قیمت { فی پرچہ ۷۵ نئے پیسے
سالانہ دس روپے

زبانِ خلق

مولانا عبدالماجد دریابادی

نگار ہندوستان پہلی بار دیکھنے میں آیا۔ یہ فروری نمبر آپ کا بھیجا ہوا ہے۔ میں سمجھے ہوئے تھا کہ نگار پاکستان کا مثنیٰ ہوگا۔ مگر یہ تو بالکل

لیکن تو چیزے دیگری

نکلا۔ اس سے قبل کا کوئی نمبر میری نظر سے نہیں گزرا اس میں ذکر جابجا غالبیہ کا ہے۔ مجھے تو غالبیہ مدخواہی نظر آیا۔ کیا غالبیہ اس کے سوا کچھ اور ہے۔

غالب میرے محبوب شاعروں میں ہے بلکہ غزلگوئی کی حد تک کہنا چاہیے کہ محبوب ترین۔ بشری کمزوریاں کس میں نہیں ہوتیں ان کمزوریوں کو زیادہ اچھالنے اور انھیں مزے لے لے بیان کرنے کی ذہنیت میری سمجھ سے باہر ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر سید عابد حسین (جامعہ ملیہ دہلی)

میں نے نگار کو بڑی دلچسپی سے پڑھا اس کے مضامین عام طور پر اور آپ کی تحریر خاص طور پر جو غالبیہ کے نام سے مسلسل شایع ہو رہی ہے بہت پسند آئی۔ خدا سے دعا ہے کہ یہ نوخیز نگار بوڑھے نگار سے زیادہ معقول اور مقبول ثابت ہو۔

پروفیسر سید احتشام حسین (الہ آباد یونیورسٹی)

نگار (جنوری) نظر نواز ہوا۔ آپ نے جس حد تک اس کی روایتوں کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے وہ لائقِ تحسین ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نئے دور میں نگار اس سے زیادہ علمی اور ادبی خدمات انجام دیگا جو پہلے دے چکا ہے کیوں کہ اس وقت علم و ادب دونوں نئی منزلوں اور نئے افق کی جستجو میں ہیں۔

اس نمبر میں یوں تو سبھی مضامین قابل مطالعہ ہیں لیکن غالبیہ کے سلسلے میں آپ نے جو جز شامل کیے ہیں وہ خاصہ کی چیز ہیں۔ میں بھی اس کی جو خدمت کر سکوں گا کروں گا۔

مالک رام (برسلز، بلجیم)

نگار کا جنوری کا شمارہ ملا تھا شکریہ ماشاء اللہ خوب نکلا ہے خدا کرے یہ خوب سے خوب تر ہوتا جائے۔

آپ نے غالبیہ کا جو سلسلہ شروع کیا ہے بہت خوب ہے اگرچہ بہتر ہوتا اگر آپ اسے مکمل غالب نمبر میں ایک ہی مرتبہ شایع کر دیتے۔ اس سے ایک تو کتاب ایک اشاعت میں پوری ہو جاتی دوسرے لوگوں کو انتظار کی زحمت بھی نہ اٹھانا پڑتی۔

عبدالمجید حیرت (پیرانا سکھر)

غالب پر نقادان وقت لتے دیکھے ہیں کہ خدا کی پناہ مگر اب تو کرم فرمائیں ایک ہی مضمون سنتے سنتے کان پک گئے عزیزو۔

پروفیسر حمید احمد خاں (لاہور)

میں نے نگار کے غالب نواز اوراق کو دلچسپی سے پڑھا اور آپ کے حسن ترتیب اند ذوق سلیم کی داد دی۔ ہندوستان میں تحقیق غالب کے لیے ابھی بے حساب مواد موجود ہے امید ہے آپ کی توجہ سے بتدریج اس سرمایہ کا انکشاف ہوتا رہے گا۔

اعجاز عسکری (علی گڑھ)

مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ سرورق کی پشت پر تعریفی رائیں چھاپنا تمھیں زیب نہیں دیتا۔ اڈیٹر اپنی شان میں تو تعریفی خط چھاپتے ہی رہتے ہیں اور اس قسم کے خطوط لکھنے والوں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ بہرحال افسوس ہوتا ہے جب کوئی تم سا شخص اس قسم کے Temptations کا شکار ہو جاتا ہے۔

پروفیسر محمود الٰہی (گورکھپور یونیورسٹی صدر شعبۂ اردو)

نگار ملا۔ این کہ می بینم بہ بیداریست یا رب یا بخواب آپ نے یقیناً معیار بلند کیا ہے .... میں خود بھی نگار کا چندہ جلد ہی بھیجوں گا امید ہے کہ آپ برا نہ مانیں گے اگر ہم لوگ بھی خریدار نہ بنیں گے تو کون بنے گا ....

جلد ۴۲ | فہرست مضامین مارچ ۱۹۶۳ء | شمارہ ۳

زبان خلق		۱	مصطفیٰ زیدی	ڈاکٹر محمد باقر	۱۴
ملاحظات		۲	باغ و بہار کا ماخذ ــ نو طرز مرصع	سید ابوالخیر کشفی	۲۳
کچھ پیروڈی کے بارے میں	(مختلف حضرات)	۴	واجد علی شاہ کے ایام اسیری کے بعض اہم واقعات	[illegible] حسن نورانی	۲۸
دیوان افسر	قاضی عبدالودود	۱۱	غالبیات ــ دو مسائل	اکبر علی خاں	۳۵

ملاحظات

ہندوستان میں اردو کے مستقبل کی طرف سے ہر اردو داں پریشان اور متفکر نظر آتا ہے۔ مایوسی اور دل گرفتگی کی یہ فضا سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو ماؤف کر رہی ہے اور ہم مسئلے سے بچا بچا کر اپنے کو بے دست و پا محسوس کرتے ہیں۔ اس انداز فکر سے ہم اپنے راستے خود ہی مسدود کرتے چلے جا رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ سہل پسندی کے ساتھ بے حسی ہماری عادت بھی ہوتی جا رہی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نالہ و فریاد کے سوا اب کوئی نسخہ استعمال کرنے کے لیے باقی نہیں رہ گیا ہے۔ اردو کی موجودہ کسمپرسی بیان کرتے وقت عموماً الزام تراشی سے کام لیا جاتا ہے اور یہ الزام ایک ہی فتنہ پرور کے سر جاتا ہے جسے حکومت کہتے ہیں۔ اس کے بعد ہم سب مطمئن ہو جاتے ہیں۔ جیسے ہم نے اپنا فرض پورا کر دیا۔

ہم سب کی سمجھ میں اردو کی ترویج و ترقی کا اور کوئی ذریعہ نہیں آتا سوائے اس کے کہ اس کو سرکاری مدارس میں منظور کرایا جائے۔ اس بات سے شاید ہی کوئی ذی ہوش انکار کرے کہ مدارس میں اردو تعلیم کا انتظام ہماری بہت سی مشکلوں کو آسان کر دے گا۔ مگر اس سے زیادہ جو چیز اس مطالبے کی پشت پناہی کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں خود کچھ کرنا نہیں پڑے گا سوائے چند نعروں اور وقتی ہنگاموں کے۔

اردو ہندوستان میں اپنے نام نہاد دعوے داروں کے ہاتھوں زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کی زندگی اب اُن لوگوں کے ذریعے ممکن ہے جو اس کی مقبولیت سے واقف ہیں اور جنھیں یہ احساس ہے کہ نئے ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں اردو کا کیا رول ہو سکتا ہے۔ نیز اس کے فراموش کر دینے سے ملک کے کتنے بڑے حصے سے بے تعلقی کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔

اردو کے چاہنے والے خالص تجارتی ذہن کے لوگوں میں بھی ملیں گے۔ چنانچہ پاکٹ بکس کی روز افزوں کثیر اشاعت اس کا ایک زندہ ثبوت ہے کہ یہ زبان ہندوستان کے گوشے گوشے میں بولی سمجھی اور پڑھی جاتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی سامنے رکھیے کہ اردو میں نشر و اشاعت کا کام اب وہ ادارے اپنا رہے ہیں جنھوں نے کبھی اردو کو اپنی مادری زبان نہیں بتایا لیکن وہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ یہ زبان آزاد ہندوستان کی زبانوں میں بلند ترین مقام رکھتی ہے اور اس کے حلقۂ اثر کو اپنانے کے معنی اپنی تجارت کو فروغ دینا ہے۔ چنانچہ ہندی کے مشہور ماہنامے سریتا نے بڑی آب و تاب کے ساتھ اپنا اردو ایڈیشن نکالا جو یقیناً اردو صحافت کے لیے ایک خوبصورت تحفہ ہے اور ان کا یہ تجربہ ہر لحاظ سے کامیاب رہا ہے۔

حال ہی میں ہندوستان کے ایک بہت بڑے انگریزی ہفت روزہ اخبار بلٹز نے بھی یہ اعلان کیا ہے کہ وہ بہت جلد اپنا اردو ایڈیشن شایع کرنے والے ہیں۔ ادارۂ نگار اس اعلان کا خیر مقدم کرتا ہے اس لیے نہیں کہ ہمیں اُن کی پالیسی اور طریق کار سے اتفاق ہے بلکہ اس لیے کہ جہاں اس ایڈیشن سے بلٹز اپنے سیاسی مقاصد کی ترویج و اشاعت کا کام لے گا وہیں اردو کو بھی مدتوں بعد ایک ایسا ہفت روزہ ملے گا جو بہرحال ہندوستان کی موجودہ صحافت کا نمایندہ ہے ہمیں یقین ہے کہ یہ تجربہ سریتا سے بھی زیادہ کامیاب رہے گا۔

عراق میں ایک بار پھر انقلاب آگیا ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے عراقیوں کو قتل و غارت کا ڈرامہ کھیلنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ موجودہ انقلاب کے رہنما عبدالسلام عارف نے سزائے موت دینے سے پہلے عبدالکریم قاسم سے جو سوالات کیے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ پچھلا انقلاب لانے کا ذمہ دار کون تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک انقلاب اتنی اہم بات نہیں تھی جتنی یہ بات کہ انقلاب لانے والا کون ہے۔ اس ایک جملے نے خود پسندی کے کتنے تہ در تہ جذبات کو عریاں کر دیا۔ بات کچھ بھی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ قاسم نے جو رحمدلانہ سلوک عارف کے ساتھ کیا تھا وہ سیاسی انقلاب کی دنیا میں دانشمندانہ نہیں تھا اور اسی کا خمیازہ انھیں اپنی زندگی سے بھگتنا پڑا ——— ہماری تمنا ہے کہ مشرق وسطیٰ کے پڑوسی ہندوستان کی امن پسند طبیعت سے کچھ سیکھیں اور اپنے مزاج میں استقلال و ثبات پیدا کر سکیں کیوں کہ ؎

برسنگ گرداں نروید نبات

کچھ پیروڈی کے بارے میں

رشید احمد صدیقی

فن کی حیثیت سے پیروڈی مغرب کی دین ہے۔ لیکن شغل کے اعتبار سے ہمارے شعر و ادب میں اجنبی نہیں ہے اردو میں اس کی ابتدائی مثال غالباً شاہنامے کی جہاں تہاں سے پیروڈی میں ملتی ہے۔ جو رکیک و سخیف زیادہ ہے۔ پیروڈی کم ہے، عربی فارسی، کلاسیکی اور مذہبی کتابوں کے تحت اللفظ اردو ترجمے کی بھی پیروڈی کی گئی ہے۔ جس کے نمونے ملا رموزی کی "گلابی اردو" میں ملتے ہیں۔ غالب۔ حالی۔ انیس اور اقبال کے کلام پر بھی یہ عمل کیا گیا ہے۔ کسی شاعر یا مصنف کی پیروڈی اس امر کی دلیل ہے کہ اس کے کلام کا غیر معمولی طور پر چرچا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ کلام یا اس کا مصنف کس پائے کا ہے۔

کچھ دنوں ترقی پسند شاعری بالخصوص بے قافیہ نظموں کی کثرت سے پیروڈی کی گئی ہے۔ یہ در اصل کسی مشہور مصنف یا شاعر کے سنجیدہ اور معروف کلام یا نظم و نثر کو مضحک رنگ میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس شرط کے ساتھ کہ مضحک مبتذل نہ ہونے پائے با الفاظ دیگر پیروڈی ادبی رنگ کی حامل ہو۔ شخصت آبی یا حد سے بڑھی ہوئی سنجیدگی کو مزاح تفنن سے معتدل کرنے اور رکھنے کا کام پیروڈی سے لیا جاتا ہے۔ علی گڑھ میں یورپ اور یورپ کچھ دنوں سے بڑی مقبول اصطلاحیں ہیں جن کو خود یورپ بڑی معصومیت سے کام میں لاتے ہیں پیروڈی ان معصوموں کے حضور میں ان کے ستم زدوں کی طرف سے نذر عقیدت ہے یا یوں سمجھ لیجیے کہ یورپ کو یورپ ہی کے حربے سے کیفر کردار کو پہنچانے کی مستحسن کوشش پیروڈی ہے۔

پیروڈی میں جدت اور جودت کا ہونا ضروری ہے اصل کی نقل اس طور پر کرنا یا اس میں ظرافت کا پیوند لگانا کہ تھوڑی دیر کے لیے نقاب یا پیوند کی تفریحی حیثیت اصل کی سنجیدہ حیثیت کو دبا دے پیروڈی کا ہنر ہے۔ پیروڈی ظریفانہ پیوند کاری یا مزاحیہ تصرف ہی کو تو کہتے ہیں۔ اعلیٰ پایے کی پیروڈی اتنی ہی قابل قدر ہوتی ہے جتنی کہ وہ عبارت یا شعر جس کی پیروڈی کی گئی ہو۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پیروڈی کا فن کس ذہانت اور ذکاوت کا طلب گار ہوتا ہے۔

پیروڈی نگاروں میں میرے نزدیک اکبر کا درجہ سب سے بلند ہے۔ ایک زمانے میں سید محمد داؤد عباسی (علیگ) کی پیروڈی نگاری کی علیگڑھ میں بڑی شہرت تھی۔ جو خوشی محمد خاں ناظر اور علامہ شبلی کے کلام پر طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ موجودہ دور میں سید محمد جعفری (پاکستان) کو بڑی شہرت ہے، آپ نے سرکس میں مسخرے[1] کو دیکھا ہوگا جو اپنے ساتھی بازیگر نمبرا کی نقل کرتا ہے۔ وہ اپنے طور پر وہی سب کو دکھاتا ہے جو بازیگر دکھاتا ہے دونوں کے دکھانے میں صرف تکنیک کا فرق ہے۔ ایک کے کرتب پر آپ محو حیرت رہ جاتے ہیں۔ دوسرے کی نقل پر ہنستے ہنستے لوٹ جاتے ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہوگا کہ مسخرا فن کے اعتبار سے نہ صرف یہ کہ بازیگر کا ہمسر ہوتا ہے بلکہ بازیگر پر اس کو یہ فوقیت حاصل ہوتی ہے کہ کرتب جو بازیگر جان کو خطرے میں ڈال کر دکھاتا ہے۔ مسخرا محض چند قلابازیوں میں دکھا دیتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ ہم بازیگر کے کرتب کا حسن شوق سے مشاہدہ کرتے ہیں

---

[1] رشید صاحب نے جسے مسخرا کہا ہے اس کو رامپور کی زبان میں بیلا (Beela) بروزن ٹیلہ کہتے ہیں۔ یہ خاص رامپوری زبان کا لفظ ہے اور کہیں دوسری جگہ سننے میں نہیں آتا جو کرتب کے مفہوم کو اپنے تمام لوازمات اور فنکارانہ نزاکتوں کے ساتھ ادا کرنے والا کوئی اور لفظ نہیں ہے جو کر کو ہم مسخرہ نہیں کہہ سکتے۔ اس لیے کہ جوکر میں فن کاری کا جتنا شدید احساس ہوتا ہے وہ مسخرے میں نہیں ہوتا جوکر اپنے مزاحیہ افعال کو ہنر بنا کر اور ہنر سمجھ کر پیش کرتا ہے جبکہ مسخرے کو بعض اوقات احساس بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے میری رائے میں سرکس والے مسخرے کو خصوصاً بیلا کہنا چاہیے کیونکہ یہ پوری طرح جوکر کا چربہ ہے (نگار)

اس سے کسی طرح کم شوق سے مسخرے کی قلابازیوں کا مشاہدہ نہیں کرتے۔ یہاں غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ جس کرتب کو بازی گر اپنی جان خطرے میں ڈال کر دکھاتا ہے اسی کو مسخرہ اپنی آبرو خطرے میں ڈال کر دکھاتا ہے۔ مسخرے کی آبرو کسی غیر مسخرے کی آبرو سے کم نہیں ہوتی۔

قلابازی تو ہم آپ بھی لگا سکتے ہیں۔ لیکن تماشائیوں کے ڈر سے شاید ایسا نہ کریں۔ دراصل قلابازی میں کچھ نہیں دھرا ہوتا۔ سب کچھ مسخرے (فنکار) میں ہوتا ہے۔ اس لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ مسخرا بننے سے پہلے قلابازی لگانے میں احتیاط برتیں اور مسخرا بننے میں اس سے بھی زیادہ احتیاط سے کام لیں۔

پیروڈی اور کارٹون میں مماثلت ہے۔ کارٹون بھی کسی شخص یا شے یا واقعے کی سب سے نمایاں شناخت یا پہلو کو مضحکہ خیز حد تک نمایاں کر دیتا ہے۔ چیسٹرٹن کے نزدیک طنز یا تضحیک کا تصور یہ ہے کہ سور کا نقشہ اس طرح کھینچا جائے کہ وہ سور سے بھی زیادہ سور نظر آنے لگے۔ یہ تعریف کارٹون پر بھی چسپاں ہوتی ہے اس طرح پیروڈی کارٹون طنز و ظرافت بقول غالب ؎

"وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے"!

نثر کی پیروڈی نظم کی پیروڈی سے مشکل ہے۔ اس سے غالباً سب کو اتفاق ہوگا اس پر مزید گفتگو کی ضرورت نہیں۔

آل احمد سرور

پیروڈی ظرافت کی ایک خاص صنف ہے۔ پیروڈی کے لیے ضروری ہے کہ جس کی پیروڈی کی جائے اس میں کچھ فکری یا فنی محرومیاں موجود ہوں۔ رشید صاحب کی اصطلاح میں انھیں کوبڑ کہہ لیجیے۔ مثلاً ایک صاف ستھرے صحیح اور ہموار شعر کی پیروڈی نہیں کی جا سکتی جب تاؤ نہ ہوگا تو اسے تیز کیسے کیا جائے گا۔ اگر شاعر کے یہاں کچھ مضامین اصطلاحات، تشبیہات، تراکیب اور علامات کی تکرار ہے اور یہ سب چیزیں ہی اس کی امتیازی صفت ہیں تو ان کی پیروڈی کی جا سکتی ہے۔ اس طرح اگر نثر نگار کے یہاں کچھ مخصوص خیالات کا اعادہ ہوتا ہے چند خاص خاص فقرے بار بار کہیں بار بار ملتی ہیں واقعہ کچھ ہو تاثرات ایک ہی سے رکھتا ہے تو وہ پیروڈی کے لیے نہایت موزوں ہے۔ پیروڈی انفرادیت کو آسیب بنا کر پیش کرتی ہے۔ اس نقطہ نظر سے اس میں محض یہ دیوتا کے مٹی کے پاؤں دیکھنے کا جذبہ ہی نہیں ذہنی صحت کے معیار قائم کرنے کا بھی احساس شامل ہے۔ ہر تشبیب دفراز کو ہموار کرنے کا عزم ہی نئے نشیب و فراز کی داغ بیل ڈالنے کا بھی۔ یہ وہ آئینہ ہے جو محبوب کی جھریاں ہی دکھاتا ہے مگر جھریوں کے باوجود ادائے محبوبی ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

جس طرح ظرافت میں طنز کو گوارا اور اسلوب کو ادبی ہونا چاہیے اسی طرح پیروڈی میں بدتمیزی کی گنجائش نہیں۔ اگر کسی کے نقطہ نظر یا اسلوب بیان کی اس طرح پیروڈی کی گئی کہ پیروڈی کرنے والے کا ذاتی عناد نمایاں ہو گیا تو پیروڈی کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ پیروڈی تو صرف آئینہ دکھاتی ہے قدروں کا پرچار نہیں کرتی۔ یہ چراغ رہ گزر ہے۔ پولس کی سرچ لائٹ نہیں۔

پیروڈی ایک شعوری کوشش ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ غیر شعوری طور پر کوئی تصویر کارٹون اور کوئی تخلیق ایک ایسی بھدی نقل بن جائے جس پر پیروڈی کا گمان ہو۔ اردو میں پیروڈی کی شعوری کوشش سب سے پہلے پطرس نے کی اور مولوی اسمٰعیل کی ریڈروں کے مانے ہوئے حسن کو اپنے آئینے سے اور محبوب بنا دیا۔ ان کے مضمون کتے میں بھی مشاعروں کی ایک پیروڈی ملتی ہے۔ مگر مضمون نگار نے وہاں پیروڈی ضمناً کی ہے۔ اپنے بنیادی مقصد کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ جہاں کسی رومان یا نصاب' عورت یا انقلاب کی لے بہت تیز ہو گئی ہے۔ پیروڈی کے ذریعے سے صحت و اعتدال کی علمبرداری کی گئی ہے۔ جہاں فنکار نے پن کے نشے میں اپنے لغمے کی باگ کل آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ پیروڈی کرنے والوں کو اس کی بے لگامی واضح کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ پیروڈی جہاد نہیں ہے ایک سنجیدہ تفریح ہے اور اس کا تہذیبی مقام مسلم ہے۔

سیّد احتشام حسین

انسان آلام حیات اور جان لیوا سنجیدہ مصروفیات سے لڑنے کے لیے تفریح کے سیکڑوں ذرائع اور خوش باشی کے لاتعداد پہلو پیدا کر لیتا ہے

وہ ہنسنے کی بات پر تو خیر ہنستا ہی ہے، لیکن بلکہ بعض لوگوں کی طرح ہنسنے سے اس کی صحت نہ خراب ہوتی ہو۔ سنجیدہ باتوں کو بھی توڑ مروڑ کر ان میں مضحک پہلو نکال لیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پیروڈی بھی اسی نوع کی ایک کوشش ہے۔ میں خود کو اس بات کے ماننے پر آمادہ نہیں کر سکا ہوں کہ پیروڈی کو ادبی محفلوں میں بھی جگہ دی جائے۔ ——— ہو سکتا ہے کہ کوئی پیروڈی نگار میری اس بدذوقی پہ مجھ سے بھی سمجھ لے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اسے وقتی تفریح تک محدود رکھنا چاہیے اور ایک ادبی صنف قرار دے کر اعلیٰ ظرافت اور مفکرانہ طنز کا مدمقابل نہیں بنانا چاہیے۔

ڈاکٹر شفیق الرحمٰن

اردو ادب میں پیروڈی کے نادر نمونے ملتے ہیں۔ لیکن یا تو ہم لوگ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہیں اور یا انگریزی کے اس غیر مانوس سے لفظ کو کوئی نئی تحریک سمجھتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے یہاں پیروڈی کی وہ آؤ بھگت نہیں ہوئی جتنی کہ ہونی چاہیے تھی۔

پیروڈی بڑی پرانی چیز ہے۔ زمانہ قبل از مسیح میں بھی لوگ پیروڈی کیا کرتے تھے۔ یونان میں کسی ٹھوس نظم یا سنجیدہ ڈرامے کو مزاحیہ رنگ میں پیش کیا جاتا تو اس عمل کو پیروڈیا (یا پیروڈو) کہتے تھے۔ ارسطو نے لکھا ہے کہ جب ایتھنز کی فوجیں سسلی میں تباہ ہو گئیں تو ایک یونانی نے اس جنگ پر اتنی اچھی پیروڈیا (یا پیروڈو) لکھی کہ اسے پڑھ کر ایتھنز والے اپنی شکست کو بھول گئے۔

اس زمانے سے اب تک دنیا کی ہر زبان میں ہر موضوع پر پیروڈیاں لکھی گئیں **Donquxote** شایع ہوئی تو ساری دنیا یورپ کے بانکے سپاہیوں اور شولری پر ہنسی اور یہ کردار دنیا کے ادب میں ہمیشہ کے لیے شامل ہو گیا۔ جان فلپس نے ملٹن کی فردوس گمشدہ کو مزاحیہ رنگ میں پیش کیا تو لوگوں نے اسے ملٹن ثانی کا خطاب دیا جو آج تک اس کے کتبے پر لکھا ہوا ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ پیروڈی نہ تو محض طنز ہوتی ہے اور نہ نری تضحیک، یہ ایسی خوشگوار سی تنقید ہوتی ہے جو بری معلوم نہیں ہوتی۔ (خصوصاً اسے جس پر پیروڈی کی گئی ہو) پچھلی صدی میں لندن کے تھیٹروں میں نامور شعرا کے کلام پر پیروڈی کی جاتی تھی۔ کئی مرتبہ متعلقہ شعرا بطور تماشائی وہیں تھے لیکن انھوں نے برا نہیں مانا۔

دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ سنجیدہ اور سبق آموز چیزیں پڑھتے وقت قاری چونکتا سا رہتا ہے اور بار بار سوچتا ہے کہ یہ باتیں تو میں پہلے سے جانتا ہوں۔ اسے شک رہتا ہے کہ مصنف کہیں پروپیگنڈہ تو نہیں کر رہا ہے ——— لیکن ایک کامیاب پیروڈی پڑھتے وقت اسے شبہ تک نہیں ہوتا کہ مصنف کسی اور کی آڑ لے کر طرز معاشرت، رسوم، اخلاقی قدروں اور دیگر اہم مسائل پر تنقید کر رہا ہے۔ چند چست سے فقرے، عبارت کے کچھ دلچسپ حصے اس کے ذہن میں رہ جاتے ہیں اور ساتھ ہی چند کارآمد نصیحتیں بھی یاد رہ جاتی ہیں۔ صحیح پیروڈی ادب کی نہایت دلکش صنف ہے جہاں تک لفظ پیروڈی کا تعلق ہے۔ سو جیسے تھیٹر کو تھیاتر اور کلاسیکل کو کلاسیکی بنا کر اپنا لیا گیا ہے۔ اسی طرح اگر پیروڈی کو پیرادی یا پیروڑی بنا دیا جائے تو شاید ہم اس سے فوراً مانوس ہو جائیں۔

ڈاکٹر محمد حسن

پیروڈی سنجیدہ فن پاروں میں مضحک پہلوؤں کی تلاش ہے۔ یہ غلط پندار، گمراہ خودی اور حد سے بڑھی ہوئی انانیت میں تناسب اور توازن پیدا کرتی ہے۔ اسی لیے بہت سے گروہوں، قوموں یا ادبی انجمنوں کی ہیجانی طنز و مزاح کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ اور پیروڈی بھی اسی کی ایک شکل ہے۔ علی گڑھ نے اس میدان کے بڑے بڑے صاحب طرز شہسوار پیدا کیے ہیں۔ اور آج جب خودستائی، اپنی بات پر اڑنا اور دوسروں کی بات نہ سننا ہماری قومی کمزوری بنتا جا رہا ہے، طنز و مزاح کی شدید ضرورت ہے جو ہمیں تصویر کا دوسرا رخ دکھا سکے۔

خوش مزاقی کا یہ معیار نہیں ہے کہ دوسروں پر ہنسا جائے۔ صحیح معیار یہ ہے کہ اپنے آپ کو کبھی کبھی اس آئینے میں دیکھا جائے اور ماتھے پر شکن نہ آنے پائے۔

شوکت تھانوی

ہم جن حالات سے گذر رہے ہیں وہ حالات ہی دراصل ان حالات کی پیروڈی بن کر رہ گئے ہیں جن سے ہم گذر چکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے زندگی جتنی بسر کرنا تھی وہ تو بسر کر چکے اب زندگی کی پیروڈی کر رہے ہیں۔ ان حالات میں جب انسان خود اپنا کارٹون بن کر رہ جائے اور جب اس کا اسلوب زندگی بجائے خود پیروڈی ہو تو اس کے پیچھے اسلوب زندگی کی اس سے کسی پیروڈی کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ پیروڈی کیا دوسروں کی ہو جب کہ فنکار اگر جہل اور موت دونوں سے بچ گیا۔ تو خود اپنے ہی فن کا شاہکار بن کر رہ جاتا ہے اور انسانی کمی کا وش یہ نہیں بلکہ خود اسی پر دبا ہنسنے لگتی ہے۔

کنہیا لال کپور

میری دانست میں اردو ادب میں پیروڈی کی بہتات ہے قریب قریب ہر غزل، ہر مضمون، ہر نظم، مضمون پر لکھی ہوئی پیروڈی کا درجہ رکھتا ہے۔ پیروڈی مزاحیہ تنقید کی سب سے مشکل صنف ہے۔ اچھی پیروڈی لکھنا پل صراط پر چلنے کے مترادف ہے۔ نثر میں ڈاکٹر شفیق الرحمن، شوکت تھانوی، کرشن چندر، منٹو اور فرقت نے چند اچھی پیروڈیاں لکھی ہیں۔ نظم میں جعفری، مجید لاہوری نے پیروڈی کے کامیاب نمونے پیش کیے ہیں۔ میں اس دن کا انتظار کر رہا ہوں جب ہمارے ادیب پیروڈی کی اہمیت محسوس کریں گے اور سلیقے سے پیروڈی لکھا کریں گے۔

فکر تونسوی

میری تھیوری یہ ہے کہ اچھا طنز نگار صرف وہی ہو سکتا ہے جس کی شکل و صورت (بہ صورت پیروڈی) ۵ فیصدی بھونڈی، بھدی اور مضحکہ خیز ہو۔ جیسے برنارڈ شا، چارلی چپلن، شوکت تھانوی، کنہیا لال کپور، فکر تونسوی اور ۔ ۔ ۔ ۔ اور بالکل یہی وجہ ہے کہ یہ حضرات سوسائٹی کی بھونڈی، بھدی اور مضحکہ خیز چیزوں پر کراری طنز لکھتے ہیں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ خدا نے کسی طنز نگار کو خوبصورت نہیں بنایا ورنہ یہ سوائے اپنی اپنی زلفوں کے اور کسی کام کے نہ رہتے آپ کا کیا خیال ہے[1]

ڈاکٹر قمر رئیس

ظرافت اور طنز کی ہیئت، ان کے محرکات اور تخلیقی عمل میں اتنے اوصاف مشترک ہیں کہ ان کے درمیان کوئی حد فاصل کھینچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن ایک چیز ہے جو دونوں کے مابین ہمیشہ وجہ امتیاز رہی ہے۔ اور وہ ان کا مقصد۔ ایک کا مقصد تضحیک ہے اور دوسرے کا تنقید۔ ظرافت ہمیں ہنسی یا لطف اندوزی کی ایک عارضی کیفیت دے کر اپنی تخلیق کا مقصد کھو بیٹھتی ہے۔ طنز اس کیفیت کو دل کی گہرائیوں میں اتار کر ہمیں زندگی کے کچھ حقائق کا ادراک بخشتا ہے پیروڈی کا سلسلۂ نسب طنز سے ملتا ہے۔ دونوں میں اگر کوئی بنیادی فرق ہے تو یہ کہ طنز اپنا موضوع اور مواد براہ راست (اور بالعموم) زندگی سے لیتا ہے۔ پیروڈی ادب اور فنون لطیفہ سے۔ ایک اہم وصف جو ظرافت، طنز اور پیروڈی تینوں میں بروئے کار رہتا ہے۔ مزاح کا مقصد۔ یعنی ایک بیانی اظہار جو ناظر کے دل میں ہنسی کی کیفیت پیدا کر دے۔ میں یہاں مزاح کی فلسفیانہ تاویلوں میں الجھنا نہیں چاہتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ ارسطو نے اسے جس طرح دریافت کیا ہے وہ اپنی نفسوریت کے باوجود آج بھی ناقابل تردید ہے۔ اس کا یہ قول کہ "وہی چیز ہنسی کی محرک ہو سکتی ہے۔ جو بدہیئتی کا ایک ایسا جزو ہو جس کی کجی یا ناہمواری کسی طرح کی اذیت یا جراحت کا شائبہ نہ رکھتی ہو" دراصل مزاح کی دو بنیادی پہلوؤں کی وضاحت کرتا ہے۔

---

[1] شاید اس موقع پر ڈاکٹر شفیق الرحمن فکر تونسوی کی نظر میں نہیں رہے

۱۔ مزاح کا محرک کوئی ایسا بے تکا پن ہوتا ہے جس سے ہماری متانت اور جمالیات کو صدمہ پہنچتا ہے۔
۲۔ لیکن وہ بے تکا پن جس سے مزاح کی تخلیق اور ہنسی کی انبساطی کیفیت حرکت اور عمل میں آتی ہے ایسا ہرگز نہ ہو جو کسی انسان یا جاندار کے لیے جسمانی یا قلبی اذیت کا باعث ہو رہا ہے۔

اس طرح ارسطو نے مزاح کو بظاہر اپنے اخلاقی آدرش کا لیکن فی الاصل ایک وسیع تر معنی میں اس کو انسان دوستی یا انسانی ہمدردی کے تابع کر دیا۔ پیروڈی کا فن بھی اپنی مزاحیہ کیفیت میں اسی انسانی ہمدردی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اور چونکہ طنز کی طرح اس کا مقصد بھی تنقید ہے اس لیے انسانی ہمدردی کا یہ عنصر اس کے تنقیدی عمل میں پوری آب و تاب لیکن ضبط و توازن کے ساتھ رونما ہوتا ہے۔

یہ سمجھنا کہ موضوع کے اعتبار سے پیروڈی کا میدان طنز سے محدود اور مختصر ہے صحیح نہ ہوگا۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے مزاح جو دونوں میں بنیادی اور مشترک حیثیت رکھتا ہے، ہماری متانت کے احساس اور جمالیات کے تصور کی شکست و برہمی سے پیدا ہوتا ہے اور چونکہ شعر و ادب جمالیاتی قدروں کا بہترین مظہر ہیں اس لیے اس محدود دائرے میں بھی قدم قدم پر سیکڑوں موضوعات پیروڈی لکھنے والے کی نگاہ کرم کے منتظر رہتے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس کا تنقیدی عمل طنز کی بہ نسبت کچھ پیچیدہ اور دشوار ہوتا ہے۔

طنز نگار زندگی کے نو بہ نو مظاہر میں سے کچھ ایسی بے تکی صورتیں اخذ کر کے جو اس کی نگاہ میں کھٹکتی ہیں، اپنے مزاحیہ اسلوب میں ڈھالتا ہے اور اس طرح اس میں استرے کی سی تیزی پیدا کر دیتا ہے۔ پیروڈی کا موضوع شعر و ادب کا کوئی خاص اسلوب خاص میلان (فکری یا فنی) یا کوئی اہم ادبی شہپارہ ہوتا ہے۔ اور اس کی تنقید کا ہدف اس خاص اسلوب، میلان یا تخلیق کی کمزوریاں ہوتی ہیں۔ اس لیے پیروڈی لکھنے والے کو طنز نگار کی ژرف نگاہی اور دیدہ وری کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کا گہرا شعور اور فنی اسالیب کی واضح بصیرت بھی درکار ہوتی ہے وہ پیروڈی کی فنی تکمیل میں جن دشواریوں سے گزرتا ہے اور جس طرح کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتا ہے اس کا اجمالی تجزیہ اس طرح ہو سکتا ہے۔

۱۔ سب سے پہلے ان نمایاں کمزوریوں کی دریافت ——— یا ان کمزوریوں کا واضح ادراک جو نمایاں نہیں ہیں۔ لیکن جن کو وہ نمایاں کر کے پیش کرنا چاہتا ہے۔
۲۔ اپنے تخیل کو اس خاص اسلوب کے دائرہ میں اسیر کر کے اس طرح مہمیز کرنا کہ اس کی تمام کمزوریاں اک مضحک ہیئت میں سامنے آ جائیں۔
۳۔ اور اس طرز عمل میں اس کا زاویہ نظر ہمدردانہ ہو۔ وہ تنقید کے اعلیٰ معیار پر پورا اترتا ہو۔ بالفاظ دیگر اس کا مقصد اس مروجہ اسلوب کی اصلاح ہو اور اس کے نقائص کو ادب کے قارئین سے روشناس کرانا تاکہ وہ اسلوب اسی مرتبہ کا مستحق سمجھا جائے جس کا وہ اہل ہے۔

اس تجزیے سے پیروڈی کے کئی اوصاف واضح ہو جاتے ہیں۔ اول یہ کہ پیروڈی لکھنے والا کسی خاص اسلوب یا فن پارہ کی خارجی ہیئت (Form) کی تقلید کرتے ہوئے اس کے مواد کو حسب ضرورت ایسی مبالغہ آرائی اور ایسے ظریفانہ پیرائے سے پیش کرے کہ اس کا اصل جوہر مسخ ہو کر بھی پہچانا جا سکے۔ ایک مغربی ناقد نے بہت پتے کی بات کہی ہے اس کا قول ہے "بہترین پیروڈی وہی ہے (اور یہ واقعہ ہے کہ بہترین پیروڈی شاذ و نادر ہی لکھی جاتی ہے) جو ہیئت کے ساتھ وفاداری لیکن مواد کے ساتھ عیاری کا مسلک اختیار کرتی ہے۔" مواد کے ساتھ یہی عیاری پیروڈی لکھنے والے کے تخیل کے ساتھ ساتھ اس کے فکر و شعور کو بھی کچھ آزادی دیتی ہے۔ اور اس بہانے اگر وہ چاہے تو اپنے عہد کی بدلتی ہوئی قدروں اور معاشرتی حالات کو بھی تنقید و طنز کا موضوع بنا سکتا ہے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اسے اس خاص اسلوب یا فن پارہ کی ہیئت (Form) اور اس کے موڈ کے ساتھ پوری پوری وفاداری برتنا ہوگی، جسے اس نے سامنے رکھا ہے اس لیے کامیاب پیروڈی کا معیار قرار دیا گیا ہے کہ اسے پڑھ کر قاری خود پتہ لگائے کہ اس کے آئینہ میں کس اسلوب یا کس فنکار کا خاکہ اڑایا گیا ہے۔ دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ پیروڈی کا تنقیدی عمل ہر اعتبار سے ایک تخلیقی عمل ہوتا ہے ایک ناقد نے اس بات پر بڑا زور دیا ہے وہ لکھتا ہے:

"پیروڈی لکھنے والے کی تنقید کو تخلیق کا ہم مرتبہ ہونا چاہیے اس کا تخلیقی عمل ایک طرح کی تخیلی بازآفرینی ہو۔"

گویا پیروڈی بھی دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح فن و فکر اور جذبہ کی متوازن ہم آہنگی کا لطیفہ بیکر ہو۔

یہاں مناسب ہوگا کہ پیروڈی کی فنی ساخت پر غور کرتے ہوئے محل ورود پر بھی ایک نظر ڈالیں لفظ پیروڈی دراصل ایک یونانی لفظ "پرودیا" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں **Counter Song** یا نغمۂ معکوس۔ پرودیا، قدیم یونان میں ایک ایسا گیت ہوتا تھا جو کسی گائے ہوئے سنجیدہ نغمے کی مقدس فضا اور اس کے سحر و اثر کے طلسم کو توڑنے کے لیے گایا جاتا ہے۔ گویا یہ اس نغمہ کی اہمیت و متانت کا خاکہ اڑاتا ہے۔ اس کا کوئی نمونہ ہمارے سامنے نہیں۔ لیکن قیاس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ کہ اس کا مقصد ان ہنگامی جذبات کی شوریدگی و جوش میں ایک توازن پیدا کرنا تھا جو کسی نغمے کی الاپوں سے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں یا یہ کہیے کہ اس جذباتی شدت اور ہیجان میں ضبط و نظم پیدا کرنے کے لیے گایا جاتا تھا۔ اس کی یہ اصلاحی روح آج بھی برقرار رہے۔ اگرچہ موسیقی سے رزمیہ، پھر ڈرامہ اور پھر ادب کی دوسری صناف تک آتے آتے اس کی نوعیت میں تغیر ہو گیا ہے۔ کیسلس کی ادبی قاموس میں پیروڈی کے اس پہلو کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا کہ

> "پیروڈی انتہا پسندی اور جارحانہ روش کے خلاف ایک طرح کا اقدام تحفظ ہے اور سب سے بڑا تحفظ، یہ ہماری حد سے بڑھی ہوئی سنجیدگی کے سنگین جرم کے خلاف ہے"

شاید اس مطمع نظر کو سامنے رکھ کر بائرن اور سوئنبرن جیسے ممتاز اور صاحب طرز شاعروں نے خود اپنے فن کی پیروڈیاں لکھی تھیں۔ جو اپنے زمانے میں بے حد مقبول ہوئیں۔

یونان میں فنی حیثیت سے اس صنف کا موجد ارسطو نے **Hegemon of Thasos** کو مانا ہے اگرچہ (**Marton**) بھی اس کی اولیت کا دعویدار کہا جاتا ہے جس نے ہزاروں اشعار میں ہومر کی رزمیہ شاعری کی پیروڈی لکھی تھی۔ اس کے بعد (**Hipponax**) نے ایلیڈ کو ایک کامیاب پیروڈی کے آئینے میں پیش کیا۔ اس ابتدائی دور کی پیروڈی میں طرزِ نگارش کے ساتھ ساتھ تصانیف کی فکری نوعیت اور ان کے داخلی موڈ کو بھی تنقید و تضحیک کا موضوع بنایا گیا ہے۔

اردو میں اس صنف کا تعارف براہِ راست انگریزی کے اثر سے ہوا اور اگرچہ انگریزی میں اس کی روایت اور اس کے فن کا نشو و نما ہے جس کا ذکر کیا گیا۔ لیکن وہاں بعض ذہین شاعروں اور ادیبوں نے اپنے بلند تر مقاصد کے حصول کے لیے ایسی اصناف کو بھی رواج دیا ہے جو اگرچہ پیروڈی کے معیار پر پوری نہیں اترتیں لیکن کچھ اوصاف میں اس صنف سے بڑی مماثلت رکھتی ہیں مثال کے طور پر **Mock Epic** یا ظریفانہ رزمیہ۔ اس میں شاعر کلاسیکی رزمیہ شاعری کی فنی نزاکتوں اس کی مخصوص بحر پر شکوہ انداز بیان مصنوعی صناعی اور اشخاص کے کارناموں کا مبالغہ آمیز بیان تمام اوصاف کی تقلید کرتا ہے۔ لیکن اس کا مواد وہ روزمرہ کی عام زندگی سے لیتا ہے۔ اس طرح عام انسانوں اور ادنیٰ واقعات کو رزمیہ انداز کے اہتمام شان و شکوہ اور عظمت کے آئینے میں دکھا کر وہ قدم قدم پر ایک پُر مزاح تضاد اور ظریفانہ صورت حال پیدا کرتا ہے۔ اس نوع کے ظریفانہ رزمیوں کے نقوش ہمیں پوپ کی "زلفوں کی عصمت دری" سے لیکر ایلیٹ کی "ویرانہ" تک میں ملتے ہیں۔ (یہ تسلیم کہ "ویرانہ" مزاح سے عاری ہے) دراصل ان نظموں کا مقصد رزمیہ کی تنقید نہیں بلکہ طنز کے پیرائے میں اپنے عہد کی زندگی کی تنقید ہے۔ اس لیے ان کا فن پیروڈی کے فن سے مشابہت کے باوجود بہت مختلف ہے۔

انگریزی ادب میں **Isaac Hawkins Brown** کو پیروڈی کا موجد کہا جاتا ہے جس نے پوپ اور تھامپسن وغیرہ کے طرزِ نگارش کی پیروڈیاں لکھی تھیں۔ انیسویں صدی میں اس صنف کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ خاص طور سے نظم کی پیروڈی کو اس عہد کا شاید ہی کوئی صاحب طرز شاعر ہو جس کے اسلوب کا خاکہ نہ اڑایا گیا ہو یا جس نے اپنے ہم عصر شعراء کے بارے میں پیروڈی کے انداز کی نظمیں لکھی ہوں۔ شیلی نے ورڈس ورتھ کی مشہور نظم **Petes Bell** کی پیروڈی لکھ کر فطرت کے اس پجاری کے فن اور ڈکشن کو ہلا کر رکھ دیا۔ سوئنبرن نے ٹینی سن کی شاہکار نظم **In Memorium** کی جو پیروڈی لکھی تھی اسے اپنے زمانے میں ٹینی سن کی نظم سے کم شہرت حاصل نہ تھی! اگر آپ کے ذہن میں ٹینی سن کے طرز خاص اور اس

نظم کا دھندلا سا خاکہ بھی ہے تو آپ سوئنبرن کی پیروڈی کے ان مصرعوں سے محظوظ ہو سکتے ہیں۔

God whom we see not is.
And God whc ig not we see.
Fiddle, we know ig diddle,
And diddle we take it, ig dee

یہاں پیروڈی لکھنے والے نے الفاظ اور خیالات میں ایک خاص لوچ اور تکرار پیدا کرکے بائرن کی معنوی نزاکت اور بلندی کو جس طرح پستی دکھائی ہے اور ایک متوازن تخیلی مبالغہ آرائی سے جس طرح بائرن کے شاہکار کا خاکہ اڑایا ہے وہ اس فن کا کمال ہے۔

انگریزی کے نثری ادب میں بھی پیروڈی کے بہت کامیاب نمونے ملتے ہیں۔ اس صدی میں جیمس جوائس نے اگر مبتذل انداز کے اخباری نقصوں کو (جو اس زمانے میں بہت مقبول تھے) پیروڈی کا موضوع بنایا تو اسٹیفن لیکاک نے جاسوسی قصوں کی ہیجان خیزی تجسس آفرینی اور مجرمانہ خوف و ہراس کی فضا کو اپنی پیروڈیوں کا ہدف بنایا۔ جیمس جوائس نے انگریزی نثر کے نمائندہ اسالیب کو بھی بڑی کامیابی سے پیروڈی کے قالب میں پیش کیا ہے اور اگر قریب سے دیکھا جائے تو ایک بڑے کینوس پر اس کا عظیم ناول "یولسس" بھی پیروڈی ہی ہے جس میں ایک طرف اس نے حقیقت نگاری کی روایت اور دوسری طرف رزمیہ قصوں کے کرداروں کی رفعت و عظمت کا مضحکہ اڑایا ہے۔ اس ناول کے پیروڈی ہونے کا سب سے بڑا ثبوت اس کا نام ہے یہی وجہ ہے کہ بعض ناقدین نے اسے اس صدی کا سب سے بڑا پیروڈی نویس مانا ہے۔

بہر حال یہاں میرا مقصد انگریزی یا اردو پیروڈی کی تاریخ کا جائزہ لینا نہیں بلکہ اس صنف کے چند فنی پہلوؤں اس کی وسعت اور امکانات کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ انگریزی میں اس ادبی روایت کی تعمیر و ترقی کا ایک سبب یہ ہے کہ وہاں کے مشاہیر اور چوٹی کے شاعروں اور ادیبوں نے بھی سنجیدگی کے ساتھ اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور اس طرح ان کی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کی آبیاری سے اس روایت کا نشو و نما ہوا۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کا یہ قول بڑی حد تک صحیح ہے کہ معیاری پیروڈی کی تخلیق صرف اس فنکار کے بس کی بات ہے جو اپنی صلاحیتوں اور ذہن و فکر کے اعتبار سے اس ادیب سے کمتر نہ ہو جس کے فن یا اسلوب کو وہ پیروڈی کا موضوع بنا رہا ہو۔

اردو میں اس روایت کی پس ماندگی کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ ہمارے مشاہیر نے اسے ہاتھ لگانا کسر شان سمجھا۔ دوسرے اور تیسرے درجے کے ادیبوں نے اگر کبھی تفنن کے طور پر طبع آزمائی کی ہے تو اس کا فنی معیار ان کی ذہنی سطح سے بلند نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ادب کا دامن اس روایت کے گلہائے گراں مایہ سے خالی نظر آتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ ہمارے یہاں اس کی کوئی روایت نہ رہی ہو۔ غالب کی طرز بیدل والی غزلوں کی عصری پیروڈیوں سے لیکر تہذیب الاخلاق کے اسالیب کی نقالی، اودھ پنچ کے عہد کی ناٹک بازی، داستانوں کے قالب میں نئی زندگی کی مسنوں طرازی ــــــ پھر سفرناموں اور ترقی پسند شعر و ادب کی پیروڈیوں تک اگر تلاش و تحقیق سے کام لیا جائے تو اس صنف کا قابل قدر خزانہ ہاتھ آسکتا ہے۔ لیکن بقول غالب ع

ہم پکاریں اور کھلے، یوں کون جائے؟

(اسکالر)

دیوان افسر

قاضی عبدالودود

مصحفی کے تذکرۂ ہندی میں ہے: "افسر غلام اشرف ولد غلام رسول کہ در مرثیہ و سلام اشرف تخلص میکند و در شعر افسر قرار دادہ۔ قوم شیخ، بزرگانش چودھری کارخانۂ بادشاہی بودہ اند۔ مشارٌ الیہ۔۔ زیک دو سال فکر مرثیہ و سلام۔۔ کردہ، میکند۔ درایامیکہ مولف طرح مشاعرہ انگندہ، دراں روزہا ہترعنیب فقیر مجموع پنج غزل طرحی مشاعرہ گفتہ از نظر فقیر گذرانیدہ۔ طبعش مناسبت تمام بدرستی کلام دارد۔" تذکرۂ مذکور کا زمانۂ آغاز اواخر ۱۲۰۸ھ ہے اور یہ ۱۲۰۹ھ میں انجام کو پہنچا؛ یہ فیصلہ کہ افسر کا ترجمہ کس سال حوالۂ قلم ہوا مشکل ہے۔ افسر نے اپنے دیوان میں دو جگہ مصحفی کو یاد کیا ہے۔

جہاں میں مجتمع بائیس جلدیں کر کے رحلت کی   اے افسر مصحفی شاعر بڑا استاد کامل تھا

رو برو کس کے غزل اپنی پڑھوں اے افسر   مصحفی سا کوئی محفل میں جو استاد نہ ہو

دیوان افسر میں مصحفی کی ایک غزل (مصرع ا "برق گلشن میں جو چمکی ترے رخساروں سے") کا مخمس ہے، اور ان کی وفات کا قطعۂ تاریخ (مادہ "مصحفی نے سجا مقام بہشت" ۱۲۴۰ھ)۔ افسر کا سال رحلت معلوم نہیں، لیکن، روشن الدولہ کی وزارت کے زمانے میں ان کا زندہ ہونا ثابت ہے۔ کتب خانۂ خدا بخش کا نسخۂ دیوان فی الحال ۱۰۹ اوراق (مسطر ۱۵ سطری، بعض صفحات سادہ) پر مشتمل ہے؛ ورق ا کے بعد کے بعض اوراق غائب ہیں۔ کاتب کا نام اور زمانۂ کتابت اس نسخہ میں درج نہیں، لیکن قرینہ ہے کہ افسر کے دوران حیات میں لکھا گیا تھا۔ دیوان کے کل مصرعوں کی مجموعی تعداد ۳۷۴۵ ہے (اس کا امکان ہے کہ اس میں دس پانچ کی غلطی ہو) مثنوی ۶۴۶، قصیدہ ۶۷۸، غزل ۲۵۹۲، ترکیب بند ۱۸۲، مخمس ۳۲۵، قطعہ ۲۴، رباعی دوبیتی قطعات جو دیوان میں زیر عنوان رباعی درج ہیں ۲۶۔ مثنویاں ۸ ہیں، پہلی میں ایک غم انجام واقعہ نظم ہوا ہے، اس کی تاریخ تصنیف افسر نے "کشتۂ معشوق" (۱۲۴۱ھ) سے نکالی ہے جو بیت ۳۹ میں ہے۔ ورق اب میں جو اس کے ۶ ابیات ہیں ان میں سے ۳ اور مثنوی کی بیت آخر حسب ذیل ہے:

عطا کر لطف سے اپنے الٰہی   مجھے ملک سخن کی بادشاہی

سکندر کا علم میرا علم کر   قلم و سب مرے زیر قلم کر

وہ دے علم و ہنر کا تاج مجھ کو   کہ کیکاؤس بھیجے باج مجھ کو

بفیض روح مولانائے جامی   ملے اس مثنوی کو خوش کلامی

اس کے موجودہ ابیات کی تعداد ۴۰ ہے، اور اس کے ساتھ ایک رنگین تصویر بھی ہے، مثنوی دوم مناجات ہے (ابیات ۴۵)، بیت اول و آخر

الٰہی ترا جز ہے ہر اک بسیط   تری ذات ہے کل شیٔ محیط

بس افسر سمند مناجات تھام   اجابت کا مالک ہے رب انام

اس مثنوی کا شعر ذیل ان کے شیعہ ہونے پر مشعر ہے:

بحق دہ و چار معصوم پاک   مرا جسم کر گوہر تابناک

مثنوی سوم (ابیات ۴۴) کا عنوان "ڈھیلہ و پتہ" (کذا) ہے اس میں ڈھیلے اور پتے کا مکالمہ ہے، بیت اول و آخر:

نہ ہے صنعت خاک آباد خلق   کیا جس نے ڈھیلے پہ ایجاد خلق

دلا ختم بس اب یہ تقریر کر   نہ اہل سماعت کو دلگیر کر

مثنوی چہارم (ابیات ۴۴) "عرضی درفرمایش شخصے سکندر نامی برائے شاہ زمن" (غازی الدین حیدر) بیت ۱ :

پیر و مرشد قبلۂ اہلِ جہاں — مہر اوج حشمت وگردوں مکاں

مثنوی پنجم (ابیات ۳۲) بھی اسی نوع کی ہے، کسی مجہول الاسم شخص کی فرمایش پر کہی گئی تھی بیت اول :

رائے صاحب فیض بخش انس وجاں — نسخۂ اکرام فیاض زماں

چھٹی، ساتویں اور آٹھویں مثنویاں بطور مکتوب ہیں : ۶۔ بنام احمد علی خاں (ابیات ۱۴) انھیں افسر نے مصحفی کا دیوان دوم بھیجا تھا، اس کا ذکر ہے، ۷۔ نام مکتوب الیہ مرقوم نہیں (ابیات ۱۵) بیت اول و ابیات آخر :

اے نہال سبز باغ دوستی — تازہ ہے تم سے دماغ دوستی

خط کیا ہندی میں اس باعث رقم — ربط ہیگا فارسی سے تم کو کم

لیکن اے مشفق کرم فرما شتاب — وقت فرصت بھیجنا اس کا جواب

۸۔ یہ بھی مثل ۷ (ابیات ۱۹) ابیات اول وآخر :

گل خندان گلستان محبت (کذا) — نہال سبز بستان محبت

بس آگے کیا کروں احوال تحریر — ترے مضمون الفت کی ہے تقریر

قصیدے ۶ ہیں : ۱۔ مدح حضرت علی (۷۵ ابیات) بیت اول :

چرخ پیمبر میں سمجھو نہ چمکتے اختر — بہر سوز جگر خلق بھرے ہیں اخگر

۲۔ مدح روشن الدولہ (۴۶ ابیات) بیت اول :

اٹھا جو آج عذار سحر سے شب کا حجاب — سروش باد صبا نے کیا یہ مجھ سے خطاب

۳۔ مدح غازی الدین حیدر (ابیات ۹۸) بیت اول :

صبح پراں جو ہوا طائر خورزریں بال — ہاتف دل نے کہا مجھ سے کہ اے نیک خصال

۴۔ ممدوح کا نام درج نہیں (ابیات ۲۴) بیت اول :

ہوا جو خواب سے میں آج صبحدم بیدار — سروش غیب نے آکر دہیں کیا اظہار

۵۔ مدح روشن الدولہ (ابیات ۲۷) بیت اول :

صبحدم ذہن رسا بلبل باغ تقریر — پایۂ عرش کی لیتی ہے خبر جس کی صفیر

۶۔ تہنیت خلعت روشن الدولہ (ابیات ۲۹) بیت اول :

روشن الدولہ بہادر دیکھ تیری نالکی — اغنیا سوگند کھاتے ہیں ترے اقبال کی

غزل کے ابیات اول وآخر اور کچھ دوسرے اشعار جو مختلف نقطہ ہائے نظر سے منتخب ہوئے ہیں درج ذیل ہیں :

حسن جہاں ہے عکس تری آب وتاب کا — دریا سے اتصال نہیں کس حباب کا

دست سیاہ ناز سے افسر بتان ہند — تاراج اپنا کشور اسلام کر چلے

شب ساقی مہوش کے کس ناز کرشمہ سے — اک ہاتھ میں شیشہ تھا اک ہاتھ میں پیمانہ

کیا خار الم دل پر کھٹکا جو ہیں بلبل نے — آغاز کیا گل کی فرقت کا شب افسانہ

افسر جو گلستاں میں نرگس کا میں شیدا ہوں — بھاتا ہے مجھے دل سے کس چشم کا شرمانا

خوباں فرنگ آتے ہیں خوش دل کو لے افسر — ہے جی میں ذرا کیجے لندن کا نظارا

بلبل کی طرح آنسو ہر چشم سے رواں ہیں — گو روں نے ملکِ دل کا غارت کیا جزیرہ
دار فانی میں اگر شاہ زمن ہوں تو کیا — ایک دن چھوڑ کے میں رنگ محل جاؤں گا
خفتگان خواب مضطر ہی نظر آئے بخواب — مر مٹے پر بھی گیا ہرگز نہ دل کا اضطراب [1]
خالی نہیں فساد سے یہ ساتوں آسماں — اک اک کی ہے بغل میں بھری فطرتیں ہزار
شاید صبا تری بولائی چمن کے اندر — پھولے نہیں سماتے گل پیرہن کے اندر
باتیں کرے ہے غیر سے ایہام میں تو کیا — آگاہ سیمبر ہیں تری زرگری سے ہم
شام جدا صبح کریں ہم آہ تڑپ کر اور کہیں — بزم طرب میں جلوہ کناں وہ شوخ ستمگر اور کہیں
طرفہ چلن اے ساقی مہوش تونے ہم سے نکالا ہے — شیشہ ہمیں خالی دکھلانا بھر کر ساغر اور کہیں
وعدہ وصل تو کرتے ہو ہم سے جان قدم اور ہے کہیں — زلفیں یاں سلجھاتے ہو بیٹھے دل الجھانے اور کہیں
خاکساروں سے مہ کیونکر اس ہمرا لوار کو ربط — سخت مشکل ہے زمیں سے آسماں ملنا نہیں
رخصت چمن کی جب نہ ملے نو بہار میں — کیا دل لگے پھر اپنا بھلا اس دیار میں
فصل خزاں میں دیکھا نقشہ عجب چمن کا — نہ گل پہ بلبلوں کی شیریں مقالیاں ہیں
شور جنوں جہاں سے گم ہے برنگ عنقا — ویراں ہیں قید خانے زنجیر خالیاں ہیں
سوگند ہے صبا مجھے بلبل سے بات کی — کب میں نے اس چمن میں کسی گل سے بات کی
لکھنؤ سے اٹھ گیا وہ آصف دوراں کہ لوگ — نام پر آتے تھے جس کی ہفت کشور سے چلے
جن کی خدمت میں بسر کرتے تھے اوقات کبھی — ان سے ہوتی نہیں اب اپنی ملاقات کبھی
کہتے تھے ہم کہ دل نہ لگا ایسے شخص سے — رکھتا ہے کوئی چشم وفا ایسے شخص سے
داغ نہ تا نہ دو کوئی مر کے مجھے چراغ سے — کلبۂ غم میں روشنی ہے مرے دل کے داغ سے
سبزۂ گلشن کیوں آنکھوں میں نشتر خار کی صورت ہے — ہجر میں کس گلرو کے اپنی بلبل زار کی صورت ہے
کوٹھیاں دل کی لٹیں دیکھیے اب کس کس کی — آج نیلام میں اک ماہ فرنگ آتا ہے
لوٹ لیتا ہے ملک استنبول — پان جب وہ صنم چباتا ہے
تڑپ کر شام سے بیمار تیرا صبح کرتا ہے — نہ پوچھا تو نے کیا صدمہ ترے دل پر گزرتا ہے

ترکیب بند بعنوان "ہفت بند" مدح حضرت علی میں ہے، بیت اول جو افسر کے شیعۂ غالی ہونے پر دال ہے:

السلام اے از ازل ہمنام رب العالمیں — دے امام اول و ہمتائے ختم المرسلیں

مخمس ۸ ہیں، قوسین میں بندوں کی تعداد اور مخمس کا مصرع سوم درج ہے۔ ۱۔ غزل افسر (۹ "باغ آفاق میں کوئی ایسا سخی") ۲۔ ایضاً (۵، ۱ "کچھ ہمارے درد سے آگاہ بطلیموس ہے") ۳۔ غزل مصحفی اس کا ذکر ہو چکا ہے ۷ بند۔ ۴۔ غزل سودا (۸ "ساون کے بادلوں کی طرح سے بھرے ہوئے") ۵۔ ایضاً (۶ "بلبل نے جسے جا کے گلستان میں دیکھا" ۶۔ ایضاً ("بلبل کو کیا تڑپتے میں دیکھا چمن سے دور" ۵) ۷۔ غزل میر (۷، "تا بمقدور انتظار کیا") ۸۔ ("خانۂ حسرت دغم ہو وطن غیبت گو" ۸)

بدگماں اس لئے نہ آقا ہی کیے نوکر سے — باپ سے بیٹے لڑیں بیٹی لڑے مادر سے
تفرقے اس نے کیے لاکھ زن و شوہر سے — رام نے جس گھڑی سیتا کو نکالا گھر سے

(بقیہ صفحہ ۳۴ پر)

[1] دیوان میں مرقوم ہے کہ یہ مصرع سعادت علیخاں کا ہے۔

مصطفیٰ زیدی

(اردو کا ایک بیباک، نڈر اور طنّاز شاعر)

ڈاکٹر محمد باقر

آپ بھی ناراض ہوں گے اور شاید مصطفیٰ زیدی بھی کیوں کہ ان سطور (جنھیں لکھتے لکھتے میں ایک مضمون بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں) میں آپ کو ایک بھی تو ملکی اور غیر ملکی بڑا نام نظر نہیں آئے گا جس کی شاعری کا مقابلہ میں نے زیدی کے اشعار سے کیا ہو۔ حالانکہ زیدی کو پڑھتے ہوئے میرے صفحۂ ذہن پر معاصر اشعار کے ایسے درجنوں بت ابھرے جو زیدی کے اشعار سے ٹکر لینا چاہتے تھے۔ لیکن میرے قلب و نظر کا تقاضا تھا کہ لذت کے اس احساس فراواں کو محفوظ رکھا جائے جو زیدی کے شعر پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ جب زیدی کے اشعار کی لذیذ حکایت بیان ہو تو بات اس کے اشعار تک ہی محدود رہے لہٰذا آپ کو اس قسم کی تنقید و تحسین سے اگر پہلے سابقہ نہیں پڑا تو اب ملاحظہ فرمالیں۔ آپ کی تنقید میرے علم میں اضافہ کرے گی۔

بات یوں ہوئی کہ مری کی ایک سہانی شام کو (غالباً ۱۹۵۹ء میں) مری لٹریری یونین نے میونسپل لائبریری ہال میں حسب معمول ایک مشاعرہ کیا۔ میں بھی سامعین کی حیثیت سے مدعو تھا۔ ہال میں پہنچا تو دیکھا کہ ایک جدید وضع کا خوش پوش نوجوان چشمہ لگائے صدارت کے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ مقامی سب ڈویژنل مجسٹریٹ ہیں اور نام مصطفیٰ زیدی ہے۔ ابھی چند شاعروں نے اپنا کلام سنایا ہی تھا کہ صدر کسی اور مصروفیت کی وجہ سے جلسہ سے رخصت ہونے کے لیے اٹھے۔ لوگوں نے اصرار کیا۔ اپنا کلام سنائیے۔ مصطفیٰ زیدی صاحب نے اپنی ایک نظم کا حصہ پڑھ دیا۔ میں حیران ہو کر سن رہا تھا کہ اردو میں اس قسم کی نظم بھی لکھی جا رہی ہے! اسے میری ناواقفیت پر محمول کر لیجیے لیکن یہ حقیقت تھی کہ فارسی سے مستعار لے کر گل و بلبل کے قصے سننے سنانے والی زبان میں پہلی دفعہ میں نے ایسے شعر سنے جن کی مثال مجھے پہلے کہیں نظر نہ آئی تھی۔ لوگوں نے ہل من مزید کے نعرے تو بہت لگائے لیکن صدر یہ جا وہ جا کرسی صدارت خالی چھوڑ کر چل دیے۔ اور میں ابھی اپنے تاثرات کو مجتمع بھی نہ کر پایا تھا کہ ہجوم (مشاعروں میں اکثر ہجوم ہی ہوتا ہے) نے خالی کرسی پر مجھے بٹھا دیا۔ مشاعرہ ہوتا رہا اور شاعر داد و بیداد کے شکار ہوتے رہے۔ لیکن میں سارا وقت یہ سوچتا رہا کہ کاش مصطفیٰ زیدی صاحب کچھ دیر اور پڑھتے بلکہ صرف وہی پڑھتے رہتے تو یہ محفل کتنی پر لطف ہوتی۔ اور پھر یہ کہہ کر دل کو تسکین دے لی کہ کبھی موقع ملا تو صرف مصطفیٰ زیدی کو سنیں گے۔ اس طرح کاہش خلش ایک آرزو بن کر دل میں بیٹھ گئی۔

زیدی صاحب کو سننے کی آرزو تو کئی سال تک پوری نہ ہوئی لیکن اب وقتاً فوقتاً ان کے اشعار مختلف جرائد میں نظر آنے تو میں خاص انہماک سے ان کا مطالعہ کرتا۔ بلکہ بعض چیزوں کو بار بار پڑھتا کہ اس سے تفہیم و تحصیل لطف میں ہر بار کے مطالعہ سے اضافہ ہوتا۔ اور پھر ایک دن مجھے "روشنی" "شہر آذر" اور "موج مری صدف صدف" یعنی زیدی صاحب کی تینوں کتابیں مل گئیں۔ یہ زیدی صاحب کا عطیہ تھا۔ جو ایک خط کے جواب میں مجھے ملا۔ پھر میری درخواست پر آپ نے زیر چاپ مجموعۂ اشعار "گریبان" بھی مجھے بھجوایا۔ کہاں تو زیدی صاحب سے چند شعر سننے کی آرزو تھی اور کہاں کامل زیدی اب میرے سامنے تھا۔

معلوم ہوا کہ مصطفیٰ زیدی ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ میں نے خود اسی سال بی اے پاس کیا تھا۔ زیدی صاحب نے الہ آباد سے انگریزی کا ایم اے کیا۔ اور پھر ۱۹۵۱ء میں پاکستان تشریف لے آئے۔ پہلے اسلامیہ کالج کراچی اور پھر کچھ مدت پشاور یونیورسٹی میں پڑھاتے رہے۔ ۱۹۵۴ء میں پاکستان سول سروس میں منتخب ہوئے اور اس وقت سے اب تک مختلف اداری عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ ۱۹۵۹ء میں انھوں نے یورپ اور شرق اوسط کا طویل سفر کیا۔ یہ بتانا اس لیے ضروری ہے کیونکہ آپ کے اشعار کے سلسلہ میں اس واقعہ کا حوالہ پیش خدمت ہوگا۔ مجھے اس سے زیادہ حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

زیدی کا پہلا مجموعۂ شعر "روشنی" کا دوسرا اڈیشن میرے سامنے ہے جو غالباً ۱۹۶۰ء میں چھپا ہے۔ اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۴۹ء میں الہ آباد سے شائع ہوا

تھا۔ تازہ اشاعت میں کچھ ترمیم اور اضافہ کیا گیا ہے۔ اور اب اس میں ۴۵ غزلیں اور نظمیں ہیں۔ لیکن یہ سب کی سب ۴۵ء اور ۵۰ء کے درمیان کی تخلیق ہیں۔ زیدی کا اپنا خیال ہے کہ یہ طالب علمی کا زمانہ تھا جب محض تجربے کے لیے آدمی بڑی بڑی تحریکوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ جب متوقع باتیں غیر متوقع طور پر ہوتی رہتی ہیں اور جب نئے جذبات کی آہٹ سے سارا وجود سنسناتا رہتا ہے:

ایک سرکش امنگ سینے میں   اس طرح اپنا سر اٹھاتی تھی
اس کے نم عارضوں کے سائے میں   اس کی سانسوں کی آنچ آتی تھی   (روشنی ص ۳۸)

یا یہ کہ:

دلِ ناداں نے چمکتی ہوئی تاریکی کو   اپنے معیار کی ظلمت کا اجالا سمجھا
ہائے وہ تشنگیٔ ذہن و تمنا جس نے   جب کبھی صحرا پہ نظر کی اسے دریا سمجھا   (روشنی ص ۷۵)

لیکن اس تشنگیٔ ذہن کے باوجود زیدی نے کبھی کبھی قلب و نظر میں وہ ہم آہنگی محسوس کی ہے کہ اسے اپنے محبوب شہکار کی بات کہتے ہی بنی ہے۔ اور اس کی تجسیم اس نے یوں کی ہے:

تیری نظروں میں روایات کی سلمائیں ہیں   جیسے بچوں کی بنائی ہوئی بازار کی بات
جیسے پربت کی بلندی سے زمیں کے مینار   جیسے اک حلقۂ الحاد میں اذکار کی بات
تیرے لہجے کی کھنک تیری نندائی آنکھیں   جیسے اک ناؤ پہ اس دیس کی اس پار کی بات
چونکتی صبح کی چہرے پہ خمارِ یک شب   چاندنی رات میں خیام کے اشعار کی بات
یوں لپکتی ہوئی چہرے پہ حیا کی تنویر   جیسے اقرار زدہ ہونٹوں پہ انکار کی بات
جیسے نکھرے ہوئے اشعار کی تخلیق کے وقت   ذہنِ شاعر میں خیالات کی رفتار کی بات
جس کو چھو بھی نہ سکے کوئی سمجھ بھی نہ سکے   اتنی نازک ہے ترے روپ ترے پیار کی بات
لکھ سکا کون سا ہومر ترے شہکار کی بات   (روشنی ص ۴۳)

شیلے اور ہومر کو شہکار کی بات نہ لکھ سکنے کے قابل ہوں اگرچہ زیدی خود اس کی نہایت حسین و جمیل تفسیر پیش کر گیا ہے۔ اور یہی اس کی فنکاری کا کمال ہے۔ جس کی بنیاد ”روشنی“ سے لے کر ”گریبان“ تک صرف خلوص پر رکھی گئی ہے۔ وہ جو کچھ محسوس کرتا ہے اسے نہایت دیانتداری سے شعر کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ لہٰذا آپ اس کے جذبات سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن ان جذبات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوتے ہوئے دیکھ کر آپ اس پر حرف گیری نہیں کر سکتے۔ باور نہ ہو تو اس نظم کو سن لیجیے۔ بات معمولی سی ہے۔ ہر محب پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے کہ محبوب التفاتِ فراواں کے بعد کبھی کبھی یہ انداز اختیار کرتا ہے جیسے وہ محب کو جانتا ہی نہ تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ قدیم شعرا کے ہاں دن کو ”گریہ زاری“ اور رات کو ”اختر شماری“ ہوا کرتا تھا۔ اور قاری اس حادثے کی غم انگیز تفاصیل سنتے سنتے اکتا جاتا تھا لیکن زیدی کے ہاں یہ سانحہ صرف اس قسم کی حیرت اور تعجب پیدا کرتا ہے جو بالکل طبعی ہے۔ ہاں ان میں کبھی کبھی بیتے ہوئے دنوں کے التفاتِ فراواں کی یاد کی کسک ضرور شامل ہو جاتی ہے اور وہ بے اختیار ہو کر پکار اٹھتا ہے۔

آج تو مڑ کے بھی اس نے نہیں دیکھا ساقی   ورنہ اس راہ پہ ذرات ہیں پامال جہاں
اس کی آنکھوں میں تھی انجان ستاروں کی تلاش   کھیلتے گھومتے گلکار نئے دھاروں کی تلاش
جھومتے ڈولتے خاموش اشاروں کی ”تلاش“   آج آنکھوں میں تڑپ تھی نہ اشارا ساقی
اب تو یہ فکر بھی بیکار ہے یہ غم بھی فضول   کہ اسے مجھ سے بہر طور محبت بھی نہ تھی
کہ اس الجھن کا سبب کوئی رقابت بھی نہ تھی   آج تو اس کی نگاہوں میں حقارت بھی نہ تھی
آج تو مڑ کے بھی اس نے نہیں دیکھا ساقی   (روشنی ص ۸۱، ۸۳)

لیکن یہ اندازِ تسکین تو صرف اپنا دل بہلانے کے لیے تھا۔ اور اس حیرت اور تعجب پر قابو پانے کے لیے جو اس سانحے نے پیدا کیا ہے ورنہ رقیب نے جو دراندازی کی تھی زیدی نہ صرف اس سے غافل نہیں، بلکہ اس کی پوری تفصیل رقیب کی زبان سے کہلواتا ہے۔

سنا تم نے زیدی کا کردار کیا ہے　　ثنا خوانِ ابلیس و بدخواہ یزداں
وہ خانہ بدوشِ زخانہ بدوشاں　　وہ آوارہ گردِ زآوارہ گرداں
وہ مصروفِ طاعت گذاریِ نغمہ　　وہ محوِ سجودِ نگارانِ رقصاں
وہ جس کا تکلم وہ جس کا ترنم　　حدی خوانیِ کاروانِ حسیناں
سلگتا ہوا خود فریبی کا بادل　　گرجتا ہوا جہل و وحشت کا طوفاں
نمازوں میں دیکھا نہ روزوں میں دیکھا　　نہ صبحوں کو خنداں نہ راتوں کو گریاں
کبھی انقلاب اور بغاوت کا شعلہ　　کبھی دودِ گرمِ دلِ نازنیناں
نہ اندازِ حکمت نہ آثارِ دانش　　فقط عکسِ مہ پاریِ مہ جبیناں
نہ لہجہ ہی ساکن نہ نغمہ ہی مدغم　　فقط برق و آتش فقط ابرو باراں
اسے کیا ثواب و طہارت سے مطلب　　وہ شاہِ صبوحی شہنشاہِ رنداں
یہی ہے تمہارے پجاری کا جتھا؟　　یہی ہے وہ سرکردۂ خوشہ چیناں
یہی ہے وہ شہ پارۂ آلِ سید؟　　یہی ہے وہ تفسیرِ خونِ شہیداں

یہی ہے وہ پروردۂ ابرو باراں؟

زیدی کے دوسرے مجموعے "شہرِ آذر" میں ۴۹ نظمیں اور ۲۰ غزلیں ہیں۔ اس مجموعے کا پہلا ایڈیشن جنوری ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا۔ گو زیدی کے بقول اس مجموعے میں جتنی نظمیں اور غزلیں بھی ہیں۔ میری نہیں ہیں بلکہ تیغ الہ آبادی کی ہیں۔ تیغ الہ آبادی اور میں اب سے کچھ عرصہ پہلے تک ایک ہی تھے لیکن آخر انھیں علیحدہ ہونا ہی پڑا۔ اس تخلص کی قصابیت کو میں نے بچپن کی غلطیوں میں شامل کر رکھا تھا لیکن آخر تخلص کے بغیر بھی گذر ہو ہی سکتا ہے۔ اپنی زندگی میں بھی تخلص کے علاوہ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ مصطفیٰ زیدی سے ابھی تک میں ہی مانوس نہیں ہوا ہوں۔ آپ کو تو شاید اور بھی مدت درکار ہو (شہرِ آذر ص ۱۹)۔ اس مجموعے کی نظموں پر شاعر نے خود یہ تبصرہ کیا ہے کہ ان نظموں میں دیکھنے سے زیادہ سوچنے اور چھونے سے زیادہ محسوس کرنے کا رجحان نظر آتا ہے۔" اور یہ تبصرہ نہایت درست ہے۔ سوچ اور حس کرنے کا کامیاب تجربہ "تہذیب" کی مختصر سی نظم میں کیا گیا ہے۔

تہذیب

شہر میں غل تھا کہ بنگال کا ساحر آیا
مصر و یونان کے اہرام کا سیّاح عظیم
چین و جاپان کے افکار کا ماہر آیا
ایک ٹیلے پہ مروّت کا نمونہ دیکھا
میں نے بھی دل کے تقاضوں سے پریشاں ہو کر
آخر اس ساحرِ طنّاز کا چہرہ دیکھا
کتنا مغرور تھا اس شخص کا مضبوط بدن
کتنا چالاک تبسم تھا جواں ہونٹوں پر
کیسے رہ رہ کے لپک جاتی تھی آنکھوں میں کرن

کتنا مرعوب تھا ہر فرد مری ملت کا
ڈرتے ڈرتے جو ٹٹولا میں نے تو یہ راز کھلا
وہ فقط موم کا اک خوف زدہ پتلا تھا

نظم کے آخری تین مصرعوں میں وہ سب کچھ سما گیا ہے جو فکر شاعر نے تخلیق کیا ہے اور جسے پڑھنے کے بعد آپ اس تمثیل کی تمام تفاصیل کو محسوس کرنے لگتے ہیں اور شاعر کے ہمنوا ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ سوچ تو ہم بھی یہی رہے تھے لیکن کہنے کی جرأت صرف تمہیں نصیب ہوئی ہے۔ مہذب آدمی تہذیب کی باتیں اسی انداز سے کہا کرتے ہیں جیسے زیدی نے اس نظم میں کی ہیں لیکن حوادث فکر کبھی کبھی شاعر کو اس ڈگر پر بھی لے آتی ہے جہاں وہ برملا کہنا شروع کر دیتا ہے :

آج کل رنگ و صباحت کی بہت قیمت ہے	آج کل جشن و مسرت کی بہت قیمت ہے
مفلسی دھات کے سکوں کو جنم دیتی ہے	زندگی موت کے چھلکوں کو جنم دیتی ہے
ردائیں تہذیب کے شعلوں سے جھلس جاتی ہیں	کونپلیں ریل کے پہیوں میں کچل جاتی ہیں
قہقہے جلتے ہوئے گوشت کی بو دیتے ہیں	اسپتالوں کو جراثیم نمو دیتے ہیں
خون بھی ملتا ہے ہوٹل میں رگ تاک کے ساتھ	عمداً زہر دیا جاتا ہے خوراک کے ساتھ
اسی منڈی میں جہاں صاف کفن بکتا ہے	جسم بکتے ہیں ادب بکتا ہے فن بکتا ہے
عشق بیسوں کی ترازو میں تلا کرتا ہے	حسن تیزاب کی بوتل سے ڈھلا کرتا ہے

(شہر آذر ص ۴۲)

زیدی کی یہ نظم ایک طویل آس انگیز شکوائیہ ہے لیکن انہی چند اشعار کو دیکھیے کہ ان میں کتنی تفاصیل آ گئی ہیں اور ان تفاصیل کا کینوس کس قدر وسیع ہے۔ پھر اس کینوس پر آپ کو ہر طرف طنز و تنقید کے تیر و نشتر بھی چلتے نظر آ رہے ہیں۔ لیکن میں نے اس نظم کو آس انگیز شکوائیہ کہا ہے۔ حزنیہ نہیں کہا کیونکہ خون انگیزی کی بجائے بات اس امید افزا ترغیب پر ختم ہوئی ہے :

آؤ ہم لوگ بھی ایک عزم سے اک ہمت سے	اپنے بیتے ہوئے حالات کو ٹھکرا کے چلیں
اپنی فرسودہ روایات کو ٹھکرا کے چلیں	وقت کی ریت پہ وہ نقش قدم چھوڑ چلیں

جن کی آتی ہوئی نسلوں کو ضرورت ہوگی

(شہر آذر ص ۴۷)

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے حقیقت پسندی اور برملا گوئی زیدی کا خاصہ ہے۔ امن پسندی اور ان کی ترغیب دلانے والے : عنظ تو آپ نے کئی سنے ہوں گے، لیکن زیدی نے امن شکستگی کی جو ہیبت ناک بھیانک تصویر کھینچی ہے اس کو سننے کے بعد آپ کے رونگٹے اگر کھڑے نہیں ہوتے تو جنگ سے نفرت ضرور پیدا ہوتی ہے۔

اگر کہیں پھر یہ آگ لپکی
تو اس کی زد سے ہماری تہذیب کی بہاریں نہ بچ سکیں گی
تمہیں تو یہ بات یاد ہوگی۔
کہ دوسری جنگ ہی میں پانی کے بدلے کیچڑ پیا گیا ہے
غذا کے بدلے سپاہیوں کو نجاستیں پھانکنی پڑی ہیں
ہزاروں مائیں جوان بچوں کے واسطے خون رو چکی ہیں
شکستگی بے بسی میں چمڑے کی پیٹیاں چباتی پڑی ہیں
ضعیف باپوں کے تھرتھراتے ہوئے قدم در پہ ٹیکے ہیں

سہاگنوں کی نگاہیں دولہا کی واپسی کو ترس چکی ہیں
سسکتی بہنوں نے بھائیوں کو کفن پہنا کے جدا کیا ہے۔　　　(شہر آذر ص ۹۵)

یہ پچھلی جنگ کی بات تھی۔ آئندہ کیا ہوگا۔ وہ بھی سن لیں:

اگر پھر اس بار جنگ ہوگی
تو آدمیت نکیلے بوٹوں کی ٹھوکروں سے لرز اٹھے گی
تمہارے گھر کے برآمدے میں شکستہ اینٹوں کے ڈھیر ہونگے
تمہارے شوہر کا سینے کی گولیوں سے فگار ہوگا
تمہارے چہرے پہ دانتوں کے نیل ہوں گے لب پہ خراش ہوگی
تمہارے چولھے میں لکڑیوں کے عوض تمہارا بدن جلے گا
تمہاری اپنی زمیں جلے گی تمہارا اپنا وطن جلے گا　　　(شہر آذر ص ۹۹)

اور پھر

یہ بات تم تک نہیں رہے گی
یہ زہر دھرتی کی ایک اک نس میں گھل کے ہر جڑ کو کاٹ دے گا
یہ زہر رگ رگ کو چاٹ لے گا
زمین گیہوں نہیں جنے گی
کہ اس کے ہونٹوں پر آدمی کے لہو سے پپڑی جمی ہوئی ہے
ملوں میں کپڑا نہیں بنے گا
کہ تکلیوں کو گھمانے والوں کی انگلیاں کاٹ دی گئی ہیں
ادب کا نام و نشان نہ ہوگا
کہ درسگاہوں میں گدھ مدرس کی لاش سے خون پی رہے ہیں
کہیں تقدس نہیں رہے گا
کہ شاہراہوں پہ فوج کے روسیاہ کتے زنا کریں گے　　　(شہر آذر ص ۹۹)

۱۹۵۰ء کا ذکر ہے میں حکومت پاکستان کی طرف سے دسمبر میں لاہور میں منعقد ہونے والی اسلامی نمائش کے لیے ایران اور ترکیہ سے نوادر مستعار لانے کے لیے بھیجا گیا۔ اس سفر کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ میونک (جرمن) میں کنگرۂ مستشرقین میں شرکت کروں۔ اگست ۵۰ کی ایک شام کو میں اور جمیل رضوی صاحب (جواب مسٹر جسٹس جمیل حسین رضوی ہیں) میجر جنرل رضا صاحب سفیر کبیر پاکستان در ایران کے مکان پر تہران میں کھانے پر مدعو تھے کہ خبر ملی کہ ایک پاکستانی مجتبیٰ زیدی خراساں میں مشہد کے قریب موٹر کار کے حادثے میں ہلاک ہوگئے ہیں۔ یہ انگلستان سے اپنی کار میں وطن واپس آرہے تھے اور اس کار کی ٹکر ایک بس سے ہوگئی۔ اس خبر سے ہمیں اور ہمارے میزبان کو بہت رنج ہوا اور تہران کے پاکستانی حلقوں میں کئی دن تک اس پر غم کا اظہار ہوتا رہا لیکن مصطفیٰ زیدی نے جب مجھے اپنے اشعار کا مجموعہ "موج مری صدف صدف" بھیجا جس کا انتساب انھوں نے اسی حادثے میں ہلاک ہونے والے بڑے بھائی کے نام سے کیا ہے تو اسے پڑھ کر پھر ایک دفعہ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یہ نامکمل نوحہ خلوص و صداقت کا ایک نادر نمونہ ہے:

تم کہاں رہتے ہو اے ہم سے بچھڑنے والو　　　ہم تمہیں ڈھونڈنے جائیں تو ملوگے کہ نہیں
ماں کی ویران نگاہوں کی طرف دیکھو گے　　　بھائی آواز اگر دے تو سنو گے کہ نہیں

دشتِ غربت کے بھلے دن سے بھی جی ڈرتا ہے — کہ وہاں کوئی نہ مونس نہ سہارا ہوگا
ہم کہاں جشن میں شامل تھے جو کچھ سن نہ سکے — تم نے ان زخموں میں کس کس کو پکارا ہوگا
ہم تو جس وقت بھی جس دن بھی پریشان ہوئے — تم نے آکر ہمیں محفوظ کیا راہ دکھائی
اور جب تم پہ برا وقت پڑا اب ہم لوگ — جانے کس گھر میں کہاں سوئے ہوئے تھے بھائی

(۲)

ہم تری لاش کو کاندھا بھی نہ دینے آئے — ہم نے غربت میں تجھے زیرِ زمیں چھوڑ دیا
ہم نے اس زیست میں بس ایک نگیں پایا تھا — کسی تربت میں وہی ایک نگیں چھوڑ دیا

رقت انگیزی صرف نالہ و شیون اور آہ و بکا سے سرانجام نہیں پاتی۔ اور انفرادی غم کو عالمگیر وسعت دینا ہر غمزدہ کے بس کی بات نہیں لیکن جب آپ ان سطور کو پڑھتے ہیں:

دشتِ غربت کے بھلے دن سے بھی جی ڈرتا ہے — کہ وہاں کوئی نہ مونس نہ سہارا ہوگا
ہم کہاں جشن میں شامل تھے جو کچھ سن نہ سکے — تم نے ان زخموں میں کس کس کو پکارا ہوگا

تو بھائی کے تلملاتے ہوئے دل کی تمام کیفیات آپ کی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔

یہ ایک تعارفی جملہ تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ زیدی کا تیسرا مجموعہ کلام "موج مری صدف صدف" پہلی دفعہ فروری ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اور اس مجموعے کی اکثر نظمیں قیامِ انگلستان یا سفرِ یورپ کے زمانے کی ہیں۔ یہ چند خاکے جن سے شاعر کے بقول ذہن کی ایک خاص فضا مرتب کی جاسکتی ہے۔ یہ فضا اس معصوم رندی کی ہے جو ایک چیز کا مشاہدہ کرنے کے بعد کبھی اس پر تنقید کرتا ہے اور کبھی اس سے محظوظ ہوتا ہے لیکن اس میں ڈوب کر نہیں رہ جاتا۔ یہ سب نظمیں وہ تاثرات ہیں جن کو ایک مخصوص جذبے کے ساتھ جذباتیت سے اوپر اٹھ کر نظم کیا گیا ہے۔ جن لوگوں نے کسی یورپی شہر کے ہما ہمی کے مراکز کو دیکھا ہے اور انھیں دیکھتے رہنے کے بعد ایک خاص قسم کے ذہنی دنیا میں بسایا ہے کچھ وہی لوگ "چیرنگ کراس" کے ایک منظریہ بند اور ایک جذباتی بند کے تاثرات کو محسوس کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ تاثرات ان کیفیتوں کی عکاسی کرتے ہیں جن کا اثر تو غالباً ہر چشم ناظر قبول کرتی ہے۔ لیکن صفحۂ قرطاس پر تاثر کی حقیقی شدت کے ساتھ منتقل نہیں کر سکتی۔ یہ کام صرف شاعر ادیب اور آرٹسٹ ہی بخوبی سرانجام دے سکتے ہیں اور زیدی اس نظم میں بیک وقت ان تمام فرائض سے عہدہ برآ ہوا ہے:

کوئی تم سے پوچھے —
ستاروں کی رونق، چراغوں کی قربت، شبستاں کے اسرار
کافی نہیں تھے
جو تم نے کسی طاقِ دل سے لرزتی ہوئی موم بتی کی لو
کبھی چرالی؟

کوئی ہم کو دیکھے —
سرِ رہگذر ایسے بیٹھے ہیں جیسے
کسی نے ذرا بھی جو پوچھا تو اس سے بگڑ کر کہیں گے
یہ دیر و حرم تو نہیں، کعبہ و آستاں تو نہیں ہے
خدا کی زمیں ہے، رہ عام ہے کوچۂ یارِ نامہرباں تو
نہیں ہے ——

یورپ کی پاپیادہ سیاحت (دراصل آپ موٹر میں سفر کر رہے تھے) میں زیدی نے بعض ملکوں اور شہروں کو اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے دیکھا ہے۔ جیسا کہ ہر سیاح کرتا ہے۔ لیکن اس مشاہدہ سے زیدی کے جذبات میں جو ہلچل پیدا ہوئی ہے وہ فلسفہ، نغمہ اور آرزو کا ایک سیل رواں بن کر نکلی ہے۔ جرمنی کی بات سنیے:

کتنے خوابوں کے طلسمات کی جنت ہے یہاں — کون سا خواب ابھی پردۂ تقدیر میں ہے
خواب اس وقت کا جو وقت نہیں آسکتا — خواب اس وقت کا جس وقت کو آنا ہوگا
گیت جس میں لب و رخسار کے افسانے ہیں — گیت جو خود بھی کبھی ایک فسانا ہوگا
جس کو چھیڑیں گے مہکتے ہوئے ہونٹوں کے گلاب — جس کو بت وقت کے آہنگ پہ گاتا ہوگا

آگ کے دشت بڑے خون کے صحرا آئے — اب بھی لیکن وہی رفتار رواں ہے کہ جو تھی
میونخ اب بھی ہر اک عہد کا روشن وارث — ہائیڈل برگ وہ حکمت کی دکاں ہے کہ جو تھی

فرض کرتے ہیں تری مرگ وہی لوگ جنھیں — خود نہ جینے کا سلیقہ ہے نہ مرنے کا شعور
تیرے ماتھے پہ نئے عہد نئے دن کی امنگ — تیری آنکھوں میں چمکتے ہوئے مہتاب کا نور
وگنر کا یہ سبک ساز یہ فولاد کے گیت — تیرے سینے کی امنگیں تیرے بازو کا غرور

ہم پیمبر تو نہیں ہیں ترے دیوانے ہیں — اک ذرا آگ ہمیں بھی ملے اے شعلۂ طور

جرمنی کا مقابلہ روضۂ شاہ شہیداں سے کیجیے، جس کے حضور میں شاعر کامل خشوع و خضوع کے ساتھ پہنچا ہے اور یہ دیکھ کر حیران ہے کہ ان قبروں کے مجاور اور یہاں کے منبر کے خطیب بھی ایران و کربلا کا رن میں آنے والے زائرین سے فلس و دینار کا بھیک مانگنے کے سوا کارزار حیات میں اور کوئی مہم سر نہ کر سکے۔ اس کی حیرت ایک نوحے کی شکل اختیار کرتی ہے:

غیر تو رمز غم کون و مکاں تک پہنچے — کربلا تیرے یہ غمخوار کہاں تک پہنچے
تیرے دیوانوں کو لے شاہ نہ دریائے فرات — اپنی بے مائگی ذہن میں کیا ملتا ہے (موج مری صدف صدف ص ۹۰)

یورپ کی سیاحت کے بیان کے علاوہ اس مجموعے میں جو رومانی اور علامتی نظمیں شامل ہیں ان میں ایک وہ تصویر جلتی ہوئی دکھائی گئی ہے جسے چاہنے والے نے ایک عرصے سینے سے لگا رکھا تھا۔ اس تصویر کو دیا سلائی دکھانے سے لے کر راکھ ہوتے ہوئے دیکھ کر جھنجھلائے ہوئے دل میں جو تاثرات پیدا ہوئے ہیں ان کو بڑی چابکدستی سے رومانی انداز میں نظم کیا گیا ہے:

آج وہ آخری تصویر جلا دی ہم نے
جس سے اس شہر کے پھولوں کی مہک آتی تھی — جس سے بے نور خیالوں پہ چمک آتی تھی

اس جھنجھلاہٹ کی جو حسین توجیہہ کی گئی ہے وہ بھی سن لیجیے:

اور اب یاد کے اس آخری پیکر کا طلسم — قصۂ رفتہ بنا زیست کی باتوں سے ہوا
دور اک کھیت پہ بادل کا ذرا سا ٹکڑا — دھوپ کا ڈھیر ہوا دھوپ کی باتوں سے ہوا
اس کا پیار، اس کا بدن، اس کا مہکتا ہوا رنگ — آگ کی نذر ہوا اور انہی ہاتھوں سے ہوا (موج مری صدف صدف ص ۴۷)

اسی مجموعے میں دو پُر تاثیر علامتی طنزیے "گواہی" اور "ایک سہرا" کے عنوانات سے شامل ہیں جن کا مطالعہ مفید ہوگا۔

زیدی کا جو تھا مجموعۂ کلام "گریباں" کے نام سے زیرِ چاپ ہے جس میں آپ کو تازہ ترین زیدی نظر آئے گا۔ اس کا خیال ہے کہ ادب عالیہ اس طرح تو جنم لیتا نہیں کہ خواہ مخواہ رزمیہ لکھا جائے یا عشق و عاشقی کے ذکر سے ارادی گریز کے راستے اختیار کیے جائیں۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر موضوع نکالنا اور تلاشِ عظیم کے بعد علامتیں وضع کرنا کوئی ایسی صحیح الدماغی کی بات نہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس مجموعے میں اس نے واردات قلب کو سیدھے سادے رومانی انداز میں بیان کر دیا ہے۔

تو مری شمعِ دل و دیدہ

وہ کوئی رقص کا انداز ہو یا گیت کا بول — میرے دل میں تری آواز ابھر آتی ہے
تیرے ہی بال بکھر جاتے ہیں دیواروں پر — تیری ہی شکل کتابوں میں نظر آتی ہے

شہر ہے یا کسی عیار کا پرہول طلسم — تو ہے یا شہرِ طلسمات کی ننھی سی پری
ہر طرف سیلِ رواں، بس کا دھواں ریل کا شور — ہر طرف تیرا خنک گام تری جلوہ گری

ایک اک رگ تری آہٹ کے لیے چشم براہ — جیسے تو آئے گی بس کوئی گھڑی جاتی ہے
تیری پرچھائیں ہے یا تو ہے مرے کمرے میں — بلب کی تیز چمک ماند پڑی جاتی ہے

ٹیک سڑکوں پہ چلیں جیپ کے آگے پیچھے — دن گزرتا ہے ترا سایۂ ابرو لے کر
فلسفے تند حقائق کی شعاعیں ڈالیں — شام آتی ہے تری آنکھ کا جادو لے کر

لنگر انداز ہوں ساحل پہ مشینوں کے جہاز — رات ڈھل جاتی ہے مہکے ہوئے گیسو لے کر
میں اسی گیس کی دنیا میں تعفن کے قریب — شعر کہتا ہوں ترے جسم کی خوشبو لے کر

اور اس عشق و عاشقی کی بات کے ساتھ ساتھ شاعر خودنگری اور فلسفہ سنجی میں بھی مصروف ہے۔

تجھ کو محصور کیا ہے مری آگاہی نے — میں نہ آفاق کا پابند نہ دیواروں کا

میں نہ شبنم کا پرستار نہ انگاروں کا — نہ خلاؤں کا طلبگار نہ سیاروں کا

زندگی ذہن کا میدان بنی بیٹھی ہے

اپنا سایہ بھی گریزاں ترا داماں بھی خفا — رات کا روپ بھی بیزار ترا غماں بھی خفا
صبحِ یاراں بھی خفا شامِ غریباں بھی خفا — زرد ایماں بھی خفا اور نگہباں بھی خفا

خود کو دیکھا ہے تو اس شکل سے خوف آتا ہے

ایک مبہم سی صدا گنبدِ افلاک میں ہے — تارۂ مایہ کی دامن صدچاک میں ہے
ایک چھوٹی سی کرن مہر کے ادراک میں ہے — جاگ اے روح کی عظمت کہ مری خاک میں ہے (گریباں کا خطی نسخہ)

آخر میں ایک حسین منظر بہ ملاحظہ ہو جس میں رفتار و احساسات کی تمام تفاصیل خوشگوار رومانی انداز میں پیش کی گئی ہیں۔
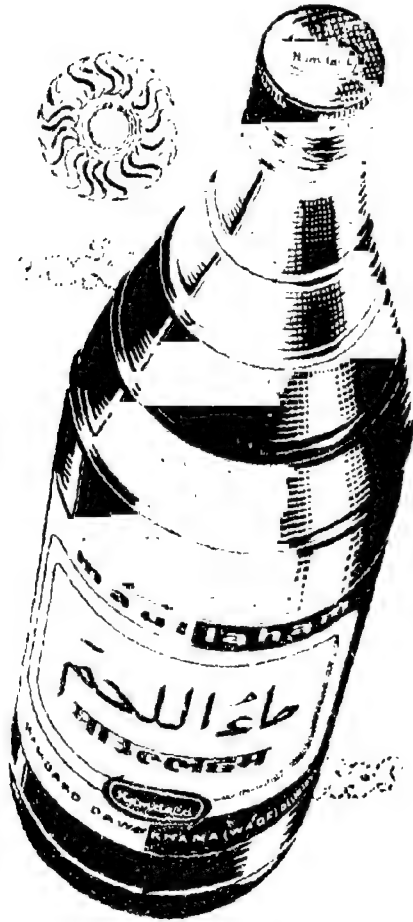
ایئر ہوسٹس

شہر کی روشنیاں کرمک آوارہ ہیں
نہ وہ ہوٹل کے دریچے نہ وہ بجلی کے ستون
نہ وہ اطراف نہ رفتار کا گم نام سکون
ہر گھڑی ساعت پرواز بنی جاتی ہے

سیکڑوں فیٹ تلے رینگ رہی ہو گی زمیں
کہیں پٹرول کے مرکز کہیں سڑکوں کا غبار
تار کے آہنی کھمبوں کی طرح راہ گزار
مختلف لوگوں کی آواز بنی جاتی ہے

تیرے لہجے میں ہے ترغیب کی یہ کیفیت
کرشمیوں کی فضا ساز بنی جاتی ہے
اے مرے دل کے دھڑکنے سے بہ ظاہر غافل
تیری صورت تری غماز بنی جاتی ہے
ہم سفر انجنیں گرم کیے بیٹھے ہیں
تو مرا سب سے بڑا راز بنی جاتی ہے

زیدی کا قلم ابھی جوان ہے۔ وہ کبھی کبھی پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے لیکن اس کے اپنے بقول "گریبان" میں اس کی محبت کے پیچھے جو عورت ہے وہ نہ تو "شہر آذر" کی آسیا گردان بتول ہے اور نہ "موج مری صدف صدف" کی مریم تنہا نشین"۔ اس موقع پر زیدی کی شاعری کے متعلق قطعی حکم لگانا درست نہ ہوگا صرف ایک امید لگائی جاسکتی ہے کہ خلوص و سادہ نگاری منازل کے ساتھ اور بڑھے گی اور چمکتی ہوئی شاعری کی اس لہر کو مزید تابانی بخشے گی۔

میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ یہ مضمون تحسین و تنقید جمال کے لیے مرتب نہیں کیا گیا ہے۔ صرف اس لذت فراواں کو مجتمع کرنے کے لیے جو زیدی کے کلام کے مطالعے سے حاصل ہوئی ہے۔ میں اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔ اس کا فیصلہ آپ کر سکتے ہیں۔

باغ وبہار کا ماخذ — نوطرزِ مرصّع

سید ابوالخیر کشفی

نوطرز مرصع باغ وبہار کا ماخذ ہے۔ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی چنداں ضرورت نہیں رہی۔ باغ وبہار کا سرورق اس حقیقت کا ثبوت ہے:

" باغ وبہار — تالیف کیا ہوا میر امن دلی والے کا ماخذ اس کا نوطرزِ مرصع کہ ترجمہ کیا ہوا عطا حسین خاں کا ہے۔ فارسی قصہ چہار درویش سے۔"

ہندوستان میں باغ وبہار کے جو ایڈیشن شایع ہوئے ان میں اس عبارت کی غیر موجودگی نے بڑا ستم ڈھایا اور غلط فہمیوں کو میر امن کے مقدمے نے زیادہ مضبوط بنایا۔ مولوی عبدالحق صاحب مرحوم دونوں کتابوں کے تقابلی مطالعے سے بجا طور پر اسی نتیجہ پر پہنچے:

" باغ وبہار جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے فارسی قصہ کا ترجمہ نہیں بلکہ اس کا ماخذ نوطرز مرصع ہے۔ بعض مقامات پر تو الفاظ اور جملے کے جملے وہی لکھدیئے ہیں جو نوطرز مرصع میں ہیں۔"

مولوی صاحب مرحوم نے ان دونوں کتابوں کے مشترک مقامات پر بڑی فاضلانہ بحث کی ہے جس سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ میر امن نے نوطرز مرصع کو اپنے سامنے رکھا نہ کہ اصل فارسی کو۔ مولوی صاحب کا مقدمہ باغ وبہار کے مطالعہ کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ میں اس بحث کو دہرانا نہیں چاہتا۔

میں اس بحث میں بھی پڑنا نہیں چاہتا کہ اصل فارسی کتاب کس کی تصنیف ہے۔ میرا تعلق تو باغ وبہار اور نوطرز مرصع کے باہمی تعلق سے ہے اور مجھے بیچارے تحسین سے ممتاز حسین صاحب کا یہ جملہ پڑھ کر خاصی ہمدردی ہوگئی ہے کہ "میر امن اور نوطرز مرصع کو اپنا ماخذ ٹھہرائیں۔ اور یہ معلوم اثر اس کا ایک جملہ تو درست ہے ہی نہیں۔"

میں تو اتنا جانتا ہوں کہ نوطرزِ مرصع شمالی ہند کی پہلی اہم اور مکمل اردو تصنیف ہے۔ نوطرزِ مرصع میں وہ اسلوب کلبلاتا ہوا نظر آتا ہے جس نے میر امن کی باغ وبہار کے صفحات پر آنکھیں کھولیں اور صفحہ بہ صفحہ اُن کے ذہن اور زبان کی فضا میں پرورش پاتا ہوا بالغ ہوگیا۔ اور "چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد" کے جذبہ کے تحت۔

دوستی میں ایک بات ممتاز صاحب سے بھی کہتا چلوں کہ حضرت! تحسین جیسے تھے، سو تھے مگر ایسا بھی کیا کہ وہ مجھ سے اور آپ سے بھی بری نثر لکھتے۔

حاشیہ میں ممتاز صاحب نے تحسین کا ایک جملہ نقل کیا ہے سوچتا ہوں کہ میں بھی ممتاز صاحب کے مقدمۂ باغ وبہار کا ایک آدھ جملہ یہ کہتے ہوئے پیش کردوں کہ "ملاحظہ ہو"۔

"...... اس لیے صوفیانہ شاعری اور آرٹ جس میں داستان گوئی بھی شامل ہے۔ سمبالک ہوتا ہے، یعنی ایک ہی معنی میں تخصیص وتعمیم کے دونوں پہلو رکھتا ہے نہ ایلیگاریکل جہاں تعمیم خصوص سے باہر ہوتی ہے ......"

اب ٹکڑے ملاحظہ ہوں ...... " یہ قصہ محمد شاہی عہد میں موضوع یا مخترع نہیں ہوا" "نیرنگیٔ روزگار مدرک صنایع وبدائع پروردگار" کہاں تک نمونے پیش کروں۔ ممتاز صاحب "علمیت" اور "علمی موضوع" کی بنا پر ایسی اردو لکھنے پر مجبور تھے اور تحسین بھی ایسے ہی دوسرے علائق کے اسیر تھے۔

اس طویل جملۂ معترضہ کے لیے معافی چاہتا ہوں آپ سے بھی اور ممتاز صاحب سے بھی۔

فارسی قصے کے بارے میں مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ میرے خیال میں قصہ چہار درویش نہ تو امیر خسرو کی تصنیف ہے اور نہ عہد محمد شاہی کی تخلیق۔

چہار درویش امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے۔ اس موضوع پر مرحوم پروفیسر شیرانی بڑی تفصیل سے داد تحقیق دے چکے ہیں۔ لیکن انھوں نے جو دعویٰ کیا ہے وہ بھی درست نہیں۔ چہار درویش حکیم محمد علی (مخاطب بہ معصوم علی خاں) کی تصنیف بھی نہیں ہے۔ خسرو کی تصنیف تو اس لیے نہیں ہے کہ اس میں دوربین کا تذکرہ ہے جو خسرو کے عہد میں ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ علاوہ بریں فارسی قصہ میں نظیری و عرفی کے اشعار بھی ہیں اور یہ شاعر خسرو کے بعد ہوئے۔ فارسی قصہ میں جن منصب داروں کے عہدے اور خطاب موجود ہیں وہ خطاب بھی عہد مغلیہ میں وضع ہوئے اور حکیم محمد علی کا دعویٰ یوں درست نہیں ہے کہ ان کے مخطوطے سے پہلے کا ایک نسخہ ۱۷۲۳ء کا لکھا ہوا دستیاب ہو گیا ہے۔ حکیم محمد علی کا نسخہ ۱۷۳۲ء میں مکمل ہوا فارسی قصہ چہار درویش عہد محمد شاہی سے پہلے لکھا گیا۔ یہی بات درست معلوم ہوتی ہے۔

ان چند باتوں کے بعد اب میں نوطرز مرصع کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں مولانا محمد حسین آزاد مرحوم نے اس کا سال تصنیف ۱۷۹۵ء بتایا اور بعد والے مدتوں اسی سنہ کو دہراتے رہے۔ اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ نوطرز مرصع اس سے بہت پہلے لکھی جا چکی تھی۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے "نوطرز مرصع" کے دیباچے میں ڈاکٹر گیان چند کے حوالے سے لکھا ہے کہ تحسین کی نوطرز مرصع کا ذکر سب سے پہلے مہر چند کھتری مہر کے "قصہ ملک محمد و گیتی افروز" میں ملتا ہے۔ یہ قصہ ۹۹-۱۷۹۸ء میں لکھا گیا تھا۔ اور اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نوطرز مرصع ۱۷۹۸ء سے بہت پہلے لکھی جا چکی تھی۔ "انھیں دنوں میں عطا حسین خاں نے چہار درویش کا قصہ فارسی سے ہندی میں تضمین کرکے "نوطرز مرصع" نام رکھا۔ مولف نوطرز مرصع ہے مگر تو ریختہ زبان میں الفاظ دقیق اور عبارت رنگین موزوں کیا ہے۔ اس سبب سے مطبوع انگریزوں کے نہیں ہوا۔"

یہ اقتباس اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اس سے نوطرز مرصع کے سبب تالیف پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ نوطرز مرصع کے دیباچہ میں تحسین نے اپنے بارے میں اور اس کتاب کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ جرنیل اسمتھ اس قصے کے محرک اول کا درجہ رکھتے ہیں۔ شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کی پسندیدگی نے کتاب کو تکمیل تک پہونچانے میں مدد دی۔ تحسین کی زندگی کا بڑا حصہ انگریزوں کے ساتھ اور ان کی نوکری میں گزرا۔ اس فسانہ کی ابتدا الہ آباد سے کلکتہ تک جرنیل اسمتھ کی معیت میں کشتی کے سفر میں ہوئی۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ اگر اس سفر کا سنہ اور تاریخ معلوم ہو جائے تو اس فسانہ کی ابتدا کی تاریخ کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ "اردو دائرہ معارف اسلامیہ" جلد ۴ (پنجاب یونیورسٹی) میں عماد السعادت کے حوالے سے اس سطر کی تاریخ دی گئی ہے۔

"والد کے انتقال کے بعد تحسین نے ۱۷۶۸ء میں جنرل رچرڈ اسمتھ کی معیت میں الہ آباد سے کلکتہ تک دریائے گنگا کا سفر کیا۔۔۔
۔۔۔۔ ۱۷۷۵ء میں وہ فیض آباد کے ریذیڈنٹ کپتان ہارپر کی ملازمت میں تھے (عماد السعادت)

ڈاکٹر سید سجاد مرحوم نے جنرل رچرڈ اسمتھ کے حالات کے متعلق بڑی تحقیقی کاوش کا ثبوت دیا ہے۔ ان کی تحقیقات کے مطابق وہ نومبر ۱۷۶۶ء میں جنرل بنایا گیا تھا اور ۱۷۷۰ء سے پہلے انگلستان واپس چلا گیا تھا۔ ڈاکٹر سجاد مرحوم کی تحقیقات کے مطابق یہ کتاب ۱۷۷۵ء کے لگ بھگ مکمل ہو چکی تھی۔ دائرۂ معارف اسلامیہ جلد ۴ کے مطابق اس کا سال تکمیل ۱۷۸۰ء (۱۱۹۵ھ) کے لگ بھگ ہے (قاموس الاعلام میں تحسین کا سال وفات ۱۲۰۰ھ دیا گیا ہے۔)

جیسا کہ پہلے کہا گیا ڈاکٹر گل کرسٹ کے مقدمہ اور باغ و بہار کے سرورق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نوطرز مرصع اس کا ماخذ اولین ہے۔ Lewis F. Smith نے ۱۸۴۲ء میں باغ و بہار کا انگریزی ترجمہ شایع کیا۔ اس کی تمہید میں وہ لکھتے ہیں:

" The Bagho-Bahar compiled by Meer Ummar of Dhailwi from

Nautarz Morassa which was translated by Ata Hussain Khan

ان حقائق کے پیشِ نظر یہ کہنا بڑی زیادتی ہے کہ میر امن اور نوطرزِ مرصع کو اپنا ماخذ بنایں۔ اسے معاذاللہ "فنی طور پر کوئی ناقص یا ناتمام نقش ایک بڑے فن کار کے لیے چیلنج ہوتا ہے۔ وہ اس زمین کو آسمان بنا دیتا ہے۔ نوطرزِ مرصع غالباً انگریزوں کو زبانِ اردو سکھانے کے لیے لکھی گئی پر اس مقصد کو پورا نہ کرتی تھی۔ میر امن نے اسے نئے قالب میں ڈھالا اور اس طرح کہ باغ و بہار جدید اردو نثر کا نقطۂ آغاز بن گیا۔ یہ بات میں سادگی و سلاست کی بنا پر نہیں کہہ رہا ہوں۔ سادہ اسلوب کا آغاز میر امن سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ سید سبطِ حسن نے "ہم قلم" ستمبر یا اکتوبر ۱۹۶۲ء میں جدید اردو نثر کی پہلی کتاب پر تفصیل سے لکھا ہے۔

میں اس ضمن میں یہ عرض کروں گا کہ سادگی و سلاست کے اولین نقوش خود نوطرزِ مرصع میں موجود ہیں (اس کی تفصیل آگے آئے گی) میر امن کا کمال تو اُن کا آہنگ اور اسلوب ہے۔ نثر کے نئے امکانات کو اجاگر کرنا ہے۔ نثر کی شہزادی مدتوں سے تصنع کے بلوری صندوق میں بند تھی اور زندگی سے محروم ــــ میر امن نے اس صندوق کے ڈھکنے کو اٹھایا نثر کی شہزادی کے ماتھے پر بوسہ دیا اور وہ جاگ اٹھی۔ مدتوں کا طلسم ٹوٹ گیا۔ یہ ہے باغ و بہار کی اہمیت۔

ابھی ابھی میں نے عرض کیا ہے کہ سادگی و سلاست کے اولین نقوش نوطرزِ مرصع میں موجود ہیں۔ اور ان نقوش کی دھیمی روشنی نے میر امن کو ایک جہانِ نو کی تخلیق میں یقیناً مدد دی تھی۔ نورالحسن ہاشمی صاحب کی یہ رائے مجموعی طور پر درست نہیں ہے کہ "نوطرزِ مرصع میں یہی سطحی اور مصنوعی مرصع کاری ہر جگہ ملتی ہے۔ یہ سطحی اور مصنوعی مرصع کاری نوطرزِ مرصع کے ابتدائی صفحات میں جنسِ ارزاں کی طرح موجود ہے۔ مگر اس کتاب کے افتتاحی حصوں کا انداز بالکل مختلف ہے۔ ابتدائی حصے میں تحسین اور میر امن کے اسالیب کے درمیان دو دنیاؤں کا فرق ہے ملاحظہ ہو!

"نوطرزِ مرصع"

اتفاقاً اس عرصہ میں نظرِ مبارک بادشاہ کی طرف ایک آئینہ کے منقش مکان عشرت گاہ کے انتصب کیا تھا جا پڑی۔ جو سن شریف اُس کا قریب پچاس سال کے پہنچا تھا وقتِ مشاہدہ جمال مہر نشاں اور معائنہ صورت حال اپنے کے دیکھتا کیا ہے کہ ایک دو سرے سفید درمیان داڑھی سیاہ کے مانند سہیل ستارے کے بیچ آخر شبِ تاریک کے کہ واقعی اس نشان کے تئیں ختم عمر کا کہتے ہیں۔ نمودار ہوا۔

"باغ و بہار"

ایک شیش محل میں بیٹھے نماز ادا کرکے وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ ایک بارگی آئینہ کی طرف جو خیال کرتے ہیں تو ایک سفید بال مونچھوں میں نظر آیا کہ مانند تارِ مقیش کے چمک رہا ہے۔ شاہ دیکھ کر آب دیدہ ہوئے

اس اقتباس سے تحسین کے روایتی اسلوب اور میر امن کی نثر تازہ کا پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دونوں کی افتادِ طبع بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

میر امن "قصہ زمین بر سرِ زمین" کے قائل تھے۔ سفید بال ان کے یہاں تارِ مقیش کی طرح چمک رہا ہے اور تحسین کے ہاں سہیل ستارے کی طرح ــــ پھر اپنے اختصار کے باوجود میر امن نے "نماز ادا کرکر وظیفہ پڑھنے" کے ٹکڑے سے آزاد بخت کے کردار کے ایک پہلو کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔

تحسین کی اس سطحی اور مصنوعی مرصع کاری کے مزید نمونے پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے اسلوب کے اس پہلو کو یارانِ طریقت مدتوں سے پیش کرتے چلے آئے ہیں۔

"الفاظ دقیق ...... مہر چند کفتری ہو"

"اس کی زبان فارسی ترکیبوں اور محاوروں کی بہتات کی وجہ سے قابلِ اعتراض تھی۔ گل کرسٹ سے لیکر ممتاز حسین صاحب کے

"ارے معاذ اللہ" تک کہہ لیجیے اب نوطرز مرصع میں اردو نثر کے نئے دور کی اولین کرنوں کا جلوہ دیکھیے اور پھر فیصلہ کیجیے کہ اس میں کوئی جملہ درست ہے کہ نہیں۔"

(۱) "یہ سن کر زیر لب خندہ کیا اور کہا کہ اے دائی شاید تجھ کو نیند آتی ہے۔ اس نے از راہ عقل دریافت کر کے کہا کہ واقعی ملکہ کو صاحب کرامات کہنا چاہیے دعا و ثنا کہہ کر اٹھی اور محل خواب گاہ میں جا کر سو رہی۔ ملکہ نے بعد ایک لمحہ کے پیالہ مانگا۔ میں نے پر کر کے دیا۔ جس وقت شراب پی کر پیالہ میرے تئیں دینے لگی میں نے بوسہ اوپر دستِ مبارک کے دیا اور پیروں پر پڑا۔ نازنین منم نے ہاتھ جھاڑ کر کہا کہ اے جاہل! بت بزرگ سے کیا بدی دیکھی کہ پرستش خدائے نادیدہ کی کرتا ہے"

(۲) "ایک مدت پیچھے سوداگروں نے ارادہ دریا ارادہ وطن کا کیا جس وقت کہ مجھ کو کہا کہ تو بھی تیاری اپنی کر۔ میں نے واسطے رفع تہمت کے کہا مگر کس سے تنہا یہ ارادہ کروں۔ بقول آنکہ ادھی پونجی جھمی کھائے۔ تب انھوں نے کہا کہ اس کفر نشاں میں کب تلک رہے گا؟ میں نے کہا خوب اگر تم ایسا ہی کہتے ہو تو ایک میں، اور ایک لونڈی، اور ایک کتا اور ایک صندوقچہ ...... یہ کچھ بساط ہے۔ میرے لائق جہاز میں جگہ مقرر کیجیو۔ میں شہر میں جا کے اور اسباب لا کے تمہارے ساتھ ہوتا ہوں۔"

(۳) "کہا کہ میں دختر وکیل مطلق بادشاہ کی ہوں۔ شب زفاف میں شوہر ہیں سے کو درد قولنج نے لیا کہ جاں بحق ہوا۔ تو اپنی حقیقت کہہ میں نے سرگزشت اپنی بیان کی اور اس ماہ روسیمن بر کے ساتھ ہم بستر ہوا اور خوش رہنے لگا۔ الغرض ہر ماہ میں ایک مردہ آتا اور میں آزردہ پر منصرف ہوتا تھا۔ تا آنکہ وہ سرو جوئبار خوبی کی حاملہ ہوئی اور ایک طفل تولد ہوا۔ کئی ماہ اور گزرے۔ طرح محبت و مودت کی ایسی پڑی کہ باہم بہ لہو لعب خوش رہتے تھے۔ ایک روز میں نے ہم خوابہ سے کہا کہ کوئی طرح گزاری کی اس قید فرنگ سے کیا چاہیئے۔"

ان تینوں اقتباسات کا مقابلہ باغ و بہار سے کیجیے تو تحسین کو میرامن سے ہٹنا نہ پائیے گا۔ ملکہ کے کہنے پر کہ "شاید تجھے نیند آتی ہے؟" نوطرز مرصع میں دائی کس سلیقے سے کہتی ہے کہ ـــــ "واقعی ملکہ کو صاحب کرامات کہا جائیے" اور باغ و بہار میں دائی کا جواب یہ ہے کہ: "ہاں مجھ پر خواب نے غلبہ کیا ہے" تحسین کا جملہ ہے "اے جاہل بت بزرگ سے کیا بدی دیکھی کہ پرستش خدائے نادیدہ کی کرتا ہے" ـــــ میرامن اسی بات کو یوں کہتے ہیں "اے جاہل ہمارے بڑے بت میں کیا برائی دیکھی جو غائب خدا کی پرستش کرنے لگا۔"

دوسرے اقتباس کا مقابلہ باغ و بہار سے کیجیے تو تحسین کا اثر اسلوب اور بیان پر صاف صاف نظر آئے گا ـــ "میرے پاس کیا ہے جو اپنے وطن کو جاؤں؟ یہی ایک لونڈی، ایک کتا، ایک صندوق بساط میں رکھتا ہوں۔ اگر تھوڑی سی جگہ بیٹھ رہنے کو دو اور اس کا قول مقرر کرو تو میری خاطر جمع ہو۔ میں بھی سوار ہوں۔"

میرامن کے یہاں "ایک" "میں" کا ٹکڑا نہیں ہے اور ارباب نظر جانتے ہیں کہ اس ٹکڑے نے تحسین کے یہاں مخاطب کی لجاجت کو کیسی دردمندی کی فضا دیدی ہے۔

تیسرے اقتباس میں ہم خوابہ کیسی خوبصورت اور برمحل و مناسب ترکیب ہے۔ مردہ گھر میں تحسین نے دونوں کے تعلقات کو فطری تقاضوں کے تحت پیش کیا ہے۔

ان معروضات کی بنا پر میں یہ عرض کروں گا کہ نوطرز مرصع یقینی طور پر باغ و بہار کا ماخذ ہے۔ صرف کہانی کی حد تک نہیں بلکہ تحسین کے اسلوب بیان نے بھی میرامن کو راستہ دکھایا ہے اور یہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میرامن نے اس زمین کو آسمان کر دیا۔ ویسے باغ و بہار، نوطرز مرصع، اور فارسی قصہ چہار درویش کے مطالعہ سے یہ بات بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ میرامن نے فارسی قصہ کو بھی اپنے سامنے رکھا تھا اور کہیں کہیں ان کی ترتیب نوطرز مرصع سے مختلف اور اصل کے مطابق ہے۔ باغ و بہار میں آزاد بخت اور خواجہ سگ پرست کی کہانی دوسرے درویش کے قصے کے بعد ہے اور تحسین کے یہاں تیسرے درویش کی سیر کے بعد۔
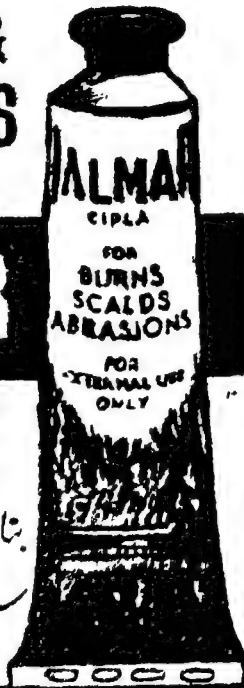
باغ و بہار کا ادبی مرتبہ نوطرز مرصع سے کہیں بلند ہے باغ و بہار ایک زندہ کتاب ہے اور اسی کتاب کی زندگی و پائندگی نے ہمیں نوطرز مرصع کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اکثر ادبی کارناموں کے ماخذ کم مرتبہ ہوتے ہیں مگر ان کی یہی اہمیت کیا کم ہے کہ وہ ادبی شہ کاروں کی بنیاد بنتے ہیں۔ حسرت کی شاعری میں رنگ کا جو احساس ہے وہ شاید مصحفی کے گہرے مطالعے کے بغیر یوں نہ ابھرتا۔ حسرت نے رنگ مصحفی کی تکمیل کردی۔ شکسپیئر کے بیشتر ڈرامے طبع زاد نہیں ہیں مگر وہ پرانی کہانیوں کے اینٹ پتھر خاک دخون اور خام مواد سے ایک نئی دنیا کی تعمیر کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ——————

—————— رومیو جولیٹ کی کہانی پرے مس ارتھلیس کی کہانی کی ترقی یافتہ شکل ہے[1]۔ اس کے علاوہ رومیو جیولیٹ کی رگوں میں قرونِ وسطیٰ کے ناکامی محبت کے کتنے ہی افسانے خون بن کر دوڑ رہے ہیں۔

نوطرز مرصع اور باغ و بہار کے سلسلے میں کہیں کہیں میرے لہجے میں قدرے تیزی آگئی ہے۔ جسے میں زندگی کی علامت جانتا ہوں۔ لیکن اگر آپ کہیں تو اس کے لیے میں معذرت بھی کر سکتا ہوں

---

[1] بحوالہ عزیز احمد ۔ مقدمہ رومیو جیولیٹ

واجد علی شاہ کے زمانہ قیام کلکتہ کے بعض اہم حالات

امیر حسن نورانی

اودھ کے حکمراں نواب واجد علی شاہ کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۸۵۶ء میں تخت و تاج سے محروم کر دیا تھا، وسط ماہ مئی ۱۸۵۶ء کو شاہ موصوف اپنے متوسلین کے ساتھ کلکتہ پہونچے اور راجہ بردوان کے محل میں قیام کیا جسے پہلے ہی مولوی مسیح الزماں کے ذریعہ کرایہ پر حاصل کر لیا تھا۔ بعد میں مٹیا برج کے علاقہ میں بڑے بڑے محل، مکانات بنوائے باغات لگوائے بیس ہزار سے زیادہ ملازمین و متوسلین شاہ موصوف کے ساتھ رہتے تھے، یہ علاقہ لکھنوی تہذیب و معاشرت کا نمونہ نظر آتا تھا۔ ۲۱ ستمبر ۱۸۸۷ء کو واجد علی شاہ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ کلکتہ کے اس طویل زمانہ قیام میں جو حالات و واقعات مٹیا برج میں پیش آئے ان کو ہندوستانی اور انگریز اہل قلم نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے تحریر کیا ہے۔ واجد علی شاہ کے حالات زندگی پر متعدد کتب موجود ہیں ان میں قیام کلکتہ کے حالات بھی درج ہیں۔ لیکن کچھ حالات و واقعات اس زمانہ کے اخبارات میں بھی نظر آتے ہیں جو ہندوستان کے مختلف مقامات سے شایع ہوتے تھے۔ اودھ کے باشندوں کو خاص طور سے شاہ معزول کے حالات سے گہری دل چسپی تھی۔ اس لیے ان کے متعلق اہم اور غیر اہم خبریں شایع کرنے میں ہفتہ وار "اودھ اخبار" پیش پیش تھا۔ اور اس مقصد کے لیے منشی نولکشور مالک اخبار مذکور نے مٹیا برج کلکتہ میں اپنا ایک نامہ نگار مقرر کیا تھا۔ اسی لیے ہر ہفتہ واجد علی شاہ کے متعلق کوئی خبر شایع ہوتی تھی۔

اس وقت میرے پیش نظر اودھ اخبار مطبوعہ ۱۸۶۲ء کی مکمل فائل ہے اس کے مختلف نمبروں میں جو خاص خاص خبریں شایع ہوئی ہیں ان کو بجنسہ پیش کر رہا ہوں۔ ان خبروں کا تجزیہ کرنے سے شاہ اودھ کے سوانح نگاروں اور ان کے حالات سے دل چسپی رکھنے والے اہل ذوق کو کچھ نہ کچھ مواد مل سکتا ہے۔

"اودھ اخبار" کے ایڈیٹر کو شاہ اودھ سے ہمدردی ہو یا نہ ہو لیکن اخبار کا نقطۂ نظر حکومت کی خوشنودی تھا اسی لیے کہیں کہیں اخبار کا لب و لہجہ اور انداز بیان طنزیہ نظر آتا ہے۔ میں نے جنوری ۱۸۶۲ء سے نومبر ۱۸۶۲ء تک شایع ہونے والی خبروں کو ترتیب وار نقل کیا ہے۔ ہر خبر کے سلسلہ میں وہی سرخی درج کی ہے جو ایڈیٹر اودھ اخبار نے قایم کی تھی۔ بعض الفاظ کا املا اس طرز سے مختلف ہے جو اس وقت رائج ہے۔ جیسے روپیہ کو روپیا لکھا ہے۔ اس کو ناظرین کاتب کی غلطی نہ تصور کریں اخبار میں جس طرح تھا بجنسہ نقل کر دیا گیا ہے۔

شاہ معزول اودھ

مدت سے ہمارے ناظرین اخبار کو شاہ اودھ کے حالات معلوم نہ ہونے سے شاید خیالات گوناگوں گذرتے ہوں گے۔ اب اخبار حیدری مورخہ یکم جنوری ۱۸۶۲ء میں انگلشمین سے لکھا ہے کہ شاہ معزول اودھ نے بہت سے مکانات مع زمین افتادہ متصل ریچھ باغ کے خریدے ہیں اور ہزار ہا آدمی سوائے اپنے ملازموں کے وہاں بسائے یہ لوگ اکثر جواری تماشا بین، چور، متجوار وغیرہ ہیں۔ جس بدنام کو کہیں جائے سکونت نہیں ملتی وہ یہاں بود و باش کرتا ہے شب و روز استعمال عیوب کا دروازہ کھلا ہے اہالیان پولیس کا اس میں گذر نہیں کہ کسی طرح سیاست کریں اور اکثر مردم بد شعار سزائے عدالت سے بچکر اس جگہ پناہ گیر ہوتے ہیں کئی لاکھ روپیہ قرض شاہ ممدوح پر ہو گیا ہے۔ اور خرچ اس قدر زیادہ کہ آیندہ کو قرض ملنا ممکن نہیں میجر ہربرٹ صاحب ہمیشہ ان کو فہمایش کرتے ہیں مگر کچھ اثر پذیر نہیں۔ صاحب کمشنر کی تجویز ہے کہ ایک چوکی پولس کی ریچھ باغ میں مقرر کی جائے اور اس کا خرچ وہاں کے باشندوں سے وصول ہو۔ بالفعل ۳۶ سپاہی اور افسر وہاں رہتے ہیں مگر وہ فقط حفاظت راستے کی کرتے ہیں مداخلت انکی

اندر باغ کے بالکل نہیں لفٹنٹ گورنر نے نواب گورنر جنرل کو لکھا ہے کہ وہ شاہ مذکور کو ہدایت کریں کہ بدچلن اور بدوضع آدمیوں کو اپنے مکان سے نکال دیں یہ بھی سنا گیا کہ ایک جماعت مفسدوں کی جو فساد ایام گزشتہ اودھ میں شامل اور مدد و معاون تھی اور معافی نامے کی رو سے بری الذمہ ہو گئی وہ سب آنکہ اب بھی بادشاہ کے نوکر ہوئے ہیں۔ فقط

صاحب اخبار حیدری نے جو کچھ کہ شاہ معزول اودھ کی نسبت تحریر فرمایا یہ لو بہ از بیت ایک شمہ بھی نہیں اندنوں بضرورت بعض امور کے راقم اودھ اخبار کا کلکتہ گیا تھا جو کچھ لکھنؤ کے باہر سن سن کر خیال کرتا تھا کہ ع باطل است انچہ مدعی گوید، وہ سب آنکھوں دیکھا متواتر سنا اور ان سماعی باتوں کے لاکھوں قرینے حضرات رفقائے شاہ معزول اودھ اور حضرت شاہ کے دیکھے کہ ایسے امور لغو، نالائق حرکات کا درج صحیفہ کرنا عار معلوم ہوتا ہے۔ ایک شمہ یہ ہے کہ حضرات رفقا نے حضرت اودھ کو ایک کلدار پتلا بنا رکھا ہے جس طرف چاہا پھیر دیا۔ بعد ہا فاحشہ عورات رذیل قوم کو پیشکش شاہ دیگر اپنا رسوخ ظاہر کرتے ہیں اور روز دس میں محل کی منع اور نکاح سے بھی بھرتی ہوتی ہے کے مقام گاہ میں حضرت کے دجہ سے روز رندانہ جلسے رہتے ہیں حضرت شاہ کی مری مٹی کو خراب کرتے ہیں کسی سے کوتاہی نہیں کی لاکھوں روپیہ کھا گئے شاہ کے سر پر قرض اس قدر ہو گیا ہے کہ عمر بھر مخلصی ممکن نہیں وہاں کے سرخیل نالائقاں ایک حضرت نے بادشاہ کو اس طرف اپنا مطیع کیا ہے کہ خود شاہ اودھ ہو رہا ہے وہاں کے بنگالیوں اور مدسلئے موجی کہولے سے مکانات کرایہ لے کر بادشاہ کو دھوکا دیتے ہیں کہ حضرت سلامت یہ مکان مول لیا گیا اس قدر روپیہ چاہیئے اسیطرح مکانات کی قیمت وصول کر کے صرف کرایہ پر مالکوں سے اُس مکان کو لیتے ہیں۔ سوا اس کے عجیب عجیب حرکات نالائق ایسے مشہور ہیں کہ ہماری تحریر کی حاجت نہیں۔ راقم کلکتے ہی میں تھا سنا کہ ۳ دسمبر کو ایک فہمایش نامہ جناب گورنر جنرل بہادر کشور ہند سے معرفت جناب میجر ہربرٹ صاحب کے خدمت شاہ معزول اودھ میں ارسال ہوا اس کے مضمون کا انتخاب یہ سنا گیا کہ خواب غفلت سے جاگیے ورنہ آپ کے ہاتھ ملکر کف افسوس کی جائیگی نواب گورنر جنرل بہادر کشور ہند حرکات سے مطلع ہوئے ہیں۔ تمہاری نالائق شکایتوں کو سن سن کر کانوں میں درد پیدا ہوا۔ دل میں جگہ نہ رہی مفت میں تمہارے نالائق مصاحب جہنم کی راہ بتانے والے ایکدن ستائیں گے۔ اور نواب گورنر جنرل بہادر کشور ہند ایسا بھی فرماتے ہیں کہ ایسے ایسے نالائق حضرات جو اغوا کنندہ حضرت ہیں ان کو نواب معتمد الیہ کے ملازمان درگاہ خوب جانتے ہیں فقط۔ اسی طرح بہت کچھ لتاڑ تھی مگر وہاں کے شیاطین طینت جو حضرت کو راہ راست سے کوسوں دور رکھتے ہیں اُنکی روش کو خراب کرتے ہیں انکے حضرات نے مشہور کر دیا ہے کہ ہم نے روپیہ خرچ کر کے ایسا بندوبست کر دیا کہ مشیر حالات گورنمنٹ کی فتنا ہمکے جلد ہو جاتے ہیں اور ہم اس کا تدارک اوپر ہی اوپر کر سکتے ہیں اس بہانے سے بھی لاکھوں روپیے بنام بہادر شوت کہ فلاں صاحب کو دیں گے۔ فلاں صاحب نے وعدہ کیا ہے لیتے ہیں اور خود نقد روپیہ ہاتھ نہیں آتا تو اسم فرضی پر تمسک لکھوا کر جھوٹا قرض اپنا اپنا ٹھیر الیا ہے اور شاہ کو اس قرضے سے دبائے ہوئے ہیں حضرت اس خوف سے نہایت مضطرب رہتے ہیں۔ ہمارے ایک عنایت فرمانے وعدہ کیا ہے کہ ہفتہ وار حضرت کے حالات سے مطلع کرتے رہینگے فقط۔

(اودھ اخبار مطبوعہ ۸ جنوری ۱۸۶۲ء صفحہ ۲۵، ۲۶)

شاہ اودہ

اودہ گزٹ سے معلوم ہوا کہ واجد علی شاہ شہر کلکتہ مقام مٹیا برج میں ایک بڑا مکان تعمیر کراتے ہیں اسکے وہاں مکان بنوانے سے گرد نواح کی رعایا کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ اور دوسری تکلیف یہ ہوئی کہ کاشی پور میں جو ولیعہد بہادر نے مکان بنوایا وہاں کی رعایا کو بھی نہایت تکلیف ہوئی سرکار اس کو خیال فرمائے۔

(اودہ اخبار مطبوعہ ۲۲ جنوری ۱۸۶۲ء صفحہ ۴۲)

شاہ اودہ

شاہ اودہ نے درخواست اپنی پنشن اور ضبطی ملک اودہ ۱۸۵۹ء تک دی صاحب آف اسسٹنٹ انڈیا نے منظور نہ کی اور لکھا کہ

آج تک شاہ اودھ نے قبول نہ کی اب اُس روپیے کے مستحق نہیں۔ فقط		(اودھ اخبار مطبوعہ ۲۲ جنوری ۱۸۶۱ء صفحہ ۶۸)

شاہ اودھ

بسکہ حضرات اوباش شوقین کا بیشتر موچی کھولہ قیام گاہ حضرت شاہ اودھ میں جماؤ تھا اور اس وجہ سے اکثر حکام منتظان سے شکایت بدوضعی تا حضور نواب گورنر جنرل بہادر پہونچی تھی۔ چنانچہ واسطے اصلاح بعض بعض خرابیوں کے میجر ہربرٹ صاحب ایجنٹ گورنر جنرل کا اجلاس موچی کھولے میں ہوا کرے گا اور اسی جگہ یہ صاحب ممدوح تشریف رکھیں گے۔ ایک داروغہ پولیس بھی مقرر ہوئے لہٰذا اب چوری کثرت سے ہوتی ہے۔ حضرت شاہ اودھ کے دل افروز محل کے بطن مبارک سے دختر زہرہ جبیں تولد ہوئی دایہ ہرکارہ دعیرہ خدمت گار کو خلعت عطا ہوئے۔ شاہ اودھ کو کمال ملال ہوا۔ کیونکہ حضرت نے بہ توقع تولد فرزند اوج اقبال سلطنت کے ہزار ہا روپیے کا سامان مہیا فرمایا تھا مگر قسمت۔		(اودھ اخبار مطبوعہ ۱۲ مارچ ۱۸۶۲ء صفحہ ۱۸۴)

"انتخابات اخبارات"

شاہ اودھ

بسکہ حضرات رفقا اور ندما کی عنایات سے حضرت محتشم الیہ کا نہایت ابتر حال پتلا ہو چلا تھا ہر ایک متنفس نے جو ذرہ بھی دخیل ہو گیا بادشاہ کو دھوکا دے کر لاکھوں کے قرض جھوٹ موٹ لکھوالیے۔ اور پھر بادشاہ کو ڈرانے دھمکانے لگے۔ غرض ایسی ایسی حرکات سے شاہ ششدر میں تھے۔ اور بیشتر عدالت کے ضوابط سے ایک نوع کی نگہداشت حفاظت تعظیم شاہ محتشم الیہ میں چنداں لحاظ نہ رہا۔ اگرچہ اُن حضرات رفقا اور ندما کی بے اعتدالیوں سے اس طبقے بھر میں حمیت کا نام بھی باقی نہ رہا۔ اور یہاں تک نوبت آگئی تھی کہ ذرا ذرا سے مقدمات خفیفہ کے واسطے شاہ محتشم الیہ کے دستخطی مختار نامے کہ جن کے عنوان کی عبارت میں بیشتر یہ تھا (منکہ واجد علی سابق شاہ اودھ ام الخ) پھر ہمارے ناظرین اخبار ملاحظہ فرماویں کہ کہاں تک نوبت پہونچ گئی تھی۔ ہر چند اکثر دل جلے یا صاحب دانش و فرہنگ ایسا کہہ سکتے ہیں کہ جب تخت و بخت جاتا رہا تو پھر کونسی منزلت باقی رہی۔ مگر نہیں یہ شاہ محتشم الیہ کے رفقا اور ندما کے حسن لیاقت کا اظہار ہے۔ ورنہ عرصہ تک خاندان تیموریہ کے مراتب کی نگہداشت کیسی رہی اور کس داب سے زمانے کے اتفاق تک اتفاق کیا گر بسکہ سرکار انگریزی کی ہر ایک امور میں جہاں مابند نظری کام کرتی ہے اُس جگہ کچھ بھی ضرور نہیں ہے کہ کوئی درخواست ہی دے تو یادم سے بلکہ دل سے بسلطنت شاہنشاہی کہاں جاتا ہے۔ اندنوں بنظر حفاظت منزلت و مراتب شاہ اودھ کے ایک خاص قانون اجرا ہوا جس سے ہر عنوان سے شاہ محتشم الیہ کی حفاظت کی مگر ایک بڑی آسایش اس ایکٹ کے جاری ہونے سے ہوئی اور وہ یہ ہے کہ اب کوئی قرضہ شاہ موصوف کو نہ دے گا۔ کیا معنی کہ جب قرض خواہ کا زور عدالت جاتا رہا۔ تو پھر قرضے کے وصول کی تدبیریں خیر بہر حال مقام شکر کا ہے کہ جب کوئی قرضہ نہ دے گا تو بادشاہ اسراف بھی نہ کر سکیں گے۔ تو اس صورت میں یہ نتیجہ نکلا کہ اپنی زندگی بھر آسایش پائیں۔

ایکٹ نمبر ۸ سنہ ۱۸۶۲ء

ایکٹ برائے نگہداشت منزلت ذاتی شاہ اودھ

ہرگاہ بموجب اس اقرار کے جو کہ منجانب سرکار انگریزی شاہ اودھ سے کیا گیا تھا واسطے قائم رکھنے شاہ موصوف کی منزلت ذاتی کے یہ قرین مصلحت ہے کہ شاہ موصوف عدالت ہائے دیوانی اور محکمجات مال اور فوجداری کے احاطہ اختیار سے کسی قدر مستثنےٰ ہوں لہٰذا حسب ذیل حکم ہوتا ہے۔

دفعہ ۱۔ از روئے دفعہ ہذا کے شاہ اودھ اختیار عدالتہائے فوجداری سے باہر قرار دیئے گئے ہیں۔ اور باہر ہیں مگر بجز ان جرموں کے جن کے واسطے موجب مجموعہ تعزیرات ہند سزائے موت مقرر ہے اور واضح ہو کہ جرائم مذکور کے سوا کوئی عدالت فوجداری یا مجسٹریٹ اختیار کسی نالش کی تحقیقات کا جو بنام شاہ موصوف ہو یا صدور کسی حکمنامے کا بنام انکے نہ رکھے گا۔

دفعہ ۲۔ کوئی افسر پولیس یا شخص دیگر بلا وارنٹ کے شاہ موصوف کی گرفتاری کا اختیار نہ رکھے گا۔ اور کوئی افسر پولیس یا شخص دیگر عام اس سے کہ کسی وارنٹ

کے اجرا کے واسطے مامور ہو یا نہ ہو مجاز نہ ہوگا کہ بغرض گرفتاری کسی شخص یا تلاشی کسی شئے کے ایسے مکان کے اندر جو کہ اس وقت مسکن شاہ موصوف ہو بخبر موجودگی اور اجازت اس عہدہ دار کے جو گورنمنٹ انگریزی کی طرف سے شاہ موصوف کے پاس بطور ایجنٹ مقرر کیا جاوے داخل ہو یا اس مسکن میں ٹھہرے۔

دفعہ ۳- اگر کوئی نالش یا اطلاع نسبت شاہ موصوف بابت کسی ایسے جرم کے جو وہ مذکرہ دفعہ اول ایکٹ ہذا سے خارج ہو گذرے تو جو عہدہ دار شاہ موصوف کے پاس بعہدہ ایجنٹ متعین ہو اُسے اجازت ہے کہ مقدمے کی تحقیقات کر کے کیفیت اس کی نواب گورنر جنرل بہادر اجلاس کونسل کی خدمت میں بھیجے اور نواب محتشم الیہم با اجلاس کونسل بروقت پہنچنے اس کیفیت کے اس جرم کے تجویز کے واسطے کمیشن مقرر فرماویں اور اُس کمیشن کو کوئی اختیار منجملہ اُن اختیارات کے جو کہ از روئے مجموعہ ضابطہ فوجداری کی عدالت کو حاصل ہیں۔ اس باب میں عطا کریں۔ مگر ملحوظ رہے کہ درصورت ثبوت کے اہل کمیشن مذکور کو اختیار صدور حکم سزا کا نہ ہوگا۔ لیکن اپنی رائے سے نواب گورنر جنرل بہادر اجلاس کونسل کو مطلع کرنا چاہیے۔ کہ نواب محتشم الیہ درباب حراست ذات یا نیلام جائداد شاہ موصوف کے یعنی جیسا کہ بحسب صورت مقدمہ تجویز متصور ہو حکم صادر کریں گے۔

دفعہ ۴۔ کوئی رٹ یا حکمنامہ نسبت ذات یا مال یا جائداد شاہ موصوف کے کسی عدالت دیوانی یا محکمہ مال و فوجداری سے کسی وقت صادر اور عمل پذیر نہیں ہو سکتا ہے۔ الا اس صورت میں کہ اسکی بابت پیشتر منظوری نواب گورنر جنرل بہادر اجلاس کونسل کی حاصل کر کے منگالی گئی ہو اور وہ منظوری مصدق بدستخط سکریٹری گورنمنٹ مند ہو۔ اور جو رٹ یا حکمنامہ بلاحصول ایسی منظوری کے شاہ موصوف کی ذات یا مال یا جائداد پر کسی وقت صادر یا عمل پذیر ہو وہ بالکل باطل اور ناجائز ہوگا۔

دفعہ ۵۔ شاہ موصوف کسی عدالت میں یا روبرو کسی اہل کمیشن کے جو کسی عدالت سے مقرر ہو واسطے دینے اظہار یا اظہار حلفی کے جب کہ وہ کسی مقدمے یا کارروائی مرجوعہ عدالت دیوانی یا محکمۂ مال فوجداری میں مطلوب ہو اصالتاً بطور گواہ حاضر نہ کرائے جاویں گے۔

دفعہ ۶۔ درصورتیکہ شہادت شاہ موصوف کی ایسے مقدمے یا کارروائی میں مطلوب ہو تو عدالت یا وہ شخص جو چاہتا ہو سوالات تحریری واسطے اظہار شاہ موصوف کے مرتب کرے اور جو مقدمہ یا کارروائی اس قسم کی ہو کہ کوئی فریق ثانی قانوناً مستحق سوالات تردیدی کا ہو تو وہ بھی مجاز طیار کرنے سوالات تردیدی کا ہوگا اور اگر سوالات تردیدی ہوں تو وہ بھی ایجنٹ حاضر باش شاہ موصوف کے پاس بھیجدیئے جاویں گے اور وہ اونہیں شاہ موصوف کو دکھلائے گا۔ اور اُن کے جوابات باقرار صالح قلمبند کرے گا۔ بعد ازاں سوالات مذکور اور اگر سوالات تردیدی ہوں تو وہ بھی مع جوابات کے اُسی عدالت میں واپس بھیجے جائیں گے کہ جس میں مقدمہ یا کارروائی مذکور دائر ہو اور اس کے ساتھ ایجنٹ مذکور اپنا سارٹیفکٹ باین مضمون کہ جوابات حسب ضابطہ لیے گئے ہیں معطوف کرے گا۔

دفعہ ۷۔ جس وقت کہ نسبت اظہار حلفی کے شاہ موصوف کا حلف کسی مقدمے یا کارروائی میں لینا مطلوب ہو تو وہ اظہار اور حلف روبرو ایجنٹ مذکور کے لیا جائے گا۔ اور ایجنٹ مذکور اس اظہار کو مع سارٹیفکٹ اس امر کے کہ اس کی نسبت حلف حسب ضابطہ کیا گیا اس عدالت یا حاکم کے پاس جس کے روبرو مستعمل ہونے والا ہو گا بھیج دے گا۔

دفعہ ۸۔ جس وقت شاہ موصوف سے سوالات کے جواب یا حلف نسبت کسی اظہار کے حسب احکام ایکٹ ہذا لیا جاتا ہو کوئی دوسرا شخص بجز ایجنٹ مذکور الصدر کے سوائے اس صورت کے کہ خود شاہ موصوف اجازت دیں مجاز حاضر ہونے کا نہ ہوگا۔

دفعہ ۹۔ جواب سوالات کے یا اظہار حلفی شاہ موصوف کا جو کہ بموجب احکام ایکٹ ہذا قلمبند ہوئے ہوں یا جس کی نسبت حلف کیا گیا ہو بطور شہادت منظور ہوں گے۔ مگر جو اعتراضات کو جوابات یا حلف مذکور کی نسبت سر اجلاس عدالت یا معرفت کمیشن کے ہو سکتے صورت میں ہوتے وہی صورت متذکرہ بالا میں بھی ہو سکیں گے۔

دفعہ ۱۰۔ ایکٹ ہذا بعد وفات شاہ موصوف کے نافذ نہ رہے گا۔ فقط۔ (اودھ اخبار مطبوعہ، مئی ۱۸۶۲ء صفحہ ۳۱۳/۳۱۴)

خدا مہربان توکل مہربان

مصحفی جب مرے ایام برے آئیں گے ؛؛ بن بلائے مرے گھر آپ چلے آئیں گے۔

مکرم خاکسار صاحب اودھ اخبار سلامت

آپ کے اخبار فیض بار مفتہ ماضیہ میں نظر راقم سے وہ سرکلر گذرا جو مجوزہ بنام بناب مسٹر سیسل بیڈن صاحب ممبر کونسل حرفاً حرفاً پیشگاہ نواب گورنر جنرل باجلاس کونسل سے درباب حفظ مراتب شاہ مظلوم اودھ کے منظور ہوا جسکے منشا کا یہ انتخاب ہے کہ باستثنائے جرم مستلزم القصاص کے اور نالش کسی قسم کی شاہ موصوف پر نہ دائر ہو نہ کوئی عدالت مجاز سماعت ہے۔ نہ شاہ کی گرفتاری جائز اور امور واجب الاستفسار بذریعہ صاحب ایجنٹ حاضر دربار شاہ موصوف کے اون سے دریافت کیا جایا کریں گے۔ سبحان اللہ کیسے نیک نیت پاک طینت ممبر اور حاکم ہیں کہ گئے گذرے زمانے پر حفظ مراتب شاہی کو مرعی فرماتے ہیں بعد شکر تعالیٰ کے ان اصحاب والہ لائے اور گورنمنٹ کی نیک نیتی اور پاسداری حق بجا ہے قابل ہزار تحسین اور صد ہزار آفریں کے ہے ع این کار از تو آید و مردان چنیں کنند۔ جہاں باشد گوے لیا شد سرکار ہی کا تخت و تاج ہے۔ گورنمنٹ ہی کو ان کی لاج ہے مردہ بدست زندہ مردانگی اور ہر حیثیتی اسی کا کام ہے نیت شاہانہ پادشاہ ہو نیکا کام ہے۔ جہاں تک یہ قواعد مجوزہ تجویز ہوئے بہت انسب میں آئندہ کو شاہ مظلوم اپنے بدخواہ ملازم تسکیم پر ور مطالب آشنا کے فریب اور دغا سے بجگر حیات مستعار اپنی سلامتی اور عافیت سے گذار ینگے۔ مگر چند امور گزشتہ اور بھی جن کی ترمیم و تجویز از بس ضروریات سے واجب الاصلاح ہیں ورنہ یہ تپ دق قرض اور تباہی جو عارض حال شاہ ہے دنغ نہ ہوگی وہ بیان کرتے ہیں تاکہ گورنمنٹ وہ بھی تجویز فرما کر نافذ اور بعد ترمیم کے ٹھیک قائم فرمائے دیکھو ندا۔

تن پرور بدخواہ مفسد بندہ غرض عیار مکار ملازمان شاہی نے جن کو شاہ موصوف کی بے زبانی اور مجبوری سے جو بقول جعفر (ابادشاہ کاہل زبان) عادت شاہی کے مزاج شاہی میں در خور اور اس جز و کل پہ محیط ہیں واسطے حاصل کرنے زرخطیر کے کارخانہ یا نام نہاد شاہی یا کارخانہ وخرید وغیرہ شاہی کے لقد دغبن سوداگر اور مہاجنان کا اصل قیمت سے چار گونہ بلکہ دہ گونہ قیمت پر اپنا حصہ ٹھہرالیا اور محکمہ سے نام کو پیروی کر کر نالش سے شاہ پر ڈگریاں کرادیں اور رقعہ تمسک لکھدیئے۔ اس میں آپ تو فاقہ مستی سے کچھ قارون بن گئے مگر شاہ بیچارہ بیخبر و غافل کا قل ہو گیا لوٹ اور کھٹی جو خرید کی اور سود لوٹ ہی لیئے نام کرائیے اور اس میں لاکھوں روپیا شاہ پر اپنا فاضل نکال لیا دیکھو ایک تو سلطنت اور دولت گئی دوسرے مال متاع جو تھا وہ نیلام ہوا اس پر ڈگریاں بھی ہوگئیں اب شاہ میں صرف یک نیمی و بدگوشت و استخوان پوست باقی رہ گیا ہے سو یہ آدم خور لیم خصال اب آستخوان خوری دشمنان شاہ کیواسطے ہما بنکر منہ ہی بیٹھے کو تیار ہیں رحمۃ اللہ علیہم اجمعین استغفر اللہ و لاحول ولا۔

اندرینحالات ایک کمیٹی چند حکام و سوداگر انگریزی وایک معتمد شاہی جو دل سے درد مند و دلسوز شاہی ہوں اور متدین بشرکت صاحب ایجنٹ کے مقرر ہو کر جو قرضہ شاہی ہے اور جس کی ڈگری ہوچکی اور جس جس کا دستگرداں یا رقعہ یا تمسک کی بابت ہے اور جس کی قسط بندی بھی ہوگئی عام اس سے کہ قارض ملازم شاہی ہو یا اسم فرضی یا بازار کا سوداگر یا مہاجن وغیرہ بس قیمت اشیا رجو واجب و عین المال ہے۔ اس کی اصل قیمت قائم کر کر اس قدر مسلم رکھا جاوے باقی بد۔ اور مسوخ تخمینہ لاگت عمارات کا بھی بمعیت کمیٹی و صاحب انجینیر کے ٹھیک ٹھیک لگا کر حساب شاہی سب کا خورد کر کرا و سیکو مسلم گرداکر اس کل قرضے اور سفاضل کی میزان کر کر منجملہ لاکھ روپیہ تنخواہ شاہ کے جس میں سے وہ صاحب ماہانہ قسط قرضہ ادا کرتے ہیں۔ مگر خائن غابن اہلکار آپ ہی شیر مادر کر جاتے ہیں ہر قرضے کی قسط بندی مقرر کر کر بآسانی ادا کرادیا جاوے۔ اور آئندہ کو ممانعت ہو کہ کوئی نقد و جنس قرض نہ دے ورنہ نالش اس کی سماعت نہ ہوگی۔ اسمیں تغلب سب نکل جاوے گا۔ بلکہ چھٹی کا دودھ بھی حرام خوروں کا لبوں پر آوے گا سب قارض کی حق رسی ہو جاویگی سب سرکار کے مشکور ہونگے۔ اور شاہ بخیر کوئی دن زندگی کا چین اور استقلال سے گزرائیں گے۔ اگر یہ نہوا تو پچھلے قرض اور رقعہ اور ڈگریوں میں ان کا کام تمام ہو جاوے گا۔ اور ہوگیا ہے قابل شرکت کمیٹی بخبر دیانت الدولہ کے کہ واقعی اسم باسمی شخص یکرنگ و ایماندار ہے اور مطلع صادق۔

ملازم شاہی میں کئی بڑے بڑے آدمی ایسے ہیں جنکا حکم سرکار سے اخراج کلٹ مگر حیلہ حوالہ سے ابتک شاہ کا پیچھا نہیں چھوڑتے دبی برباد اور بدنام کرتے ہیں اونکی بدوضعی بدمعاملگی اور باطنی تنک حرامی زمین سے آسمان تک روشن ہے وہ بھی مردود محروج ہوں غرض شاہ کو کیئی بیا مسہل دیا جائے جس سے یہ سب سدے دور ہو جاویں جب تو مرض کہنہ کو شفا ہوگی ورنہ بے حکیم خطرہٴ جان ہے۔

ساتھ اس کے علاوہ باہر کے قرضخواہوں کے شاہ کا حساب لاکھوں روپیہ کے مال خانے اور توشہ خانے اور نقد وجنس وغیرہ کا جو اونکی اہالی سے متعلق ہے بحضور کمپنی، صاحب ایجنٹ وغیرہ اوس سے سمجھا جاوے دیسیاری کا جو ہاجب ٹھنڈا اور خوش مزا شفاف پارہ دیکھ کر پی جاتا ہے پھر اس سے ہلا نہیں جاتا غرض مال مست لوگ کھا کھا کر ایسے بھاری ہو گئے ہیں کہ مثل قارون کے زمین کے میخ ہو گئے. نکالے سے کبھی نہیں نکلنے شاید نیچے سے سرنگ لگے تو اوڑ جاویں مگر کھایا پیا سب خاک میں مل جاوے گا. چاہیئے کہ پہلے اونکا حال قال پوریا بوریا سنبھال لیا جاوے ہند کے باشندوں کا تو خیریت سے کہیں زمین کے پردے پر کھوج بھی مل جاویگا. اور جو حال کے مچھلی ہے وہ اگر کہیں کشمیر کے ڈل میں غوطہ لگا کر سون کھینچ گئی تو ہزار ہا مانجھی جال ڈالیں اور نہایو اور دہیان سو بکاریں مگر خبر بھی نہ ملے گی خبر شرط ہے۔

(تنبیہ) اب ایک اندیشہ باقی رہا کہیں گیہوں کے ساتھ گھن نہ پس جاوے یا لئے کے ساتھ کوئی گوشت کا ٹکڑا اجان کر شلغم نہ کھا جاوے اس واسطے ہم سب اصحاب کو آگاہ کرتے ہیں کہ اس حساب کتاب اور تغلب اور بدر میں کہیں بیچارے منشی صفدر صاحب کا کچھ روپیا یا حساب کتاب جو قریب ۲۰ لاکھ وہ اپنا ذمہ شاہ کے بتاتے ہیں نہ مارا جاوے (راے صاحب اودھ اخبار میں ایک سوال کے جواب میں بڑے شش و پنج میں ہوں یعنی ایک بزرگ مجھ سے یہ بات فرماتے ہیں کہ شاہ مظلوم گونگے زبان ہیں. یہ منشی صفدر صاحب لسان السلطان کہاں سے ہو گئے آپ بڑے زبان آور ہیں اور سائل زبان دراز اب براہ زبان وانی ضرور ایک جواب دندان شکن ایسا دیجیے کہ زبان زد ہو جائے اور پھر سوال سائل زبان پر نہ آئے جراحات السنان لہا التیام؛ و مالا یلتیام ماجرح اللسان تا لوگ آپ کو مجیب کہیں اور جواب کو عجیب آمین یا مجیب الدعوات آمین؛

چند اصحاب یہ بھی متفسر ہیں کہ منشی صاحب بے نشان لا مکان تھے صرف سے رکے نواب منور الدولہ کے نوکر رہے اونکی جہت سے دربار شاہ تک راہ پائی اور کوئی کارندہ نہ تھا ذوالفقار الدولہ کی ناکاروائی اور کاہلی نے اُنکو محیط اور قابو یافتہ کر دیا وہ بیک بینی و دو گوش آئے تھے اب لاکھوں کے آدمی کہاں سے ہو گئے۔ جن کا ۲۰ لاکھ بادشاہ پر فاضل ہے جس کے وہ شاہ سے دعویدار ہیں اور چند کوٹھی اور نوٹ شاہی اپنے نام سے لیے اور عدالت میں آپ کو سوداگر لکھاتے ہیں نام ملازمت شاہی سے یہ عار ہے اُنکے پاس یہ دولت کہاں سے آئی. کشمیر کے سوداگر اعلیٰ تو پشمینے کے ہیں اور ادنیٰ پشمینہ باف اور سب پشم فروش یا کاتب یا ماہی گیر یا قلی اس سرد ملک سے اگر ایک وقت کھانے کو ملے تب بھی باہر نہیں آتے. منشی صاحب یا اُنکے بزرگ کس چیز کے سوداگر تھے ایک سوداگر کا اور فرقہ بھی ہے جو کابل ایران لاہور شمند کلکتہ تک ہوتی ہے. سبحان اللہ دولت حسن بھی کیا چیز ہے ہم اس کے جواب سے بھی قاصر ہیں. عقل کام نہیں کرتی مگر ہم اس قدر رائے دیتے کہ منشی صاحب یہ کہدیں کہ ہم نے منور الدولہ سے نیکی صرف کیا تھا اور پھر چپکے سے لو اکر بیٹھ رہیں ورنہ کشمیر لے گئے تو وہاں عملداری جس بیدار مغز کی ہے ظاہر ہے وہ نہ ہو کہ ع زر زر گشتہ در جہاں گنج گنج۔

پھر ایسا ادس تہ لگے گا حضرات کشامرہ کی وفاداری اور شرافت اور خوبیوں کی ایک کتاب منشی صاحب نے تالیف کی ہے خداوہ صحیفہ ہم پر نازل کر دے تو ہم بے نقط تفسیر اس کی لکھیں جس سے سب کو عبرت ہو اور حیرت ع من خوب مے شناسم ابلیس بے وقارا فقط راقم کلمتہ الخیر (اودھ اخبار مطبوعہ ۴ جون ۱۸۶۲ء صفحہ ۳۷۵ لغایتہ ۳۷۷)

کوائف شاہ اودھ

نامہ نگاران اخبار نامہ اردہ گائیڈ مقام موچی کھولہ سے ایسا لکھتے ہیں کہ یہ سراپا نیاز عرصہٴ دراز ہوا کہ آپ کی طرف سے اس بات کا مجاز ہے کہ گاہ گاہ بارگاہ سلطانی کے اخبار کہ سلطان الاخبار ہے آپ کی خدمت میں لکھا کروں مگر کثرت کار و ہجوم افکار سے لکھنا

دشوار ہے اور نہ لکھنا ناگوار چار و ناچار یہ چند سطور مسطور ہوتی ہیں امید کہ شرف قبول پائے اور آپ کے پرچہ اخبار میں چھپ جائے۔ کئی سال سے یہ شکستہ بال یہاں کا حال بریں منوال دیکھتا ہے کہ بہت سے دولہ جمع ہوکر کچھ میں لوں کچھ تو لے کر رہے ہیں اور دولت خانہ سلطانی کو خالی کر کرا اپنا گھر بھر رہے ہیں۔ انھیں کارندوں کے کردار سے یہ سرکار عالی وقار گورنمنٹ انگلشیہ کے دربار میں غیر منتظم اور غفلت شعار ٹھہرائی گئی اور ایک عالم میں اس سلطان عالم کی بدنامی ہوئی خلق نے ناحق اس شاہ بیگناہ کو بدنام کیا اور اُن کو چھوڑ اِن کو الزام دیا ان پر الزام اس وقت لاکلام ہوتا کہ ان کا کوئی حکم باعث خلل نظام ہوتا سو حضرت کی کیفیت یہ ہے کہ ہر ہر کام کا انتظام اس کارخانہ کے مدار المہام کے ید اقتدار میں دیا ہے اور اپنے کو اس کے خیر و شر سے بری کیا ہے کسی طرح کا دین لین اپنے ذمہ نہیں لیتے اور کسی تمسک اقرارنامے یا حسابات کارخانجات پر دستخط نہیں کرتے ہم ان کو غافل تب کہتے کہ قبالجات پھیر نہ لیتے اور پر امیسری نوٹوں کا معاملہ بے تصفیہ چھوڑ دیتے اس کا قصہ یوں ہے کہ بادشاہ نے کئی لاکھ روپئے اپنے کارندوں کو حوالے فرمائے۔ کہ کئی قطعہ مکان بنام بندگان عالیشان سلطان مول لیویں اور قبالجات داخل خزانہ سلطانی کردیویں مگر اُن کارندگان خوش اطوار کے کردار سنیئے کہ چند کوٹھیاں تو خریدکیں مگر قبالجات احمد محمود کے نام لکھوا لیے اور بادشاہ سے یہ کہدیا کہ پیر و مرشد خانہ زاد نے حسب فرمان واجب الاذعان مکان مول لیا اور غلامان شاہی کا اس پر قبضہ کر دیا باقی رہا قبالجات سو بعض ضروریات کے سبب بندے کے ہاتھ میں ہیں۔ اب یہاں ہوشیاری و دانش شعاری اس بادشاہ خجستہ اختر مروت پیکر کی سنیئے کہ اُس وقت کثرت مروت اور شدت رافت سے چپ رہ گئے اور بھولے بنکر درگزر فرمایا اور ایک عرصہ دراز تک خاموش رہ کر رنگ دیکھا کئے آخر جب دیکھا کہ یہ لوگ تمام ہضم ہی کرنے کی فکر میں ہیں تب کئی بار بطور تذکار اُن قبالجات کو پوچھا نوٹوں کا ذکر کیا مگر انھوں نے مال مردم خوری کے طریقے سے سمجھا دیا اور ایک پرزہ نہ دیا تب تو بادشاہ نے تنگ طلبی کی اور جس طرح بن پڑا قبالجات کو بدلوا اپنے نام کرلیے اور نوٹ جو وہ رکھتے وہ لے لیے جو عدم اطلاع میں سلطان عالم کے بک گئے وہ واپس آنے والے ہیں اب دیکھیے کہ یہ ہوشیاری ہے یا غفلت شعاری بیدار مغزی ہے یا ناتجربہ کاری۔ ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ گورنمنٹ نے بمقتضائے اتحاد اور اسی وجوہ بیدار مغزی سے بادشاہ کو مواخذہ دیوانی و فوجداری سے بری الذمہ کیا کہ جی کھول کے ایسے معاملات کارندوں سے سمجھ لیویں لیکن مفصل معلوم نہیں کہ اصلاح ان امور میں کون کارندہ ذریعہ خیرخواہی ہوا۔ آئندہ جو دریافت ہوگا عرض کریں گے فقط

دوربین

(اودھ اخبار مطبوعہ ۲۵ رجون ۱۸۶۲ء صفحہ ۴۲۵)

"دیوان افسر" بقیہ صفحہ ۱۳

جو می ابلیس نے آکر ذقن غیبت گو

قطعات ۶ ہیں: ۱۔ نعت و منقبت۔ ۲۔ تہنیت جلوس فعت الدولہ (غازی الدین حیدر) ۳۔ تاریخ غسل صحت سعادت علی خاں (مادہ "نہایا بتایید سبحان پاک وزیر الممالک میان دو عید": ۱۲۱۸) ۴۔ تاریخ وفات مفتی غلام حضرت (مادہ "روح نے خلد میں کیا ہے مقام: ۱۲۳۵) ۵۔ تاریخ ٹھاکر دوارا لالہ فتح چند وچھمن رام "فیض مجسم ٹھاکر دوار ۱۸۱ (۱۸۷۱ سمبت) ۶۔ قطعۂ تاریخ وفات مصحفی۔ رباعیاں جن میں ایسے دوبیتی قطعے بھی شامل ہیں جن کی بیت اول مصرع ہے ۱۲ ہیں۔ وہ رباعیاں یہ ہیں:

افسر غم عشق دل سے کھونا معلوم
جی وصل صنم سے شاد ہونا معلوم
مثل شب ہجر عمر رفتہ میں کٹی
آرام سے بجز مرگ سونا معلوم

ہمبزم کی تیرے بات ہم نے کاٹی
یا خیمے کی شب قنات ہم نے کاٹی
بد بر ہوا اس قدر کہ پھر بات نہ کی
رو رو کے تمام رات ہم نے کاٹی

دیوان کی بیت آخر یہ ہے:

ہو علی حیدر بعطائے علی
گلشن عالم میں بعشرت مقیم

دیوان میں ورق ۱۳ الف سے (۹) تک حاشیے میں نثر جس کے آغاز کی عبارت یہ ہے: "بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ مثل نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی اس کا اصل مطلب یوں سنا جاتا ہے۔"

غالبیّہ ـــــــ دوسرا باب

اکبر علی خاں

اس بار غالبیہ کا دوسرا باب شایع کیا جا رہا ہے۔ اس میں ایسے حضرات کی اطلاعات کو نقل کیا گیا ہے جو غالب سے ملاقات کے مدعی ہیں۔

غالب بڑے وسیع تعلقات والے تھے۔ ان کی شہرت بھی کم نہ تھی۔ اطراف و جوانب سے جو لوگ دہلی آتے تھے اُن میں سے نہ معلوم کتنوں کے لیے غالب کی ذات باعث کشش ہوتی ہوگی۔ خود دہلی بھی مجمع صاحبان تصانیف و تالیف تھی اور اُن میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جو غالب کو نہ جانتا ہو مگر غالب کے اس وسیع حلقے میں سے صرف چند اشخاص ہی ایسے نکلے جنھوں نے اپنی ملاقات کو قلم بند کیا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر تاسف کی بات یہ ہے کہ ان میں سے بعض کی حیثیت صحیح معلومات کے پیش نظر مشکوک ہے۔ مثال کے طور پر امجد علی اشہری کا بیان سراسر غلط معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ نہ صرف غالب کا الہ آباد جانا کسی اور ذریعے سے ثابت نہیں ہوتا بلکہ آخر عمر میں کوئی بھی سفر قرین قیاس نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اشہری کلنے اپنی کم عمری کی بنا پر کسی دوسرے صاحب کو غالب سمجھ لیا ہو۔

اسی طرح صفیر بلگرامی کے بیان کے بعض حصے بھی غور طلب ہیں جنھیں بغیر پوری جانچ پڑتال کے قبول نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں غوث علی شاہ قلندر اور ریاض الدین امجد کی تحریریں اپنی قدامت کے لحاظ سے بڑی اہم ہیں اور ان کی صداقت پر بھی کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔

آج کی صحبت میں ان سب تحریروں کو پیش کیا جا رہا ہے، یقین ہے کہ ان کے ذریعے غالب کی تصویر کو کچھ ایسے رنگ ملیں گے جو ان کی شخصیت کو نمایاں کرنے اور ان کی تعارفی علامات کو زیادہ یقینی اور مضبوط بنانے میں مدد دیتے ہیں:

تذکرہ غوثیہ ——— سید غوث علی شاہ قلندر

ایک روز ہم مرزا نوشہ کے مکان پر گئے۔ نہایت حسن اخلاق سے ملے۔ لب فرش تک آکر لے گئے۔ اور ہمارا حال دریافت کیا ہم نے کہا کہ مرزا صاحب ہم کو آپ کی ایک غزل بہت پسند ہے علی الخصوص یہ شعر:

تو نہ قاتل ہو کوئی اور ہی ہو　　　تیرے کوچے کی شہادت ہی سہی

کہا صاحب یہ شعر تو میرا نہیں کسی استاد کا ہے فی الحقیقت نہایت ہی اچھا ہے

غزل مرزا نوشہ

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی　　　میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے　　　کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے　　　غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو　　　آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی
عمر ہر چند کہ ہے برق خرام　　　دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں　　　نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلک نا انصاف　　　آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے　　　بے نیازی تری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے اسد　　　گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

اس دن سے مرزا صاحب نے یہ دستور کر لیا کہ تیسرے دن زینت المساجد میں ہم سے ملنے کو آتے اور ایک خوان کھانے کا ساتھ لاتے۔ ہر چند ہم نے عذر کیا کہ یہ تکلف نہ کیجے مگر وہ کب مانتے تھے۔ ہم نے ساتھ کھانے کے لیے کہا تو کہنے لگے کہ میں اس قابل نہیں ہوں میخوار، روسیاہ، گنہ گار مجھ کو آپ کے ساتھ کھاتے ہوئے شرم آتی ہے البتہ اولش کا مضائقہ نہیں۔ ہم نے بہت اصرار کیا تو الگ طشتری میں لے کر کھایا۔ ان کے مزاج میں کمال کسر نفسی اور فروتنی تھی۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف فسانۂ عجائب لکھنؤ سے آئے۔ مرزا نوشہ سے ملے۔ اثنائے گفتگو میں پوچھا کہ مرزا صاحب اردو زبان کس کتاب کی عمدہ ہے۔ کہا: چار درویش کی۔ میاں رجب علی بولے: اور فسانۂ عجائب کیسی ہے۔ مرزا بے ساختہ کہہ اٹھے: اجی لاحول ولا قوۃ اس میں لطف زبان کہاں۔ ایک تک بندی اور بھٹیار خانہ جمع ہے۔ اس وقت تک مرزا نوشہ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی میاں سرور ہیں۔ جب چلے گئے تو حال معلوم ہوا۔ بہت افسوس کیا اور کہا کہ ظالمو! پہلے سے کیوں نہ کہا۔ دوسرے دن مرزا نوشہ ہمارے پاس آئے۔ یہ نقصہ سنایا اور کہا کہ حضرت یہ امر مجھ سے نادانستگی میں ہو گیا ہے۔ آیئے آج اُن کے مکان پر چلیں اور کل کی مکافات کر آئیں۔ ہم اُن کے ہمراہ ہو لیے۔ اور میاں سرور کی فرودگاہ پر پہنچے۔ مزاج پرسی کے بعد مرزا صاحب نے عبارت آرائی کا ذکر چھیڑا اور ہماری طرف مخاطب ہو کر بولے کہ جناب مولوی صاحب رات میں نے فسانۂ عجائب کو جو بغور دیکھا تو اُس کی خوبی عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں نہایت ہی فصیح و بلیغ عبارت ہے۔ میرے قیاس میں تو ایسی عمدہ نثر نہ پہلے ہوئی نہ آگے ہوگی اور کیونکر ہو اس کا مصنف اپنا جواب نہیں رکھتا غرض اس قسم کی بہت سی باتیں بنائیں۔ اپنی خاکساری اور ان کی تعریف کر کے میاں سرور کو نہایت مسرور کیا۔ دوسرے دن اُن کی دعوت کی ہم کو بھی بلایا۔ اُس وقت بھی میاں سرور کی بہت تعریف کی۔ مرزا صاحب کا مذہب یہ تھا کہ دل آزاری بڑا گناہ ہے اور در حقیقت یہ خیال بہت درست تھا۔ المومن من سلم المسلمون من یدہٖ ولسانہٖ

مباش در پئے آزار و ہر چہ خواہی کن　　　کہ در طریقت ما غیر ازیں گناہے نیست

ایک دن ہم نے مرزا غالب سے پوچھا کہ تم کو کسی سے محبت بھی ہے؟ کہا: کہ ہاں حضرت علی مرتضیٰ سے۔ پھر ہم سے پوچھا کہ آپ کو؟ ہم نے کہا کہ واہ صاحب آپ تو مغل بچہ ہو کر علی مرتضیٰ کی محبت کا دم بھریں اور ہم اُن کی اولاد کہلائیں اور محبت نہ رکھیں کیا یہ بات آپ کے قیاس میں آسکتی ہے۔
(۱۰۰ - ۱۰۲)

ایک روز راقم خدمت میں حاضر تھا کسی شخص نے مرزا تو شہ صاحب کے انتقال کی خبر سنائی۔ آپ نے فرمایا: انا للہ و انا الیہ راجعون۔

کھال دھونتی رہ گیو اور نر بجھ بجھے انگار — اہرن کو ٹھمکو مٹو اور اٹھ گئے میت لوہار
سدا نہ پھولیں توریاں اور سدا نہ ساون ہوئے — سدا نہ جوبن تھر رہے اور سدا نہ جیوے کوئے

شنیدم کہ در روزگار کہن — شدہ عنصری شاہ صاحب سخن
چو اورنگ از عنصری شد تہی — بفردوسی آمد کلاہ مہی
چو فردوسی از دار فانی گذشت — نظامی بملک سخن شاہ گشت
نظامی چو جام اجل درکشید — بسر چتر اشعار سعدی رسید
چو اورنگ سعدی فرو شد زکار — سخن گشت بر فرق خسرو نثار
وزاں پس چو نوبت بجامی رسید — جہان سخن را تمامی رسید

علدم ہے یا کوئی کوہ ہے صنم ہے — چلی جاتی ہے داں خلقت خدا کی

نہایت خوب آدمی تھے عجز و انکسار بہت تھا۔ فقیر دوست بدرجۂ غایت اور خلیق از حد تھے۔ ایک روز ہم ان کے پاس گئے تو انھوں نے اپنے یہ دو قطعے پڑھے تھے:

قطعہ

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار — ساقی و مغنی و شرابی و سرودی
زنہار از آن قوم مباشی کہ فریبند — حق را بسجودی و نبی را بدرودی

قطعہ

بروز حشر الٰہی چو نامۂ عملم — کنند باز کہ آن روز باز خواہ من است
بکن مقابلہ آن را ز سرنوشت ازل — اگر زیادہ و کم باشد آن گناہ من است

رند مشرب، بے شر، رحم دل تھے۔ اور فن شاعری میں تو اپنا جواب نہ رکھتے تھے لیکن افسوس یہ ہمارے محب بھی چل دیے۔

ندی ناؤ کا بیٹھنا پلک ایک کی بیت — پل میں بچھڑے جات ہیں یہی جگت کی ریت
ہم دیکھیں جگت جات ہے جگر دیکھے ہم جائیں — ہم تو بیٹھے راہ پر کس کس کو پچھتائیں
(۳۵۵ - ۳۵۶)

سرورِ ریاض ـــــــ شیخ محمد ریاض الدین امجد

بیان قلعہ معلیٰ میں جانے کا اور جناب مستغنی عن الالقاب مرزا اسد اللہ خاں غالب دام افضالہم کی ملاقات سے لطف اٹھانے کا:

چھبیسویں جولائی (۱۸۶۰ء مطابق ۶ محرم ۱۲۷۷ھ) کو صبح کو اٹھا۔ دہلی کے قلعے میں اکبر آبادی دروازے سے پہنچا۔ یہاں پہلے چھوٹے چھوٹے کچے پکے مکان ہندستانی طور کے غریبوں نے اور بڑے بڑے انگریزی وضع کے بادشاہ زادوں اور امیروں نے بنائے تھے۔ ہر طرح کا تکلف تھا، خوب سجائے تھے لیکن بہ نظر صفائی ان کو سرکار انگلشیہ نے مسمار کر دیا۔ میدان ہموار کر دیا۔ دیوان عام میں خاص گوروں کا مقام ہے۔ اور دیوان خاص میں عام صاحب لوگوں کا قیام ہے۔ دیوان عام آگرے کے دیوان عام سے چھوٹا ہے اور دیوان خاص آگرے کے دیوان خاص سے بڑا ہے۔ اور سامنے مہتاب باغ ویران پڑا ہے۔ لیکن بادشاہی چھپّر تا حال ویسا ہی بنا ہے۔ یہ نہیں ٹوٹا ہے۔ پہلے یہاں دکانیں تھیں بازار آباد

تھا ہر شخص شاد تھا کہتے ہیں کہ یہ جگہ ٹکسال تھی۔ جھل جھلا کر تیز اوپر آدمی چڑھ جاتا تھا۔ بول چال اچھوں کی بن جاتی تھی۔ حوصلہ بڑھ جاتا تھا۔ وہاں سے کلکتے دروازے سے نکل کر سرن داس کے باغیچے کے نیچے ہو کر نئے پل کے اوپر پہنچا۔ اور سلیم گڑھ اور نیلی چھتری کی طرف دور سے دیکھ کر کہ پاس جانے میں دیر ہوتی تھی، نہلنے والیوں کے دیکھنے کی اور نگم بود گھاٹ پر آنے کی جلدی تھی۔ نگم بود کے گھاٹوں پر گیا۔ ان گھاٹوں کی اچھی تعمیر ہے۔ عمارت دلپذیر ہے۔ پختہ ہیں خام نہیں بدنمائی کا نام نہیں۔ بند ان کے گھاٹوں کے برابر نہر کے گھاٹوں سے بہتر عورتیں ہر قسم کی نہاتی تھیں کوئی نہاتی تھی کوئی بال کو سکھاتی تھی۔ کوئی ماہ پارہ سورج کی پوجا کرتی تھی اور کوئی زہرہ جبیں ماتھے پر قشقہ بھرتی تھی، رخساروں پر چھلپے لگاتی تھی الغرض نگم بود گھاٹ سے بڑھ کر نگم بود دروازے سے نکلا سیگہ زین کی طرف چلا۔ یہ دو بڑے انگریزی مکان ہیں نہایت عالی شان ہیں اور نہر کے کنارے پر چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بڑے تماشے کی بنی ہیں۔ اندر بینچکیاں لگی ہیں۔ باہر ان کا عجب تماشا تھا بڑی دیر تک دیکھا کیا۔ بعد اس کے ہوا کھاتا ہوا بادل پورے میں گیا۔ پھر منصور علی خاں کی حویلی میں کہ اب بھی وہاں عمارات وسیع اور مکانات رفیع، دروازہ عالی شان، مکلف مکان صحن کشادہ، صاف گلی کوچے شفاف موجود ہیں، لیکن آدمی مفقود ہیں، ہوتا ہوا بیگم کے باغ میں آیا۔ یہ باغ بہت آراستہ پیراستہ پایا۔ اب کمپنی باغ اس کا نام ہے۔ کیفیت کا مقام ہے سرکار دولت مدار نے نئے سرے سے مرتب کیا ہے روش سڑکوں سے درست کر دیا ہے۔ بیچ میں نہر جاری روز بروز بڑی طیاری ہے۔ روشیں بلند ہیں سڑکیں اہل فرہنگ کو پسند ہیں۔ ہر طرف باغ میں نہریں رواں ہیں آبشاریں رواں ہیں۔ روشوں کے کناروں پر دوب لگائی ہے اچھی رنگت چھائی ہے۔ غرض کہ آم اور جامن اور مولسری کے پرانے پرانے پیڑ تھے اور نیچے مولسری کے درختوں کے نیچے گرے ہوئے پھولوں کے ڈھیر تھے۔ خدا بخش نے دو چار سو پھول اٹھائے ایک ہار گوندھا تین گجرے بنائے۔ اور تھوڑے سے مرزا نوشہ کے مکان پر جس کا ذکر آگے آوے گا گر پڑے سو وہیں چھوڑ آئے۔ وہاں سے خواص پورے میں جہاں عام لوگوں کی بستی تھی اور علی الخصوص میاں نیاز علی نے پہلے یہاں سکونت کی حویلی لی تھی پہنچا۔ وہاں سے سرائے میں آیا۔ یہاں تین دروازے عالی شان ہیں اور بیچ میں ایک دروازہ ہے اس میں خدا بخش خیاط کی دکان ہے۔ اب بھی پانچ چار وہاں بڑے بڑے مکان ہیں پھر چاندنی چوک میں ہوتا ہوا بلی ماروں میں ہو کر شیر افگن خاں کی بارہ دری میں جہاں جناب اسد اللہ خاں غالب عرف مرزا نوشہ رہتے تھے گیا۔ مرزا کی ملاقات سے شرف یاب سعادت ہوا۔ سبحان اللہ ذات جامع الکمالات کے اوصاف خارج از شرح و بیان ہیں۔ یہ سر آمد زبان دانان شیراز و صفاہاں ہیں۔ مغتنمات روزگار نفیس الطبع، قدیم الوضع، عالی وقار، والا تبار، ناخدائے سفینۂ سخن وری، در یکتائے بحر معنی پروری آسمان زمین ذی کمالی، نو زبان نازک خیالی مجموعہ اوراق خرد مندی شیرازۂ اجزائے جرائد معنی بندی، مہر سپہر بلاغت اسد بیشۂ فصاحت رشک انوری روشن طالب حق تو یہ ہے کہ شعرائے ماضی و حال ہر فن شاعری میں غالب۔ قد میانہ نہیں بلکہ دراز، اکبر آباد کے سارے انداز کترے ہوئے سفید کچھ سیاہ داڑھی کے بال، گورے چٹے خوبصورت مدرجۂ کمال لازالت شموس بلاغتہ طالعاً و غمام فصاحتہ متقاطراً۔ میاں نیاز علی نے میری طرف اشارہ کیا کہ یہ بھی شاعر ہیں۔ اس فن میں کچھ کچھ ماہر ہیں۔ فرمایا کہ کچھ سنائیے، طبع کے جوہر دکھائیے، غرض کہ ہیچ مداں نے دو غزلیں ایک فارسی دوسری اردو کی سنائیں۔ مرزا نے سن کر تحسین جس کے سزاوار نہ تھا فرمائیں۔

غزل فارسی

شنیدم از صبا من آید اینک شہسوار من — زبان دادم کہ برخیزد بہ تعظیمش غبار من

ہمی آید صبا اکنون زیدت بر مزار من — غبار خاطر او گشت شاید این غبار من

گذار اے باغباں مارا گماں دزدی مظلم — کہ گلہا نیستند ایں لخت دل اندر کنار من

مدام ادی سخن پر دلہا آں لو نکتہ اہتم — عروس فکر ہر شب می نشیند در کنار من

ریاض آرزوی وصل آں گل چاک گردیدم
کہ زیں سودا چو آتش سوختہ آخر مشت غبار من

غزل اردو

پھر وہ آئے گھر میں مجھ ناکام کے — کٹ گئے دن گردش ایام کے

وہ اُٹھے پہلو سے ہم بیٹھے رہے — دل کو سینے کو جگر کو تھام کے
لائے ہاتھوں ہاتھ اہلِ کارواں — ورنہ ہم تھے ایک دو ہی گام کے
ہاتھ اٹھاؤ ہمرہانِ قافلہ — اور ہیں ہم ایک دو ہی گام کے
عشق جس کو ہے وہی انسان ہے — ورنہ یہ سب آدمی ہیں نام کے
یہ صدائے قیس تھی اور جذبِ شوق — ناقۂ لیلیٰ کو ٹھہرا تھام کے
تپ سے اک فرحت ہے تیرے عشق میں — ولولے ہیں الجزئے سرسام کے

خوب لکھی ہے غزل تم نے ریاضؔ
کیوں نہ ہو قابل ہو تم انعام کے

اور اسی غزل میں مرزا کے ایک شعر میں دوسرا اشعرا اپنا ملا کر چار مصرعوں کا ایک قطعہ بنایا تھا۔ غیر وہ بھی سنایا تھا۔

قطعہ

اب نہیں ہیں اپنے مصرف کے ہم — رات کے دن کے نہ صبح و شام کے
عشق نے غالبؔ نکما کر دیا — ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

جب یہ زبان پر لایا تو مرزا نے برجستہ یہ فرمایا کہ اسے یوں نہیں یوں کہو کہ ضعف نے غالب نکما کر دیا یا دہرے غالب نکما کر دیا۔ عشق کیسا عاشقی کا وہ زمانہ نہ رہا پھر ارشاد کیا کہ ریختی زبان میں اچھے معنی نکالتے ہو، خاصے شعر ڈھالتے ہو۔ الحاصل دلّی کے ثقات لکھنؤ کے حضرات ہندو مسلمان یہ پیر و جوان ملکہ ایک نتھ کا بھی خیر آباد کا رہنے والا آفت کا پرکالہ مولوی فضل حق کا نواسہ سن میں ذرا سا قطبی میر پڑھتا تھا بات بات میں لڑتا جھگڑتا تھا حاشیہ نشینان بساطِ ادب تھے، اہلِ کمال سب کے سب تھے بعدہ مرزا نے تین بند مرثیے کے اپنی تصنیف کے سنائے۔ لوگ روئے پیٹے چلّائے۔ وہ بند میں نے طلب کیے مرزا نے اپنے دستِ خاص سے لکھ دیے۔

مرثیہ

ہاں اے نفسِ بادِ سحر شعلہ فشاں ہو — اے دجلۂ خون چشمِ ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قم لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو — اے ماتمیانِ شہِ مظلوم کہاں ہو

بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تابِ سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہم کو — ماتم میں شہِ دیں کے ہیں سودا نہیں ہم کو
گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو — گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو

یہ خرگہ نُہ پایہ جو مدت سے بجا ہے
کیا خیمۂ شبیر سے رتبے میں سوا ہے

کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے جہاں کا — کچھ اور ہی نقشہ ہے دل و چشم و زباں کا
کیسا فلک اور مہرِ جہانتاب کہاں کا — ہوگا دلِ بے تاب کسی سوختہ جاں کا

اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے
گرتا نہیں اس رُو سے کہو برق نہیں ہے

مرزا خود فرماتے تھے کہ یہ حصہ دبیر کا ہے۔ وہ مرثیہ گوئی میں فوق لے گیا ہے ہم سے آگے نہ چلا ناتمام رہ گیا۔ . . . (ص ۲۱ - ۲۷)

اُس دن شہادت کی رات تھی۔ لیکن تعزیہ داری کا کیا ذکر یہ عجیب بات تھی۔ اول تو وہاں پہلے ہی تعزیہ داری نہیں ہوتی تھی دوسرے غدر کے

سب سے کسی میں وسعت نہ رہی زیادہ تر کم ہو گئی۔ سچ جو پوچھو تو یہاں ہر ماہ محرم ہے۔ ہر دم تازہ غم دالم ہے۔ اب بھی قدیم مکانوں میں محفلیں ہوتی ہیں۔ جیسے حامد علی خاں اور عالیہ بیگم کے یہاں۔ سو وہاں بے سروسامانی ہے بڑی پریشانی ہے۔ جہاں بڑی طیاری کے علم تھے۔ اب ان کا نشان بھی نظر نہیں آتا ہے۔ امام باڑہ دیکھا نہیں جاتا ہے۔ یوسف مرزا اور حسین مرزا کے یہاں گو افسردگی ہے لیکن دل کو محفل قرینے کی ہوتی ہے۔ وہی بقول جناب فیض مآب اسد اللہ خاں غالب کے کہ اے بھی مرثیہ لکھیے تو ایک کا لکھیے تو حد کیجیے تو دو کا کیجیے جب تمام شہر برباد ہو کر بگڑ جائے تو کیا خاک بن آئے۔ (ص ۴۳-۴۴)

دوبارہ حاضر ہونا اسد اللہ خاں غالب کی خدمت میں اور دیکھنا ایک مجذوب کا اور جانا اکثر بڑے بڑے کوچوں میں اور معائنہ کرنا عمارات خوش اسلوب کا

یکم اگست ۱۸۶۰ء (بارھویں محرم ۱۲۷۷ ہجری) صبح کو جناب مستغنی عن الالقاب اسد اللہ خاں غالب کے مکان پر آیا۔ انھوں نے اگلے پچھلے آگرے کے باشندوں اور میلوں کا تذکرہ فرمایا۔ فارسی کا دیوان دکھایا اور میر طالب علی اور میر نصیر الدین حسین اور منور علی شاہ اور مرزا تقی بیگ کوتوال اور دیگر عمال کے جلسوں کا جو آگرے میں گزرے ہیں جس عہد میں یہ بھی آگرے میں تھے سنایا۔ دیر تک حاضر رہا اور دل میں یہ کہا کہ کیا خدا کی قدرت ہے زمانہ کہیں جوہر سے خالی نہیں رہتا دو چار اہل کمال سب جگہ موجود ہیں افسوس کہ قدر دان نابود ہیں زمان ماتقدم میں کیسے کیسے فاضل اجل شاعر بے بدل اسی شہر مینو بہر میں ہوئے گئے۔ خلوت کدہ عدم میں سوتے گئے۔ علی الخصوص ۱۲۰۹ ہجری میں خواجہ میر درد صاحب کیسے صاحب کمال اہل قال با حال ہوئے جن کا کلام معجز نظام دردمندان عشق کو تریاق تجربہ کا اثر دکھاتا ہے اور بیماران محبت پر کار مسیحائی کرتا ہے۔ مردہ دلوں کو زندگی کا مزہ آتا ہے۔ ازاں بعد ۱۲۲۵ھ میں جناب میر صاحب میر تقی میر صاحب ریختہ گوئی میں صاحب ایجاد ہوئے اجلہ شعرا کے استاد ہوئے۔ اقلیم سخن ان کے قبضۂ قدرت میں آئی انھوں نے صدائے کوس لمن الملکی بلند فرمائی۔ پھر میر سوز صاحب کی آتش بیانی نے حاسدوں کو جلایا۔ وہ تحریر فرمایا کہ آج تک رونق بزم سخن وری ہے۔ سچ جو پوچھیے تو انھیں لوگوں سے ایجاد شاعری ہے۔ اور وہ جو میاں نصیر تھے تو یہ بھی اس فن میں بے نظیر تھے۔ بعد و حسرتی اور ممنون اور شیفتہ ہوئے۔ لوگ ان کے کلاموں پر بھی فریفتہ ہوئے۔ ازاں بعد خاں معروف اور عارف اور احسان کا زمانہ آیا۔ انھوں نے اس فن میں کمال بہم پہنچایا۔ بلکہ شاعری کو خوب چمکایا۔ اور ذوق تو ملک الشعرا تھے۔ اپنے عہد میں یکتا تھے۔ اور مومن خاں یہ شخص جادو بیان عجیب طرح کا انسان تھا۔ اس کی معجز بیانی سے بت بھی سر ہلاتے تھے اور آدمی حق شناس اس قدر بے ہوتے تھے کہ بت بن جاتے تھے۔ لیکن سب کی ایک ہی ہانک تھی ہمیشہ طرز عاشقانہ میں منہ کھولتے بخلاف ناسخ و آتش کہ یہ ہزار داستان تھے۔ سب گھر بولتے تھے موتی رولتے تھے۔ اب صرف مرزا کا دم ہے سو خدا قایم رکھے اس شہر میں دایم رکھے۔ خیر مرزا سے رخصت ہو کر بازار میں آیا ...... (ص ۵۶-۵۷)

غلام غوث بے خبر

آپ کا خط اخیر اکتوبر میں آیا اور میں نومبر کے شروع میں دورے کو جانے والا تھا۔ خیال ہوا کہ دہلی پہنچ لوں، حضرت غالب سے مل لوں تو پھر خط کا جواب، ملاقات کی کیفیت سب ایک ہی دفعہ لکھوں۔

اس کی حقیقت یوں ہے کہ چھٹی نومبر کو یہاں سے روانہ ہوا، رڑکی میں لشکر سے جا ملا۔ جب وہاں سے کوچ ہوا تو حکم ہوا کہ اب دہلی نہ جائیں گے، میرٹھ پہنچ کر موقع ملا جی نہ مانا، دو روز کی رخصت لے کر دلی گیا۔ احباب سے ملنا، شہر کا دیکھنا، مزارات کی زیارت کرنی دو دن میں کیا کرتا۔ بہر حال اور وں سے ایک بار، حضرت غالب سے دو بار ملا، اور انھیں دیکھ کر بہت رنج ہوا۔ فی الواقع اب وہ پیر فانی ہو گئے ہیں، اور بڑی بے لطفی یہ ہے کہ سامعہ بالکل باطل ہے، لکھ کر باتیں ہوتی ہیں، عرصہ دراز کے بعد ملاقات ہوئی، جی چاہے کہ بہت سی باتیں کیجیے، لکھنے میں بھلا کہاں تک کیجیے۔ مگر ہوش و حواس بہت درست شوخی طبیعت اور ظرافت کا وہی عالم، بہ خلاف مولوی صدر الدین خاں کہ ان کے حواس میں بھی فتور کلی ہے ......

(مکتوب بنام عبدالرزاق شاکر بحوالہ احوال غالب ۳۷)

خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی

ایک مرتبہ ہم لکھنؤ سے کشمیر جا رہے تھے، اتفاق سے کچھ دیر کے لیے دلی اترنا پڑا۔ سرائے میں قیام کیا تھا، اسٹیشن پر جانے کے لیے اڈے سے بگھی منگوائی، ابھی بگھی آئی تھی کہ یکایک ہم کو خیال ہوا کہ حسن اتفاق سے دلی آنا ہوا ہے تو مرزا غالب سے بھی ملاقات کر لینی چاہیے۔ فوراً بلی ماروں کا محلہ دریافت کر کے جانے کو مستعد ہوئے، کچھ دور چل کر لوگوں سے پتہ دریافت کیا، اتنے میں ایک صاحب ملاقاتی مل گئے، خیریت پوچھنے کے بعد کہنے لگے، چلیے میں مرزا صاحب سے ملاقات کرا دوں۔

مرزا صاحب کا مکان پختہ تھا، ایک بڑا پھاٹک تھا جس کے بغل میں ایک کمرا اور کمرے میں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اس پر ایک نحیف الجثہ آدمی، گندمی رنگ، اسی بیاسی برس کا ضعیف العمر بیٹھا ہوا، ایک مجلد کتاب سینے پر رکھے ہوئے، آنکھیں گڑوئے ہوئے پڑھ رہے تھے، یہ مرزا غالب دہلوی ہیں۔ جو بگمانِ غالب دیوانِ قاآنی ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

ہم نے سلام کیا لیکن بہرے اس قدر تھے کہ ان کے کان تک آواز نہ گئی، آخر کھڑے کھڑے واپس آنے کا قصد کیا تھا کہ غالب نے چارپائی کی پٹی کے سہارے سے کروٹ بدلی اور ہماری طرف دیکھا، ہم نے سلام کیا، بمشکل چارپائی سے اتر کر فرش پر بیٹھے، ہم کو اپنے پاس بٹھایا، قلم دان اور کاغذ سامنے رکھ دیا، اور کہا: آنکھوں سے کسی قدر سوجھتا بھی ہے لیکن کانوں سے بالکل سنائی نہیں دیتا، جو کچھ میں پوچھوں اس کا جواب لکھ کر دو، نام و نشان پوچھا، ہمارے ساتھ جو صاحب گئے تھے ہر چند انھوں نے تعارف کرانے کی کوشش کی مگر بے سود ہوئی، جب ہم نے نام دیتا لکھا تو کہا: مجھ سے ملنے گئے ہو تو ضرور کچھ نہ کچھ کہتے ہوگے، کچھ اپنا کلام بھی سناؤ، ہم نے کہا ہم تو آپ کا کلام زبانِ مبارک سے سننے کی غرض سے آئے تھے۔ بہت دیر تک اپنا کلام سنایا کیے، پھر اصرار کیا کہ تم بھی کچھ سناؤ، ہم نے یہ مطلع سنایا:

مہ مصر است داغ از رشک مہتابی کہ من دارم ۔ زلیخا کور شد از حسرت خوابی کہ من دارم

(غالب کو 'مہ مصر' کی ترکیب میں تامل ہوا، کہا، ماہِ کنعان سنا ہے، مہ مصر نئی ترکیب ہے، صائب کا شعر سند میں پیش کیا تو مرزا بہت خوش ہوئے)[1] عجیب لطف اور مزے سے اس مطلع کو دہرایا اور حد سے زیادہ تعریف کی، پھر آدمی سے کہا کھانا لاؤ، ہم سمجھے بہ خیال مہمان نوازی تکلف کر رہے ہیں۔ لکھ دیا کہ ہم صرف تھوڑی دیر کے لیے دلی اتر پڑے تھے، ریل کا وقت بالکل قریب ہے، اور بگھی سرائے میں کھڑی ہے اسباب بندھا ہوا رکھا ہے، پا بہ رکاب آپ سے ملنے آئے تھے، اب اجازت چاہتے ہیں، کہنے لگے، آپ کی عنایت اس تکلیف فرمائی سے بڑھ کر کہ میری صورت اور کیفیت ملاحظہ فرمائیں، ضعف کی حالت دیکھی کہ اٹھنا بیٹھنا دشوار ہے۔ بصارت کی حالت دیکھی کہ آدمی کو پہچانتا نہیں ہوں۔ سماعت کی کیفیت ملاحظہ کی کہ کوئی کتنا چیخے مجھ کو خبر نہیں ہوتی، غزل پڑھنے کا انداز ملاحظہ کیا، کلام سنا، اب ایک بات باقی رہ گئی ہے کہ میں کیا کھاتا ہوں اور کتنا کھاتا ہوں اس کو بھی ملاحظہ کرتے جائیے، اتنے میں کھانا آیا، دو پھلکے اور ایک طشتری میں بھنا ہوا گوشت جس میں کچھ شوربا بھی پڑا ہوا تھا، پھلکے کا باریک پرت لیکر دو چار نوالے بمشکل کھائے اور کھانا بڑھا دیا، تعجب ہوتا ہے کہ اس مقدار خوراک پر کیوں بسر کرتے ہیں۔ (اردوئے معلی طبع لاہور)

صفیر بلگرامی

مولف کا دہلی جانا اور حضرت غالب سے شاگردی کا خلعت پانا

سنہ ۱۲۸۰ھ میں بندہ سید فرزند احمد صفیر اپنی دوسری شادی کے واسطے بلگرام گیا، اور بعد شادی کے اپنے نانا صاحب عالم صاحب سجادہ نشین مارہرہ ضلع ایٹہ کی خدمت میں حاضر ہوا، رستے میں فرخ آباد پڑا، وہاں جناب ڈپٹی کلب حسین خاں صاحب بہادر نادر سے ملاقات کا لطف اٹھایا، جب

---

[1] توسین کی عبارت مقدمہ کلیات عزیز سے ماخوذ ہے۔

مارہرے پہنچا اور نانا صاحب کی خدمت سے فیض یاب ہوا، وہاں حضرت غالب کا چرچا اور ان کا ذکر بہت پایا، نانا صاحب سے اور ان سے ایک ربط خاص تھا، مگر لطف یہ ہے کہ ملاقات کی نوبت عمر بھر نہ آئی۔ میں نے خواہش کی کہ حضرت غالب کا شاگرد ہوں، اور ایک عریضہ مع دو غزل فارسی اور دو غزل ہندی کے مارہرے سے روانہ کیا۔ حضرت غالب نے اس کے آٹھویں دن ایک جلد "مثنوی ابر گہر بار" اور جواب میرے خط کا مجھے بھیجا۔ میں نے ایک مخمس قدسی کی غزل پر بہ فرمائش تفضل حسین خاں (جنھوں نے نعت کہنے والوں کا تذکرہ جمع کیا تھا) لکھا تھا اس کو حضرت غالب کے پاس اصلاح کے لیے بھیجکر بلگرام آیا اور وہاں سے آرے پہنچا۔ حضرت غالب نے اس مخمس پر ایک جگہ مقطع میں اصلاح دیکر بھیج دیا۔ جب میں نے بوستان خیال کو اردو کرکے اس کی پہلی ایک جلد مطبع عظیم المطابع پٹنہ میں چھپوائی اور اس کا اشتہار بذریعہ او دھ اخبار مشتہر ہوا، حضرت غالب نے ایک خط مع اس کی قیمت کے میرے پاس بھیجا، میں نے ایک جلد بھیج دی، اس وقت سے خط و کتابت رہی، یہاں تک کہ حضرت کے اشتیاق نے ۱۲۸۲ھ میں بے اختیار مجھے آرے سے دہلی جانے کی تحریک کی اور بے نشان و گمان مارہرے پہنچا اور وہاں سے اپنے منجھلے ماموں حضرت شاہ عالم کے ساتھ مع چند ملازموں کے روانۂ دہلی ہوا۔ ماموں کا یہ قصد تھا نانا صاحب نے اپنے باغ کے آم ایک ٹوکرا لیمے کے قریب دو ہزار کے میرے ساتھ کر دیئے۔ میں علی گڑھ سے دہلی روانہ ہوا، دس بجے شب کو دہلی پہنچا شب تمنا بار اں قلعے کے نیچے بسر کی، صبح کو جامع مسجد کو باہر سے دیکھتا ہوا محلہ بلی ماران میں حضرت غالب کے پاس پہنچا، حضرت برآمدے میں بیٹھے کچھ پی رہے تھے، ماموں صاحب بھی حاضر ہوئے، دیکھ کر بشاش ہو گئے، اس کے بعد میں سامنے موجود ہوا، پوچھا یہ کون ہیں، عرض کیا صفیر، ماموں صاحب نے کہا میرا بھانجا۔ بولے ذرا ٹھہر جایئے، یہ کہہ کر بدقت ہاتھوں کو زمین پر ٹیک کر اٹھے، اور بغل گیر ہوئے، اور برآمدے سے اندر آکر بیٹھے، گرمی کے دن تھے صفر کا مہینہ تھا، حضرت کا لباس اس وقت یہ تھا، پاجامہ سیاہ اور کرتا ململ کا کلی دار، ٹوپی سرخ ٹول کا، بدن میں حرارت، سر کھلا ہوا، رنگ سرخ سفید، منہ پر داڑھی دو انگل کی، آنکھیں بڑی، کان بڑے، قد لمبا، ولایتی صورت، پاؤں کی انگلیاں بسبب کثرت شراب کے موٹی ہو کر اینٹھ گئی تھیں، اور یہی سبب تھا کہ اٹھنے میں دقت ہوتی تھی آنکھوں میں نور موجود تھا، کان کی سماعت میں کچھ ثقل آچلا تھا۔

الغرض اندر آکر بیٹھے، بعد مزاج پرسی کے نانا صاحب کو بہت پوچھا اور کہا افسوس کوئی سبب ایسا نہیں ہوتا جو حضرت کی ملازمت کروں، اتنے میں نواب ضیاء الدین صاحب بھی تشریف لائے، حضرت نے مجھے ان سے ملایا۔ وہ بھی وجیہہ آدمی رئیسوں کی وضع پر تھے، کرتا پہنے، خلطہ دار پاجامہ، سر پر ٹوپی، تسبیح ہاتھ میں، بعد اس کے حضرت نے ان سے میرا حال کہا اور فرمایا یہ میری ملاقات کو آرے سے آئے ہیں، اس کے بعد کچھ ان سے سرگوشی ہوئی، جب وہ اٹھ گئے اور دوپہر قریب ہوئی تو حضرت اٹھے اور مجھے اور میرے ماموں کو اپنا تمام مکان دکھایا، ہر جگہ کا نشان دیتے جاتے تھے کہ یہ مقام فلاں کام کے لیے اور یہ فلاں کام کے لیے، آخر زینے کے پاس آئے اور چھت پر چلے، ہم لوگ بھی ساتھ تھے، اوپر جاکر دیکھا تو بہت بڑی چھت تھی اور اس کے کونے پر ایک کمرا گلی کے رخ پر بنا ہوا تھا۔

لطیفہ: فرمایا بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ یہاں آدھی رات تک دھوپ رہتی ہے، یہ کہہ کر ہنسے اور بولے آپ سمجھے، میں نے کہا سمجھا، یعنی گرمی کے دن میں دہلی کی گرمی اور تمازت آفتاب سے در و دیوار اس قدر جلتے ہیں کہ آدھی رات تک ان کی گرمی فرد ہوتی ہے۔ الغرض پھر کوٹھے سے نیچے آئے اور فرمایا اس مکان کے دکھلانے سے میرا مطلب یہ تھا کہ میرے مکان میں گنجائش نہیں اور آپ مہمان عزیز ہیں، اس لیے ضیاء الدین خاں صاحب کا مکان جو جامع مسجد کے قریب ہے، آپ کے واسطے تجویز ہوا ہے، گو تھوڑا سا دور ہے۔ مگر آرام بہت ملے گا۔ میں نے عرض کی مجھے حضوری ضروری ہے، فرمایا کچھ ایسا دور نہیں ہے، یہ کہہ کر اپنے ایک رفیق کو بلایا اور میرے ساتھ کیا، اس مکان میں پہونچے وہ مکان عالی شان تھا ایک بڑا پھاٹک بر سر سڑک جس پر ایک بنگلہ خوش نما بنا ہوا۔ اس کے اندر ایک خانہ باغ تر و تازہ، اس کے بعد ایک ایوان عالی شان فرش و فروش سے آراستہ، سجا سجایا، اس کی پشت پر محل سرا دونوں بغلوں میں کمرے، غرض بہت خوش آب و ہوا مکان ملا، ہم سب چھ آدمی تھے، اس مکان کے ایک کونے میں سما گئے، الغرض ابھی اچھی طرح سے بیٹھے بھی نہ تھے کہ پانچ خوان جن پر خوان پوش خوش نما پڑے تھے انھیں رفیق کے ساتھ آئے، معلوم ہوا کھانا ہے اور ایک خوان میں خوش رنگ و خوش بو تخمی آم تھے، میں خیال کیا کہ جب یہ آم خود لیسے ہیں پھر میرے ساتھ کے آم بھیجنے کے قابل کب ہیں، الغرض کھانا کھایا بہت مزیدار اور خوش گوار تھا، قورمہ، قلیہ، شیر مال، پلاؤ، زردہ، شیر برنج، متنجن، کباب، پراٹھا، سب کچھ تھا، بعد کھانے آم جو کھلانے

بیٹھا، صورت حرام نظر آتے بالکل کھٹے، میں پورب کے آم کھائے ہوئے تھا، بڑی نفرت ہوئی، اپنے ساتھ کے آم نکال کر ملنے، ساتھ کہیں بہتر پائے، پھر تو نصف نوکر احضرت غالب کی خدمت میں بھیجا، وہاں سے تھوڑی دیر کے بعد ایک رباعی لکھ کر آئی جس کا آخری مصرع مجھے یاد ہے

کھانا نہ اسے کہ یہ پائے ہیں آم

اور سب آم منگا لیے، آم کا شوق حضرت کو بہت تھا، الغرض شام کو میں پھر حاضر خدمت ہوا، آموں کی بہت تعریف کی، قریب مغرب میں فرودگاہ پر آیا، صبح کو نسخہ سفیر رسالہ تذکیر و تانیث لے کر گیا، حضرت نے خود لے کر اُسے دیکھا اور بے عینک کے دیکھا اور دو چار روز میں تمام رسالہ دیکھ ڈالا، اور بہت تعریف کی اور اُس کی تقریظ لکھ کر مجھے دی جو اس رسالے کے ساتھ چھپی ہے اور عود ہندی میں بھی موجود ہے۔

سہ روز کی ملازمت سے طبیعت محظوظ ہوئی رہی، ایک دن قریب دوپہر کے پلنگڑی پر لیٹے ہوئے تھے اور میں قریب پٹی کے حاضر تھا۔ بولے کیوں حضرت برف کا پانی ہو گئے میں نے کہا اگر کوثر کا پانی پینا ہو تو بلوا لیجئے، کہنے لگے ضرور، اور آدمی کو پکار کر کہا کہ فلاں کنوئیں سے پانی لے آؤ، میں نے کہا حضور نے برف کا پانی کہا تھا، فرمایا برف ہی کا ہے، غرض پانی آیا، پیا واقعی سرد تھا، فرمایا یہ ایک کنواں ہے جس کا پانی ایسا ہوتا ہے۔

ایک دن ایک صاحب نے مجھے پوچھا اور مذہب کا استفسار کیا میرے ماموں صاحب کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "منہم" اور میری طرف اشارہ کر کے فرمایا "منا"

ایک دن مرثیے کا ذکر آگیا فرمانے لگے میں نے بھی ایک مرثیہ شروع کیا تھا تین بند کہہ کر دیکھا تو داسوخت ہو گیا دو بند یہ ہیں[1]:

پھر فرمایا کہ واقعی یہ حق مرزا دبیر کا ہے۔ دوسرا اس راہ میں قدم نہیں اٹھا سکتا۔

ایک دن فرمایا کہ آپ کہتے ہوں گے کہ غالب کچھ اچھی اچھی چیزیں کھاتا ہوگا اور میرے کھانے کے لیے معمولی پلاؤ، قورمہ، قلیہ، شیرمال، وغیرہ بھیج دیتا ہوگا۔ آج میرا کھانا دیکھیے، الغرض گیارہ بجے دن کو آپ کا کھانا ایک سینی میں آیا، ایک دسترخوان بچھایا گیا، اس پر ایک چینی کے پیالے میں شوربا اور ایک میں بھرا ہوا گھی گرم کیا ہوا، اور ایک تانبے کی رکابی میں پاؤ بھر گوشت کی بوٹیاں اور تانبے کی رکابی میں تین پھلکے رکھے گئے، اور ایک رکابی تانبے کی خالی، پھر وہ رفیق آکر بیٹھے انھوں نے پھلکوں کے کنارے توڑ توڑ کر کئی ٹکڑے کیے اور خالی رکابی میں رکھے، پھر ایک چمچے سے تھوڑا گھی اور شوربا لے کر ان ٹکڑوں کو ملایا اور خوب ملا کر حلوے کی طرح بنا کر لقمے کے انداز سے ایک طرف رکابی میں رکھ دیا، اتنے میں حضرت پلنگڑی سے اترے اور دسترخوان پر آبیٹھے، پہلے وہ دونوں لقمے نوش جان فرمائے، اس کے بعد آدھا پیالہ شوربا اور آدھا پیالہ گھی کا پی گئے، البتہ آدھ سیر گھی سے کم نہ ہوگا بعد اس کے پھلکوں کے دو چھلکے لے کر شوربا ملا ملا کر کھائے اس پر پھر بقیہ گھی اور شوربا پی لیا اور کھا چکے، اور فرمایا بس میرا کھانا یہی ہے، شب کو پاؤ بھر بادام مقشر نمک میں تلوا کر کھا لیتا ہوں۔

ایک دن نواب ضیاء الدین خاں نے میری دعوت کی، بہت تکلف کا کھانا کھلایا، میں ان کھانوں کی تعریف نہیں کر سکتا۔ بہت دیر تک باتیں ہوا کیں،

ایک دن مولوی صدر الدین صاحب آزردہ کے پاس مجھے لے گئے، ان کے فیض سے بھی کامیاب ہوا

ایک دن پنکھے کے میلے میں دس روپے دے کر اپنے عزیزوں کی طرح مجھے بگھی پر بھیجا، وہ میلہ بھی قابل دید تھا، دہلی کا میلہ کیا کی سیر خود اختیاری بھی خوب کی، جامع مسجد کو دیکھا، سبحان اللہ کیا کہنا ہے ..... تبرکات کی زیارت کی جناب امیر ا کے قرآن لکھے ہوئے دیکھے، خط کوفی میں تھے، چوک کی سیر روز کرتا تھا، بازاروں میں پھرتا تھا، مگر دہلی کام نہیں، چیزوں کی خریداری کرو، دام پوچھو، چیز لو، دام دو، کسی نے کبھی نہ پوچھا کہ تم کون ہو، کہ
بوستان خیال میری ملاقات کو چند بار تشریف لائے اور بہت تپاک سے ملے، دوم نزہۃ

ـــــ کیا رہیں ان لوگوں

[1] یہ تین بند بعینہٖ وہی ہیں جو ریاض الدین امجد کی سیر دہلی میں مندرج ہے

میں چھپی ہے۔
غرض دہلی میں رہ کر خوب سیر کی، خوب لطف اٹھائے، آخر رمضان ۱۲۸۲ ہجری تک آرے چلے آئے، جب تک حضرت غالب کے ہوش و حواس درست رہے، خط و کتابت جاری رہی، آخر ۱۲۸۵ھ میں انتقال فرمایا۔
کلام معجز نظام اُن کا فارسی اور اُردو ہر جگہ موجود ہے، مگر دو غزلوں میں سے کچھ لکھتا ہوں، ایک وضع اول کی دوسری وضع ثانی کی۔

مجھ سے اور حضرت غالب علیہ الرحمۃ سے ایک مرتبہ لکھنؤ اور دہلی کی زبان کے بارے میں گفتگو ہوئی، اور سبب اس کا یہ ہوا کہ ان دنوں حضرت اپنے ایک رسالہ کا مسودہ اردو زبان کی تحقیق میں کاتب سے لکھوا رہے تھے، جو میں نے اس کے صاف شدہ اجزا ہاتھ میں لے لیے؛ حضرت نے دیکھ کر فرمایا، ہاں اس کو دیکھو یہ ایک چیز میں نے ان دنوں بہ فرمائش ڈائرکٹر صاحب لکھی ہے، اس میں اردو کی مختصر تاریخ اور کچھ قواعد تھے، کوئی پانچ جزو کا رسالہ تھا، جناب ڈائرکٹر صاحب نے مولف کے نانا حضرت صاحب عالم کو بھی خط لکھا تھا کہ زبان اردو کی تاریخ اور قواعد میں کوئی کتاب لکھ کر بھیج دیجیے، چنانچہ حضرت نے اس کا اہتمام میرے سپرد کیا تھا، مگر میں نے اس کا مسودہ درست کر کے بھیج دیا تھا پھر خدا جانے کیا ہوا، اس طرح حضرت غالب کو بھی لکھا تھا، وہ اسی رسالے کو لکھوا رہے تھے، الغرض اسی رسالے کو پڑھنے میں کچھ دہلی و لکھنؤ کی زبان کا ذکر آ گیا، فرمایا میاں اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو زبان کو زبان کر دکھایا تو لکھنؤ نے۔ اور لکھنؤ میں ناسخ نے، ورنہ بولنے کو کون نہیں بول لیتا، اب جس کا جی چاہے تراش خراش روز کرے مگر میرے نزدیک وہ تراش خراش کی جگہ ہی نہیں چھوڑ گیا ہے، ہاں قواعد لکھ نہیں گیا، قواعد جاننے والا اُس کے کلام میں مزا پاتا ہے ہماری دلی ہمیشہ اس بات میں پیچھے رہی کہ مضمون کے آگے زبان کی درستی نہ کی اور مضمون میں بھی عاشقانہ کا زیادہ خیال رہا، مگر یاد رہے، اس مضمون میں دلی کے برابر میں کسی کو نہیں سمجھتا، پھر ہنس کر فرمانے لگے، اس زبان پر اس کے سوا اور ہو تا کیا، میں نے بھی ایک طرز خاص ایجاد کیا تھا جس میں ہر طرح کے مضمون کو نشو و نما ہو سکتا تھا، مگر یاروں نے چلنے نہ دیا۔ اور سچ پوچھو تو یہ ایجاد ناسخ کی ہے، میاں جب ناسخ کا کلام دہلی میں پہنچا جیسا تم نے ولی کے دیوان کا حال سنا ہو گا کہ دلی میں آیا تو جیسے نئی چیز پر لوگ گر پڑتے ہیں اسی طرح اس کے کلام پر گر پڑے، اُس وقت فارسی کی شاعری دلی میں بہت پھیکی تھی، مگر اردو کی مداخلت فقط بول چال میں تھی۔ اس کو مسلسل نظم میں جو دیکھا تو نوخیز اور فارسی داں سب اس کی تقلید پر چلنے لگے، اور ہر ایک نے اپنے اپنے معلومات کے مطابق رہ سپری کی۔ مگر وہ فقط زبان کو نظم کر دیتا تھا، کچھ ایسی دقت نہ ہوئی پھر بھی غلغلے لوگوں نے ادھر توجہ کی ہر ایک کی نئی طرز ہو گئی، مگر ناسخ کے کلام نے دلی میں آ کر سب کو حیران کر دیا، اور قاعدے کے ساتھ مطلب کا واضح طور سے ادا ہونا۔ دلوں کو برانگیختہ کرنے لگا۔ یہاں تک کہ شعرا نے ادھر رغبت کی نگاہ سے دیکھا، اس وقت ہم تین شاعر با مذاق نام آور دہ تھے، میں اور مومن خاں اور ذوق، ذوق نے ادھر کم رغبت کی، کیونکہ ان کو اپنے مضمون ہی کے باندھنے میں دقت پڑتی تھی، زبان کی طرف کب خیال کر سکتے ہیں مگر مومن خاں نے خیال کیا، پہلے یہ شاہ نصیر کے شاگرد تھے، شاہ نصیر کی جو طرز ہے وہ معلوم ہے، مگر مومن خاں نے ان کو چھوڑ کر ناسخ کی طرز پر غور کیا اور فارسی کی تراش خراش پر توجہ کی، ادھر میں نے بھی، غرض ہم دونوں دہلی کے طرز زبان کو چھوڑ کر ترکیب اور بندش کی درستی میں مصروف ہوئے، مگر جب بہت کچھ کہہ گئے تو دیکھا کہ ہم دونوں کی طرز الگ الگ ہو گئی، اور کوئی ناسخ سے نہ ملی، میں نے تو میر تقی میر کا انداز اختیار کیا اور مومن خاں اپنے اُسی رنگ میں رہے، خلاصہ یہ کہ دہلی کی زبان میں ہر شاعر کے کلام میں اختلاف پاؤ گے اور اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ ناسخ نے جن قاعدوں سے زبان کو درست کیا جس کے سبب سے تمام لکھنؤ کی ایک ہی زبان ہو گئی۔ وہ قاعدے عام نہیں ہوئے کہ ہم تک پہنچتے، ناچار اپنی جودت طبع سے جو کچھ ہو اوہ کیا مگر یاد رہے کہ مضمون دہلی کا اور زبان لکھنؤ کی مستند ہے۔ ایک تمہارے سحر صاحب فرماتے ہیں؛

نہاتا ہے وہ مہ دریا میں کپڑے جو ر دھوتی ہے

یہ معشوق کی تعریف نہیں ہوئی، بلکہ ایسا غریب معشوق ہے کہ کھڑے گھاٹ کپڑے دھلواتا ہے۔ اسی طرح شعرائے لکھنؤ کے اور جز
اور ...

کھانا کھایا بہت حرمنید جلد اول صفحہ ۲۲۱ - ۲۲۸

شعر پڑھے، میں نے عرض کی کہ حضور یہ سب سچ فرمایا، مگر اتنا تو خیال کیا جائے کہ شاعر کو مضمون مل جائے اور باندھنے سے کام ہے، عشق و عاشقی ان کی بلا جانے، نہ یہ حقیقی عاشق اور نہ ان کا کوئی حقیقی معشوق، ان کے خیال کو خدا نے ایسی قوت عنایت فرمائی ہے کہ دوسروں کے حالات کو اپنے وہم کے زور سے ایسا باندھ دیتے ہیں کہ ہو بہو ہو جاتا ہے۔

ایک حقیقت میں اپنے شعر کی عرض کروں، میں چھپرے میں ایک دوست کی ملاقات کو گیا وہاں چند اشخاص اور بھی بیٹھے تھے۔ دو آدمی الگ کرسیوں پر تھے، مجھ سے لوگوں نے کہا کچھ شعر پڑھیے، میں نے چند شعر پڑھے، منجملہ ان کے ایک یہ شعر بھی پڑھا:

کس وقت سے ہم جام ہتھیلی پہ لیے ہیں لو تھوڑی سی رنجش کو زیادہ نہیں کرتے

اس شعر پر وہ دونوں شخص جو کرسیوں پر تھے آپس میں کہنے لگے کہ بھئی یہ تو رات کا بالکل واقعہ ہے۔ جناب پھر پڑھیے گا، میں نے پھر پڑھا، ان لوگوں نے اس شعر کو لکھ لیا، اور حقیقت یہ ہے کہ نہ میں شراب پیوں، اور نہ ایسا شرابی شخص میرے پاس تھا جس کے واسطے میں شراب جام میں بھر کر یہ کہتا: فقط وہم و خیال کا یہ کھیل ہے حضور، مطلب اس تقریر سے یہ ہے کہ شاعر کے خیال میں جو کچھ آ جائے اس کو باندھ دینا چاہیے، کوئی خاص معشوق نہیں ہو سکتا، ہر ایک کا معشوق الگ ہوتا ہے، کسی کو گورا پسند ہے، کسی کو سانولا، "معشوق من است آنکہ بہ نزدیک تو زشت است" کا حال ہے۔

یہ سن کر حضرت غالب ہنسے اور فرمایا کہ بیشک ایسا ہی ہے، مگر میاں میں نے غزل گو شعرا کے لیے ایک میزان درست کی ہے، وہ یہ ہے کہ فارسی میں رودکی اور فردوسی سے لے کر خاقانی اور سنائی و انوری وغیرہ تک ایک گروہ ہے۔ ان حضرات کا کلام تھوڑے تفاوت سے ایک وضع پر ہے، پھر حضرت سعدی طرز خاص کے موجد ہیں، سعدی و جامی و ہلالی یہ اشخاص متعدد ہیں، فغانی ایک شیوۂ خاص کا مبدع ہوا ۔۔ خیالہائے نازک اور معانی بلند کا۔ اس شیوے کی تکمیل کی ظہوری و نظیری و عرفی و نوعی نے، سبحان اللہ قالب سخن میں جان پڑ گئی۔ اس روش کو بعد اس کے صاحبان طبع نے سلاست کا پیرایہ دیا، صائب و کلیم و قدسی و شفائی اس زمرے میں ہیں، رودکی و اسدی و فردوسی، یہ شیوہ سعدی کے وقت میں ترک ہوا، اور سعدی کی طرز بسبب سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا۔ فغانی کا انداز پھیلا اور اس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے گئے۔ تو اب طرزیں تین ٹھہریں، خاقانی اس کے اقران، ظہوری اس کے امثال، صائب اس کے نظائر، اب ان میں سب کی طبیعت کو حقانیت کی طرف میلان ہو گیا جس کو بہ ظاہر عشق مجازی کا زینۂ آخر اور حقیقی کا زینۂ اول کہہ سکتے ہیں، ان کا کیا پوچھنا، اور جو مجازی میں پورے نکلے، وہ بھی قدم بہ قدم ٹھہرے اور ان کے کلام کے درجے والے سب حقیقی میں ہیں:

اگرچہ شاعران نغز گفتار ز یک جام اند در بزم سخن مست
ولے با بادۂ بعضے حریفاں خمار چشم ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعار این قوم ورائے شاعری چیزے دگر ہست

وہ "چیزے دگر" حصے میں پارسیوں کے آئی ہے، ہاں اردو زبان میں اہل ہند نے وہ چیز پائی ہے، جیسے میر تقی میر:

بدنام ہو گے جانے بھی دو امتحان کو رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

سودا:

دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار خواہاں نہیں لیکن کوئی واں جنس گراں کا

قائم:

قائم اور تجھ سے طلب بوسے کی کیوں کر مانوں ہے تو ناداں مگر اتنا بھی بد آموز نہیں

مومن خاں:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ناسخ کے یہاں کم تر، آتش کے یہاں بیشتر، یہ نشتر ہیں، مگر مجھے کوئی ان کا شعر اس وقت یاد نہیں۔ میں نے التماس کیا کہ میں ان لوگوں

کے شعر عرض کروں، فرمایا ہاں پڑھو:

ناسخ

یہ بھی کہنا ہے جلوہ میرے بت کا — کہ اک ذاتِ خدا ہے اور میں ہوں
جن کی رفتار کے مائل ہیں ہم — وہی آنکھوں میں پھرا کرتے ہیں
رکھو کسی طرح تو سرِ کار، مہرباں — کرتے رہو جفا ہی وفا گر نہ ہو سکے
مر چلا ہوں امیدواری میں — ایسے ہاں سے وہ کرتے کاش نہیں

یہ شعر سن کر حضرت غالب نے فرمایا، ہاں، ان میں بعض نشتر ہیں، پھر میں نے آتش کے شعر پڑھے:

آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، اٹھ بھی کھڑے ہوئے — میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا
دمِ آخر بھی بالیں پر مرے ہم راہ یار آئے — رقیبوں نے محل رکھا نہ باقی عذر خواہی کا
اس بلائے جان سے آتش، دیکھیے کیونکر بنے — دل سوا شیشے سے نازک، دل سے نازک خوئے دوست
سجدۂ شکرِ خدا یا میں کیے رکھتا ہوں — قدمِ یار پہ ہے سر کو جھکانا شبِ وصل

یہ شعر سن کر فرمایا، ان میں بھی بعض [1]

نثار علی شہرت

میں نے دیکھا کہ حضور جہاں پناہ (بہادر شاہ ظفر) گاؤ تکیے سے سر لگائے آرام سے ہیں اور سامنے چند شعرا موجود ہیں غرضکہ مجکو بھی ان کے عقب میں کھڑا کر دیا گیا۔ اول غالب صاحب نے غزل پڑھی جنھوں نے ایک ایک شعر اس عمدگی سے پڑھا کہ سننے والوں کو نقش تصویر بنا دیا......

(آئینۂ داغ ص ۱۰)

ایک روز میں مرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ کھانا نوش فرما رہے تھے[2] میں مؤدب ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا، آپ نے ایک رنگترہ میری طرف پھینکا کہ اس سے شغل کیجیے چونکہ رمضان کا مہینہ تھا اور مجھے روزہ تھا میں نے اس رنگترہ کو ہاتھ نہیں لگایا آپ تاڑ گئے اور فرماتے کیا ہیں:

"ہاں! آپ مولوی آگئے ہیں"

میں ہنسا تو آپ بھی مسکرانے لگے، جب آپ کھانا نوش فرما چکے تو جو قلمی رسالہ آپ کے سامنے رکھا تھا اس میں کچھ بنانے لگے، غالباً اصلاح دے رہے تھے۔ میں نے گزارش کی:

"جناب کیا ارقام فرما رہے ہیں؟" تو فرمانے لگے۔

"اس میں فارسی الفاظ بہت ٹھونس دیے گئے ہیں اس لیے انھیں نکال رہا ہوں اور شستہ الفاظ اس میں ڈال رہا ہوں۔"

میں نے ادب کے ساتھ گزارش کی:

"آپ کا دیوان بھی تو فارسی سے مالا مال ہے۔" فرمانے لگے:

"وہ جوانی کی نازک خیالیاں ہیں، شہرت! بعض شعر تو ایسے ادق میرے قلم سے نکل گئے ہیں کہ میں اب ان کے معنی خود نہیں بیان کر سکتا!"

پھر فرمانے لگے:

"دلی والوں کی جو اردو ہے جس کو مشک و عبیر کہنا چاہیے، اس کو ہی اشعار میں لکھنا چاہیے، آخر عمر میں ہماری تو یہی رائے قائم ہوئی ہے۔"

[1] جلوۂ خضر جلد اول: ۲۴۰ در ذکر مومن — [2] کھانا کیا تھا سامنے ایک چھوٹے سے گلاس میں ماء اللحم رکھا ہوا تھا۔

میں نے ادب کے ساتھ گزارش کی! "داغ کی اردو کیسی ہے؟" فرمانے لگے:

"ایسی عمدہ ہے کہ کسی کی کیا ہوگی، ذوق نے اردو کو اپنی گود میں پالا تھا، داغ اس کو نہ صرف پال رہا ہے بلکہ اس کو تعلیم دے رہا ہے۔"

(آئینۂ داغ ۳۴ - ۳۵)

میر حیدر حسین سہیل

اسد اللہ خاں غالب کو میں نے دیکھا ہے یہ والد کی ملاقات کو فراش خانے آئے تھے میں بہت کم سن تھا، اتنا یاد ہے کہ رنگ گورا تھا داڑھی کترواں تھی، بال ترشوائے تھے کشیدہ قامت قوی الجثہ تھے۔ (صلائے عام جنوری ۱۹۱۱ء)

سید امجد علی اشہری

غالب: مجھ کو دلی کی آبادی اور شاعری میں ایک مرزا اسد اللہ خاں غالب کا دیکھ لینا دلی و سودا سب کو دیکھ لینے کے برابر ہے ۸۵ء میں میں نے حضرت میرزا صاحب کو الہ آباد میں بابو بینی پرشاد صاحب وکیل ہائی کورٹ کے دیوان خانے میں دیکھا تھا ان کی شیوا بیانی سے بھی مستفیض ہوا۔ اس وقت میری عمر سترہ اٹھارہ برس کی تھی اور میں بھوپال میں ملازم تھا۔ جناب نواب سکندر بیگم صاحبہ خلد نشین والیٔ سابق ریاست بھوپال نے بہت چاہا کہ حضرت میرزا صاحب بھوپال تشریف لائیں اور یہیں قیام فرمائیں مگر میرزا سے دلی چھٹنا مشکل تھا۔

میرزا غالب کا اردو دیوان شاعری کی جان ہے۔ ——— اگر اردو میں شاعری کی صورت نظر آ سکتی ہے تو میرزا غالب کے دیوان میں۔ مگر اس کا سمجھنا معمولی بات نہیں۔ اس لیے مولانا شوکت کے حل غالب سے مشکل کشائی کا کام لینا چاہیے۔ میرزا غالب فارسی کے شاعر ہیں اور اُن کا فارسی کلام نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران میں استادانہ درجہ رکھتا ہے۔ مگر دلی کی بود و باش اور شاعری کے حقیقی مذاق نے اُن کی اردو شاعری پر جو اثر کیا وہ میرزا غالب اور صرف میرزا غالب کا حصہ ہے۔ وہ اردو شاعری میں اپنی وضع کے آپ موجد ہیں اور آپ خاتم۔ حکیم مومن خاں اور استاد ذوق ان کے مشہور اور مستند ہم عصر ہیں لیکن میرزا غالب کا کمال فن اور چیز ہے۔

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزی دیگری (ایشیائی شاعری)

نورانی تیل

ساختہ: انڈین کیمیکل کمپنی مئوناتھ بھنجن یو۔پی

- آپ کے خاندان بھر کے تحفظ کے لیے
- حادثوں کے موقع پر نورانی تیل سب سے اہم ساتھی ہے۔

اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیے۔ اور درد، چوٹ، زخم ورم سے نجات پانے کے لیے اسے استعمال کیجیے

Summit Advt.NU/9

NIGAR, URDU MONTHLY, RAMPUR U.P. OCTOBER 1963
REGISTERED WITH THE REGISTRAR OF NEWSPAPERS AT R.N. NO. 2136/57

قیمت { فی پرچہ ۷۵ نئے پیسے
سالانہ دس روپے

نگار
ڈاکٹر ذاکر حسین نمبر

ذاکر صاحب ہمارے تعلیمی رہنماؤں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں انھوں نے نظام تعلیم کو
روستانی مزاج دینے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے جس کی ایک جیتی جاگتی مثال جامعہ ملیہ ہے۔ علی گڑھ کو بھی
ے دور ابتلا میں جو ہمت ملی وہ انھیں کی ذات کا پرتو ہے اور اس کے مزاج میں نرمی و گرمی کی جو مخصوص
نت پیدا ہوئی وہ بھی ذاکر صاحب کے طفیل ہے۔ لیکن اس سب سے الگ ہو کر ان کی ایک ادبی حیثیت بھی ہے۔
چہ کتابی شکل میں ذاکر صاحب کی چند ہی تحریریں آئی ہیں اور ان میں سے بھی کئی تراجم ہیں اس کے علاوہ
یش بہا ذخیرہ تقاریر خطبات پیغامات اور خطوط کی شکل میں بکھرا ہوا ہے۔ ادارۂ نگار یہی کوشش
یگا کہ اس میں ذاکر صاحب کی ساری تحریروں کو جمع کر دیا جائے تاکہ ایک صاحب طرز ادیب کی
رشات دستبرد زمانہ سے محفوظ ہو جائیں اور ادب و انشا کے بیش بہا ذخیرے کی شیرازہ بندی ہو سکے۔

آپ کے پاس ذاکر صاحب کے

• پیغامات • خطوط • تقاریر اور • خطبات میں سے

پھ بھی ہو وہ ہمیں مرحمت فرمائیے تاکہ یہ نمبر زیادہ سے زیادہ جامع ہو سکے۔

نگار
ڈاکٹر ذاکر حسین نمبر

ذاکر صاحب ہمارے تعلیمی رہنماؤں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں انھوں نے نظامِ تعلیم کو ہندوستانی مزاج دینے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے جس کی ایک جیتی جاگتی مثال جامعہ ملیہ ہے۔ علی گڑھ کو بھی ایک دورِ ابتلا میں جو ہمت ملی وہ انھیں کی ذات کا پرتو ہے اور اس کے مزاج میں نرمی و گرمی کی جو مخصوص صفت پیدا ہوئی وہ بھی ذاکر صاحب کے طفیل ہے۔ لیکن اس سب سے الگ ہو کر ان کی ایک ادبی حیثیت بھی ہے۔ اگرچہ کتابی شکل میں ذاکر صاحب کی چند ہی تحریریں آئی ہیں اور ان میں سے بھی کئی تراجم ہیں اس کے علاوہ ایک بیش بہا ذخیرہ تقاریر، خطبات، پیغامات اور خطوط کی شکل میں بکھرا ہوا ہے۔ ادارۂ نگار یہی کوشش کریگا کہ اس میں ذاکر صاحب کی ساری تحریروں کو جمع کر دیا جائے تاکہ ایک صاحبِ طرز ادیب کی نگارشات دستبردِ زمانہ سے محفوظ ہو جائیں اور ادب و انشا کے بیش بہا ذخیرے کی شیرازہ بندی ہو سکے۔

آپ کے پاس ذاکر صاحب کے

• پیغامات • خطوط • تقاریر اور • خطبات میں سے

جو کچھ بھی ہو وہ ہمیں مرحمت فرمایئے تاکہ یہ نمبر زیادہ سے زیادہ جامع ہو سکے۔

ضروری اعلان: پاکستانی خریدار نگار کا سالانہ چندہ اس پتہ پر بھیج دیں رسالہ جاری کر دیا جائے گا نمائندہ نگار ۶۱/۷ این سمن آباد لاہور

ایڈیٹر: اکبر علیخاں

شمارہ ۴	فہرست مضامین اپریل ۱۹۶۳ء	جلد ۴۲

ملاحظات		۲	اقبال بحیثیت استاد	مولانا عطاء الرحمن مرحوم	۳۱
خطبۂ صدارت یوم اقبال	رشید احمد صدیقی	۵	اکبر اور اقبال	نور محمد ایم اے	۳۸
اقبال کا فکری ارتقاء	محمد عبدالسلام خاں	۱۲	شاعر مشرق	سعادت نظیر	۴۷
اقبال کے چار غیر مطبوعہ خطوط	ڈاکٹر محمود الٰہی	۲۹			

ملاحظات

اقبال اردو کا وہ تنہا شاعر ہے جس کی شاعری کا شمار مقصدی شاعری میں ہوتا ہے اور جس کے پاس کہنے کے لیے وہ تھا جو اس کے علاوہ اگر کسی شاعر کے پاس ہوتا بھی تو اتنا جاندار کشش اور تاثیر سے بھرا پرانہ ہوتا جتنا اقبال نے اسے بنا دیا۔

شاعری اور مقصد قریب کی چیزیں نہیں ہیں۔ ان کا ملاپ بہت دور کی بات ہے اتنی دور کی بات کہ اردو شاعری کی تاریخ میں صرف تین مثالیں ملتی ہیں۔ حالی، اکبر اور اقبال عجیب اتفاق ہے کہ اقبال کے فکر و فن کا ذکر آتے ہی حالی اور اکبر بھی معرض بحث میں آجاتے ہیں۔ لیکن یہ سب جانتے ہیں کہ حالی اور اکبر کا رول ایک محدود عرصہ روزگار کے لیے تھا اور اب ہم قصہ ماضی کی طرح ان سے کبھی لطف لیتے ہیں اور کبھی عبرت حاصل کرتے ہیں۔ یہ دونوں اپنی ملت کے مرثیہ خواں بن کر رہ گئے ایک غم و اندوہ سے رو پڑا اور دوسرے نے دکھ اور صدکی نشتریت سے طنز و مزاح کو تیز کیا۔

جیسا کہ میں نے ابھی کہا تھا حالی اور اکبر کا ذکر اقبال کے ساتھ لازماً آتا ہے اس لیے کہ اقبال اپنے ابتدائی دور شاعری میں ان دونوں سے متاثر ہوئے ہیں شکوہ و جواب شکوہ اقبال کے ذہن پر حالی کی گرفت اور بانگ درا کا ظریفانہ کلام اکبر کی گرفت کے واضح نشانات ہیں جن کے بعد شک و شبہ کی گنجایش نہیں رہتی۔

حالی اور اکبر سے اقبال کی اثر پذیری کی وجہ وقت کا مطالبہ کہی جاسکتی ہے یا ان کا دل صد مند اس سے زیادہ کا ثبوت نہیں ملتا۔ اقبال کا ذہن جو مطالبات کرتا ہے اس کو مطمئن کرنے کے لیے آپ ہی سوچیے ان دونوں کے پاس کیا ہے۔ ان کے خلوص کے تو وہ ہمیشہ قایل رہے ہیں لیکن ان کا تاثر زیادہ دن قائم نہیں رہا اور وہ ان کی تقلید سے بہت جلد آزاد ہو گئے۔

وہ زبان و بیان میں غالب اور داغ سے بھی متاثر نظر آتے ہیں چنانچہ اقبال کی بالکل ابتدائی غزلوں پر داغ کی زبان کا ٹھپہ لگا ہوا ہے۔ لیکن جیسے جیسے ان کا ذہن بالغ تر ہوتا جاتا ہے غالب کی بیدلیت کا جادو چڑھتا نظر آتا ہے۔ اردو کے کلاسیکی شاعروں میں وہ غالب کے علاوہ کسی اور کا ساتھ دے بھی نہیں سکتے۔ یا پھر

کسی نذر عرفی و نظیری کی بلند خیالی کا حسن انھیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے کیوں کہ یہ "کہکشاں کٹتے ہیں تو ثریا کی سنہری بوتل"۔

اقبال کا کلام اپنے مواد، وزن و وقار اور قدرت زبان و بیان کے لحاظ سے اردو شاعری کا نمایاں ترین کارنامہ ہے۔ مواد کے معاملے میں اقبال کہہ سکتے ہیں کہ تمتع زہر گوشہ یافتم اگرچہ جہان کی آخری پناہ گاہ اسلام ہے۔ ان کی رائے میں توازن یا کسی خیال پر اصرار اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے یہاں خیالات کوئی وقتی رد نہیں تھے بلکہ اقبال کا ذہن ہزار بار غور و فکر کی کسوٹی پر کس کر ان خیالوں کو رد و قدح کی منزل سے گزارتا تھا ان کے موضوعات زندگی کے جن سنجیدہ مسائل سے علاقہ رکھتے تھے ان کا لازمی نتیجہ کلام میں وزن و وقار کی صورت میں جلوہ گر ہونا چاہیے تھا۔ زبان و بیان پر وہ خود اثر انداز ہوتے تھے اور اس معاملے میں وہ بھم منفرد ہیں۔ کتنے ہی الفاظ ایسے ہیں جن کے معانی اقبال کی زبان میں کچھ اور ہیں۔ قلندر۔ فقیر۔ مومن۔ خودی جیسے الفاظ کے مفاہیم کو جو وسعت اقبال نے دی اُس کا ہلکا سا بھی تصور کسی دوسرے کے یہاں نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کا فقیر اور قلندر اخلاق علم اور عمل کے لحاظ سے جس بلندی پر فائز ہے وہ ہمارے عام عقائد سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ ایک معمولی کرشمہ ہے اقبال کی زبان کا۔

یہ درست ہے کہ اقبال کے کلام میں تضاد ہے۔ لیکن یہ تضاد ایسا ہے جسے تاریخی نقشے کے طور پر تو ہم آپ استعمال کر سکتے ہیں لیکن اقبال کے خلاف کوئی فرد جرم مرتب نہیں کر سکتے۔ وہ کون شخص ہے جس کے یہاں فکری ارتقا نہیں ہوتا حق کی تلاش و جستجو میں سالک کو مختلف منازل سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس سفر کا کوئی اثر اس پر مرتب نہ ہو۔ یہ سب تو راستے کی باتیں ہیں منزل پر پہنچ کر اس نے کیا کہا اصل بات تو یہ ہے۔

اقبال کو زمان و مکان کی قیود میں رکھ کر نہ ہم اس کے ساتھ بھلا سلوک کرتے ہیں اور نہ اپنے ساتھ۔ اس کی آفاقیت کے اپنے تقاضے ہیں۔ حق کو کسی سے منسوب نہیں کیا جا سکتا، حق سب کا ہے اور سب کے لیے ہے اُسے جغرافیائی حد بندیوں میں بھی نہیں جکڑا جا سکتا۔ اور رنگ و نسل سے بننے والی دیواریں بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ اقبال کا کلام بھی فریادی ہے کہ اسے کسی مصنوعی قید و بند میں نہ رکھا جائے۔ اس کا خطاب اس بات کا متقاضی ہے کہ اس پر قدغن نہ کی جائے مطالبہ ہے کہ حق کا مطالبہ رہا ہے۔ اگر کبھی حق پر ان حد بندیوں کو جائز کیا گیا تو وہ خود ان بندشوں کے خالقوں کے لیے بھی سود مند نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ حق کو اپنانے کے لیے جس وسعت قلب و نگاہ کی ضرورت ہے اگر حق کی ملکیت کے دعوے دار کے پاس ہوتی تو اس تفریق کا امکان ہی کہاں تھا۔

آپ ہی بتائیے کہ اقبال کے مندرجہ ذیل چند اشعار میں وہ کونسی بات ہے جس کے بارے میں ہم یہ کہہ سکیں کہ اس کا خطاب ہندوستان کے تمام شہریوں سے نہیں کسی مخصوص فرقے سے ہے۔ یا اس کا مطالعہ صرف ایک فرقے کی قوت فکر و عمل میں بیداری اور جوش و خروش کا باعث ہو سکتا ہے باقی میں نہیں

غیرت ہے بڑی چیز جہان تگ و دو میں　　پہناتی ہے درویش کو تاج سر دارا

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں　　سو بار ہوئی حضرت آدم کی قبا چاک
تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے　　صاحب نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک

خون دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات　　فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور　　چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے　　دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے　　شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ہے
دلیل کم نظری قصہ قدیم وجدید

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے
بری ہے مستی اندیشہ ہائے افلاکی

وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کف جو

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

بچھائی ہے جو کہیں عشق نے بساط اپنی
کیا ہے اس نے فقیروں کو وارث پرویز

گدائے میکدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ
پہنچ کے چشمہ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے
کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

خرد سے راہرو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے چراغِ رہ گزر ہے
درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغ رہگزر کو کیا خبر ہے

اقبال کی فکر نے جو چراغ روشن کیا ہے اس کو تہ داماں رکھنے سے کسی کو راستہ نہ ملے گا۔ برصغیر ہند اپنے اس عظیم فرزند سے اگر اس دور میں بھی کچھ نہ لے سکا جب کہ یہ دور تعمیر و ترقی کے امکانات کا جائزہ لے رہا ہے تو کب لے گا۔ جب آنے والا مورخ ہماری کوتاہیاں گنانے وقت بتائے گا کہ ہمیں اپنے اچھوں کو پہچاننا نہیں آیا۔ آئندہ نسلیں شرم سے گردن جھکا لیں گی، ان نسلوں کی سرخروئی کا سامان ہم آج بھی کر سکتے ہیں جس میں خود ہماری بھی سرخروئی ہے۔

نگار کا زیر نظر شمارہ ہندوستان کے اس قابل فخر فرزند کی یاد منانے کے لیے شایع کیا جا رہا ہے ۔ اس میں جو تحریریں شامل ہیں ان میں سے دو آج سے ۱۸ سال پہلے رامپور رضا انٹر کالج کے یوم اقبال میں پڑھی گئی تھیں یعنی "خطبۂ صدارت" اور "اکبر و اقبال" یہ تحریریں ایک خاص حلقے سے آگے نہ بڑھ سکیں اس لیے ان کو اس نمبر میں شریک کر لیا گیا ہے۔ ان کو پڑھتے وقت لازماً ۱۹۴۵ء کو سامنے رکھنا چاہیے ۔

مولانا عبدالسلام خاں صاحب کا مضمون خصوصیت سے اسی شمارے کے لیے لکھا گیا ہے ۔ یہ مضمون اپنی موجودہ شکل میں نامکمل ہے یعنی اس میں اقبال کے فکری رجحانات کی نشاندہی صرف ۱۹۰۸ء تک کی گئی ہے آئندہ قسطوں میں اس سلسلے کی مزید کڑیاں سامنے آئیں گی۔ صاحب مقالہ اقبال پر اپنے کئی وقیع مضامین کی وجہ سے کسی تعارف کے محتاج نہیں نگار کے اس جدید دور میں موصوف سے دستگیری و تعاون کی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

خطبۂ صدارت یوم اقبال

جو گورنمنٹ رضا انٹرمیڈیٹ کالج رامپور میں ۲۰ اپریل ۱۹۴۵ء کو پڑھا گیا

رشید احمد صدیقی

بزرگان رامپور، دوستو اور عزیزو! آپ نے مجھے یاد فرمایا کہ میری توقیر بڑھائی اسے میں ذاتی منزلت کے ساتھ شعبۂ اردو کی بھی منزلت سمجھتا ہوں جس کے متعدد ارکان اس وقت آپ کے سامنے موجود ہیں۔ سرور صاحب آپ میں ممکن ہے پرانے ہو چلے ہوں لیکن ان کی یاد ہمارے یہاں تازہ ہے اور مدتوں تازہ رہے گی۔ دوسرے مسٹر مسعود حسین خاں ایم، اے ہیں جن کا مقالہ آپ سہ پہر میں سنیں گے، یہ ہمارے ہاں پی ایچ ڈی کے طالب علم اور شعبہ میں معلم بھی ہیں۔ تیسرے مسٹر نور محمد ہیں جنھوں نے اردو میں ایم، اے فائنل کا امتحان دیا ہے۔ ان کا مقالہ بھی آپ کے سامنے آئے گا۔

صاحبو! مجھے اندیشہ ہے کہ اقبال مرحوم کا کلام کبھی ڈیفنس آف انڈیا کی زد میں آیا تو آپ کے آل احمد سرور صاحب سب سے پہلے گرفتار کر لیے جائیں گے باوجود اس کے کہ انھوں نے ریاست میں پناہ لی ہے۔ سرور صاحب نے اقبال کے کلام کا مطالعہ جس الفت و قابلیت سے کیا ہے شاید ہی کسی اور نے کیا ہو۔ اس کا نتیجہ ان کے حق میں قابل رشک نہیں رہا ہے۔ اقوال سے گزر کر کہیں انھوں نے اپنے اعمال میں بھی اقبال کو دخل دینا شروع کیا تو میں سمجھتا ہوں ریاست رام پور اور مسلم یونیورسٹی کے درمیان کہیں معلق نظر آئیں گے گو مجھے اس کا یقین ہے کہ وہ اس حال میں بھی یوم اقبال منانے سے باز نہ آئیں گے۔

صاحبو! اردو تاریخ کا یہ پہلو آپ سے پوشیدہ نہ ہوگا کہ اردو شاعری ہمارے گفتنی و ناگفتنی حالات کی جس حد تک ترجمان رہی اس حد تک ان حالات کو بہتر و برتر بنانے میں معین نہ ہوئی۔ ہمارے شعر و ادب میں علیگڑھ تحریک یا حالی کے عہد سے پہلے ذہنی تجربوں یا تہلکوں کے نشان نہ ملنے کے برابر ملتے ہیں۔ ہمارے شعراء شاعری میں عبادت تو خوب خوب کرتے تھے۔ حسن عمل سے کوئی علاقہ نہ رکھتے تھے وہ مشکل سے مشکل بحر قافیہ اور ردیف میں جلد سے جلد سہ غزلہ چہار غزلہ تیار کر لیتے تھے لیکن زندگی اور زمانے کے مطالبے کی طرف متوجہ نہ ہوتے تھے۔ ان کے ہاں "شکست کی آواز" ملتی ہے مگر دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان نہیں ملتا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے ان شعراء پر زندگی و زمانہ کی چوٹوں کا اثر نہ ہوتا تھا۔ البتہ وہ ان چوٹوں کو اپنے جنس کی چوٹ سمجھنے سے قاصر تھے۔ بعض دوستوں نے ان کی متفرق نظموں یا غزلوں میں زندگی اور زمانہ کا کرب یا دھڑکن دریافت کی ہے لیکن میں اس نظریہ کا کچھ زیادہ قائل نہیں ہوں حسن ظن سے ہم نے جہاں اور بہت سے معرکے سر کیے ہیں یہ ایک سہی! اردو شاعری میں ہمارے بیشتر شعراء نے تفریح یا تفریغ سے اور کام لیا ہے۔ شاید ہی کسی اور ملک یا ادب میں شاعری کی یہ گت بنی ہو۔ محض چند ایک سے قطع نظر بقیہ نے زندگی کا غم غلط کرنے کی خاطر شاعری کی پناہ پکڑی زندگی سے نبرد آزما ہونے کے لیے شاعری نہیں کی۔

صاحبو! میں اتنا ماننے کے لیے تیار ہوں کہ ہمارے ہاں کچھ شعراء ایسے گزرے ہیں جنھوں نے ہمارے ذہنی رجحانات کو بعض مواقع پر اچھے راستے پر لگایا ہے۔ اس کی پہلی مثال انیس کے ہاں ملتی ہے۔ لکھنؤ میں اردو شاعری کا جو رنگ و آہنگ تھا اس کو منقلب کر دینے کا سہرا انیس اور انیس کے

کے خاندان کے سر ہے۔ انھوں نے قوم کے مزاج کو پہچان کے شاعری کا رخ بدلا لیکن اپنے زمانے کے ڈھنگ کو نہ بدل سکے شعر و ادب کو گوارا نہیں کیا۔ مذہبی شاعری میں محسن کاکوروی کا نام بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ محسن کے اس کمال کا اعتراف کم لوگوں نے کیا ہے کہ وہ لکھنؤ کے تنہا شاعر ہیں جنھوں نے لکھنوی شاعری کے کمزور پہلو کو اپنے نعتیہ کلام سے دل کش بنا دیا، دیا شنکر نسیم ان سے پہلے گزرے ہیں جن کی گلزار نسیم کی بے ساختہ صناعی کی نظیر ہماری شاعری میں نہیں ملتی۔ لیکن جس پل صراط پر محسن کو چلنا پڑا نسیم اس سے بالکل محفوظ رہے۔ انیس اور انیس کے کلام نے ہمارے ادبی مزاج کو سدھارا اور سنوارا — بالخصوص اس وقت جب ہمارے ہاں سوء مزاج کے سوا کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

انیس کے بعد حالی نے اردو شعر و ادب کے دھارے کو موڑا اور اس کو ایسی وادیوں سے گزرنے کا موقع دیا جہاں نہ صرف اس دھارے کی حیات بخشی میں اضافہ ہوا بلکہ اس کی رد اور روانی میں زور آیا۔ حالی سے پہلے شعر "تلخی" کام و دہن کی آزمائش میں بطور کار خیر شریک ہو جایا کرتے تھے۔ حالی زہر غم قلب و جگر میں اتار چکے تھے۔ ان کا رنج و الم شخصی یا رسمی نہ تھا۔ ان کے ماتم سے انسانیت ماتم گسار نظر آنے لگتی تھی۔ حالی کے ماتم میں حرکی و تخلیقی استعداد پائی جاتی ہے۔ حالی نے غالباً سب سے پہلے اس حقیقت کو پیش کیا کہ خلوص درد مندی، علم آرٹ اور انسان سب کی معراج ہے شاعری میں حالی نے سچائی کو آزمائش و زیبائش پر ترجیح دی۔ حالی کا لہجہ دھیما ہے لیکن اس میں یہ قابلیت ہے کہ وہ شور و سکوت دونوں میں یکساں سنائی دیتا ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ حالی کی شاعری نے مسلمانوں میں اضمحلال اور افسردگی پیدا کر دی۔ یہ بات درست نہیں ہے حالی کی مثال اس شخص کی ہے جو سردار کی بے گور و کفن نعش پر جھول میں دبکا نہیں کرتا بلکہ ایک خطبۂ میت دے رہا ہے جس سے تھکی ہاری سپاہ اور ساتھیوں کا عزم نئے سرے سے بیدار ہوتا ہے۔ مسدس سے قطع نظر حالی کی شکوہ ہندی میں بصیرت رکھنے والوں کو وہ چیز نظر آئے گی جو مسلمانوں سے نہیں انسانیت سے اوجھل ہو گئی تھی، حالی نے مسلمانوں کے زوال کو انسانوں کا زوال منوایا ہے۔ حالی نے مسلمانوں کے جن فضائل کے زوال کا ماتم جس خلوص اور سطوت حزیں سے کیا ہے اس نے شکوۂ ہند کو دنیائے ادب کی عظیم المرتبت المیہ کے بہت قریب کر دیا ہے۔

حالی اور اکبر کا زمانہ ایک ہے لیکن دونوں کی شاعری کے حدود مختلف ہیں۔ حالی کے مد نظر اسلام اور مسلمان ہیں، اکبر مشرق اور مشرقیت کے نمائندہ ہیں۔ وہ ہندو اور مسلمان دونوں کو مغربیت کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہتے دیکھتے ہیں اور ان کی بے بسی پر کڑھتے ہیں۔ اکبر پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کو مغرب میں کوئی خوبی نظر نہ آتی تھی، وہ مغرب سے ناواقف تھے، وہ مغرب کی سطحی باتوں کو اہمیت دیتے تھے۔ وہ قدیم کو ہر اعتبار سے مقدس و محترم گردانتے تھے۔ وہ عورتوں کی تعلیم کے خلاف تھے اور انگریزی تعلیم پسند نہ کرتے تھے۔ لیکن اکبر جس زمانہ میں تھے اس میں ہمارے بڑے سے بڑے صاحب فکر و نظر یورپ کی اس نفسیت سے مرعوب تھے جو اکبر کو نظر آتی تھی۔ اس زمانہ کی مقتدر تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ اور تو اور ہم اپنے مذہب کو بھی اسی حد تک برحق یا قابل اعتبار سمجھتے تھے جس حد تک اس کی سند جواز مغرب کے اعمال و اذکار میں ملتی تھی۔ لہذا زمانے میں بھی اکبر مغرب سے مرعوب نہ ہوئے تو کسی نہ کسی حد تک ان کی بڑائی تسلیم کرنی پڑے گی۔ پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ وہ لوگ جو مغرب سے پورے طور پر آشنا ہیں ان میں کتنے ایسے ہیں جو آج اسی دیار اکبر میں یورپ کی بڑائی ہر شعبۂ حیات میں تسلیم کرتے ہیں۔

اکبر کی مصطلحات شاعری ذرا سہل قسم کی ہیں۔ ان کے بعض بنائی تنقیدی برہمنوں کو نہیں بھاتے، اکبر سیدھی بات بہت جلد بغیر کسی پیچ کے کہہ دیتے ہیں۔ اس سے شعر و ادب کے "اشراف و ثقات" گھبراتے ہیں یہ رویہ بانقطۂ نظر تنقید کی شریعت میں جائز نہیں رکھا گیا ہے۔ پھر ہر شاعر کو اختیار ہے چاہے وہ کل سے جز کا استنباط کرے چاہے جز سے کل کا۔ اکبر ہی نہیں کوئی بڑا شخص یا شاعر کو لیشن منسٹری نہیں بنا سکتا۔ اس کے ہاں بناوٹ نہیں ہوتی یعنی یہ بھی درست اور وہ بھی درست نہیں۔ شاعر کا یہ ٹکنیک نہیں ہوتا یہ کام ہمارا آپ کا ہے کہ ہم شاعر کو ہر ترازو اور ترازو سے تولنے کے بجائے اس کو سمجھنے اور چاہنے کے لیے ذوق ذہانت سے کام لیں۔

حالی کے زمانے میں ہونے کے باوجود نفسیاتی ترقی کے اعتبار سے اکبر ایک طرح پر حالی سے آگے ہیں یا ں سودا کی ہجویات سے قطع نظر اکبر ہماری شاعری میں پہلے شاعر ہیں جنھوں نے ہنسنے ہنسانے میں پہل کی ہے۔ یہ کام حالی کے عہد میں کسی اور کے بس کا نہ تھا۔

صاحبو! میری یہ گفتگو اب تک آپ کو غیر متعلق معلوم ہوئی ہو گی لیکن اقبال کا صحیح مقام متعین کرنے کے لیے ان مقامات سے گذرنا ضروری

تھا۔ گو میں اس کا بھی قائل ہوں کہ اقبال اب اس درجہ پر فائز ہیں جہاں یہ حکم لگانا بے محل نہ ہوگا کہ جو اقبال کا معتقد نہیں وہ خود بے بہرہ ہے۔ کوئی شاعر یا آرٹسٹ وسیع اور حقیقی معنوں میں شاعر یا آرٹسٹ نہیں ہے، اگر وہ سارے جہان کا شاعر یا آرٹسٹ نہ ہو۔ آپ اور میں اقبال کو مسلمان شاعر مانتے ہیں اور غلط نہیں مانتے۔ اور نہ ایسا سمجھنا اقبال ہی نہیں کسی بڑے شاعر کی شان کے منافی ہے۔ اقبال کو میں انہیں معنوں میں مسلمان شاعر مانتا ہوں جن معنوں میں اسلام کو سارے جہان کا مذہب سمجھتا ہوں۔ اگر رحمۃ اللعٰلمین سارے جہان کے لیے باعث رحمت ہیں تو ان کا نام لیوا، خواہ وہ شاعر ہو یا لیڈر، سارے جہان کے لیے شاعر اور لیڈر ہوگا۔ میں تو اس کا قائل ہوں کہ ہم میں آپ میں جو لوگ اقبال سے ناواقف ہیں یا اقبال کے قائل نہیں ہیں وہ نہ صرف غیر تعلیم یافتہ ہیں بلکہ غیر متمدن بھی ہیں وہ شخص یقیناً تعلیم یافتہ یا متمدن نہیں کہا جا سکتا جو آفاق گیر شعرا یا آرٹسٹ کی عظمتوں سے ناآشنا ہو۔

شاعر، مفکر اور رہبر کی حیثیت سے اقبال کو ہمارے ادب اور زندگی میں وہ درجہ حاصل ہے جو آج تک مسلمانان ہند میں کسی اور شاعر اور مفکر یا ادیب کو حاصل نہیں ہوا، فرداً فرداً ممکن ہے ہمارے بعض شعرا کا پایہ اقبال سے برتر ہو لیکن بحیثیت مجموعی اقبال ہمارے اردو شعرا میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک نامعلوم طویل مدت تک اردو شاعری میں اقبال کی حیثیت خاتم الشعرا کی رہے تو تعجب نہیں، مذہب ہی نہیں شاعری میں بھی نبی اکثر گزرے ہیں اور گزرتے رہیں گے۔ رسول کم ہوئے ہیں۔

صاحبو! جب اقبال نے اپنا کلام و پیام ملک کے سامنے پیش کیا اور یہ ہمارے آپ کے سامنے کی بات ہے تو ہر طرف سے مخالفت کا طوفان اٹھا لیکن ان کی زندگی ہی میں وہ وقت بھی آگیا جب ہم میں کوئی ایسا نہیں ہے جو اقبال کا قائل نہ ہو۔ ہم ان کے کلام کو صوری و معنوی ہر صورت سے سراہتے ہیں اور ان کو سب سے بڑا شاعر اور مفکر گردانتے ہیں۔ دنیا کی بڑی ہستیوں کی ایک بڑی پہچان یہ بھی ہے کہ ابتدا میں ان کی شدید مخالفت کی جائے اور آخر میں ان پر جان نثار کی جائے۔ اردو میں ایک سے ایک بڑا شاعر مانا جاتا ہے مگر ہمارے ذہنوں پر اقبال کی جو عالمگیر گرفت ہے وہ کم تر کسی کے حصے میں آئی۔ یہاں تک کہ ہم میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اقبال کو خاصان خدا کے زمرے میں رکھتے ہیں۔

اردو شاعری میں فکر کا عنصر سب سے زیادہ غالب کے ہاں ملتا ہے۔ اردو میں غالب پہلے شاعر ہیں جنھوں نے شاعرانہ جذبے میں مفکرانہ گہرائی پیدا کی۔ اس کا اعتراف خود اقبال نے کیا ہے۔ غالب کے علمی تصورات سے یہاں بحث نہیں، کہنا صرف یہ ہے کہ فلسفیانہ مسائل کو فلسفیانہ شاعرانہ انداز میں پیش کرنے کا سہرا غالب کے سر ہے۔ بعض غزلوں یا اشعار سے قطع نظر غالب کی زبان جہاں کہیں انھوں نے فکر و فلسفہ کو دخل دیا ہے علمی زبان بن گئی ہے۔ معتقدانہ شاعرانہ انداز میں شاعری کرنے کا امتیاز انیس و محسن کو حاصل ہے گو میں اس کا بھی قائل ہوں کہ مرثیہ نگاروں میں انیس وہ ہیں جنھوں نے مرثیے کے زور سے اپنی شاعری کو نہیں بلکہ اپنی شاعری کے زور سے مرثیے کو چمکایا۔ زبان کے اعتبار سے انیس کو جو درجہ حاصل ہے وہ مسلم ہے لیکن یہاں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ اردو بیشتر شاعرانہ زبان رہی ہے اس لیے ایسی شاعری میں جہاں خیالات سے زیادہ جذبات کی کارفرمائی ہو یہ خوب کام دیتی ہے، اور یہی سبب ہے کہ جب کبھی اس میں ایسے عناصر داخل کیے گئے جو خالص شاعرانہ نہ تھے تو یہ ناہموار نظر آنے لگی ایسی ناہموار کہ اس کے پرستار اس شاعری کے بھی قائل نہ رہے جس نے اس میں اپنا کلام پیش کیا غالب اور حالی کا یہی حشر ہوا۔

صاحبو! اقبال کو بھی اس منزل سے گزرنا پڑا انیس کا یہ کمال تھا اور مرثیہ کی خوش بختی کہ انیس نے مرثیہ میں وہ ساری خوبیاں جمع کر دیں جو دیگر اصناف سخن میں علیحدہ علیحدہ موجود تھیں۔ ان کے کلام میں غزل، قصیدہ، مثنوی، مسدس حتیٰ کہ ڈراما اور افسانہ سب کے خصوصی امتیاز بڑے دل کش اسلوب میں سمائے ہوئے ملتے ہیں۔ میر کے بعد انیس کو زبان پر جو قدرت تھی وہ آج تک نہ دیکھی گئی نہ سنی گئی۔ اقبال کی زبان کا بھی یہی حال ہے۔ میر و مومن کے مقابلے میں آپ اقبال کی زبان کو شاید ناقابل التفات سمجھیں لیکن یہاں زبان سے مراد صرف روزمرہ اور محاورہ اور اس قبیل کی باتیں نہیں ہیں بلکہ وہ زبان مدنظر ہے جو شاعر نے اپنے کلام میں مخصوص ضرورتوں کی بنا پر اختیار کی ہے اور کامیاب یا ناکامیاب رہا ہے۔ اس سلسلے میں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ اگر آپ اس پر غور کریں کہ اقبال کا موضوع سخن کیا ہے۔ ان کا انداز تخاطب کیا ہے۔ ان کی ذہنی پرداخت کیسی اور ذہنی پرواز کس طرف تھی۔ ان کا مقصد کیا تھا اور ان کے مخاطب کون ہیں تو آپ اقبال کی زبان کے قائل ہو جائیں گے۔ مجھے تو اکثر محسوس ہوا ہے کہ جہاں تک مسائل علمیہ و فکریہ کو شعر میں ڈھال کر دل نشین اور فکر انگیز بنانے کا تعلق ہے۔ غالب کی زبان سے اقبال کی زبان زیادہ متوازن و شگفتہ ہے گو یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ اس وادی کے

کے کانٹے کا نکالنے کا کام غالب ہی نے کیا اور اس طرح اقبال کے لیے زمین ہموار اور صاف ملی۔ روزمرہ اور عام بول چال کی زبان سے یہاں بحث نہیں۔ اقبال کے ہاں اس زبان کا گذر نہیں، البتہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اقبال نے فارسی الفاظ اور ترکیبوں کو جس ماہرانہ اور شاعرانہ انداز سے اپنے اردو کلام میں منتقل کیا ہے اس سے ہندوستان میں اردو اور فارسی دونوں کا وزن و وقار بڑھ گیا۔

صاحبو! اردو شعرا میں ایسے اصحاب بھی نظر آتے ہیں جو شاعری کے علاوہ دوسرے علوم و فنون پر بھی قدرت رکھتے تھے لیکن اس کا اثر ان کی شاعری پر بہت کم نظر آتا ہے بعض شعرا علمی و فنی مصطلحات کی رعایت اپنے کلام میں مدنظر رکھتے ہیں ہم اپنے حسن ظن سے ان کو اس علم و فن کا امام قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ جو لوگ شاعری اور انشار پردازی کے ہتھکنڈوں سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس قسم کی رعایت و مناسبت کا فن جاننے سے دور دور تک کا تعلق نہیں یہ سارا کرشمہ ضلع جگت یا رعایات لفظی کا ہے جو ایک زمانے میں ہمارے شعر و ادب اور روزمرہ کی صحبتوں میں بہت مقبول تھے۔ یہی حال بڑی حد تک اردو شاعری میں تصوف کا ہے۔ اردو میں ایسے شعرا بہت کم گزرے ہیں جو واقعتاً تصوف سے لگاؤ رکھتے تھے یا جنھوں نے تصوف کا مطالعہ کیا ہو، یہی سبب ہے کہ ہم کو اردو شاعری میں زبانی کھیل زیادہ ملتا ہے۔

صاحبو! ہم میں ایک غلط فہمی یہ پھیلی ہوئی ہے کہ شاعری میں جذبہ ہی سب کچھ ہے۔ میں ایسے جذباتی شعرا سے واقف ہوں جو جذبہ کو خدا کی سب سے بڑی دین اور اپنا سب سے بڑا سرمایہ افتخار جانتے ہیں، جذبہ کو میں بھی خدا کی سب سے بڑی دین سمجھتا ہوں۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ وہ ہمارے شعرا کی شامت بھی بن گیا ہے۔ اگر غور فرمایئے تو معلوم ہو جائے گا کہ جذبہ بجائے خود کوئی بڑی بات نہیں ہے اگر اس کو حرکت میں لانے اور صحیح راستے پر لگانے کا ملکہ فکر و تجربے نے شاعر کو نہ عطا کیا ہو۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے ایک متنازعہ فیہ مسئلہ کی بھی ابتدا ہوتی ہے۔ یعنی اقبال شاعر نہیں فلسفی ہیں۔ یا ان کی شاعری پر فلسفہ غالب ہے

میرے نزدیک اس سوال کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ اقبال کا درجہ (او ربرگزیدہ شاعر کا درجہ) اس بحث سے کہیں بلند ہے کہ وہ شاعر پہلے ہیں فلسفی بعد میں یا اس کے برعکس بحیثیت مجموعی شاعری میرے نزدیک مخصوص پیرایۂ اظہار ہے نہ موضوع بحث، جتنے موضوع فلسفہ، سائنس، منطق وغیرہ کو بھی شاعری کا رنگ و آہنگ دیا جا سکتا ہے اور سلیقہ نہ ہو تو حسن و عشق کی بھی کوئی حیثیت نہیں۔ چنانچہ میرے نزدیک اقبال کا شاعر ہونا ان کے فلسفی ہونے کا منافی نہیں ہے۔ اسی طرح ان کے مفکر یا فلسفی ہونے سے ان کی شاعری کی منزلت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ نرا شاعر اور نری شاعری کا چسکا ہم کو غزل سے پڑا۔ یہاں تک کہ اکثر ہم غیر شعوری طور پر بھی یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ شاعری عبارت ہے غزل سے بعضوں کا خیال ہے کہ شاعری اور تغزل مترادف نہ سہی ان کا چولی دامن کا ضرور ساتھ ہے۔ شاعری کا یہ تصور اس اعتبار سے دلچسپ ہے کہ اس سے ہمارے تمدنی امزاج کی غمازی ہوتی ہے یعنی حسن و عشق تمام تر عبارت ہے عورت کے حسن سے!

اقبال کا حسن و عشق اس سے ماورا بھی ہے، بلند بھی ہے اور شاید اس کا منافی بھی۔ لیکن اس بحث کو کسی دوسرے موقع کے لیے ملتوی کر دینا مناسب ہوگا۔ میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ اقبال کی عظمت کی نشانی ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے کلام میں شاعر اور مفکر دونوں نظر آتے ہیں۔ مفکر اگر شاعر نہ ہو تو ممکن ہے ہم اس کی بات سمجھ لیں یہ البتہ دشوار ہوگا کہ ہم اس کے کہے پر عمل بھی کریں اس طرح شاعر نہ ہو تو ممکن ہے ہم مشاعرے میں واہ واہ کر لیں تنہائی و تکلیف میں وہ ہمارا مونس یا رہبر نہ بن سکے گا۔ اردو شاعری میں خالص شاعر بھی گزرے ہیں۔ ان کی شاعری کو ہم اچھی شاعری بھی کہہ سکتے ہیں۔ البتہ بڑی شاعری نہیں کہہ سکتے۔ ہمارے یہاں اچھے شاعر بہت سے گزرے ہیں بڑے شاعر یقیناً بہت کم ہیں۔

صاحبو! اردو شاعری میں صرف اقبال کی شاعری ایسی ہے جو ہم کو ان علوم و مسائل تجربات و تحریکات کی طرف بے اختیار متوجہ کرتی ہے جو اس وقت عالمگیر ہیں اور جن کی گرفت عام اور تعلیم یافتہ ذہنوں پر ہے انھوں نے دنیا کے اکابر اصحاب فکر و عمل کے خیالات تعلیمات و جدوجہد کو اپنے کلام کے ذریعے اس شاعرانہ لطف و نزاکت اور عالمانہ بصیرت و سنجیدگی سے پیش کیا کہ ہم ان کو اصحاب فکر سے ایک طرح ذہنی ربط پیدا ہو گیا اور اس طور پر ہم نہایت آسانی کے ساتھ ان تمام عالمگیر ذہنی تحریکوں سے آشنا ہوئے جن سے کسی اور طرح ہمارے عامۃ الناس روشناس نہ ہو سکتے تھے شاعری کا یہ کمال اور اس کے لیے سب سے مستند سند جواز یہ ہے کہ وہ مشکل گہرے اور تاریک تصورات و خیالات کو بہت جلد زیادہ سے زیادہ

دلوں میں اتار دیتی ہے اور یہ وہ کارنامہ ہے جو شاعری کے علاوہ کسی فن کو نصیب نہیں۔ اردو شاعری میں یہ بات صرف اقبال کے ہاں ملتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اقبال نے ان افکار و تحریکات کی خوبی اور خامیوں کو اسلامی افکار و اعمال کی روشنی میں اس طرح پیش کیا جس سے ہمارے خواص و عوام دونوں گمراہ ہونے کے بجائے بہرہ مند ہوئے۔

سیاسی لیڈر تو ہم میں پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن ذہن و فکر کو طاقت و تازگی بخشنے اور صحیح راستے پر رہنمائی کرنے والا ہم میں مدت سے نہیں پیدا ہوا تھا۔ آج کل مادی ترقی کے ساتھ ذہنی ترقی کی جو رفتار ہے اس سے عہدہ برآ ہونا معمولی ذہن و دماغ کا کام نہیں ہے۔ آجکل سیاسی قیادت جتنی آسان ہے اتنی ہی ذہنی قیادت مشکل ہے۔ سیاسی قیادت اکثر چند افراد اور محدود مقاصد کی بنا پر حاصل ہو جاتی ہے لیکن ذہنی قیادت ہر صدی میں صرف چند ایک کے حصہ میں آتی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں میں ہمہ گیر ذہنی قیادت بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی۔ یہ سعادت اور برگزیدگی اس صدی میں اقبال کو نصیب ہوئی۔ اقبال نے زندگی اور زمانے اور زمانے کے تقریباً تمام مسائل میں، پر حکیمانہ شاعرانہ یا شاعرانہ حکیمانہ انداز سے اظہار خیال کیا ہے اور کچھ ایسے دل کش اور موثر انداز میں پیش کیا ہے کہ ہم میں ہر شخص خواہ وہ اس کے سمجھنے کی کافی استعداد رکھتا ہو یا نہیں ان مسائل کو سمجھنے سلجھانے کی کوشش کرتا ہے کامیاب ہوتا ہے تو خوش ہوتا ہے اور نہیں کامیاب ہوتا ہے تو کامیاب یا مطمئن ہونے کی بار بار کوشش کرتا ہے اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اقبال کے وسیلے سے قوائے علمیہ و عملیہ کس طرح بیدار و بالیدہ ہوتے ہیں۔ اقبال کے کلام کی مثال اس متاع یوسفی کی ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے مصر کے اہل ثروت و اقتدار ہی نہیں بلکہ ایک بڑھیا بھی تھوڑی سی روئی لے کر بازار مصر میں آ موجود ہوئی تھی۔ آپ سوچیں تو معلوم ہوگا کہ اقبال کی اس کرامت کا عام ذہنی نشوونما اور ذہنی حوصلوں پر کیسا عظیم الشان اثر ہے۔

صاحبو! اسلام نے اپنے پیرووں کو دین و دنیا کی ان منزلوں پر فائز کر دیا تھا جن سے آگے یا جن سے بڑی کوئی اور منزلت نہ تھی۔ دنیا کی کوئی ترقی یا ذہن و عمل کا کوئی کارنامہ ایسا نہ تھا جو مسلمانوں کو سراسیمہ یا متحیر کر سکتا۔ مسلمانوں پر ایسا وقت بھی آیا جب وہ منزلت سے گر کر ذلت میں جا پڑے اور اس تصور سے کہ وہ سب کچھ تھے یا کر سکتے تھے لیکن کرتے کچھ نہ تھے ان کو شدید نقصان بھی پہنچایا، یہ سب ہمارے سامنے کی باتیں ہیں۔ ہم نے ہر طرح کے جتن کیے لیکن شعور کی وہ بیداری جس کو ہم افراد کی نہیں جماعت کی بیداری سے تعبیر کر سکتے مدتوں نصیب نہ ہوئی۔ مغربی اداروں اور مغربی افکار سے ہم مسحور و مرعوب ہوتے رہے۔ یہ حال عوام ہی کا نہیں تھا بلکہ ہمارے خواص بھی اس کے شکار تھے۔ ہماری اکثر مستند تصانیف اور مشیر ادارے اس پر گواہ ہیں۔ اقبال کے کلام کی گرمی اور تازگی ان کی تعلیم کی گیرائی اور گہرائی اور ان کے بے پایاں خلوص سے ہمارے دلوں کے معلوم نہیں کب سے خشک ہوتے ہوئے اور رکتے سوتے بہے۔ ساز نغمہ سرا ہو گئے، ہندی مسلمانوں میں جو ہمہ جہت بیداری آج نظر آ رہی ہے اس کو جو نام چاہے دے لیجیے، یہ کرامت اقبال ہی کی ہے جس کے لیے انیس و غالب، حالی و اکبر، سرسید و شبلی نے زمین ہموار کر رکھی تھی۔

صاحبو! اقبال سے پہلے مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کو واجب العمل سمجھنا تو درکنار ان کو تحریر و تقریر میں بطور سند پیش کرنا اپنی اور دوسرے کی ذہنی توہین سمجھتا تھا۔ یہ طبقہ اسلاف و اکابر کی روایات اور مذہبی و اخلاقی قدروں پر بھروسہ نہیں کرتا تھا۔ اردو شعر و ادب کو دوسرے شعر و ادب کے مقابلے میں ہیچ سمجھتا تھا۔ ہر وہ چیز جو مغرب سے آئی ہو مستند اور مشرق کا ہر تصور و تفکر مردود تھی۔ اقبال کے کلام و پیام نے ہمارے قلب و دماغ کی یکسر قلب ماہیت کر دی۔ اب کسی بحث میں اقبال کا کلام یا ان کے متفرق اشعار کو بطور دلیل پیش کرنا عام بات ہے۔ بعض دعی باتوں سے قطع نظر اقبال نے وہی چیزیں پیش کی ہیں جو پہلے سے ہمارے ہاں موجود تھیں لیکن نیا ذہن ان کی طرف مائل نہ ہوتا تھا۔ اقبال کی تعلیم کی بنیاد قرآن و حدیث، ائمہ کے اقوال اور اسلاف کے کارناموں پر مشتمل ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن اقبال نے ان باتوں کو جس قابلیت خلوص اور جرأت کے ساتھ پیش کیا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم خود اپنی نظروں میں محترم ہو گئے، اور اس طور پر محترم بنے کہ دوسرے ہم کو محترم ماننے پر مجبور ہوئے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شاعری اور پیمبری کی حدود نہ صرف ایک دوسرے سے مل گئی ہیں بلکہ کچھ دور تک ایک ساتھ چلی گئی ہیں۔

صاحبو! ہم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اقبال کو مفکرین یورپ کا خوشہ چیں قرار دیتے ہیں۔ یہ غلطی نہیں تو غلط فہمی ضرور ہے۔ یہی نہیں بلکہ

آج کل بعض حلقوں میں یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ خود اسلام اپنے پیشرو مذاہب سے ماخوذ ہے یا ان کا خوشہ چیں ہے، اسی سلسلے میں ایک بات یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ اقبال نے جو بات کہیں بھی مفید مطلب پائی اختیار کر لی اور باقی کو ترک کر دیا یہ سارے اعتراضات تسلیم کر لینے چاہئیں۔ یہ اعتراضات بڑی حد تک اسلامی تصورات کی تصدیق کرتے ہیں نہ کہ تکذیب، واقعات صحیح ہیں صرف ان سے نتیجہ غلط نکالا گیا ہے۔ اسلام نے اس کا کہیں اور کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ وہ دنیا کی تاریخی و تمدنی آثار و کسر و انکسار سے یکسر محفوظ و علیحدہ رہ کر ایک دن یک لخت آسمان سے نازل ہو گیا وہ جملہ دوسرے ادیان کا ناسخ بھی ہے اور تصدیق کرنے والا بھی۔ ناسخ اس لیے کہ اسلام دین کامل قرار دیا گیا اس ہستی کے توسل سے جو اسلام کا مرد کامل ہے اور اس طاقت نے اس کو کامل قرار دیا جس سے بڑی طاقت انسانی تصور میں نہیں آ سکتی اور تصدیق کرنے والا یوں کہ وہ ان ادیان کو جھٹلاتا نہیں بلکہ ان کے بنیادی تصورات کی تصدیق کرتا ہے۔ اس لیے اسلام میں اگر وہ باتیں ملیں جو اس سے پہلے کے ادیان میں ملتی ہیں تو اس میں شرمانے، خفا یا مایوس ہونے کی کیا بات ہے۔ اس سے اسلام کا درجہ فروتر کیوں کر ہوا؟ کلام الٰہی یا مذہب الٰہی کے یہ معنی کب ہوئے کہ دنیا کے حالات و حوادث سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو، بذات خود میں سمجھتا ہوں کہ اس دنیا کا خدا اسی دنیا کے ماضی حال و مستقبل سے بیگانہ نہیں ہے اس لیے کہ دنیا کی تاریخ تقدیر الٰہی سے باہر نہیں۔

صاحبو! اس بحث کی روشنی میں اگر ہم یہ مان لیں کہ اقبال نے مفکرین یورپ سے استفادہ کیا تو اس میں کیا قباحت لازم آتی ہے اور اقبال نے مفکرین یورپ کی انہیں باتوں سے سروکار رکھا ہو جو ان کے کلام و پیام کی تائید و تصدیق کرتے ہوں (بقیہ سے نہیں) تو کیا قباحت لازم آتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں آپ کو اس مسئلہ پر بھی غور کرنے کی دعوت دوں گا کہ مفکرین یورپ کے اکثر بنیادی تصورات ان اسلامیوں کے تصرفات ہیں جو براہ راست یا بالواسطہ یورپ پہنچے تو یورپ کے مفکرین کے بارے میں آپ کیا رائے قائم کریں گے یہ بحث بڑی طولانی ہے اس صحبت میں میں صرف اقبال کو مدنظر رکھنا چاہتا ہوں اقبال نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ ان پر فلاسفۂ مغرب کا کافی اثر تھا۔ لیکن اس کے ساتھ اقبال نے اس کا بھی اعتراف کیا ہے کہ مغربی مفکرین کے مطالعہ سے پہلے وہ ان اسلامی تصورات و عقائد سے بھی پورے طور پر بہرہ مند تھے جو کلام پاک کے مطالعہ کا نتیجہ تھے، میرے نزدیک ان دونوں بیانات میں تضاد نہیں ہے کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ اقبال مغربی مفکرین سے متاثر بھی اس لیے ہوئے کہ ان کے ذہن و دماغ میں وہ اسلامی تصورات رچے ہوئے تھے جو انسانی ذہن و عمل کو انسانی ارتقا کی اس وادی میں لے جاتے ہیں جس کا ایک سرا میلاد آدم سے وابستہ ہے اور دوسرا معراج آدم میں پوشیدہ۔

صاحبو! اس بحث میں گفتگو کی گنجائش ہے لیکن وقت میں گنجائش نہ ہونے کے سبب سے میں اس مسئلہ کو یہاں ختم کر دینا چاہتا ہوں اور لطف ان نوجوان دوستوں کو جو اقبال کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں مشورہ دوں گا کہ وہ اقبال کے بنیادی تصورات کو ذہن میں رکھ کر کلام پاک کا مطالعہ کریں۔ ان کو معلوم ہو جائے گا کہ اقبال پر قرآن کا اثر مغربی مفکرین کے اثر سے کہیں زیادہ نمایاں ہے اور اقبال کو مغربی مفکرین کے تصورات سے دلچسپی ہی اس لیے پیدا ہوئی کہ ان کے تصورات کلام الٰہی سے ہم آہنگ ہیں اور اقبال ان مفکرین کے اسی حد تک ہمنوا ہیں جس حد تک قرآن پاک سے ان تصورات کی تصدیق ہوتی ہے۔ ہمارے ایک عزیز ذی استعداد طالب علم نے اس پر کام کرنے کا تہیہ کر لیا ہے کچھ تعجب نہیں آئندہ سال یوم اقبال کے موقع پر سرور صاحب کی معرفت آپ اس طالب علم کے اس مقالہ سے اسی ایوان میں آشنا ہوں۔

بعضوں کے نزدیک اقبال کے ہاں جہاں تہاں منطقی الجھنیں ملتی ہیں۔ خودی اور خدائی کے حدود واضح نہیں ہیں۔ فوق البشر کا تصور کہیں کچھ ہے اور کہیں کچھ۔ وہ کبھی کسی ادارے یا شخصیت کی تعریف کرتے ہیں اور کبھی اس سے روگرداں ہو جاتے ہیں اور اس قبیل کی دوسری باتیں۔ لیکن یہ امور ایسے نہیں ہیں جن کی اہمیت اقبال کی عظمت پر غالب آ سکے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس دنیا میں خدا کی قدرت کا سب سے بڑا نمونہ انسان ہے اور انسان ہی وہ باشعور مخلوق ہے جو باعتبار خلقت اپنے خالق سے بہت قریب کا رشتہ رکھتا ہے اور یہ رشتہ زندگی کا ہے اس زندگی کا جو ہمیشگی سے پیوستہ ہے جو ادھر مسلسل ہوتی رہتی ہے معدوم نہیں ہوتی۔ یہ زندگی خدا سے شروع ہوتی اور خدا پر ہی ختم ہو جاتی ہے انسانی زندگی کبھی اس سے باہر نہیں ہو سکتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کی خودی ہمیشہ انسانی خودی رہے گی اور اس کی خودی کی معراج اس پر نہیں ہے کہ وہ خدا بن جائے بلکہ خدا کی صفات سے قریب تر ہو کر مرتفع تر و مستحکم تر ہوتی رہے۔ انسان کے خدا بن جانے میں میرے نزدیک انسان کی کوئی بڑائی نہیں ہے اس لیے کہ انسان کا خدا بن جانا انسانیت

کے مقاصد میں نہیں ہے۔ استحکام خودی سے اقبال کا مقصد یہی ہے کہ وہ کسی ذات میں ختم نہ ہو۔ انسانی خودی کی انتہا صرف انسانی خودی کی انتہا ہے کسی اور کی ابتدا یا انتہا نہیں۔

صاحبو، یہ مسائل علمی نقطۂ نظر سے اہم ہوں تو ہوں مذہبی نقطۂ نظر سے ان کی کوئی اہمیت نہیں اس لیے کہ مذہب اس بحث سے بلند بھی ہے اور علیحدہ بھی۔ در اصل اسلام میں کوئی فلسفہ نہیں ہے۔ اسلام کا مدار چند بنیادی عقائد پر ہے اس کے بعد ان عقائد کے ماتحت تمام تر عمل ہے۔ مذ ابتداً خود میں سمجھتا ہوں کہ عقائد کے لیے یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ وہ سائنس، فلسفہ اور ریاضی کی کسوٹی پر صحیح اتریں، عقائد کا مستحکم ہونا ضروری ہے۔ سائنٹیفک ہونا بالکل ضروری نہیں ہے۔ فلسفہ دراصل مذہب کا گورستان ہے۔ دنیا کے مذاہب پر جو زوال آیا وہ غالباً اسی سبب سے ہے کہ ان میں فلسفے کے جراثیم موجود تھے۔ اگر اسلام مذہب عمل نہ ہوتا تو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و شخصیت کو اس درجہ اہمیت نہ دی جاتی۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے شجر اسلام میں نمو ہے یہی سبب ہے کہ اسلام پر برے سے برا وقت آیا لیکن اس پر کہولت یا فرسودگی طاری نہیں ہوئی۔ انسانی جہد و عمل کا مذہب کبھی فرسودہ نہیں ہوا۔ درس خودی میں اقبال اسی جہد پیہم پر زور دیتے ہیں جس میں محبت فاتح عالم بھی شامل ہوتی ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ اقبال کے بیانات میں تضاد ملتا ہے۔ اس کے بارے میں صرف یہ کہنا کہ اسلام کے نداکی طرح اسلام اور اسلام کے شاعر میں بھی مختلف حیثیتیں مختلف مواقع پر بر سر کار آتی ہیں۔ اسلامی سیرت و شخصیت میں "فولاد" و "پرنیاں" دونوں ملتی ہیں۔ ضرب کاری بھی اور خوئے دلنوازی بھی۔ لیکن اس بحث کو یہاں ختم کر دینا چاہیے۔ بہت ممکن ہے آج کی صحبت میں کسی گوشے سے ان پر تفصیلی گفتگو سننے میں آئے۔

صاحبو! میں نے اقبال کا کلام پڑھا ہے۔ بار بار پڑھا ہے ہر حال میں پڑھا ہے، پھر بھی سرور صاحب سے کم پڑھا ہے۔ مجھے ہمیشہ کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اقبال کا کلام اس آسمان کی مانند ہے جس کے نیچے ہم آپ بستے ہیں۔ جاڑے گرمی برسات میں اس فضائے نیلی پر کیسے کیسے سماں نظر آتے ہیں جو کبھی یکساں نہیں ہوتے۔ جن میں زندگی کی بوقلمونی نظر آتی ہے۔ اور کچھ نہیں تو برسات میں آپ نے دیکھا ہوگا۔ اس بساط پر کیسی کیسی نیرنگیاں نظر آتی ہیں اور آپ کے ذہن میں کیسی کیسی رنگین پراسرار، ڈراتے والی، تسکین دینے والی حوصلہ دلانے والی تصویریں اور تصورات جیسے جیتے جاگتے، ہنستے بولتے دم بدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من "جلوہ گر ہوتے رہتے ہیں۔ جیسے کشمیر کی زمین و آسمان بن کر جب دیکھیے، جتنا دیکھیے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور محسوس ہوگی جو پہلے نہ ہوئی تھی!

صاحبو! آپ کو یاد ہوگا: میں نے عرض کیا تھا کہ اقبال کا کلام و پیام ہماری زندگی کی سرگرمیوں میں غیر معمولی طور پر دخیل ہے۔ اقبال کے کلام و پیام سے مسلمانان ہند میں ایک جدید نشاۃ الثانیہ کی ابتدا ہوتی ہے۔ ہماری زندگی کا کونسا شعبہ ایسا ہے جہاں اقبال کے کلام و پیام سے ہم کو مکمل رہبری نہیں ملتی۔ ان کے فلسفے نے نئے علم کلام کا دروازہ کھولا، شعر و ادب میں نئی قدریں سامنے آئیں۔ تعلیمی مسائل میں اقبال کے کلام سے روشنی اور گرمی دونوں ملتی ہیں، ہمارے آپ کے پروفیسر سیدین نے کچھ دن ہوئے ایک مبسوط تصنیف میں اقبال کے ان نظریوں کو پیش کیا ہے جو تعلیم کی اساس مانے جاتے ہیں، ہماری موجودہ سیاسی تگ و تاز میں اقبال کے کلام کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جماعت کی شیرازہ بندی میں اقبال کی تعلیم نے وہ کام کیا جو اب تک پورا نہ ہوا تھا، اقبال ہی کے تصور سے ہم کو اپنے علمی و تمدنی ورثہ کی عظمت کا احساس ہوا اور قومی شعور کی صحیح راستہ پر نشو و نما ہوئی۔ اقبال کے کلام و پیام سے مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ اور حضرت اسمٰعیل شہید کے کارناموں کو از سر نو تازگی و تابندگی ملی۔

ہمارے ادب میں اتنا جامع حیثیات شاعر اب تک نہیں پیدا ہوا جو بیک وقت اپنی قوم میں اپنے زمانے کا سب سے بڑا معلم و مفکر تھا۔ اس کی یادگار منانا اور اس کے بتائے ہوئے راستے کو اختیار کرنا سعادت مندی بھی ہے اور اقبال مندی بھی! خدا آپ کی مدد کرے۔

اقبال کا فکری ارتقاء

محمد عبدالسلام خاں

ظروف اور ذہنی فعالی

واردات انسانی فکر کی صورت میں ہوں یا وجدان کی شکل میں۔ ان میں ماضی کے تجربے، مستقبل کے تقاضے اور موجودہ ظروف و احوال کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج کے فلسفیانہ نظام، سائنسی اکتشاف اور جمالیاتی اظہار ہزاروں سال پہلے دنیا سے خراج تحسین وصول کر چکے ہوتے اور ہمارے حصے میں بزرگوں کے ورثے کی حفاظت کے سوا کچھ آتا۔ تاہم یہی سب کچھ نہیں ہیں فرد کا شخصی تاثر اور اس کی ذہنی صلاحیت، شخصیت کی ذاتی فعالی اور ناگزیر عامل ہیں ان واردات کی آمد، صورت پذیری اور ظہور میں۔ ورنہ یکساں ظروف میں ہر شخص افلاطون و ارسطو ہوتا، ہر فرد ایڈیسن اور اسٹیفینسن بنتا، غالب اور اقبال میں کوئی ندرت نہ ہوتی۔

اقبال کی حکیمانہ فکر اور فلسفیانہ نظام میں بے شبہ دانایان مغرب اور حکمائے مشرق دونوں کے افکار کا نمایاں اثر ہے۔ مغرب کے مادی ارتقاء کو بھی دخل ہے اور مشرق کی زوال آمادہ ثقافت سے اثر پذیری کو بھی۔ ان کی فکر میں اسلامی دنیا کے ہر جہتی انحطاط کا عموماً اور ہندی مسلمانوں کی زبوں حالی کا خصوصاً ایک مقام ہے۔ امت مسلمہ کی رفعت کی عام آرزو خود بھی ایک محرک ہے۔

فکر اقبال کے ظروف

اقبال کا گھریلو صوفیانہ مذہبی ماحول اور ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت، مکتبی اور مدرسی مضامین اور اساتذہ کی صحبتیں ان کی فکر کو ایک خاص سمت میں ڈالدینے کی ذمہ دار ہیں۔ ہندوستان کی مذہبی، ثقافتی اور سیاسی عصبیتوں اور فرنگی استعمار کی سیاست کاریوں کو بھی ان کی فکری تعمیر سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ پنجاب کی صحت بخش آب و ہوا، جسمانی طاقتیں اور ان کو بڑھانے کے وسائل سے دل چسپی، قوت کے مظاہرے اور اقبال کی ان سے عملی دل چسپی ان سب کا ایک طرح سے اثر ہے ان کے خیالات کے میلان میں۔

اُنیسویں صدی کے ربع آخر میں مغرب کی مادی قوتوں کا ہندوستان پر کامل استیلاء اور اس کے افکار و تصورات کی قوت قدیم تہذیب کے ساتھ ساتھ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے مذہبی عقائد اور ان کی دینی روایات کو بھی متزلزل کیے ہوئے تھے۔ سرسید مرحوم کے اعتذاری مباحث اور اجتہادی انتقادوں نے بڑی حد تک اس تزلزل پر نظری طور سے قابو پانے کی کوشش کی۔ سرسید کی ان بحثوں اور تنقیدوں کا علمی فائدہ یہ ہوا کہ مذہبی مباحث کی تحقیقات میں جو جمود پیدا ہو گیا تھا وہ ٹوٹ گیا اور مجتہدانہ نظر و بحث کے لیے نئے رستے کھل گئے۔ شبلی اسکول نے ان آزاد بحثوں سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ شبلی اور ان کے رفقاء اور شاگردوں کے علم و فضل، اعتدال پسندی، عمق اور ثقاہت نے اس اعتذاری لے کو بہت ہلکا کر دیا اور بے روک ٹوک اجتہاد کی بندش کی۔ مولانا آزاد مرحوم نے قرآنی صداقتوں کو اور مسلم کرداروں کو علمی ماحول میں جس اچھوتے خطیبانہ انداز میں پیش کیا، اس نے ان میں نئی زندگی بھر دی۔ اسی فضا کی ایک عظیم شخصیت خود اقبال بھی تھے۔

یہ احوال و ظروف کتنے ہی موثر سہی لیکن ان سے اقبال کی فکر کی کامل توجیہہ نہیں ہوتی۔ ایک خاص رخ سے معلومات و محسوسات کا انتخاب جمع، جائزہ، ترتیب اور استنباط کسی خاص جذبے یا جذبات کے رہین منت ہو سکتے ہیں لیکن خود اقبال کی اپنی ذہنی ساخت اور اس کی فعالی اُن کے نظام فکر کی تشکیل میں سب سے اہم عامل ہے۔ دوسری چیزوں کی حیثیت محرکات سے زیادہ نہیں۔

اقبال کا نشوونما اور تعلیم و تربیت

اقبال جو اس عہد کے ایک عظیم مفکر تھے ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو سیالکوٹ کے ایک

ایسے متوسط الحال اور پیشہ ور مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے جہاں صوفیانہ خیالات اور بزرگوں کی کشف و کرامات کا خاصا چرچا تھا۔ شریعت و طریقت کے اسرار و رموز سے دلچسپی تھی۔

اقبال نے مکتبی تعلیم جس میں فارسی ادبیات کے اوسط اور عربی کے ابتدائی مروجہ نصاب تک کی کتابیں شامل تھیں، کسی ٹھیٹ ملائے مکتبی کے بجائے قصبے کے روشن خیال، صوفی منش، جدید تعلیم کے ہمدرد اور سرسید اور ان کی تعلیمی تحریک سے دلچسپی رکھنے والی اثر انداز شخصیت مولوی میر حسن شاہ کے پاس پائی۔ ان بزرگ کی نگرانی اور تعلیم و تربیت میں رہتے ہوئے ان کی ہدایت پر ہی اقبال اسکاچ مشن ہائی اسکول میں (جو بعد میں اسکاچ مشن کالج ہوگیا تھا) داخل ہو گئے اور وہیں سے ۱۸۹۳ء میں انٹرنس کیا۔ اسی زمانے میں اقبال کی پہلی شادی ہوئی لیکن باہم خوشگوار تعلقات قائم نہیں ہو سکے اور شادی کے باب میں اقبال کی جو خوش آیند توقعات ہونگی وہ بر نہ آسکیں۔ بہرحال اِن ازدواجی علائق کے ساتھ ہی ۱۸۹۵ء میں اقبال نے اسی کالج سے ایف اے کر لیا۔

مکتب و مدرسہ کی قید و بند کے باوجود اقبال لڑکپن کے عام شوقوں میں آزادانہ حصہ لیتے تھے۔ کبوتر بازی، بٹیر بازی ان کے مرغوب شغل تھے۔ پنجاب کے متوسط گھرانوں کے نو عمروں کی طرح ڈنڈ پیلنا، مگدر ہلانا اور اکھاڑوں میں زور کرنا اقبال کے دلچسپ مشاغل تھے۔ شعر و شاعری سے لگاؤ فطری تھا طالب علمی کے زمانے میں ہی شعر کہنے لگے تھے۔ سیالکوٹ میں جو چھوٹے موٹے مشاعرے ہوتے ان میں شریک ہوتے اور اپنی غزلیں پڑھتے۔ داغ کو اُستادی کے لیے اقبال نے اسی زمانے میں انتخاب کیا تھا۔

۱۸۹۵ء میں اقبال لاہور آگئے اور ۱۸۹۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے عربی ادب اور فلسفے کر امتیازی نمبروں کے ساتھ بی اے کیا۔ ۱۸۹۹ء میں علی گڑھ کالج کے مشہور استاد، پریچنگ آف اسلام کے مصنف اور شبلی کے دوست اور استاد پروفیسر آرنلڈ کے شاگرد خاص کی حیثیت میں گورنمنٹ کالج سے ہی فلسفے میں ایم۔ اے کیا۔ لاہور میں رہ کر اقبال کا ذوق شاعری خوب نکھر گیا۔ غالباً ۱۸۹۵ء کی بات ہے کہ لاہور کے ایک مشاعرے میں سب سے پہلی بار شریک ہوئے اور غزل پڑھی جس کا مطلع تھا:

تم آزماؤ ہاں کو زباں سے نکال کے　　بہ صدقے ہو گی میرے سوالِ وصال کے

اسی غزل میں وہ مشہور شعر بھی تھا جس پر مرزا ارشد گورگانی عش عش کر گئے تھے:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے　　قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اس زمانے کی شاعری میں اگر ایک طرف مجازی عشق سے دل بہلایا ہے تو دوسری طرف صوفیانہ واردات کو بھی نظم کیا ہے عشق حقیقی کی چاشنی بھی ہے۔ تاہم مذہبی کرداروں سے شیفتگی، دینی روایات سے محبت اور ملت اسلامیہ سے گہری وابستگی ان کی شاعری کا غالب عنصر ہے۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتدا کے چند سال ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں یہی وہ زمانہ تھا کہ ہندوستانی قومیت میں اختلاف و افتراق کی خلیج وسیع ہوتی جا رہی تھی۔ فرقہ پرورانہ مطالبوں اور ان کے ردعمل سے سیاسی فضا مکدر تھی۔ جمہوری خطوط پر قومی حقوق طلبی کی جدوجہد اور حکومت کے نظم و نسق اور اس کی حکمت عملی پر عوامی نقطۂ نگاہ سے تنقید نظر کو مسلمانوں کا سربرآوردہ طبقہ اپنے فرقہ وارانہ مفاد کے خلاف سمجھتا تھا۔ خاص طور سے یو۔پی اور بہار کے مسلمان وطنی تحریکوں کے خلاف صف آرا تھے۔ جن صوبوں میں مسلمان غیر معمولی اقلیت میں تھے یا اپنی ایک گونہ اکثریت کی وجہ سے اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے۔ ان کا انداز نظر بدلا ہوا تھا۔ عام مسلمان کشمکش میں مبتلا تھے۔ جذبات کی رو میں کہیں قومیت کے خلاف صف آرا ہو جاتے کبھی شانہ بہ شانہ برادران وطن کے ساتھ نظر آتے۔ مسلمانوں کی کوئی مستقل مستحکم اور مرکزی پالیسی نہ تھی۔ علی گڑھ قیادت سے آزاد جدید تعلیم یافتہ نوجوان اس افتراق و اختلاف سے متنفر تھا اور چاہتا تھا کہ ہندو مسلمان ایک جان اور دو قالب ہو کر خالص وطنی بنیادوں پر اپنی سیاسی جدوجہد کو استوار کریں اور نفرت و اختلاف کو قومیت متحدہ کے وسیع مفاد میں محو کر دیں۔

اقبال کا اس زمانے میں یہی رجحان تھا۔ چنانچہ ملت سے پوری وابستگی، مذہبی روایات سے پوری شیفتگی اور ملی کرداروں سے پوری عقیدت کے باوجود انھوں نے قومی جذبات سے معمور نظمیں لکھیں جن میں ملکی روایتوں قومی کرداروں اور وطنی علامتوں سے والہانہ دلچسپی کا اظہار تھا۔ اور وطنیت و قومیت کو فرقہ وارانہ اتحاد کی بنیاد بنا کر متحدہ قومیت کی طرف دعوت دی تھی۔ آفتاب۔ ایک آرزو۔ ترانۂ ہندی۔ نیا شوالہ

ہندوستانی بچوں کا گیت اور تصویر درد جیسی نظمیں وطنیت و قومیت کے جذبات سے معمور دل کی پکار ہیں۔ نالۂ یتیم، یتیم کا خطاب، خط منظوم، عرض بجناب حضرت نظام الدین اولیاء۔ ہلال عید، سپاس جناب امیر وغیرہ نظمیں بھی اسی عہد کی یادگار ہیں۔ ان نظموں میں مذہبی تلمیحات کے ساتھ ملی روایات سے عشق، اسلامی کرداروں سے والہانہ تعلق پوری شدت سے موجود ہے۔

ایم اے کر چکنے کے بعد اقبال سب سے پہلے اورنٹیل کالج لاہور میں عربی کے استاد ہو گئے اور غالباً عربی درسیات کے مضامین تاریخ فلسفہ وغیرہ کا درس ان سے متعلق ہو گیا اور عربی، فارسی، اردو، ہندی اور سنسکرت کی درسیات کے اساتذہ کی رفاقت میں انھوں نے تعلیمی کام انجام دینا شروع کر دیا۔ کچھ مدت بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں جہاں آرنلڈ تھے اقبال بھی فلسفے کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گئے اور ۱۹۰۵ء تک وہ اسی اسامی پر رہے۔

اقبال کا مذہبی تصوّر اور وطنیت

اس عہد کے کلام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال مذہب کے ہر حیثیتِ اصول زندگی ہونے اور اجتماعی و انفرادی تمام شعبہائے حیات کے لیے اس کے شیرازہ بند ہونے کے تصور تک نہیں پہنچے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مذہب ایک باطنی لگاؤ، روحانی تعلق اور قلبی لطیفہ ہے جس سے انسانی جذبات میں لطافت اور تقدس پیدا ہو جاتا ہے۔ سارے عالم سے یگانگی اور دوستی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ عام خلوص ہمدردی اور محبت اس کے لوازم ہیں۔ دل آزاری اور شکوہ سنجی اس کی روح کے خلاف ہیں۔ "التجائے مسافر" میں التجا ہے:

مری زبان قلم سے کسی کا دل نہ دکھے کسی سے شکوہ نہ ہو زیر آسماں مجھ کو

مذہب کا نچوڑ محبت ہے۔ "سپاس امیر" میں "انا مدینۃ العلم و علی بابہا" کو سامنے رکھتے ہوئے محبت کو اصل اصول قرار دے کر حضرت علیؓ کو خطاب کرتے ہیں:

اے باب مدینۂ محبت اے نوح سفینۂ محبت
اے مذہب عشق را نمازے اے سینۂ تو امین رازے

"فریاد امت" میں اسلام کی حقیقت کی اس طرح توضیح کرتے ہیں:

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

مذاہب کا اختلاف ایک ہی حقیقت کے مختلف رخ ہیں ان میں باطنی تضاد یا تصادم نہیں۔

اصل محبوب ازل کی ہیں یہ تدبیریں سبھی ایک بیاض نظم ہستی کی ہیں تصویریں سبھی

آنکھ مل جاتی ہے ہفتاد و دو ملت سے تری ایک پیمانہ ترا سارے زمانے کے لیے

اقبال کی اس متصوفانہ مذہبیت کا تقاضا ہے صلح کل اور عام دعوتِ اتحاد۔ افتراق و اختلاف سے نفرت:

تو جدائی پہ جان دیتا ہے وصل کی راہ دیکھتا ہوں میں
بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے اس عبادت کو کیا سراہوں میں
میں کسی کو برا کہوں تو بہ ساری دنیا سے خود برا ہوں میں

"فریاد امت" میں واعظوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں:

غیر بھی ہو تو اسے چاہیے اچھا کہنا یہ غضب ہے کہ یہ اپنوں کو برا کہتے ہیں

اس روحانی لطیفے اور باطنی مقدس حرارت کا کوئی متعین عملی تقاضا نہیں، کوئی خاص بندھی ٹکی ثقافت نہیں، خاص صورتوں اور خاص رسموں میں محدود نہیں، اس کے اپنے تلے مطالبے نہیں اس لیے اس کا نہ کسی قومیت سے تصادم ہے نہ کسی نظام سے:

ہم نے یہ مانا کہ مذہب جان ہے انسان کی　　کچھ اسی کے دم سے قایم شان ہے انسان کی
روح کا جوہر نکھرتا ہے اسی تدبیر سے　　آدمی سونے کا بن جاتا ہے اس اکسیر سے
رنگ قومیت مگر اس سے بدل سکتا نہیں　　خون آبائی رگِ تن سے نکل سکتا نہیں

چنانچہ اقبال ترانۂ ہندی میں اعلان کرتے ہیں:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا　　ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

نیا شوالہ میں اختلاف و افتراق کی خلیج اس طرح پاٹتے ہیں:

زنار ہو گلے میں تسبیح ہاتھ میں ہو　　یعنی صنم کدے میں شانِ حرم دکھا دیں
مندر میں ہو بلانا جس دم پجاریوں کو　　آوازۂ اذاں میں ناقوس کو چھپا دیں
اگنی ہے اک نرگن کہتے ہیں پیت جس کو　　دھرموں کے یہ بکھیڑے اس آگ سے جلا دیں

مذہب کا یہ تصور کچھ تو اس دور کے عام جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے مذاق طبع کا آئینہ دار ہے جو خاص طور سے اس کے عملی تقاضوں اور شعائر و رسوم کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے اور ایک بہت نجی معاملہ سمجھ کر اس کی باطنیت اور روحانیت کو ہی سب کچھ جانتے تھے۔ علاوہ ازیں ایران کے عام صوفی شعراء کے کلام سے حقیقی مذہب کا جو دل آویز اور روحانی تصور ماخوذ ہوتا ہے اس کی سرمستی اور سرجوشی کو چھوڑ کر اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ جب ہر شے میں ایک ہی ازلی ابدی حسن کی جھلک ہے۔ بلبل کی چہک کی دوسری صورت گل کی نہک ہے۔ غنچے کی چٹک کا دوسرا نام انسان کا سخن ہے۔ جگنو کی چمک سوز ہے اور مرغ خوشنوا کا نغمہ ساز تو پھر تسبیح زنار کی دوسری صورت کیوں نہ ہو۔ اذان ناقوس ہی کی صدا کیسے نہ ہو۔ حقیقت کا یہ شاعرانہ تخیل، وجود کا یہ جمالیاتی تصور، تہذیبوں کی آویزشوں اور نصب العینوں کے تصادموں کے لیے جس طرح کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا اسی طرح مذاہب کی ہنگامہ آرائیوں کے لیے بھی کوئی بنیاد نہیں مہیا کرتا۔

ہر شے میں جبکہ پنہاں خاموشی ازل ہو　　یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو

اقبال اور جستجو

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کا یہ تصور اور مابعد الطبیعیاتی حقائق کی عام مذہبی توجیہیں اقبال کے دل و دماغ کو مطمئن نہ کر سکیں چنانچہ آغوشِ مذہب میں پرورش پایا ہوا، بزرگوں کی عقیدت مندیوں کے گہوارے میں جھولا ہوا، شاعرانہ احساسات سے معمور، ذوق و وجدان کی وسعتوں سے روشناس، مغربی فلسفے کا یہ نوجوان طالب علم جب کائنات پر نظر ڈالتا ہے تو اس کی فلسفیانہ فکر سراپا استفسار و جستجو بن جاتی ہے۔ وہ بہت سنجیدگی سے سوچنے لگتا ہے کہ آیا اس ہنگامۂ بود و نابود کا کوئی مقصد ہے یا یہ جمع و تالیف اور شکست و ریخت محض عناصر کا کھیل ہے؟ کبھی ہمالہ سے پوچھتا ہے:

اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے　　دستِ قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لیے

---

[1] حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے　　انساں میں وہ سخن ہے، غنچے میں وہ چٹک ہے
انداز گفتگو نے دھوکے دیے ہیں ورنہ　　نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی　　جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

پرندے اور جگنو کا مکالمہ ہے۔ جگنو کی زبان میں:

چمک بخشی مجھے آواز تجھ کو　　دیا ہے سوز مجھ کو، ساز تجھ کو
مخالف ساز کا ہوتا نہیں سوز　　جہاں میں ساز کا ہے ہم نشیں سوز

کبھی گل رنگین سے سوال ہوتا ہے کہ "راز وہ کیا ہے ترے سینے میں جو مستور ہے؟" اگر واقعی یہ عالم رنگ و بو کوئی با مقصد اور سوچا سمجھا کارنامہ ہے تو پھر چیزوں میں ہم آہنگی اور توافق کیوں نہیں۔ اس رزمگاہ اضداد کی کیا توجیہہ ہے۔ اگر اس عالم سے ماورا بھی کوئی جہان ہے تو وہ کیا ہے اور کیسا ہے اور کیا وہ بھی ناآہنگی کا شکار اور اضداد کی آماجگاہ ہے؟ "خفتگان خاک سے" استفسار کرتا ہے:

اے مئے غفلت کے سرمستو کہاں رہتے ہو تم　　کچھ کہو اس دیس کی آخر جہاں رہتے ہو تم

وہ بھی حیرت خانۂ امروز و فردا ہے کوئی　　اور پیکار عناصر کا تماشا ہے کوئی

آدمی واں بھی حصار غم میں ہے محصور کیا　　اس ولایت میں ہے انساں کا دل مجبور کیا

واں بھی جل مرتا ہے سوز شمع پر پروانہ کیا　　اس چمن میں بھی گل و بلبل کا ہے افسانہ کیا

رشتہ و پیوندیاں کے جان کا آزار ہیں　　اس گلستاں میں بھی کیا ایسے نکیلے خار ہیں

اس جہاں میں اک معیشت اور سو افتاد ہے　　روح کیا اس دیس میں اس فکر سے آزاد ہے

کیا وہاں بجلی بھی ہے دہقاں بھی ہے خرمن بھی ہے　　قافلے والے بھی ہیں؟ اندیشۂ رہزن بھی ہے

پھر اس تضاد اور ناآہنگی کے دور ہونے کی تمنا کرتا ہے۔ چنانچہ "آفتاب صبح" میں اپنی اس آرزو کو بیان کیا ہے:

دیدۂ باطن پہ راز نظم قدرت ہو عیاں　　ہو شناسائے فلک شمع تخیل کا دھواں

عقدۂ اضداد کی کاوش نہ تڑپائے مجھے　　حسن عشق انگیز ہر شے میں نظر آئے مجھے

پھر کائنات کی سب سے دل چسپ اور دل آویز مخلوق انسان کی کہاں سے ابتدا ہے اور کونسی اس کی منزل ہے:

کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انساں　　کہاں جاتا ہے، آتا ہے کہاں سے

پھر انسان جو اپنی ساخت اور استعداد و صلاحیت کے اعتبار سے قدرت کا شہکار ہے کیا واقعی اس کی قسمت نیستی ہے؟

تم بتا دو راز جو اس گنبد گرداں میں ہے　　موت اک چبھتا ہوا کانٹا دل انساں میں ہے

اگر موت عدم محض نہیں ہے فقط انتقال مکانی ہے تو یہ انتقال تدریج کے بجائے دفعتاً کیوں ہے؟

کیا عوض رفتار کے اس دیس میں پرواز ہے　　موت کہتے ہیں جسے اہل زمیں کیا راز ہے

اس دوسری زندگی کی تشخیص و تعبیر میں جنت و دوزخ کے حوالے کا مفہوم کیا ہے، ان کی کیا حقیقت ہے، کیا توجیہہ ہے؟

باغ ہے فردوس یا اک منزل آرام ہے　　یا رخ بے پردۂ حسن ازل کا نام ہے

کیا جہنم معصیت سوزی کی اک ترکیب ہے　　آگ کے شعلوں میں پنہاں مقصد تادیب ہے

اگر یہاں ہمارا علم حقیقتوں تک پہنچنے کے قابل نہیں تو کیا اس زمان و مکان سے آزاد عالم میں اس کی یہ محدودیت ختم ہو جائیگی اور ہم حقیقتوں کو براہ راست محسوس کر سکیں گے یا یہی جستجو اور استفہام ہماری تقدیر ہے؟

اضطراب دل کا ساماں یاں کی ہست و بود ہے　　علم انساں اس ولایت میں بھی کیا محدود ہے

دید سے تسکین پاتا ہے دل مہجور بھی　　لن ترانی کہہ رہے ہیں یا وہاں کے طور بھی

جستجو میں ہے وہاں بھی روح کو آرام کیا　　واں بھی انساں ہے قتیل ذوق استفہام کیا

اقبال کے سلسلے میں یہ سوالات محض شاعرانہ تخیل آفرینی یا وقتی لطیف احساسات نہیں جن کو نظر انداز کر دیا جائے۔ ان کے پیچھے منطقی فکر ہے مستقل دل کی کرید ہے۔ دماغ کی مسلسل الجھن ہے۔ تصوف اور فلسفے کی آویزش ہے۔ عقیدے اور استدلال کی کشمکش ہے اور مادیت اور روحانیت کا تصادم ہے۔ چنانچہ ان کے پورے کلام پر نظر ڈال جاؤ۔ ان کے عمر بھر کے فلسفے کا جائزہ لے لو وہ ان ہی سوالوں کے گرد گھومتے نظر آئیں گے۔ ان کی پختہ فکر اور فلسفیانہ نظر مذہبی عقائد اور صوفیانہ شعور کے سہارے خالص مادی ماحول میں ان ہی سوالوں کا جواب دیتی

ہوئی نظر آئے گی۔ ایک خاص میلان کے تحت ان کے آئندہ نظام فلسفہ کے لیے منتشر نقطے اور دھندلے خطوط ان سوالوں کی روشنی ہی میں تشکیل ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ وسائل علم اور ذرائع معرفت کی تنقیح اور انتخاب شروع ہو جاتا ہے۔

حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ خود اصل کائنات کا جہاں تک تعلق ہے ان کے شاعرانہ وجدان اور متصوفانہ شعور نے اس کی ہستی کے راز کو اسی زمانے میں ان پر بے نقاب کرنا شروع کر دیا تھا۔ کائنات اپنی آخری حقیقت کے اعتبار سے کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اس کے مسلسل اور متواتر تغیرات کی بنیادی علت کیا ہے؟ طبیعی اسباب و علل زیادہ سے زیادہ اتفاق اور مصاحبت تک پہنچاتے ہیں۔ ان کو دائمی مان لو لیکن یہ کیوں ہیں، کہاں سے آئے ہیں، اس کا جواب عقل کے پاس کہاں تھا۔ عقل مشاہدات و محسوسات سے تجرید و تعمیم کے ذریعہ کلیات کا استخراج کر لے لیکن وہ محسوسات تک ہی تو محدود ہوں گے۔ محسوسات سے ماورا اور ان کی پشت پر اگر کوئی اندرونی واقعیت ہے تو اس کی اصل حقیقت اور پھر اس حقیقت کے ذاتی لوازم اور بلاواسطہ اوصاف اگر کچھ ہوں تو وہ عقل و فکر کی گرفت میں کیسے آتے۔ عقل و فکر کا خام مواد وہ احساسات اور ارتسامات ہیں جنکو حواس معروض کی ظہوری حیثیت سے اخذ کرتے ہیں عقل اپنے اصول و ضوابط کے تحت انھیں مرتب و منظم کرتی ہے۔ لیکن کسی معین معروض کے عقلی تصور کے لیے صرف انھیں احساسات اور ارتسامات کی ترتیب و تنظیم کافی نہیں جو حواس نے کسی خاص وقت میں اس معین معروض کے کسی خاص رخ اور خاص مکانی نسبتوں سے اخذ کیے ہیں بلکہ دوسرے گزشتہ اوقات کے اور دوسرے رخوں اور دوسری مکانی نسبتوں سے اخذ کیے ہوئے احساسات اور ارتسامات سب اس خاص زمانی اور خاص مکانی ارتسام کے ساتھ شامل ہو کر عقل کا خام مواد ہیں جن کو عقل مرتب اور منظم کر کے کسی معین معروض کا تصور مکمل کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہنا چاہیے کہ کسی معروض کے عقلی تصور کے لیے کوئی خاص متعین زمانی اور مکانی ارتسام کافی نہیں بلکہ گزشتہ زمانی اور مکانی تجربات کے تحت معروض کو مجموعی صورت جیسا ہونا چاہیے۔ اس کو ٹھیک لیا ہونا چاہیے

غرض یہ کہ عقل کا عمل ظواہر پر ہوتا ہے، اصل حقیقت جو ظواہر کی تہہ میں ہے، وہ اس کی گرفت سے باہر ہوتی ہے اس لیے عرفان حقیقت اس کے حدود کار سے بہت بلند ہے۔ وہ زمان و مکان کی حدود کے تحت فکر کرتی ہے جن کا اصل حقیقت پر اطلاق نہیں ہوتا محض اس اصول کے پیش نظر کہ ہر اثر کے لیے اثر آفرین اور معلول کے لیے علت درکار ہے، وہ زیادہ سے زیادہ حقیقت کے دروازے تک پہنچ سکتی ہے لیکن خود حقیقت یا حقائق اپنی اندرونی حیثیت میں اس اصول کے تحت ہیں یا اس اصول کا اطلاق ان پر نہیں ہوتا، اس پر عقل کوئی روشنی نہیں ڈالتی۔ وہ تو صرف ظواہر کا یا دوسرے لفظوں میں معروضات کا اپنے طریقوں اور اپنے شروط کے ساتھ جائزہ لے سکتی ہے مگر خود حقیقت کو اس کی واقعی نوعیت کو، اس کے حقیقی لوازم و اوصاف کو، ظواہر کے ساتھ اس کے تعلق کو اگر کچھ ہو تو، پھر اس تعلق کی نوعیت کو کسی طرح نہیں محسوس کر سکتی۔[1]

حقیقت کو دریافت کر لینے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اس کو براہ راست محسوس کیا جائے۔ جب حقیقت خود محسوس ہو جائے گی تو شاید کائنات سے متعلق "کیا ہے"، "کیوں ہے"، اس کے تغیرات کی بنیادی علت کیا ہے، اور کب سے اور کہاں سے، جیسے سوالات کا جواب خود بخود ہی واضح ہو جائے گا۔ لیکن کیا اس کو براہ راست محسوس کرنا ممکن بھی ہے۔ اقبال کا جواب غالباً صوفیانہ مشاہدات کو سامنے رکھتے ہوئے، یہ ہے کہ ممکن ہے بلکہ واقعہ ہے۔ اقبال دل کو براہ راست احساس حقیقت کا منصب دیتے ہیں۔ دل سے اقبال کی مراد غالباً وہ مقدس الٰہی لطیفہ ہے جو انسانی ظواہر میں بحیثیت باطن ذات یا حقیقت انسانیہ کے پوشیدہ ہے اور یہی محل ہے تجلیات الٰہیہ کا دل کے براہ راست محسوس کرنے کی ہی دوسری تعبیر وجدان ہے۔ اقبال عقل کے ادراک اور دل کے مشاہدے کا فرق اور عقل کے حدود اور قیود اور

---

[1] عقل کے دائرہ عمل اور طریق کار کی تشریح میں کانٹ کے زاویۂ نظر کو پس منظر کے طور پر بالقصد سامنے رکھا گیا ہے۔ مجھے برگسانی انداز نظر کی تائید میں اقبال کے اس عہد کے کلام میں کوئی اشارہ نہیں ملا۔

اس کے مقابلے میں دل کی آزادی کو بیان کرتے ہیں:

راز ہستی کو تو سمجھتی ہے — اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے — اور باطن کو دیکھتا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے — تو خدا جو، خدا نما ہوں میں
شمع تو محفل صداقت کی — حسن کی بزم کا دیا ہوں میں
تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا — طائر سدرہ آشنا ہوں میں
کس بلندی پہ ہے مقام مرا — عرش رب جلیل کا ہوں میں

شاید عقل کی اس "مظاہر وابستگی" اور "زمان و مکان سے رشتہ بپائی" کا انکشاف اور دل کی اس باطن بینی اور "سدرہ آشنائی" کا شعور ہی تمہید ہے اقبال کے "شمشیر ذوق جستجو" کے زخموں کے اندمال کی ابتدا کا اور "دیدہ دری" کے رستے میں گرم سیر ہونے کا۔

اقبال اور وحدت وجود

دل یا انسان کی باطنی ذات عقل کے واسطے کے بغیر اصل حقیقت کو خود بخود محسوس کرتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دراصل ایک ہی حقیقت ہے جو انسان بھی ہے اور واقعیت بھی۔ کسی چیز کے براہ راست شعور کے لیے معروض شعور اور شاعر کو ایک ہونا چاہیئے یا ایک دوسرے کا براہ راست وصف ہو یا دونوں کسی تیسری ذات کے براہ راست اوصاف ہوں۔ آخری دونوں صورتوں کا مآل بھی یہی ہے کہ محل اور موصوف یا ذات اور بطن ایک ہی حقیقت ہے جو حامل ہے متعدد اوصاف اور اعتبارات کی۔ غرض یہ کہ دل کی باطن بینی اور انفس و آفاق کی وحدت لازم و ملزوم ہیں۔ چنانچہ اقبال نے اپنے اس ابتدائی دور میں جہاں دل کی باطن بینی اور معرفت پر زور دیا وہاں انفس اور آفاق کی اندرونی وحدت یا دوسرے لفظوں میں نظریۂ وحدت وجود کی بھی حمایت کی جو کسی نہ کسی حیثیت میں آخر تک ان کے فلسفے کا بنیادی عنصر رہا۔

۱۹۰۵ء تک کے کلام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اقبال کے سامنے 'وحدت وجود' کا کوئی متعین اور مستند نظریہ اپنی تفصیلوں اور عقلی توجیہوں کے ساتھ نہ تھا۔ ان کا وحدت وجود کا تصور غالباً ان منتشر معلومات پر مبنی تھا جو مختلف ماخذوں اور متعدد مکاتیب سے ماخوذ تھے۔ اس میں نہ ناقدانہ انتخاب ہے نہ عالمانہ ترتیب و تعمیر۔ یہ بھی بعید نہیں کہ اردو، فارسی اور ہندی شعرا کے متفرق صوفیانہ کلام نے خاص طور سے اس باب میں ان کی رہنمائی کی ہو۔ بہر حال ان کے اس عہد کے تصور میں کسی فلسفیانہ گہرائی یا براہ راست صوفیانہ احساس کو بہت کم دخل ہے تاہم انھوں نے اپنی "امتیاز دیر و حرم میں پھنسی ہوئی" فکر کو اس دلدل سے نکالنے کی کوشش کی ہے اور اپنے 'سیمابی جوش اضطراب' کو ٹھنڈا کرنے کی ایک راہ نکالی ہے، یہ علم کی بے تابی کو تسکین دینے کے لیے ایک شاعرانہ تخیل ہے جس میں متعدد مکاتب خیال کے خاص خاص نقطے، ان کے عقلی نتائج کو سامنے رکھے بغیر شامل ہیں۔[1]

[1] یوں تو کثرت کی وحدت سے توجیہ، مشرقی مفکرین کا ہی امتیاز نہیں فلاسفۂ مغرب بھی۔ قدیم یونانیوں میں بھی وحدت وجود کے حامی رہے ہیں اور یورپ کے جدید حکما میں بھی متعدد اہل فکر کا یہی میلان رہا ہے۔ میں یہاں صرف شنکر اچاریہ اور ابن عربی کے نظریوں کی تلخیص پر اکتفا کر رہا ہوں۔ آیندہ پتہ چلے گا کہ اقبال نے بھی انہیں کی طرف اشارہ کیا۔ اور یہی مشرق کے مشہور نظریے ہیں جو خواص ہی نہیں بلکہ عوام تک پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ اور اقبال کے تصور میں بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ ان ہی دونوں کا اثر ہے۔ شنکر اچاریہ کے نزدیک واقعی حقیقت صرف برہما ہے۔ برہما اپنی ذات کے اعتبار سے ازلاً ابداً یکساں ہے ہر قسم کی دوئی سے منزہ، صور اور اشکال سے ماورا، ہر قسم کے تعلق اور آمیزش سے بری، معرا ذات محض، ہر قسم کی قیود اور ہر طرح کے تعینات سے برتر شعور محض، سکون خالص۔

کائنات اپنی تمام جزئیات اور پوری تفاصیل کے ساتھ برہما کی مظہری صورت ہے۔ اس ظہور کی علت اور اس کا محل اور ہیولیٰ بھی خود برہما ہی ہے۔ اس کے علاوہ کسی کی ہستی نہیں عالم یا یہ مظہری کثرت عملی اور کاروباری واقعیت کے طور پر موجود ہے، ذہنی تخیلات اور خواب کے محسوسات سے بالکل مختلف اور جدا۔

برہما کی اس مظہری ہستی یا کثرت میں اور انسانی "انا" کی مظہری ہستی میں تلازم ہے۔ جب تک مظہری "انا" اپنی مظہری شخصیت کو قائم رکھے ہوئے ہے (باقی)

اس زمانے کی مشہور نظم "شمع" اور بعض دوسرے متفرق اشعار پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے نزدیک حقیقت اور واقعیت صرف ایک ہے جس میں خالق اور مخلوق، علت اور معلول یا کائنات اور مکوّن کا فرق نہیں۔ یہ جیسی تھی ویسی ہے۔ ایک ہی تھی اور ایک ہی ہے یہ ظاہری کثرت

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) وہ اس کثرت کا واقعی فرد ہے اور کثرت اس کے لیے واقعی حقیقت ہے۔ اس کی یہی مظہری واقعیت بنیاد ہے اس کے سماجی تعلقات کی مدار اسی پر مدار ہے اس کے مذہبی فرائض و واجبات کا۔ اعمال اور ان کے اثرات کی واقعیت اسی مظہری ہستی سے مشروط ہے۔

لیکن یہ کثرت واقعۃً حقیقی نہیں۔ اس کی بنیاد محض بے علمی یا جہالت ہے۔ جوں ہی اصل حقیقت کا عرفان ہوا کہ "تو وہی ہے" اور "انا" حقیقتاً خود ہی برہما ہے یہ کثرت غایب ہوئی۔ اب نہ اعمال ہیں نہ ان کے اثرات، نہ تعلقات ہیں نہ متعلقین فقط برہما ہی برہما ہے؛ ایک اور یکساں، جب تک جہالت رہتی ہے اور حقیقت کا عرفان نہیں ہوتا "میں" "میں رہتا ہوں اور" تو "تو۔ جہالت رفع ہوئی تو نہ تو تو ہے نہ میں میں: صرف برہما ہے، ہر قسم کی کثرت اور ہر طرح کے تعلقات سے مقدس، بے صورت، بے قید، حقیقت خالص اور شعور محض۔

یہ عدم عرفان یا جہالت شخصی تو ہے ہی لیکن چوں کہ پوری مظہری کائنات کی بنیاد ہے اس لیے عالمی یا کائناتی بھی ہے اور چونکہ پوری مظہری کائنات اصل حقیقت کے اعتبار سے برہما ہی برہما ہے اس لیے یہ جہالت یا عدم عرفان بھی برہما ہی ہے اور مظہری کائنات کی طرح خود بھی عملی اور کاروباری واقعیت ہے لیکن چوں کہ اصل عرفان کے ساتھ یہ فنا ہو جاتی ہے اس لیے بے حقیقت اور لاشئ محض ہے۔ حقیقت تو وہی ہے جو لازوال ہے۔ گویا کائنات یا کثرت نتیجہ ہے جہالت کا جو بے حقیقت اور بے بود ہے اور برہما کا جو حقیقت ہے اور ہست۔

ابن عربی کے نزدیک ذات یا حقیقت صرف ایک ہے۔ اس کے علاوہ نہ کوئی حقیقت نہ کوئی وجود۔ ذاتی حیثیت میں یہ حقیقت مجہول الکنہ اور مبہم ہے، ہر قسم کی قیود اور ہر طرح کے تعینات سے ماوراء، خود ابہام اور اطلاق بھی اس کے لیے قید نہیں۔ تمام افعال اور اسماء و صفات سے بالاتر، ازلیت اور ابدیت سے بھی برتر۔ ہستی یا مصدری وجود بھی ایک تعین ہے اور اپنی اس حیثیت میں ذات تعینات سے بلند ہے۔ ناقابل تعبیر ہے، بے عنوان اور بے اسم، غیب محض بغیر تعلیت و ظہور۔

یہ حقیقت متعدد تنزلات یا درجات کے لحاظ کے بعد سبب ہے ظہور کائنات کا۔ یہ تنزل ایک طرح کے تعین ہیں چنانچہ سب سے پہلا تعین وجود ہے دوسرے تمام اوصاف اور تعینات سے معرّا۔ یہ ذات کا وجود ہے اور صرف ذات کے لیے۔ ہر قسم کے علم و ادراک سے ماوراء۔ حقیقت کا یہ وجودی تعین منشا ہے اس کے علمی تنزل کا۔ موجودہ حقیقت جو اپنی تمام صلاحیتوں، قوتوں اور امکانات پر مشتمل ہے، علم ذات کا موضوع ہے۔ ذات کا یہ عرفان خود اپنے آپ کا عرفان ہے جو شامل ہے ذات کی متمیز اور متعین حیثیت کے علم کو اور اپنے تمام متمیز متعین امکانات اور صلاحیتوں اور قوتوں کے علم کو۔ ذات کا یہی علمی تعین مبدأ ہے اس کی علیت کا۔ بہرحال ذات کی یہ اندرونی صلاحیتیں ایک دوسرے لحاظ سے ظواہر عالم کی حقیقتیں ہیں جن میں ظواہر کے تمام امکانات شامل ہیں۔ یہ صلاحیتیں جو علم الٰہی میں اپنے کیفی امتیاز کے ساتھ ازلاً ابداً ثابت ہیں "اعیان ثابتہ" کہلاتی ہیں۔ ذات حقہ اپنے امکانات کے علم کے ساتھ مبدأ ہے ان امکانات کے ظہور کا۔ ان امکانات کا ظہور جو ظہور ہے کائنات کا، ذات حقہ کا ظہوری تنزل ہے۔ یہ ظہور جس طرح تقاضا ہے ذات کا اسی طرح خود یہ امکانات یا اعیان ثابتہ بھی اپنے ظہور کے متقاضی ہیں۔ ذات کے تقاضائے ظہور کی منشا محبت یا عشق ہے اس حب ظہور کا پہلا مطلوب ظرف ظہور کا حصول ہے۔ یہ ظرف ظہور جس میں اشیاء اپنی مکانی یا درجاتی ترتیب سے ظاہر ہوتی رہتی ہیں ظہور اشیاء سے پہلے محض ایک وہمی اور خیالی خلاء ہے۔ عماء کہلاتا ہے۔ ذات کے ظہوری تنزل کے معنی ہیں اس کے امکانات کا جو دوسری حیثیت میں ظواہر عالم کے امکانات یا اعیان ثابتہ ہیں، ظاہر اور مشہود ہو جانا۔ یہ امکانات علم حق سے قطع نظر غیر متمیز استعداد ہے جو مادہ ہے عالمی کثرت کا، چنانچہ شیخ اس کو "ہباء" کا نام دیتے ہیں۔

ہباء استعداد و امکان ہے ذات حقہ کا۔ اس کی حقیقت ذات حقہ کے علاوہ کچھ نہیں، اس کی ہستی کے معنی ہیں ذات کا ہستی، اس کے ظہور کا مفہوم ہے صرف ذات کا ظہور ہے۔ ذات کے ظاہر ہونے کا مطلب اتنا ہی ہے کہ قوتیں فعلیتیں ہو جاتیں۔ ذات کی کسی فعلیت کا نمودار ہونا ذات کا اس طرح موجود ہونا کہ اس سے ایک خاص انداز نمودار ہو۔ مثلاً زید کی کسی استعداد جیسے قیام کی سکت، قعود کی سکت یا لکھنے پڑھنے کی سکت کے عملی حقیقت بن جانے کے

(باقی اگلے صفحہ پر)

جس کو کائنات یا عالم کہا جاتا ہے ہمارے اپنے شعور اور آگہی کا ساختہ ہے، حقیقت میں نہ "من" ہے نہ "تو" ہے نہ کوئی بلند ہے نہ پست، نہ کہیں مہک ہے نہ کہیں مستی ہے:

یہ آگہی مری مجھے رکھتی ہے بیقرار　　خوابیدہ اس شرر میں ہیں آتشکدے ہزار
یہ امتیاز رفعت و پستی اسی سے ہے　　گل میں مہک شراب میں مستی اسی سے ہے
بستان و بلبل و گل و بو ہے یہ آگہی　　اصل کشاکش من و تو ہے یہ آگہی

اگر یہ شعور و آگہی فنا ہو جائے تو یہ تمام تعینات ختم ہو جائیں اور وہی ازلی اور ابدی حقیقت رہ جائے جس میں من و تو کا کوئی فرق نہیں:

آزاد دست برد بقا و فنا ہوں میں　　کشتہ ہو یہ شرار تو کیا جانے کیا ہوں میں

یہ مجہول الکنہ حقیقت جو وحدت صرف ہے بے چندگی اور اطلاق محض ہے، بے تعین، عرفان ذات کی خواہاں اور نمود کی متقاضی ہے۔ ذات کا یہ تقاضائے نمود، حقیقت کی یہ خواہش عرفان علت ہے کثرت کی اور سبب ہے ظہور کائنات کا۔ یہ تقاضائے نمود یا عشق نظارگی دعوت بے حجابی ہوتی ہے۔ اور تعینات اور امتیازات نمایاں ہو جاتے ہیں، وحدت کثرت نظر آنے لگتی ہے اور دعوت بے حجابی کو مہمیز کرتی ہے:

صبح ازل جو حسن ہوا دلستان عشق　　آواز کن ہوئی تپش آموز جان عشق

اب خواہش دید پیدا ہو گئی، چشم شعور وا ہونے لگی:

یہ حکم تھا کہ گلشن کن کی بہار دیکھ　　ایک آنکھ لے کے خواب پریشاں ہزار دیکھ

ذات کا مرتبۂ اطلاق و ابہام وجود سے برتر اور شعور و آگہی سے ماورا ہے۔ ہستی ہی عین شعور و آگہی ہے۔ ہستی وہ کائنات کی ہو یا حقیقت مطلقہ کی بنیاد ہے تعین و امتیاز کی، اساس ہے تعلق اور وابستگی کی۔ ہستی سے یہاں ذات متعین اور متمیز ہوتی ہے۔ وہیں اشیاء یا کثرت اور کائنات باہم دگر بھی اور خود اصل حقیقت سے بھی متمیز ہو جاتی ہے اور متعین و حدتیں ظہور پذیر ہو جاتی ہیں؛ من و تو میں فرق ہو جاتا ہے بلندی اور پستی ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ گل میں مہک اور شراب میں مستی صاف محسوس ہونے لگتی ہے۔ گل و بلبل اور شمع و پروانہ حسن و عشق کے الگ الگ موضوع دکھنے لگتے ہیں؛ ہستی کا یہ پردہ سب کو جدا جدا کر دیتا ہے۔ الگ الگ قیدی اور الگ الگ قفس۔ حقیقت سے دور ہر ایک اپنے اپنے غمکدے میں غربت کے دن گزارتا رہتا ہے:

مجھ سے خبر نہ پوچھ حجاب وجود کی　　شام فراق، صبح تھی میری نمود کی
وہ دن گئے کہ قید سے میں آشنا نہ تھا　　زیب درخت طور مرا آشیانہ تھا
قیدی ہوں اور قفس کو چمن جانتا ہوں میں　　غربت کے غمکدے کو وطن جانتا ہوں میں

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) معنی یہی ہیں کہ زید ایک ایسے انداز اور ایسی وضع میں موجود ہے کہ دیکھنے والا اس کو کھڑا، بیٹھا یا لکھتا ہوا، پڑھتا ہوا محسوس کرے۔ کھڑے ہوئے بیٹھے ہوئے، یا لکھنے پڑھنے کی نہ تو کوئی الگ ہستی ہے اور نہ ان کی کوئی الگ حقیقت ہے۔ چنانچہ یہ ہبا، یا استعداد محض فعلاً اختیار کرتی ہے اور ذات حق کی شہودی تجلی کا محل بن جاتی ہے تو کائنات یا کثرت نمایاں ہو جاتی ہے۔ گویا کائنات ذات باری کا اپنا ایک خاص انداز وجود ہے اور بس۔ شیخ کے نزدیک کائنات اپنی نوعی حیثیت میں، قدیم ہے۔ ذات حق ازلاً اور ابداً موجود ہے اور اس کی موجودگی کے لیے کوئی نہ کوئی انداز وجود ضروری ہے۔ اس کا یہ انداز وجود اس کے کسی نہ کسی امکان کا ظہور ہے اور ہر امکان کا ظہور کسی نہ کسی فعلیت کی نمود ہے۔ یہی فعلیت کوئی نہ کوئی شے ہے۔ اور یہ سلسلہ ازل سے ابد تک برابر جاری ہے۔

ابن عربی کے نزدیک اگرچہ کائنات کی اپنی الگ کوئی حقیقت نہیں اور نہ اس کا کوئی اپنا الگ وجود ہے تاہم وہ حقیقی اور واقعی ہے نہ کوئی دھوکہ ہے نہ کوئی التباس اور فریب۔ ذات باری سے بھی ممتاز اور اس کی کثرت باہم بھی ممتاز، ایک دوسرے سے الگ۔ ہر شے خود ہی شے ہے نہ کہ دوسری۔

ہستی کا سراپا جستجو ہونا، رازِ حقیقت کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرنا حقیقت ہے اسی غیر شعوری تعلق کے غماز ہیں:

یادِ وطن فسردگیِ بے سبب بنی　　　شوقِ نظر کبھی کبھی ذوقِ طلب بنی

من و تو کا یہ فرق، گل و بلبل کا یہ امتیاز، شمع و پروانہ کی یہ تشخیص، گلشن کن کی یہ بہار کیا سچ مچ واقعی ہے؟ کیا حسن و عشق حقیقتاً الگ الگ ہیں؟ عالم کی یہ کثرت کیا حقیقی کثرت ہے؟ اقبال کہتے ہیں کہ یہ سب فریب نظر ہے جس کو شعور و آگہی کی غفلت آفرینی نے اپنے اظہار کے لیے گھڑ لیا ہے:

چشمِ غلط نگر کا یہ سارا قصور ہے　　　عالم ظہورِ جلوۂ ذوقِ شعور ہے

ورنہ صرف ایک ہی مقدس اور متعالی حقیقت ہے، ان سب فریبوں سے ماوراء، یہاں تو "محمود" ہے اور بس "ایاز" ہی "جہالت کا اختراع ہے:

محمود، اپنے آپ کو سمجھا ایاز ہے　　　کیا غفلت آفریں یہ مئے خانہ ساز ہے

شعورِ غفلت آفریں اور آگہی غلط نگر کا یہ کائناتی سلسلہ، زمان بردوش اور امکان در آغوش حقیقت کے گلے کا طوق بن گیا اور حقیقت مطلقہ صید و صیاد میں اور حلقۂ دام و بام حرم میں جدا جدا محصور ہو گئی ورنہ واقع میں نہ کوئی پہلے ہے نہ بعد، نہ یہاں ہے نہ وہاں، تنہا ایک حقیقت ہے جس کو چاہو ناز کہہ دو چاہو نیاز نام رکھ دو؛ ناز نیاز ہے اور نیاز ناز، ظاہر باطن ہے اور باطن ظاہر:

یہ سلسلہ زمان و مکاں کا کمند ہے　　　طوقِ گلوئے حسنِ تماشا پسند ہے
منزل کا اشتیاق ہے، گم کردہ راہ ہوں　　　اے شمع! میں اسیرِ فریبِ نگاہ ہوں
صیاد آپ حلقۂ دامِ ستم بھی آپ　　　بامِ حرم بھی، طائرِ بامِ حرم بھی آپ
میں حسن ہوں کہ عشق سراپا گداز ہوں　　　کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں
ہاں! آشنائے لب ہو نہ رازِ کہن کہیں　　　پھر چھڑ نہ جائے قصۂ دار و رسن کہیں

اس شعور و آگہی کا سبب، جس کی غلط نگاہی سے حقیقت جدا جدا تعینوں اور امتیازوں میں مقید ہو جاتی ہے خود ہستی ہے اس لیے حقیقت کے بے قید وحدت اور بے تعین اطلاق کے لیے اس ہستی کا فنا ہونا ضروری ہے:

میری ہستی نے رکھا مجھ سے تجھے پوشیدہ　　　پھر تری راہ میں اس کو نہ مٹاؤں کیوں کر

گویا شخصیت کا نصب العین اور "انا" کا مطمحِ نظر خودی کو فنا کرنا ہے نہ کہ اس کو باقی رکھنا:

میری ہستی ہی جو تھی میری نظر کا پردہ　　　اٹھ گیا بزم سے میں پردۂ محفل ہو کر
عین ہستی ہوا ہستی کا فنا ہو جانا　　　حق دکھایا مجھے اس نقطے نے باطل ہو کر

اقبال کے اس شاعرانہ "وحدت وجود" کا غالباً حاصل یہ ہے کہ صرف ایک ہی حقیقت ہے بے قید، بے امتیاز؛ اس کی لامتناہی ذات اپنی خواہش عرفان کے تحت ظہور کی متقاضی ہے۔ یہ مظہری وجود یا کثرت اسی تقاضے کا جواب ہے۔ وہ شعور خالص جو خود ذات ہے اور ذات کا ہے اور صرف ذات کے لیے ہے۔ مظہری صورت میں وحدت کو جدا جدا اور زمانی مکانی تعینوں میں دیکھنے لگتا ہے لیکن جس طرح حقیقت کا یہ رخ محض مظہری ہے اندرونی اور باطنی ذاتیت نہیں، اسی طرح شعور کی یہ گرفت بھی اندرونی اور باطنی حقیقت کی گرفت نہیں۔ یہ مظہری ہستی باطل یا نظر انداز ہوئی اور اصل حقیقت سامنے آئی تو پھر وحدت ہی وحدت رہ جاتی ہے؛ بے امتیاز اور بے تعین۔ خود شعور کا بھی یہ غیر ذاتی انداز ختم ہو جاتا ہے۔ اب حقیقت ہی حقیقت محسوس ہوتی ہے، "تو" فنا ہو جاتا ہے اور "میں" ہی "میں" رہ جاتا ہے۔

نہ صہبا ہوں نہ ساقی ہوں نہ مستی ہوں نہ پیمانہ　　　میں اس میخانۂ ہستی میں ہر شے کی حقیقت ہوں

زندگی سے فرار کی خواہش اور وحدت وجود

اس زمانے کے کلام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شاعرانہ وحدت وجود کا اقبال کی فکر پر خاص اثر نہ تھا: نہ وہ زندگی کی کشمکش سے بھاگنا چاہتے تھے نہ ان کے

یہاں معاشرتی تعلقات سے گریز کی تلقین ہے نہ وہ ظواہر سے بچ کر گزرنا چاہتے ہیں نہ باطن ہی باطن کی تلقین کرتے ہیں نہ ان کے کلام سے کسی ہمہ گیر انفعالی دلچسپی کا احساس ہوتا ہے۔" ایک آرزو" میں کوئی شبہ نہیں کہ زندگی سے فرار، عزلت گزینی کی غیر معمولی خواہش، مظاہر قدرت سے انفعالی دلچسپی نمایاں ہے؛

شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا — ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو
مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری — دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
آزاد فکر سے ہوں عزلت میں دن گزاروں — دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو
لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں — چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا — ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو

لیکن اس کے لہجے میں سنجیدگی اور طمانیت نہیں، آرزو میں خلوص اور طلب میں سچی تڑپ نہیں ہے بلکہ جھنجلاہٹ ہے مایوسی کا وقتی ردعمل ہے، ناکامی کا غصہ ہے۔ اہل وطن کی بے حسی کا ماتم ہے۔ چنانچہ اسی نظم کے دوسرے بند کے اشعار ہیں:

شمشاد گل کا بیری، گل یاسمن کا دشمن — ہو آشیاں کے قابل یہ وہ چمن نہیں ہے
اپنوں کو غیر سمجھوں اس سرزمیں میں رہ کر — میں بے وطن ہوں میرا کوئی وطن نہیں ہے
وہ مے نہیں کہ جس کی تاثیر تھی محبت — ساقی نہیں وہ باقی وہ انجمن نہیں ہے

اہل وطن کا یہی اختلاف اور افتراق تھا جس سے فلسفی اقبال کا نہیں بلکہ شاعر اقبال کا دل بجھ گیا اور وہ نت نئے ہنگاموں سے اکتا اٹھا:

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب — کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

اور اس کو مذہب سے تعلق کے باوجود ملا اور پنڈت دونوں سے دلچسپی نہیں رہی:

پچھلے پہر کی کوئل وہ صبح کی موذن — میں اس کا ہمنوا ہوں وہ میری ہمنوا ہو
کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں — روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو

لیکن اس پر بھی ان کے دل کی تمنا یہی ہے کہ:

ہر دردمند دل کو رونا مرا رلا دے — بیہوش جو پڑے ہیں شاید انھیں جگا دے

اقبال کا میلان طبع اس ابتدائی دور میں اقبال کے مخصوص فلسفے کی تلاش تو عبث ہے لیکن بلند نظری، عالی حوصلگی اور احساس ذات کی مثالیں ان کے کلام سے انتخاب کر لینی مشکل نہیں۔ ان کی طبیعت کی یہی افتاد تھی جس سے ان کے آئندہ فلسفے نے ایک خاص میلان حاصل کیا:

ہم صفیر و تم مری عالی نگاہی دیکھنا — شاخ نخل طور تاڑی آشیانے کے لیے

ایک دانے پہ ہے نظر تیری — اور خرمن کو دیکھتا ہوں میں

میں انتہائے عشق ہوں تو انتہائے حسن — دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

ساتھ ساتھ شاعرانہ واردات کی ہی صورت میں سہی لیکن اس زمانے میں بھی ان کے یہاں ایسے خیالات ملتے ہیں جو آگے چل کر فکری شکل میں ان کے مابعد الطبیعیاتی اور اخلاقی نظام کے عناصر بنے۔

انسان کی اہمیت اقبال نے گوناگوں طریقوں اور مختلف اسلوبوں سے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ انسان قدرت کا شہکار

اور کائنات کی تخلیق کا مقصد ہے:

پریشاں ہوں میں مشتِ خاک لیکن کچھ نہیں کھلتا سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گردِ کدورت ہوں
یہ سب کچھ ہے مگر ہستی مری مقصد ہے قدرت کا سراپا نور ہو جس کی حقیقت میں وہ ظلمت ہوں

کائنات کی آرائش و پیرایش اسی کے دم سے ہے۔ کائنات کی تعمیر میں جو خرابیاں مضمر ہیں، جو ناہم آہنگیاں اور فساد و فتنہ اس میں چھپے ہوئے ہیں ان کو دور کرنا اور ان کی اصلاح کرنا اسی کا منصب ہے۔ "انسان اور بزمِ قدرت" میں قدرت کی زبان سے اس کے منصب اور ذمہ داریوں کا دوسرے مظاہر سے مقابلہ کیا گیا ہے:

ہے ترے نور سے وابستہ مری بود و نبود باغباں! ہے تری ہستی پئے گلزارِ وجود
انجمن حسن کی ہے تو، تری تصویر ہوں میں عشق کا تو ہے صحیفہ، تری تفسیر ہوں میں
میرے بگڑے ہوئے کاموں کو بنایا تو نے بار جو مجھ سے نہ اٹھا وہ اٹھایا تو نے

انسان کی اس عظمت کا اصل راز اس کا شعور اور آگہی ہے۔ "چاند" سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں، سراپا نور تو سینکڑوں منزل ہے ذوقِ آگہی سے دور تو
جو مری ہستی کا مقصد ہے، مجھے معلوم ہے یہ چمک وہ ہے، جبیں جس سے تری محروم ہے

محض شعور ہی نہیں بلکہ شعورِ ذات اور احساسِ نفس اپنی اہمیت کا پورا پورا تصور، خاص عنصر ہے انسانی فضیلت کا۔ "آفتابِ صبح" سے خطاب ہے:

اپنے حسنِ عالم آرا سے جو تو محرم نہیں ہمسرِ یک ذرۂ خاکِ درِ آدم نہیں

آرزو حیاتِ انسانی کی کائناتی اہمیت اس کی آرزوؤں اور تمناؤں میں پوشیدہ ہے۔ آرزو ہی ہے جو اس کو خوب سے خوب تر تک لے جاتی ہے اور فساد میں صلاح کا خواب دکھاتی ہے، ناہم آہنگیوں میں ہم آہنگی کا خیال آتا ہے۔ مظاہر سے اسباب و علل کی طرف نظریں اٹھتی ہیں:

دوا ہر دکھ کی ہے مجروحِ تیغِ آرزو رہنا علاجِ زخم ہے آزادِ احسانِ رفو رہنا

"گلِ رنگین" سے مخاطب ہیں:

اس چمن میں میں سراپا سوز و سازِ آرزو اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو

عمل اقبال محض آرزوؤں اور تمناؤں میں کھیلتے رہنے کو انسانیت کا جوہر نہیں سمجھتے۔ اصل مقصد ان آرزوؤں اور تمناؤں کو عملی حقیقت بنانا ہے۔ فرزندِ آدم کا حقیقی امتیاز یہ ہے کہ وہ اسباب و علل کو سمجھے اور خوب سے خوب تر کو پیدا کرے، فساد کی بنیادوں کا پتہ چلائے، اصلاح کے میدان ہموار کرے، اس کے لیے "زیبِ محفل ہونا" کافی نہیں، "شریکِ شورشِ محفل ہونا" ضروری ہے۔ ہنگامۂ عالم کا دور سے تماشا کرنا فضول ہے۔ بلکہ اس کے صدموں کو برداشت کرنا ناگزیر ہے:

تو اگر زحمت کشِ ہنگامۂ عالم نہیں یہ فضیلت کا نشاں اے نیرِ اعظم نہیں

"سید کی لوحِ تربت" پر وہ یہ وصیت پڑھتے ہیں کہ "ترک دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں"۔ "تصویرِ درد" میں اہلِ وطن کو سبق دیتے ہیں:

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
یہی آئینِ قدرت ہے، یہی اسلوبِ فطرت ہے جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے

عمل کے لیے بے خوفی دلیری اور خلوص ضروری ہے، اس کو وہ مومن کی خصوصیت سمجھتے ہیں:

بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے قوتِ فرماں روا کے سامنے بیباک ہے

شخصی ارتقاء سلسلۂ ارتقاء کا یہ آخری حلقہ ہے۔ انسان جس کی حیاتیاتی قدر و قیمت اسی کی حد تک محدود نہیں بلکہ خود کائنات کی اصلاح و ارتقاء کے لیے بھی اس کے وجود کی اہمیت ہے، اقبال کے لیے اسی وقت سے دلچسپی کا موضوع رہا ہے۔ اس کی شخصی

حیات کا اتنا مختصر وقفہ اور پھر ہمیشہ کے لیے فنا کے بے پایاں اور گہرے سمندر میں ڈوب جانا ان کی فلسفیانہ طبیعت کے لیے کبھی طمانیت بخش نہیں ہوا۔ ان کا تخیل فنا کو زندگی کا منتہا اور غایت تسلیم کرنے کو کبھی آمادہ نہ ہوا۔ وہ زندگی کہتے ہی اس کو ہیں جو فنا سے دو چار نہیں ہوتی "صبح کے ستارے" کی زبانی کہتے ہیں:

زندگی وہ ہے کہ جو ہو نہ شناسائے اجل کیا وہ جینا ہے کہ ہو جس میں تقاضائے اجل

لیکن حیات کا ایک نہایت مختصر مدت کے بعد زوال روزمرہ کا مشاہدہ ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ "کنار راوی" پر کشتی کو دور افق میں غائب ہوتے ہوئے دیکھ کر اقبال کا شاعرانہ تخیل انسانی حیات کی نظروں سے اوجھل ہو جانے کی توجیہہ پیدا کر لیتا ہے:

جہاز زندگی آدمی رواں ہے یونہی ابد کے بحر میں پیدا یونہی نہاں ہے یونہی
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

چنانچہ ان کے نزدیک موت زندگی کی فنا نہیں بلکہ وہ خود ایک خاص طرح کی زندگی ہے جس کو عام نظریں محسوس نہیں کر پاتیں:

موت کی ظلمت میں ہے پنہاں شراب زندگی مر گیا ہوں یوں تو میں لیکن فنا کیوں کر ہوا

۱۹۰۵ء تک کا فکری تجزیہ

یورپ روانہ ہونے سے پہلے تک کی اس مختصر مدت کے کلام کے اس تجزیے سے یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اقبال کی نظر کے سامنے اکثر وہ بنیادی سوال آ چکے تھے جو آخر تک ان کی فکر کا محور رہے۔ ان سوالوں کو جہاں تک حل کرنے کا تعلق ہے اس زمانے کے کلام میں اس کی کوششیں صاف نمایاں ہیں لیکن ان میں فکر کی پختگی سے کہیں زیادہ شاعرانہ تخیل ہے تاہم یہ ضرور ہے کہ ان کی فکر کا رخ گو پوری پوری طرح نہ سہی مگر ایک بڑی حد تک متعین ہو چکا تھا۔

اقبال یورپ کے تعلیمی اور معاشرتی ماحول میں

۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے اقبال یورپ روانہ ہو گئے اور ٹرینٹی کالج کیمبرج میں داخلہ لیا اور از سر نو کیمبرج یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ پروفیسر آرنلڈ کے علاوہ یہاں انھیں مشہور استاد فلسفہ ڈاکٹر میکٹیگرٹ اور جان سورلے وغیرہ سے بھی فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ مشہور مستشرق ڈاکٹر براؤن اور ان کے شاگرد ڈاکٹر نکلسن سے تعلقات نے مشرقیات کے ذوق کو پھر تازہ کر دیا چنانچہ ڈاکٹریٹ کے لیے اقبال نے 'ایرانی مابعد الطبیعیات' کا موضوع منتخب کیا اور جرمنی کی میونک یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی، اس تقریب سے برلن، میونک اور ہائیڈل برگ کے اساتذۂ فلسفہ سے بھی استفادہ کیا۔ ساتھ ساتھ اپنے موضوع کی مناسبت سے اسلام کے بنیادی عقائد اور ان کے اثرات، مسلم خصوصاً ایرانی اثرات سے متاثر تصوف اور اس کے اثرات کی تحقیق کا بھی ان کو موقع ملا اور اس موضوع کے خصوصی ماہرین کے مشورے اور رائیں بھی انھیں ملتی رہیں، اور بحث و تنقید کی سہولتیں بھی میسر آئیں۔ مغربی فلسفہ تو ان کا ہندوستان سے ہی نصابی مضمون تھا، کیمبرج میں اس پر زیادہ وسیع اور زیادہ عمیق نظر ڈالنے کے مواقع نصیب ہوئے۔

یورپ میں قیام کے دوران حمایت اسلام کا فریضہ انجام دینے والے مشہور اسلامی مصنف جسٹس امیر علی اور بہت سے دوسرے اکابر علم سے روابط پیدا ہوئے۔ مختلف ممالک کی اہم اور نمایاں شخصیتوں سے ملاقات اور گفتگوؤں کے وقتاً فوقتاً اتفاقات رہے۔ متعدد بار اسلامی ممالک کے اکابر اور طلبہ سے بھی بات چیت رہی ہوگی۔ ان روابط اور گفتگوؤں سے انھوں نے بین الاسلامی رشتے اور وطنی تعلق، دونوں کے فرقوں کو محسوس کیا ہوگا۔

ہندوستان کی جامد اور تھکی تھکی سی زندگی کے مقابلے میں انھیں یورپ کی فعالی اور متحرک زندگی کو اندر اور باہر سے دیکھنے کے، سمجھنے کے، اس کے عوامل اور محرکات کو جاننے اور مختلف پہلوؤں سے اس کو جانچنے کے اور اس کے اثرات کی ناپ تول کے پورے مواقع حاصل ہوئے، جن سے ان کی فلسفیانہ طبیعت نے فائدہ اٹھایا۔ مغربی ممالک کے قومی شعور اور بین الاقوامی احساس اور ان کے مظاہر کا اور ان کے بنیادی اسباب و محرکات کا مطالعہ کیا، ان کے تہذیبی اور معاشرتی نتائج اور امکانات پر نظر ڈالی اور مختلف نظری اور عملی فلسفوں سے روشناس ہوئے۔ غرض یہ کہ اقبال نے یورپ میں دیکھا بھی اور سیکھا بھی، سراہا اور اثر لیا۔ ناپسند کیا اور بغاوت کی۔

یورپ کی فعالی کا اقبال پر اثر

یورپ کی قوت عمل اور فعالی کا جہاں تک تعلق ہے اقبال اس سے خاص طور سے متاثر ہوئے

حتیٰ کہ ایک زمانے میں اسی تاثر کے پیش نظر انھوں نے شعر و سخن کو بھی ترک کرنے کا ارادہ کر لیا:

مدیر مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہہ دے — جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انھیں مذاق سخن نہیں ہے

لیکن بعض احباب کی فہمایش اور اپنے استاد مسٹر آرنلڈ کے فیصلے کے سامنے انھیں اپنے ارادے سے باز رہنا پڑا۔

اقبال ہندوستان میں بھی مادیت پسند اور مظاہر پرست نہ تھے لیکن یورپ کی فعالی میں اس کے مادی زاویہ نظر اور خالص کاروباری نقطۂ نظر کو بڑا دخل رہا ہے۔ یہ اقبال کی فلسفیانہ، فنا دطبع تھی کہ انھوں نے یورپ کی فعالی کو تو گرہ میں باندھا لیکن اس کی مادیت اور مظاہر پسندی سے انھوں نے کوئی رشتہ نہیں جوڑا بلکہ اس کی ہلاکت باری کی پیشنگوئی کی:

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے — کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی — جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

چنانچہ اس زمانے میں اقبال نے مختلف اسلوبوں اور گوناگوں پہلوؤں سے حرکت، عمل، جدوجہد اور زندگی کے لیے تقاضم اور پیکار کی ضرورت کی خاص طور سے دعوت دی ہے۔ پہلے عمل کی حیثیت ان کے یہاں خیال و ارادہ سے زیادہ نہ تھی لیکن اب وہ مستقل پیام بن گیا ہے:

بیتاب ہے اس جہاں کی ہر شے — کہتے ہیں جسے سکوں نہیں ہے

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی — یہ رسم قدیم ہے یہاں کی

اس رہ میں مقام بے محل ہے — پوشیدہ قرار میں اجل ہے

حرکت اور عمل کے مقابلے میں کوئی عظمت نہیں، گویا یہ وسیلہ نہیں مقصد ہے، محرک نہیں خود زندگی ہے:

آتی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکوں — کہتا تھا مور ناتواں لطف خرام اور ہے

حرکت اور عمل کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ شاید کسی وقتی جذبے کے تحت یہ بھی کہنے لگتے ہیں:

جو موج دریا لگی یہ کہنے سفر سے قائم ہے شان میری — گہر یہ بولا صدف نشینی ہے مجھ کو سامان آبرو کا

مگر یہ غالباً شاعرانہ واردات ہے۔

آرزوئے نو اور طلب

ہندوستان میں جو مبہم آرزو تھی اب وہ مستقل طلب کی صورت میں نمایاں ہو گئی ہے گویا آرزو اور طلب لازم اور ملزوم بن گئے ہیں۔ آرزو محض خلش نہیں "آرزوئے نو" ہے "تخلیق مقاصد" کا مقدمہ ہے:

دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بیکار — قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں

بھاگ دوڑ کے لیے مقصد ہے، جدوجہد کا مطلوب ہے، تڑپ کا مدعا ہے:

غرض ہے پیکار زندگی سے، کمال پائے ہلال تیرا — جہاں کا فرض قدیم ہے تو، ادا مثال نماز ہو جا

کوئی شے کسی کی قسمت نہیں۔ مال مسالہ بکھرا پڑا ہے، فراہمی اجارہ داری نہیں، نہ آئینہ سازی سکندر پر موقوف ہے:

نہیں ہے وابستہ زیر گردوں کمال شان سکندری سے — تمام ساماں ہے تیرے سینے میں تو بھی آئینہ ساز ہو جا

طلب کو کسی مرحلے پر ختم نہ ہونا چاہیے۔ مطلوب کو ہمیشہ حاصل سے آگے رہنا چاہیے اور کسی بھی حاصل پر اکتفا نہ ہونا چاہیے:

نہ ہو قناعت شعار گلچیں اسی سے قائم ہے شان تیری — وفور گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا

اس لیے کہ زندگی ہی کا دوسرا نام طلب ہے، طلب نہ ہو تو پھر زندگی زندگی نہیں موت ہے۔

موت ہے عیش جاوداں ذوق طلب اگر نہ ہو — گردش آدمی ہے اور گردش جام اور ہے

لاموجود الا اللہ

عمل اور جدوجہد کی اہمیت کو فکری طور پر محسوس کر لینے اور اس کو اپنا مستقل پیغام بنا لینے کے ساتھ ساتھ اقبال وحدت وجود کے حامی نظر آتے ہیں اور کثرت کو اصل حقیقت کی ہی جلوہ گری اور اس کا تنزل سمجھتے ہیں۔ سب ایک ہی سرمدی

حقیقت کے تعینات ہیں۔ اگر ان تعینات کے بطن کو محسوس کر لیا جائے تو صرف ایک ہی حقیقت ہے جو موجود ہے باقی سب معدوم۔

راز ہستی راز ہے جب تک کوئی محرم نہ ہو　　کھل گیا جس دم تو محرم کے سوا کچھ بھی نہیں

لیکن اب وہ اس کثرت کو غالباً محض آگہی کا زائیدہ نہیں خیال کرتے اور نہ اصل ہستی کو پردہ مان کر اس کو اٹھا دینے کی فکر میں رہتے ہیں وہ صرف اتنا چاہتے ہیں کہ اس کثرت کے بطن میں جو وحدت پنہاں ہے اس کو نظر انداز نہ کیا جائے اور حسن ازلی کا سب کو مظہر جان کر سب سے عملی دلچسپی لی جائے اور چیزوں میں امتیاز و غیریت کی ناقابل شکست دیواریں نہ حائل کر لی جائیں، زاویۂ نظر کو بدلا ہوا نہ ہونا چاہیے۔ ایک ہی حقیقت کے یہ سب مختلف مظاہر ہیں اور ہر مظہر اپنا ایک مقام رکھتا ہے:

تارے میں وہ قمر میں وہ جلوہ گہ سحر میں وہ　　چشم نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے

ان مظاہر کے عقب میں صرف ایک ہی وجود ہے جو قائم و دائم ہے اور وہی ان مظاہر کا وجود ہے، اس وجود کے علاوہ مظاہر کا کوئی الگ وجود نہیں:

نفیِ ہستی ایک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا　　لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

مظاہر تو اس وجود برتر کے فقط اطوار و اعتبار ہیں۔ یہ محض بحر وجود کی موجیں ہیں اور حقیقت کی اپنی تڑپیں ہیں:

چشم نابینا سے مخفی معنیِ انجام ہے　　تھم گئی جس دم تڑپ سیماب سیم خام ہے

مگر وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ اصل حقیقت کا عشق اور اس سے تعلق کا شدید احساس ان اطوار وجود اور اعتبارات حقیقت کو باطل کر دیتا ہے تاہم یہ ایک حال ہے، یہ عشق کی سرمستی ہے جو اس بت اعتبار کو توڑ دیتی ہے:

توڑ دیتا ہے بت ہستی کو ابراہیم عشق　　ہوش کا دارو ہے گویا مستیِ تسنیم عشق

وحدتِ وجود کا یہ تصور اب محض شاعرانہ نہیں، ہاں یہ بلکہ ابن عربی کے مستند نظریے سے کچھ زیادہ قریب ہو گیا ہے۔ تعینات کے واقعی ہونے میں اور باہم امتیازات کے حقیقی ہونے میں ان کا کلام واضح اور قطعی نہیں ہے۔ تاہم اس کی تشریح ابن عربی کے مذاق پر بھی کی جا سکتی ہے۔[1]

تقاضائے نمود

ظہور کا تقاضا یا نمود کی خواہش جو پہلے صرف ذات حق تک محدود تھی اب پوری کائنات پر چھا گئی ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ اور عالم کی ہر وحدت ظہور کا تقاضا رکھتی ہے، ہر شے میں نمود کی خواہش ہے۔ دریائے ہستی کا ہر قطرہ ہستی کی لذت سے آشنا ہے:

لذت گیرِ وجود ہر شے　　سرمستِ مئے نمود ہر شے

وجود سے یہ لذت گیری اور نمود کی یہ اندرونی خواہش مابعد الطبیعیاتی بنیاد ہے اقبال کی دعوت حرکت و عمل کی اور خاص عنصر ہے ان کے آئندہ فلسفے کا۔ ظاہر ہے کہ اگر ہستی کی نفی ہی حقیقت ہے، حقیقی کمال فنا ہے اور فطرت کا مطالبہ سکون محض ہے تو پھر حرکت و عمل جو اظہار ہے ہستی کا اور خروش ہے بحر وجود کا، حقیقت سے بغاوت ہے اور مقابلہ ہے فطرت کا۔

تغیر اور نمود

اقبال کے ذہن میں شعوری یا غیر شعوری طور سے ان کی آئندہ فکر کا جو مسالہ خیالات کی صورت میں برابر جمع ہوتا جا رہا تھا اس میں شاید خالص شاعرانہ توجیہہ کے ضمن میں "تغیر" کا اضافہ اسی زمانے میں ہوا ہے۔

---

[1] خاص طور سے اقبال کا مندرجہ ذیل شعر تو بیچ التیج ہے کہ وہ تعینات کو فریب نظر ہی سمجھتے تھے لیکن چونکہ غزل کا شعر ہے اس لیے نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور تاویل بھی کی جا سکتی ہے لیکن اگر ان کا حقیقتاً یہی نقطۂ نظر ہے تو عمل سے اس کا پیوند بہت دشوار ہوگا:

جو ایک تھا اے نگاہ تو نے ہزار کر کے ہمیں دکھایا　　یہی اگر کیفیت ہے تیری تو پھر کسے اعتبار ہوگا

"حقیقتِ حسن" میں حسن خدا سے شکایت کرتا ہے کہ "جہاں میں کیوں نہ مجھے تونے لازوال کیا؟" اس شکایت کا جواب دیا گیا ہے کہ:

ہوئی ہے رنگ تغیر سے جب نمود اس کی　　　وہی حسین ہے حقیقت زوال ہے جس کی

نمود کے لیے یا دوسرے لفظوں میں وجود کے لیے تغیر لازم ہے۔ جو شے حرکت نہیں کر رہی ہے تو اس کی فعلیتوں کا بھی اظہار نہیں ہو رہا ہے اور ایسی حالت میں اس کے ظہور اور نمود کے کوئی معنی نہیں۔ کامل سکون اور مطلق جمود ہستی نہیں محض عقلی تجرید ہے۔ نمود یا وجود برابر بدلتے رہتے یا محض امکانات کے فعلیتوں میں ظاہر ہونے کا نام ہے اس لیے کسی ہستی کے لازوال ہونے کا مفہوم اس کی ہستی یا مکمل خفا ہے۔ مسلسل بدلتے رہنے کا ہی نام شے ہے۔ ایک فعلیت دوسری فعلیت کو جنم دیتی جا رہی ہے اور دوسری تیسری کو، فقط "ثبات تغیر کو ہے زمانے میں"۔

وطنیت کے بجائے ملّیت

وطن کے خالص جذباتی ماحول سے علیحدگی، مختلف اسلامی ممالک کے باشندوں سے تعلقات اور ان سے بیگانگی کا احساس، "ایرانی مابعد الطبیعیات" کی تحقیق کے سلسلے میں مختلف عہدوں اور مختلف وطنوں کی شخصیتوں، عمومی وحدتِ خیال، جذبۂ وطنیت کے مظاہر اور اس کے دور رس نتائج کا شعور، مسلم لیگ کا قیام اور انگلستان میں مقیم ہندوستانیوں کی اس سے دلچسپی اور تحریکِ وحدتِ اسلامی　ان سب کے ملے جلے اثرات نے غالباً اقبال کو ملت کی انفرادیت اور اس کی غیر منقطع وحدت سے آشنا کیا اور ان کے جذبات میں کھلا انقلاب آگیا۔ ایک "انقلاب العیر" کی صورت میں وطنیت سے ان کا تعلق ختم ہو گیا۔ اب وہ ملت اسلامی کو سماجی وحدت کے ساتھ ساتھ ایک مستقل سیاسی وحدت بھی سمجھنے لگے، اس کی ضرورتوں اور اس کے تقاضوں کو انھوں نے وطنی اور قومی تقاضوں اور ضرورتوں سے جدا محسوس کرنا شروع کر دیا۔

اقبال کے تصورات میں یہ انقلاب نہایت اہم اور دور رس نتائج کا حامل تھا، یہ ایک بڑی موڑ تھی جس نے ان کی زندگی کے رخ کو بدل دیا۔ اگر وہ ملت کی انفرادیت اور وحدت کو مطمح نظر نہ بناتے تو شاید ان کی فکر کوئی مستقل رخ نہ اختیار کرتی اور وہ دنیا کو ایک نیا خیال نہ دے سکتے۔ خود ان کی شاعری بھی وہ اچھوتا انداز نہ حاصل کر پاتی جس نے ان کو شعرا کی صف میں مستقل اور قابلِ رشک انفرادیت کا حامل بنا دیا اور شاید ان کی شخصیت بھی اتنی پرکشش اور محبوب نہ رہتی، نہ ملکی حیثیت میں اور نہ بین الاسلامی بلکہ اب تو بین الاقوامی حیثیت میں بھی

وطن کے ذرے ذرے کو دیوتا بنانے والا اقبال اب اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ مسلم قومیت خود مستقل وحدت ہے جو کسی وطنیت اور کسی قومیت میں محدود نہیں۔ یہ ایک نیا سماجی مظہر ہے جس کے تحفظ کے طریقے بھی نئے ہیں:

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا　　　بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

کیوں کہ اس نئے سماجی مظہر کا کوئی اپنا وطن ہی نہیں ہے دنیا تو دنیا اور مذاہب کے برخلاف اس کا نصب العین عقبیٰ بھی نہیں ہے:

کہاں کا آنا کہاں کا جانا فریب ہے امتیازِ عقبیٰ　　　نمود ہر شے میں ہے ہماری کہیں ہمارا وطن نہیں ہے

اس انوکھی قومیت کی بنیاد وہ اصولِ حیات ہیں جن کا شعار اور علامت حرم کی صورت میں پوری قوم کے لیے جاذب ہے:

جذبِ حرم سے ہے فروغ انجمنِ حجاز کا　　　اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے

محدود وطنیت اور ملکی قومیت افتراق کے بت ہیں جن سے ملت کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اپنے دامن کو ان بتوں سے بچائے جانے کی یہی تدبیر ہے کہ ملی وحدت کے شعار میں جذب ہو جائیں:

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا　　　بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبارِ راہِ حجاز ہو جا

عبدالقادر کے نام پیغام میں اسلامی قومیت کے اصول کو جو اس عہد کے وطنیت میں نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں، ان کا حسن و جمال دکھا کر ملت میں ان کے لیے نئی تڑپ پیدا کرنے کے عزم کا اظہار کرتے ہیں:

جلوۂ یوسفِ گم گشتہ دکھا کر ان کو　　　تپش آمادہ تر از خونِ زلیخا کر دیں

اور یہ غلط خیال جو ملت کے دل میں جما دیا گیا ہے کہ ملی تصورات مسلمانوں کی ترقی میں حائل ہیں اس کی عملی تردید کا سامان بہم پہنچائیں:

اس چمن کو سبق آئین نمو کا دے کر
قطرۂ شبنم بے مایہ کو دریا کر دیں
رخت جاں بت کدۂ چین سے اٹھالیں اپنا
سب کو محو رخ سعدیٰ و سلیمیٰ کر دیں

فرد اور ملت

اقبال کے فلسفے میں اگرچہ خودی کے اسرار کا انکشاف مقدم ہے تاہم بے خودی کے رموز کی جھلک ابھی سے نظر آنے لگی ہے۔ جبکہ خودی ابھی ان کے ذہن کے شخصی میلان سے آگے نہیں بڑھی ہے۔ اس زمانے میں ملت سے ان کا غیر معمولی شغف پھر جرمنی کا فلسفیانہ ماحول، غالباً ان کا ہی اثر تھا کہ اقبال نے فرد کی مستقل حیثیت سے صرف نظر کرلی اور فرد پر اسی اسلامی ملت کے جزء کی حیثیت سے نظر ڈالی جس کی انوکھی ساخت وطنیت اور قومیت کے بجائے اصول پر ہے۔

چنانچہ فرد کے انفرادیت سے متمتع ہونے کے معنی ملت کے جزء ہونے کی حیثیت سے ملت کے ضمن میں متمتع ہونے کے ہیں اس کی اپنی الگ کوئی ہستی ہی نہیں، اس کی ہستی تو ملت کے ایک ترکیبی جزء کی سی ہے اس لیے اس کا پورا اور صحیح تحقق ملت کی ہستی کے اندر ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے اپنے مفاد کے معنی ہی ملت کا اجتماعی مفاد ہے اور سب افراد کی ہستی کو محض ان کی اپنی ہستی کہنا مجاز اور تسامح ہے:

وجود افراد کا مجازی ہے ہستی قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زن مجاز ہو جا

اقبال کی وطن کو واپسی اور انکا فکری نشوونما

اقبال جولائی ۱۹۰۸ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے بی، اے، لندن سے بیرسٹر اور میونک یونیورسٹی، جرمنی سے ڈاکٹر ہو کر ہندوستان واپس آگئے اور اس طرح ان کی رسمی طالب علمی کا دور ختم ہو گیا۔ ان کی فکری نشوونما کا جہاں تک تعلق ہے تو گویا تحصیل علم کے زمانے میں ہی ان کے نظام فکر کے بہت سے اجزاء کے نقوش کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ یہ نقوش کچھ تو گہرے تھے اور کچھ اُتھلے اور بعض کی حیثیت رخ اور میلان سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ بعد کے زمانے میں ان میں ترمیم و تنسیخ ہوئی اور اضافہ بھی یہاں تک کہ "اسلامی الہیات کی تعمیر نو" میں ان کی فکر نے ایک منظم اور مربوط فلسفے کی صورت اختیار کرلی۔

(باقی)
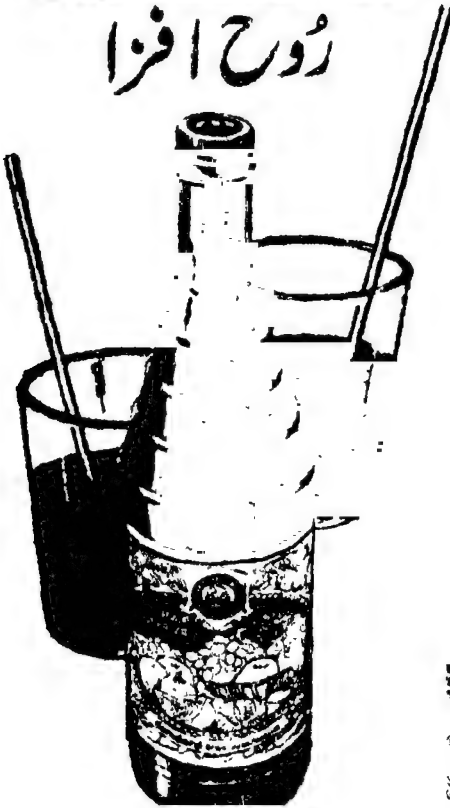
اقبال کے چار غیر مطبوعہ خطوط

ڈاکٹر محمود الٰہی

حیدرآباد کے دارالترجمہ کو جن اساتذۂ علم و فن کی خدمات حاصل تھیں، ان میں قاضی تلمذ حسین کا نام سرفہرست ہے۔ قاضی صاحب گورکھپور کی خاک سے اٹھے اور پھر وہیں پیوندِ خاک ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مشرقی نہج پر ہوئی۔ لیکن انھوں نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ اس تعلیم سے وہ اس منزل تک نہیں پہنچ سکتے جس میں ملک و قوم کی فلاح مضمر ہے اس لیے انھوں نے ایم اے، او کالج میں داخلہ لیا اور وہاں سے ایم اے کی سند حاصل کی۔

قاضی صاحب نہ تو مغربیت کے دلدادہ تھے اور نہ مشرقیت کے اندھے مقلد۔ وہ دونوں میں اعتدال اور توازن برقرار رکھنا چاہتے تھے اور ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ اسے برقرار رکھا۔ بعض امور میں شبلی کے مخالف ہوتے ہوئے قاضی صاحب سیاسی، مذہبی اور تعلیمی تحریکات میں شبلی کے خوشہ چیں تھے اور غالباً اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں انھیں ایک ممتاز عہدہ قبول کرنا پڑا۔ شبلی کے خطوط میں قاضی صاحب کا ذکر کئی جگہ آیا ہے جس سے ان کے ابتدائی رجحانات اور مصروفیات کے بارے میں بہت کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

اردو زبان و ادب کے سلسلے میں قاضی صاحب کے کارناموں کا تنقیدی جائزہ لینے کا یہ موقع نہیں ہے۔ لسان العصر ریاض رضواں اور مرآۃ المثنوی کا شمار قاضی صاحب کے ادبیات میں ہوگا۔ مثنوی مولانا روم پر ہندوستان میں اب تک جتنا کام ہوا ہے ان میں مرآۃ المثنوی کو ہر لحاظ سے اہمیت حاصل ہے۔ علامہ اقبال کو مولانا روم سے جیسا اور جتنا تعلق تھا، اس کا علم اقبالیات کا مطالعہ کرنے والوں کو اچھی طرح ہے۔ مرآۃ المثنوی کی اشاعت کے بعد قاضی صاحب نے علامہ اقبال سے خط و کتابت کی تھی۔ قاضی صاحب کے خطوط کی نقل تو موجود نہیں لیکن علامہ اقبال نے قاضی صاحب کو جو خطوط لکھے تھے وہ قاضی صاحب کے ایک عزیز محمد حامد علی صاحب کے پاس محفوظ ہیں۔ میں حامد علی صاحب کا شکرگزار ہوں نہ صرف یہ کہ انھوں نے علامہ اقبال کے یہ خطوط مجھے دیے بلکہ اپنے ذاتی کتب خانے سے استفادہ کرنے کا موقع دیا:

لاہور ۳ر جنوری ۱۹۳۵ء

جناب من تسلیم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ افسوس کہ میں ابھی تک علیل ہوں گو پہلے کی نسبت کسی قدر آواز بہتر ہے۔

مجھے پہلے سے اندیشہ تھا کہ کتاب کی فروخت میں آپ کو زیادہ کامیابی نہیں ہوگی۔ ہندوستان میں فارسی کا مذاق اب بہت کم ہو گیا ہے اس کے علاوہ تعلیم یافتہ مسلمانوں میں عام طور پر مذہبی ذوق بھی مفقود ہے۔

بہاول پور کے نوجوان نواب اگرچہ خود فارسی تصانیف کا ذوق شاید نہیں رکھتے تاہم قدر داں ضرور ہیں۔ آپ ان کی خدمت میں ایک کتاب عمدہ جلد کرا کر بطور ہدیہ ارسال کریں، میں بھی کوشش کروں گا کہ ان کی توجہ آپ کی کتاب کی طرف مبذول ہو۔ افسوس کہ ان کے گرد و پیش اچھے آدمی نہیں ہیں لیکن ممکن ہے عنقریب کوئی خوشگوار تبدیلی ان کے مصاحبین میں ہو جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو ممکن ہے کہ بہتر نتیجہ ہو۔

اس کے علاوہ آپ سر سید راس مسعود صاحب کو بھوپال لکھیں۔ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال بھی اہل علم کے قدر داں ہیں۔ ان کی خدمت میں کتاب عمدہ جلد کرا کر بھیجیے۔ سید راس مسعود صاحب اور شعیب صاحب قریشی منسٹر بھوپال کی خدمت میں بھی ایک ایک نسخہ ارسال کیجیے۔

والسلام محمد اقبال لاہور

(۲)

جناب من السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ آپ ابھی اپنی کتاب نواب صاحب کی خدمت میں ارسال نہ کیجیے۔ آٹھ دس روز تک حج بیت اللہ کو جانے والے ہیں ان کی واپسی تک انتظار کیجیے جو جلد ہوگی۔ یورپ جانے کا قصد نہیں ہے۔

محمد اقبال۔ لاہور

۱۷ر جنوری ۱۹۳۵ء

(۳)

بھوپال ۸ر مارچ ۱۹۳۶ء

جناب قاضی صاحب السلام علیکم

میں ابھی تک علیل ہوں اور یہاں بھوپال میں برقی علاج کے لیے مقیم ہوں۔

اس وقت بھاول پور کی ریاست ہندو مسلم مناقشات میں الجھی ہوئی ہے۔ موقع موزوں نہیں تاہم اگر آپ مرآۃ المثنوی وہاں بھیجنا چاہیں تو عرضداشت کرنل مقبول حسین صاحب قریشی ہوم ممبر ریاست کے نام بھیجیے۔ میں نے ان کے نام ایک خط لکھ دیا ہے جو اسی لفافے میں بند ہے۔ خط بھی عرضداشت کے ہمراہ بھیج دیجیے۔

والسلام

محمد اقبال

(۴)

جناب من

آپ کا لفافہ ابھی ملا ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے میری صحت عامہ تو اچھی ہے مگر آواز میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی ہے۔ میں نے کوئی مقالہ حضرت رومیؒ پر نہیں لکھا۔ آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔

والسلام

محمد اقبال

۲۷ر جولائی ۱۹۳۶ء

علامہ اقبال بحیثیت استاد

صالحۃ الکبریٰ عرشی

" یوں تو علامہ اقبال کے کلام کی تفسیر و توضیح اور اس کی ترویج واشاعت کی خاطر ہندوستان اور پاکستان کے مختلف رسائل میں مضامین کی بھر مار ہے اور ان موضوعات پر مستقل کتابوں کا بھی روز بروز اضافہ ہو رہا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ علامہ اقبال کی زندگی کے نشیب و فراز اور ان کی حیات کے شب و روز سے ـــــ جو رنگ و نور سے روشن و تابندہ ہیں۔ لوگ بے پروا ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ چند ہی سال ایسے ہیں جن میں وہ ہستیاں ہمارے درمیان موجود ہیں جنھیں علامہ اقبال سے شرف ملاقات حاصل رہا ہے۔ ابھی ایسی آنکھیں باقی ہیں جنھوں نے اس عظیم شاعر کو دیکھا ہے اور ابھی وہ لب و گوش قوت سماعت اور طاقت گویائی رکھتے ہیں جنھوں نے اس محبوب اور محترم شخصیت سے گفت و شنید کا لطف اٹھایا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے تمام بزرگوں سے پر زور درخواست کی جائے کہ وہ علامہ اقبال کی حیات کی ایسی بے شمار کڑیوں کو ملانے میں مدد دیں جو ان کی زنجیر ایام سے غائب ہیں۔ یہ لوگ نہ رہیں گے تو پھر ہمارے سارے ذرائع کمزور اور سارے وسیلے ایک حد تک یقین کی اس بلندی سے نیچے اتر آئیں گے جن پر وہ آج ہیں۔ اس لیے علامہ اقبال پر کام کرنے والے افراد اور ان کے ساتھ ہی ساتھ اداروں پر بھی یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ زیر بحث کام میں عملی دلچسپی لیں۔ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ شخصیت پر لکھنے والوں کو خصوصیت سے گفتنی اور ناگفتنی کی رسمی اور مذموم قید کو توڑ کر لکھنا چاہیے اور درج گزٹ ہر وہ بات ہونا چاہیے جو اس شخصیت کو یا اس کے کارناموں کو سمجھنے میں کسی نہج سے بھی کارآمد اور مفید ہو سکتی ہو۔ اس موقع پر حضرت یزداں میں چپ نہ رہنے والے بندۂ گستاخ کی مثال جرأت پیدا کرنے میں ضرور مددگار ثابت ہوگی چاہے وہ خود اسی زہر ہلاہل کو قند نہ کہہ سکنے والے سے متعلق ہی کیوں نہ ہو۔

ہاں تو ہم سب کو چاہیے کہ ان اصحاب کو اس اہم کام کی طرف متوجہ کیا جائے۔ اگر یہ حضرات لکھنے پر آمادہ نہ ہوں تو ان سے باقاعدہ ملاقاتیں کی جائیں اور سوالات کے ذریعے وہ سب کچھ معلوم کرنے کی سعی کی جائے جس کے بارے میں یہ اندیشہ ہے کہ وہ ان کے سینوں میں ایک راز کی صورت ان کے ساتھ ہی دفن ہو جائے گا۔

اسی جذبے کے تحت ایک بے حد دلچسپ اور بیش قیمت تاثراتی تحریر علامہ اقبال کے ایک شاگرد اور میرے والد (امتیاز علی عرشی صاحب) کے ایک عزیز اور قریبی دوست میاں عطاء الرحمن کی پیش کی جاتی ہے جو لاہور کے مشہور صاحب علم و ثروت خانوادے (میاں سر محمد شفیع باغبان پورہ) کے ایک فرد تھے۔ انھوں نے جیسا کہ خود انھوں نے لکھا ہے علامہ اقبال کو اس عالم میں دیکھا جس میں کم لوگوں نے دیکھا ہوگا

میاں صاحب کی یہ تحریر رام پور رضا انٹر کالج کی طرف سے منعقد کیے گئے یوم اقبال کی ایک نشست منعقدہ سنہ ۱۹۴۵ء میں پڑھی گئی تھی جس کی صدارت مشہور ماہر تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے کی تھی۔ اس جلسے کی دوسری اور تیسری نشست جس میں کلام اقبال سے متعلق تفسیری تصاویر کی نمائش بھی شامل تھی رشید احمد صدیقی اور غلام السیدین کے زیر صدارت ہوئی تھیں۔ یہ تصاویر رام پور کے دو مصوروں عظمت اللہ خاں اور اوریا ماکی کاوشوں کا نتیجہ تھیں۔

میاں صاحب مرحوم کے اس مضمون کی نقل میرے پاس محفوظ تھی جس کے محفوظ رہنے میں علامہ اقبال اور چچا عطاء الرحمن۔

دونوں سے عقیدت اور محبت کو دخل رہا ہے۔ امید ہے کہ میاں صاحب کی یہ تحریر ذوق و شوق کے ساتھ پڑھی جائے گی اور علامہ اقبال کی شخصیت کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے کچھ اور پرکشش ہوگی۔

مضمون نگار (میاں عطاء الرحمٰن مرحوم) کے بارے میں بھی یہ عرض کر دوں کہ وہ سالہاسال رام پور میں مقیم رہے اور ریاست کے محکمہ فنانس کے علاوہ بھی بہت سے شعبوں کے منتظم رہے اور آخر میں ہز ہائی نس کے پرائیویٹ سکریٹری بھی۔ وہ بڑے خوش مزاج زندہ دل اور پرخلوص آدمی تھے۔ انھیں ادب سے نہ صرف لگاؤ تھا بلکہ دخل بھی تھا۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ لاہور سے شایع بھی ہوا تھا۔ تقسیم سے پہلے وہ واپس لاہور چلے گئے تھے اور وہیں انتقال کیا۔

مضمون اور مضمون نگار کے تعارف کی رسم کے بعد مجھے رخصت کی اجازت دیجیے اور اصل تحریر ملاحظہ فرمائیے!

مجھے کالج چھوڑے ہوئے آج تیس برس سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ گو ایسا اتفاق کبھی کبھار ہوتا ہے۔ لیکن جب بھی مجھے کسی ایسے مجمع میں شمولیت کا موقع ملتا ہے جیسا آج ہے تو شاید گرد و نواح کی فضا کے اثر سے میرے جسم میں خون ایک نئی طرح سے حرکت کرنے لگتا ہے۔ اور میں اپنے دماغ میں اس قسم کے محسوسات گردش کرتے ہوئے پاتا ہوں۔ جو کبھی ہوا کرتے تھے۔ جب آتش جوان تھا۔

علامہ اقبال کے فکر و فلسفہ پر بے شمار چیزیں شایع ہو چکی ہیں اور ہوتی رہیں گی لیکن ان کے کسی شاگرد نے بحیثیت شاگرد کے اپنے محسوسات بیان نہیں کیے اور مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں نے مہینوں مسلسل ان کے قدموں میں بیٹھ کر ان سے انگریزی کی وہ نظمیں پڑھیں جو اس زبان میں اپنی نوع کی بہترین تخلیقات خیال کی جاتی ہیں۔ اور اس مطالعہ میں وہ لطف حاصل کیا ہے جو مشرق کے سب سے بڑے شاعر کی زبان سے مغرب کے سب سے بڑے شعراء کا کلام پڑھنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔

اقبال کی یاد میں غالباً ان موقعوں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جب پہلے پہلے میں نے انھیں دیکھا۔ میاں شاہنواز بیرسٹرایٹ لا مرحوم سے ہمیشہ ان کے خاص تعلقات رہے۔ ان دونوں کی آپس میں بے انتہا بے تکلفی تھی اور آخر تک بھی یہ دونوں جب بھی ملتے گفتگو کا وہی پرانا رنگ شروع ہو جاتا۔ میرے چچا میاں سر محمد شفیع مرحوم اور میاں شاہنواز ان دنوں لاہور ہائی کورٹ کے پہلو میں ایک ہی احاطے کی دو کوٹھیوں میں رہتے تھے غالباً سنہ ۱۹۰۴ء یا ۱۹۰۵ء کا ذکر ہے جب میری عمر بھی تیرہ چودہ برس کی تھی۔ چچا سر شفیع کے یہاں میرا آنا جانا اکثر ہوتا تھا۔ کیوں کہ وہاں میرے دو ہم عمر رفیق رہتے تھے مجھے خواب کی طرح لیکن صاف یاد ہے کہ جس کمرے میں ہم لڑکے بیٹھا کرتے تھے، اس کے برابر والے کمرے میں ان زندہ دل جوانوں کی بے تکلفانہ محفل جما کرتی تھی۔ ہمیں اس میں شمولیت کی اجازت تو ہو ہی نہ سکتی تھی۔ لیکن ہم دروازوں کے روزنوں میں سے اور کسی کھلے دروازے کے باہر دیوار سے لگ کر ان کی باتیں سنا کرتے تھے اور جہاں اندر سے کسی بزرگ کے نکلنے کی آہٹ ہوتی بھاگ کر چھپ جایا کرتے تھے۔ اقبال ان دنوں محفل کے روح رواں تھے۔ اور ہم تو یہی سمجھتے تھے کہ حد درجہ کے رندمشرب ہیں۔ ان کی آواز سب سے زیادہ بلند ہوتی اور باتوں میں کھلا مذاق جس کے لیے پنجابی زبان خاص طور پر موزوں ہے۔

اسی زمانہ میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسے انجمن کی پرانی شیرانوالہ دروازہ والی عمارت میں ہوا کرتے تھے اور چوں کہ ان جلسوں میں اکثر اوقات دلچسپی کا کافی سامان ہوا کرتا تھا۔ ہم بھی کئی کئی دنوں کا پروگرام ہونے کے باوجود جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا شمولیت سے ناغہ نہیں کرتے تھے خصوصاً ان دنوں میں جب اس وقت کے نوجوان شعراء، جن میں سے خان احمد حسین خاں اور اقبال خاص طور پر ممتاز تھے، اپنا کلام سنانے والے ہوں مجھے یاد ہے کہ اقبال ایک خوش وضع جوان کی صورت، ہلکی پھلکی سی عینک لگائے گلے کا بٹن کھلا ہوا شلوار پہنے اسٹیج پر آیا کرتے تھے۔ اور ان کے آتے ہی وہ ہنگامہ جو چندہ جمع کرنے اور خشک و بے لذت تقریر کرنے والوں کی وجہ سے تمام ہال میں برپا ہو کر تا تھا، تالیوں میں تبدیل ہو جاتا اور پھر وہ نغمے فضا میں گونجنے لگتے جن کے سننے کی آرزو میں ہم بھیڑ بھاڑ میں دھکے کھاتے ہوئے داخل ہو کر صبح سے چاروں طرف کے دباؤ کے جھونکے برداشت کیے ہوئے بیٹھے ہوتے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ہماری سمجھ میں آتا تھا یا نہیں کہ شاعرانہ نکتہ سنج کیا کہہ رہے ہیں۔ بہر حال اقبال کے دلکش ترنم میں وہ مزا آجاتا تھا جو شاید

کسی محفل رقص و سرود میں بھی نہ آتا۔ اور ان کے اشعار کی داد اس بے تکلفی دل سے نکلے ہوئے جوش کے ساتھ دی جاتی جو پنجاب والوں ہی کا حصہ ہے ان جلسوں میں ہندوستان کی اسلامی دنیا کے بڑے بڑے آدمی شرکت کیا کرتے تھے۔

چنانچہ مولوی نذیر احمد، شبلی نعمانی اور حالی جیسی ہستیوں کو پہلے پہل میں نے وہیں دیکھا یا سنا۔ مولانا حالی بہت ضعیف تھے اور آواز آتی نہ تھی کہ تمام حاضرین سن سکتے۔ لاؤڈ اسپیکر کا زمانہ نہ تھا۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ مولانا حالی اپنی نظم کے ایک دو اشعار پڑھ کر بیٹھ گئے۔ اور مسودہ اقبال کو دے دیا جو انھوں نے اپنے مخصوص طرز میں سنایا۔ اور نظم پڑھنے سے قبل ایک فی البدیہہ رباعی کہی جس کے قافیہ ردیف نام حالی کلام حالی تھے۔ الفاظ مجھے یاد نہیں۔
اس کے بعد اقبال ولایت چلے گئے اور کئی سال تک سوائے اس کے کہ اقبال کی کوئی نئی غزل مخزن میں نکلی اور ہم نے جھٹ اپنی بیاض میں نقل کر کے اسے یاد کرنا اور گانا شروع کر دیا۔ ان کا سامنا نہ ہوسکا ولایت سے واپس آنے کے بعد ان کے تغزل کے رنگ میں فرق آگیا اور اس میں کم از کم اس وقت ہمارے لیے وہ رندانہ کیف نہ رہا جو ان کی ولایت سے بھیجی ہوئی اس مشہور غزل کے مقطع میں ہے:

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانا ابھی وہی کیفیت ہے اس کی — کہیں سرِ رہ گزار بیٹھا ستم کشِ انتظار ہوگا

اقبال کے ولایت سے واپس آجانے کے بعد غالباً ۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء میں جب میں اسکول سے کالج میں پہنچ چکا تھا۔ انجمن حمایت اسلام کا جلسہ ہوا۔ جلسے سے پہلے یہ خبر اڑائی گئی تھی کہ اقبال اپنی کوئی خاص نظم پڑھنے والے ہیں۔ بس پھر کیا تھا وقت سے دو گھنٹے پہلے کالج سے بھاگ لیے اور ابھی چونکہ پنڈال اچھی طرح بھرا نہ تھا اسٹیج ڈائس کے کنارے جس کے اوپر بڑے لوگوں کے لیے کرسیاں بچھی تھیں پاؤں نیچے لٹکا کر جم گئے۔ کالج کے چار یا پانچ نوجوان کہیں تہیہ کر کے بیٹھ جائیں تو انھیں کوئی رعب یا دھمکی دے کر اٹھا تو لے خصوصاً ایسے۔ آگے ایسے میں جب کہ اقبال نئی نظم پڑھنے والے ہوں۔
دو چار قانون اور حفظ امن کے جو کیدار آئے اور اپنی چوٹی کا زور لگا دیا لیکن یہ لوگ "زمین جنبد نہ جنبد گل محمد" والا تہیہ کر کے بیٹھے تھے۔ کسی سے مذاق، کسی پر پھبتیاں، کسی سے کامل خاموشی بلا حرکت کی سیاسی پالیسی برتی گئی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ جب وقت کم رہ گیا اور جگہ کی قلت پیدا ہوئی تو ایک ہی ہلے میں ڈائس کے چاروں طرف کے کنارے پاؤں لٹکائے ہوئے نوجوانوں سے بھر گئے۔ اور کسی سینے پر کپڑے کا پھول لگا کر اکڑنے والے کی دال نہ گلی۔

غرض یہ کہ اقبال ڈائس پر آئے۔ چاروں طرف سے اللہ اکبر کا فلک شگاف نعرہ بلند ہوا۔ اور حسب معمول ڈائس پر تھوڑی بہت کھسر پسر کے بعد وہ اپنی نظم پڑھنے کو کھڑے ہوئے۔ باوجود سامعین کے بے حد اصرار کے اقبال نے نظم کو ترنم سے پڑھنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ترنم سے پڑھنا نظم کے مضمون سے مناسبت نہیں رکھتا۔ معلوم ہوا کہ نظم کا عنوان "شکوہ" ہے۔ اقبال پہلا بند پڑھنے لگے:

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں — فکر فردا نہ کروں محو غم دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں — ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز مری تاب سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

ہزاروں کے مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ کیا مجال کہ کسی کے سانس لینے کی آواز تک سنائی دے جائے۔ دوسرا بند شروع ہوا:

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم — قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
ساز خاموش ہیں فریاد سے معمور ہیں ہم — نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم
اے خدا شکوۂ ارباب وفا بھی سن لے
خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

جوں جوں اقبال نظم پڑھتے جاتے تھے سامعین کا جوش بڑھتا جاتا تھا اور ہر بند کے بعد تالیوں اور نعروں کا ایک طوفان برپا ہو جاتا تھا جس کے خاموش ہونے تک اقبال کو بار بار رکنا پڑتا تھا۔ اسی ہنگامہ پر درشان کے ساتھ یہ نظم شروع سے آخر تک پڑھی گئی۔ اور نئے اسلامیہ کالج لاہور کے میدان میں آج تک انجمن حمایت اسلام کے یا دوسرے جتنے بھی جلسے ہوئے ان میں مجھے یاد نہیں کہ کسی میں اس قدر جوش و خروش کا اظہار کیا گیا ہو۔

جس قدر اس قابل یادگار موقع پر ہوا۔

شکوہ کے شایع ہونے کے بعد چاروں طرف سے جوابوں کی بوچھار شروع ہوئی۔ کھلے خطوط میں، اخباری مضامین میں، نثر میں، نظم میں، درجنوں پمفلٹ شایع ہوئے۔ کچھ مولویوں نے اقبال کو برا بھلا کہا۔ لیکن اقبال بالکل خاموش رہے۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد ان کی نظم شمع و شاعر نکلی۔ لیکن یہ قدرے مشکل زبان میں لکھی گئی تھی۔ اور مقصد اور خیالات زیادہ تر سیاسی ہیں۔ سوائے اعلیٰ تعلیم یافتہ اسلامی پبلک کے اس کا لطف کوئی نہیں اٹھا سکتا۔ اس لیے گو اس کی شہرت بہت ہوئی لیکن عام نہیں۔

اس سے بھی چند ماہ یا شاید ایک سال بعد جنگ بلقان کے دوران میں خبر ملی کہ اقبال نے خود شکوہ کا جواب لکھا ہے، جو عنقریب کسی جلسے میں پڑھا جائے گا اس پر جوش امید ہر طرف پھیل گیا اور شاید اسی سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے مولوی ظفر علی خاں "زمیندار" والوں نے لاہور موچی دروازہ کے باہر باغ میں ایک عظیم الشان جلسہ کا اہتمام کیا۔ اور مشتہر ہوا کہ اس میں اقبال کی نظم ہوگی۔ شائقین کا ایک جم غفیر باغ کے پنڈال میں جمع ہوا۔ میں خود اس جلسہ میں موجود تھا۔ اقبال نے نظم اسی طرح ہر طرف سے داد کی بوچھاڑ میں پڑھی۔ ایک ایک شعر نیلام کیا گیا۔ اور ایک گراں قدر رقم بلقان فنڈ کے لیے جمع ہو گئی۔

یہ نظم کئی لحاظ سے شکوہ کی نسبت بہت زیادہ بلند ہے اور اس میں پہلے یہ مسلمانوں کو یہ بتا کر کہ ان کا شعار اسلامی نہیں رہا، وہی سبق دیا گیا ہے جو اقبال کی طرف سے اہل اسلام کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

یعنی یہ کہ زمانہ گزشتہ کی یاد میں رونے دھونے سے کچھ حاصل نہیں، اسلام فنا نہیں ہو سکتا، اگر کوشش کرو تو سب کچھ ممکن ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کوشش کرنے والوں ہی کے ساتھ ہے چند بند سن لیجیے تاکہ اقبال کے درد قومی کے خلوص کا اندازہ ہو سکے۔ اللہ سے شکوہ کے بعد دیکھیے جواب کس طرح شروع ہوتا ہے:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے　　پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے
قدسی الاصل ہے رفعت پہ نظر رکھتی ہے　　خاک سے اٹھتی ہے گردوں پہ گزر رکھتی ہے
عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا
آسماں چیر گیا نالۂ بیباک مرا

آئی آواز غم انگیز ہے افسانہ ترا　　اشک بیتاب سے لبریز ہے پیمانہ ترا
آسماں گیر ہوا نعرۂ مستانہ ترا　　کس قدر شوخ زباں ہے دل دیوانہ ترا
شکر شکوہ کو کیا حسن ادا سے تو نے
ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں　　راہ دکھلائیں کسے رہرو منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جوہر قابل ہی نہیں　　جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

یہاں تک تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اقبال کے شکوہ کا جواب تھا۔ اب پیغام سنیے:

دیکھ کر رنگ چمن ہو نہ پریشاں مالی　　کوکب غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی　　گل بر انداز ہے خون شہدا کی لالی
رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے

مثلِ بو قید ہے غنچے میں، پریشاں ہو جا — رخت بر دوش ہوائے چمنستاں ہو جا

ہے تنک مایہ تو، ذرے سے بیاباں ہو جا — نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے

دہر میں اسمِ محمد سے اجالا کر دے

انجمن کے جلسوں میں بعض اوقات حاضرین اور منتظمین کے درمیان بڑی دلچسپ نوک جھونک ہوا کرتی تھی۔ منتظمین میں عام طور پر اردو کے ان دنوں غالباً سب سے زیادہ مقبول اخبار "پیسہ اخبار" کے ایڈیٹر مولوی محبوب عالم صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی عبدالعزیز پیش پیش ہوا کرتے تھے لڑکے خوش طبعی سے انھیں پیسہ اور دھیلا کہا کرتے تھے۔ گو اس سے کسی قسم کی تحقیر مقصود نہ تھی۔ لیکن عبدالعزیز صاحب خصوصاً چونکہ انجمن کے جلسوں میں چندہ جمع کرنے کے لیے سب سے زیادہ پروپیگنڈہ کیا کرتے تھے۔ اس معاملہ میں ان کی اور حاضرین کے درمیان خصوصیت تھی۔ ہوتا یہ تھا کہ جہاں کسی پسندیدہ شاعر کی نظم یا اچھے مقرر کی تقریر کا وقت آیا عبدالعزیز صاحب ڈائس پر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کہ آپ فلاں صاحب کی نظم سننے کے لیے بے چین ہیں وہ موجود ہیں اور سنانے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن چندے کی رقم مثلاً ساڑھے چار ہزار روپے تک پہنچ گئی ہے پانچسو اور دلوائیے تو نظم شروع ہو گی۔ ورنہ جب تک پانچ ہزار روپیہ نہ ہوں گے آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔ اس پر لوگ جلدی جلدی دیتے اور رقم پوری کر دی جاتی تو نظم شروع ہوتی۔ اس کا جواب حاضرین کو موقع مل جاتا تھا تو اس طرح دیا جاتا تھا۔ کہ ڈاکٹر اقبال کی اگر کسی جلسے میں کوئی نظم نہیں ہوئی اور حاضرین میں موجود ہیں تو ایک صاحب کھڑے ہو گئے اور کہا کہ آج تو چندہ دیتے دیتے تھک گئے ہیں۔ آپ نے ہماری دلچسپی کا کوئی سامان مہیا نہیں کیا۔ لہٰذا علامہ اقبال سے ان کے چند غیر مطبوعہ اشعار سنوا دیجیے۔ اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو چندہ بھی نہیں ہو گا۔ تمام حاضرین تہیہ کر کے بیٹھ جاتے کوئی ایک پیسہ نہیں دیتا۔ چنانچہ منتظمین مجبور ہو جاتے اور علامہ کی منت سماجت کر کے اشعار پڑھواتے۔ ایک ایسا موقع یاد ہے کہ اقبال مسکرا اٹھے اور ایک فی البدیہہ رباعی مذاحیہ شان میں پڑھی، ٹھیک الفاظ مجھے یاد نہیں۔ کچھ اس طرح تھے: بلندہ باقی۔ بہت سے بیندہ باقی۔ اور ابھی تو رہتا ہے چندہ باقی وغیرہ۔ اور یہ سنا کر بیٹھ گئے حاضرین نے پہلے تو خوب تالیاں بجا کر داد دی۔ اس کے بعد ایک صاحب اٹھے اور کہنے لگے کہ اس رباعی کا بہت بہت شکریہ۔ لیکن شوق پورا نہیں ہوا۔ حسرت رہی جاتی ہے۔ چنانچہ علامہ پھر اٹھے اور پھر چند اشعار سنا کر چندے کی گاڑی کو دوبارہ چلتا کر دیا۔

ٹھیک تاریخیں یاد نہیں لیکن سن ۱۹۱۲ء یا سن ۱۹۱۳ء کا ذکر ہے۔ جب میں لاہور گورنمنٹ کالج میں بی اے میں پڑھتا تھا۔ اقبال کئی مرتبہ اس کالج میں پڑھانے پر مامور ہوئے۔ لیکن ہمیشہ فلسفہ کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ اس مرتبہ شاید پرنسپل کی غیر موجودگی، یا کسی اور وجہ سے ہماری جماعت کو انگریزی نظم کا سبق دینا ان کے فرائض میں شامل ہو گیا اور ہماری بے حد خوش قسمتی تھی کہ ہم نے انگریزی زبان کے بہترین شعرا کی چند بہترین نظمیں ان سے پڑھیں، ان میں جہاں تک مجھے یاد ہے ملٹن کی **Lycidas** اور **Penseroso, Allegro** کیٹس کی **Isabella** ڈرائڈن کی **Mac Fleckno** اور غالباً کولرج کی **Ancient Mariner** شامل تھیں **Gray's Elegy** کے علاوہ شیلے کی **Adonais** جس کا میں خاص طور سے ذکر کرنا چاہتا ہوں کیونکہ بلا مبالغہ یہ انگریزی زبان کی چند سب سے بلند نظموں میں سے ایک ہے۔ شیلے کا تخیل ہمارے مشرقی شعراء کی طرح گہرا اور پُرمعنی ہوتا ہے اور جس طرح ہمارے شعراء ایک ہی شعر میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں اسی طرح شیلے کے ایک بند میں خیالات کا ہجوم ہوتا ہے، جن کو علیحدہ علیحدہ کر کے پوری طرح سمجھنے کے لیے قدرے محنت درکار ہوتی ہے۔ اس خاص نظم کے متعلق میں ذرا تفصیل سے کام لینا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اس کے بغیر استاد کی استادانہ حیثیت کی حقیقت کا اظہار نہیں ہو سکے گا۔ آپ کے معلمین تو جانتے ہوں گے۔ لیکن آپ میں سے شاید ہی کوئی طالب علم ایسا ہو جسے معلوم ہو کہ یہ نظم شیلے نے اپنے دلی دوست اور مشہور شاعر (**Keats**) کے مرثیے کے طور پر لکھی تھی جس کا صرف چوبیس برس کی عمر میں، نقادوں کے نہایت بے رحمی سے اس کی بعض نظموں پر اعتراض کرنے کے صدمے سے انتقال ہو گیا تھا۔ یہ تمام نظم صحیح معنوں میں درد و غم کے اثرات سے معمور ہے اور ہر مصرعے میں ایک زخم خوردہ دل کے خون کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ عجیب بات ہے نظم کے آخری تین چار بندوں میں اس انتہائی مایوسی اور شدت غم کے ذکر کے ساتھ جو کیٹس کی جدائی سے شیلے پر چھا گیا تھا۔ شیلے کی اپنی موت کا جزاس

نظم لکھنے سے تین چار سال بعد واقع ہوئی ہو بہو نظارہ موجود ہے گویا یہ ایک قسم کی پیشنگوئی تھی کہ میری موت اس طرح واقع ہونے والی ہے۔ گویا اول تو لکھنے والا شیلے۔ دوسرے اس کی وہ نظم جو انتہائی جذبے کی حالت میں لکھی گئی۔ اور تیسرے پڑھانے والا ڈاکٹر محمد اقبال جو خود گہرے تخیل کا بادشاہ ہے اس مجموعے نے شاگردوں کی جماعت کے ان افراد پر جو حساس دل رکھتے تھے، وہ اثر کیا کہ تمام عمر فراموش نہیں ہو سکتا۔

اس نظم کے پچپن بند ہیں اور ڈاکٹر صاحب پینتالیس منٹ کے ایک کالج کے گھنٹے میں تو، نو مصرعے کا ایک بند ہی روزانہ پڑھاتے تھے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کو پڑھانے میں جماعت کو پڑھنے میں کتنا لطف حاصل ہوتا ہوگا۔ جب شیلے کے خیالات کو علامہ اقبال جیسا آدمی سمجھانے کی غرض سے واضح کرے اور خیال کے ساتھ مقابلہ یا موازنہ کے طور پر اپنے اور اردو شعراء کے خیالات بھی پیش کرے تو سامعین کی خوش قسمتی کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ ایک دریا تھا جو بہتا چلا آتا تھا۔ علامہ کے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ اور دل یہی چاہتا تھا کہ وہ اسی طرح پڑھاتے جائیں۔ اور ہم طلبہ خاموش بیٹھ کر سنا کریں۔ کالج کا ایک گھنٹہ جو عام طور پر طالب علم کے لئے محنت سے چھٹکارے کی مسرت انگیز خبر لیے ہوئے آتا ہے۔ اس گھنٹے کے ختم ہونے سے دل پر چوٹ کی شکل میں لگتا تھا۔ اور بادل نخواستہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلے جاتے تھے۔

میں چاہتا ہوں کہ شیلے کی (Adonais) سے مثال کے طور پر ایک چیز پیش کر دوں جس سے آپ کو مندرجہ بالا گفتگو کی کیفیت کا اندازہ ہو سکے۔ اس کے دوسرے بند کی آخری سطور میں شیلے کہتا ہے کہ ان کی قبر پر اُگے ہوئے پھولوں کی طرح جو دفن شدہ انسان کی بے ثباتی اور نفرت انگیز صورت پر ہنستے ہیں۔ کیٹس نے اپنی آنے والی ہولناک موت کو اپنے آخری نغموں سے اس طرح سجا کر چھپا رکھا تھا کہ وہ نظر نہیں آتی تھی۔

کسی قبر پر اُگے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر شیلے کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ایک تو وہ پھول انسان کی بے ثباتی پر ہنستے ہیں۔ دوسرے وہ انسانی لاش کے ڈراؤنے پن کو اپنے حسن سے چھپا دیتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں مرزا غالب فرماتے ہیں:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں　　　خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں

ان میں قبر کے پھولوں کو دیکھ کر غالب کے دل میں یہ خیالات پیدا ہوئے کہ یہ پھول ان دلفریب صورتوں کا ایک حصہ ہیں جو اس خاک میں دفن ہیں اور جنھیں ان کے حسن کی طاقت نمو نے مٹی کے باہر ظاہر کر دیا ہے۔

علامہ اقبال کا انگریزی تلفظ کچھ اچھا نہ تھا۔ شیلے کو شیلی کہتے تھے۔ اور اردو فارسی بھی حد درجہ پنجابیت لیے ہوئے لہجے میں بولتے تھے۔ یعنی قاف کو کاف ہی کہتے تھے۔ اور حقہ کو حکہ۔ اسی بنا پر مولانا نیاز فتحپوری نے اپنی مشہور ڈائری میں اقبال کی صورت شکل اور طرز گفتگو کو نہایت غیر شاعرانہ بیان کیا ہے۔ لباس کی طرف توجہ نہیں کی۔ یہاں تک کہ کالج ہائی کورٹ میں انگریزی سوٹ پہن کر جاتے تھے تو وہ بھی ڈھیلا ڈھالا بغیر استری کے۔ ٹائی ٹیڑھی ہے تو ٹیڑھی ہی سہی۔ عام طور پر بندھی بندھائی ٹو جیبکا لیا کرتے تھے۔ بوٹ میلے ہیں تو کچھ پروا نہیں۔ بالوں کی مانگ نہیں نکالتے تھے۔ پیچھے کو برش کر لیا کرتے تھے۔ پہلے ہمیشہ ترکی ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ بعد میں بالدار سیاہ ٹوپی اختیار کر لی۔ باوجود اس کے کہ ہماری اس سال کی بی اے کی جماعت جو زیادہ تر سنٹرل ماڈل اسکول سے ہی اپنی شرارت پسندی کے لیے مشہور چلی آتی تھی۔ اور خصوصاً برے تلفظ والے پروفیسر کا تو ناک میں دم کر دیا کرتی تھی، ان کے گھنٹے میں اس قدر خاموش ہو کر بیٹھ جاتی تھی کہ ایک تنکا بھی زمین پر گرے اور اس کی آواز سنائی دے جائے۔ مجھے یاد نہیں کہ اقبال نے کبھی کسی لڑکے کو کسی قصور پر سزا دی ہو۔ بلکہ دھمکی تک بھی کبھی نہیں دی۔ حیرت کی بات ہے کہ ... معلوم ہوا ہے کہ ان کی داہنی آنکھ بیکار تھی۔ جماعت میں ہمیشہ ان سے قریب بیٹھتا تھا لیکن میں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ وہ صرف ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ میں نے علامہ اقبال کو سگریٹ یا سگار پیتے کبھی نہیں دیکھا، گو سنا ہے کہ حقہ کے بہت شوقین تھے۔ کالج میں تو بغل میں ایک آدھ کتاب یا کاغذ کا رجسٹر لیے۔ سر جھکائے کبھی کچھ گنگناتے ہوئے ادھر ادھر دکھائی دیتے تھے۔ کسی سے بات چیت نہ کرتے تھے۔

ان دنوں کالج میں ایک سوسائٹی بزم سخن کے نام سے تھی۔ اس کے جلسے عام طور پر پندرھویں دن یا مہینے میں ایک بار ہوا کرتے تھے۔ لیکن زندہ دل پروفیسر شیخ نور الٰہی صاحب اس کے مستقل صدر تھے۔ ہر جلسہ میں اپنے کالج کے علاوہ دوسرے کالجوں کے اتنے طالب علم جمع ہو جایا کرتے تھے جتنے کمرے میں سما سکتے۔ اس بزم میں کالج کے لڑکے اپنا منظوم کلام جو زیادہ تر غزلیات پر مشتمل ہوتا سنایا کرتے تھے۔ بعض اوقات طرح مقرر کر دی

جاتی تھی جس پر سب مشق سخن کرتے تھے ۔ اور جیسا کہ ہمارے صدر میں پہلے عرض کر چکا ہوں، زندہ دل تھے، وہ مبتذل قسم کی عریانی کے سوا ہر قسم کی بات کہہ لینے دیا کرتے تھے۔ آج کل کی طرح اس وقت شعرا میں اتنی عریاں پسندی بھی نہ تھی لیکن مذاق اور پھبتیوں میں کالج کے کسی نہ کسی رنگ میں ممتاز طالب علموں اور پروفیسروں تک کو شعروں میں باندھ لیا جاتا تھا جس سے جلسہ کی دلچسپی روز افزوں تھی ۔ خدا جانے اب مسکدہ بزم قائم ہے یا نہیں۔ بہرحال اس وقت بہت کوشش کی گئی لیکن صدر بننا تو درکنار علامہ اقبال کبھی اس کے ایک جلسہ میں بھی شریک نہیں ہوئے ۔ البتہ (COLLEGE DAY) کے موقع پر ہر سال کسی بھلے آدمی نے بہترین اردو نظم کے لیے ایک مستقل انعام مقرر کر رکھا تھا ۔ اس مقابلے میں جو لڑکے نظمیں بھیجتے تھے ان کے جج علامہ اقبال ہی ہوا کرتے تھے ۔ یہاں تک کہ جب وہ کالج میں پڑھاتے بھی نہ تھے، تو یہ نظمیں فیصلے کے لیے انھیں کے پاس بھیجدی جایا کرتی تھیں ۔ بعد میں وہ نظمیں جو اول، دوم، اور سوم درجہ پر رہتیں کالج ڈے پر تمام لڑکوں کے سامنے ان کے مصنف پڑھ کر سناتے اور انعام حاصل کرتے تھے ۔ ویسے عام طور پر بھی علامہ اقبال، نوجوانوں کے شعر کہنے کے خلاف تھے مجھے یاد ہے کہ ان کی پروفیسری کے دنوں میں جب وہ ہمیں پڑھاتے تھے ہم ان کی کلاس کے دو تین لڑکے اپنی اپنی غزلیں لے کر ایک دن اکٹھے ان کے پاس گئے اور عرض کیا کہ ہم آپ کے شاگرد ہیں اور شعر کہنے کا شوق رکھتے ہیں اگر کبھی کبھی آپ ہماری ناچیز کوشش دیکھ کر تھوڑی بہت اصلاح فرما دیا کریں تو بڑی عنایت ہوگی ۔ فرمایا کہ بھائی میں بھی کسی کے اشعار پر اصلاح نہیں دیا کرتا ۔ جو تمہارے دماغ میں آئے لکھو ۔ لیکن اگر میری نصیحت مانو تو شعر کہنا چھوڑ دو یہ مشغلہ اچھا نہیں ۔

اقبال کے ملنے والے عام طور پہ کہتے ہیں کہ اپنے گھر میں بہ فراغت بیٹھے ہوئے بھی جب کبھی بات چیت کے دوران اچھے اشعار پڑھے جاتے تو ان کے آنسو نکل آتے تھے ۔ اور یہ تو مشہور ہے کہ شعر کہتے وقت اکثر زار و قطار رویا کرتے تھے ۔ اور یہ بھی کہ ان سے عندالطلب شعر نہیں کہلوائے جا سکتے تھے، جب تک ان پر وہ خاص کیفیت طاری نہ ہو اور طاری ہو تو بیسوں اشعار ایک وقت میں کہہ جاتے تھے ۔ اس سے مجھے ایک واقعہ یاد آگیا ہے، حالانکہ وہ پڑھاتے وقت کتاب کے مضمون ہی سے سروکار رکھتے تھے ۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ سبق چھوڑ کر گویا جماعت سے باتیں کرنے لگے ۔ جو نظم وہ پڑھا رہے تھے اس میں ایک مصرعے کے بے معنی تھے کہ شاعر کے لیے زبان کے الفاظ اظہار خیالات کو کافی نہیں ہوتے ۔ اقبال کتاب کی طرف سے نگاہ اٹھا کر جماعت سے مخاطب ہو گئے اور فرمایا کہ آپ لوگ اندازہ نہیں کر سکتے کہ شاعر کے دماغ میں جس وقت آمد ہوتی ہے تو اس کی کیا حالت ہوتی ہے ۔ خیالات ایک طوفان کی طرح امڈے چلے آتے ہیں، اس کو ہر خیال کے لیے پہلے الفاظ تلاش کرنا پڑتے ہیں پھر عروض اور قافیہ ردیف کے مرحلوں کو طے کرنا پڑتا ہے اس کے بعد ایک شعر بنتا ہے ۔ اس وقت تک درجنوں ایسے خیالات بھول کر ضائع ہو جاتے ہیں جو اگر شعر میں آجاتے تو اس مخصوص شعر سے شاید کہیں بہتر ہوتے ۔ شاعر بعض اوقات سخت بے چین ہوتا ہے اور تڑپتا ہے کہ اظہار خیال کے لیے اسے الفاظ نہیں ملتے یا ملتے ہیں تو اس خاص بحر یا قافیہ یا ردیف میں ادا نہیں ہو سکتے جس میں نظم یا غزل لکھی جا رہی ہے۔

(اقبال ریویو سہ ماہی)

اکبر اور اقبال

نور محمد ایم، اے

کمال اور زوال، بلندی اور پستی، سرفرازی اور تنزلی ان الفاظ میں دنیا کی تاریخ دہرائی جا سکتی ہے۔ ہندوستان مغلوں کے زمانے میں اپنے عروج کا شباب دیکھ چکا تھا، شاہجہاں کے عہد میں یہ دلہن کی نظر بد اس شباب کو گھن بن کر لگ گئی اور بسرعت تمام شیب میں تبدیل ہونا چلا گیا تا آنکہ ۱۸۵۷ء کا حادثہ رونما ہوا۔ ۱۸۵۷ء میں سلطنت مغلیہ نے آخری سنبھالا لینے کے بعد ہمیشہ کے لیے دم توڑ دیا اور وہ بابری شمع جو اس بزم رنگیں کو تین سو سال تک جلا دیتی رہی جھلملا کے ختم ہو گئی اور اپنے ساتھ پرانے ہندوستان کو بھی ختم کر گئی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان نے ایک نیا جنم لیا۔ غالب نے واقعہ ۱۸۵۷ء کو "رستخیز بیجا" کے نام سے یاد کیا ہے لیکن میرے نزدیک یہ "رستخیز بیجا" تھا۔ ۱۸۵۷ء نے جدید ہندوستان کی بنیاد رکھی، وہ ہندوستان جو اورنگزیب کی وفات کے وقت سسکیاں لے رہا تھا اب تک زندہ رہتا۔

قوموں کی زندگی کو ہم تین شعبوں میں تقسیم کر سکتے ہیں مذہبی، ادبی، سیاسی۔ تنزل پذیر قوم ان تینوں چیزوں سے محروم ہو جاتی ہے اس کے ایمان میں تزلزل، اس کے ادب میں انحطاط اور اس کی سیاست میں گتھیاں اور غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ کوئی ایسا مذہبی سرگروہ نہیں ملتا جو صحیح معنوں میں اس کی رہنمائی کرے اور نہ کوئی ایسا سیاست داں ملتا ہے جو قوم کے سامنے ایک مکمل لائحہ عمل پیش کرے قوموں کا زوال ایک یا دو دن کی بات نہیں ہوتی، سال یا دو سال کا واقعہ نہیں ہوتا قوم کو بنتے اور بگڑتے صدیاں لگ جاتی ہیں۔

۱۸۵۷ء کا واقعہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا منحوس ترین سانحہ ہے یہ ایک ایسا جانگداز اور روح فرسا صدمہ تھا کہ مسلمان اس کی تاب نہ لا سکے اور وہ دماغی توازن کھو بیٹھے۔ مذہب سے مسلمانوں کا اٹھنا اور بچھڑنا بے روگرانی شروع ہوئے عرصہ ہو چکا تھا لیکن اس غیر متوقع آفت نے رہے سہے عقائد اور اعتقادات بھی ڈھیلے کر دیئے اور اس طرح ایمان میں تزلزل کی بنیاد پڑی۔

بھولا ہوا خواب جب حقیقت کا روپ دھار ان نہ کر سکا تو مسلمانوں کے دماغ مختل ہو کر رہ گئے وہ سمجھتے تھے کہ دہلی کی سلطنت ان کی میراث ہے اور اس کی بقا اور حفاظت ان کی سیاست۔ جب یہ ہاتھ سے نکل گئی تو ان کی سیاست کا خاتمہ ہو گیا انھیں اب کوئی شاہراہ عمل سجھائی نہیں دیتی تھی ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انھیں ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیے۔ ان کی بدحواسی، بےچینی اور اضطراب نے انھیں اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ کاوش فکر کرتے اور اس غیر متوقع مصیبت کا کوئی ٹھیک حل ڈھونڈ نکالتے۔ یہ تھے وہ حالات جہاں سے سیاست میں پیچیدگیاں اور غلط فہمیاں شروع ہوئی ہیں۔

"کل کی نوخیز چھوکری" سلطنت کا سایہ عاطفت اٹھ جانے کے بعد مبہوت ہو کر رہ گئی۔ یتیمی کے صدمے نے اس سے بھلے اور برے میں امتیاز کرنے کی قوت سلب کر لی اور وہ اپنے خیر خواہوں میں تمیز نہ کر سکی۔ ناز و نعم میں پلی ہوئی شاہی حرم اور دربار میں پرورش پائی ہوئی بیگموں اور شاہزادوں کے منہ لگی ہوئی کیا جانتی کہ مصیبت کیا چیز ہوتی ہے، جس وقت قلعہ سے نکالی گئی نادان تھی، عوام کے نرغہ میں جا پھنسی، جوانی کے دن تھے اور امنگوں کی راتیں، ان سے کھل کھیلی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف عزت ہاتھ سے جاتی نظر آئی تو دوسری طرف اثاثہ لٹتا دکھائی دیا، غرضکہ اس طرح ادب میں انحطاط رونما ہوا۔

ایمان میں تزلزل سیاست میں پیچیدگیاں اور ادب میں انحطاط ان تینوں نے مل کر مسلم قوم کے لیے نہ صرف زوال کے سامان مہیا کر دیئے بلکہ اسے اس مقام تک لے آئے جہاں اس کی بقا کے لیے کسی مرد کامل کی ضرورت لاحق ہوئی۔ توحید کی امانت سینوں میں رکھنے

والے اب نہ صرف ایک مذہبی رہنما کے محتاج تھے بلکہ انھیں اپنی بقا کے لیے ایک مجتہد ادیب کی ضرورت تھی اور سیاست میں ایک دور اندیش اور تجربہ کار سیاست داں کی۔ ان کی کشتیٔ حیات بادِ حوادث کے تیز و تند جھونکوں کی تاب نہ لاکر پاش پاش ہوئی جا رہی تھی۔ ٹھیک اسی وقت چند افراد خدا کا نام لے کر قوم کو بچانے کا عزم کر کے اٹھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قوم کی اصلاح ایک شخص کے بوتے کا کام نہ تھا، مولوی ابو القاسم مذہبی اصلاح کا بیڑا اٹھاتے ہیں اور دیوبند میں ایک مذہبی جامع کی بنیاد رکھتے ہیں، سرسید سیاسی رہنما کا کام اپنے ذمے لیتے ہیں لیکن اس گُر سے بخوبی واقف ہیں کہ سیاست کی پہلی سیڑھی تعلیم ہے اسی لیے وہ علوم جدید و قدیم کی تعلیم مسلمانوں میں عام کرنے کی غرض سے علی گڑھ میں ایک مرکزی دار العلوم کا سنگ بنیاد رکھتے ہیں اور ادب کی اصلاح اور صحیح نہج پر لانے کا سہرا حالی کے سر رہتا ہے۔

حالی اردو ادب میں پہلی ہستی ہے جس کے یہاں اجتماعی شعور پایا جاتا ہے۔ حالی کو اپنے سے زیادہ قوم اور وطن کا خیال ہے وہ مسلمانوں کی بے حسی اور بے دلی سے حد درجہ متاثر ہیں ان کی زندگی کا ہر لمحہ اس بے حسی اور بے دلی کو دور کرنے کے لیے وقف تھا انھوں نے ادب کو پہلی مرتبہ ایک وسیلہ اور ذریعہ کے طور پر استعمال کیا حالی کے یہاں ادب مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ یہ محض ان کے اظہار خیال کا ذریعہ ہے۔ حالی کے نزدیک مقصد اتنا اہم ہے کہ وہ نظم و نثر دونوں کو اسی مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں حتیٰ کہ غزل کی سی صنف ادب کو بھی وہ وسیلہ کے طور پر ہی کام میں لاتے ہیں" حالی رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا" حالی نے ماضی کے گن گائے اور حال کی بدحالی پر نیر بہائے، حالی مغرب سے مرعوب تھے وہاں کی مادی ترقیات اور علوم و فنون کے عروج نے ان کی نظر میں خیرگی پیدا کر دی تھی، حالی کی یہ کیفیت بہت کچھ سرسید کی صحبت اور قربت کا نتیجہ تھی حالی کے کردار میں یہ ایک عجیب خصوصیت تھی کہ وہ شخصیتوں سے بہت جلد متاثر ہو جاتے تھے، حالی نے سرسید سے متاثر ہو کر عمر بھر "پیروی مغربی" کے راگ الاپے حالی نے ایک پختہ کار اور ہوشیار فن کار کی طرح ہمارے سامنے دو متضاد تصویریں پیش کر دیں۔ ماضی کی رونق اور حال کی خستگی اس درماندگی اور خستہ حالی کا علاج حالی نے "پیروی مغربی" تجویز کیا۔

لیکن حالی ہی کے زمانے میں ایک شخص نے یہ آواز بلند کی کہ ہماری موجودہ پستی، افلاس اور ادبار کی وجہ ہماری مغرب کی اندھی اور کورانہ تقلید ہے ہم نے جادۂ حق کو چھوڑ دیا اس لیے ہم قعر مذلت میں گر پڑے۔ یہ آواز اکبر کی تھی اکبر نے مسلمانوں کی بہبودی اور خوشنودی اسی میں دیکھی کہ وہ سختی کے ساتھ اپنے ماضی سے وابستہ رہیں۔ حالی مسلمانوں کے ماضی کو روشن اور شاندار تسلیم کرتے ہوئے بھی جب کشمکش اور الجھن کے دوراہے پر پہنچتے ہیں تو مسلمانوں کو "آتش نمرود" میں "بے خطر" کو د پڑنے کی تلقین کرتے ہیں لیکن اکبر اس اندھی تقلید کے قایل نہیں قدامت پسندی ان کا مذہب اور شرقیت ان کا ایمان ہے "غیرت قومی" اکبر کے مزاج کا جز و لاینفک ہے خواہ وہ تعلیم ہو یا سیاست ہو یا مذہب ہو یا معاشرت اکبر کبھی غیرت قومی کا دامن نہیں چھوڑتے۔

اکبر کے بعد جس شخص نے مغربی تہذیب کی یلغار کو روکنے کی کوشش کی وہ اقبال تھے۔ اکبر نے قریب قریب ان ہی چیزوں کی مخالفت کی تھی جن چیزوں کی اقبال نے کی یعنی مغرب کی اندھی تقلید، عورتوں کی آزادی اور ان کی موجودہ تعلیم مشینوں کا غلبہ، مغربی تعلیم، قرآن اور مذہب سے بے نیازی وغیرہ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اکبر کے منہ سے جب ہم ان باتوں کی مخالفت سنتے ہیں تو ہم انھیں محض تفریح کی چیز سمجھ کر ٹال جاتے ہیں لیکن جب اقبال کے منھ سے سنتے ہیں تو ہمہ تن گوش ہو کر سنتے ہیں ــــ اس سے پہلے کہ میں یہ واضح کرنے کی کوشش کروں کہ کیوں اقبال کی آواز کوہ ندا کی آواز کا اثر رکھتی ہے کہ ہم بے اختیارانہ اس کی جانب بڑھتے چلے جاتے ہیں اور کیوں اکبر کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ گئی یہ مناسب ہوگا کہ میں ایک ہی موضوع پر اکبر کے اور پھر اقبال کے اشعار آپ لوگوں کی خدمت میں پیش کر دوں اشعار کی تعداد صبر آزما ہے لیکن میرے مقصد کی وضاحت کے لیے یہ ناگزیر سا امر ہے۔ اکبر مغرب کی اندھی تقلید کے بارے میں کہتے ہیں؛

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے ۔۔۔ بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن یہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی ۔۔۔ یورپ کا تری رگوں میں خون بھی ہے

حاصل کرو علم طبع کو تیز کرو
باتیں جو بری ہیں ان سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر
اس میں کیا ہے کہ نقلِ انگریز کرو

خدا جانے کہا کس نے یہ کسی دن عقل سے
کہ مشرق کو نظر آتا نہیں مغرب سے چھٹکارا
مضر ہیں مذہبی قیدیں مناسب ہے شکست ان کی
مزاحم ہیں مگر یہ مولوی ان کا نہیں چارہ
وہ چھینٹے دیجیے ان کو حکیمانہ طریقوں سے
کہ بجھ کر راکھ ہی ہو جائے مذہب کا یہ انگارا
چلے مقراضِ تدبیر ایسے پیچیدہ طریقوں سے
کہ جڑ کٹ جائے مذہب کی یہ گھر ہو منہدم سارا

رات اس مس سے کلیسا میں ہوا میں دوچار
ہائے وہ حسن وہ شوخی وہ نزاکت وہ ابھار
آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہگار کریں
گال وہ صبح درخشاں کہ ملک پیار کریں
دل کشی چال میں ایسی کہ ستارے رک جائیں
سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں
عرض کی میں نے کہ اے گلشن فطرت کی بہار
دولت و عزت و ایماں ترے قدموں پہ نثار
تو اگر عہد وفا باندھ کے میری ہو جائے
ساری دنیا سے مرے قلب کو سیری ہو جائے
شوق کے جوش میں میں نے جو زباں یوں کھولی
ناز و انداز سے تیوری وہ چڑھا کر بولی
غیر ممکن ہے مجھے انس مسلمانوں سے
بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے
کوئی بنتا ہے جو مہدی تو بگڑ جاتے ہیں
آگ میں کودتے ہیں توپ سے لڑ جاتے ہیں
مطمئن ہو کوئی کیونکر کہ ہیں یہ نیک نہاد
ہے ہنوز ان کی رگوں میں اثرِ حکمِ جہاد
عرض کی میں نے کہ اے لذتِ جاں راحتِ روح
اب زمانے پہ نہیں ہے اثرِ آدم و نوح
ہم میں باقی نہیں اب خالدِ جانباز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظِ شیراز کا رنگ
یاں نہ وہ نعرۂ تکبیر نہ وہ جوشِ سپاہ
سب کے سب آپ ہی پڑھتے ہیں سبحان اللہ
مجھ پہ کچھ وجہِ عتاب آپ کو اے جان نہیں
نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلمان نہیں
میرے اسلام کو ایک قصۂ ماضی سمجھو
ہنس کے بولی کہ تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

اقبال کہتے ہیں:

ہاتھ بے زور ہیں الحاد سے جی خوگر ہیں
امتی باعثِ رسوائیِ پیغمبر ہیں
بت شکن اٹھ گئے باقی جو رہے بت گر ہیں
تھا براہیم پدر اور پسر آزر ہیں
بادہ آشام نئے بادہ نیا خم بھی نئے
حرمِ کعبہ نیا بت بھی نئے تم بھی نئے

ہر کوئی مست مئے ذوقِ تن آسانی ہے
تم مسلمان ہو ؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے
حیدری فقر ہے نے دولتِ عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے — مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج دل پریشاں سجدہ بے ذوق — کہ جذب اندروں باقی نہیں ہے

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے — مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

عورتوں کی تعلیم اور آزادی کے بارے میں اکبر کی ظرافت کی پھلجھڑیاں ملاحظہ ہوں:

اعزاز بڑھ گیا ہے آرام گھٹ گیا ہے — خدمت میں ہے دلیری اور ناچنے کو ریڈی
تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر — شوہر پرست بی بی پبلک پسند لیڈی

ان سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی — یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

خدا کے فضل سے بی بی میاں دونوں مہذب ہیں — حجاب ان کو نہیں آتا، انھیں غصہ نہیں آتا

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی — اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسماں نکلیں — میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بی بیاں نکلیں

ان اشعار سے آپ یہ غلط نتیجہ نہ نکال لیں کہ اکبر تعلیم نسواں کے مخالف تھے، یہ اکبر کے ساتھ زیادتی ہوگی وہ عورتوں میں تعلیم کا رواج دیکھنا چاہتے تھے لیکن کس قسم کا یہ ملاحظہ ہو:

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر — خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

کون کہتا ہے کہ تعلیم زناں خوب نہیں — ایک ہی بات فقط کہتا ہے یاں حکمت کو
دو اُسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم — قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

اس سلسلے میں اکبر کی ایک طویل نظم "تعلیم نسواں" ایک پنڈت صاحب کی فرمائش سے دیکھنے کی چیز ہے۔ اقبال "آزادی نسواں" کے عنوان سے کہتے ہیں:

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا — گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش — مجبور ہیں معذور ہیں مردانِ خرد مند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ — آزادیِ نسواں کہ زمرد کا گلو بند

اسی سلسلے میں اقبال کے اور اشعار پیش ہیں:

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی — نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد
تہذیب فرنگی ہے اگر مرگ امومت — ہے حضرت انساں کے لیے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن — کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن — ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت

جو ہر مرد عیاں ہوتا ہے بے منت غیر — غیر کے ہاتھ میں ہے جوہر عورت کی نمود
راز ہے اس کے تپ غم کا یہی نکتۂ شوق — آتشیں لذت تخلیق سے ہے اس کا وجود

تعلیم کے بارے میں اکبر کہتے ہیں:

وہ حافظہ جو مناسب تھا ایشیا کے لیے — خزانہ بن گیا یورپ کی داستانوں کا
نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے — جناب ڈارون کو حضرت آدم سے کیا مطلب
نظر ان کی رہی کالج ہی میں علمی فوائد پر — گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر
طفل دل محو طلسم رنگ کالج ہو گیا — ذہن کو تپ آئی اور مذہب کو فالج ہو گیا
کہاں جہنم و جنت کہاں عذاب و ثواب — دل اب تو رہتے ہیں کالج کے فیل پاس کیے
تکمیل میں ان علوم کے ہو مصروف — نیچر کی جو طاقتوں کو کر دیں مکشوف
لیکن تم سے امید کیا ہو کہ تمہیں — عہدہ مطلوب ہے وطن مالوف

اقبال کہتے ہیں:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے — کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے حاصل نہیں فراغ کہ تو — کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

پختہ افکار کہاں ڈھونڈھنے جائے کوئی — اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر — چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام
بری ہے افکار سے ان مدرسے والوں کا ضمیر — خوب و ناخوب کی اس دور میں ہے کس کو تمیز
اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم — ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم — کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

نئی تہذیب کے متعلق اکبر کہتے ہیں:

نئی تہذیب سے ساقی نے ایسی گرم جوشی کی — کہ آخر مسلموں میں روح پھونکی بادہ نوشوں کی
مجھ کو حیرت ہے کہ ہیں یہ کس گرو کی چیلیاں — حشر برپا کر رہی ہیں مغربی البیلیاں
ناز تھا ان کو بہت اپنے بدن کی ساخت پر — اگزبیشن میں مرے اک دوست عریاں ہو گئے
خامشی سے نہ تعلق ہے نہ تمکین کا ذوق — ان حسینوں میں بھی پاتا ہوں میں اسپیچ کا شوق
لیلیٰ نے سایہ پہنا مجنوں نے کوٹ پہنا — لڑکا جو میں نے بولے بس بس خموش رہنا
حسن و جنون بدستور اپنی جگہ ہیں لیکن — ہے لطف بحر ہستی فیشن کے ساتھ بہنا
انگلش ڈریس انور کا جو کل بزم میں دیکھا — اکبر نے کہا یہ تو خرابی کے ہیں آثار
معنی میں بھی ہو جائے گا آخر کو تغیر — تبدیلیٔ صورت کے رہے گر یہی اطوار
حالی کی عبارت سے حجاب آنے لگے گا — شرماؤ گے کرتے ہوئے اسلام کا اظہار
آخر کو رہو گے نہ ادھر کے نہ ادھر کے — انگریز بھی کھنچتے رہیں گے قوم بھی بیزار

اقبال کہتے ہیں:

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب　　کہ روح اس میں مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید　　ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیب حاضر میں　　بھڑک اٹھا بھبوکا بن کے مسلم کا تن خاکی
نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے　　یہ رعنائی یہ بیداری یہ آزادی یہ بیباکی
تغیر آگیا ایسا تدبر میں تخیل میں　　ہنسی سمجھی گئی گلشن میں غنچوں کی جگر چاکی
کون ہے تارک آئینِ رسولِ مختار　　مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار　　ہوگئی کس کی نگہ طرزِ سلف سے بیزار؟
قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں　　کچھ بھی پیغامِ محبت کا تمھیں پاس نہیں

اقبال نے جب یورپی تہذیب اور تمدن کا بہ نظر غور مطالعہ کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے:

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے　　کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی　　جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

لیکن یہ سن کر آپ کو تعجب ہوگا کہ اکبر نے سات سمندر دور رہتے ہوئے بھی اقبال سے پیشتر یہ کہدیا تھا۔

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو　　بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو
برق گر جائے گی اک دن اور اڑ جائیگی بھاپ　　دیکھنا اکبر بچائے رہنا اپنے آپ کو

نفس انسانی پر مشینوں کے غلبہ کے بارے میں اکبر اور اقبال دونوں نے اپنے اپنے مخصوص رنگ میں اظہار خیال کیا ہے۔

اک دن وہ تھا کہ دب گئے تھے لوگ دین سے　　اک دن یہ ہے کہ دین دبا ہے مشین سے　(اکبر)
ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت　　احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات　(اقبال)

قرآن کریم مسلمانوں کے لیے آئین حیات کا کام دیتا ہے مسلمانوں نے اگر دنیا میں شہرت و نیک نامی حاصل کی عظمت و بزرگی پائی ترقی و سروری کے مدارج طے کیے تو یہ سب اسی آئین حیات پر عمل پیرا ہونے کا صدقہ تھا۔ اکبر و اقبال دونوں کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ع

اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

اکبر کہتے ہیں:

صوم ہے ایمان سے، ایمان خصت عوم گم　　قوم ہے قرآن سے قرآن رخصت قوم گم

اور اقبال کہتے ہیں:

از یک آئین مسلمان زندہ است　　پیکر ملت ز قرآن زندہ است

اشعار کی تعداد زیادہ ہوگئی ہے اس کا مجھے احساس ہے لیکن میں پہلے کہہ چکا ہوں میرے مقصد کی وضاحت کے لیے یہ ایک ضروری امر تھا آپ نے ان اشعار سے اندازہ لگایا ہوگا کہ اساسی چیزوں کے متعلق اکبر اور اقبال دونوں ہم خیال ہیں لیکن اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اکبر کے مقابلے میں اقبال کیوں زیادہ کامیاب رہے اس کے کئی اسباب ہیں۔

آرٹ کی عظمت بہت کچھ آرٹسٹ کی شخصیت اور اس کے عقائد پر منحصر ہے۔ اکبر اور اقبال کی شخصیت میں بعد المشرقین ہے۔ ایک دیو پیکر ہے تو دوسرا بونا، ایک علوم جدید و قدیم کا ماہر تو دوسرا صرف علوم قدیم سے آشنا، ایک مشرق و مغرب کے بہترین افکار سے مزین تو دوسرا گنے چنے لوگوں کے خیالات سے آگاہ، ایک فلسفی تو دوسرا صوفی بعد میں اور ظریف پہلے، اقبال کے کلام میں تاثیر ان کے شاعرانہ

اعجاز سے نہیں ہے کیوں کہ جہاں تک فنی خصوصیات کا تعلق ہے اکبر کا کلام کسی لحاظ سے، کسی پہلو سے اقبال کے کلام سے کم نہیں ہے بلکہ میرا تو خیال ہے کہ جو قدرت اکبر کو زبان پر حاصل تھی وہ شاید اقبال کو کبھی نصیب نہ ہوئی اس فرق کی وجہ جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں شاعرانہ اعجاز نہیں بلکہ شخصیتوں کا فرق ہے۔ اکبر کی شخصیت نہ اتنی بلند ہے جتنی اقبال کی ہے نہ اس میں وہ ہمہ گیری ہے جو اقبال کے یہاں ہے۔ زبان پر اگر قدرت ہے تو شعر میں شگفتگی، برجستگی، سلاست، طلاقت اور روانی پیدا ہو سکتی ہے۔ شعر میں حسن بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن جب تک محرکاتِ شعری عظیم نہ ہوں آرٹ میں بلندی نہیں آسکتی۔ اکبر کے یہاں تخریبی پہلو نمایاں ہے اقبال کے یہاں تعمیری پہلو پیش پیش ہے۔

اکبر کے یہاں سوجھ تھی اور بلا کی سوجھ میں بوجھ کو بہت کم دخل تھا۔ اکبر ہر چیز کے مضحک پہلو کو پہلی نظر میں دیکھ لیتے ہیں اور اسی کو اساسی پہلو قرار دے کر طنز و ظرافت کے تیروں کی بوچھار شروع کر دیتے ہیں۔ اکبر زیادہ تر چیزوں کا سرسری مطالعہ کرتے ہیں، اقبال نے ان چیزوں کا مطالعہ ساحل پر کھڑے ہو کر محفوظ و ثبت مقام سے نہیں کیا بلکہ انھوں نے طوفان سے چشمک زنی کی، وہ موجوں سے کھیلے اور چٹانوں سے ٹکرائے، اسی چشمک، کھیل اور ٹکر سے وہ شرارہ وجود میں آیا جس نے ان کے کلام کو زیادہ موثر، زیادہ بلند اور وقیع بنا دیا برخلاف اس کے اکبر ان چیزوں کو عوامل بیابانی سمجھتے رہے۔ انھوں نے ایک محفوظ اور مثبت مقام سے طوفان کا صرف نظارہ کیا اسی لیے وہ اس کی تہہ تک نہ پہنچ سکے ان کا مطالعہ کچا، خام اور ناقص رہا، اسی لیے وہ جزئیات پیش کرنے سے قاصر رہے وہ برائیوں پر زور دیتے ہیں جو پہلی نظر میں دکھائی دے جاتی ہیں، اکبر بات کو بتنگڑ بنا کر پیش کرتے ہیں اور معمولی چیز پر زور دیتے ہیں ان کا وار ہمیشہ کوٹ، پتلون، اور سایہ پر ہی پڑتا ہے اگر میں یہ کہوں کہ اکبر اوچھے ہتھیاروں سے وار کرتے ہیں تو شاید بیجا نہ ہوگا اقبال ظاہر کے ساتھ ساتھ باطن پر بھی نظر رکھتے ہیں اور چیزوں کے حسن و قبح کا انحصار ان کی ظاہری سج دھج پر نہیں بلکہ ان کی تمام خصوصیات پر رکھتے ہیں ان باتوں کو ذہن میں رکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اکبر کی ناکامی کا سبب ان کے مطالعے کی سطحیت اور فکر و وشن کی کمی ہے۔ لیکن صرف اسی چیز کو اکبر کی ناکامیابی کی وجہ قرار دینا اکبر کے ساتھ ناانصافی ہوگی اکبر کے زمانے میں مغربی سیلاب نیا نیا تھا نئے سیلاب میں شدت ہوتی ہے، طاقت ہوتی ہے، زور ہوتا ہے، اچھے اچھوں کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ یہی حال اس وقت بھی ہوا سلطنت کے نقصان اور تعلیم کے فقدان نے یہ امر ذہن نشین کر دیا تھا کہ ہماری نجات اسی میں ہے کہ ہم زندگی کے ہر شعبہ میں مغرب کی پیروی شروع کر دیں مغربی معاشرت اور تمدن کا غائر نظر سے مطالعہ کسی نے نہیں کیا غلام قوم کے قوائے ذہنی مفلوج ہو جاتے ہیں وہ اچھے اور برے میں تمیز نہیں کر سکتی خوب و زشت میں امتیاز نہیں کر سکتی اقبال کے الفاظ میں:

بھروسہ کر نہیں سکتے غلامی کی بصیرت پر ۔۔۔ کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا

فاتح کا ہر عیب مفتوح کی نظر میں حسن بن جاتا ہے اس کے علاوہ دور سے چمکنے والی چیز سونا ہی نظر آتی ہے۔ آقاؤں کا ہر فعل غلاموں کے نزدیک قابل تقلید ہوتا ہے اس کے علاوہ مغربی معاشرت میں ظاہری چمک دمک کچھ ایسی تھی کہ یہاں کے لوگوں کی نظر خیرہ ہو کر رہ گئی غرضکہ ایسے ماحول میں جب ذہن مفلوج ہو گئے تھے اور نظریں خیرہ، اکبر نے تن تنہا مغربی ملیغار کو روکنے کی کوشش کی اکبر اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے حقیقت یہ ہے کہ یہ کام ایک شخص کے بس کا تھا بھی نہیں ایک اکبر تو کیا اگر دس اکبر بھی ہوتے تو اس سیلاب کو روک نہ سکتے میرا مقصد اس سے اکبر کی عظمت گھٹانا نہیں ہے۔ اکبر کی اتنی اہمیت تو مسلم ہے کہ ایسے وقت میں جبکہ ہمارے افکار و خیالات مغربی رنگ میں رنگے جا چکے تھے انھوں نے اپنے بے پناہ طنز و ظرافت کے بل بوتے مغربی سیلاب پر اتنی شدید اور کاری ضرب لگائی کہ علی گڑھ اور برطانوی سامراج دونوں کا بڑھتا ہوا اثر اور ترقی کرتی ہوئی طاقت تحس نحس ہو کر رہ گئی۔ علی گڑھ نے برطانوی قدروں کی حمایت کی تھی اور انھیں مسلمانوں میں عام کرنا چاہا تھا لیکن اکبر نے اس ڈھول کا پول کھول دیا اکبر کو اگر ہم حکیم نہیں کہہ سکتے تو نقاد ضرور کہہ سکتے ہیں۔ برطانوی عظمت کو منجملہ جن چیزوں سے دھکا پہنچا ہے ان سیاسی تحریکات کے بعد سب سے پہلے اکبر کا نام آتا ہے اکبر کا یہی کمال کیا کم ہے کہ اقبال کے لیے زمین ہموار کر دی اکبر کی عدم موجودگی میں اقبال کے کلام کا کیا حشر ہوتا یہ صرف تصور ہی کیا جاسکتا ہے بیان نہیں۔

اقبال کی کامیابی اور اکبر کی ناکامیابی کی ایک وجہ اور ہے۔ اکبر نے اپنے خیالات کے ابلاغ کے لیے جو وسیلہ اختیار کیا وہ طنز و ظرافت تھی۔

لطیف نازک اور پرمعنی ظرافت ہر شخص کے بس کی نہیں ہوتی اسی لیے اکبر کا کلام زیادہ تر قہقہوں میں اڑا دیا گیا اس معنویت کی طرف بہت کم لوگوں نے توجہ دی اکبر نے ہنسا کر رلانا چاہا وہ تبسم میں آنسوؤں کا پیغام لائے تھے لیکن عوام کی کم فہمی اسے صرف قہقہہ سمجھ کر رہ گئی یہ نہ دیکھا کہ اس قہقہے میں کتنا کرب کتنا سوز، کتنی بے چینی پوشیدہ ہے۔ اکبر نے حکومت کے خوف سے سرد موسم اور برفبار ہواؤں میں شاہد معنی کے لیے ظرافت کے لحاف کو ترجیح دی۔ طنز و ظرافت کا تعلق جہاں جذبات و حسیات سے ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ ذہن و دماغ سے ہوتا ہے اکبر نے متفرق اشعار کہے لیکن ذہن پر جب تک کوئی عمل مسلسل نہ ہو اثر نہیں ہو سکتا۔ اقبال کی کامیابی بڑی حد تک اکبر کی ناکامیابی کی رہینِ منت ہے اکبر ہی کا ایک شعر ہے:

اکبر کا نغمہ قوم کے حق میں مفید ہے ۔۔۔۔ دل کو تو گرم رکھتا ہے وہ بے سُرا سہی

یہ اقبال کی دانشمندی کا بہت بڑا ثبوت ہے کہ انھوں نے خودی کا ہتھیار اس وقت استعمال کیا جب مسلمانوں کے دل اکبر کے نغمے سے تازہ تازہ گرم تھے۔ اکبر اور اقبال کے مزاج میں کتنا فرق تھا یہ آپ ان دو شعروں سے معلوم کر سکتے ہیں:

اس میں برائی کیا تھی جو میں ۔۔۔۔ اچیلئے رسم دیرینہ رہا
آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا ۔۔۔۔ منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

اکبر تہذیب مغربی کی مخالفت کرتے رہے لیکن لوگوں نے اسے قبول کر ہی لیا۔

جلوۂ ساقی و مے جان لیے لیتے ہیں ۔۔۔۔ شیخ جی ضبط کریں ہم تو پیے لیتے ہیں

اکبر کی ناکامی کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ وہ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ مغرب کی ترقی لادینی، عریانی اور چنگ و رباب سے ہے یہ ان کے سطحی مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ اقبال کی کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے بتایا کہ:

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب ۔۔۔۔ نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب
محکمی او نہ از لادینی است ۔۔۔۔ نے فروغش از خطِ لاطینی است
قوتِ افرنگ از علم و فن است ۔۔۔۔ از ہمیں آتش چراغش روشن است

اکبر کی آنکھوں پر قدامت کی عینک تھی، قدامت پرست انسان تھوڑا بہت متعصب بھی ہوتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ دنیا کی تمام خوبیاں اور بھلائیاں اسی تہذیب معاشرت اور تمدن سے ہیں جس کا وہ پیرو ہے وہ تو کنویں کا مینڈک ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ بحر کی وسعتیں ایک لفظ مہمل ہے اکبر نے جو شعر شیخ جی کے بارے میں کہے تھے وہ ان پر بھی چسپاں ہوتے ہیں۔

حالِ دنیا سے بے خبر ہیں آپ ۔۔۔۔ گو تقدس مآب بیشک ہیں
شیخ جی پر یہ قول صادق ہے ۔۔۔۔ چاہِ زمزم کے آپ مینڈک ہیں

اقبال کے یہاں سب کچھ ملتا ہے لیکن تعصب نہیں ملتا وہ جانتے ہیں کہ مغرب باوجود اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اس قدر پست ہونے کے ہمیں بہت کچھ دے سکتا ہے اور وہ بہت کچھ ہے ندرت فکر و عمل

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ذوقِ انقلاب ۔۔۔۔ ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ملت کا شباب
ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی ۔۔۔۔ ندرتِ فکر و عمل سے سنگ خارا لعلِ ناب

شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد نے بھی قریب قریب یہی بات کہی تھی:

"اہل یورپ کی عظمت سلطنت نہیں ہے بلکہ ان کی عظمت ان علوم میں ہے جو جدید ایجاد ہوئے ہیں۔ اور ہوتے جاتے ہیں اور جن علوم کے ذریعے سے انھوں نے ریل اور تار برقی اور اسٹیمر اور ہزار ہا قسم کی کارآمد کلیں بنا ڈالی ہیں"

اکبر کی ناکامی کی ایک وجہ ان کی تعلیم کا منفی پہلو بھی ہے انھوں نے صرف یہ کہہ دیا کہ یہ راستہ جس پر تم گامزن ہو خطرناک ہے لیکن یہ نہ بتا سکے کہ یہ دوسرا راستہ بھی ہے جو تمہیں منزل مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔ اکبر نے انسانوں کو اور انسانوں کے سماج کو چھوئی موئی سے زیادہ نازک سمجھ لیا تھا کہ جہاں چھوا مرجھا گیا شاید وہ ارتقا کے قایل نہ تھے:

یا الٰہی یہ کیسے بندر ہیں　　　ارتقا پر بھی آدمی نہ ہوئے

شاید انھیں یہ احساس نہیں تھا کہ ع اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد۔ وہ سماج ہی کیا جس میں لچک نہ ہو بڑے سے بڑا درخت اگر آندھی کا مقابلہ کرے گا تو منہ کی کھائے گا۔ زندہ اور قائم وہی رہتا ہے جس میں جھکنے اور طوفان کو برداشت کرنے کی صلاحیت ہے ممکن ہے کہ مغربی سیلاب بھی ایک تاتاری فتنہ ثابت ہوتا۔ جس طرح اسلام تاتاریوں کے ہاتھوں تباہ حال ہوا اسی طرح اس نئے نرتی بھی انھیں کے بل بوتے پر کی۔

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے　　　پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اقبال کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ انھوں نے اسلام کو ٹھوس اور جامد نہیں قرار دیا بلکہ نامی اور حرکیاتی تصور کیا۔ اسی سلسلے میں سید سلیمان ندوی کے یہ الفاظ قابل توجہ ہیں۔

"پچاس برس کے تجربے نے یہ بتایا ہے کہ نئی روشنی کی بہترین شعاع وہ ہے جو جدید و قدیم تعلیم کی مثبت و منفی لہروں کے ملنے سے نکلتی ہے ان بجلیوں کو علیحدہ کر دیجیے تو نئی یا پرانی کوئی روشنی پیدا نہ ہوگی"

حالی کے یہاں مفاہمت ہے، اکبر کے یہاں احساسِ شکست ہے اور "لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو" کی صدائے بازگشت ہے، لیکن اقبال کے یہاں اعلان جنگ ہے اور یہی وجہ اکبر کی ناکامی اور اقبال کی کامیابی کی ہے، حالی اور سرسید کے یہاں اندھا دھند تقلید کرنے کا نعرہ ہے اور اکبر کے یہاں قدامت پسندی کی تلقین ہے۔ ظاہر ہے دونوں کے نقطۂ نظر انتہا پسند تھے۔ ان میں توازن کی ضرورت تھی، چناں چہ اقبال نے ہمیں ایسا پیغام دیا جس میں اعتدال اور توازن ہے مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کے یہاں سرسید حالی اور اکبر کی بہترین تعلیم ملتی ہے یعنی وہ تعلیم جس میں نہ انتہائی تعصب سے کام لیا گیا ہے نہ انتہائی عقیدت سے بلکہ ایک سوجھ بوجھ رکھنے والے کے غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ آپ خودی کے فلسفے کو کچھ دیر کے لیے نظر انداز کر دیجیے پھر دیکھیے کہ اقبال کے یہاں کیا رہ جاتا ہے یہی سرسید، حالی، اور اکبر کے خیالات کی صدائے بازگشت، وہی مشرقیت کو ہاتھ سے نہ جانے دو لیکن مغرب سے بھی جتنا حاصل کر سکو کرلو:

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر　　　فطرت کا تقاضا ہے کہ ہر شب کو سحر کر

شاعرِ مشرق

سعادت نظیر

یادِ ایام کہ مسموم تھی مشرق کی فضا
ہر سخنور کی صدا دیتی تھی پیغامِ قضا

شاعری نام تھا الفاظ کی صناعی کا
عام فقدان تھا مضمون کی رعنائی کا

نقشِ بے رنگ تھی اربابِ سخن کی محفل
لیلیٰ حکمت و معنی سے تھا خالی محمل

عقل و دانش پہ تھا اک خوابِ گراں سا طاری
بختِ خوابیدہ کہاں، اور کہاں بیداری

تو نے وہ بربطِ نو چھیڑ دیا، اے اقبال!
جس کے ہر سر میں ہے فطرت کا جمال و جلال

تیری آواز سے اقوام و ملل جاگ اٹھے
اک نئی شان سے جذباتِ عمل جاگ اٹھے

تیرے نغمات پہ اربابِ وطن جھوم اٹھے
جھوم اٹھے اہلِ نظر، اہلِ سخن جھوم اٹھے

گونج اٹھے تیرے ترانے کچھ اس انداز کے ساتھ
نطق مربوط ہو جیسے لبِ اعجاز کے ساتھ

تیری آواز ہے یا ٹوٹے ہوئے دل کی صدا
درد میں، سوز میں ہے ڈوبی ہوئی تیری نوا

اللہ اللہ! ترا اسلوبِ بیانِ گل کار!
نظر آنے لگے ویرانے میں آثارِ بہار

دردِ دل تھا جو تری سعیٔ خوش انجام کے ساتھ
جاگ اٹھا قوم کا اقبال ترے نام کے ساتھ

تیرے افکارِ جواں نے وہ مسیحائی کی
روح سی پھونک دی ہر جسم میں برنائی کی

تیری پرواز کی رفعت سے فلک ہیں پامال
پایۂ عرش کو چھوتے ہیں ترے فکر و خیال

فکر سے تیرے ملا شعر کو کچھ ایسا مقام
شاعری بن گئی اک حسنِ عمل کا پیغام

جس کے ہر شعر میں جادو ہے، وہ شاعر تو ہے
فلسفہ جس پہ ہے نازاں، وہ مفکر تو ہے

تیری لے میں ترے نغمات جو سن پاتے ہیں
ولولے عشق کے کچھ اور ابھر آتے ہیں

تیری باتوں سے ٹپکتا ہے خرد ساز فسوں
تیرا احساسِ خودی اور ترا ذوقِ جنوں

تو نے آئینۂ امروز میں فردا دیکھا
جو نہ اوروں کو نظر آیا وہ جلوا دیکھا

زندگی بخش حقائق ترے اشعار میں ہیں
اور عرفان کے نکتے تری گفتار میں ہیں

تیری ہر نظم میں ہے روشنی سیاروں کی
تیرے ہر گیت میں خوشبو ہے چمن زاروں کی

جو درخشاں نہیں گردوں پہ، وہ خورشید نہیں
تو وہ شاعر نہیں، جو زندۂ جاوید نہیں

ایڈیٹر پبلشر نے ناظم پریس میں چھپوا کر دفتر نگار کھیر سخی رام پور یوپی سے شایع کیا

EGD. NO. A—466
42ND YEAR OF PUBLICATION
IGAR, URDU MONTHLY, RAMPUR U.P.
OCTOBER 1963
EGISTERED WITH THE REGISTRAR OF NEWSPAPERS AT R.N. NO. 2136/57

قیمت { فی پرچہ ۷۵ نئے پیسے
سالانہ دس روپے

بغیر عنوان کے

احمد جمال پاشا (لکھنؤ)

نگار کے لیے پانچ خریداروں کے چندے جلد ہی بھجوا رہا ہوں۔

ذکیہ جیلانی (علیگڑھ)

کچھ پتے لکھ رہی ہوں ان کو میرے حوالے سے ایک سال کے چندے میں نگار وی۔پی سے بھیج دیں۔ خود میرا چندہ یقینی ہے۔

شفقت فاطمہ (سیتاپور)

دو سالانہ خریداروں کے پتے بھیجے جاتے ہیں۔ ان کو وی پی کر دیجیے۔ میں نے پہلے گفتگو میں طے کر لیا ہے۔ اطمینان رکھیں۔

عطا محمد شعلہ (بنارس)

اپنا چندہ مبلغ دس روپے حاضر ہے۔ دو خریداروں کے پتے علیحدہ ایک خط کے ذریعے بھیج رہا ہوں، ان کے نام وی پی نگار جلد سے جلد۔ آئندہ بھی کوشش جاری رکھوں گا۔

(منی آرڈر کوپن سے)

ڈاکٹر محمود الٰہی (گورکھپور)

......میں خود بھی نگار کا چندہ جلد ہی بھیجوں گا۔ امید ہے کہ آپ برا نہ مانیں گے۔ اگر ہم لوگ بھی خریدار نہیں بنیں گے تو کون بنے گا۔

نقی احمد ارشاد (ڈمکا سنتھال)

اس پہاڑی اور قبائلی علاقے میں بھی مقامی ایجنٹ اس نادر اردو رسالے کو پہنچا دیتا ہے۔ جہاں اردو لکھنے والے تو درکنار بولنے والے بھی بہت کم ہیں۔

آئندہ سے میں نگار کا مستقل خریدار بن جاؤں گا۔

رزاق فاروقی (حیدرآباد دکن)

حسب وعدہ آپ کے نگار کو میں خریدار دے رہا ہوں۔ چھٹیاں ختم ہو جائیں تو کالج کا چندہ بھی پہنچ جائے گا۔ جن خریداروں کے پتے دیتے ہیں ان سے بھی توسیع اشاعت کے لیے کہا ہے اور یہ یقین ہے کہ یہ لوگ بھی نگار کو نئے خریدار دلائیں گے۔ اگر یہ سلسلہ چلتا رہے تو بہت خوب ہو

چھیڑ غالب سے چلی جائے
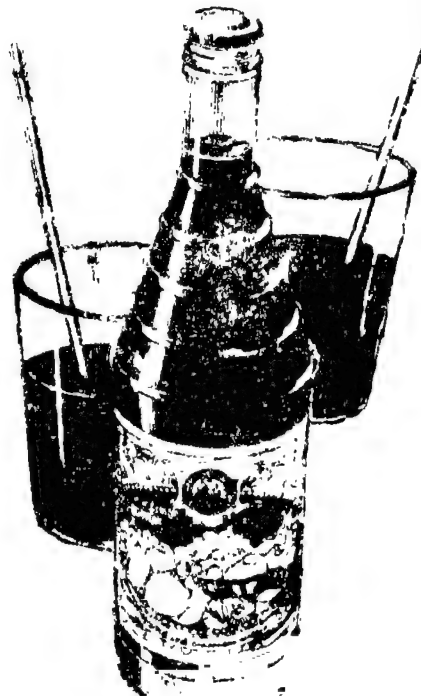
مولانا حالی نے غالب کو حیوان ظریف بتایا ہے۔ غالب کے خطوط میں خصوصیت سے جگہ جگہ یہ وصف نمایاں ہوتا ہے۔ مرزا غالب کو عام لوگوں تک پہنچانے میں ان کی زندگی کی رنگارنگی اور بوقلمونی بڑا اسہارا بن سکتی ہے۔ بہت سے لوگوں نے غالب کی زندگی کو ان کے کلام اور خطوط کی مدد سے ڈرامائی اور مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ غالب کے بارے میں بہت سے ریڈیو فیچر بھی ملتے ہیں۔ ایسے ڈراموں، فیچروں اور مزاحیہ مضامین کا ایک انتخاب اس کتاب کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ غالب کی ہفت پہلو شخصیت کو جتنی عمدگی کے ساتھ ان تحریروں میں سمویا گیا ہے وہ پڑھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ ان تحریروں کے مصنف ہی خود اعلیٰ معیار کے ضامن ہیں۔ کسی ادبی شخصیت کو اتنے دلچسپ انداز میں پیش کرنے والی یہ اردو زبان کی اکلوتی کتاب ہے۔

چند لکھنے والے:

ڈاکٹر محمد دین تاثیر، حمید احمد خاں، پروفیسر آل احمد سرور، سید وقار عظیم، شوکت تھانوی، ڈاکٹر محمد اشرف، ہری چند اختر، حمیدہ سلطان، سراج احمد علوی، کنھیا لال کپور، فیاض عالم، حاجی لق لق۔ اور دوسرے

قیمت ——— ۵ روپے

نگار بک ایجنسی رامپور

نگار

اسسٹنٹ ایڈیٹر: اکبر علی خاں

ضروری اعلان:
پاکستانی خریدار نگار کا سالانہ چندہ اس پتہ پر بھیجدیں
رسالہ جاری کردیا جائیگا
نمائندہ نگار ۶۱۷ این سمن آباد لاہور

جلد ۴۲ | فہرست مضامین مئی ۱۹۶۳ء | شمارہ ۵

ملاحظات ۳ ــ ۴
اردو ڈراما ــ حال اور مستقبل (ڈاکٹر عبدالعلیم نامی) ۵ ــ ۷
حسرت کی رومانیت (سعادت نظیر ایم اے) ۸ ــ ۱۱
ذوق ــ ایک مطالعہ (محمد انصار اللہ نظر) ۱۲ ــ ۲۰
سنہ انیس سو باسٹھ کا بہترین طنزیہ مزاحیہ ادب (احمد جمال پاشا) ۲۱ ــ ۲۴
منظومات (مخمور سعیدی، مولوی محمد افضل) ۲۵
باب الانتقاد (جذبات نادر ترقی اردو بورڈ ایڈیشن پر ایک نظر) (رشید حسن خاں) ۲۶ ــ ۴۷

ملاحظات

خدا مغفرت کرے، شوکت تھانوی چل بسے۔ خبر بڑی اچانک سی تھی۔ وہ دن قاضی جی کی حیثیت سے ان کی حاضری کا تھا کہ ریڈیو نے قاضی عبدالغفور المتخلص بہ مدفن کے مدفون ہونے کی خبر سنائی۔ دل کو ایک دھچکا لگا۔ کون سوچ سکتا تھا کہ جس کا کام ہنسنا ہنسانا تھا وہ رلا دے گا۔ کم لوگوں کو اتنی مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ قلم کے ساتھ ساتھ آواز، حرکات و سکنات پر جس بے پناہ قدرت کے وہ مالک تھے کہا جا سکتا ہے کہ وہ پیدائشی فنکار رہتے اور ظاہر ہے کہ فنکاری کا یہ درجہ کتنا ممتاز ہے۔

دو ایک بار ان سے ملاقات ہوئی تھی پہلی بار طفیل صاحب کے یہاں دفتر "نقوش" میں تانگے سے اترتے ہوئے میں نے دیکھا اور بغیر کسی دقت کے پہچان لیا۔ جیسے وہ خود بول رہے ہوں کہ میں شوکت تھانوی ہوں۔ بڑے مضطرب سے معلوم ہو رہے تھے۔ طفیل صاحب سے اپنی کتابوں کی ایک ایک جلد لی۔ شاید انگلستان کسی ادبی وفد کے ساتھ جا رہے تھے اور جلدی میں تھے مگر لطیفوں سے غافل نہ تھے۔ پھر ایک بار لاہور ریڈیو اسٹیشن پر ان سے ملاقات ہوئی۔ بڑی محبت سے ملے اور اپنی دو کتابیں دیں۔ بار خاطر اور قاعدہ بے قاعدہ آخری کتاب دیتے ہوئے کہنے لگے کہ میں خود ہی بے قاعدہ ہوں کہ آپ جیسے باقاعدہ نوجواں کو قاعدہ پڑھا رہا ہوں۔ نہ صرف لفظوں کے بازی گر نہیں تھے۔ لفظوں سے اپنا الگ ماحول تخلیق کرتے تھے۔ اپنے نمایاں کرداروں کے ساتھ لکھنوی تہذیب کی اتنی پر لطف نمائندگی اب کسی سے کاہے کو ہوگی۔

ان کی بہت سی تحریریں اخباروں میں چھپ کر رہ جائیں گی۔ طفیل صاحب ہی یہ کام کر سکتے ہیں کہ اخباروں کے اوراق سے نکال کر

ان سب کو ایک اچھے انتخاب کی شکل میں شائع کر دیں۔ اُن کے ورثہ کو بھی اس سے ایک گونہ مگر بروقت تسکین کا سامان بہم پہنچ گا۔

اگر آج ہندوستان و پاکستان دونوں ملکوں میں کتابوں کی آزادانہ خرید و فروخت ہوتی تو شوکت تھانوی جیسے کتنے ہی ہندوستانی پاکستانی مصنفوں کے حقوق محفوظ رہتے اور ان کے اہل و عیال پر آئی ہوئی مصیبت اتنی سخت نہ رہتی جتنی موجودہ صورت میں بن جاتی ہے۔ سنا تھا کہ انجمن مصنفین پاکستان سلسلہ جنبانی کر رہی ہے مگر شاید وہ بھی سپر انداز ہو گئی۔ اور یہ اہم ترین معاملہ جو کتنی ہی بد عملیوں کا سد باب ہو سکتا تھا لیت و لعل میں پڑا ہوا ہے ہندوستانی ادیبوں کو چاہیے کہ وہ بھی اس حق کے لیے آواز اٹھائیں۔ اس ملک کا تو وزیر اعظم بھی مصنف ہے۔ اس سے زیادہ اس "امت" کے حقوق کو کون جانے اور سمجھے گا۔ شوکت تھانوی کی موت نے مصنفوں کے جائز حقوق کی یاد دلائی ہے تو انھیں یہ حق ملنے بھی چاہئیں۔ کیا کتابوں اور رسالوں کی تجارت سے زیادہ بے ضرر تجارت ان دونوں ملکوں کے درمیان کچھ اور بھی ہو سکتی ہے؟ اور کیا اس تجارت سے زیادہ مبارک کوئی اور تجارت بھی ہے جس سے عقل و علم کی دنیا میں روشنی اور عمل کی دنیا میں نمایاں آئے۔

کشمیر کے مذاکرات ختم ہو گئے بغیر کسی نتیجے تک پہنچے ہوئے۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی کہ کیوں دونوں ہمسایہ ملکوں کے تعلقات شستہ اور شائستہ ہو جاتے۔ لاکھوں انسان ادھر اور ادھر دونوں طرف آنے جانے کی پابندیوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ اعزا اور اقارب کہاں ہیں اور خود کہاں، کتنے دوست بچھڑے کتنے اپنے دیکھتے دیکھتے اس حد بندی کے پار ان سے کٹ گئے۔ ایسے قریب کے پڑوسی کب تک الگ تھلگ رہیں گے یا رہ سکیں گے۔

وصل و فراق کی یہ کیفیت اور امید و بیم کا یہ سلسلہ دیکھیے کب ٹوٹتا ہے اور وہ ساعت کب آتی ہے کہ فرط مسرت سے ان کی آنکھیں اشک بار گلے رندھے ہوئے اور دل کی دھڑکنوں میں انبساط فراواں کے نغمے مچلتے ہوں۔ وہ بھائی ۔۔۔ مہندر پال۔

جنوری میں نگار کے خاص نمبروں کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ سب سے پہلے ذاکر حسین نمبر کی تیاری کرنی ہے یوں تو ادارہ نگار فرداً فرداً بھی تعاون کی درخواست کرے گا مگر ضروری نہیں کہ سارے متعلقہ حضرات تک پہنچ ہو سکے۔ اس میں بہت سی دشواریاں ہوتی ہیں بعض اوقات صحیح پتے نہیں معلوم ہوتے۔ اس لیے جو نگار دوست اس نمبر کی تیاری میں کوئی بھی مدد دے سکتے ہوں وہ اس سے گریز نہ فرمائیں اور اس بات کا بھی انتظار نہ کریں کہ براہ راست انہیں لکھا ہی جائے۔ اس انداز کے کاموں میں سرگشتہ خمار رسوم و قیود نہیں رہنا چاہیے۔

جامعہ ملیہ دہلی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور حیدر آباد میں ذاکر صاحب کے دوستوں عقیدت مندوں اور شاگردوں کے حلقے آباد ہیں۔ یہ حضرات توجہ کریں اور ذاکر صاحب کی شخصیت ان کے تعلیمی کارناموں پر لکھیں۔ ذاکر صاحب کے خطبات و پیغامات اور خطوط وغیرہ کو روداروں اور رسائل و اخبارات کے صفحوں سے جمع کریں۔ ذاتی طور پر ان میں سے جو کچھ بھی جس کسی کے پاس ہو وہ اسے ملک و قوم کی امانت سمجھتے ہوئے ادارہ نگار تک پہنچائے تو یہ نمبر ایک اہم دستاویز بن جائے گا اور اس طرح ادب و انشا کے شہ پاروں کے ساتھ ہندوستان میں تعلیم و تعلم کے ایک اہم تجرباتی دور کی تاریخ بھی سمٹ آئے گی ـــــــ

جذبات نادر کے ترقی اردو بورڈ ایڈیشن پر برادرم رشید حسن خاں نے حسب عادت بڑی محنت سے تبصرہ کیا ہے۔ ترتیب کا کام جتنا آسان سمجھا جاتا ہے دراصل اتنا آسان ہے نہیں۔ اس کے اپنے کچھ مطالبات ہیں۔ اگر ان کو پورا نہ کیا جائے تو نولکشوری عہد کی کتابوں اور موجودہ دور کی مطبوعات میں کیا فرق ہو گا۔ یہ تقاضے ایسی صورت میں اور بھی سخت ہو جاتے ہیں جبکہ کتاب پہلے سے مطبوعہ شکل میں موجود ہو اور مرتب کرنے والے کا یہ دعویٰ بھی ہو کہ اس نے ایڈیٹنگ کے ذریعے زیادہ مکمل شکل دینے کی کوشش کی ہے ـــــــ اردو میں ایڈیٹنگ کا معیار کیوں بلند نہیں ہوتا۔ یہ مسئلہ بھی غور طلب ہے۔ اس کے وجوہ بہت سے ہیں جس میں مرتب اور ناشر اور ان دونوں کے ساتھ اہل علم کا بھی کچھ شامل ہے آئندہ اس پر تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔

اردو ڈراما — حال اور مستقبل

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی

اردو ڈراما عہد جدید کی پیداوار ہے اور اس کے لیے ہم پرتگیز کا جس قدر احسان مانیں کم ہے۔ مغربی اقوام میں پرتگیز ہراول دستے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ من حیثیت القوم سب سے پہلے لوگ ہیں جو نامعلوم راستوں کو عبور کرتے ہوئے ساحل ہند تک پہنچے اور صرف بارہ سال کی کوشش سے نہ صرف گوا پر قابض ہو گئے۔ بلکہ اس کے ذریعے ایک وسیع علاقے کے حاکم بن گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں بہمنی حکومت کے زوال پر احمد نگر، بیجاپور، گولکنڈہ، بیدر اور برار کی مسلم حکومتیں قائم ہو چکی تھیں، اردو اپنی ابتدائی منزلیں طے کر کے عدالتی زبان بنتی جا رہی تھی۔ سلاطین دکن نہ صرف علم و ادب کے سرپرست ہی تھے بلکہ خود بھی سخن سنجی اور سخن فہمی کا خاصا ذوق رکھتے تھے۔

یہ رومنۃ الکبریٰ کے بھی عروج کا زمانہ تھا۔ اسپین کی عظمت ایک کیتھولک ملک کی حیثیت سے مسلمہ تھی اس لیے اسقف اعظم کے اشاروں پر چلنے والی حکومتیں فوجی دستوں کے ساتھ ساتھ مبلغین کے دستے بھی روانہ کرتی تھیں جو ”جاہل اور بت پرستوں“ کو ”خداوند یسوع مسیح“ کا درس دیتی اور ”آسمانی روشنی“ سے ان کے دلوں کو منور کرتی تھیں۔

گوا کو مرکزی حیثیت ملتے ہی مبلغین تثلیث نے اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ چونکہ اردو عوامی زبان بن چکی تھی اس لیے پرتگیز نے اسی کو تبلیغ تثلیث کا ذریعہ بنایا اور شہر شہر گاؤں گاؤں قریہ قریہ پھر کر نہ صرف نقشہ بردوں کے ذریعے حضرت عیسیٰ کے پیغام کو پہنچایا بلکہ ان کی زندگی کے حالات بھی اسٹیج پر پیش کیے۔ یہیں سے اردو ڈرامے کی ابتدا ہوتی ہے۔

اگرچہ اب تک اردو کے ابتدائی دور پر تحقیق کرنے والوں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی ہے اور ہم یہ نہیں معلوم کر سکتے ہیں کہ پرتگالیوں نے اپنے دور میں کس قدر مدارس اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے قائم کیے۔ نصاب کس قسم کا تھا۔ درسی کتابیں کس نے لکھیں اور کب لکھی گئیں اور کیا مابعد زمانہ میں وہ شائع ہوئیں یا نہیں پرتگیز مدارس کے مدرسین ہندوستانی تھے یا سب غیر ملکی، اردو اور فارسی کے علاوہ کس کی اور کونسی زبانیں ان مدارس میں پڑھائی جاتی تھیں۔ اگر ان سوالات کا جواب ہم کو مل جائے تو نہ صرف اردو ڈراموں کی ابتدائی تاریخ کا پتہ چل جاتا ہے بلکہ تاریخ ادب اردو کے ابتدائی دور کی ترتیب و تدوین میں جو دشواریاں پیش آ رہی ہیں وہ بھی دور ہو جائیں گی۔ ہمیں امید ہے کہ وہ وقت جلد آئے گا جب اردو ادب کے محققین اس کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں گے۔

پرتگالیوں کی خوش قسمتی سے مغلیہ حکومت کا آفتاب طلوع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اکبر نے فتوحات دکن کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس لیے مبلغین تثلیث کے ہاتھ ایک نیا میدان آیا اور انھوں نے دہلی اور آگرہ میں بھی تثلیث کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ اکبر اور جہانگیر کی سرپرستی اور مسلم اراکین دولت مغلیہ کی ہمت افزائی نے ان کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا اور وہ پنجاب اور کشمیر سے آگے بڑھ کر تبت تک جا پہنچے۔ پرتگیز مبلغین کو اس داد و دہش سے کچھ فائدہ پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو۔ ہم کو البتہ یہ معلوم ہو گیا کہ تبت میں بھی اردو سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ یہ تبلیغی سلسلہ کم و بیش ایک صدی تک جاری رہا۔ بعدہٗ انقلاب زمانہ نے پرتگالیوں کو بیک بینی و دوگوش ہندوستان سے رخصت کر دیا۔ ان کی جگہ پہلے ڈچ، پھر فرانسیسی اور بعد میں انگریزوں نے لی۔

ابھی تک ہم یہ نہیں معلوم کر سکے ہیں کہ ڈچ اور فرانسیسیوں نے اردو زبان و ادب کی کیا خدمت کی لہٰذا ہم اس عبوری دور سے گزرتے ہوئے ۱۷۵۰ء پہنچتے ہیں جب کہ انگریزی کا پہلا اسٹیج ہندوستان میں قائم ہوتا ہے۔ اس کا نام ”بمبے تھیٹر“ تھا اور بمبے گرین ”بمبے“ میں تعمیر ہوا تھا یہ اسٹیج ۱۸۳۶ء تک قائم رہا۔ بعد کو قرض خواہوں کی نذر ہو گیا۔ دس سال کی کوشش اور جدوجہد کے بعد ایک دوسرا انگریزی اسٹیج ۱۸۴۶ء میں تعمیر ہوا۔ اس کا سرکاری نام اگرچہ ”بمبے تھیٹر“ تھا لیکن وہ ”گرانٹ روڈ تھیٹر“ ”رانی کا تھیٹر“ اور ”شنکر سیٹھ کا تھیٹر“ بھی کہلاتا تھا۔ اس میں ۱۸۵۳ء تک صرف انگریزی ڈرامے دکھلائے جاتے تھے۔ سال مذکور میں

بمبئی تھیٹر کی مجلس منتظمہ کے ایک اہم رکن جگن ناتھ شنکر سیٹھ نے بمبئی کی اجازت سے اس میں مرہٹی ڈرامے دکھلائے کیونکہ مرہٹی شنکر سیٹھ کی مادری زبان تھی لیکن مرہٹے چونکہ اوسطاً غریب تھے اس لیے مسلسل نقصانات کے پیش نظر مرہٹی کے بجائے ہندوستانی یا اردو میں ڈرامے دکھلانے شروع کیے۔ چونکہ انگریز اردو زبان سے واقف تھے جو ان کو بطور زبان خاص ایسٹ انڈیا کالج لندن اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں سکھلائی گئی تھی اس لئے انھوں نے اردو ڈراموں کو خوش آمدید کہا اور پہلا ڈراما "راجہ گوپی چند اور جلندھر" جو ۲۶ نومبر کو دکھلایا گیا تھا دیکھنے کیلئے گورنر بہ اجلاس کونسل کمانڈر انچیف اور دوسرے سول اور ملٹری عہدیداران سرکاری تشریف لائے۔

یاد رہے کہ "راجہ گوپی چند اور جلندھر" ۱۸۵۳ء میں دکھلایا گیا۔ گورنر اور کمانڈر انچیف کی موجودگی میں پیش کیا گیا ایک ایسے اسٹیج پر پیش کیا گیا جو لندن کے رائل تھیٹر ڈروری لین کے نمونے پر تیار کیا گیا تھا اور انگریز جسے "آورنٹل ڈروری" کہتے تھے اور جس کا مکمل ریکارڈ ابھی حکومت مہاراشٹر کے آرکیوز میں محفوظ ہے۔ پھر بھی بعض لوگ "رہس" کو "ڈرامہ" کے جامے میں پیش کر کے اندر سبھا کو اردو کا پہلا ڈراما قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ تواریخی شواہد کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ واجد علی شاہ کے عہد تک لکھنؤ میں کوئی اسٹیج ہی نہ تھا۔ نہ پرتگیز نے تعمیر کیا تھا۔ نہ ڈچ اور فرانسیسیوں نے اور نہ کبھی انگریزوں نے اس کی تعمیر کا خیال ظاہر کیا تھا اس لئے اگر نوٹنکی۔ رام لیلا اور رہس وغیرہ کو ناٹک کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ معمولی عقل کا انسان بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ جب اسٹیج ہی موجود نہ ہو ـــ واجد علی شاہ جلیل القدر حکمراں نے ماڈرن اسٹیج ہی نہ دیکھا ہو اور امانت جیسے مصنف کو خواب میں بھی کبھی نظر نہ آیا ہو تو واجد علی شاہ کے رہس اور امانت کا رہس کس طرح ڈرامے کی حیثیت اختیار کر سکتے ہیں۔

اردو ڈرامہ کا مقدمہ کچھ طویل ہو گیا۔ آئیے اب ہم اردو ڈرامہ کی طرف متوجہ ہوں۔ اردو ڈرامہ پانچ ادوار پر تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا دور ڈاکٹر بھاؤ داجی لاڈ سے شروع ہو کر نرمدا شنکر پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور کے لکھنے والے تقریباً سب پارسی تھے الا سوکر بالوجی ٹیلوکیکر کے جو ایک مرہٹہ تھا اور نرمدا شنکر کے جو گجرات کا باشندہ تھا۔ پارسی ڈراما نویسوں میں افضلیت کا شرف خان صاحب شہزادان مہروان جی آرام کو حاصل ہے جنھوں نے گل باصنوبر کرد۔ ہیرا۔ چندراوتی۔ حاتم طائی۔ باغ بہار۔ لیلیٰ مجنوں۔ عالمگیر۔ گوپی چند۔ جوان بخت۔ گل بکاؤلی۔ نورجہاں بہرام اور شیریں نامی ڈرامے اور ایک درجن کے قریب اوپرا یعنی منظوم ڈرامے لکھے۔ اس کے بعد ایدل جی بھائی۔ بندہ خدا۔ ڈاکٹر پارکھ ہرانڈ صیلیا۔ فرامرز۔ کابراجی کھوری اور جہانگیر پٹیل کا نمبر آتا ہے۔ جنھوں نے خوسترو شیریں۔ پاکدامن گلنار۔ بھولی گل دورنگی دنیا۔ رستم و سہراب۔ جمشید۔ شاہ زادہ شیاوکس۔ خداداد قمرالزماں ظالم تہ در۔ ستمگر۔ عالمگیر۔ پاکدامن پردین وغیرہ لکھے۔ اس دور کے ڈرامے عموماً گجراتی زبان میں لکھے اور اردو میں ترجمہ کیے جاتے تھے۔ آرام کے متعلق پتہ چلا ہے کہ وہ اردو فارسی سے واقف تھے اور براہ راست اردو میں لکھا کرتے تھے۔

دوسرا دور احمد حسین خاں سے شروع ہو کر بابو ہریش چند پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور کے بیشتر ڈرامہ نویسوں نے اپنے ڈراموں کی زبان کے لیے اردو کا استعمال کیا ہے یہاں سے واضح طور پر اردو کی مقبولیت کا ثبوت ملتا ہے۔ لکھنے والوں میں افسوں مرادآبادی۔ امراؤ علی لکھنوی۔ بالو بالیشور پرشاد۔ بزرگ لاہوری۔ حسین خاں بلبل۔ دعلیت رائے ہکیں۔ نظیر محمد تیغ۔ سید سجاد حسین جوہر بنارسی۔ میاں چراغ الدین چراغ۔ لالہ چندن لال۔ محمد الف خاں حباب فتح پوری۔ درگا پرشاد۔ دینا ناتھ فتح آبادی وغیرہ قابل ذکر ہیں اور ان کے ڈراموں میں خوش رحسینا۔ نازاں۔ رزم بزم۔ طلسم عشق۔ جہد جابر۔ ساحر سبھا۔ سحر سامری عشرت سبھا۔ طلسمات سلیمانی۔ اکسیر اعظم۔ دلبر دلشیر۔ انجام الفت۔ ہماماخذ العصمت کا ڈاکو شرارہ عشق۔ حسن کنور سین۔ مار آستین وغیرہ قابل ستائش ہیں۔ اسی دور کے دیگر ڈراما نویسوں میں رونق بنارسی۔ سجاد دہلوی۔ کدار ناتھ صورت۔ ونائک پرشاد۔ غلام حسین ظریف۔ سید میر عباس علی۔ حافظ محمد عبداللہ۔ عبدالوحید قیس۔ پنڈت بنواری لعل عطا شمس آبادی۔ غلام قادر فصیح۔ مراد بریلوی۔ نظیر اکبرآبادی اور نظامی سیلپوری نے کافی شہرت پائی۔

اردو ڈرامہ کا تیسرا دور احسن لکھنوی سے شروع ہو کر یعقوب علی پر ختم ہوتا ہے۔ چونکہ یہ دور اردو ادب کا عہد زریں کہلاتا ہے۔ اس لیے ڈراما نویسوں اور ان کی تصانیف کی تشریح ضروری سمجھی گئی ہے۔

احسن لکھنوی: کے دس ڈراموں میں چندراولی۔ خون ناحق۔ بزم فانی۔ الفردس۔ بھول بھلیاں۔ چلتا پرزہ۔ شریف بدمعاش کافی مشہور ہوئے۔

آرزو لکھنوی :۔ کے دس ڈراموں میں متوالی جوگن اور حسن کی چنگاری سے شہرت پائی۔

بیتاب دہلوی :۔ کے ۱۲ ڈراموں میں کرشن اوتار۔ کسوٹی۔ میٹھا زہر۔ زہری سانپ۔ امرت۔ مہابھارت۔ رامائن۔ اور کرشن سداما اسٹیج پر مقبول ہوئے

حشر کاشمیری :۔ کے ۳۲ ڈراموں میں اسیر حرص۔ شہید ناز۔ صید ہوس۔ خواب ہستی۔ خوبصورت بلا۔ یہودی کی لڑکی۔ بلوا منگل بھگیرت گنگا۔ ہندوستان، ترکی حور۔ سیتا بن باس۔ دھرمی بالک۔ بھارتی بالک۔ دل کی پیاس اور رستم و سہراب نے نام پیدا کیا۔

دیوانہ امرتسری :۔ کے کئی درجن ڈراموں میں تائید یزدانی۔ مہاراجیہ۔ آفتاب۔ اجودھیا۔ پرستان کافی مقبول ہوئے۔

ذائق لکھنوی :۔ کے ۱۴ ڈراموں میں نور عرب۔ تاج نوراں　ستی ساوتری۔ زہر کی انگوٹھی۔ فخر عرب۔ دھرم یوگی۔ کٹورہ بھر خون نے شہرت پائی۔

رحمت علی :۔ کے نصف درجن ڈراموں میں دردِ جگر۔ باوفا قاتل۔ جلاد عاشق مشہور ہوئے۔

عباس علی :۔ کے ۱۳ ڈراموں میں۔ نیرنگ ستمگر۔ جہاں آرا۔ جاں نثار۔ نور اسلام۔ پنجاب میل۔ شریمتی منجری، موہنی بی اے۔ لیڈی لاجونتی پورن مل۔ ستی سندری نے عزت پائی۔

محشر انبالوی :۔ کے ۱۹ ڈراموں میں دشمن ایمان۔ جوش توحید۔ دو رنگی حور۔ خون جگر۔ سنہری خنجر۔ شکنتلا۔ خود پرست کافی مشہور ہوئے۔

مراد لکھنوی اشتر لکھنوی اور مراد لکھنوی کے ڈراموں نے بھی کافی شہرت پائی۔

اردو ڈرامہ کا چوتھا دور آرزو بدایونی سے شروع ہو کر بیتاب پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور کے لکھنے والوں میں آرزو بدایونی۔ آصف مدراسی۔ اعظم حیدرآبادی۔ افسوں شاہجہانپوری۔ دل لکھنوی۔ راحت مرادآبادی۔ رادھے شیام۔ رندھیر۔ شمس گیاوی۔ اور شمس لکھنوی نے نام پیدا کیا۔

اس کے بعد جب اردو ڈراما اپنے پانچویں دور میں داخل ہوتا ہے تو کم از کم اپنی تکنیک ختم کر چکا ہے۔ اس دور کے لکھنے والوں میں وہ لوگ شامل ہے جو صرف مطالعہ کے لیے ڈرامے لکھتے ہیں۔

اگرچہ اردو ڈراما آج ختم ہو چکا ہے اور اسٹیج کم و بیش مردہ تصور کیا جاتا ہے لیکن حالات بتلاتے ہیں کہ وہ زمانہ دور نہیں ہے جب اردو اسٹیج دوبارہ اپنی سابقہ عظمت حاصل کرے گا۔

آج ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ عوام کو ڈرامے کے صحیح فن سے روشناس کرایا جائے تاکہ وہ اپنے ڈراما نویسوں اور ان کے پیش کردہ ادب کو پہچان سکیں۔ آج دنیا کا ہر ملک اپنے ڈراما نویسوں پر فخر کرتا اور نظم میں ڈرامے کو سب سے بلند مقام دیتا ہے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو یہ معلوم کر کے تعجب نہ ہوگا کہ شکسپیئر۔ شاد۔ ابسن۔ گوئٹے۔ شلر اور گالسورذی کا درجہ اپنے ملک کے دوسرے ادیبوں پر بھاری ہے۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اردو اسٹیج اور ڈرامہ کا مستقبل شاندار ہے اور ہمارا نوجوان طبقہ اس میں دلچسپی لے کر اس کو اس کے صحیح مقام پر جلد یا بدیر پہنچا دے گا۔

حسرت کی رومانیت

سعادت نظیر ایم، اے

انسانی نفسیات کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا اتھاہ سمندر ہے جس میں چھوٹی بڑی طرح طرح کی وقت بے وقت ذرا ذرا سے تغیر سے ان گنت کیفیات کی موجیں جو احساسات و جذبات کے امتزاج کا نتیجہ ہیں، پیدا ہوتی ہیں، جن کا مکمل نفسیاتی تجزیہ قریب قریب ناممکن ہے، انہی کیفیات میں رومانیت بھی ایک ممتاز کیفیت ہے، جو مختلف اور متعدد عناصر سے مرکب ہے جس کی فضا میں عقل و شعور کے اجزا بہت کم پائے جاتے ہیں۔ البتہ ماضی پرستی، تجسس، مرکز گریزی، جذبات کا ہجوم، احساس و وجدان پر اعتماد، تخیل کی خود کفالتی، ولولۂ مہم جوئی اور انقلابِ حیات کا جوش داخلی طور پر محسوس ہوتا ہے تو صحت و صفائی اور بیان کی وضاحت و تشریح سے زیادہ موسیقیت، اشاریت اور معنی و مفہوم کی تہیں اور ان کی وسعتیں بھی خارجی حیثیت سے ملتی ہیں۔ غرض رومانیت بھی ایک عجیب کیفیت کا نام ہے جو دل میں ایک عجیب و غریب اضطراب سا پیدا کر دیتی ہے جس کی تسکین کے لیے فطری طور پر خارجی ماحول میں دلبستگی و دل آویزی کی جستجو، جاذبِ نگاہ مناظر کی تلاش، ہم خیالی کا تجسس، یکدلی، یک جہتی، اور ہم آہنگی کی تمنا ہوتی ہے اور یہ سب کچھ یقینی سامانی کے ساتھ حسینوں کے ارتباط یا تذکرۂ حسن میں محسوس ہوتا ہے۔ یہی کیفیت ترقی کرتے کرتے عشق و محبت کا روپ دھار لیتی ہے اور رفتہ رفتہ ہر شعبۂ نفسیات پر چھا جاتی ہے، رومانیت کا یہی بدلا ہوا روپ شعر و شاعری کی تخلیق کا نقطۂ آغاز ہے، جیسے جیسے شاعر کو حسن کا گہرا احساس ہوتا ہے، ویسے ویسے وہ نامعلوم طور پر عام سطح سے بلند ہو کر نہ صرف حسن کے جلوؤں کو مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے اور اس کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہی ہوتا ہے بلکہ اپنے اس خصوصی احساس کو مترنم آہنگ کے ساتھ زبان و بیان کا خوش وضع لباس بھی عطا کرتا ہے، احساس کی اس پیش کش میں عموماً شاعر کی طبعی افتاد، علمی صلاحیت، عہد گزشتہ کے واقعات، ماحول کے اثرات اور اشارتی انداز خاص لحاظ حد تک دخیل ہوتے ہیں اور یہ چیزیں اگر مناسب حیثیت سے مددومعاون ہوں تو یہی رومانیت اس کو ایک معیاری مقام پر پہنچا دیتی ہے، اور اس کی شخصیت کو قابل قدر بھی بنا دیتی ہے اور شاعر اپنے جادو اثر نغموں سے اپنے گرد و پیش کی دنیا کو محظوظ کر کر کے مسحور کر لیتا ہے اردو شاعری کے افق پر کچھ ایسے آفتاب اثر شاعر بھی نمودار ہوئے ہیں، جن کے احساسات کی شعاعوں نے غمِ حیات کے طوفانِ باد و باراں کے ساتھ ساتھ رومانیت کی ایک نظر فریب قوسِ قزح کی تشکیل کی انھیں ممتاز رومانی شاعروں میں حسرت موہانی بھی ایک شخصیت ہیں جنھوں نے "چکی کی مشقت" کے دوران میں بھی رومانی غزل نگاری کو نظر انداز نہیں کیا۔

حسرت کے کلام میں حسن کی جلوہ سامانی، نشاط کی کیفیت، ہوس کی آسودگی اور احساسِ جمال کی شدت پائی جاتی ہے، ان کے یہاں ایک صحت مند باذوق اور جمال پرست کی جگر تشنگی ہے، وہ حسن کے ہر جلوے کے پرستار تو ہیں مگر چونکہ بہارِ باغِ کائنات "صنفِ نازک" کا حسن ہی شعور و احساس پر زیادہ اثر انداز ہوتا ہے اس لیے وہ بھی اسی بتِ ہزار شیوہ پر جان دیتے ہیں، ان کا مرکز دل اوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والی ایک مشرقی خاتون ہے، جو ہرجائی نہیں اور وہ معصیت بھی نہیں، پاک باز ہے، سادگی کا پیکر اور شرم و حیا کا مجسمہ ہے ؎

خود عشق کی گستاخی سب تجھ کو سکھا لے گی — اے حسنِ حیا پرور! شوخی بھی شرارت بھی

حسرت اپنی بیقراریٔ دل کا اظہار کرتے ہیں مگر زبان سے نہیں، آنکھوں سے کیوں کہ محبوب کے خاطرِ نازک کا انھیں پورا پورا لحاظ ہے ؎

گراں گزرے گا حرفِ آرزو اس طبعِ نازک پر — نگاہِ شوق اس مفہومِ رنگیں کو ادا کر دے

کبھی تو رعبِ حسن اس کی اجازت نہیں دیتا اور حسرتِ اظہارِ دل کی دل ہی میں رہ جاتی ہے ؎

دل میں کیا کیا ہوسِ دیدہ بڑھائی نہ گئی — روبرو ان کے مگر آنکھ اٹھائی نہ گئی

حسرت ایک صداقت پسند اور راست گو کی طرح دورِ انقلاب میں عہدِ ہوس کا ایک واقعہ جو غالباً ان کی رومانیت کی تاریخ میں سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے

بڑی ہی سادگی سے بے جھجک جرأتِ رندانہ کے ساتھ بیان کیے ہیں کہ نہایت اضطراب و اشتیاق کے ساتھ محبوب سے دل بستگی کے باعث بار بار اُن کی مشتاق نگاہیں، بے اختیار اس کی جانب اٹھ جاتی ہیں، وہ عاشق نواز بھی اپنے غرفے سے تاک جھانک کرتی ہے، اس سے کبھی وہ مل کر دفورِ شوق سے کچھ بے باکی کا مظاہرہ کر جاتے ہیں تو وہ شرم و حیا کی ماری دانتوں میں انگلی دبا لیتی ہے، کبھی درازدستی سے پردہ گرا دیتے ہیں تو وہ دوپٹے سے منہ چھپا لیتی ہے، سوتے میں پاؤں چومنا چاہتے ہیں تو وہ شوق سے ٹھکرا کر مسکرا دیتی ہے، ابتدائی زمانہ یاد دلاتے ہیں اور جستہ جستہ واقعات کا ذکر بھی کرتے ہیں کہ وہ پہری چھپی رات غیروں کی نظریں بچا کر آجایا کرتی تھی اور دورانِ ملاقات میں کبھی ذکرِ فراق آجاتا تھا تو روتی بھی تھی اور رلاتی بھی تھی، دوپہر کی سی دھوپ میں ان کے بلانے کو ننگے پاؤں چلی آتی تھی، اس کی ہواؤں میں بسی زلفیں مشامِ جان کو طبلۂ عطار بنا دیتیں اور اس کے مہندی میں رچے ہوئے دستِ رنگین کا نظر میں جچنے والا معیار پیش کرتے تھے، چھیڑ چھاڑ کی باتیں ہوتیں اور وہ دشمن کے بگڑ کر باتوں میں اڑا دیا کرتی تھی، مختصر یہ کہ صحبتِ راز و نیاز گرم رہتی تھی، انھیں برگشتگی پر سو سو طرح سے منایا جاتا اور وہ جب من جاتے تو وہ خود روٹھ جاتی، وہ چھیڑتے گدگداتے، وہ بگڑ بگڑ کر ہنستی اور من کر بگڑ جاتی ہے

اے شوق کی بے باکی وہ کیا تری خواہش تھی		جس پر انھیں غصہ ہے، انکار بھی حیرت بھی

اس نازنیں سے لڑائی بھی ہوتی ہے اور صفائی بھی، تقاضائے محبت کے ہاتھوں وہ وفا پر مجبور بھی ہے، لیکن دنیا کا خیال مانع ہے اور بدنامی و رسوائی کا خوف عناں گیر، حضرت کی اس ابتدائی سادگی و سپردگی کی جگہ آخر میں وہ پختگی و سنجیدگی لے لیتی ہے جس میں تجربات کی وسعت اور مشاہدات کی گہرائی سے ایک وزن پیدا ہو جاتا ہے اور وہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ با لوازمِ وصل کی تدبیر بنتی ہے نہ آرزو سے نقدیر بدلتی ہے، التفاتِ یار کو وہ آغازِ وفا کا ایک ایسا خواب تصور کرتے ہیں جس کی تعبیر سچ نہیں ہوا کرتی، قیدی عمر ہو کر انھیں عظمتِ عشق محسوس ہوتی ہے اور وہ اپنی عالی جنابی اور گردوں رکابی پر ناز کرنے لگتے ہیں، عشق و محبت کے ابتدائی دور کی حسین یادیں ہی ان کی رومانی زندگی کے مایۂ ناز سرمائے سے کچھ کم نہیں گویا آغازِ الفت کے عیش با فراغت اور بیگانۂ رسمِ جفا محبوب کے لطفِ بے نہایت کے مزوں کی یاد ہی تا دمِ مرگ اُن کی حیاتِ عشق کا سرمایہ بن ...

حسن سے اپنے وہ غافل تھا، میں اپنے عشق سے		اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے؟
میری جانب سے نگاہِ شوق کی گستاخیاں		یار کی جانب سے آغازِ شرارت کے مزے
اک بار کی تھی سوم ... اس میں ہے موجود		اے جانِ تمنا تری تصویر ابھی تک
بھولی نہیں دل کو تری دزدیدہ نگاہی		پہلو میں ہے کچھ کچھ خلشِ تیر ابھی تک

حالانکہ جیسا ان کے کلام سے پتا چلتا ہے، محبوب کی اور ان کی ملاقاتوں کی زندگی کبھی کی ختم ہو چکی ہے، باہمی چھیڑ چھاڑ کا واسطہ باقی نہیں رہا، سلسلۂ راز و نیاز منقطع ہو چکا ہے، نہ وہ ہمنشینی ہے، نہ وہ بادہ پیمائی، بایں ہمہ قنوطیت، جو منجملۂ لوازماتِ فراق ہے، حسرت کے دل و دماغ پر اثر انداز نہ ہو سکی اور وہ کہیں ناامید و مایوس نظر نہیں آتے، اور انھیں یادوں کے سہارے اپنے رنگین ماضی کی دنیا خیالوں میں بساتے اور متکیف ہو کر ایسے نغمہ ریز ہوتے ہیں کہ روداد حال کا نقشہ گزرتا ہے:

اے یادِ یار! دیکھ کہ با وصفِ رنجِ ہجر		مسرور ہیں تری خلشِ ناتواں سے ہم
شب وہی شب ہے، دن وہی دن ہے		جو تری یاد میں گزر جائیں
کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر		ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا
مل گئی مجھ کو صبرِ عشق کی داد		وہ جو شرمندۂ جفا نہ ہوا

دنیائے محبت میں حسرت پر جو کچھ بیتی اور جو کچھ گزری، اسی کی سرگزشت تو ان کی رومانی شاعری کی جان ہے، جدائی کے عالم میں وہ کبھی روئے دل آرا کے تصور سے کھیلتے ہیں تو کبھی خیالِ یار سے باتیں کرتے ہیں، کبھی یادِ جاناں کی رنگینیوں سے بہلتے ہیں تو کبھی غمِ ہجراں سے گھبرا کر بے اختیار وصالِ یار کی دعا کر بیٹھتے ہیں مگر پچھتاتے بھی ہیں کہ کہیں ان کی التجا قبول ہو گئی تو انھیں کشمکشِ انتظار کی لذتوں سے محروم ہونا پڑے گا، لبوں پر شکوۂ بے اعتنائی ہوگا اور نہ خلشِ فرقت ہی رہے گی کہ دل لطف اندوز ہو سکے۔ لیکن حقیقت ہے کہ محبوب کی غفلت شعاری عشق کا سخت ترین مرحلہ ہے سہ

گھبرا کے تغافل سے تمنا ہے ستم کی　　حالت کوئی دیکھے ترے مجبورِ الم کی

اس منزل پر بھی آرزو بر نہیں آتی تو ان کے جی میں آتا ہے کہ اس شوخِ تغافل کیش سے اب پھر کبھی نہ ملیں اور بے وفا ہو جائیں، عشق کے حسین زمانے کو ایک خوابِ فراموش سمجھیں اور تمنائے شوق سے ہاتھ اٹھا لیں، کاوشِ دردِ جگر کو بھول جائیں، مائل آرام ہوں اور مشتاقِ شفا بھی، انھیں کوئی ارماں ہو نہ کوئی حسرت بلکہ بے نیازیٔ مدعا ہو، عہدِ وفا سے وہ اس قدر بیگانہ ہو جائیں کہ دل میں اُس حسنِ ستم پرور کی یاد بھولے سے بھی کبھی چٹکیاں لینے نہ لگے مگر کس کے بس کا روگ ہے؟

اس سراپا ناز سے کیوں کر خفا ہو جائیے　　ہائے ری بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو مگر

کوئی عشق بازی کا مشغلہ نہیں کھیل! اے دلِ مبتلا　　مگر اب کیا ہے جو حوصلہ تو خوشی سے ناز بتاں اٹھا

حسرت نے اپنے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں حسن و عشق کے ہر پہلو کو موثر انداز میں اجاگر کرنے کی اکثر کامیاب کوشش کی ہے۔ حتیٰ کہ کہیں انھوں نے ابتذال اور فحاشی کی بھی پروا نہیں کی، ان کے یہاں مذاقِ سلیم اور سنجیدگی پر گراں گزرنے والے شعر بھی ہیں، لیکن ان جواہر پاروں کی بھی کمی نہیں جو ان کی نمایاں انفرادیت کے آئینہ دار ہیں، جن میں انھوں نے باتوں باتوں میں شاعری کا ذوق جگایا ہے ؎

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی　　مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

ان کے سحر آگیں شعروں میں ایک شاہ پارہ یہ بھی ہے جس میں انھیں بیک وقت حسن کرشمہ ساز کے اعجاز کا اعتراف بھی ہے اور اس پر طنز بھی ؎

خرد کا نام "جنوں" پڑ گیا جنوں کا "خرد"　　جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

قادرانہ رمز کاری شعر کو پرکشش بنا دیتی ہے، تشبیہیں، استعارے اور کنائے معنی آفرینی اور جدت طرازی کے موثر ذرائع ہیں۔ ان سے معنوں اور برمحل لفظوں کے مفہوم و مطالب کا خوش رنگ دامن وسیع تر ہو جاتا ہے، مگر ان شعری وسیلوں کا استعمال شاعر کے سلیقے پر موقوف ہے کیوں کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر انھیں جس حسن سے برتے گا، شعر اتنا ہی جاندار ہو جائے گا اور یہ خوبی بھی حسرت کے یہاں مناسب صورت میں پائی جاتی ہے، ان کی تشبیہات، استعارات اور کنایات میں فنی نزاکتوں کے ساتھ ساتھ رومانی قدروں کی دل آویزیاں بھی سمٹ آئی ہیں:

پیراہن اُس کا ہے سادہ رنگیں　　یا عکس مے سے شیشہ گلابی

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام　　دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

چمنِ جاں میں نسیمِ ہوس انگیز چلی　　کشتِ امید پر ابرِ طرب آثار آیا

اسی سے پھبتے ہیں، ہوتی ہے جس پہ اُن کی نظر　　اگر یہی ہے تو امیدوار ہم بھی ہیں

نفسیات کی یہ بالکل روزمرہ کی ہوئی پیش پا افتادہ بات ہے کہ بات پر بات یاد آتی ہے، چنانچہ اسی بات سے حسرت نے ایک بات بنائی ہے:

نہ چھیڑ اے ہمنشیں! کیفیتِ صہبا کے افسانے　　شرابِ بے خودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

یہ آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ کسی ذہین و نابغہ کے حرف و حکایات کو کشف و کرامات سمجھ لیا جاتا ہے، اس سے حسرت کی طباعی نے بھی فائدہ اٹھایا ہے اور اپنی فنکارانہ چابکدستی کا ثبوت دیا ہے:

نگہِ یار سے پا لیتے ہیں دل کی باتیں　　شہرتِ کشف و کرامات چلی جاتی ہے

سیدھے سادے انداز کے ساتھ موثر اسلوبِ اظہار سے حیرت آفرینی بھی شاعر کا ایک کمال ہے:

دلِ بیتاب جو قابو میں نہیں ہے حسرت　　نگہِ شوق نے، کیا جانیے! کیا دیکھا ہے؟

یوں تو ہر انسان حسن و محبت کے رنگا رنگ پہلوؤں سے کم و بیش آشنا ہوتا ہے اور نت نئے مشاہدات و معاملات اور تجربات سے نشاط اندوز بھی، نشاط و سرور کے علاوہ کچھ اس کے ناگوار پہلو بھی ہوتے ہیں جن سے ہر دل فطری طور پر متاثر و مغموم ہو جاتا ہے، مگر عوام کو یہ سارے جذبات گونگے کے گڑ کھانے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے، یہ شاعر ہی کا حصہ ہے کہ بقدرِ قدرتِ کلام اپنے داخلی احساسات، خارجی حالات اور ان کے اثرات کو ایسے موثر پیرائے میں اپنے ماحول تک بھی پہونچاتا ہے کہ ہر اک سامع اس کی ہر کہی ہوئی بات کو اپنے دل کی آواز سمجھتا ہے اور مزہ لیتا ہے، شاعر اپنے جذبات ہی کی

ترجمانی نہیں کرتا بلکہ اوروں کے دل کی گرہیں بھی کھولتا ہے، اور اس خوبی کے ساتھ اپنی تقریر میں لذت پیدا کرتا ہے کہ ہر سننے والا چیخ اٹھتا ہے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے اور یہی حسنِ اظہار و قدرتِ کمال ہے، ان باتوں کا دارومدار داخلی نوعیت سے احساسات کی قوت اور رومانیت کی شدت پر ہے اور خارجی حیثیت سے ماحول، معاملات و تجربات کی اثر اندازی پر۔ جس شاعر میں رومانیت جس شدت کی ہوگی، اس کے اشعار اتنے ہی بلیغ، موثر اور پسندیدہ ہوں گے، حسرت کے احساس اور جذبات میں بھی ایک معیاری رومانیت سموئی سموئی سی محسوس ہوتی ہے جس سے ان کی شاعری میں ایک دلکشی اور پسندیدگی آگئی ہے جو حسنِ قبول کی ضامن ہے:

اللہ رے! جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا
طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

لایا ہے دل پر کتنی خرابی!
اے یار! تیرا حسنِ شرابی

حسنِ جاناں سے یہ کہتا ہے مرا شہرۂ عشق
دور پہنچا ہے مرے نام سے افسانہ ترا

جذبۂ شوق کدھر کو لیے جاتا ہے مجھے؟
پردۂ راز سے کیا تم نے پکارا ہے مجھے؟

حسرت کے کلام میں احساسِ جمال، صحت مندیٔ ذوق، معاملاتِ حسن و عشق کی بصیرت اور اس کے اظہار و ابلاغ میں سادگی، شگفتگی اور لطافت و بے باکی مثالی ہے، ان کا نقطۂ نظر عقلی کم اور جذباتی زیادہ ہے لیکن ان کے یہاں جذبات میں تندی نہیں، اعتدال ہے، اور احساسات میں کیف آگینی و نشاط انگیزی:

تجدیدِ لطفِ یار کی لذت میں کیا کہوں؟　　شکوے تمام شکر کے عنوان ہو گئے
تجھ میں کچھ بات ہے ایسی جو کسی میں نہ ملی　　یوں تو اوروں سے بھی دل ہم نے لگا دیکھا ہے

مختصر یہ کہ حسرت مروجہ فلسفیانہ اصطلاحوں سے نہیں الجھتے نام نہاد تہذیب و تمدن کے اصولی قید و بند سے آزاد ہو کر انبساطِ احساس کی دنیا میں جس کا دوسرا نام "رومانیت" ہے، گامزن ہوتے ہیں۔ جہاں ان کے خیال اور جذبے کے پُرکشش نقوش کہیں ہلکے، کہیں گہرے رنگ میں ابھر آتے ہیں، لب و لہجہ خوش گوار ہو جاتا ہے، اضطراب و حشر سامانی بے کرانی و لامحدودیت کے ساتھ لذتیں اشاریت جھلکنے لگتی ہے اور وہ اپنے اندرونی و بیرونی تجربات کو ایک دوسرے میں سمو کر لطیف پیرایۂ بیان میں اپنی طرب آمیز "رومانیت" کی جلوہ گری کرتے ہیں:

جلوۂ یار نہ چھپ جائے سرِ بام کہیں
جلد، اے حوصلۂ دید! مجھے تھام کہیں

دامِ گیسو میں ترے اک دلِ ناشاد بھی ہے
اے مرے بھولنے والے تجھے کچھ یاد بھی ہے

بقیہ سن انیس سو ساٹھ کا طنزیہ و مزاحیہ ادب

نمکدان، پاک پنچ، پھلجھڑی، بھوپال پنچ، بیسویں صدی، شمع، بانو، کھلونا، بھائی جان، امروز، جنگ، کوہستان، داستان گو، نصرت، لیل و نہار، قومی آواز، پنچ، انجام، سیاست، انقلاب اور ملاپ میں خبر بنتے نظر آتے ہیں۔

۔۔۔ کارٹون کی تاریخ اودھ پنچ کی طرح نمکدان کے سیاسی اور سماجی کارٹونوں کا ایک الگ باب تیار کرے گی۔ نجمی اور جمیل کے قلم میں اودھ پنچ والی تیزی اور شوخی ہے۔ جنگ میں نجمی کا مستقل کارٹون "آپ سے ملیے" امروز کے لیے "بڑے میاں" اور "وقت کی بات" قومی آواز میں برکاش کی "ایک ہی" اور "زمانے کی رفتار" کوہستان میں حمید کا "میر صاحب" پنچ کا "جلتی دنیا" انجام میں محمود بٹ کے "منشی جی" سیاست حیدرآباد میں احمد کے مستقل کارٹون، انقلاب میں وہاب حیدر کی "سنی سنائی" ملاپ میں پران کی "آج کی بات" شمع میں سدھیر کے "ہنستے گیت" پاک پنچ میں عزیز کے کارٹون، پھلجھڑی میں شہاب کے کارٹون اور ان کے علاوہ داستان گو، نصرت اور اردو کے بیشتر رسائل و اخبارات میں شنکر اور دوسری زبانوں کے کارٹونوں کے چربے اس بات کے ضامن ہیں کہ کارٹون کے فن پر ہمارے ادب میں خاطر خواہ توجہ دی جارہی ہے۔ اور اس فن کا مستقبل خاصہ روشن ہے۔ خاص طور پر بچوں کے رسائل کارٹون کے بغیر ادھورے رہتے ہیں اور اخبارات کا یہ روز بروز لازمی جزو بنتے جارہے ہیں۔

بہ حیثیت مجموعی طنزیہ و مزاحیہ ادب خاصہ آگے بڑھا ہے اچھی کتابیں، اچھے مضامین، اور اچھے لکھنے والے اچھے مستقبل کی نشاندہی کرتے ہیں، یہ بید کہ بہترین ادب معیار و مقدار کے اعتبار سے بہت زیادہ نہیں پیدا ہوا مگر پھر بھی رفتار ادب حوصلہ شکن نہیں بلکہ خاصی حوصلہ افزا رہی، اور مستقبل میں طنزیہ و مزاحیہ ادب کی نئی وسعتوں اور بلندیوں کے امکانات زیادہ واضح اور روشن

ذوق — ایک مطالعہ

محمد انصار اللہ نظر

تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ عہد آفریں صرف وہی شخصیتیں ہوتی ہیں جو ماضی کی روایات کو اچھی طرح جانتی سمجھتی اور برت سکتی ہوں ساتھ ہی ان میں یہ صلاحیت بھی ہونی لازم ہے کہ وہ ماضی سے مستقبل کے لیے صحیح نتائج بھی اخذ کر سکیں، ہر زمانے کے لیے کچھ تقاضے ہوتے ہیں اور یہ تقاضے ہر حال میں پورے ہو کر رہتے ہیں البتہ کچھ ذہین اور با استعداد اشخاص ان تقاضوں کو سمجھ کر ان کے لیے مناسب ذرائع پیدا کر دیتے ہیں مثلاً ۱۸۵۷ء کے بعد ملک میں ایک انقلاب پیدا ہوا، زبان و ادب کو بھی ایک نیا انداز اختیار کرنا تھا۔ سرسید اور حالی شبلی اور آزاد نے زمانے کے ان تقاضوں کو سمجھ کر مناسب اقدامات کیے اور اس طرح زبان و ادب بہت جلد صحیح نہج پر لگ گئے اگر ہمارے یہ بزرگ اس وقت نہ ہوتے تو بھی یہ کچھ ہو کر رہتا البتہ ممکن تھا کہ اس تبدیلی میں کچھ عرصہ اور لگ جاتا، سائنسی اصطلاح میں ان عہد آفریں شخصیتوں کی حیثیت CATELYTIC AGENT کی ہوتی ہے جو عمل کو تیز تر بنا دیتا ہے۔ وہ اس عمل میں خود کو فنا نہیں کرتا بلکہ اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے عمل کی رفتار کو بڑھا دیتا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے جدید طرز کی شاعری کی بنیاد رکھی یہ اس وقت کا تقاضا تھا، آزاد کے ذریعہ یہ کام ہوا، آزاد نہ ہوتے تو بھی یہ ہو کر رہتا دیر یا جلد۔ لیکن یہی کام ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے پہلے ممکن نہ تھا۔ آزاد شیخ محمد ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے ذوق کی تربیت میں رہ کر بہت کچھ حاصل کیا لیکن آزاد کے اس کارنامے کو صرف ذوق کی تربیت کا نتیجہ نہیں کہہ سکتے۔ جیسا کہ ان کے ایک شاگرد سید ممتاز علی نے لکھا ہے:

"میں نے ابتدا سے اس میں یہی دھن پائی کہ وہ نظم اردو کے دوسرے ولی بن جائیں اور اس میں ایسا انقلاب پیدا کر دیں کہ یہ زبان بھی روئے زمین کی اور معزز زبانوں کی طرح تمام مطالب علمی کے بیان کے لیے کارآمد ہو سکے اور اس کے الفاظ اور بندشوں میں ہمارا دل اپنی پوری حسرتیں اور ارمان نکال سکے۔ اس منصوبے کا ظہور اگرچہ ۱۸۷۴ء میں ہوا لیکن یہ وہ منصوبہ تھا جس نے خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق کے دامن تربیت میں نشو و نما حاصل کیا تھا۔" (مجموعۂ نظم آزاد۔ دیباچہ صفحہ ۳)

کچھ شک نہیں کہ ذوق کی شخصیت نہایت اہم تھی، ان کا علم و فضل، ان کی قادر الکلامی، تلامذہ کو اصلاح دینے کا انداز مسلّم ہے اس میں شک نہیں کہ ذوق اپنے دور کے شاعرانہ ماحول کے صحیح نمائندہ تھے، ان کے کلام میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو ان کے دور میں پسندیدہ تھیں جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنے دور میں نہایت مقبول اور ہر دل عزیز رہے، تمام تذکرہ نویس ان کی خوبیٔ کلام کے قائل اور معترف ہیں۔ ہر طبقہ اور ہر فرقہ کے افراد ان کے دامن تلمذ سے فیض اٹھانا فخر سمجھتے تھے، حالت یہاں تک تھی کہ:

"صبح سے شام تک تربیت طلاب کمال اور حک و اصلاح غزل سے خواب و خور کی مہلت نصیب اعدا تھی۔" (گلستان سخن)

قبول عام کا اندازہ اس سے کیجیے کہ جب انتقال ہوا تو سینکڑوں تاریخیں کہی گئی تھیں۔

"مسموع ہوا کہ ایک خوش مذاق نے سعی اور تجسس کو کام فرما کر ان قطعات سے کچھ کچھ بہم پہنچائے بعد شمار کے دریافت ہوا کہ تین سو سے زیادہ فراہم ہو گئے تھے۔" (گلستان سخن)

شیخ ذوق ایک صاحب علم ذہین شخص تھے انھوں نے اپنے زمانے کا بغور مطالعہ کیا تھا اور بدلتے ہوئے مزاج کو خوب سمجھ لیا تھا چنانچہ کہتے ہیں:

ذوق گل اور کوئی تازہ کھلایا چاہتا ہے — کہ ہوا باغِ جہاں میں ہے دگرگوں چلتی

غزل کا مقطع ہے اور یہ غزل بقول آزاد "ابتدائے شباب کی ہے اور نظر ثانی نہیں ہوئی۔" (دیوان ذوق صفحہ ۱۹۹) لیکن اس کو سنتے ہی ذہن میں یہ خیال

پیدا ہوجاتا ہے کہ شاعر نے کسی آنے والے انقلاب کو محسوس کرلیا ہے۔ مشہور ہے کہ ذوق نے اپنے عہد کی روایات کو بڑی خوش اسلوبی اور مستقل مزاجی سے نباہا، لیکن یہاں ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ انھوں نے زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کا اگر ساتھ دیا تو کس طرح؟ کیونکہ یہیں ان کے جوہر کھلتے ہیں۔

ذوق سترہ سال کی عمر سے پہلے ہی شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد ہو چکے تھے (مجموعہ نغز) شاہ نصیر استاد وقت تھے کچھ عرصہ کے لیے شاہزادہ مرزا ابوظفر کو اصلاح دینے پر بھی مامور ہوئے تھے، یہ بڑے قادر الکلام، بلکہ زور آور استاد تھے "تیلیاں" کی ردیف میں مشہور معرکہ ہوا:

"شاہ نصیر کی تلاش پر ہزار آفریں ہے کہ ہر بار وہ غزلہ ساٹھ ستر بیت کا پڑھتا تھا اور یہ شاگرد کی غزل انہیں ہیں سے کم نہ ہوتی تھی طرفہ یہ کہ وہ سب غزلیں بھی اسی بکہ تاز عرصہ سخن کی طبع زاد ہوتی تھیں۔" (گلستان سخن)

اور یہ مشاعرہ "کئی مہینے تک" جاری رہا۔ ایسے زور آور اور کہنہ مشق استاد کی شاگردی کا اثر یہ ہوا کہ خود ذوق بھی سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنے لگے۔ اس دور کی بعض غزلوں کے ردیف و قافیہ کو دیکھیے:

اب/غضب ہے کہ نہیں　　آب/حساب تو دے　　اب/شب آوے کہ نہ آوے　　گردن/پرفن کر گئے

ذوق نے ابتداءً اپنے عہد کے انداز غزل خوانی کو اپنایا اور اس میں خوب کامیاب رہے، سرکار شاہی سے خطاب پایا بادشاہ اور ولی عہد کے استاد مقرر ہوئے، اپنے منصب کی خاطر روایات کو برابر آخر عمر تک نباہتے رہے۔ چنانچہ ۱۸۵۱ء کے ایک مشاعرے میں یہ غزل پڑھی جس کا یہ شعر مشہور ہے

توڑا اگر شاخ کو کثرت نے ثمر کی　　دنیا میں گراں باری اولاد غضب ہے　(چراغ دہلی از حیرت)

آزاد نے بھی اس سلسلہ میں جابجا استاد کے اقوال لکھے ہیں بعض یہ ہیں:

"۱۸۵۲ء میں ایک مشاعرہ ہوا.... فرمایا ہم لمبی غزل لکھ دیں بھلا یاد تو رہے کہ یوں نشست دیتے ہیں زمین ٹھنڈی ہو تو ہوکلام بے اصول نہ ہو۔" (دیوان ذوق صفحہ ۱۰۵)

"۱۸۵۰ء میں .... مشاعرہ کیا...... میں نے کہا حضرت ضرور کہیے چاہیے لوگ ہمیں کہیں گے انھیں بے محاورہ کہنا نہیں آتا، استاد کا ارادہ پھر مستقل ہوگیا اور غزل تمام کی۔" (ایضاً صفحہ ۱۹۲)

یہ اقتباسات بتاتے ہیں کہ ذوق آخر عمر میں بھی مشاعرہ کی سخت سے سخت زمین میں شعر کہنے کے لیے تیار رہتے تھے لیکن اگر ان کی غزلوں کا بغور مطالعہ کریں اور آخر عمر کی وہ غزلیں الگ کرلیں جو انھوں نے اپنے شوق سے کہیں تو معلوم ہوگا کہ اب وہ عام بحروں، مختصر ردیفوں اور سہل قافیوں میں غزلیں کہنے لگے تھے، چنانچہ اس سلسلے کی کچھ غزلوں کے ردیف و قوافی درج ہیں:

مرجھا/دکھلا گئے　　رفو/وضو کرتے　　خدا/جفا سمجھے

سہل زمینوں کا انتخاب اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ شاعر اب یہ سمجھ گیا ہے کہ محض سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنے میں کوئی افادیت نہیں چنانچہ اس نے اس سلسلہ کو خود ترک کر دیا۔

"شاہ نصیر مرحوم اپنی غزلوں میں کبھی کبھی ایک قطعہ بھی کہہ دیتے تھے، ان دنوں کی غزلوں میں (ذوق) نے بھی ایک ایک قطعہ لگا دیا ہے۔" (دیوان ذوق صفحہ ۹۲)

ایک موقع پر آزاد نے ان قطعوں کو "شاگردی کا تمغہ" بھی کہا ہے۔

شاہ نصیر کے بعض مقطعوں میں "گرمی" کے مضامین بھی ملتے ہیں۔ مثلاً:

نصیر اور بھی ایسی کوئی غزل پڑھ گرم

ذوق کی ابتدائی غزلوں میں بالکل اسی مضمون کے مقطع مل سکتے ہیں:

عاشقانہ سی غزل اور کوئی پڑھ تو گرم

شاہ نصیر مرحوم نے انشا اور مصحفی کے ساتھ بھی بزم شعر میں شرکت کی تھی، ان کے اثر سے ذوق بھی اپنا دامن بچا نہ سکتے تھے۔ چنانچہ مصحفی اور شاہ نصیر کی مشہور معرکہ کی زمین میں ذوق سے بھی ایک غزل منسوب کی جاتی ہے:

مثل خورشید ہے سیب ذقن سرخ ترا　　معدن لعل وگہر ہے دہن سرخ ترا　　(نگارستان سخن)

سید انشا نے دو غزلہ اور سہ غزلہ بہت لکھے اور ان میں درمیانی مقطع لکھنے کا ایک نیا انداز اختیار کیا، شاہ نصیر نے بھی اس طرز کو اختیار کیا اور ذوق کے یہاں بھی یہی انداز ملتا ہے۔ مثالاً:

کر کے بحر و قافیہ تبدیل لکھ اور اک غزل　　بیٹھ کوئی دم تو اے ذوق اور اس پر غم کے ساتھ　　(دیوان مرتبہ آزاد)

لیکن آخر دور میں ذوق کے یہاں نہ دو غزلہ سہ غزلہ کا شوق ملتا ہے نہ اس انداز کے مقطعے ہیں اور نہ غزلوں میں قطعات ہیں، اب شاعر کا رجحان معنویت کی طرف ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے اشعار ایک زمین میں بہت زیادہ نہیں کہے جاتے، ذوق کی آخر عمر کی غزلیں بہ لحاظ تعداد اشعار مختصر بھی ہیں، طویل ردیفوں کی بجائے مختصر ردیفوں کا استعمال اور "گریہ" اور "گرمی" جیسے روایتی مضامین کا ترک، گویا اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس کے بعد ہی دو دور آئے گا جب ردیف اور قافیہ بلکہ وزن کے خلاف بھی ایک احتجاج ہوگا، رسمی مضامین کو نہ صرف واجب الترک سمجھا جائے گا بلکہ ان کو شاعری کا عیب جانیں گے۔

(۲)

مصحفی اور انشا کے بعد لکھنؤ میں ناسخ اور آتش کی دھوم تھی، آتش نے اپنے نظریہ کا اظہار ایک مقطع میں کر دیا ہے:

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں　　شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

شیخ ناسخ اور خواجہ آتش کے انداز میں جو اختلافات ملتے ہیں ان کے باوجود "تلاش الفاظ" پر زور دینا دونوں کے یہاں مشترک ہے۔ اس موقع پر ناسخ کے ایک شاگرد نواب کلب حسین خاں نادر کا ذکر بھی مناسب ہوگا۔ نادر نے اپنی تصنیف تلخیص معلی میں ناسخ اور رشک کے ان اصولوں کو بھی بیان کیا ہے جو بالخصوص شعرا کے لیے اہم ہیں، یہ کتاب زبان کی صحت کے متعلق لکھی گئی ہے مگر اس کے موضوعات یہ ہیں:

"مقدمہ سبب تالیف کتاب میں
پہلی فصل امور واجب الترک و مستحسن الترک محاورات اور وضع قدیم و جدید میں
دوسری فصل صرف یا منت تذکیر و تانیث اور بعض قواعد جمع بنانے کے با دیگر فوائد و زوائد میں
تیسری فصل اختلاف روزمرہ گفتگوئے ساکنان مغرب و مشرق لکھنؤ میں
چوتھی فصل بعض مصطلحات و مرکبات علم عروض و قوافی میں
خاتمہ بعض فوائد و زوائد و امور قابل ترک و اختیار و محاورات و الفاظ وغیرہ۔"　　(تلخیص معلی دیباچہ)

ناسخ کے تلامذہ میں شعر کہنے کا جو طریقہ رائج معلوم ہوتا ہے یہ ہے:

"جس طرح پر شعر کہنا منظور ہو اس کے سب قوافی پہلے لکھے ان میں سے غور کر کے کہ کتنے قوافی خاص لائق گنجایش مضامین ہیں انھیں کو سہل زمینوں میں موزوں کرے اول مصرعہ ثانی لکھے بعد اس کے مصرعہ لگا دے۔" (تلخیص معلی)

اس عہد کی تصانیف کا مطالعہ کریں تو ان سے یہی زبان، قواعد عروض کے اصولوں کی اس دور میں اہمیت معلوم ہوگی، لیکن معنی، مطالب اور مضمون کے متعلق کوئی بات ایسی نہیں ملتی جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہو۔ اس کو ہمیشہ ضمنی اور ثانوی حیثیت دی گئی ہے۔

ذوق نے ناسخ سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا ہے، انھوں نے ناسخ کی کئی غزلوں پر غزلیں کہیں، اور زبان کے اصول و قواعد کے سختی سے پابند ہوئے۔ اس موقع پر ان کے دو مقطع پیش کرنا مناسب ہوگا۔

بجز شاہ علی شاہ کون جانے ذوق　　تری زبان کا مزہ تیری شعر خوانی میں
بے تمیزوں کو ہو نقصان لطف ذوق　　لیں ہیں نام طفل آ دھا پیار سے

ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذوق اپنے اشعار میں لطف زبان کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ یہاں تک کہ اس پر داد نہ ملنے کی شکایت بھی کرتے ہیں، ان کو بچوں کا ادھوا
ینا بھی اس حد تک ناگوار تھا کہ اسے بھی بے تمیزوں کا شعار سمجھتے تھے، یہ سب صحیح ہے لیکن انسان کی ذاتی افتاد طبع بھی بڑی چیز ہے، اس دور میں جب بندش الفاظ
، اہمیت ہو جو بیان ہوئی ذوق نے ایک مقطع کہا دستر و سال سے بھی کم عمر میں)

ٹک دیکھ اب تو چشم حقیقت سے اے ذوق ہر طرف جلوہ گر ہے اسی کا ظہور حسن (مجموعہ نغز)

اس مقطع کے مضمون سے قطع نظر ایک پہلو یہ بھی اہم ہے کہ لفظ "طرف" جو متحرک الاوسط ہے ساکن الاوسط نظم ہوا ہے۔ ناسخ اور ان کے تلامذہ کے یہاں اس
الیں دیکھنے میں نہیں آئیں۔ البتہ میر تقی میر کے متعلق آزاد نے ایک حکایت نقل کی ہے کہ لکھنؤ میں چند عمائدین نے میر صاحب سے شعر کی فرمائش کی میر صاحب نے یہ مطلع پڑھا۔

عشق برے ہی خیال پڑا ہے چین گیا آرام گیا دل کا جانا ٹھیر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

اور فرمایا " آپ کہیں گے خیال کی "ی" ظاہر کرو مگر جواب یہ ہے کہ محاورہ یہی ہے" (آب حیات) ـــــ ذوق کے بچپن میں میر صاحب زندہ تھے
ر لکھنؤ میں تھے) ان کے واقعات ذوق نے بچپن میں سنے ہوں گے، میر کے سودا اور قائم کے کلام میں بھی متحرک کو ساکن اور ساکن کو متحرک نظم کرنے کی مثالیں
ملتی ہیں، ذوق نے بھی اپنے لئے دہلوی شعرا کی روایات کو زیادہ قابل عمل پایا، چنانچہ وہ حسب ضرورت اصول و ضوابط سے انحراف بھی جائز رکھتے ہیں
سلسلہ میں وہ ناسخ کے مقلد بالکل نہیں ہیں، چند مثالیں پیش کرتا ہوں:

وہ صبح کو آئے تو کروں باتوں میں دوپہر

اور: دوپہر ہے سایہ بھی بیٹھے ہے دب کر زیر پا

ایک ہی لفظ "پہر" کو ایک موقع پر ساکن الاوسط اور دوسرے پر متحرک الاوسط نظم کیا۔

کوسوں کیا تنگیٔ زمانے کو

فراق گورکھپوری صاحب کو بھی ذوق کی یہ ترکیب کھٹکی ہے لیکن انھوں یہ کہہ کر کہ شاید ذوق کے زمانے میں ایسا ہی بولتے ہوں اسے اہمیت نہیں دی
،، اصول کے مطابق "تنگیٔ زمانہ" بھی صحیح ہے۔ لیکن شاعر نے قافیہ کی رعایت برتی" اسے ضرورت شعری کہہ سکتے ہیں۔

ہو سرخ دوستی سے محمد کی آل کے

ں بھی "آل کی" ہونا چاہیے تھا مگر ردیف یہی تھی ـــ اس موقع پر تلخیص معلی کا ایک اقتباس اہم ہے۔

" از انجملہ ہے کہ اکثر اشعار میں مصرعہ اول اس طرح موزوں کرتے ہیں کہ جب تک دو ایک لفظ مصرعہ ثانی میں شامل کرکے نہ پڑھے جائیں
تب تک مطلب واضح نہیں ہوتا اور یہ بے لطف محض ہے چاہیے کہ ہر مصرعہ کا مطلب جداگانہ ہو۔ (ذوق)

منہ آنکھیں کیے جاتا ہے کدھر تو کہ تجھے ہے ترا نقش قدم چشم نمائی کرتا "

، طرح ایک اور موقع پر نادر لکھتے ہیں:

" اور یہ دو حرف بڑے چھپے ہوئے دشمن ہیں ایک نون عین اور دوسرے ہائے ہوز کہ یہ اکثر وقت موزونی دھوکہ دے کر وزن سے خارج ہو کر
شاعر کو ذلیل کرتے ہیں۔ بڑے بڑے استادوں نے دھوکا کھایا ہے "

گر مشغول ہو وے جلو ریز بہ دشت قبچاق

خود آزاد نے بھی اصولوں سے ذوق کے اس انحراف کو محسوس کیا تھا چنانچہ دیوان ذوق میں جا بجا اس کی مثالیں خود انھوں نے پیش کی ہیں (ملاحظہ ہو
۳۲، ص ۱۲۲، ص ۱۴۵ وغیرہ) آزاد نے کبھی کبھی اس مسئلہ پر استاد سے گفتگو بھی کی ہے۔ مثلاً ذوق کا مصرعہ ہے۔

صبا وہ ڈھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

محاورہ ہے "سحر کا ہونا" ذوق نے اس کے خلاف نظم کیا ہے۔ آزاد نے پوچھا تو ذوق نے جواب دیا۔

" یہ ایک حسن اتفاق ہے کہ ہماری زبان میں اس کے مقابل ایک محاورہ بھی موجود ہے کہ ایسی ڈھول لگی کہ تڑکا ہو گیا خیر اگر ہوا تو کچھ لطف ہی

پیدا ہوا بلکہ طرزِ بیان میں ایک وسعت کا قدم آگے بڑھا قباحت کیا ہوئی"۔ (دیباچہ دیوانِ ذوق ص ۳۴)

اس شعر کے متعلق ذوق کہہ سکتے تھے کہ یہ بچپن کا کلام ہے حافظ شوق کے دورِ تلمذ کی یادگار رہے (عمدہ منتخبہ) لیکن آزاد کے مذکورہ بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ذوق محاورہ میں اس تصرف سے شرمندہ بالکل نہیں تھے بلکہ وہ اسے زبان میں "وسعت کا ایک قدم" سمجھتے تھے اور اس پر وہ آخر تک قائم رہے۔ اس زمانہ میں جب کہ معمولی سی لغزش پر بھی برسرِ مشاعرہ ٹوک دیتے تھے۔ ادنیٰ ادنیٰ بات کے لیے سند طلب کی جاتی تھی۔ ذوق کا اقدام بلا شبہ جرأت مندانہ ہے اس سلسلے میں شاہ نصیر کے دو شعر نقل کرتا ہوں جن میں ذوق پر گرفت کی گئی ہے۔

ذوق اتنا شعر گوئی کا عبث کس واسطے　　قافیہ میں گر نہ تھیں حضرت کے لب کی تبلیاں
آپ ہی منصف ہوں اے صاحب ذرا بہرِ خدا　　بارکی چلمن ہو اور بائے مگس کی تبلیاں

(انتخاب کلیاتِ شاہ نصیر مطبوعہ اعلیٰ پریس میرٹھ)

تعجب ہے کہ ان اشعار کو پنڈت کیفی نے لالہ گھنشیام داس عاصی کے نام سے شائع کیا ہے اور ایک شعر کا اضافہ بھی کیا ہے۔

شیخ صاحب یہ وہ چلمن ہے کہ جسمیں بے دریغ　　باندھیے گر ہو سکیں تارِ نفس کی تیلیاں　　(خمخانۂ جاوید ۵/۳۴۳)

ان معرکہ آرائیوں کے باوجود ذوق نے محاورات اور روزمرہ میں بھی تصرف کیا اور اس طرح یہ بتا دیا کہ قدیم روایات کی اہمیت اپنی جگہ پر ہے لیکن ہر زمانے کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ اکثر لوگ صرف قدامت پرستی کا شکار ہو جاتے ہیں، لیکن جو شخصیتیں عہد آفریں ہوتی ہیں وہ نئے تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہیں، زبان و ادب میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ان تبدیلیوں سے چشم پوشی کرنا تنگ نظری کی دلیل ہے اور ان سے دامن بچا کر چلنے والا اپنے دور سے بہت پیچھے رہ جائے گا۔ ذوق کے زمانہ میں یہی بڑی بات تھی کہ انھوں نے نئے محاوروں، نئے الفاظ کو اختیار کیا، شاعری کے نئے مزاج کو پہچانا جو مضمون وہ نظم کرنا چاہتے تھے اس کے لیے انھوں نے اگر اصول کی پابندی کو حارج کرتے دیکھا تو اس قید کو توڑ دینے میں کوئی تکلف نہ کیا، ان کے نزدیک اصل چیز وہ خیال تھا جو نظم کیا جاتا تھا نہ کہ وہ اصول جن کے مطابق نظم ہوتا تھا، اصول کا مقصد خود یہی ہے کہ وہ مضمون کو زیادہ دلکش اور پراثر بنا دیں نہ یہ کہ اس کی تاثیر اور کشش کو نقصان پہنچائے۔ ذوق کا شاعری کے متعلق جو نظریہ تھا وہ اس مقطع سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

نہ ہو لفظ مغلق نہ تعقید مطلق جو فی الجملہ کچھ ہو تو مضمون ادق ہو

(۳)

ذوق آنکہ مدام ہمچو مردانِ خدا　　برداشتہ بود دل ازیں جائے دنی　　صہبائی

ذوق ایک خدا پرست شخص تھے ان کے نزدیک تمام انسان "انسان" تھے وہ ان میں کسی قسم کی تفریق نہیں کرتے تھے کہتے ہیں:

مت بھول بندگی پر غرہ میں آ کے بندے　　زاہد ہے تا بہ فاسق سب ہیں خدا کے بندے

مذہبی فرقوں کے متعلق وہ صرف اتنا ہی کہتے تھے کہ:

جو اس کے نزدیک رہبری ہے　　وہ اس کے نزدیک رہزنی ہے

ان کے سامنے انسانیت کا ایک تصور تھا شرافت اور اخلاق کا ایک معیار تھا۔ انھوں نے اپنے زمانے کے حالات کا مطالعہ کیا تو ہر طرف ادبار اور پستی نظر آئی، اس نے ان کو بہت متاثر کیا تھا چنانچہ مختلف انداز سے اس کا ذکر کرتے ہیں مثلاً:

رباعی

ان آنکھوں سے روتے لالہ گوں بھی دیکھا　　اوران کو بہا اشک خوں بھی دیکھا
کیا کیا دیکھا نہ رنگ ہم نے اے ذوق　　یوں بھی دیکھا جہاں کو یوں بھی دیکھا

اپنے زمانے کے وضعداروں کو تنگ ہوتے دیکھا اور ان کی تباہی سے متاثر ہوتے ایک رباعی میں اس قسم کا تاثر بیان کیا ہے۔

رباعی

جب تلک تھے گرہ میں احمقوں کے پیسے　　سب کہتے تھے ان کو آپ ایسے ایسے
مفلس جو ہوئے تو پھر کسی نے اے ذوق　　پوچھا نہ کہ تھے کون وہ ایسے تیسے

ذوق مسلمان تھے اور اس دور میں خصوصاً مسلمانوں کی تباہ حالی دیکھ کر بہت کڑھتے تھے دیکھیے اس کیفیت کو کس قدر دردناک انداز سے بیان کرتے ہیں:

قطعہ

جن کو اس وقت میں اسلام کا دعویٰ ہے کمال　　دیکھتا ہوں میں اب اے ذوق میں انکا احوال
جس طرح سے کہ ہنسا دیتے کو بے دینوں کے　　نقل کرتا ہے مسلمان کی کافر نقال

(ڈاکٹر) تنویر احمد علوی نے آجکل دسمبر ۱۹۶۲ء میں ذوق کی بعض تحریروں کا عکس شایع کیا ہے، اس میں یہ قطعہ بھی ہے۔ اسی صفحہ پر نواب زینت محل بیگم کے مکان کی تاریخ کے کئی مادے ذوق نے لکھے ہیں جو ۱۲۶۲ھ کا واقعہ ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قطعہ مذکور ۱۲۶۲ھ میں کہا ہوگا۔ مذکورہ رباعیات سے ذوق کی طبیعت کا اندازہ ہو سکتا ہے، انھوں نے اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ اب محض ہجر و وصال کی روایتی کیفیات کے بیان کا موقع نہیں ہے بلکہ اب ضرورت ہے کہ اخلاقی اور اصلاحی حقایق بیان کیے جائیں، چنانچہ ان کی غزلوں میں زندگی کی حقیقتوں اور نصیحتوں کا مختلف تمثیلوں کے ذریعے بیان ملتا ہے اور اس قسم کے اشعار ان کے یہاں بہت ہیں:

دیدۂ آبلہ پا کا ہے یہی اب رونا　　کہ نہ پہنچا ہو کہیں مجھ سے کسی خار کو رنج
اے ذوق دیکھ دختر رز کو نہ منہ لگا　　چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

جرأت اور حب الوطنی کے مضامین بھی ملتے ہیں نمونہ یہ ہے:

شرط ہمت نہیں مجرم ہو گرفتار عذاب　　تو نے کیا چھوڑا اگر چھوڑے گا بدلا لیکر
یوں اسیران قفس تک کوئی پہنچا گلبرگ　　جیسے غربت میں شفیقان وطن کا کاغذ
نزاق خلد میں گندم ہے سینہ چاک اب تک　　الٰہی ہو نہ وطن سے کوئی غریب جدا

ذوق نے غزلیں کہی ہیں اور غزلوں میں انھوں نے اس قسم کے مضامین نظم کیے ہیں، ان سے پہلے ہی غزل کا مزاج مخصوص ہو چکا تھا اس کی اپنی زبان ہے اپنی اصطلاحات ہیں اور اپنا انداز بیان ہے اس کا بہترین نمونہ ہمیں ذوق کے دوسرے استاد بھائی حکیم مومن کے یہاں ملتا ہے غزل کو غزل کے صحیح معنوں میں استعمال کرنے میں مومن سے زیادہ مشکل ہی سے کوئی کامیاب کہا جا سکتا ہے۔ ذوق کے سامنے ایک مقصد تھا اور ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے غزل کا مروجہ انداز بہت تنگ تھا۔ ذوق کا عقیدہ تھا کہ:

کوئی صورت اپنے صورت گر کی بے صورت نہیں

اور وہ کائنات کے ہر ذرہ سے فائدہ اٹھا لینا اپنا منصب اور اپنا حق سمجھتے تھے اس میں شک نہیں کہ ان کی غزلوں میں بھی روایتی اشعار ملتے ہیں۔ لیکن انھوں نے اصلاحی اور اخلاقی مضامین بھی بہت نظم کیے ہیں، اس کے لیے غزل کی رمزیہ زبان ناکافی ثابت ہوئی۔ انھوں نے اشاروں، کنایوں کو چھوڑ کر صاف صاف اپنے خیالات کا اظہار شروع کر دیا:

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو　　زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو
آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور چیز　　کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا
دین و ایماں ڈھونڈتا ہے ذوق کیا اس وقت میں　　اب نہ کچھ دیں ہی رہا باقی نہ ایماں ہی رہا

بعض اوقات تو ان مضامین کو اس قدر کھل کر نظم کر جاتے ہیں کہ وہ غزل میں کھٹکنے لگتے ہیں مثلاً:

نام مطلوب ہے تو فیض کے اسباب بنا　　پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

مضمون کی افادیت سے انکار نہیں لیکن اس میں وہ کیفیت ہرگز نہیں جو غزل کے شعر کے لیے ضروری سمجھی گئی ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ ذوق کو ان تمثیلوں کے

استعمال میں بھی تکلف نہیں جن کو اساتذہ نے مبتذل کہہ کر نظر انداز کر دیا تھا مثلاً،

جس کے سبب لڑائی ہو وہ آدمی نہیں　　　کانٹا ہے گھر میں سیہہ کا یا گل کنیر کا

سگ دنیا پس از مردن بھی دامن گیر دنیا ہو　　　کہ اس کتے کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو

بدخصلتوں کو کرتا ہے بالا نشیں فلک　　　اونچی ہے آشیانۂ زاغ و زغن کی شاخ

نکلے دنیا سے کہاں احمق اٹھا کر بار حرص　　　رہ گیا یہ تو گدھا دلدل میں پھنس کے بوجھ سے

وہ کان جو بلبل، طوطی اور قمری کا تذکرہ سننے کے عادی تھے زاغ و زغن اور سیہہ کا ذکر یقیناً پسند نہیں کر سکتے، وہ طبایع جن کے سامنے ہمیشہ گل و نسترن و یاسمن کی بہاریں رہیں کنیر کے پھول، اور کتا گھاس کو یقیناً حقیر ہی سمجھیں گے۔ چنانچہ ذوق کے یہ اشعار یقیناً پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھے گئے ہوں گے اس ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ کسی قدیم تذکرہ میں ایسے اشعار نقل نہیں کیے گئے، لیکن ذوق کے سامنے ایک مقصد تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ کسی کی ناپسندیدگی سے متاثر ہو کر اپنے مقصد کو پس پشت نہیں ڈال سکتے تھے۔ چنانچہ آخر تک وہ اپنی اسی روش پر قائم رہے۔ ذوق سے انتہائی سختی برتنے کے باوجود ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انھوں نے اردو غزل میں ایک انقلاب پیدا کر دیا یعنی یہ کہ ناسخ اور ان کے معتقدین کے کلام کو سن کر ذہن صنایع بدایع کی تلاش کرتا ہے اور ذوق کا شعر سن کر ہم اس کے مفہوم کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، غزل کے مزاج میں یہ تبدیلی نہایت اہم ہے۔

شاہ نصیر اور ناسخ کا اثر یہ تھا کہ سامعین قافیہ پیمائی اور لفظی صنعت گری کے دلدادہ ہو رہے تھے چنانچہ اس دور کے مشاعروں کی طرحیں دیکھ لیجیے ایسی ہی ملیں گی مثلاً:

کب کے مشتاق تھے زخموں کے دہن پتھر کے

کیا غمزہ ترا برسر بیداد غضب ہے

ہے صفائی سے سزاوار شکن کا کاغذ

اس میں شک نہیں کہ ذوق نے اخلاقی مضامین کو آسان زمینوں میں عام فہم تمثیلوں کے ذریعے نہایت سادگی کے ساتھ نظم کیا ہے لیکن اگر وہ صرف یہی کرتے تو یقیناً ناکام ہوتے، انھوں نے زمانے کا ساتھ بھی دیا اور سخت سے سخت زمین میں اچھی غزلیں کہہ کر مشاعروں میں پڑھیں اور اس طرح اپنی قدرت کلام کا سکہ دلوں پر بٹھا دیا، لیکن مقصد ہمیشہ پیش نظر رہا ابتدائی غزلوں میں ایک دو شعر ایسے ضرور کہتے تھے جو زندگی کے لیے مفید ہوں اور آخر عمر کی غزلوں میں ایسے اشعار کی تعداد کافی زیادہ ہو گئی تھی۔ سامعین کے مزاج کو بتدریج متاثر کر کے ایک دوسرے نہج پر لے آنا بڑی بات تھی، ہم بھی دیکھتے ہیں کہ وہی سامعین جو کبھی ایسی غزلوں کو پسند کرتے تھے کہ:

آفریں معنی باریک سے کیا خوب نصیر　　　تو نے پیدا کیے ہیں سر بسر اشعار میں بال

ذوق کی آخری عمر تک ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ اب ان شعروں کو اپنے ذہن میں محفوظ کرنے لگے تھے اور یہی ان کی پسند ہو کر رہ گئی تھی کہ:

دل صاف ہو تو چاہیے معنی پرست ہو　　　آئینہ خاک صاف ہے صورت پرست ہے

آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور چیز　　　کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

یہ پہلا شعر گلشن بے خار (۱۲۵۹ھ) گلستان سخن (۱۲۷۱ھ) چمن بے نظیر (۱۲۶۴ھ) وغیرہ میں اور دوسرا گلشن بے خار (۱۲۵۹ھ) گلستان سخن (۱۲۷۱ھ) سخن شعرا (۱۲۹۱ھ) ترجمہ حدائق البلاغت (۱۲۵۰ھ) وغیرہ میں ملتا ہے اور ایسے ہی اشعار کو ضرب المثل کا درجہ بھی حاصل ہوا۔ مقبولیت کا حال یہ تھا کہ ایک مدت تک لوگوں کی تحریر و تقریر میں بیشتر ذوق ہی کے اشعار نقل کیے جاتے تھے،

(۴)

مولانا محمد حسین آزاد نے زبان کی تنگی کا شکوہ ایک موقع پر اس طرح کیا ہے:

"غرض اول جو کچھ نصیب ہوا شعرائے اردو کی بدولت ہوا اور یہی سبب ہوا کہ جو کچھ سامان ایک ملکی اور ٹکسالی زبان کے لیے درکار ہوتے ان سے یہ زبان مفلس رہی کیوں کہ اس عہد میں علوم و فنون تاریخ و فلسفہ، ریاضی وغیرہ کا چرچا عام ہوتا تو اس کے لیے بھی الفاظ ہو جاتے جن جن

باتوں کا چرچا تھا انہی سامانوں کے الفاظ اور خیالات پیدا ہوئے۔" (آبِ حیات ص۲۱)

شمالی ہند میں سودا اور ان کے بعد انشا ر نے اس سلسلے میں بڑا کام کیا تھا مگر ان کے بعد شاعری نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا تھا۔ ذوق نے اس بدلے ہوئے ماحول میں پھر سودا اور انشا۔ کی یاد تازہ کی، انھوں نے قصیدوں میں علمی مسائل کو نظم کیا، بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھایا اور غزل جیسی لطیف صنف کو بھی اس کے لیے استعمال کیا، ان کی غزلوں میں ایسے اشعار بھی اکثر ملتے ہیں جن کے متعلق خیال ہوتا ہے کہ شاعر نے صرف کسی خاص مسئلہ کو نظم کرنے کے لیے یہ شعر کہہ دیا ہے مثلاً:

نخلِ گلِ مہندی نہ پہ نصفت سبو میں اے نگار ۔۔۔ تو کھڑا ہو رکھ کے میرا کاسۂ سر زیرِ پا

اگر نخلِ گلِ مہندی کی یہ تاثیر معلوم ہو گی کہ یہ بہار کا پھول ہے اس کا ذائقہ قدرے تلخ ہوتا ہے، پودے پودے کا عرق سوزشِ اعضا کے لیے مفید ہے خصوصاً جب وہ آگ یا گرم پانی سے جلنے کے سبب ہو۔

عدوئے نیش زن کے گھر سے میرا مہ جبیں نکلے ۔۔۔ الٰہی برجِ عقرب سے قمر جلدی کہیں نکلے

برجِ عقرب دوازدہ بروجِ فلکی میں سے آٹھواں ہے، اس کی شکل بچھو سے مشابہ ہے، بہ لحاظ تاثیر آبی ہے، رنگ سیاہ ہے، اس برج میں قمر کا ہونا عشق کرنے کی طرف اشارہ کرتا ہے ـــ ان خواص کو ذہن میں رکھیے، یہ کہنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے کہ شاعر کا مقصد ان ہی کو نظم کرنا تھا اس قسم کی متعدد مثالیں دیوانِ ذوق میں ملیں گی۔

یہیں تصوف کے متعلق بھی اتنا کہہ دینا مناسب ہے کہ تصوف اردو شاعری کے حاوی رجحانات میں سے ایک ہے اور ذوق کے زمانے میں تو اس کا زور اور بھی زیادہ تھا خود مرزا غالب بھی "مسائلِ تصوف" بیان کر کے "ولی" بننا چاہتے تھے اس دور میں مسئلہ وحدت الوجود کو زیادہ اہمیت حاصل تھی خواجہ میردرد بھی اسی کے قائل تھے لیکن اقبال نے آخر اس کی تردید کی اور اس کے مضر اور مہلک اثرات کو ظاہر و ثابت کیا، ذوق کے تصوف کے متعلق کوئی تحقیقی کام ابھی نہیں ہوا اس لیے کوئی قطعی بات کہنا قبل از وقت ہے البتہ ایک شعر میں انھوں نے وحدت الوجود کے مسئلہ پر نہایت عمدہ طنز کیا ہے:

لکھتا ہے شیخ مسئلہ وحدت الوجود ۔۔۔ لیکن دوئی عیاں ہے قلم کے شگاف سے

فلسفہ کی بحثوں کے متعلق بھی ذوق نے نہایت عمدہ بات کہی ہے:

کیا جانیں ہے زمانے کو حادث ہے یا قدیم ۔۔۔ کچھ ہو بلا سے اپنی کہ ہیں خانموں میں

مولوی نذیر احمد مرحوم نے اس شعر کے متعلق لکھا ہے:

"اگر تم میری صلاح مانو تو علم الکلام کی کتاب تو بھول کر بھی آنکھ اٹھا کر مت دیکھنا ایک بڑا نقصان جو طلبگارِ دین کو اس فن کی کتابوں سے پہنچتا ہے یہ ہے کہ اس کی طبیعت دینیات سے متشکک ہو جاتی ہے جس ترتیب سے میں نے تم کو دینیات میں غور کرنے کو بتایا ہے اس کا لحاظ بھی حیرت اختلات سے بچنے کے لیے مفید ہے جب انسان اس بات کو نصب العین کرے گا کہ میں فانی اور بے حقیقت مخلوق ہوں اور معلوم نہیں کہ بعد مرگ کیا پیش آئے میں نہیں سمجھتا کہ ایسا آدمی ان جھگڑوں کی طرف متوجہ ہونے کے لیے اپنی طبیعت کو حاضر پائے بعض باتوں سے تو وہ بایں خیال اعراض کرے گا کہ میں ان سے زیادہ اہم کام میں مصروف ہوں۔" (ابن الوقت ص۱۴۵)

غرض یہ کہ ذوق نے مختلف علوم و فنون کے مسائل کو غزل میں داخل کر کے غزل کو ایک نئی وسعت دینے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی مختلف اختلافات اور منفی اندازِ فکر سے ذہنوں کو آزاد بھی کرنا چاہا ہے لیکن یہ کام ان کے زمانے میں ممکن نہ ہو سکا۔ آزاد حالی اور نذیر احمد وغیرہ کے دور میں زمانے نے خود ذہنوں کو صحیح راہ پر لگا دیا۔

(۵)

ذوق کے ابتدائی اور آخری دور کے اندازِ فکر میں فرق کو سمجھنے کے لیے ہی ہم ایک غزل نقل کرتے ہیں یہ غزل انھوں نے آغازِ شباب میں کہی تھی، صرف یہی چند شعر اسی حالت میں عمدہ منتخبہ میں مل سکے۔

ہم ہیں اور سایہ ترے کوچہ کی دیواروں کا ۔۔۔ کام جنت میں ہے کیا ہم سے گنہگاروں کا

آتشِ دل سینہ میں مثلِ منقل — داغ سے انبار ہے انگاروں کا

آرزو ہے کہ جو خورشیدِ قیامت — سایہ اس کشتۂ ابرو پہ ہو خمداروں کا

ہائے وہ عاشقِ جانباز کہ — تک — ہدفِ تیر رہا تجھ سے کمانداروں کا

کیا تعجب ہے پس از مرگ بھی رہوے تو وہ — دل میں پیکاں توں کا اور سینہ میں سوفاروں کا

ذوق بے چیدہ کہاں زلف ہے اس کافر کی — ہے مگر نامۂ اعمال سیہ کاروں کا

آزاد لکھتے ہیں کہ عالمِ شباب کا مطلع خاص و عام میں عام ہو رہا تھا آخر عمر میں آکر غزل پوری ہوئی سنہ ۱۲۶۰ھ میں تیس ہزاری باغ میں کہی تھی۔ (دیوانِ ذوق ص ۶۴) چنانچہ کسی قدیم تذکرے میں مطلع کے سوا کوئی شعر نہیں ملا، دیوانِ ذوق میں بھی اس مطلع کے سوا مذکورہ بالا کوئی شعر نہیں ملتا البتہ جو غزل دیوانِ ذوق میں ہے مطلع مذکور کے علاوہ اس میں یہ اشعار ملتے ہیں:

محتسب گرچہ دل آزار ہے میخواروں کا — دیکھیے اک جام تو ہے یار ابھی یاروں کا

اتنا تو سوزِ فغاں ہو کہ چمن میں بلبل — خرمنِ گل کی جگہ ڈھیر ہو انگاروں کا

چرخ پر بیٹھ رہا جان بچا کر عیسیٰ — ہو سکا جب نہ مداوا ترے بیماروں کا

ہوں رنگیں حلقِ بریدہ کی ہمارے خونبار — گر تماشا تجھے منظور ہو فوّاروں کا

ہیں کماندار ترے تیرِ مژہ تشنۂ خوں — منہ کھلا رہتا ہے اس واسطے سوفاروں کا

کیوں نہ ہر تار میں سو دل ہوں گرفتار گرہ — جیلخانہ ہے محبت کے گرفتاروں کا

دیں گے جاں بوسۂ لعلِ نمکیں پر ہم بھی — جاں نثاری ہے اگر شیوہ نمکخواروں کا

بے سیاہی نہ چلا کام قلم کا اے ذوق — روسیاہی سروساماں ہے سیہ کاروں کا (دیوانِ ذوق)

پہلی غزل کے مطلع میں واقعی ایک کیفیت ہے ایک والہانہ پن ہے، چنانچہ ذوق نے اسے قائم رکھا اور تذکرہ نویسوں نے بھی اسے پسند کیا (دیکھیے عمدۂ منتخبہ، گلشنِ بے خار، گلستانِ بے خزاں، گلستانِ سخن، سخن شعرا وغیرہ) باقی تمام اشعار محض روایتی سوز و گداز پر مشتمل ہیں کوئی کیفیت نہیں چنانچہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ غزل دوبارہ پوری کرتے وقت شاعر نے ان کو قلم زد کر دیا تھا۔

تازہ غزل کے متعلق آزاد کا یہ قول کہ سنہ ۱۲۶۰ھ میں کہی گئی تحقیق طلب ہے البتہ آخر عمر کی تخلیق ضرور کہہ سکتے ہیں، اس کے مطلع پر غور کریں محتسب میخواروں کی دل آزاری ادائیگی فرض کے طور پر نہیں کرتا بلکہ اس کی نیت یہ ہے کہ اسے بھی ایک جام مل جائے اس کا ثبوت دوسرے مصرعے سے فراہم کیا کہ اسے ایک جام دے دیجیے تو وہ یاروں کا یار ہوگا۔ مضمون اس دور کی رسمِ رشوت خوری اور خیانتِ منصبی کی غمازی کرتا ہے اور سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ ذوق کا اپنا مشاہدہ بلکہ تاثر ہوگا، ڈاکٹر تنویر احمد علوی صاحب نے آجکل دسمبر سنہ ۶۲ء میں ذوق کی تحریروں کا جو عکس شایع کیا ہے اس میں ایک مصرعہ یہ بھی ہے:

الٰہی مدعا نکلے یہ رشوت خوار اڑ جائے

یہ بھی اس دور کی رشوت ستانی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

پہلے شعر کو بھی ذوق کا ذاتی تاثر کہہ سکتے ہیں؛ دلی میں اس وقت جو انتشارِ عام تھا اس نے ہر فرد کو بیقرار کر رکھا ذوق اسی بیقراری میں افادیت پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ فغاں میں اتنا سوز پیدا ہو جائے کہ خرمنِ گل کو بھی پھونک ڈالے ذوق کی زندگی میں تو یہ ممکن نہ ہوا البتہ کچھ ہی عرصہ بعد یہ آگ بھڑک اٹھی اور سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے واقعات ہمارے سامنے ہیں۔ غزل کے مقطع کو دیکھیے وہ بھی کیفیت سے خالی نہیں اس میں بھی ایک پیغام ملتا ہے، اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اب ذوق کی غزلوں میں جو سوز و گداز ہے اس میں ایک حد تک اصلیت کو بھی دخل ہے بیشک اس دور کی غزلوں میں بھی بعض شعر روایتی اور اشعار کی تعداد بڑھانے والے ہیں لیکن اگر غور کریں تو ذوق کے یہاں ہمیں ایسے نکات معلوم ہوں گے جو واقعی مفید اور قابلِ قدر ہوں گے، ذوق کے کلام میں ہمیں قدیم انداز کے ساتھ ساتھ ایک نئے دور کی جھلکیاں بھی مل سکتی ہیں اور اس لحاظ سے ان کے کلام کا مطالعہ کافی اہم ثابت ہو سکتا ہے۔

سن اُنّیس سو باسٹھ کا بہترین طنزیہ مزاحیہ ادب

احمد جمال پاشا

مجھے نہیں یاد پڑتا کہ برہمن نے کبھی کسی سال کو خراب بھی بتایا ہو۔ اصل یہی وہ واحد نکتہ ہے جس پر شیخ و برہمن ہمیشہ متفق پائے گئے لہذا میرے لیے بھی یہی بہتر ہوگا کہ میں بھی ان سے متفق ہو کر اس قران السعدین کو ساعت منحوس میں تبدیل ہونے سے بچا لوں۔

سن انیس سو باسٹھ کے بہترین ادب کے محض ایک پہلو یعنی طنز و مزاح کے وسیع اور عریض احاطے میں صحافتی کالم، مضامین، افسانے، خاکے، ناول، ناولٹ، مستقل مزاحیہ کردار، ڈرامے، فیچر، پیروڈی، انشائیے، تراجم، ڈائری، رپورتاژ، سفر نامے، خطوط، باقیات الصالحات، وکابیات، لطیفے، کارٹون، غزلیں، نظمیں، آزاد نظمیں، مثنویاں، شہر آشوب، بنجارہ نامے، قصائد، ہجویات، واسوخت، مراثی، ریختی، قطعات اور رباعیات وغیرہ آتی ہیں ان کے علاوہ نئے نئے رسالے، نئی کتابیں، نئے انتخابات، نئی آوازیں، نئے رجحانات، نئی تحریکیں اور نئی روشیں سامنے آتی ہیں۔ ان ہی کے ساتھ ہمیں پیچھے مڑ کر بھی دیکھنا ہے کاروان طنز و ظرافت کا کوئی راہی ہم سے بچھڑ تو نہیں گیا، ہماری متاع عزیز کے گرانمایہ سرمایے میں سے کچھ کم تو نہیں ہو گیا۔ اور بہ حیثیت مجموعی سال بھر میں ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا۔

سال بھر کے جائزے میں پہلی چیز سب سے زیادہ نمایاں یہ ہے کہ اس وقت ہمارے طنزیہ اور مزاحیہ ادب میں صحافت کا بول بالا ہے ہمارے بیشتر طنز و مزاح نگار محنت و مشقت کے ذریعے حیات و کائنات کے آفاقی مسائل سلجھانے کے بجائے روزمرہ کے ہنگامی واقعات اور سطحی موضوعات پر خامہ فرسائی کر رہے ہیں۔

کالم نویسی کی روایت کو سب سے پہلے منشی سجاد حسین نے اودھ پنچ لکھنؤ میں جنم دیا تھا مولانا محمد علی جوہر، خواجہ حسن نظامی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا چراغ حسن حسرت نے اسے وزن و وقار اور مجید لاہوری نے اسے مقبول عام کیا۔

ہمارے موجودہ صحافتی مزاح نگاروں کے میر کارواں مولانا عبدالماجد دریابادی، شوکت تھانوی، حیات اللہ انصاری، احمد ندیم قاسمی، طفیل احمد جمالی، ابراہیم جلیس، فکر تونسوی، خوشتر گرامی اور عبدالمجید سہالوی ہیں۔ ان سب کے یہاں گہرا سیاسی و سماجی شعور، بالغ نظری، گہرائی و گیرائی ہے ان کے ہاتھوں میں وقت کی نبضیں ہیں، ان کی آوازوں میں مسایل کی گونج اور قلم میں تلواروں کی کاٹ ہے۔ یہ روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے لے کر بین الاقوامی مسایل تک کی ناہمواری پر شدید طنز کر کے ہماری زندگی میں توازن پیدا کرنے کے مقدس فرض کو بڑی پابندی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔

یہ عہد مولانا عبدالماجد دریابادی کا عہد ہے ضروری نہیں کہ آپ ان کے مسلک سے بھی متفق ہوں مگر ان کے طنز میں جو شدت اور زہرناکی ہے وہ آپ بھی تسلیم کر لیں گے۔ ہر ہفتے صدق جدید لکھنؤ میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی سچی باتیں شایع ہوتی ہیں جن کو ہندوستان اور پاکستان کے بیشمار اخبار اور رسالے بڑے فخر اور پابندی کے ساتھ اپنے یہاں نقل کرتے ہیں۔ ان کی مقبولیت اور عظمت ہمارے دلوں میں ظفر علی خاں، سالک اور حسرت کی یاد تازہ کر دیتی ہے اس عہد کی امامت کا سہرا انہی کے سر ہے۔

پندرہ روزہ نمکدان کراچی میں "گر تو برا نہ مانے" سے "بت شکنی" کے نام پر رکھ کر قلم نکلے، پہلے مختار زمن لکھتے تھے اور اب نصر اللہ خاں لکھتے ہیں۔ نمکدان کے تیر اندازوں میں اودھ پنچ کے نوحتوں کی سی تیزی، شوخی اور طراری ہے، ان کی دوربین نظروں سے کسی بھی سیاسی، سماجی اور معاشرتی بدعنوانی اور بے اعتدالی سے بچ نکلنا محال ہے طفیل احمد جمالی کی "بت شکنی" صحافتی مزاح کی تاریخ میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔

روزنامہ جنگ کراچی اور راولپنڈی اردو کا سب سے کثیر الاشاعت اور مقبول عام روزنامہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اخبار طنز و مزاح پر سب سے زیادہ توجہ دیتا ہے۔ اس میں شوکت تھانوی کا "پہاڑ تلے" ابراہیم جلیس کا "وغیرہ وغیرہ" رئیس امروہوی کا مزاحیہ کردار "نواب مرزا اچھے صاحب قبلہ کا خاکہ" اور طنزیہ قطعہ اور

شفیع عقیل کا گرد و پیش شائع ہوتا ہے۔ جنگ کا مزاحیہ کالم بہت سے اخبار اور رسالے بغیر کسی حوالے یا حوالے کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔ اکثر اشاعتی ادارے ان تراشوں کی مدد سے مزاحیہ افسانچوں کے مجموعے تیار کر کے شائع کر دیتے ہیں جیسے شوکت تھانوی کا مارشل لا ــــ نمک مرچ، کارٹون اور جوکر وغیرہ۔ شوکت تھانوی، ابراہیم جلیس، رئیس امروہوی اور شفیع عقیل کے کالم عوام اور خواص میں بے حد مقبول و معروف ہیں خاص طور پر رئیس امروہوی کا "قطعہ" جو ہمیشہ دو دھاری تلوار ہونے کے علاوہ اپنے اندر ایک عجب کشش اور جاذبیت رکھتا ہے۔

روزنامہ امروز لاہور میں عنقا کے نام سے احمد ندیم قاسمی روزانہ "حرف و حکایت" کا کالم لکھتے ہیں۔ عنقا کے بیشتر موضوعات سماجی کے ساتھ ساتھ ادبی بھی ہوتے ہیں ادب کی یہ چاشنی ان کو عوام کے علاوہ خواص میں بھی مقبول بنائے ہوئے ہے۔ اسی وجہ سے "حرف و حکایت" کا یہ باغ و بہار کالم اردو کے صحافتی مزاح میں ایک مخصوص اہمیت کا حامل ہے۔

روزنامہ قومی آواز لکھنؤ گزشتہ ۱۸ سال سے اپنے پڑھنے والوں کو "گلوریاں" پیش کر رہا ہے۔ اس کے میزبان حیات اللہ انصاری اور عبدالمجید سہالوی کا ایک مخصوص لہجہ، انداز، تہذیب، رکھ رکھاؤ اور معیار ہے بہت رچا بسا گہرا سیاسی و سماجی شعور اور سوجھ بوجھ ہے ان کی ظرافت میں مقصدیت اور توازن کا خوشگوار آہنگ بہت عام ہے۔

روزنامہ ملاپ دہلی میں فکر تونسوی "پیاز کے چھلکے" لکھتے ہیں۔ فکر تونسوی صحیح معنوں میں صحافتی اور عوامی مزاح نگار ہیں ان کے پیاز کے چھلکے عوام میں بے حد مقبول ہیں، کوئی مسئلہ، کوئی گتھی غرض کوئی بات بھی ہو فکر تونسوی دم بھر میں اس کے چھلکے اتار کر رکھ دیتے ہیں ان کا سیاسی شعور ان کی ادبیت اور ان کی صحافت ان کی ظرافت پر حاوی ہے۔

خوشتر گرامی برسوں سے نہایت خاموشی کے ساتھ بیسویں صدی دہلی میں "تیر و نشتر" لکھ رہے ہیں ان کے ہر فقرے میں ایک مخصوص ادبی نشتریت پنہاں ہوتی ہے۔ ان کے یہ فقرے اور حاشیے ہماری سیاست، ادب، اور زندگی کی مختلف بے اعتدالیوں پر بڑا تیکھا طنز کرتے ہیں ان کے طنز میں مزاح کی نرمی اور گرمی کے ساتھ ساتھ توازن اور اعتدال بھی ملتا ہے جو فی زمانہ نایاب نہ سہی کمیاب ضرور ہے۔

ہفتہ وار بھوپال پنچ میں "اور پھر بد اہتی رہی" علامہ ڈھبیر کے نام سے تخلص بھوپالی لکھتے ہیں۔ تخلص کے قلم میں مبالغے کی دھمک ضرور ہے مگر یہ زخموں پر پھاہے رکھنے کے فن سے ناواقف ہے۔ زخموں کو کریدنا کوئی ان سے سیکھے ان کی شوخی نے بڑھ کر بے باکی اور بے حجابی کی صورت اختیار کر لی ہے۔

صدق جدید لکھنؤ، جنگ کراچی، نگران کراچی، امروز لاہور، قومی آواز لکھنؤ، ملاپ دہلی، بیسویں صدی دہلی، اور بھوپال پنچ بھوپال، کے علاوہ اس میدان میں روزنامہ نوائے وقت لاہور کا "سر راہے"، روزنامہ سیاست حیدرآباد دکن میں کوہکن کا شیشہ و تیشہ، روزنامہ پاسبان ڈھاکہ میں پروفیسر ارشد کاکوی کا شیشہ و تیشہ، روزنامہ انجام کراچی میں رمضانی کا برسبیل تذکرہ، روزنامہ اردو ٹائمز بمبئی میں علامہ ہرزن کا قطعہ اور پیر مغاں نے کہا، روزنامہ آبشار کلکتہ میں فرہاد کا سنگ و خشت اور ہفتہ وار آگ لکھنؤ میں علامہ نابناہی کا تندور خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پچھلے دنوں ہماری محفل سے ریاض جرولی اور شاہد صدیقی اٹھ گئے۔ ریاض جرولی اودھ پنچ کے آخری دور کے پرانے لکھنے والوں میں سے تھے انھوں نے منشی سجاد حسین کی آنکھیں بھی دیکھیں تھیں یہ ہمارے لیے اپنا قلمی دیوان "تفریحات ریاض" چھوڑ گئے ہیں۔ ریاض جرولی کا نامراد ڈاکٹر اور مرثیہ اسپ ہمیشہ ان کا نام زندہ رکھے گا۔ شاہد صدیقی کوہکن کے قلمی نام سے روزنامہ سیاست حیدرآباد دکن میں شیشہ و تیشہ کا مزاحیہ کالم لکھتے تھے اور خوب لکھتے تھے۔ شاہد قلم کے دھنی تھے، ان کے رنگ میں بڑی شوخی اور پرکاری تھی۔ ان کو شباب ہی میں موت نے آ لیا۔ دنیائے طنز و ظرافت کے لیے یہ دونوں حادثے ناقابل تلافی ہیں ــــ ان کے علاوہ اودھ پنچ لکھنؤ اور بھوپال پنچ بھوپال اس درمیان بند ہو گئے، پاک پنچ اور پھلجھڑی بھی اس دوران نظر نہیں آئے ان رسائل کے بند ہونے پر ہمارے طنزیہ و مزاحیہ شعراء نے مرثیے نہیں کہے مگر پھر بھی ان حالات کا ماتم ضروری ہے جو اس کا ذمہ دار ہے۔

صحافت کے بعد ادب کا وسیع و عریض میدان شروع ہوتا ہے اردو کے مزاحیہ ادب میں مضمون نگاری کا وہی درجہ ہے جو شاعری میں غزل کا۔ سال بھر کے جائزے سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے پرانے مزاح نگار رفتہ رفتہ میدان چھوڑ رہے ہیں۔ پرانی نسل میں گرمی، لگن اور فن پر ریاض کے مقابلے میں اطمینان، سہل پسندی اور خاموشی کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ نئی نسل زیادہ دم خم کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ غزلوں کی طرح مضامین بھی بے تحاشہ لکھے جا رہے ہیں۔ مگر قابل ذکر مضامین با آسانی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں اچھے مضامین کی یہ افسوسناک کمی خاصی تشویشناک ہے۔ مضمون نگاری (مزاح نگاری) دراصل ایک ایسی ریل گاڑی ہے جس میں صرف فرسٹ کلاس ہوتا ہے۔ دوسرے اور تیسرے درجے کے مسافروں کا اس میں گذر و سفر ممکن نہیں۔

اس سناٹے کو چراغ تلے اور اندیشۂ شہر نے توڑنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ شوکت تھانوی کی "بزم لطف" اور فرقت کاکوروی کی "مردہ دل خاک جیا کریں" سال رواں کے مزاحیہ ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مضامین رشید عرصے سے نایاب تھی مگر اس سال اس کا بھی نیا ایڈیشن آگیا ہے۔

افسانے اس سال نہ لکھے جانے کے برابر لکھے گئے۔ شوکت تھانوی، شفیق الرحمان اور فکر تونسوی ہمارے قابل ذکر افسانہ نگار ہیں۔ شوکت تھانوی کچھ قابل توجہ افسانے اس درمیان لکھے ہیں مگر شفیق الرحمن بالکل خاموش ہیں اور فکر تونسوی کالم نویسی کی طرف زیادہ متوجہ ہیں۔

ناولوں میں کرشن چندر کے گدھے کی واپسی، فکر تونسوی کا "پروفیسر بدھو" سید ضمیر جعفری کی "تین لڑکیاں۔ تین دادا" محمد خالد اختر کی "شیخ قربان علی" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جمیل جالبی نے منشی سجاد حسین کے ناول "حاجی بغلول" کو ایڈیٹ کیا ہے مگر انھوں نے اس کام کو محنت اور توجہ سے انجام نہیں دیا۔ "بغلول" کا سنہ تصنیف اور منشی صاحب کے حالات اس میں تقریباً ندارد ہیں۔ آخر میں انھوں نے کتاب کی جو فرہنگ تیار کی ہے وہ افسوسناک اغلاط سے عبارت ہے۔ مگر پھر بھی یہ اچھی کوشش ہے۔ منشی سجاد حسین کے دوسرے ناولوں (میٹھی چھری، طرحدار لونڈی، اور پیاری دنیا) کے نئے ایڈیشن بھی اسی سال سامنے آئے ہیں۔ سرشار کا "جام سرشار" اور ڈپٹی نذیر احمد کا ابن الوقت بھی شایع کیے گئے ہیں۔ ان سب کا تعلق ہماری کلاسکی ظرافت سے ہے۔

مرزا ظاہردار بیگ، ابن الوقت، خوجی، چچا چھکن، خالم، مرزا جی، منشی جی اور قاضی جی کے علاوہ اس سال ہمارے مزاحیہ ادب میں دو نئے کرداروں کا خوش گوار اضافہ ہوا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کا "مرزا ودود بیگ" اور عطیہ پروین کی "چچی"۔ مشتاق احمد یوسفی نئے مزاح نگاروں میں سب سے ممتاز اور محترم ہیں۔ "چراغ تلے" کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رشید احمد صدیقی اور پطرس سے کہیں زیادہ خون خرابے کریں گے۔ ان کا مرزا ودود بیگ ہر وقت ان کے ساتھ نظر آتا ہے۔ مرزا کا کردار بہت جاندار اور جیتا جاگتا ہے۔ خوجی کی طرح اس کے کوئی جسمانی کو تاہی نہیں ہے۔ نہ یہ خوجی اور بغلول کی طرح منہ زور عظمت کا احساس بھی ایک خاص انداز اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ مرزا کے یہاں ملتا ہے غرض اردو کے ابتک کے تمام مزاحیہ کرداروں میں ظاہر دار بیگ چچا چھکن اور شیطان کے بعد اتنا متوازن کردار ہمارے ادب میں یوسفی ہی نے پیش کیا ہے۔ عطیہ پروین کا چچی کا کردار ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ لوکھلاہٹ اور سڑیل پن اپنے اندر ایک عظمت کا احساس لیے ہوئے ہے ان کا یہ مستقل کردار اپنے اندر بڑی گنجائش رکھتا ہے۔ تخلص بھوپالی کی "پیا والی خالہ" اور فکر تونسوی کے پروفیسر بدھو میں بھی مزاحیہ کردار کی ایک جھلک ملتی ہے۔ مگر ان میں ابھی وہ وسعت اور لچک نہیں پیدا ہوسکی ہے جو مزاحیہ کردار کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

ریڈیو اور اسٹیج کے لیے اس دوران برابر ڈرامے اور فیچر لکھے اور خاکے اڑائے گئے مگر اس درمیان ہمارے سامنے آنے والی چیزوں میں سلطان کا "سو سال بعد" "لیڈی گرل" کے لیے ضرورت رشتہ اور ڈاکٹر محمد حسن کا "فٹ پاتھ کے شہزادے" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

خاکہ نگاری کی صنعت پر خاص توجہ کی جا رہی ہے۔ رشید احمد صدیقی کی "ہم نفسان رفتہ"، شاہد احمد دہلوی کی "گنجینۂ گوہر"، سید ضمیر جعفری کے "اڑتے ہوئے خاکے" اور تخلص بھوپالی کا "پوسٹ مارٹم" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ماہ منیر خاں صرف خاکے ہی لکھتے ہیں لیکن اگر وہ متفرق کرداروں کے خاکے اڑاتے رہنے کے کسی ایک کردار کے تخلیق کرنے پر اپنی ساری توجہ صرف کردیں تو اس بہانے اردو ادب میں ایک نئے کردار کا اضافہ ہو جائے ویسے ان کے میر صاحب کے کردار میں بڑی صلاحیت ہے۔

پیروڈی کے میدان میں کنہیا لال کپور، شفیق الرحمان، غلام عباس، محمد خالد اختر، م۔ نسیم، ضیاء الحسن موسوی، نسیم درانی، تخلص بھوپالی اور راجہ ممتاز پیش پیش نظر آتے ہیں۔ سال رواں کا اہم ترین کارنامہ کنہیا لال کپور کی پیروڈی "انار کلی" ہے۔

اردو ادب میں جدید انشائیہ کی تحریک کے قائد ڈاکٹر وزیر آغا ہیں۔ "خیال پارے" ہمارے جدید انشائیہ ادب میں حرف آخر کا درجہ رکھتا ہے اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ اس کی اشاعت سے اب تک ہمارے بیشتر انشائیہ نگاروں کے نئے انشائیے خیال پارے کی بازگشت اور انشائیہ پر منو خیال پارے کے مقدمے کا ناقص تجزیہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس میدان میں وزیر آغا اور مشکور حسین یاد کے علاوہ کم و بیش سب ہی "انشائیہ نگار" اس دور میں انشائیہ نگاری کے نام پر مضمون نگاری اور مزاح نگاری میں مصروف ہیں۔ نظیر صدیقی کے مجموعے "شہرت کی خاطر" کو کسی طرح سے بھی انشائیوں کا ترجمان نہیں دیا جاسکتا۔ یہ سیدھے سادے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین ہیں۔ نظیر صدیقی دراصل ہمارے اچھے طنز و مزاح نگار ہیں نہ کہ انشائیہ نگار۔ اسی

انشائیہ کے نام سے جو مختلف انتخابات شایع ہوئے ہیں ان مجموعوں میں بھی ہم کو سوائے انشائیہ نگاری کے سب ہی کچھ مل جاتا ہے۔ دراصل یہ ہلکے پھلکے مزاحیہ مضامین کے شگفتہ انتخابات ہیں جن کو مضمون تو بآسانی قرار دیا جا سکتا ہے مگر انشائیہ ہرگز نہیں۔

اس سال تراجم کی رفتار بہت اطمینان بخش رہی۔ اسٹی فین لی کاک، مارک ٹوئن، وڈ ہاؤس، ہیز بٹ اسو ٹیفٹ اور ولیم سرویان وغیرہ کے مضامین کے تراجم خاصی تعداد میں پیش کیے گئے۔ ترجمے کے باب میں ل احمد، شاہد احمد دہلوی، عثمان غنی، ابن انشا، ابراہیم رضوی، ضیاالحسن موسوی، ممتاز مفتی، افضل صدیقی، لطیف صدیقی، سریندر کمار اور اسرار عارفی کی کوششیں مستقل اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ڈائری، رپورتاژ اور خطوط دراصل پیروڈی کی صورت میں زیادہ پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں شوکت تھانوی اور فرقت کاکوروی خاصے نمایاں رہے۔

نثر کے مقابلے میں دراصل شعر و شاعری کے میدان میں زیادہ گرمی، جوش اور چہل رہی۔ جوش، شوکت تھانوی، سید محمد جعفری، کوکن، شاد عارفی، دلاور فگار، ابوالمجاہد زاہد، قاضی غلام محمد، اے ڈی اظہر، نذیر احمد شیخ، ماچس لکھنوی، مسٹر دہلوی، شوق بہرائچی، ظریف جبلپوری، شہباز امروہوی، رئیس امروہوی، مرزا محمود سرحدی، اور علامہ پاکٹ مار وغیرہ برابر اچھی تخلیقات پیش کرتے رہے۔ راجا مہدی علی خاں اور قاضی غلام محمد کے نئے مجموعۂ کلام کے علاوہ دلاور فگار کی ستم ظریفیاں، اے ڈی اظہر کی لذت آوارگی، ظریف جبلپوری کا فرمان ظرافت، ابوالمجاہد زاہد کا نگ و تازہ، ناشاد کا کلام بے لگام، کلام لق لق (حاجی لق لق کے کلام کا نیا ایڈیشن) اس سال شایع ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ سودا، غالب، اکبر اور شاد عارفی وغیرہ کے شعری مجموعے پاکٹ بکس کی شکل میں شایع ہوئے ہیں۔ پاکٹ بک والوں نے طنزیہ غزلیں اور نظمیں اور مزاحیہ غزلیں اور نظمیں کے عنوان سے دو انتخابی مجموعے بھی پیش کیے ہیں مگر ان دونوں مجموعوں میں ایک تو سنجیدہ نگارشات اور مروت کا دخل ہے دوسرے تاریخ اور معیار کا احساس ناپید ہے۔

طنز و مزاح پر ادھر تنقید و تحقیق کا خاصا کام ہوا ہے ڈاکٹر وحید قریشی (اکبر اور نئی علامات) ڈاکٹر وزیر آغا (انشائیہ نگاری، پطرس اور حاجی بغلول) ڈاکٹر شوکت سبزواری (اردو ادب میں طنز و مزاح) اسلوب احمد انصاری (ہمنفسان رفتہ) مظفر علی سید (اردو مزاح میں ایک نئی آواز) ممتاز حسین (ایک نیا مزاح نگار) طفیل احمد جمالی، بشیر بدر، منظر سلیم، رام لعل (اندیشۂ شہر کی ظرافت احمد جمال پاشا بہ حیثیت مزاح نگار۔ ایک نیا طنز نگار) ڈاکٹر اعجاز نقوی (اردو کی مزاحیہ صحافت، اردو کے مزاحیہ کردار، ایک نیا طنز و مزاح نگار) آفتاب اختر (اردو ظرافت کے خالص نمونے) کے علاوہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر عبدالسلام وغیرہ نے طنز و مزاح سے متعلق موضوعات پر بہت جاندار مقالے لکھے ہیں۔

ہمارے بیشتر ناقدین کی کمزوری ہے کہ وہ طنز و مزاح پر توجہ نہیں دیتے، چبائے ہوئے نوالے کھاتے اور کہی ہوئی باتیں دہراتے رہتے ہیں۔ دوسرے ان سب کے یہاں مطالعے کی کمی کا افسوس ناک حد تک شدید احساس ہوتا ہے۔

لطیفے ہمارے رسائل اور اخبارات میں برابر شایع ہوتے رہے ان میں نئے لطائف کی پھلجھڑیوں کے ساتھ پرانے اور گھسے پٹے لطائف بھی برابر دہرائے جاتے رہے۔ نمکدان، بھوپال پنچ، پھلجھڑی، جائزہ، کھلونا، بھائی جان، کلیاں، داستان گو، سرپنچ، نصرت اور دوسرے رسائل میں اکثر اچھے اور معیاری لطائف بھی دل کو فرحت بخشتے رہے۔ ریڈیو سے ملا نصیرالدین کے لطائف نشر کیے گئے ان کے علاوہ تبسم، تبسم، قہقہے اور نرم گرم جیسے مجموعے بھی شایع ہوئے اس درمیان انگریزی اور دوسری زبانوں کے اچھے لطیفے بھی بہ کثرت ترجمہ ہو کر ہم تک پہنچے۔

کارٹون بنانے والے کا یہ کمال ہوتا ہے کہ وہ ہماری روزمرہ کی زندگی کا چھوٹے چھوٹے واقعات سے لیکر دنیا کے عظیم ترین مسائل کی ناہمواری کو اس رخ سے پیش کرتا ہے کہ اس واقعہ کا مضحک پہلو ہمارے سامنے آجاتا ہے اور ایسی ہنسی آتی ہے جو ہماری فکر کو حرکت میں لاتی ہے۔ جمیل، حمید، بریان، نجمہ، شنکر، سبیر، عزیز، احمد، پرکاش، محمود وہاب اور شہاب جیسے ممتاز کارٹون کاروں نے اپنے نرم گرم خطوط کے ذریعہ سیاست، ادب، علم اور زندگی کے ہر گوشے میں ہماری رہنمائی کی ہے۔ قیامت کی پیشگوئی کرنے والے نجومیوں، بشیر ساربان، ٹیڈی ازم، سیاست، لیڈری، عشق، بے ٹکٹ مسافر، تیز رفتار سواریاں، عالمی، مرکزی، صوبائی اور مقامی ارباب حل و عقد، ادیب، شاعر، فلسفی، فیشن کے مارے، بوہیمیں، قومی یک جہتی، امن عالم، اتحاد و انسانیت کے نعرے لگانیوالے، غذا میں آمیزش کرنے والے اور ٹیکس پر ٹیکس لگانے والوں کی

(باقی صفحہ ۱۱۲)

مخمور سعیدی

اجنبیت باہم اس درجہ کہاں تھی پہلے
تھی وہاں بھی وہی صورت جو یہاں تھی پہلے

اب اک آنسو بھی نہیں ہے سرِ مژگاں لیکن
چشمِ تر تھی کہ جواہر کی دکاں تھی پہلے

وہ فسونِ نگہِ ناز، ارے کیا کہنا
ٹھہری ٹھہری یہی عمرِ گزراں تھی پہلے

بن گئی کلفتِ دل تلخیٔ جاں کیا کہیے
جو نظر راحتِ دل عشرتِ جاں تھی پہلے

کر دیا آبلہ پایانِ جنوں نے سیراب
خاکِ ہر دشت و چمن، تشنہ دہاں تھی پہلے

یہ نتیجہ ہے ترے غم سے سبکدوشی کا
زندگی اتنی گراں بار کہاں تھی پہلے

اب بھنور بن کے ڈبونے کو جو بیتاب ہوئیں
کشتیِ دل انھیں موجوں پہ رواں تھی پہلے

زندگی بھر کے لیے روگ بنی جاتی ہے
اک خلش سی جو قریبِ رگِ جاں تھی پہلے

کتنی محجوب سی دنیا کی طرف اٹھتی ہے
وہ نظر جو تری جانب نگراں تھی پہلے

ہم اک امید پہ بڑھ آئے ہیں آگے مخمور
ورنہ دنیا وہیں اب تک ہے جہاں تھی پہلے

مولوی محمد افضلی

بیزار مجھ سے گرچہ رہا کیجیے گا آپ
میرا ہی ذکر سب سے سوا کیجیے گا آپ

مانا کہ دور دور رہا کیجیے گا آپ
لیکن نہ ضبط ہوگا تو کیا کیجیے گا آپ

آئینے میں نہ جانیے کیا دیکھ دیکھ کر
احساسِ غم کو طول دیا کیجیے گا آپ

ہوگا نہ اضطراب بظاہر مرے لیے
دل میں تو بے قرار رہا کیجیے گا آپ

بستر پہ بار بار بدلیے گا کروٹیں
راتوں کو چپکے چپکے دعا کیجیے گا آپ

کیجیے گا بار بار بھلانے کی کوششیں
ہم کو ہمیشہ یاد کیا کیجیے گا آپ

کوشش سے لائیے گا لبوں پر ہنسی مگر
دل ہی جو رو پڑے گا تو کیا کیجیے گا آپ

جب چارہ گر بنا نہ سکے گا مآلِ غم
بچنے کی میرے دل سے دعا کیجیے گا آپ

مجبور ہو کے غیر کی تسکین کے لیے
خود مجھ پہ اعتراض کیا کیجیے گا آپ

تنہائیوں میں میرے تصور کے سامنے
رو رو کے پھر سے عہدِ وفا کیجیے گا آپ

لیجیے مرا سلام وہ دن بھی قریب ہے
جب میری بے رخی کا گلہ کیجیے گا آپ

یہ بد دعا نہیں ہے مگر افضلی کے بعد
بے وجہ سوگوار رہا کیجیے گا آپ

باب الانتقاد

جذباتِ نادر (ترقی اردو بورڈ ایڈیشن) پر ایک نظر

رشید حسن خاں

نادر علی خاں نادر کاکوروی (متوفی اکتوبر ۱۹۱۲ء) اپنے زمانے کے معروف شاعر، اور نظم نگاری کی تحریکِ جدید کے قابلِ ذکر نمایندے تھے۔ انھوں نے انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کیے، اور اُس طرز کی طبع زاد نظمیں بھی کہیں۔ ان کا ایک ترجمہ "گزرے ہوئے زمانے کی یاد" آج بھی تاثیر و دلکشی کا اعلا نمونہ ہے۔ خیال کو زیادہ سے زیادہ سادگی کے ساتھ پیش کرنا، بھاری بھرکم الفاظ اور پرشور اندازِ بیان سے دامن بچانا، اور لفظوں کے انتخاب میں مرصع سازی کے بجائے محض ادائے خیال کی ضرورت کا خیال رکھنا، اُن کا خاص انداز تھا۔ اُن کی نظموں میں ہر جگہ یہ محسوس ہوتا ہے، کہ شاعر کے پیشِ نظر طرزِ ادا میں پیچ و خم پیدا کرنے، چونکا دینے والا اندازِ بیان اختیار کرنے، اور مرصع شعر گوئی کے بجائے، کسی خیال کو بہ وضاحت انداز سے نظم کر دینے کا اصول رہنما تھا۔ اُن کی کچھ نظمیں یقیناً ایسی ہیں، (جن کو پڑھ کر آج کے بہت سے نوجوان نظم نگار (جو ابہام و ژولیدہ بیانی کے اندھیرے میں بھٹکتے پھرتے ہیں، اور اپنے ساتھ دوسروں کے صبر و ضبط کا بھی جا و بے جا امتحان لیتے رہتے ہیں) بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

حالی و آزاد کے بعد جن لوگوں نے نظمِ جدید کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا، اور اُردو نظم کو مغربی خیالات، و اندازِ بیان سے آشنا کیا، اور اِس طرح اُس میں وسعت و تنوع کے مستقل عناصر کا اضافہ کیا اُن میں نادر کا نام بھی ہے۔ اُن کے ذکر کے بغیر اور اُن کے کلام کو پیشِ نظر رکھے بغیر، اردو نظم کا تاریخی جائزہ مکمل نہیں ہو سکتا۔

نادر کی نظموں کا مجموعہ دو حصوں میں الگ الگ چھپا تھا۔ دوسرا حصہ ۱۹۱۱ء میں نولکشور پریس سے شائع ہوا تھا، اس میں ان کی مثنوی "لالہ رُخ" بھی شامل تھی۔ یہ مجموعے مدت سے کمیاب تھے۔ اردو اکیڈمی سندھ کراچی نے، ترقیِ اردو بورڈ کراچی کی اعانت سے، ۱۹۶۱ء میں ان دونوں مجموعوں کو، ایک جلد میں شائع کر دیا ہے۔ یہ مجموعہ نہایت خوب صورت ٹائپ میں چھپا ہے۔ مضبوط جلد، خوب صورت گرد پوش، عمدہ کاغذ، غرض آرایشِ بیرون در کے سارے لوازم سے آراستہ ہے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے، کہ اس کی ترتیب میں ساری ضروری باتوں کو پوری طرح ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔

بہت سی اچھی کتابیں عموماً بار بار نہیں چھپتی ہیں۔ خصوصاً کسی پرانے شاعر کا مجموعۂ کلام۔ اب بظاہر دس، پندرہ برس تک اس مجموعے کا دوبارہ شائع ہونا مشکل ہے۔ اِس لیے یہ بہت ضروری تھا کہ اس اشاعت میں حسنِ طباعت کے ساتھ ساتھ اس طرف بھی توجہ کی جاتی کہ نادر کا جو کلام مختلف رسالوں میں منتشر ہے، اُس کو بھی شاملِ مجموعہ کر لیا جائے۔ کلامِ نادر کا دوسرا حصہ ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا تھا۔ نادر کا انتقال اکتوبر ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ دو ڈھائی برس کی اِس مدت میں، انھوں نے جو نظمیں کہیں، وہ اِدھر اُدھر بکھری ہوئی ہیں۔ پرانے رسالوں کے فائل روز بروز کم یاب ہوتے جا رہے ہیں۔ اِس بات کا شدید احتمال ہے کہ نادر کی یہ نظمیں کچھ دنوں کے بعد فراموش ہو جائیں گی۔

کتابیں اِس سے پہلے بھی چھپتی تھیں، آج بھی چھپتی ہیں۔ لیکن آج کل کسی کتاب کا نیا اڈیشن شائع کرنے کے کچھ اصول ہیں، جن کو پیشِ نظر رکھنا لازمی سمجھا جاتا ہے۔ نادر کا یہ مجموعہ ترقیِ اردو بورڈ جیسے معیاری ادارے کی اعانت سے شائع ہوا ہے۔ اس لیے اِس میں تو ترتیب کے اُن اصولوں کو بہر طور ملحوظ رہنا چاہیے تھا۔ کسی پرانی کتاب کو اُسی طرح چھاپ دینا ایسا معمولی کام ہے جس کو ہر معمولی سے معمولی پبلشر کر سکتا ہے، برابر اس کے نمونے دیکھنے میں آتے رہتے ہیں۔ اگر معقول ادارے بھی یہی کرنے لگے، تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح امتیاز کیا جا سکے گا؟

اس سے بھی زیادہ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ نقل مطابقِ اصل کا اصول، جس کا دعوا کئی جگہ کیا گیا ہے، پوری طرح ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ خاص طور سے صحتِ متن میں۔ متن جگہ جگہ غلط ہے۔ جس کے سبب سے یہ ضروری ہو گیا ہے، کہ جو لوگ صحیح متن کے طلب گار ہوں، وہ پہلے پرانا اڈیشن ڈھونڈھیں۔

ں سے نئے اڈیشن کی تصحیح کریں، اور پھر پڑھیں۔ پرانا اڈیشن بقول مرتب، نایاب کی حد تک کم یاب ہے، اس لیے نتیجہ معلوم!!

اسی طرح جو لوگ یہ چاہتے ہیں، کہ نادر کا مکمل کلام پڑھیں، وہ اس مجموعے کو خریدنے کے بعد مختلف لائبریریوں میں جاکر پرانے رسائل کی ورق گردانی کریں، ور اُن نظموں کو نقل کریں، جو اس مجموعے میں نہیں ہیں۔ یہ کوئی میر و سوداؔ کا کلیات تو تھا نہیں، جن کو ہر شخص مرتب نہیں کرسکتا۔ معمولی تلاش اور ضروری اہتمام سے کام لیا جاتا، تو مکمل مجموعہ بہ آسانی مرتب ہوسکتا تھا۔ اگر اتنی مشکل پسندی بھی بارِ خاطر ہو، تو اس جھمیلے میں پڑنے ہی کی کیا ضرورت ہے!! معمولی پبلشر یہ کارِ ہنر ضرور کرتے ہیں کہ کسی کتاب کو ردّی میں سے ڈھونڈ نکالا، یا کسی لائبریری سے لے آئے، اور اُس کو حوالۂ کاتب کردیا۔ نیا اڈیشن بہ آسانی تیار ہوگیا۔

ذیل میں کچھ فروگذاشتوں کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے، اس توقع کے ساتھ کہ آیندہ جو کتابیں شائع ہوں وہ اس آلودگی سے پاک رہیں، تاکہ ایسے اداروں کے معیار و اعتبار پر حرف نہ آئے۔

"جذبات نادر" حصہ دوم کے قدیم اڈیشن میں، حصہ منظومات کے بعد اور مثنوی سے پہلے، ایک صفحے کا "صحت نامہ" ہے، جس میں بارہ غلطیوں کی صحیح کی گئی ہے۔ نئے اڈیشن میں وہ غائب ہے، اور غلطیوں کی تصحیح بھی نہیں کی گئی ہے۔ حالانکہ اصولاً اس اڈیشن میں ان غلطیوں کی تصحیح کرنا چاہیے تھی۔ نقل مطابق اصل کا لحاظ رکھتے ہوئے، اُن غلطیوں کو بھی بعینہٖ رکھنا ضروری تھا، تو صحت نامے کو بھی نقل کرنا ضروری تھا۔ ذیل میں قدیم اڈیشن سے اس صحت نامے [illegible] کیا جاتا ہے۔ آسانی کے لیے صحت نامے میں بائیں طرف نئے اڈیشن کے صفحات اور سطروں کو بھی درج کردیا گیا ہے۔ نیز [illegible] میں نمبر شمار کا بھی اضافہ ہے:

صحت نامہ جذبات نادر					جدید اڈیشن میں	
شمار	صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر
۱	۲۱	۳	سکا تھا	چکا تھا	۱۲۹	۴
۲	۲۴	۴	کوہ طور	فرطور	۱۳۴	۴
۳	۳۱	۱۳	محنت	مشقت		
۴	۳۵	۱۵	مند	بند		
۵	۳۷	۱	اپنے مال	اپنے بال	۱۶۱	۶
۶	۵۰	آخری	انتکار	انتظام	۱۸۵	۸
۷	۵۱	″	یہ بڑی	ہے تری	۱۸۷	۹
۸	۵۴	″	نام کی	قوم کی	۱۹۱	۱۳
۹	۷۹	[illegible] ۱۲	خرف	خوان	۲۳۲	۰
۱۰	۹۱	۱۵	کس جال	کس حال	۲۶۰	۳
۱۱	۹۲	۹	یاد ہو	یاد ہیں	۲۶۲	۳
۱۲	۹۳	۱۳	بہادر	بہادر مرحوم	۲۶۴	۲

اس سلسلے میں یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا، کہ جدید اڈیشن میں، بعض غلطیاں درست کردی گئی ہیں، اور کچھ کو چھوڑ دیا گیا ہے، نیز قدیم اڈیشن کے، اس "صحت نامے" میں بھی، بعض غلطیوں کی جو نشان دہی کی گئی ہے، وہ بجائے خود صحیح نہیں ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے۔ شمار کے عدد سے صحت نامے کے مطابق ہیں۔

(۱) جدید اڈیشن میں یہ غلطی نہیں ہے۔

(۲) قدیم اڈیشن میں "کوہ نور" ہے۔ یہی جدید اڈیشن میں ہے۔ اور صحیح بھی یہی ہے۔ "صحت نامہ" میں اس کو غلط لکھا گیا ہے۔ پہلے مصرع میں "کوہ طور" ہے، اور یہ بھی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

(۳) یہ تصحیح بھی "صحت نامہ" میں غلط کی گئی ہے۔ قدیم و جدید میں یہاں "محنت" ہے اور ٹھیک ہے۔

(۴) "صحت نامہ" میں یہ تصحیح بھی بے محل ہے۔ شعر میں کوئی غلطی نہیں ہے۔

(۵) جدید میں یہ غلطی موجود ہے۔

(۶) جدید میں یہ غلطی موجود ہے۔ مرتب نے جگہ جگہ اس کا التزام کیا ہے کہ اگر کوئی لفظ غلط نقل کیا گیا ہے یا قافیہ کہیں غلط ہے، تو حاشیے میں نوٹ دے دیا ہے۔ لیکن یہاں قافیہ میں "انتظام" کے بجائے، "انتظار" لکھا ہوا ہے (قدیم اڈیشن کے مطابق) اور اس کو علی حالہٖ چھوڑ دیا گیا ہے۔

(۷) "صحت نامہ" کے لحاظ سے، قدیم اڈیشن میں "یہ تری" ہونا چاہیے۔ لیکن متن میں "یہ تری آب و ہوا میں گونہ تاثیر نشاط" درج ہے۔ یہی جدید میں ہے۔ اس لحاظ سے "غلط" کے خانے میں "یہ تری" صحیح نہیں ہے۔ البتہ تصحیح ٹھیک کی گئی ہے۔ یعنی "ہے تری آب و ہوا میں" ہونا چاہیے۔ جدید میں، نقل مطابق اصل سے کام لیا گیا ہے۔

(۸) یہ غلطی جدید اڈیشن میں بعینہٖ موجود ہے۔ تعجب ہے کہ مرتب صاحب کو اس مصرع میں کوئی عیب نظر نہیں آیا۔ یا ع نام کی قدمت سے اپنے کو بچایا جاتا تھا میں۔

(۹) یہاں جدید میں تصحیح کر دی گئی ہے۔

(۱۰) جدید میں یہ غلطی موجود ہے۔

(۱۱) صحت نامے میں، "یا دہو" کے بجائے، "یا دہیں" لکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ جدید اڈیشن میں، اس کی صحت نامے کے مطابق تو تصحیح نہیں کی گئی ہے۔ البتہ تصحیح مزید سے کام لے کر، یہاں، "یاد ہوں" لکھا گیا ہے۔

(۱۲) جدید میں یہ تصحیح نہیں کی گئی ہے۔

سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ ہے، کہ جدید اڈیشن میں جگہ جگہ متن غلط ہے۔ اور اس سلسلے میں بے حد بے احتیاطی یا بے پروائی سے کام لیا گیا ہے۔ ایسے کچھ مقامات کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

جدید اڈیشن میں	قدیم اڈیشن میں
یہ حبس ہیں ہو آب دار (ص ۲۴۰)	حبس میں ہے
میں آپ کی ہلکتے ہوں (ص ۲۵۰)	میں آپ ہی
اے خبط یا وہ گوئی دور و دراز (ص ۲۵۰)	یا وہ گردی دور و دراز
شب تم نیند بھی اول تو (ص ۲۵۵)	نیند ہی اول تو
آہ بھی تیر ہے گر آہ ہو تاثیر کے ساتھ (ص ۲۵۰)	گر آہ ہے
گویا ندیا بہتی جاتی ہے (ص ۱۸۲)	گویا دنیا (یہ نظم رسالۂ زمانہ مارچ ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں دنیا کے بجائے کشتی ہے)
سارنگی کی تال وہ سریلی (ص ۲۹)	تان وہ سریلی
بگولوں میں تڑاکے اڑتی ہیں اور پھڑ پھڑاتی ہیں (ص ۲۰۰)	پھڑ پھڑاتی ہیں۔
ابھی اک کھیپ آئی ہے ابھی اک آنے والی ہے (ص ۱۶۷)	ابھی اک کھیپ آئی اور ابھی اک آنے والی ہے
اور اک کھنڈر لاکے کہ تھا وہ گنبد افراسیاب (ص ۱۴۱)	اور اک کھنڈ پل کہ تھا وہ

اتناکہ اس میں سوز ہے (اور) اس میں ساز ہے (ص ۲۵۱)	قدیم میں لفظ "اور" موجود ہے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کو قوسین میں کیوں لکھا گیا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا قدیم میں "اور" نہیں تھا مرتب نے اضافہ کیا ہے۔
اچھا ہے بہت ہندو مسلماں کا اتفاق	قدیم میں لفظ "بہت" نہیں ہے۔ اس لیے یہاں اس کو قوسین میں لکھنا چاہیے تھا۔

ص ۲۳۹ پر حاشیے میں یہ عبارت بھی موجود ہے: "۲ حاشیہ از نادر، رتی والمیک"۔ یہ عبارت قدیم اڈیشن میں نہیں ہے۔ البتہ ۱ کے تحت جو عبارت درج کی گئی ہے، وہ قدیم میں موجود ہے (یہ لکھنا بے محل نہ ہوگا کہ یہ نظم جولائی سنہ [illegible] کے زمانہ میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں پہلا حاشیہ بھی نہیں ہے۔)

مرتب نے یہ اہتمام کیا ہے کہ جہاں کوئی لفظ غلط نظم ہوا ہے، یا اور کوئی فروگذاشت ہوگئی ہے، اُس کو حاشیے میں ظاہر کر دیا ہے۔ لیکن متعدد مقامات ایسے ہیں، جہاں یہ التزام قائم نہیں رہ سکا ہے۔ اس سے عجیب صورتِ حال پیدا ہوگئی ہے۔ گویا مرتب کی رائے میں ان مقامات پر کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہے! ایسے چند مقامات درج ذیل ہیں۔

ص ۲۴۳ پر رباعی کا ایک مصرع ہے: "ٹوٹی ہوئی شیشہ کی رہی ہے جھنکار"۔ قدیم میں بھی "ٹوٹی ہوئی" لکھا ہے۔ نقل مطابقِ اصل کی دھن میں یہ نہیں دیکھا گیا، کہ یہاں "ٹوٹے ہوئے" کا محل ہے۔ اگر قدیم کتابت میں تصرف نامناسب تھا، تو "کذا" ہی لکھ دیا جاتا۔

ص ۷۷، پر ایک شعر ہے ؎ خم و مینا میں تلچھٹ سے کیا کہ اک آتور باقی ہے :: مگر مستوں کے دل میں شوق ابھی بے طور باقی ہے۔ اس شعر میں لفظ "بے طور" پر یہ حاشیہ لکھا گیا ہے۔

" آتور میں واو مجہول ہے۔ دور، طور، میں معروف۔ مرتب۔"

مجھ کو اپنے قصورِ فہم کا اعتراف ہے کہ میں یہاں "بے طور" میں طور کو بہ فتحِ اول سمجھتا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ یہ بہ ضمِ اول ہے اور بہ واو معروف! سبحان اللہ!! اس سے قطع نظر کر کے یہ عرض کرنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ حاشیے کی عبارت مفہوم سے بے نیاز ہے۔

ص ۷۵، پر یہ مصرع ؎ یہ رفتگانِ خاک جن کی تمام عمر ـــ صریحاً ساقط الوزن ہے۔ اور اس پر کوئی نوٹ نہیں ہے۔

ص ۷۷، پر مندرجۂ ذیل بند بھی ہے۔

کیا ہے بشر ایک خوشنما طائر ہے مجبور کبھی کبھی بہ زور آور ہے
نالاں ہے کبھی بارِ زمیں کے نیچے اور زمزمہ ساز بیٹھی اس پر ہے

مرتب نے کسی جگہ حاشیے میں یہ لکھا ہے کہ یہاں قافیہ صحیح نہیں ہے۔ حرکات بدل گئی ہیں، لیکن "طائر"، اور "زور آور" میں اُن کو کوئی غلطی محسوس نہیں ہوئی۔

ص ۳۰۲ پر ایک مصرع ہے، ؎ افسوس اک بات وہ بھی جزبات۔ مرتب نے لفظ "جزبات" سے متعلق حاشیے میں لکھا ہے "کذا"۔ گویا یہ لفظ جزبات ان کی رائے میں صحیح نہیں ہے۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں۔ یہاں "جزبات" "جزوی بات" کے مفہوم میں ہے اور صحیح ہے۔

اسی صفحے پر ایک مصرعہ ہے ؎ ایک شکوہ ایک بے اصل بات ـــــ اس پر مرتب نے نوٹ دیا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ نادر نے یہاں قافیے میں لفظ "اصل" کو تلفظِ عام کے مطابق نظم کیا ہے لیکن انھوں نے اس پر غور نہیں فرمایا کہ ابتدائے مصرع میں لفظ "ایک" نے مصرع کو ساقط الوزن بنا دیا ہے "اک" کا محل ہے۔

صحتِ املا اور یکسانیتِ املا کا حال سب سے زیادہ قابلِ رحم ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنے بڑے ادارے سے شائع ہونے والی کتابوں میں، اس کا بھی اہتمام نہیں کیا جا سکتا! چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

املا میں یکسانیت کی نام کی کوئی چیز نہیں ہے ایک لفظ چار جگہ ایک طرح ہے، دس جگہ دوسری طرح، مثلاً۔

مجکو ص ۔ ۱۰۱، ۱۲۹، ۱۳۴، ۱۳۵ مجھکو ص ۔ ۱۲۶، ۱۳۱، ۱۳۲ مجھ کو ص ۱۳۴، ۱۵۵

تجکو ص ۱۳۵ — تجھکو ص ۱۲۷، ۱۳۳، تجھ کو ص ۹۱، ۱۴۵
اسکو ص ۲۲۰ — اس کو ص ۲۲۳
ڈھونڈھتا ص ۱۲۶، ۱۲۸، — ڈھونڈتا ص ۱۴۰

غلط املائی بھی کمی نہیں ہے۔ میں صرف ایسے الفاظ کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں جن کے آخر میں ایک "ھ" زائد ہے۔

آنکھہ ص ۸۹، ۱۴۵ — دیکھہ ص ۹۰، ۱۳۰ — ساتھہ ص ۱۲۰ — تجھہ ص ۱۲۸، ۱۳۲
مجھہ ص ۱۳۱، ۱۳۲ — بیٹھہ ص ۱۲۹ — کچھہ ص ۱۳۳ — تجھہی ص ۱۴۰ — ہاتھہ ص ۱۴۵

مندرجۂ بالا دونوں طرح کی مثالیں، محض مشتے نمونہ از خروارے کا حکم رکھتی ہیں۔ ان کی اس کتاب میں اتنی ہی بہتات ہے، جتنی امانت کے یہاں ضلع جگت کی۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ صرف "ھ" کے اضافے ہی تک یہ غلطی محدود ہے۔ ایسے بھی مقامات ہیں، جہاں "ھ" ہونا چاہیئے، اور غائب ہے مثلاً "ڈیوڑھی" ڈیوڑی بن گئی ہے (ص ۱۰۸) اور صرف "ھ" کی کمی زیادتی تک بھی یہ محدود نہیں ہے۔ وہ ساری غلطی ہائے املا موجود ہیں، جو معمولی معمولی ناشروں کی شائع کی ہوئی کتابوں میں ہوتی ہیں۔

منشی فخر الدین سفیر کاکوروی، نادر کے ہم عصر بھی تھے اور ہم وطن بھی۔ انھوں نے نادر کی وفات پر، رسالۂ زمانہ کے شمارۂ اکتوبر ۱۹۱۲ء میں ایک تعزیتی مضمون لکھا تھا — اس مضمون کو جدید اڈیشن کے آخر میں شامل کر لیا گیا ہے۔ لیکن کئی بوالعجبیوں کے ساتھ۔ مضمون سے پہلے مرتب صاحب نے بطور تعارف لکھا ہے:

"نادر کاکوروی کی وفات پر صفیر بلگرامی کا اظہار تعزیت"

ملاحظہ فرمایا! مرتب صاحب کی رائے میں سفیر[۱] کاکوروی، اور صفیر بلگرامی[۲] میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مضمون کے آخر میں لکھا ہوا ہے "صفیر از کاکوری" مقدمے کے آخر میں مرتب نے لکھا ہے: "اس مجموعے میں صفیر کاکوروی مرحوم کا ایک مضمون بھی شامل کر لیا گیا ہے"۔ یہاں وہ "بلگرامی" تو نہیں بنے، البتہ صفیر (بہ صاد) بدستور بنے رہے۔

مرتب نے کسی جگہ دعوا کیا ہے، کہ نقل مطابقِ اصل کے اصول سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن اُن کا یہ دعوا صحیح نہیں ہے۔ دو، تین مثالیں، محض اختصار کے لیے پیش کی جاتی ہیں:

مثنوی لالہ رخ کے آغاز میں ص ۲۷۱ پر پہلی سطر میں لکھا ہوا ہے (نقل سر ورق) گویا اس صفحے پر قدیم اڈیشن کے صفحۂ اول کی مکمل نقل ہے۔ (۱) شروع میں لکھا ہوا ہے: "مثنوی لائٹ آف دی حرم" جب کہ قدیم میں صرف "مثنوی لائٹ آف حرم" ہے (۲) اسی طرح چھٹی سطر میں "مثنوی لالہ رخ" لکھا ہوا ہے۔ قدیم میں صرف "لالہ رخ" ہے۔ (۳) اسی طرح ص ۲۷۲ پر مرتب نے آخری سطر میں لکھا ہے (منقول از نسخۂ اول بجز شمار صفحات) اگر نقل الی الاصل کا پورا پورا حساب کتاب کیا جائے، تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ قدیم فہرست میں عنوانات ۱۹ ہیں، جب کہ اس میں ۲۱ ہیں۔ بات یہ ہے کہ دو عنوان "سحاب ملال" اور "نور محل کی خوش الحانی" فہرست میں شامل نہیں تھے۔ اصل کتاب میں موجود تھے۔ اگر مرتب کی مراد یہ ہے کہ یہ صفحہ بالکل قدیم اڈیشن کے صفحے کی نقل

---

[۱] سفیر کاکوروی کے حالات کے لیے دیکھیے، خمخانۂ جاوید جلد چہارم ص ۲۱۹۔

[۲] صفیر بلگرامی کا انتقال ۱۳۰۸ھ میں ہوا ہے (مطابق ۱۸۸۹ء) تاریخ لطیف (قلمی، کتاب خانہ رام پور) میں جلال کے صاحبزادے، میر مہدی کمال کا قطعہ تاریخ وفات موجود ہے جس کا آخری شعر یہ ہے:

کلک نے لکھ دیا کمال ان کی وفات کا یہ سال ؎ لو ہوئے جا کے اب صفیر، روح الامیں کے ہم صفیر

ہے، تو اس کا اظہار ضروری تھا کہ یہاں یہ عنوانات اضافہ مرتب ہیں۔ اس کے علاوہ سطرِ اول میں "لائٹ آف دی حرم" میں لفظ "دی" زائد ہے۔ قدیم میں "لائٹ آف حرم" ہے۔

قدیم اڈیشن میں رباعی "خمخانہ میں میرے جشنِ احباب رہے" "نغمۂ تمہید" کے بعد ہے۔ جدید میں "نغمۂ تمہید" سے پہلے علاحدہ ایک صفحہ پر درج ہے۔

جدید اڈیشن میں ص ۷، پر فہرست مضامین حصہ دوم ہے۔ ص ۷ کے آخر میں قوسین میں لکھا ہوا ہے، (علاوہ شمارۂ صفحات اصل نسخے سے منقول) اس کا عالم یہ ہے کہ جدید اڈیشن میں شمارۂ ۳۳ کے آگے صرف "غزلیات" لکھا ہوا ہے، جب کہ قدیم میں "غزلیات عاشقانہ فارسی و اردو" لکھا ہوا ہے۔

شمارۂ ۳۴ کے آگے، جدید اڈیشن میں "متفرقات" لکھا ہوا ہے۔ قدیم میں اس کے بجائے یہ عبارت ہے "تاریخ دیوان ملک الشعراء امیر الدولہ سعید الملک سر راجہ امیر حسن خاں صاحب بہادر ممتاز جنگ مرحوم"

قدیم رسائل کی ورق گردانی کی جاتی، تو نادر کی منتشر نظموں کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی تصحیحات یا اُن سے متعلق باتیں بھی مل جاتیں جن کو مقدمے یا حواشی میں اگر پیش کیا جاتا تو بعض اعتبارات سے افادیت میں خاصا اضافہ ہوجاتا۔ ایسے چند حوالے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

نادر کی نظم "دو تصویریں" قدیم و جدید اڈیشن میں موجود ہے۔ یہ نظم زمانہ بابتہ اپریل ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس پر نادر کا یہ نوٹ تھا جو مجموعے میں نہیں ہے۔ کلامِ نادر کا حصہ دوم، اُن کی زندگی ہی میں شائع ہوا تھا، یہ نہیں کہا جاسکتا ہے، کہ انھوں نے دانستہ اس نوٹ کو چھوڑ دیا، یا غلطی سے شامل ہونے سے رہ گیا۔ دوسری بات زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ کیونکہ اور نظموں پر ایسے نوٹ موجود ہیں۔ یہ نوٹ درج ذیل ہے:-

"انسان بطنِ قدرت سے ایک خوبصورت معصوم اور پاک جسم لے کر پیدا ہوتا ہے، لیکن جس قدر وہ بڑھتا جاتا ہے، اسی قدر آلایشات دنیا سے ملوث ہوتا، اور ترقی معکوس کرتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ انتہائے عمر کو پہنچ کر وہ انتہا درجہ کا بدصورت، گناہگار اور ناپاک ہوجاتا ہے۔ اور ہرگز اس قابل نہیں رہتا، کہ ایک منٹ کے لیے دنیا میں زندہ چھوڑ دیا جائے۔"

یہ ایک فلسفیانہ خیال ہے۔ اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ مذہب اس قانون قدرت کو رد کرنے میں کہاں تک قادر اور کہاں تک مجبور ہے۔ اور کہاں تک اس منطقی دلیل کو تسلیم کرتا ہے لیکن ایک انگریزی شاعر نے اس ہیبت ناک تصویر کے دو رخ جس سادگی سے دکھائے ہیں وہ ضرور اس قابل ہیں کہ ناظرین کو ایک نظر دکھائے جائیں۔ اور ان کو اس مسئلے پر غور کرنے کا ایک بار موقع دیا جائے۔ (نادر)

۱۹۲۸ء میں زمانہ کا جبلی نمبر شائع ہوا تھا۔ اس کے آخر میں منشی دیا نرائن نگم نے "یادِ رفتگاں" کے عنوان کے تحت متعدد لوگوں کا ذکر کیا تھا۔ ان میں نادر بھی ہیں۔ متعلقہ عبارت نقل کی جاتی ہے:-

"جن اصحاب نے پندرہ سال پیشتر زمانہ کے صفحات پر نادر کاکوروی کی بے نظیر نظمیں "مقدس سرزمین" اور "بہارستان ربیع" "نادر ہند" "دعوتِ گل" "شعاعِ امید" "نغمۂ شاعری" ملاحظہ فرمائی ہیں، ان کے دلوں سے اس محب وطن شیریں بیان شاعر کی یاد آسانی سے محو نہیں ہوسکتی ہے افسوس نادر کاکوروی صرف ۴۵ برس کی عمر میں اکتوبر ۱۹۱۲ء[1] میں داغ مفارقت دے گئے۔ ان کے دل میں ملکی محبت کا شعلہ موجزن تھا اردو شاعری میں اصلاح کے حامی تھے۔ اور طرز جدید میں خوب خوب نظمیں کہتے تھے، جو اردو کے مشہور پرچوں میں چھپ کر مقبول عام ہوتی تھیں۔ جب سے زمانہ کا سلسلۂ جدید شروع ہوا۔ آپ اپنی بہترین نظمیں اسی رسالے کی نذر کرنے لگے۔ اکثر تصویروں کے متعلق آپ نے خاص نظمیں بھی کہہ کر اپنے زورِ طبع کا ثبوت دیا ہے۔ اڈیٹر رسالہ کے ساتھ آپ کی محبت کا کیا ذکر کیا جائے۔ ۱۹۱۲ء میں جب راقم الحروف کے برادر خورد مسٹر رام سرن نگم کی شادی ہوئی، تو آپ نے ایک مرصع سہرا کہہ کر بھیجا تھا جس کی شاعرانہ خوبیوں کا لطف دل میں اب تک باقی ہے۔"

---

[1] زمانہ میں یہاں ۱۹۱۳ء لکھا ہوا ہے، جو غلطی کتابت ہے۔ نادر کی وفات پر سفیر کاکوروی کا تعزیتی خط اکتوبر ۱۹۱۲ء کے زمانہ میں شائع ہوا تھا۔ اس پر اڈیٹر کا بھی ایک نوٹ تھا جس کا پہلا جملہ یہ ہے "پریس جاتے وقت ہم کو یہ افسوس ناک خط ملا۔"

رسالۂ الناظر (لکھنؤ) کے شمارۂ فروری ۱۹۱۳ء میں تین "قطعات تاریخ وفات نادر" شائع ہوئے تھے جن کے تاریخی مصرعے درج ذیل ہیں:

شاعرِ بے مثل و دمساز جہاں (موسیٰ حسین اختر جلال آبادی)

اب سدھارے سوئے جنت نادر کاکوروی (الٰہی بخش ناشر)

رو رو کے لکھ رہے ہیں تاریخ موت نادر (محمد صدیق خاں رعد جونپوری)

ص ۲۰۱ پر ایک نظم ہے بعنوان "آہ یہ ہوگا"۔ یہ نظم مخزن کے شمارۂ اگست ۱۹۰۷ء میں "فنا" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔

نادر کے کلام کا دوسرا حصہ ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا تھا، اُن کا انتقال ۱۹۱۲ء میں ہوا ہے۔ ان ڈھائی سال کی مدت میں انھوں نے جو نظمیں کہیں وہ مختلف رسالوں میں محفوظ ہیں۔ یہ بہت ضروری تھا کہ اس جدید اڈیشن میں اُن کو شامل کر لیا جاتا۔ کیونکہ قدیم رسالوں کے فائل اب ہر جگہ بہ آسانی نہیں ملتے ہیں۔ اور کچھ دنوں کے بعد یہ بمشکل بھی نہیں ملیں گے۔ ذیل میں ایسی نظموں کی ایک فہرست پیش کی جاتی ہے، جو میری نظر سے مختلف رسائل میں گزری ہیں۔ میں یہ تو قطعیت کے ساتھ نہیں کہہ سکتا ہوں کہ ان نظموں کے علاوہ ان کی کوئی نظم اور نہیں ہے، لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی شخص بالاستیعاب رسائل کا جائزہ لے، تو ایک دو نظموں سے زیادہ کا اضافہ شاید نہیں ہو سکے گا۔ میری نظر میں بہرحال ان نظموں کے علاوہ اُن کی کوئی نظم نہیں ہے۔

(۱) صحیفۂ فطرت — زمانہ، فروری ۱۳ء
(۲) سوزِ عشق — زمانہ شمارۂ ستمبر و اکتوبر ۱۱ء
(۳) سیر دریا — ادیب، جنوری ۱۱ء
(۴) سرمصرعی — مخزن، نومبر ۱۹۱۲ء
(۵) امامباڑہ لکھنؤ — زمانہ، جولائی ۱۲ء
(۶) پروانۂ جاں سوز — زمانہ، جون ۱۵ء
(۷) سوزِ پروانہ — زمانہ، جولائی ۱۵ء
(۸) جلوۂ امید — زمانہ، اگست ۱۴ء
(۹) نپولین اور کمسن جہازی — زمانہ، جنوری ۱۱ء
(۱۰) غزل — زمانہ، اکتوبر ۱۲ء
(۱۱) سال گذشتہ — زمانہ، جنوری ۱۳ء
(۱۲) غزل — الناظر، مئی ۱۱ء
(۱۳) سہرا — زمانہ، فروری ۱۲ء
(۱۴) یاددہانی بہ طرزِ احسن — زمانہ، اپریل ۱۳ء
(۱۵) تحفۂ تہنیت — زمانہ، فروری ۱۲ء
(۱۶) قصیدۂ تہنیت در بارِ شاہی — زمانہ، دسمبر ۱۱ء
(۱۷) دلی دربار — ادیب، دسمبر ۱۱ء

اس خیال سے کہ یہ نظمیں یک جا ہو کر محفوظ ہو جائیں اور اگر کوئی شخص نادر کے مکمل کلام کو دیکھنا چاہے، تو اس کو دقّت نہ ہو۔ یہ نظمیں نقل کی جاتی ہیں۔ اُن کے دورِ آخر کی ان نظموں میں بعض نظمیں چستیِ بندش اور حسنِ اظہار کے اعتبار سے خاصے کی چیز ہیں مثلاً صحیفۂ فطرت کے یہ شعر دیکھیے:

یہ جہاں حسن خود ہے اک ملبوسِ شاعری — چپے چپے پہ یہاں اشعار ہیں لکھے ہوئے

خونِ بلبل کی کہاں پھولوں یہ رنگ آمیزیاں — مجرمانِ عشق کے اظہار ہیں لکھے ہوئے
ابرِ باراں پر نظر کر دیکھ شبنم کی بہار — واہ کیا مضمونِ گوہر بار ہیں لکھے ہوئے
ہر جگہ یاں دفن ہے اک شاعرِ عاشق مزاج — ہر جگہ قطعے سرِ دیوار ہیں لکھے ہوئے
اس خرابے سے کوئی گزرا ہے نادر نام بھی — جا بجا دیوار پر اشعار ہیں لکھے ہوئے

صحیفۂ فطرت

"برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار — ہر ورقِ دفتریست معرفتِ کردگار"

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

یہ جو حسن و عشق کے طومار ہیں لکھے ہوئے — کیا یہ سب مہمل ہیں، سب بیکار ہیں لکھے ہوئے
یہ جہانِ حسن خود ہے اک طلسمِ شاعرانہ — چپے چپے پر یہاں اشعار ہیں لکھے ہوئے
شاعری ہے وہ مرقعِ کلیاتِ کائنات — جس پہ اہلِ الفت کے اقرار ہیں لکھے ہوئے
دفترِ عالم کی نظم آرائیاں ہیں کس قدر — صاف حسن و عشق کے اسرار ہیں لکھے ہوئے
دیکھ چشمِ غور سے نقش و نگارِ کارگاہ — برگِ گل پر نسلِ گلزار ہیں لکھے ہوئے
خونِ بلبل کی کہاں پھولوں پہ رنگ آمیزیاں — مجرمانِ عشق کے اظہار ہیں لکھے ہوئے
آسماں کی لوح پر خطِ شعاعِ شمس سے — کیسے کیسے مطلعِ انوار ہیں لکھے ہوئے
ابرِ باراں پر نظر کر دیکھ شبنم کی بہار — واہ کیا مضمونِ گوہر بار ہیں لکھے ہوئے
یہ گھٹائیں اودی، کالی کیا ہیں سائن بورڈ ہیں — جو پئے ترغیبِ بادہ خوار ہیں لکھے ہوئے
ہر جگہ یاں دفن ہے اک شاعرِ عاشق مزاج — ہر جگہ قطعے[1] سرِ دیوار ہیں لکھے ہوئے

اس خرابے سے کوئی گزرا ہے نادر نام بھی
جا بجا دیوار پر اشعار ہیں لکھے ہوئے

(زمانہ، فروری ۱۹۱۳ء)

سوزِ عشق

آہ اے آتش بجانِ محبت کے شرارِ بے قرار — آتشِ پنہاں کے آئینہ اے شعلۂ سیماب وار
اے خدائے عشق اور اے نشترِ سینہ فگار — تیری کاوش سے گل افشاں دیدۂ خوننابہ بار

کشتہ کر کے زندۂ جاوید تو نے کر دیا
ذرۂ پامال کو خورشید تو نے کر دیا

ہستیِ فانی مری، میرا وجودِ دردمند — تھے اسی قابل کہ ہوں تیرے جلا سے بہرہ مند
شکر ہے یہ التجائے معنوی آئی پسند — باعثِ راحت ہے مجھ کو تیرے ہاتھوں کی گزند

---

[1] یعنی قطعاتِ تاریخِ وفات (نادر)

آہ اے بزمِ جہاں کے شمعِ شب افروزِ عشق
اے شرارِ برق تاب اے شعلۂ جاں سوزِ عشق

اک مرقع ہے عدم کا جلوۂ ہستی مرا — مٹ گیا جب اپنی اصلیت سے جا کر مل گیا
یعنی جب تکمیل کو پہنچا تو میں کچھ بھی نہ تھا — میری ہستی اک دھواں ہے شعلۂ جوالہ کا

نغمہ زا ہے اب صدا میرے شکستِ رنگ کی
وسعتِ ہستی ہے وسعت میرے قلبِ تنگ کی

(زمانہ، شمارہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۱۴ء)

سیرِ دریا

سیرِ دریا، انبساطِ کشتی اور گھٹا چھائی ہوئی — بڑھ چلی حد سے، جوانی جوش پر آئی ہوئی
دستہ ہائے گل سے کشتی کو بنا کر مہبطِ گل — لے چلا تفریح کو عہدِ شباب اور عہدِ گل

عاشق و معشوق باہم سیر کرنے کو چلے
آشنایانِ محبت ڈوب مرنے کو چلے

کیا سرور افزا نشاط انگیز چھائی ہے گھٹا — بوندیاں پڑتی ہیں یا کیوڑا چھڑکتی ہے گھٹا
بوئے گل کے مختلف کپڑے بدلتی ہے نسیم — پنکھیاں پھولوں کے گویا منھ پہ جھلتی ہے نسیم
لیتی ہے نظارۂ ہر برگ میں لذت نگاہ — پیاتی ہے سبزۂ شاداب پر امرت نگاہ
جس طرح دریا میں موجوں سے کوئی کشتی نشیں — کھیلتا ہو ڈال کر پانی میں دستِ نازنیں
کشتیِ چشمِ طراوت آشنا سے کود کر — تیرتی ہے سبزۂ امواجِ ساحل پر نظر

دور کوسوں دور جاتی ہے فضائے آب میں
ڈبکیاں کھاتی ہوئی امواج اور گرداب میں

تیرتی ہیں وہ بطیں گرتی ہوئیں مرغابیاں — اور وہ کشتی میں بیٹھا جا رہا ہے اک جواں
خوب اک نہ بارکہ نوخیز بھی پہلو میں ہے — آدمی کے ایک دریائی پری پہلو میں ہے
ہائے وہ مستانہ انداز اور وہ رغبت کی نگاہ — وہ گلابی آنکھ اور وہ نشے میں متوالی نگاہ
بے خودی میں زانوئے عاشق دبانا پیار سے — اور وہ سینے پر اُس کے سر جھکانا پیار سے

عالمِ خلوت ہے اور معشوق در آغوش ہے
لطفِ سیر و لطفِ وصل و لطفِ ناو نوش ہے

اے ہوس آلودہ، اے لذت کشِ آغوشِ یار — چین ہی چین اب تو لکھتا ہے ترا نامہ نگار
چین ہے کیا! درحقیقت چین اسی کا نام ہے!! — کیا شباب چند روزہ کا یہی اک کام ہے!!
عیش کہتا ہے اسے!! سمجھا نہ تو مفہومِ عیش — تیرتی ہے بحرِ غم پر کشتیِ موہومِ عیش
تیری کشتی گرچہ او کشتی نشیں جاتی ہے تیز — کشتیِ عمرِ رواں، اس سے کہیں جاتی ہے تیز
بس ہوا و حرص کی موجوں کو اپنے ساتھ روک — ٹھہر کشتی پھیر، ہتے چھوڑ، اپنے ہاتھ روک

زورِ طوفاں ہے، کہیں گرداب میں تو آ نہ جائے   دیکھ، ساحل سے کہیں کشتی تری ٹکرا نہ جائے
ہے حبابِ بحر کے مانند انجامِ حیات   ایک غوطہ کھاتے ہی لبریز ہے جامِ حیات
لے حبابِ بحر، اے پروردۂ آغوشِ موج   تیری ہستی اک جنازہ ہے رواں بر دوشِ موج
لذتِ گہوارہ ہے جس کی تجھے ہر لہر میں
ایک تختہ بھی نہ ابھرا ڈوب کر اس بحر میں
دیکھ ہوتی جا رہی ہے اب گھٹا تاریک تر   اور جھونکے آمدِ طوفاں کی دیتے ہیں خبر
روک ہتے، پھیر رُخ کشتی کا، ناداں لوٹ آ   جان دینے کو نہ جا، اے دشمنِ جاں لوٹ آ
دیکھ تیرے ساتھ خطرے میں ہے تیرا ہم نشیں   اور تو اس نازنیں کو بھی نہ لے ڈوبے کہیں
تو نہیں سنتا کسی کی، خیر، جاتا ہے تو جا   اپنی بربادی کی کرنے سیر جاتا ہے تو جا
جا، پر اس آغازِ الفت کا بخیر انجام ہو
تیرا بیڑا پار ہو، ساحل پہ تجھ کو شام ہو

(ادیب، جنوری ۱۹۱۱ء)

سہ مصرعی[1]

خوشی سے خوشی کا نہ ہونا ہی اچھا   جہاں جان رو رو کے کھونا ہی اچھا
رلانا ہی اچھا ہے، رونا ہی اچھا

یہ قصر اور یہ گھر ہے سب چار دن کا   یہ فرشِ معطر ہے سب چار دن کا
تو خاکِ لحد کا بچھونا ہی اچھا

بھری تلخیوں سے ہے یہ جانِ شیریں   سم آلودہ ہے یاں نہ نانِ شیریں
غذا سے یہاں ہاتھ دھونا ہی اچھا

تماشے جہاں کے کبھی کم نہ ہوں گے   زمانہ رہے گا مگر ہم نہ ہوں گے
نہ ہوں ہم، ہمارا نہ ہونا ہی اچھا

کہے جا اسی طرح اشعار نادر   نہ اشکوں کا ٹوٹے ترے تار نادر
یہ لڑیوں میں موتی پرونا ہی اچھا

(مخزن، نومبر ۱۹۱۲ء)

---

[1] سب ایڈیٹر مخزن (لاہور) غلام محمد طور نے، نادر کی موت پر، ایک مضمون مخزن شمارہ نومبر ۱۹۱۲ء میں لکھا تھا۔ اس کے آخر میں یہ سطریں بھی ہیں:۔

"دنیا کے مصائب اور زمانے کے حوادث سے، جو پے درپے آپ کو پیش آئے، آپ کی طبیعت زندگی سے اچاٹ ہو گئی تھی چنانچہ حالتِ بیماری میں ذیل کی سہ مصرعی سے، جو نمبر کے پرچہ میں "کلامِ نادر" کے عنوان کے نیچے درج ہو چکی ہے، اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔" اس کے بعد مندرجہ بالا سہ مصرعی نقل کی گئی ہے۔

بڑا امام باڑہ لکھنؤ

اے عنادیبِ اودھ، اے یادگارِ لکھنؤ — اے گلِ پژمردۂ رفتہ بہارِ لکھنؤ
تیرے گنبد کا کلس ہے طرۂ تاجِ اودھ — اور ترا گنبد ہے چترِ زرنگارِ لکھنؤ

ہر عمارت کو اودھ تجھ سے لڑا کر توڑ دے — ہر محل کو تیری اک ہلکی سی ٹکر توڑ دے
فاتحِ اقلیمِ تعمیرات ہے لاریب تو — ایک آئینہ ترا سدِ سکندر توڑ دے

رومی دروازے کی رفعت پہ ہے تکبیرِ عمل — سر اٹھا کر جس نے دیکھا اس کو چکر آگیا
اس طرح ہے سر اٹھائے تیری مسجد کا کلس — آسماں تا چرخ ہے گویا تجھی پر گھومتا

آہ یہ طوطے نہیں، روحیں ہیں ہر بازدید — آئی ہیں جنت سے پہنے حلہ ہائے سبز فام
اور طے کر کے مسافت عالمِ ارواح کی — تیرے میناروں پہ دم لینے کو کرتی ہیں قیام

آ کے گرتے ہیں ترے گنبد پہ جب غولِ طیور — اور جب وہ چہچہاتے ہیں ترے مینار پر
آہ! کس حسرت سے گھنٹوں دیکھتا ہوں میں انھیں — اور مجھے اس نوحہ میں تب یہ آتا ہے نظر

صحن مے خانہ میں کی آراستہ ساقی نے میز — چن کے کچھ کنٹر بھرے اور کچھ جامِ بلور
ناگہاں پہ یاں فضائے نیلگوں سے آگرے — اور ہو کر مست، نغمہ زن ہوئیں مثلِ طیور

کچھ شفق نے چھوٹ کر برسا دیا جب سرخ رنگ — لے کے بیٹھا گود میں پھولوں کی کشتی آسماں
چاندنی میں پھول مہکے اور تارے کھل گئے — بکھر بکھر کر آگریں لاکھوں سنہری تتلیاں

صبح دم کی شاہِ دریا بار نے جو روشن ماہتاب — اور دنیا جگمگا کر بن گئی ارژنگِ چیں!
میں نے دیکھی چھوٹتے گردوں پہ فواروں کی طرح — ہر کلس سے تیرے برجوں کے شعاعِ آتشیں

دن کو کچھ ہے لطف تیرا، شام کو کچھ، شب کو کچھ — تیرے ہر انداز میں آہ اک ادائے تازہ ہے
کیا تری آرائش، اپنے آپ مشاطہ ہے تو — صبح گلگونہ ہے تیرا، شام تیرا غازہ ہے

اے اودھ کی جان اے روحِ روانِ لکھنؤ — یادگارِ آصفِ خلد آشیانِ لکھنؤ
سو بناؤ کا مرقع کش ہے اک تیرا بگاڑ — ہے تری اک بے نشانی سو نشانِ لکھنؤ

سوزِ پروانہ[1]

سر میں پروانے کے ہے اک نشۂ ہوشِ جنوں — اس کے دل میں کیا ہے جلنے کے لیے اک قطرۂ خوں
اس کی ہستی ہے متاعِ سعدِ طلسماتِ فسوں — پھونک دے خرمن، یہ وہ خس ریزہ ہے آتش بدل

اس کے بال و پر ہیں مثلِ شمع جلنے کے لیے
اور کلیجہ اس کا شعلوں پر پگھلنے کے لیے

شعلہ زن ہے اس کے دل میں لذتِ پنہاں کی آگ — اور ہے اس آگ کو اس قالبِ خاکی سے لاگ
جیسے شوہر کی چتا پر اس کی دلہن کا سہاگ — جل بجھے جس طرح ققنس چھیڑ کر دیپک کا راگ

عشق جل بجھتا ہے خود سارا زمانہ پھونک کر
خاک ہو جاتی ہے بلبل آشیانہ پھونک کر

بھولنا اپنے کو صورت ہے کسی کی یاد کی — یعنی یہ معراج بھی اک شکل ہے افتاد کی
حسنِ شیریں کا فسانہ موت ہے فرہاد کی — ہے تو ہستی منت کشِ غمِ عالمِ ایجاد کی

نالۂ قمری ہے وجہِ خندۂ صبحِ بہار
وسعتِ آغوشِ گل ہے رونقِ بلبل کا فشار

زیست کا کیا تذکرہ، پروانہ اس سے سادہ ہے — موت کا عاشق ہے، ہر دم مرگ کا دلدادہ ہے
مرنے کو یوں ہی کمر باندھے ہوئے استادہ ہے — المدد اے آرزوئے مرگ! وہ آمادہ ہے

ننگ ہے محتاجیِ گور و کفن اس کے لیے
شمع کے شعلے پہ ہے دار و رسن اس کے لیے

نادر آخر تا کجا یہ صدمۂ سوزِ نہاں — بس کہیں جل بجھ چکے بھی میرا جسمِ ناتواں
سوزِ حسرت سے مرے دل سے نکلتا ہے دھواں — ہر نفس میرا صدائے صاف دیتا ہے کہ ہاں!

پھونک دے اے عشق تو اس ہستیِ خاشاک کو
اور اڑا دے ہاتھ اٹھا کر میری مشتِ خاک کو

ڈھونڈھتی ہے روحِ مضطر میری پروازِ فراغ — تنگیِ قیدِ قفس سے دل ہے میرا داغ داغ
جس طرح سے دور تک پھیلائے نور اپنا چراغ — ہر طرف کوسوں تلک اڑتی پھرے خوشبوئے باغ

سبزہ و گل بن کے کاش اس خاکداں پہ پھیل جاؤں
رنگ بن کر میں فضائے آسماں پہ پھیل جاؤں

(زمانہ، جولائی ۱۹۱۵ء)

---

[1] اس نظم کے تین بند، دوسرا، تیسرا، اور آخری "پروانۂ جاں سوز" میں بھی موجود ہیں۔ اس اختلاف کے ساتھ، کہ دوسرے بند کے آخری دو مصرع، بدلے ہوئے ہیں، اور آخری بند میں مصرعوں کی ترتیب مختلف ہے۔

یہاں یہ تذکرہ بے محل نہ ہوگا، کہ نادر کی نظم "شباب الصالحین" کا پہلا بند "شوقِ نادر" کے "نغمۂ تمہید" میں پہلے بند کی جگہ موجود ہے۔ "نغمۂ تمہید" رسالۂ زمانہ بابت فروری سنہ ۱۹۱۵ء میں "سوزِ عشق" کے عنوان سے شائع ہوا تھا، اس اختلاف کے ساتھ کہ "نغمۂ تمہید" کا چھٹا بند، اس میں نہیں تھا۔

ہر روز یاں کے موقع اُس غار میں وہ جاتا
اور شام کو نکلتا کیا جانے کیا بناتا

اس مشغلے میں اُس کو گذرے کئی مہینے
لیکن نہ بھید اُس کا پایا کبھی کسی نے

آخر کو ہو گیا فاش اک دن یہ راز اُس کا
جب بن بنا کے نکلا باہر جہاز اُس کا

تیری پناہ یارب نادانوں کی خیر کرنا
واں اُس نے ڈوب مرنا تھا اس پہ سیر کرنا

کیسا جہاز جس کا اسلوب تھا نہ ڈھنگ تھا
پتوار تھی نہ جس میں کپتان تھا نہ بیڑا

جس میں نہ بادباں کا مستول کا پتا تھا
مر دو بچانے کی بھی لگتی جہاز کیا تھا

قسمت میں کیا لکھا ہے یہ کون جانتا تھا
واں اُس ذلیل بیڑے کا ناخدا، خدا تھا

اس شان سے بہادر آمادۂ سفر تھا
اک بانو تھا زمیں پر اور اک جہاز پر تھا

آ نکلا پہرے والا ناگہ کوئی اُدھر سے
اور دیکھتے ہی کھینچا اس کو جہاز پر سے

رسّی سے باندھ کر اور اچھی طرح جکڑ کر
آئے نپولین کے لایا اسے پکڑ کر

اور ہاتھ جوڑ کر کی عرض اے حضور عالم
بے شک ترا شاہنشاہ ہر دل کے دل پہ قائم

رکھا تھا اس کو تم نے آزاد از غلامی
اس کے عوض میں اس نے کی یہ نمک حرامی

بے انتظار حکم شہ اور اذنِ شاہی
ہے بے تمیز اپنے گھر کو ہوا تھا راہی

گر میں پہنچ نہ جاتا، تو یہ نکل چکا تھا
اس کا جہاز بولن کی سمت چل چکا تھا

سُن کر نپولین نے حیرت میں آ کے پوچھا
"اس کا جہاز میرے ساحل پہ کیسے آیا

میں پوچھتا ہوں پہرے والے کدھر گئے تھے
کیا اک سرے سے سب کے سب آج مر گئے تھے

ہر چند کام کرتے اس وقت تھک گیا ہوں
لیکن چلو بتاؤ میں چل کے دیکھتا ہوں"

بولا سپاہی جی ہاں اس کو ضرور دیکھیں
وہ دیکھنے کے قابل بھی ہے ضرور دیکھیں

یہ واقعہ حقیقت میں اک عجیب تر تھا
خود بادشاہ آیا ساحل قریب ہی تھا

نزدیک آ کے پوچھا لنگر کہاں ہے اس کا
وہ ہاتھ اٹھا کے بولا، وہ بادباں ہے اس کا

چھوٹا سا اک ہوا کے جھونکوں سے ہل رہا تھا
اور لنگر اس فضا میں تارا سا کھل رہا تھا

اچھی طرح سے دیکھا اس کو قریب جا کر
اور نوجوان مجرم سے بولا مسکرا کر

"بے وجہ کچھ نہیں ہے اس درجہ بے قراری
دل میں کوئی بے شک معشوقہ ہے تمہاری

آمادہ خودکشی پر تم کو کیا ہے کس نے
تم جیسے دیوانے ہی کی جانے تھے ڈوب مرنے"

بولا وہ لڑکا شرما کر اور سر جھکا کر
میں کیا بتاؤں اپنی مجبوری بندہ پرور

معشوقہ ہے نہ میری کوئی نہ یار میرا
مجھ کو نہ کر رہا ہے مضطر دیار میرا

جو اک وطن ہے اور اک پیارا مکاں ہے
وہ میری اک بوڑھی بے کس ضعیف ماں ہے

میں اس کے دیکھنے کو بے چین ہو رہا ہوں
مر دو ہے نہ زندہ اس ملک میں پڑا ہوں

سُن کر نپولین کا دل رحم سے بھر آیا
اور اس کی راست بازی کا اس کو باور آیا

دل میں کہا کہ کتنا ہے یہ بھی نیک لڑکا
ہو یہ شریف ماں کے ایسا ہی ایک لڑکا

خوب اس کی پیٹھ ٹھونکی، خوب اس کو شاباشی دی — گھر جانے کی اجازت اس کو بعد ازاں خوشی دی
کچھ نقد اس کو دے کر، اور اک نشان دے کر — پہنچا دیا خود اپنی ہی کشتی پر اُسے گھر
کہتے ہیں اکثر اس کو فاقے ہوئے، پر اُس نے — بیچے نہ مرتے دم تک سکے نپولین کے

اس واقعے کو گو اک مدت گزر چکی ہے — یورپ میں اس کی اب تک ویسی ہی تازگی ہے
اس یاد سے ہے لندن کا دل گداز اب تک — پیرس کے میوزیم میں ہے وہ جہاز اب تک

(زمانہ، جنوری ۱۹۱۱ء)

غزل

شکایت کر کے غم اوراں کا تیز کرتا ہے — ابھی تو گفتگو سے مصلحت آمیز کرنا ہے
ترے اعمال نامے پر کہاں ہیں دستخط تیرے — وہاں ثابت تجھے جعلی یہ دستاویز کرنا ہے
یہ دنیا جائے آسایش نہیں ہے، آزمایش ہے — یہاں جو سختیاں تجھ پر پڑیں انگیز کرنا ہے
غزل خوانی کو تو آیا نہیں اس بزم میں نادر — تجھے یاں وعظ کہنا، پند سود آمیز کرنا ہے

پیٹتا ہوں سر کہ میں دنیا میں رسوا کیوں ہوا — میں نے ایسا کیوں کیا، افسوس ایسا کیوں ہوا

میں سمجھا تھا مرے حق میں دعائے خیر کرتے ہو — مجھے تم کوستے ہو، ہمدمو! اندھیر کرتے ہو

(زمانہ، اکتوبر ۱۹۱۲ء)

سالِ گذشتہ

آہ بوڑھے، سن رسیدہ اور قریب المرگ سال — اب تو ہوتا جاتا ہے ابتر ترا ہر روز حال
اور اب نزدیک تر ہے تیرا وقتِ واپسیں — آہ تجھ کو ہم سے اب کچھ کہنا سننا بھی نہیں
مختصر سی کچھ وصیت، کچھ نصیحت ہی سہی — اور اگر دل میں ترے شکوے ہوں تو وہ بھی سہی
کچھ تو کہہ حال اپنا او بیمار، لب اپنے تو کھول — مرنے والے تیرے دل میں کیا ہے کچھ منہ سے تو بول
آہ کیا اس عالمِ ظلمات اور انوار میں — اس جہانِ پُر طلسمات اور پُر اسرار میں
اپنی پُر غم سرگذشتِ تقدیر کا اک حرف بھی — ہم سے کہنا ہی نہیں منظور تجھ کو واقعی
کیا تری غم گیں صدا یہ کان سن سکتے نہیں — کیا یہ مژگاں اشکِ حسرت تیرے چن سکتے نہیں

مرنے والے سال! وہ بھی کتنا نازک وقت تھا — جبکہ لیلائے ازل تھی دردِ زہ میں مبتلا
قسمت و تقدیر سے محروم تھی کل کائنات — اور ہر اک چیز بے اندازہ و بے پیمانہ تھی، اور بے ثبات
جب نہ چرخانے میں پیدائش زمانہ کی ہوئی — کیا وہ حالت بھی تری او سال ہے دیکھی ہوئی

کیا ترے کانوں میں پہنچی تھی زچہ کی پہلی چیخ — یاد ہے تجھ کو کہ تھی کتنی بھیانک وہ بھی چیخ
تو نہ سمجھا ہستیوں کی ابتدا تخلیق ہے — اور ہر اک زندگی کی انتہا تکلیف ہے

سال بوڑھے سال، او مرحوم ہونے والے سال — بلکہ دو اک روز میں معدوم ہونے والے سال
جب چلی تھی بحرِ ناپیدا کنارِ دہر میں — ایک پہلی لہر، تو کیا بات تھی اُس لہر میں
پہلے وہ آغوشِ مادر کیوں بنی تیرے لیے — پھر دہانِ قبر وہ کیوں بن گئی تیرے لیے
مادرِ قدرت نے کیوں شیر کفِ موجِ فنا — لے کے لفظِ موت پیشانی پہ تیری لکھ دیا

مرنے والے سال! اچھا ہم کو اتنا تو بتا — آخری سورج ترا، کیا بات تھی جو زرد تھا
عشق و الفت کا ترے اس پر اثر تھا ہو نہ ہو — رحم کر کے تجھ پہ، وہ باچشمِ تر تھا ہو نہ ہو
پر نہیں تھا وہ تو بے مہری سے آگے کو رواں — دل لوں، جھیلوں پہ، باغوں، وادیوں پر نور فشاں
اور نہ دیکھا اُس نے مڑ کر بھی تجھے دم توڑتے — ایک آنسو بھی نہ ٹپکا آہ اس کی آنکھ سے

او ہمیشہ کے لیے معدوم اور مرحوم سال — کوسِ رحلت کر رہا ہے تجھ پہ اظہارِ ملال
مختصر افسانۂ غم ہو چکا تیرا تمام — اور تیری زندگی کا ہو چکا اب ختم کام
مر چکا تو، اور اٹھا کر تیری نعشِ بے کفن — وقت نے کی غرقِ تاریکیِ دریائے محن
مرنے والے کی لحد ہے، اور نہ ہے شمعِ مزار — نوحہ خواں کوئی ہے اُس پر اور نہ کوئی اشکبار

آہ او سالِ گذشتہ، او اراو مرحوم سال — او غریقِ بحر، او معدوم فی المعدوم سال
کس قدر تو پہلے خوش آیند اور خوش لہجہ تھا — جس قدر اب چُپ نظر آتا ہے، ایسا تو نہ تھا
تیری چمکیلی امیدیں کب چمک جاتی نہ تھیں — دور سے دکھلاتی تھیں جھلکی قریب آتی نہ تھیں
آہ تیرے ساتھ اب، او سال! وہ سب مر گئیں — اور نئی امیدیں میرے دل میں آکر بھر گئیں

(زمانہ جنوری ۱۹۱۲ء)

جی بھر آیا پچھلا سامانِ اسیری دیکھ کر — رو دیا میں اپنا زنداں خالی خالی دیکھ کر
رحم آجائے گا ان کو شکل میری دیکھ کر — میری حالت دیکھ کر میری غریبی دیکھ کر
ساحلِ جولانگہِ امواج پر شکلِ حباب — دم بخود بیٹھا ہوا ہوں اپنی ہستی دیکھ کر
معنت بھی خواہاں نہیں وہ دل کہ کیونکر آدمی — بے ضرورت چیز لے لیتا ہے سستی دیکھ کر
اب کہاں وہ نوجوانی اور کہاں جذباتِ عشق — پیار بھی آتا نہیں اب شکل پیاری دیکھ کر
دشتِ غربت سے چلا ناحق میں بستی کی طرف — کون پوچھے گا مجھے میری غریبی دیکھ کر
لاکھ میں اُن کو بھلاتا، ضبط کرتا ہوں مگر — دل بھر آتا ہے پہلو اپنا خالی دیکھ کر

کھنچ گیا نقشہ نظر میں ہستیِ موہوم کا ۔ بن گیا تصویر میں تصویر اپنی دیکھ کر
عشق کا ناؔدر کہاں سے تو لگا لایا یہ روگ
رونا آتا ہے ہمیں تیری جوانی دیکھ کر (الناظر، مئی ۱۹۱۱ء)

سہرا[1]

ہے جلوۂ برقِ طور سہرا، ہے ساعدِ صافِ حور سہرا ۔ ہے موجِ دریائے نور سہرا، ہے جوشِ جامِ بلور سہرا
فلک پہ تارے کھلے ہوئے ہیں، شفق میں بجلی چمک رہی ہے ۔ افق میں سورج نکل رہا ہے، ہے مطلعِ صبحِ نور سہرا
نسیمِ جنت کی چل گئی تھی اسی کی اک موج ہے یہ باقی ۔ بہارِ فردوس ہنس پڑی تھی، اسی ہنسی کا ظہور سہرا
ہوا ہے نوشہ پہ سایہ گستر، اسی نے پھیلا دیے ہیں شہپر ۔ ہے ورنہ عنقائے قافِ اقبال کا نشیمن ضرور سہرا
فلک نچھاور کہیں نہ کرتا ہو سر پہ نوشہ کے عقدِ پرویں ۔ اسی کا پرتو نہ ہو سمجھتے ہیں جس کو اہلِ شعور سہرا
پری نے پیچھے سے راجہ اندر کے سر پہ ڈالا ہے اپنا آنچل ۔ جو یہ نہیں ہے تو میں کہوں گا ہے طرۂ زلفِ حور سہرا
عروس نے اپنے نازنیں ہاتھ چشمِ نوشہ پہ رکھ دیے ہیں ۔ اسی کے یہ پنجۂ نگاریں سے بن گیا منہ کا نور سہرا
فلک پہ رحمت برس رہی ہے، زمیں پہ گنگا اتر رہی ہے ۔ ہے رحمتوں کا نزول سہرا، ہے برکتوں کا وفور سہرا
بہار کی دیوی سر پہ نوشہ کے پھول برسا رہی ہے گویا ۔ کھڑی ہوئی ہنس رہی ہے لچھمی یہ ہے مبارک ضرور سہرا
سرودِ عشرت کے تار لڑیاں ہیں اور زمزمے ہیں پھول مطرب ۔ ہے مطربِ جشنِ عیشِ نوشہ ہے سازِ بزمِ سرور سہرا

گلِ مضامینِ فکرِ ناؔدر سے، ورقِ[2] کاغذ ہے کشتیِ گل
کہ نذرِ نوشہ کے شوق میں بن گئی ہیں سلک سطور سہرا (زمانہ، فروری ۱۹۱۲ء)

یاددہانی بہ طرزِ احسن

کسی کافر کا وعدہ کر کے ممکن ہے پلٹ جانا ۔ پلٹ جانا کسی طناز کا ممکن ہے پیماں سے
یہ ممکن ہے کہ گھر آئیں گھٹائیں جھوم کر لیکن ۔ نہ ٹپکے ایک بھی قطرہ محیطِ ابرِ باراں سے
بہار آئے، چمن پھولے پھلے، لیکن یہ ممکن ہے ۔ کہ اک دانہ نہ ہو حاصل امیدِ کشتِ دہقاں سے
یہ ہو سکتا ہے چل جائے ہوا کچھ ایسی عالم میں ۔ کہ رنگ اڑ جائے پھولوں سے چمک لعلِ بدخشاں سے
یہ ممکن ہے کہ ہو جائے دعا کی سلب خاصیت ۔ نکل کر پھر پلٹ آنا ہے ممکن تیر پیکاں سے (دکذا)
یہ سب ممکن ہے لیکن وعدہ کرنا اور مکر جانا ۔ نہیں ممکن ہے ہرگز راجہ شعبان علی خاں سے
دھنی ہیں قول کے اور اپنے وعدے کے وہ سچے ہیں ۔ میں سچ کہتا ہوں پھر راجہ ہیں اور راجہ کے بیٹے ہیں (زمانہ، اپریل ۱۹۱۳ء)

---

[1] اس سہرے کے آغاز میں، یہ نوٹ لکھا ہوا ہے " ایڈیٹر زمانہ کے برادرِ عزیز منشی رام سرن نگم . بی . اے . ایس . سی . کی شادی خانہ آبادی کی یادگار میں لکھا گیا "
[2] یہ سکونِ حرفِ ثانی، ناؔدر کا تصرف ہے .

تحفۂ تہنیت

(راجہ سید شعبان علی خاں صاحب بہادر تعلقہ دار سلیم پور کو خطاب کے، سی، آئی، ای، عطا ہونے پر لکھا گیا)

بڑھا دے دے رہا ہوں اپنی طبعِ گرم جولاں کو　　مبارک باد دینے جائے گی شعبان علی خاں کو
کہ تجھ سے سادگی ہائے جہاں کو حسنِ آرایش　　تری رامشگری سے دلفریبی بزمِ امکاں کو
گھٹا کی طرح اٹھ اور چل نسیمِ صبحدم بن کر　　چل اور لہکا دے باغوں کھیتوں کو اور بستاں کو
ہلا دے شاخِ گل کو اور اڑا دے توعنا دل کو　　ہنسا دے غم زدوں کو چھیڑ دے زلفِ پریشاں کو
یہی موقع ہے شوخی کا یہی موقع مسرت کا　　لٹا دے تلملا دے ہر سخنور، ہر سخنداں کو
چلی جا شوخیوں سے اور پہنچ جا آستانے پر　　ادب سے دے مبارکباد اُس ممدوحِ ذی شاں کو
مگر میری زباں بھی کیوار، نہ اپنے ساتھ لیتی جا　　ادا کیا کر سکے گی تو مرے جذباتِ پنہاں کو
مرا دل بھی لیے جا تو، یہ وہ شے ہے کہ کہتا ہوں　　خدا دل دے تو دے میرا ہی ایسا ہر مسلماں کو
مگر اس دل میں کیا ہے، صرف سچی بے ریا الفت　　رفیقِ سُرخ جو شیریں کرے تلخیِ دوراں کو
لیے جا ہاں وہ بے پایاں خوشی بھی میری خاطر سے　　جو اس تقریب پر حاصل ہوئی اس تہنیت خواں کو
جب اس ساماں سے اِس ٹھاٹھ سے عرضِ ستائش ہو　　تو کیوں مقبولیت حاصل نہ ہو فکرِ سخنداں کو
کسی کی ذات میں جب اس قدر ہوں خوبیاں یکجا　　کہ ہو مدِ نظر اعزاز اُس کا شاہِ شاہاں کو
کسی ذرّے میں جب یہ کیفیت کسبِ ضیا کی ہو　　کہ وہ اپنی طرف کھینچے شعاعِ مہرِ تاباں کو
تو یہ کہنا برا کیا ہے کہ شاہنشاہ لندن سے　　خطاب آئے عطا دینے کے لیے شعبان علی خاں کو
حقیقت میں یہ عزت باعثِ صد فخر و نازش ہے　　یہ عزت مایۂ صد ناز ہے امثال و اقراں کو
تمامی خوبیاں یکجا ہوں جب انساں میں خالق نے　　دکھایا اپنی قدرت کو، بنا کر ایسے انساں کو
الٰہی اُن کو عمرِ خضر دے، جاہِ سکندر دے　　کہ پہنچے مدتوں تک فیض خدام و عزیزاں کو
اٹھائیں فائدہ جس سے ہزاروں بے سر و ساماں　　خدا وسعت دے ایسی زندگیِ عیش ساماں کو

خطابِ کے، سی، آئی، ای، ملا دربارِ دلی سے
مبارک ہو یہ عزت راجۂ شعبان علی خاں کو　　(زمانہ، فروری ۱۹۱۲ء)

قصیدۂ تہنیتِ دربارِ شاہنشاہی

پھر کھلا صبحدم دریچۂ نور　　ظلمتِ شامِ غم ہوئی کافور
پھر پلا کے جامِ آتش رنگ　　ساقیِ سرخ فام نشے میں چور
بن گیا پھر سوادِ ہندستاں　　اک محیطِ فضائے عالمِ نور
دندصیاچل کی اونچی چوٹیاں پھر　　ہو گئیں چشمک زنِ تجلیِ طور
یعنی بھارت کی راجدھانی میں　　پھر یہ عشرت کے جشن کا ہے ظہور

یعنی شاہنشہِ معظمِ ہند　　جارجِ پنجم و میریِ قیصور
تاجِ ہندوستان و انگلستان　　رشکِ خاقان و قیصر و فغفور
آنکھیں جن کے جمال سے روشن　　دل ہے جن کے خیال سے مسرور
عہد میں جن کے ہے رعیت شاد　　دور میں جن کے ملک ہے معمور
جلوہ آرا ہیں خود بہ نفسِ نفیس　　زیبِ دربار ہیں نظامِ حضور
لشکریانِ صف شکن بہ جلو　　راجگان، شاہزادگان بہ حضور
یعنی سب والیانِ ہندستاں　　جموں، کشمیر، اور اودے پور
شاہِ آسام و لامۂ تبت　　راجگانِ بڑودہ و میسور
والیِ مسقط اور خانِ قلات　　راجۂ گوالیار اور اندور
سب سورج بنسی اور چندر بنسی　　راجۂ جودھپور اور جے پور
جس کے دربار میں ہیں یوں روشن　　جیسے سورج سے ذرّے ہوں پرنور
یادگارانِ پرتھی و جے چند　　جانشینانِ تغلق و تیمور
وارثانِ سپاہِ درّانی　　سر برآوردگانِ غزنی و غور
سورمایانِ راجپوت و سکھ　　غازیانِ قبائلِ مشہور
غولِ دیوانِ راون و اندر　　فوجِ بھیلانِ والیِ چتّور
تیغ باندھے کمر میں خوں آشام　　تیر کھینچے لگائے زخموں میں چور
حملہ شیرانِ بیشۂ پیکار　　سب نہنگانِ بحرِ خوں مغرور
جس کے آگے ادب سے حاضر ہیں　　جس کی تعمیلِ حکم پر مجبور
عہد کی جس کے برکتیں بے حد　　عقلِ اوّل شمار سے مجبور
جس کے الطاف لاتعدّ و شمار　　اور جس کے فیوض لامحصور
ہند میں اس طرح کا جشنِ عظیم　　ایسا دربار، دبدبہ، مذکور
کسی تاریخ سے نہیں ثابت　　اور کسی عہد میں نہیں مشہور
خاکِ دلّی ترے نصیب کہ تو　　بادشاہوں سے پھر ہوئی معمور
کامرانی کی ہر طرف ہے بہار　　شادمانی کا ہر جگہ ہے ظہور
کیا نصیبہ ہے ہند کا چمکا　　کہ مے عیش سے ہیں سب مخمور
اے شہنشاہِ آسماں اورنگ　　اے جہاندارِ معدلت دستور
تیرے خادم خدیو اور خاقان　　تیرے محکوم قیصر و فغفور
سلطنت تیری غرب سے تا شرق　　ملک آباد و شاد اور معمور
ہوئے اجزائے مذہب و ملت　　تیرے آئین اور ترے دستور
بادشاہوں پہ واجب التعمیل　　تیرے احکام اور ترے منشور
تیری افواج، بے حساب و شمار　　تیرا اقبال فاتح و منصور

توسلامت رہے ہزار برس ہر برس اک صدی بنے بھرپور
اور رہے دور پھر تسلسل کا یوں ہی کرتا رہے زمانہ مرور
میرا منہ تیری مدح خوانی کا بس دعا گوئی تھی مجھے منظور

اس سے زائد تری ستائش میں
نطق بے کار ناطقہ معذور

(زمانہ، دسمبر ۱۹۱۱ء)

دلی دربار

فاتح اعظم سکندر رومی کے بعد، یہ پہلا موقع ہے کہ ممالک یورپ کے جلیل القدر تاجدار نے سات سمندر پار سے آکر، سرزمین ہند پر قدم رکھا ہے۔ یعنی حضور پرنور ملک معظم حضرت جارج پنجم شاہنشاہ ہندوستان اور شاہنشاہ بیگم ملکۂ میری، ادام اللہ ملکہم و اجلالہم کے قدوم میمنت لزوم سے خاک ہندوستان کو شرف افتخار حاصل ہوا۔ اس مسرت خیز موقع پر وفا شعار رعایائے ہند کو جس قدر خوشی و مسرت ہو کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل ہندوستان کا زمین و آسمان اس کی کثیر التعداد اقوام کی مدح سرائیوں اور مختلف زبانوں کی نغمہ پروری سے گونج رہا ہے۔ چنانچہ مشہور بنگالی شاعر، مسٹر جے، این، مکرجی نے انگریزی نظم میں دہلی کو مخاطب کرکے جس حسن سے اظہار مسرت کیا ہے، وہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ نظم بطور خلاصہ، ۳۱ اکتوبر کے انڈین ڈیلی ٹیلیگراف لکھنؤ میں شائع ہوئی ہے۔ ترجمہ نذر ناظرین ہے۔

اے پرانی دلی، اے آثار دیرینہ شکوہ اے[1] جوانوں بادشاہ ....
تو کبھی گہوارہ تھا، مذہب کا اور تہذیب کا اب شباب اور ....

پانڈوں نے تجھ کو جب دیکھا نگاہ شوق سے پڑ گئی آنکھوں میں اُن کی، بس چکا چوندھا ایک بار
خوب گایا ہے مہا بھارت نے ہر یالہ ترا باندھ کر صنعت کا سہرا تیرے اور قدرت کا ہار

تیرے چپے چپے پر انبار ہیں اورنگ و تاج حوصلوں کے، ولولوں کے، جوش کے، جذبات کے
لوگ لیتے اور تجھے کھوتے رہے ہیں بارہا چال سے، تدبیر سے، تلوار سے، اور توپ سے

تو عمارات نفیسہ کا ہے دار السلطنت سات تعمیرات میں دنیا کی ہے تیرا شمار
آج بھی وہ خوبیاں ہیں تجھ میں جن کو دیکھ کر وجد کر اُٹھتے ہیں تیرے دوست دشمن ایک بار

لے مبارک! بعد مدت ہنستی ہے قسمت تری آرہا ہے یعنی شاہنشاہ ہندوستان کا
کالے کوسوں دور سے، ساتوں سمندر پار سے چھوڑ کر پیچھے جزیرہ اپنا انگلستان کا

ہاں مبارک عظمت دیرینہ کے سنگ نشاں ڈال دے گا اپنے ہاتھوں سے ترا ایسا ہار یار
ایک چادر تیری بوسیدہ شکستہ قبر پر یادگاروں میں تری اور ایک تازہ یادگار

---

[1] پیش نظر رسالے میں، یہاں پر کا کاغذ غائب ہے۔ مجھے فی الوقت یہ شمارہ دوسری جگہ نہیں ملا ہے۔

ہو رہی ہے دیکھ وہ صبحِ تجلی کی نمود　　　اُٹھ رہا ہے پردہ بزمِ عظمت و اقبال کا
فرش سے تا عرش آرائش ہے آتا ہے نظر　　　پھر زمانہ سا عہدِ آشوک کے اجلال کا

آج تک مطلع ترا ہر چند تھا تاریک و تار　　　لیکن اب موجودہ شاہی کر رہی ہے صاف تر
اور یہ امید ہے فیضِ قدومِ شاہ سے　　　اور بھی ہو جائے گا وہ صاف تر شفاف تر

مجھ سے سن، تو درحقیقت فخرِ ہندوستان ہے　　　منتخب ہونے پہ تیرے ہے زمانہ بھر گواہ
اور رہیں گے تیرے مینار و مساجد مدتوں　　　تیری عظمت اور تیری شان و شوکت پر گواہ

ملک تیرا آسماں کی طرح ناپید اکنار　　　خطۂ کشمیر سے، وسعت میں بحرِ ہند تک
اور تیرا عرض بھی ہے طول سے کچھ کم نہیں　　　برہما کے ملک سے گجرات اور سرہند تک

اس سے پہلے ہند کو تھی اس قدر وسعت کہاں　　　یعنی اب جتنا ہمالہ کے ادھر ہے ہند ہے
قلۂ ایورسٹ کے مانند کوئی سلطنت　　　گردشِ ایام سے محفوظ اگر ہے ہند ہے

امن و آسائش مسرت کا سبب ہے، گو، مگر　　　ہونا توپوں اور تفنگوں کی گرج میں فتح مند
واقعی ہے تیری قدرت اور شوکت کی دلیل　　　آتش افشاں کوہ کے دامن میں رہنا بے گزند

سرزمینِ پانی پت کے آج خاک و خون پر　　　ہیں جلیل القدر مہماں کے نصبِ شاہی خیام
ہوں مبارک تجھ کو دلّی تاجپوشی کے رسوم　　　تیرے شاہنشاہوں کی فہرست میں اور ایک نام

یعنی جھرمٹ میں رعایا کے، نظر آئیں گے اب　　　شاہ و شاہنشاہ بیگم با لباسِ زرنگار
جلوۂ دربار و فرمانِ شہنشاہی سے ہوں　　　آنکھیں روشن، کان مشتاق اور دل شاد ایک بار

ہم بھی اس موقع پہ، اک پرجوش طوفاں کی طرح　　　لیں فلک سر پہ اٹھا شورِ مبارک باد سے
اور لے کر ساتھ سچی مشرقی تمکین کو　　　ہم نوا ہو جائیں ہم برطانیہ آزاد سے

(ادیب، دسمبر ۱۹۱۱ء)

ایڈیٹر پبلشر نے ناظم پریس میں چھپوا کر دفتر نگار لطیف رامپور یوپی سے شایع کیا

...یئے تاکہ یہ نمبر زیادہ سے زیادہ جامع ہوسکے

REGD. NO. A—465 42ND YEAR OF PUBLICATION
NIGAR, URDU MONTHLY, RAMPUR U.P. OCTOBER 1963
REGISTERED WITH THE REGISTRAR OF NEWSPAPERS AT R.N. NO. 2136/57

قیمت { فی پرچہ ۵۷ نئے پیسے
سالانہ دس روپے

نگار

ڈاکٹر ذاکر حسین نمبر

ذاکر صاحب ہمارے تعلیمی رہنماؤں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے نظام تعلیم کو ہندوستانی مزاج دینے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے جس کی ایک جیتی جاگتی مثال جامعہ ملیہ ہے۔ علی گڑھ کو بھی ایک دو رابتلا میں جو ہمت ملی وہ انھیں کی ذات کا پرتو ہے اور اس کے مزاج میں نرمی و گرمی کی جو مخصوص صفت پیدا ہوئی وہ بھی ذاکر صاحب کے طفیل ہے۔ لیکن اس سب سے الگ ہوکر ان کی ایک ادبی حیثیت بھی ہے۔ اگرچہ کتابی شکل میں ذاکر صاحب کی چند ہی تحریریں آئی ہیں اور ان میں بھی کئی تراجم ہیں اسکے علاوہ ایک بیش بہا ذخیرہ تقاریر، خطبات، پیغامات اور خطوط کی شکل میں بکھرا ہوا ہے۔ ادارۂ نگار یہی کوشش کرے گا کہ اس میں ذاکر صاحب کی ساری تحریروں کو جمع کر دیا جائے تاکہ ایک صاحب طرز ادیب کی نگارشات دستبرد زمانہ سے محفوظ ہو جائیں اور ادب و انشا کے بیش بہا ذخیرے کی شیرازہ بندی ہو سکے۔

آپ کے پاس ذاکر صاحب کے

• پیغامات • خطوط • تقاریر، اور • خطبات میں سے

جو کچھ بھی ہو وہ ہمیں مرحمت فرمایئے تاکہ یہ نمبر زیادہ سے زیادہ جامع ہو سکے

ایڈیٹر: اکبر علیخاں

ضروری اعلان

پاکستانی خریدار نگار کا سالانہ چندہ اس پتہ پر بھیجیں
رسالہ جاری کر دیا جائے گا
نمائندہ نگار این ۶۱۷ سمن آباد لاہور

جلد (۴۲) | فہرست مضامین جون سنہ ۱۹۶۳ع | شمارہ (۶)

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
ملاحظات	۲	نامۂ دوستی — ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	۲۶
حل التغا دفی تواریخ سیرۂ خیر العباد — اسحاق النبی خاں	۵	منظومات — غلام ربانی تاباں، امتیاز علی عرشی، سحر رامپوری	۳۲
فن داستان نگاری اور باغ و بہار — سید ابوالخیر کشفی	۱۴	〃 — غلام ربانی تاباں، صبا اکبرآبادی، انجم قریشی رامپوری	۳۳
توبۃ النصوح کا ایک انگریزی ترجمہ — سید مبارز الدین رفعت	۱۹	غالبیہ — تعبیر الباب — اکبر علیخاں	۳۴
		مطبوعات موصولہ	۴۷

ملاحظات

ابھی تک ہمیں تحقیقی کام کی اہمیت کا احساس نہیں ہوا ہے۔ اسکی بنیادی اور سچی وجہ یہ ہے کہ تحقیق جس لگن محنت اور توجہ کا مطالبہ کرتی ہے وہ خود بڑی حد تک حوصلہ شکن ہے۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب لوگ کسی راستے کی سختی اور دشوار گزاری کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو اپنی کاہلی کو چھپانے کے لیے منزل کی تحقیر پر کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ اردو تحقیق کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے جو لوگ اس میدان میں اپنے کچھ جوہر دکھا سکتے تھے وہ اس سے خائف ہو گئے اور قدم بڑھانے سے پہلے ہی پیچھے کی طرف پلٹ گئے۔

اردو کے نقادوں میں کم ایسے ہیں جنھوں نے ادب میں تحقیق کی اہمیت کو تسلیم کیا ہو۔ اور جب کبھی وہ یہ ثابت کرنے کے لیے اس طرف آئے ہیں کہ تحقیق بڑا سہل اور آسان ادبی مشغلہ ہے تو اس کا نتیجہ کلیاتِ میر کے پاکستانی ایڈیشن کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جس میں مرتب نے خواہ اہمیت کچھ دے دی ہو اور ان سے کام کم لیا ہے۔

تحقیق کا اولین مقصد یہ ہے کہ ادب کی بنیادوں کو مضبوط کیا جائے۔ ہمارے اہلِ قلم ابھی تک تفہیم و تنقید سے آگے نہیں بڑھتے ہیں اور سیاسی، سماجی اور معاشرتی ماحول کو سامنے رکھ کر گفتگو کی جاتی ہے بعض اوقات ان کا یہ سعی کام بھی نہیں ہوتا۔ اس طرح بے بنیاد عمارت کی تعمیر ہوا کرتی ہے۔

اردو دواوین کے سلسلے میں کام کا کل اب تک نہ ہونے کے برابر ہے۔ بعض اس کی یہ ہے کہ ان تک پہنچ ہی کس کی ہوتی ہے۔ دو چار شاعروں کے دیوان نولکشور پریس کے طفیل میں سامنے آ گئے ہیں مگر ادھر بھی یہ سلسلہ کئی دہے کا شکستہ کر اب ان میں سے اکثر کو غیر مطبوعہ ہی سمجھنا پڑتا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ نولکشور نے لاتعداد کتابیں اردو فارسی کی چھاپ ڈالیں مگر اس عہد میں ترتیب و اشاعت کا وہ فنی شعور کہاں تھا جو آج صاحب نظر تلاش کرتے ہیں۔ اس لیے وہ ایڈیشن نہ اغلاط سے پاک ہیں اور نہ تنقیدی (CRITCAL) کہلائے جا سکتے ہیں۔ اور تو سب کچھ چھوڑیے یہ سوچیے کہ جب تک یہ ذخیرہ دریافت نہ کر لیا جائے اس وقت تک ہم اردو زبان کی لغت کی تدوین بھی نہیں کر سکتے۔ جس زبان کے پاس اپنی لغت تک نہ ہو اس کی کم مایگی کے بیان کی ضرورت ہی کیا ہے۔ نولکشوری عہد کے بعد جو نصف صدی ہم نے گزاری اس نے ہمارے ذہن کو فنی پختگی نام کی کوئی چیز نہیں دی۔ اور ہم بیکار رہ گئے۔ اب تو جو کچھ بھی کچی روشنائی سے لکھا جائے اس میں زیادہ سے زیادہ سلیقہ ہونا چاہیے۔ اس یقین کے ساتھ اس کی نسبت کسی

سامنے ہی غلطی کا امکان گویا نہ رہے۔ جیسے ایک مشہور نقاد نے نمبر کے تجزیے میں نواب یار محمد خاں امیر رامپوری کے شعر:

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن　　مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

بیاد باتیں لکھ ڈالی تھیں۔ یہ غلطیاں بار بار ہوتی رہیں گی۔ ہمارے نقاد مقدموں پر گزر اوقات کرتے رہیں گے اس وقت تک جب تک انھیں اپنے مٹے گا۔

بات کیجیے صاحب! میں نے قائم کا دیوان اڈیٹ کیا ہے اور متعدد اہم نسخے سامنے رکھ کر کوشش کی ہے کہ اس کا صحیح متن پیش کرسکوں۔ آپ کا پہلے تو یہی امکان کم ہے کہ جواب اثبات میں ہو اور اگر کوئی اللہ کا بندہ ان محققین کے گروپ کو خوش رکھنے کے لیے آمادہ بھی ہوا تو آپ کی اس معید۔ دس فیصد یا اگر فی صفحہ کی بات ہو تو دو روپیہ فی صفحہ۔ آپ نے مہینوں پسینہ بہایا تھا۔ آنکھیں گھلا کر کر مخزونہ پرانے نسخوں ادھر ادھر آنے جانے میں اپنا روپیہ صرف کیا تھا مگر آپ کو کیا ملا کل تین سو روپے یہ ہماری قدر شناسی ان کاموں کی اہمیت کا احساس ہے۔ جو بنیادی کام ہیں، اور جن کے ذریعے آئندہ اغلاط کے دروازے بند ہو جاتے ہیں زبان و بیان کا ارتقا سامنے آتا ہے عہد بعہد زبان کی رفتار کا علم ہوتا ہے ادب کی تاریخ بنانے میں مدد ملتی ہے۔ ان کی قیمت ہم نے کل تین سو روپے لگائی۔ لیکن اگر یہی کتاب، آٹھ لکھے سیدھے مضامین کا مجموعہ ہوتی محض تعبیر بتبسم کے مضامین کا تو ان کا معاوضہ مصنف کو ۸ روپے فی صفحہ ملتا جب تو یہی اونچا نظریہ ہمارے ایک عرصے تک ترجموں کے معاملوں میں برتی رہی اب ہم تحقیق کے ساتھ برت رہے ہیں۔ شاید ادبی دنیا میں اب یہ کام کرنیوالوں کا امتحان لینے والی چیز تحقیق ہی ہے۔ جو لوگ اس سے متعلق ہیں ان کی بے جگری اور ہمت کی داد دینی پڑتی ہے ــــ بڑے کام اپنے کرنیوالوں کی ذاتی تسکین کا ذریعہ کہاں تک بن سکتے ہیں اور تسکین میں بھی تو ایک حد تک دوسروں کی ستائش شامل ہوتی ہے۔ ہمارے شاعر اور نقاد اور ان کے علاوہ دوسرے ادبی مشاغل والے اکثر داد اور کمی داد کا شکار ہوتے ہیں۔ ہاں تحقیق کرنے والا گروپ ستائش اور حوصلے سے بے پروا تو ہوتا ہی ہے مگر عام طور پر اس کا مستحق بھی نہیں جانا جاتا۔ جس محنت اور لگن کی زندگی یہ لوگ گزارتے ہیں اس کا اندازہ لگانا بھی دشوار ہے۔ ابھی پچھلے دنوں علی گڑھ یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے معراج العاشقین کو اڈیٹ کیا ہے۔ یہ کتاب برسوں سے ہماری مختلف یونیورسٹیوں کے اردو نصاب میں شامل اور اپنے لا تعداد بے معنی جملوں کے ساتھ رائج ہے۔ استاد ہر جملے کی تشریح و توضیح کرتے وقت گل افشانیٔ گفتار سے کام لیتا ہے حالانکہ وہ خود پریشان ہوتا ہے اس کتاب کی بے ربطی سے۔ لیکن آخر کرے تو کیا کرے کلاس میں اس کتاب پر اعتراض کے معنی اپنی کم سوادی پر منتج ہوتے ہیں اور حلقۂ شاگرداں میں بات خراب ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کے متن کو صحیح ترین شکل میں پیش کرکے نہایت اہم تشریحی حاشی لکھے ہیں اور تقریباً تمام ناقابلِ فہم مقامات کو سہل بنا دیا ہے۔ مگر کون ہے جو ان کے کام کی اہمیت کو سمجھے اور پھر اس دماغ سوزی کی داد دے جو انھیں اس کام کے دوران میں کرنی پڑی ہے۔ کیا صرف قاضی عبدالودود صاحب جیسے دو چار اصحاب کی تحسین و تعریف ہی پر گزارہ کیا جاسکتا ہے۔ کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ ہم ان اربابِ تحقیق کی حوصلہ افزائی کریں جو اپنی جانیں کھپاتے ہیں اور میر و مرزا غالب اور مومن میراں اور سرور کی تخلیقات کی صحیح شکل پیش کرکے ہمیں اس لائق بناتے ہیں کہ لفظوں کے پردے میں چھپے ہوئے شاہد معنی کے حسن سے لطف اٹھایا جاسکے۔

جدید ایران اور جدید عرب و جاپان نے اپنے خزانوں کو زیادہ سے زیادہ مہذب بنا لیا ہے۔ اس لیے کہ وہ جانتے ہیں جدید کی بنیاد قدیم پر رکھی جاتی ہے جو آج جدید ہے وہ بھی کل قدیم کے درجے میں آجائے گا اپنے ورثے کی طرف سے غفلت برت کر ہم اپنے مستقبل کے خود لٹیرے بن جاتے ہیں۔

آج اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ تحقیق کے میدان میں آنے والوں کی ہمت افزائی ہر رخ پر ہو۔

ناشر کی طرف سے باعزت معاوضے کی شکل میں اور کتاب کو حسن صورت دے کر۔

قدر کی طرف سے محنت کو سراہ کر اور خریداری کے ذریعے کتاب کو کیڑے مکوڑوں کی خوراک بننے سے بچا کر۔

ہندوستان میں اردو کے ادبی رسالوں کو زندہ رکھنا ایک بڑا اہم مسئلہ ہے۔ فلمی رسالوں کو نہ اشتہاروں کی کمی ہے نہ خریداروں کی۔ ادبی پرچوں کے لیے دوہری مار ہے۔ نہ خریدار نہ اشتہار۔ خریدار پیدا کرنے کے لیے صبر اور اتنا وقت درکار ہوتا ہے۔ حلقہ بنتے بنتے بنتا ہے۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ برسوں مسلسل اشاعت کے بعد بھی بنیادیں کمزور رہتی ہیں اور خریداروں کا قحط چھایا رہتا ہے۔ تو اب صرف ایک صورت اشتہاروں

ایڈیٹر: اکبر علیخاں

ضروری اعلان
پاکستانی خریدار نگار کا سالانہ چندہ اس پتہ پر بھیجیں
رسالہ جاری کر دیا جائے گا
نمائندہ نگار ۶۱۷ ای این سمن آباد لاہور

جلد (۴۲) | فہرست مضامین جون ۱۹۶۳ء | شمارہ (۶)

ملاحظات		۲
حل التضاد فی تواریخ سیرۃ خیر العباد ۔ اسحاق النبی خاں		۵
فن داستان نگاری اور باغ و بہار	سید ابوالخیر کشفی	۱۴
توبۃ النصوح کا ایک انگریزی ترجمہ ۔ سید مبارز الدین رفعت		۱۹
تاریخ و من	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	۲۶
منظومات	غلام ربانی تاباں، امتیاز علی عرشی، سحر رامپوری	۳۲
"	غلام ربانی تاباں، صبا اکبرآبادی، انجم قریشی رامپوری	۳۳
غالبیہ	تعبیر اسباب ۔ اکبر علیخاں	۳۴
مطبوعات موصولہ		۴۷

ملاحظات

ابھی تک ہمیں تحقیقی کام کی اہمیت کا احساس نہیں ہوا ہے اسکی بنیادی اور سچی وجہ یہ ہے کہ تحقیق جس لگن محنت اور توجہ کا مطالبہ کرتی ہے وہ خود بڑی حد تک حوصلہ شکن ہے۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب لوگ کسی راستے کی تنگی اور دشوار گزاری کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے منزل کی تحقیر پر کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ اردو تحقیق کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے جو لوگ اس میدان میں اپنے کچھ جوہر دکھا سکتے تھے وہ اس سے خائف ہو گئے اور قدم بڑھانے سے پہلے ہی پیچھے کی طرف پلٹ گئے۔

اردو کے نقاد و رہبر کم ایسے ہیں جنھوں نے ادب میں تحقیق کی اہمیت کو تسلیم کیا ہو۔ اور جب کبھی وہ یہ ثابت کرنے کے لیے ہر طرف لگے ہیں کہ تحقیق غیر اصیل اور کم مایہ ادبی مشغلہ ہے تو اس کا نتیجہ کلیات میر کے پاکستانی ایڈیشن کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جس میں مرتب نے حواشی بہت کم دیئے ہیں اور ان سے کام کم لیا ہے۔

تحقیق کا اولین مقصد وہ ہے کہ ادب کی بنیادوں کو مضبوط کیا جائے۔ ہمارے اہل قلم ابھی تک تفہیم و تنقید سے آگے نہیں بڑھتے ہیں اور سیاسی، سماجی اور معاشرتی ماحول کو سامنے رکھ کر گفتگو کی جاتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ بنیاد کا علم نہ ہو تو ساری عمارت بے بنیاد عمارت کی تعمیر ہو جاتی ہے۔

اردو دواوین کے ساتھ یہاں تک کا کام مکمل اور صحیح ترین نسخہ اس لیے کہ اب تک پہنچی کس کی ہوئی ہے۔ دوچار شاعروں کے دیوان نولکشور پریس کے طفیل میں سامنے آ گئے ہیں مگر اب ان کی بھی یہ حالت ہے کہ اب ان میں سے اکثر کو غیر مطبوعہ ہی سمجھنا پڑتا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ نولکشور نے لاتعداد کتابیں اردو فارسی کی چھاپ ڈالیں مگر اس عہد میں ترتیب و اشاعت کا وہ فنی شعور کہاں تھا جو آج صاحب نظر تلاش کرتے ہیں۔ اس لیے وہ ایڈیشن نہ اغلاط سے پاک ہیں اور نہ تنقیدی (CRITCAL) کہلائے جا سکتے ہیں۔ اور تو سب کچھ چھوڑ دیجئے یہ سوچیئے کہ جب تک یہ ذخیرہ دریافت نہ کر لیا جائے اس وقت تک ہم اردو زبان کی لغت کی تدوین بھی نہیں کر سکتے۔ جس زبان کے پاس اپنی لغت تک نہ ہو اس کی کس مپرسی کے لیے کسی دلیل کی ضرورت ہی کیا ہے۔ نولکشوری عہد کے بعد جو نصف صدی ہم نے گزاری اس نے ہمارے ذہن کو نئی پختگی نام کی کوئی چیز نہیں دی۔ اور ہم بیکار رہ گئے۔ اب تو کچھ بھی کی روشنائی سے لکھا جائے اس میں زیادہ سے زیادہ سلیقہ ہونا چاہیے۔ اس یقین کے ساتھ اس کی نسبت کسی

غلط شخص سے تہلیل کی جا رہی ہے۔ اور اس قسم کی غلطی کا امکان گویا نہ رہے۔ جیسے ایک مشہور نقاد نے میر کے تجزیے میں نواب یار محمد خاں امیر رامپوری کے شعر:

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن   مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

کو بنیاد بنا کر بہت کچھ بے بنیاد باتیں لکھ ڈالی تھیں۔ یہ غلطیاں بار بار ہوتی رہیں گی۔ ہمارے نقاد مفروضوں پر گزر اوقات کرتے رہیں گے اس وقت تک جب تک انھیں اپنے ورثے کو برتنے کا سلیقہ نہ آ جائے گا۔

آپ کسی ادارے سے بات کیجیے "صاحب! میں نے تاباں کا دیوان ایڈٹ کیا ہے اور متعدد اہم نسخے سامنے رکھ کر کوشش کی ہے کہ اس کا صحیح متن پیش کر سکوں۔ آپ کا ادارہ اسے چھاپ سکے گا؟" تو پہلے تو یہی امکان کم ہے کہ جواب اثبات میں ہو اور اگر کوئی اللہ کا بندہ ان محققین کے گروپ کو خوش رکھنے کے لیے آمادہ بھی ہوا تو آپ کی اس محنت کا صلہ کیا ملے گا۔ ۸ فیصد۔ دس فیصد یا اگر فی صفحہ کی بات ہو تو روپیہ فی صفحہ۔ آپ نے مہینوں پسینہ بہایا تھا۔ آنکھیں گھلا کر کرم خوردہ پرانے نسخوں کو مصیبت جھیل کر پڑھا تھا اور ادھر ادھر آنے جانے میں اپنا روپیہ صرف کیا تھا مگر آپ کو کیا ملا کل تین سو روپے یہ ہماری قدر شناسی ہے اور کاموں کی اہمیت کا احساس ہے۔ جو بنیادی کام ہیں اور جن کے ذریعے آئندہ اغلاط کے دروازے بند ہو جاتے ہیں زبان و بیان کا ارتقا سامنے آتا ہے عہد بعہد زبان کی رفتار کا علم ہوتا ہے ادب کی تاریخ بننے میں مدد ملتی ہے۔ ان کی قیمت ہم نے کل تین سو روپے لگائی۔ لیکن اگر یہی کتاب، الٹے سیدھے مضامین کا مجموعہ ہوتی محض تبصر تبصر قسم کے مضامین کا تو ان کا معاوضہ مصنف کو ۸ روپے فی صفحہ ملتا جو بے تو یہی ادبی نظری ہمارے ایک صدی تک ترجموں کے معاملوں میں برتی رہی اب ہم تحقیق کے ساتھ برت رہے ہیں۔ شاید ادبی دنیا میں ادب کا کام کرنے والوں کا امتحان لینے والی چیز تحقیق ہی ہے۔ جو لوگ اس سے متعلق ہیں ان کی بے جگری اور ہمت کی داد دینی پڑتی ہے ـــــ بڑے کام اپنے کرنے والوں کی ذاتی تسکین کا ذریعہ کہاں تک بن سکتے ہیں اور تسکین میں بھی تو ایک حد تک دوسروں کی ستائش شامل ہوتی ہے۔ ہمارے شاعر اور نقاد اور ان کے علاوہ دوسرے ادبی مشاغل والے اکثر داد اور کم بیداد کا شکار ہوتے ہیں۔ ہاں تحقیق کرنے والا گروپ ستائش اور حوصلے سے بے پروا تو ہوتا ہی ہے مگر عام طور پر اس کا مستحق بھی نہیں جانا جاتا۔ جس محنت اور لگن کی زندگی یہ لوگ گزارتے ہیں اس کا اندازہ لگانا بھی دشوار ہے۔ ابھی پچھلے دنوں علی گڑھ یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے معراج العاشقین کو ایڈیٹ کیا ہے۔ یہ کتاب برسوں سے ہماری مختلف یونیورسٹیوں کے اردو نصاب میں شامل اور اپنے لا تعداد بے معنی جملوں کے ساتھ رائج ہے۔ استاد ہر جملے کی تشریح و توضیح کرتے وقت گل افشانیٔ گفتار سے کام لیتا ہے حالانکہ وہ خود پریشان ہوتا ہے اس کتاب کی بے ربطی سے۔ لیکن آخر کرے تو کیا کرے کلاس میں اس کتاب پر اعتراض کے معنی اپنی کم سوادی پر منتج ہوتے ہیں اور حلقۂ شاگرداں میں بات خراب ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کے متن کو صحیح ترین شکل میں پیش کر کے نہایت اہم تشریحی حاشیے لکھے ہیں اور تقریباً تمام ناقابل فہم مقامات کو سہل بنا دیا ہے۔ مگر کون ہے جو ان کے کام کی اہمیت کو سمجھے اور پھر اس دماغ سوزی کی داد دے جو انھیں اس کام کے دوران میں کرنی پڑی ہے۔ کیا صرف قاضی عبدالودود صاحب جیسے دو چار احباب کی تحسین و تصویب ہی پر گزارہ کیا جا سکتا ہے۔ کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ ہم ان ارباب تحقیق کی حوصلہ افزائی کریں جو اپنی جانیں کھپاتے ہیں اور میر و مرزا غالب اور مومن، میرن اور سودا کی تخلیقات کی صحیح شکل پیش کر کے ہمیں اس لائق بناتے ہیں کہ لفظوں کے پردے میں چھپے ہوئے شاہد معنی کے حسن سے لطف اٹھایا جا سکے۔

جدید ایران اور جدید عرب و جاپان نے اپنے خزانوں کو زیادہ سے زیادہ مہذب بنا لیا ہے۔ اس لیے کہ وہ جانتے ہیں جدید کی بنیاد قدیم پر رکھی جاتی ہے جو آج جدید ہے وہ بھی کل قدیم کے درجے میں آ جائے گا اپنے ورثے کی طرف سے غفلت برت کر ہم اپنے مستقبل کے خود لٹیرے بن جاتے ہیں۔

آج اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ تحقیق کے میدان میں آنے والوں کی ہمت افزائی ہر رخ پر ہو۔

ناشر کی طرف سے باعزت معاوضے کی شکل میں اور کتاب کو حسن صورت دے کر۔

قاری کی طرف سے محنت کو سراہ کر اور خریداری کے ذریعے کتاب کو کیڑے مکوڑوں کی خوراک بننے سے بچا کر۔

ہندوستان میں اردو کے ادبی رسالوں کو زندہ رکھنا ایک بڑا اہم مسئلہ ہے۔ فلمی رسالوں کو نہ اشتہاروں کی کمی ہے نہ خریداروں کی۔ ادبی پرچوں کے لیے دوہری مار ہے۔ نہ خریدار نہ اشتہار۔ خریدار پیدا کرنے کے لیے صبر آزما وقت درکار ہوتا ہے۔ حلقہ بنتے بنتے بنتا ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ برسوں مسلسل اشاعت کے بعد بھی بنیادیں کمزور ہی رہتی ہیں اور خریداروں کا قحط چھایا رہتا ہے۔ تو اب صرف ایک صورت اشتہاروں

کی باقی رہ جاتی ہے ۔ اردو کے ادبی پرچوں کو اشتہار صرف اردو سے تعلق کی وجہ سے مل سکتے ہیں ۔ اور ایسے کتنے مشتہرین ہیں جو اردو سے لگاؤ رکھتے ہوں بہت گنتی کے!
ان میں سر فہرست ہمدرد دواخانہ ہے پھر سیلا بمبئی اور شیروانی الہ آباد آتے ہیں ۔ ان تینوں کے مالکان اردو دوست بھی ہیں اور صاحب ذوق بھی۔

یوں تو ان کے اشتہارات اردو پرچوں میں جاتے ہیں لیکن جی چاہتا ہے کہ اردو کی کس مپرسی میں یہ سنجیدہ ادب کی ترویج و ترقی کیطرف زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیں ۔ اور اردو کے ان چند گنتی کے رسائل پر خصوصی توجہ دیں جو زندگی اور موت کے درمیان جھولتے ہیں لیکن پھر بھی سستے اور گھٹیا ادب کی اشاعت سے دامن بچائے رہتے ہیں ۔ ایسے رسالے ۲۰ ۔ ۲۵ سے زیادہ ہرگز نہ ہونگے ۔ لاکھوں روپے کے بجٹ میں سے ایک حقیر رقم ان رسالوں میں نئی روح پھونک سکتی ہے جناب عبد الحمید خواجہ ۔ جناب حکیم عبد الحمید دہلوی اور جناب احمد رشید شیروانی سے ، یہ ہماری توقع ہے کہ وہ اس معاملے پر غور فرمائیں گے اور اپنے اڈورٹائزنگ ایجنسیوں کو خصوصی ہدایات دیں گے ۔ تاکہ اردو کے خادم اطمینان سے مصروف عمل رہیں ۔

اس شمارے سے نگار میں ایک اہم کتاب کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے ۔ کتاب کا موضوع بے حد دلچسپ مفید اور ضروری ہے ـــــ ہر شخص جانتا ہے اسلامی تاریخ کا سرورق یعنی سیرۃ رسول اللہ ﷺ اس حیثیت سے ایک معمہ بنی ہوئی ہے کہ اس کے واقعات تاریخ و ایام کی چولیں ٹھیک نہیں بیٹھتیں ۔ اور کبھی کبھی تو ان میں ایسا شدید تضاد پایا جاتا ہے کہ پوری سیرۃ کے راوی مشکوک نظر آنے لگتے ہیں ۔ قدیم سیرۃ کی کتابوں میں لگ بھگ سو سوا سو واقعات کی تاریخیں اپنی ساری تفصیلات کے ساتھ ملتی ہیں ۔ دنیا کی تاریخ میں یہ اسلامی مورخوں کا حیرت خیز کارنامہ ہے ۔ لیکن موجودہ دور کے صاحب قلم اس شجر ممنوعہ تک جاتے ہوئے ڈرتے ہیں اور موجودہ کتابوں میں دو ایک واقعات کی تاریخیں بھی نہیں ملتیں ۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی تاریخ سے ایام مطابقت نہیں کرتے کبھی روایات سے موسم غیر مطابق ہو جاتے ہیں ۔ کبھی ایک ہی واقعے کے متعلق دو مختلف مہینوں کے نام ملتے ہیں ۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی تاریخی واقعہ کی علم ہئیت تکذیب کرتا ہے غرض یہ وادی پر خار ایسی ہے جس سے دامن بچا کر گزر جانے ہی میں عافیت ہے ۔

یہ موضوع خالص انسانی نقطۂ نظر سے بھی اہم ہے کہ انسانی تہذیب و تمدن کی ایک نمائندہ امت کی تاریخ کو صحیح صحیح سمجھنا خود اپنی جگہ ایک ضرورت ہے ۔ اس لیے کہ اس کے بغیر اس زنجیر سے ایک کڑی کم رہ جاتی ہے ۔ چنانچہ نیلسن (Nielsen) ونکلر (Winkler) پرسیول (Persival) میور (Moir) جیسے مستشرقین اور حمید اللہ جیسے صاحب نظر نے ایسے مسئلے کو سلجھانے کی کوشش تو مگر کامیاب نہ ہو سکے ۔

اس موضوع کے لیے جس وسعت مطالعہ محنت اور خلوص کی ضرورت تھی مسرت کا مقام ہے کہ اس کا پورا پورا حق صاحب تصنیف نے ادا کیا ہے ، اور ایک وسیع کینوس پر اپنے مطالعہ کا نچوڑ پیش کیا ہے ۔ موصوف کا یہ کارنامہ علمی دنیا پر ایک احسان ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا ۔

یوں تو نگار کی محفل میں اسحاق النبی خاں صاحب پہلی بار تشریف لائے ہیں ۔ مگر ایک طرح ان کا رشتہ اس رسالے سے بہت پرانا ہے ۔ ۱۹۴۲ء کی بات ہے مولانا نیاز فتحپوری نے ڈاکٹر ٹسڈل کے ان اعتراضات کا ترجمہ شایع کیا تھا ۔ جو قرآن مجید پر کیے گئے تھے ۔ صاحب تصنیف ہی وہ پہلے مرد مومن تھے جنھوں نے عالمانہ انداز میں اس کے کچھ حصوں کا جواب لکھا تھا اور جو بہ ہان دہلی میں " ہاردن اور گورالڈ طلائی " کے عنوان سے شایع بھی ہوا تھا ۔ اسلام سے دلچسپی رکھنے والے حلقوں نے اس کا خیر مقدم پورے جوش و خروش سے کیا تھا اور اب بھی بہت سے حضرات کو یہ افسوس ہے کہ وہ کام پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکا ۔

موجودہ کتاب میں بظاہر ایک خشک موضوع کو جیسی تر زبانی صاحب تحریر نے عطا کی ہے وہ اس کے بہت سے بوجھل حصوں کو بھی گوارا بنا دیتی ہے ۔
نگار کو یہ فخر ہے کہ اس نے ایک ایسی کتاب پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جس کی ضرورت کا احساس تو سب کو تھا مگر لب اظہار اور جرأت گفتار کی کمی نے اسے احاطۂ تحریر میں نہیں آنے دیا ۔

حل التضاد فی تواریخ سیرۃ خیر العباد

اسحاق النبی خاں

مقالۂ اوّل

فصل اوّل

انسانی تاریخ میں ساتویں صدی عیسوی ہمیشہ یادگار رہے گی، کیونکہ اس زمانے میں دنیا ایک عجیب و غریب انقلابی تحریک سے روشناس ہوئی تھی جسکے ایک ہی ہاتھ میں بیک وقت تخریب و تعمیر دونوں کے جوہر موجود تھے، عرف عام میں اس تحریک کو اسلامی تحریک کہا جاتا ہے۔ اس کی ابتدا اگرچہ جزیرہ نمائے عرب کے ایک گمنام اور غیر تاریخی گوشے یعنی حجاز سے ہوئی تھی، لیکن اس کی عمومی اور آفاقی مقبولیت نے ثابت کر دیا کہ یہ وقت کی آواز تھی جو کہیں سے بھی اٹھتی ضرور سنی جاتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بیس پچیس سال کے اندر ہی یہ تحریک پورے مشرق وسطیٰ پر چھا گئی جہاں سے اس کا ہر ت پھیلا عالم تھا۔

یہ بات سب کو تسلیم ہے، کہ جزیرہ نما سے نکلنے کے فوراً ہی بعد اس کے علمبرداروں نے ایک ایسی بے نظیر تہذیب اور لافانی تمدن کی بنیاد ڈالی جس نے انسانیت کو آگے بڑھانے میں حیرت انگیز کام انجام دیئے اور آج بھی تاریخ تمدن کے طالب علموں کے لیے باعث کشش اور جاذب توجہ ہیں۔

تاریخ اسلام کی ابتدا پیغمبر اسلام کی سیرۃ، یا بالفاظ دیگر آپ کے ان احکام و افعال سے ہوتی ہے، جو اس تحریک کو منظم کرنے، چلانے اور کامیاب بنانے میں اختیار کیے گئے تھے۔ اس اعتبار سے تاریخ اسلام کا یہ ابتدائی حصہ حد درجہ اہم ہے، اور اسلامی تاریخ کے ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اصل تحریک کو سمجھنے کے لیے اس حصّے کا بغائر نظر مطالعہ کرے۔

مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے اپنے پیغمبر کی تعلیمات اور زندگی کے جزئیات کو محفوظ کرنے کے لیے جو جد و جہد کی اور جو جو طریقے اختیار کیے، خود ان کی نظیر تاریخ عالم میں ڈھونڈے نہ ملے گی۔ یہ دعویٰ بڑی حد تک سچا معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس سلسلے میں مسلمانوں نے جس بے اندازہ محنت، احتیاط، اور تلاش و تنقید کا ثبوت دیا ہے، وہ واقعی قابل داد ہے۔ اور اگرچہ آج تاریخی روایات کو جمع کرنے اور ان پر جرح و تنقید کے کچھ اور اصول بھی دریافت ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ پرانے اصول ہنوز اپنی جگہ ہیں اور ان کی حمایت میں بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے

تاریخی نقطۂ نظر سے پیغمبر اسلام کی سرگزشت کو تین بڑے حصوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی:

۱۔ عہد ماقبل نبوت

۲۔ مکی عہد

۳۔ مدنی عہد

عمومی تاریخ میں یہ آخری حصہ خاص اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ اسی نقطے سے آنحضرتؐ کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے اور اسی مقام سے اسلامی تحریک جو اس وقت تک خاموش اور پرامن تھی، شمشیر بکف ہو کر عملی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ تاریخ اسلام کے طالب علموں کے لیے آنحضرتؐ کی سیاسی زندگی کا مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا آپکی نظریاتی تعلیم کا، کیونکہ یہ آپکی عظیم انقلابی تحریک کا عملی پہلو ہے، اور اس سے ہمیں وہ تمام درجہ بدرجہ تنظیمی، اور سیاسی ترتیبات نظر آسکتی ہیں جن کی بدولت اسلام مذہب کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ معاشرے اور سیاسی طاقت میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی ایک فرد میں نظریات پیش کرنے کی صلاحیت کے ساتھ انتظامی قابلیت، اور پھر رہنمائی کا جوہر کارخانۂ قدرت میں سب سے زیادہ

نادر الوقوع عجوبہ ہے، اس نظریے سے دیکھیے تو کسی بھی مصلح، رہنما، ہادی، قائد یا فاتح میں بیک وقت اتنے اوصاف نظر نہیں آتے جتنے تنہا رسول عربی کی ذات میں قدرت نے ودیعت کیے تھے، جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ اس عظیم شخصیت نے اگر ایک طرف بالکل نئے قسم کے دینی، معاشی، سیاسی، اور اخلاقی نظریات و تصورات پیش کرکے دنیا سے منوا لیے تو دوسری طرف دس سال کی قلیل مدت میں ایک ایسی عظیم اور مائل بہ ترقی سلطنت کی خود اپنے ہاتھوں سے تشکیل و تاسیس بھی کی جس نے اگلے آٹھ دس سال کے اندر ہی براعظم ایشیا و افریقہ کی دو مضبوط ترین شہنشاہیتوں کو نیست کر دیا[1]۔

یہ سلطنت صحرائے عرب سے اٹھی ہوئی عارضی آندھی نہ تھی جو فوراً اتر جاتی بلکہ ایک مضبوط اور محکم نظام تھا جس نے تھوڑے ہی عرصے میں وادئ سندھ سے بحیرہ بحر ارال (ARAL) تک اور ارال سے لے کر اٹلانٹک (ATLANTIC) تک ایک ہی پرچم کو سربلند کر دیا، جو بڑی مدت تک اسی شان و شوکت سے لہراتا رہا، اور آج بھی جبکہ ڈیڑھ ہزار سال گزر چکے ہیں، دنیا کے ایک بڑے حصہ پر سایہ فگن ہے۔

اس عظیم سلطنت کی ابتدا ان چھوٹی چھوٹی مہموں، اور معرکہ آرائیوں سے ہوئی تھی جن کو سیرت کی اصطلاح میں غزوات و سرایا کہا جاتا ہے، اور جو اس اعتبار سے نہایت ہی اہم ہیں کہ اسلام کی تابناک تاریخ سیاست کا پہلا باب انہیں سے شروع ہوتا ہے۔ سیرۃ کی کتابوں میں ان غزوات و سرایا کے جو دلچسپ حالات ملتے ہیں وہ اتنی تفصیل کے ساتھ ہیں کہ ان کو پڑھنے کے بعد کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ آنکھوں دیکھا حال نہیں، مثلاً ہر غزوے یا سریے کی اصل وجہ، مقام جنگ، اس کا مدینے یا کسی اور مشہور مقام سے فاصلہ مع سمت، امیر جیش یا علمبردار کا نام، پرچم کا رنگ، مسلم فوج کا شعار، شرکا کی پوری تعداد، مع اسماء مشاہیر باہمی صراحت کہ مثلاً ان میں کتنے اوسی تھے، کتنے خزرجی، پھر ان سب کے حلفاء، اور دوستوں کی نشاندہی ہوا نقلین؛ مخالفین کے سواروں کی طاقت، گھوڑوں کے نام نیز یہ کہ کون شخص کس کے ہاتھ سے قتل یا مجروح ہوا؟ اور کس آلہ سے؟ پھر وہ تمام خاص خاص گفتگوئیں جو آپس میں یا فریقین کے درمیان ہوئیں، مخالفین کی جنگی طاقت؛ اسیران جنگ کے نام، غنائم کی تفصیل، حتیٰ کہ معرکہ کا دن تاریخ اور مہینہ تک متعین کیا گیا ہے۔ اور کسی وجہ سے تاریخ و ایام کی کوئی صراحت نہ مل سکی تو مہینہ ضرور نظر آئے گا؛

ظاہر ہے کہ یہ جملہ تفصیلات، اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان کو فوراً ہی قلمبند نہ کر لیا جائے، بالخصوص تاریخ اور دن کی نشاندہی بلا لکھے ممکن نہیں؛ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر واقعی یہ روایات درست ہیں، اور ان تفصیلات کی حیثیت افسانوی نہیں بلکہ تاریخی ہے، تو ابتدائی "مدونین سیرۃ" یا ان کے "رواۃ" کے سامنے براہ راست کچھ ایسی دستاویزیں تھیں جن کا تعلق عہد رسالت بلکہ غزوات سے تھا؛

یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے ہمیں روایات سیرۃ پر تنقید کا حق پہنچتا ہے، اور اصولی طور پر ہماری نظریں کتب سیر کے ابتدائی ماخذوں کی طرف اٹھتی ہیں؛ کیوں کہ تاریخ صرف مستند ماخذوں کے بیان کردہ واقعات کا نام ہے۔

اس سلسلے میں عام تصور یہ ہے کہ یہ جملہ روایتیں، دوسری اور تیسری صدی ہجری سے پہلے ضبط تحریر میں نہیں آ سکی تھیں[2] چنانچہ اکثر علمائے تاریخ کا خیال یہ

---

[1] ڈاکٹر منگانا جیسے مخالف کا خیال ہے:-

" In any case, whatever view we may take of the claims of Mohammad no one can deny that he was a great man. -- a man who can put an end in less than 10 years to two formidable kingdoms, the kingdom of the old Achemenides represented by the classic Sassanide and that of Roman Ceasers of Eastern countries by means of some camel drivers of Arabia, must be at any rate taken into consideration. A controller of conscience and soul to so many millions and in the plain light of civilization, is indeed greater than Alexander and Bonapart known only to day in historical books."

(A. Mingana leaves P XXIV)

[2] خطبات احمدیہ / ۳۱۵

ہاں، اتنی بات ضرور عرض کروں گا کہ قرآن مجید میں اس لفظ کا استعمال شاید ہی ان پڑھ کے مفہوم میں نہیں ہوا ہے اور غالباً ہر جگہ "غیر بنی اسرائیل" (GENTILE) یا غیر کتابی لوگوں کے استعمال ہوا ہے، بلکہ بعض تاریخی شہادتوں کی بنا پر یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں شاید اس کا مروجہ مفہوم "موجب ہی نہ تھا۔ چنانچہ عبداللہ بن عباس نے ( ) کی تشریح کرتے ہوئے لفظ "امیون" کے معنی اس طرح بیان کیے ہیں "قوم لم یصدقوا رسولاً ارسلہ اللہ ولا کتاباً انزلہ"[1] (یعنی وہ قوم جس نے اللہ کے بھیجے ہوئے رسول اور کسی نازل کردہ کتاب کی تصدیق نہیں کی) بلکہ اس ذیل میں انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ان لوگوں کے پاس خود نوشت صحیفے ہوتے ہیں جن کو یہ اپنے ہاتھوں سے لکھ لیتے ہیں اور اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔[2]

عبداللہ بن عباس کے شاگرد خاص عکرمہ کے نزدیک بھی ہر غیر کتابی "امی" تھا؛ چنانچہ انھوں نے رومیوں کے مقابلے میں مجوسیوں کو محض اس بنا پر امی قرار دیا ہے کہ وہ غیر کتابی تھے۔[3] دوسری صدی کے نصف اول میں ابن اسحٰق نے بھی "امی" کے معنی "ان پڑھ" یا ناخواندہ نہیں لیے بلکہ اس کا تقریباً وہی مفہوم سمجھا جو ابن عباس نے بیان کیا تھا، یعنی غیر بنی اسرائیل (Gentile) یا غیر کتابی چنانچہ "قل للذین اوتوا الکتب والامیین" کی تشریح کرتے ہوئے "امیین" کے معنی "الذین لا کتاب لھم" بیان کیے ہیں[4] یعنی وہ قوم جس میں کوئی آسمانی کتاب نازل نہیں ہوئی۔ خود قرآن مجید کے سیاق سے بھی اسی مفہوم کی تائید ہوتی ہے، اس لیے کہ تقریباً ہر جگہ یہ لفظ اہل کتاب کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے[5] حتیٰ کہ آنحضرت صلعم کے لیے بھی جب اس کا استعمال ہوا تو اس صراحت کے ساتھ کہ آپ کی یہ صفت توریت اور انجیل میں موجود ہے[6]۔ حیرت ہے کہ علمائے اسلام اس آیت کی موجودگی میں لفظ امی کے معنی "ان پڑھ" کس طرح کر لیتے ہیں اس لیے کہ توریت اور انجیل کی تمام پیشگوئیاں ہمارے سامنے ہیں، اور ان میں ایک بھی ایسی نہیں جس میں کسی "ناخواندہ" نبی کی آمد کی خبر دی گئی ہو۔

علاوہ ازیں مضبوط ترین ناقابل تردید تاریخی شہادتیں بھی اس عقیدے کے خلاف ہیں۔ کہ ظہور اسلام کے وقت پورا عربی سماج ناخواندہ یا ان پڑھ تھا: یہ سچ ہے کہ آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے دنیا کے تعلیمی نقشے میں وہ رنگ نظر نہیں آتے، جو آج موجود ہیں، اس لیے کہ اس عہد میں انسانی معاش بیشتر قلم کی وابستگی سے آزاد تھی، لیکن پھر بھی چند در چند دینی، سیاسی اور تجارتی ضرورتوں کے لیے اکثر لوگ تحصیل علم پر مجبور تھے۔ جن کی تعداد اگرچہ ہر ملک میں محدود ہوتی، لیکن ہوتی ضرور تھی۔ اور اسی نسبت سے عربوں میں بھی تعلیم کی افراط خارج از قیاس ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ ظہور اسلام کے وقت باشندگان عرب اپنے پڑوسی ملکوں یا قوموں کے مقابلے میں ان پڑھ تھے تاریخی واقعات کے ساتھ ناانصافی ہوگی، کیوں کہ اوراق تاریخ میں اس کے خلاف مبہم شہادتیں ملتی ہیں جن کو میں فصل دوم میں پیش کروں گا۔

فصل دوم

ظہور اسلام کے وقت عربوں کی تعلیمی حالت کا پورے طور پر جائزہ (Survey) لینا نہ تو اس کتاب کا موضوع ہے، اور نہ اس چھوٹی سی فصل میں ممکن ہے، اس لیے میں یہاں صرف چند ایسی تاریخی شہادتیں مختصراً پیش کرنا چاہتا ہوں جس سے قارئین کو یہ اندازہ ہو سکے کہ عہد رسالت میں جاہلی معاشرے کو قلم سے کیا لگاؤ تھا، اور اس زمانے میں لکھنے پڑھنے کی کس قدر صلاحیتیں موجود تھیں؟ اس سلسلے میں سب سے پہلی شہادت جو میں پیش کرنا چاہتا ہوں اس زمانے کی مروجہ عربی زبان کی ہے جو میری رائے میں سب سے اہم ہے۔

اگر یہ اصول صحیح ہے کہ کسی زبان کی تعمیر اور وسعت میں اس کے بولنے والوں کی ضروریات اور تقاضائے ذہنی کو دخل ہوتا ہے اور ان ضروریات کی طرف اس زبان کے الفاظ اور ان کی قلت و کثرت رہنمائی کر سکتی ہے، تو خود عربی زبان اس بات کی شاہد ہے کہ ظہور اسلام کے وقت عربوں میں تعلیمی فقدان نہ تھا، اور یہ امت امیہ اپنے پڑوسی ملکوں سے میدان تعلیم میں پیچھے نہ تھی۔ صرف "عربی مبین" یعنی حجاز کی زبان میں (جس میں قرآن نازل ہوا) نوشت و خواند اور اس کے متعلقات کے لیے اس کثرت سے الفاظ ملتے ہیں جن سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس زمانے کی سماجی ضروریات میں تعلیم کو کافی دخل حاصل ہو چکا تھا، میں یہاں صرف قرآن مجید سے کچھ ایسے الفاظ پیش کرتا ہوں جو مختلف مدارج کی کتابوں اور مکتوبات کے لیے استعمال ہوتے تھے، مثلاً:

"کتاب[7]۔ اساطیر[8] (اسطورہ)۔ زبر[9] (زبور)۔ اسفار[10] (سفر) کتاب مرقوم[11]۔ نسخہ[12]۔ صحف[13] (صحیفہ)۔ سجل[14]۔ قط[15]"

گویا نو الفاظ! ان میں سے تین آخر الذکر لفظ (یعنی صحف[16]، سجل[17]، قط[18]) کے علاوہ جو دوسری زبانوں سے آئے ہیں، باقی تمام الفاظ عربی ہیں، اور ان سب کے الفاظ اور مصادر عربی میں رائج تھے، یعنی:

---

[1] الدر منثور/ ... [2] در منثور/ ... نیز دیکھیے طبری تفسیر ۱۴۳/۳ [3] طبری تاریخ ۱۴۲/۲ [4] ابن ہشام ۲۲۶/۲ [5] دیکھیے قرآن/۳: ۲۰، ۱۴/۲۰

[6] قرآن/۷: ۱۵۷ [7] قرآن: ۲: ۲۵، ۸: ۳۱، ۱۹: ۲۲، ۲۳: ۸۵، ۲۵: ۲۶، ۲۹: ۶۰، ۳۲: ۵۸، ۱۴: ۱۵، ۶۳: ۱۳ وغیرہ

[8] ۲۶: ۱۹۶، ۲۳: ۴۵، ۳: ۸۴، ۱۹: ۳۵، ۲۵: ۵۴، ۳: ۲۳، ۵ [9] ۵۲: ۵، ۲۴: ۱۹ نیز دیکھیے ۸۰: ۱۵ [10]

کتب، سطر: زبر، سفر، رق، نسخ، ان پر دو لفظوں کا اور اضافہ کیجئے یعنی "خط" اور "املا" کا جو قرآن مجید میں جداگانہ استعمال ہوئے ہیں، گویا ظہورِ اسلام کے وقت صرف "لکھنے" یا "کتابت" کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے عربی زبان میں کم سے کم آٹھ لفظ ایسے تھے جن کا حوالہ قرآن میں ملتا ہے، یہ تعداد اتنی زیادہ ہے کہ آج کی ترقی یافتہ زبانوں میں بھی کم تر زبانیں اس کا مقابلہ کر سکیں گی۔ ظاہر ہے کہ یہ جملہ الفاظ اس وقت تک "حصہ زبان" نہیں بن سکتے، جب تک بولنے والوں کو ان کی شدید ضرورت نہ ہو اور پیہم استعمال نہ ہوتے رہیں! میں نے یہ الفاظ صرف قرآن مجید سے انتخاب کیے ہیں تاکہ عہدِ رسالت میں ان کا استعمال اور رواج شکوک و شبہات سے بالا رہے، ورنہ اسی عہد کے چند اور الفاظ بھی پیش کیے جا سکتے تھے!

کیا یہ تصور واقعی حیرت خیز نہیں کہ جس زبان میں نوشت و خواند کے لیے اتنے زیادہ الفاظ مروج ہوں، اُسی زبان کے بولنے والے فنِ کتابت سے بے بہرہ فرض کر لیے جائیں، اور بایں معنی "امی" سمجھے جائیں کہ وہ لکھنے پڑھنے کی ابتدائی صلاحیتوں سے محروم تھے؟

قطع نظر اس سے کہ خود قرآن مجید کے اندازِ بیان اور خاص طور پر طرزِ استدلال سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ظہورِ اسلام کے وقت عربی سماج "ان پڑھ" تھا، یا قرآن مجید کے سامعین اولین اور مخاطب وقت جاہل تھے، اس لیے کہ اس میں جگہ جگہ متداولہ کتابوں کے حوالے نظر آتے ہیں، عبارتیں نظر آتی ہیں جن کے خلاصے بطور سند پیش کیے گئے ہیں، پھر جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، وہ پست نہیں، بلکہ بلند ہیں، جن سے سامعین کے طویل ذہنی ارتقا کا پتہ چلتا ہے، سماجی اور اخلاقی نکات کی کیفیت یہ ہے کہ اگرچہ آج کی دنیا شعوری اور غیر شعوری طور پر انھیں آہستہ آہستہ قبول کرتی جا رہی ہے، مگر بہت سے پسماندہ سماجوں کے لیے ہنوز ناقابلِ فہم و عمل ہیں۔

قرآن مجید کی سب سے پہلی عبارت جو نازل ہوئی اس کی ابتدا "اقرأ" سے ہوتی ہے، اور انتہا "علم بالقلم، علم الانسان مالم یعلم"[3] پر۔ نزولِ قرآن کے بعد جب اس کتاب پر اعتراضات کی بوچھاڑیں ہونے لگیں، جرح و تنقید شروع ہو گئی۔ مطعون کیا جانے لگا، اور طرح طرح کے بہتان لگائے گئے تو ان میں سب سے زیادہ عام اعتراض یہ تھا کہ یہ پچھلی کتابوں یعنی "اساطیر الاولین"[4] سے ماخوذ ہے، گویا اس قسم کے مضامین کا طعنہ جو اکثر ادیب اور نقاد دیا کرتے ہیں جن کی نظریں پچھلی کتابوں پر ہوتی ہیں، یہ الزام بھی کسی جاہل معاشرے کی طرف سے ممکن نہیں، چنانچہ قرآن نے جب اس کی تردید کی تو ان الفاظ میں: "فاتوا بکتب من عند اللہ ھو اھدیٰ"[5] — "فاتوا بسورۃ من مثلہ"[6] — "فاتوا بعشر سور مثلہ"[7]، گویا تمام مصنفین عرب کو چیلنج کیا گیا کہ اگر قرآن آسمانی کتاب نہیں، تو اس کی مثل، کوئی دوسری کتاب پیش کی جائے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت ایک ایسا طبقہ موجود تھا جس کو "دعوتِ تصنیف" دی جا سکتی تھی ورنہ ظاہر ہے کہ ایک ان پڑھ سماج کے لیے یہ تمام تر مطالبات بے معنی ہیں، کم سے کم میرے لیے یہ بات قطعاً خارج از قیاس ہے کہ قرآن کی یہ دعوتِ تصنیف" ایک ایسے جاہل اور ان پڑھ معاشرے کے لیے تھی، جو اس کے جواب میں چند سطریں لکھنے سے بھی معذور تھا، قرآن میں یہ چیلنج ایک دو جگہ نہیں پورے چھ مقامات پر نظر آتا ہے[8] جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ مطالبہ اتفاقی نہ تھا بلکہ مخالفین بار بار کوشش[9] کرتے اور بار بار ناکام ہوتے۔ یہاں یہ بات خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے، کہ رسول اللہ نے ان چیلنجوں میں یا تو قرآن جیسی "کتاب" کا مطالبہ کیا ہے یا "جزوِ کتاب" یعنی سورۃ کا۔ ظاہر ہے کہ "سورۃ" کسی کاوشِ لسانی کا نام نہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اسی زمانے میں جبکہ قرآن کوثر و تسنیم سے ریگستانِ عرب کی آبیاری کرنا چاہتا تھا، ایک مکی عالم، نضر بن حارث نے یہاں "تارا ہو یزداں" کی مقدس آگ سلگانا چاہی تھی، اور مجوسیت قبول کر کے[10] اس کی تبلیغ شروع کر دی تھی، چنانچہ اس کی مشہور کتاب کا تذکرہ جس کو قرآن نے "لھو الحدیث"[11] کا خطاب دیا تھا، اوراقِ تاریخ میں آج تک محفوظ ہے، اس کتاب میں "نضر نے رستم و اسفندیار کے دلچسپ قصے بیان کیے تھے، اور اس کا دعویٰ تھا کہ یہ قرآن سے کسی طرح کم نہیں[12]، نضر صرف فارسی زبان ہی سے واقف نہ تھا، بلکہ شاید یونانی بھی جانتا تھا[13]

---

[1] ۲۹ : ۴۸ [2] قرآن ۹۶ : ۴ [3]

[4] ۶ : ۲۵، ۸ : ۳۱، ۲۳ : ۸۴، ۲۷ : ۶۸، ۲۵ : ۵، ۴۶ : ۱۷، ۶۸ : ۱۵

[5] ۲ : ۲۳، نیز دیکھیے ۱۰ : ۳۸ [6] ۱۱ : ۱۳ [7]

[8] Arthur Jeffery-Foreign Vocabulry of the Quran p.p.182

[9] نضر بن حارث نے زندقہ یعنی مجوسی مذہب اختیار کر لیا تھا دیکھیے ابن حبیب محبر/۱۶۱ [10] قرآن ۳۱ : ۶

[11] ابن اسحٰق کا بیان ہے "فحدثھم عن رستم السندید وعن اسفندیار و ملوک فارس، ثم یقول، واللہ ما محمد باحسن حدیث منی وما حدیثہ الا اساطیر الاولین اکتتبھا کما اکتتبتھا" — ابن ہشام ج ۱ 268

قرآن مجید کے کم سے کم ایک مقام سے اندازہ ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت کئی اور اہل قلم تصنیف و تالیف میں معروف تھے، جن کی کتابیں، بازاروں میں فروخت ہو رہی تھیں[1]، ان میں سے ہر مصنف کا دعویٰ تھا کہ اس نے جو کچھ بھی لکھا ہے، وہ منشائے الٰہی کے عین مطابق ہے، کتابوں کی خرید و فروخت کا رواج صرف قرآن ہی سے ثابت نہیں ہوتا، بلکہ بیع مصاحف کے سلسلہ میں جو روایات ملتی ہیں، ان سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ رواج عام تھا۔[2]

روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ متعدد عالم جو بیرونی زبانوں سے واقف تھے عمدہ کتابوں کے ترجمے میں مصروف تھے، چنانچہ مشہور مصدق رسول ورقہ بن نوفل کا ترجمۂ انجیل جو وہ عبرانی سے کر رہے تھے[3] مشہور واقعہ ہے! اسی زمانے میں بنو قریظہ کے ایک یہودی عرب نے، پوری توریت یا اس کے کسی حصے کا ترجمہ عربی میں کیا تھا[4] یہ ترجمہ غالباً حضرت عمر کے سامنے پیش بھی ہوا تھا، "مجلۂ لقمان" کا ترجمہ بھی شاید اسی عہد سے تعلق رکھتا ہے جو غالباً ایک مدنی عالم سوید بن صامت نے کیا تھا، یہ ترجمہ آنحضرت نے بھی ملاحظہ فرمایا تھا۔[5]

آنحضرت کی رحلت سے کچھ ہی سال بعد حضرت عمر کے عہد میں جب نہاوند فتح ہوا تو اس کے مال غنیمت میں کسی ایرانی دانشور کی ایک کتاب بھی ہاتھ آئی جو بیشتر ادبی خاندان سے متعلق تھی، کہا جاتا ہے کہ اس کے ایک حصہ کا ترجمہ خلیفۂ ثانی کی خدمت میں روانہ کیا گیا، تو آپ نے پوری کتاب کے ترجمے کا حکم دیا[6] اگر یہ بات صحیح ہے تو ظاہر ہے کہ اس عہد میں تراجم کی کتنی منزلت تھی۔

بیرونی زبانوں سے واقفیت محض علمی اغراض کے لیے ضروری نہ تھی، بلکہ شاید عام کاروبار میں بھی ضرورتیں رہتیں، چنانچہ خود حضرت نبی امی نے زید بن ثابت کو جو آپ کے میر منشی تھے خاص طور پر عبرانی، اور سریانی زبانیں سیکھنے کی ہدایت فرمائی تھی، تاکہ بیرونی یہود و نصاریٰ سے خط و کتابت میں سہولت رہے، چنانچہ انھوں نے بہت جلد ان زبانوں میں اتنی دستگاہ حاصل کر لی، کہ پھر اس قسم کی تمام خط و کتابت انھیں کے قلم سے ہوتی[7]، ایک روایت کے موجب یہ یونانی بھی جانتے تھے۔[8]

زید کے علاوہ کئی دوسرے صحابی بھی بیرونی زبانوں سے واقف معلوم ہوتے ہیں، چنانچہ سنہ ۶ھ میں ممالک غیر کو جب اسلامی سفارتیں گئیں، تو یہ تمام سفیر ان ممالک کی سرکاری زبانوں سے بخوبی واقف تھے۔[9]

بلند پایہ کتابوں کو مطلا، اور مذہب کرنے کا رواج علمی شوق کی سب سے بڑی دلیل ہے، سبع معلقات کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان قصائد کو سونے کے حروف سے لکھا گیا تھا[10]، یہ روایت صحیح ہو یا مشکوک، لیکن عہد صحابہ میں قرآن مجید کے نسخوں کو مطلا کرنے کی متعدد روایتیں ملتی ہیں جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فن قدیم سے چلا آ رہا تھا۔ ابن مسعودؓ کے سامنے ایک بار جب مطلا قرآن پیش کیا گیا، تو انھوں نے فرمایا کہ قرآن کی عمدہ زینت اس کی تلاوت ہے[11]، حضرت علی نے چاندی چڑھے ہوئے قرآن کے نسخے دیکھے، تو سخت برہم ہوئے۔[12]

ظہور اسلام کے وقت عرب دیہات میں بھی تعلیمی فقدان نظر نہیں آتا، اور مکاتب و مدارس نظر آتے ہیں؛ بنو ہذیل میں جو مکے اور طائف کے درمیان آباد ...

---

[1] ۲: ۷۹، خاص طور پر الفاظ "یکتبون بایدیھم" اور "لیشتروا بہ ثمنا قلیلا" ملاحظہ ہوں۔

[2] عہد صحابہ میں بہت سے لوگ مدینہ میں یہ کاروبار کرتے تھے حنظلہ کہتے ہیں "مررت مع طاؤس علی قوم یبیعون المصاحف" ابن سعد ۴/۳۱۳

[3] بخاری میں ورقہ کے متعلق ہے: وکان یکتب کتاب العبرانی، فیکتب من الانجیل (تجرید باب ...)

[4] مسند ۳/۳۸۷

[5] ابن ہشام ۲/۸۷ طبری ۲/۲۳۳، سوید نے جب اس کو آنحضرت کے سامنے پیش کیا تو آپ نے فرمایا "ان ھذا الکلام حسن"۔

[6] A History of Historical writings-James Westfall, pp 337

[7] ..... عن زید بن ثابت: قال امرنی رسول اللہ ان اتعلم لہ کلمات من کتاب الیہود ...... فلما تعلمتہ کان اذا کتب الی یہود کتبت الیہم، واذا کتبوا الیہ قرأت لہ کتابہم ..... (۲) عن زید بن ثابت یقول امرنی رسول اللہ ان اتعلم السریانیۃ (ترمذی، باب فی تعلیم السریانی) ڈاکٹر حمید اللہ

[8] ابن سعد ۲/

[9] ڈاکٹر حمید اللہ

[10] ابن سعد

[11] ..... جئی ابن مسعود بمصحف قد زین بالذھب فقال ان احسن ما زین بہ المصحف تلاوتہ (منتخب کنز العمال ۱/۴۲)

[12] منتخب کنز العمال ۱/۴۰۰

تھے۔ مدارس موجود تھے، چنانچہ اس قبیلے کی ایک ضرب المثل فاحشہ "قلزنہ" کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بچپن میں جب یہ مدرسے جاتی تو بچوں کے قلم دواتوں میں ڈال کر جنسی جذبات کو برانگیختہ کرتی تھی۔ اس روایت سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں مخلوط تعلیم کا رواج عام تھا۔ یمن میں بھی دیہاتی مدارس کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ عہد رسالت میں جب نجرانیوں کا وفد مدینے پہنچا تو اس میں ان اطراف کے جملہ دیہاتی مدارس کا ناظم تعلیمات بھی تھا جس کا نام ابوحارثہ تھا۔

یہ برکت غالباً انہیں چھوٹے چھوٹے دیہاتی مدارس کی تھی کہ جب حضرت نبی امی نے حجاز کے ساحلی علاقے کے قبائل، اور مدینے کے گرد و پیش کی بستیوں سے معاہدے کرنا شروع کیے تو وہ سب کے سب تحریری صورت میں تھے۔ ظاہر ہے کہ ان دیہاتی بستیوں میں تعلیمی فقدان ہوتا تو ان سیاسی دستاویزوں کا مرتبہ ایک دفتر بے معنی سے زیادہ نہ تھا، اور ان کی کوئی افادیت نہ تھی۔

ظہور اسلام کے وقت عربی سماج میں، اساتذہ اور معلمین کی بھی کمی نہیں معلوم ہوتی، بلکہ اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے بڑے لوگ تعلیم میں دلچسپی لیتے تھے، چنانچہ ابن حبیب نے "اشراف المعلمین" کے عنوان کے تحت جو نام گنائے ہیں، سب اونچے درجے کے لوگ ہیں ان میں کم سے کم پانچ نام ایسے جاہلی اساتذہ کے ہیں جن کی عظمت سب کو تسلیم تھی۔

نہ صرف تعلیمی اغراض، بلکہ تصنیف و تالیف کے لیے، کاغذ بہت ضروری شے ہے جس سے اس زمانے میں پورا مشرق وسطیٰ ناواقف تھا۔ مصر میں ایک خاص قسم کا کاغذ نرکل کی چھال سے بنایا جاتا تھا، جس کو پیپائرس Papyrus کہتے تھے، عربی میں اسی کا نام قرطاس ہے۔ قرطاس کے علاوہ دوسری شے جو اس کام میں آتی تھی، جانوروں کی جھلی تھی جسے دباغت کے بعد قابل نوشت بنایا جاتا تھا، عربی میں اس کو رق کہا جاتا تھا۔ یہ دونوں لفظ قرآن مجید میں آئے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں اس وقت عام طور سے استعمال میں تھیں۔ غالباً ان کی درآمد مصر و فلسطین سے براہ راست ہوتی، چنانچہ ایک مکی تاجر مالک بن دینار کا نام تاریخ میں آج بھی محفوظ ہے۔ غالباً یہ اشیا گراں تھیں۔

کتابتی ضروریات کے لیے اس زمانہ میں ایک خاص قسم کا ریشمی کپڑا بھی استعمال ہوتا تھا جس کو "حریر" کہا جاتا تھا اور غالباً لفظ تحریر کا تعلق بھی اسی "حریر" سے ہے۔ حریر پر لکھے ہوئے کم سے کم ایک خط کا حوالہ بخاری میں ملتا ہے، جو شاہ غسان نے کعب بن مالک کو سنہ ۹ھ میں لکھا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شاید قرطاس اور رق سے بھی زیادہ قیمتی شے تھی، اور صرف رؤسا استعمال کرتے تھے۔ ان کے مقابلہ میں عام ضروریات کے لیے ویسی ساخت کی اشیاء کتابت بافراط نظر آتی ہیں، مثلاً ادیم، رقع، عسب وغیرہ۔ ادیم چمڑے کے کاغذ کو کہتے تھے، عسب کھجور کی چھال یا ڈنٹھل کو صاف کر کے بنایا جاتا تھا، علاوہ ازیں مختلف اشیا کی تختیاں یا ٹھیکرے بھی استعمال میں آتی تھیں، جن کو "لخفہ" "سبورہ" اور کتف کہا جاتا تھا۔ لخفہ اور سبورہ سفید پتھر کو باریک تراش کر بنائی جاتی تھیں گویا یہ پتھر کی سلیٹیں تھیں، کتف جانوروں کی شانے کی ہڈیاں تھیں جن کو چھو کر کاٹ لیا جاتا تھا۔ یہ تمام چیزیں سہل الحصول معلوم ہوتی ہیں، چنانچہ خلیفہ اول کے عہد میں جب قرآن کی تالیف کا کام شروع ہوا، تو اکثر لوگوں کے پاس قرآن کے اجزا انہیں سستی چیزوں پر لکھے ملے، اشیاء کتابت کی اس گونا گونی سے مختلف طبقات کی تعلیم کا اندازہ دشوار نہیں۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت تعلیم کسی خاص حلقے یا طبقے تک محدود نہ تھی، اور شاید اس جنس گراں سے سرمائے اور مذہب (تعلیم عام) کی اجارہ داری ختم ہو چکی تھی، اور بلا کسی تخصیص کے امیر غریب، غلام، آقا، مرد، عورت سب بہرہ مند ہو سکتے تھے، امرا اور دولت مند طبقے کی مثالیں تو اس لیے ضروری نہیں کہ ہر ملک و قوم میں تعلیم ہمیشہ انہیں کی جاگیر رہی ہے، مگر مجھے یہاں ایسی مثالیں پیش کرنا ہیں، جو غریب، کم مایہ اور خواتین کے طبقے سے تعلق رکھتی ہیں کیونکہ یہی طبقہ ہمیشہ اس نعمت سے محروم رکھا گیا ہے۔

کم مایہ لوگوں میں تعلیم کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اسیران بدر میں تقریباً ستر قیدی مسلمانوں کے ہاتھ لگے تھے جن کو اس شرط پر رہا کرنے کا فیصلہ کیا گیا کہ مقررہ زر فدیہ بطور تاوان جنگ ادا کر دیں، چنانچہ بہت سے لوگ رہا کر دیئے گئے، مگر پھر بھی کچھ ایسے قیدی بچ گئے جو غریب تھے، اور یہ رقم ادا نہیں کر سکتے تھے، ایسے لوگوں کے لیے یہ تاوان مقرر کیا گیا تھا، کہ وہ مدینے کے دس دس بچوں کو لکھنا سکھا دیں۔ غلاموں میں، اگرچہ متعدد لکھے پڑھے نظر آتے ہیں مگر یہاں عامر بن فہیرہ کی مثال (غلاموں میں) کافی ہے۔

[illegible]

قرآن مجید کے کم سے کم ایک مقام سے اندازہ ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت کئی اور اہل قلم تصنیف و تالیف میں معروف تھے، جن کی کتابیں، ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہی تھیں[1]، ان میں سے ہر مصنف کا دعویٰ تھا کہ اس نے جو کچھ بھی لکھا ہے، وہ منشائے الٰہی کے عین مطابق ہے، کتابوں کی خرید و فروخت کا رواج صرف نزول قرآن ہی سے ثابت نہیں ہوتا، بلکہ بیع مصاحف کے سلسلہ میں جو روایات ملتی ہیں، ان سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے، کہ یہ رواج عام تھا[2]۔

روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ متعدد عالم جو بیرونی زبانوں سے واقف تھے عمدہ کتابوں کے ترجمے میں مصروف تھے، چنانچہ مشہور مصدق رسول ورقہ بن نوفل کا ترجمۂ انجیل جو وہ عبرانی سے کر رہے تھے[3] مشہور واقعہ ہے؛ اسی زمانے میں بنو قریظہ کے ایک یہودی عرب نے، پوری توریت یا اس کے کسی حصے کا ترجمہ عربی میں کیا تھا[4]، یہ ترجمہ غالباً حضرت عمر کے سامنے پیش بھی ہوا تھا، "مجلۂ لقمان" کا ترجمہ بھی شاید اسی عہد سے تعلق رکھتا ہے، جو غالباً ایک مدنی عالم سوید بن صامت نے کیا تھا، یہ ترجمہ آنحضرت نے بھی ملاحظہ فرمایا تھا[5]۔

آنحضرت کی رحلت سے کچھ ہی سال بعد حضرت عمر کے عہد میں جب نہاوند فتح ہوا تو اس کے مال غنیمت میں کسی ایرانی دانشور کی ایک کتاب بھی ہاتھ آئی جو بیشتر ادبی خاندان سے متعلق تھی، کہا جاتا ہے کہ اس کے ایک حصہ کا ترجمہ خلیفہ ثانی کی خدمت میں روانہ کیا گیا، تو آپ نے پوری کتاب کے ترجمے کا حکم دیا[6] اگر یہ روایت صحیح ہے تو ظاہر ہے کہ اس عہد میں تراجم کی کتنی منزلت تھی۔

بیرونی زبانوں سے واقفیت محض علمی اغراض کے لیے ضروری نہ تھی، بلکہ شاید عام کاروبار میں بھی ضروری رہتی ہیں، چنانچہ خود حضرت نبی امی نے زید بن ثابت کو جو آپ کے میر منشی تھے خاص طور پر عبرانی، اور سریانی، زبانیں سیکھنے کی ہدایت فرمائی تھی، تاکہ بیرونی یہود و نصاریٰ سے خط و کتابت میں سہولت رہے، چنانچہ انھوں نے بہت جلد ان زبانوں میں اتنی دستگاہ حاصل کر لی، کہ پھر اس قسم کی جملہ خط و کتابت انھیں کے قلم سے ہوتی[7]، ایک روایت کے بموجب یہ یونانی بھی جانتے تھے[8]، زید کے علاوہ کئی دوسرے صحابی بھی بیرونی زبانوں سے واقف معلوم ہوتے ہیں، چنانچہ سنہ ۶ھ میں ممالک غیر کو جب اسلامی سفارتیں گئیں، تو یہ جملہ سفیران ممالک کی سرکاری زبانوں سے بخوبی واقف تھے[9]۔

بلند پایہ کتابوں کو مُطلّا، اور مُذہّب کرنے کا رواج علمی شوق کی سب سے بڑی دلیل ہے، سبع معلقات کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان قصائد کو سونے کے حروف سے لکھا گیا تھا[10]، یہ روایت صحیح ہو یا مشکوک، لیکن عہد صحابہ میں قرآن مجید کے نسخوں کو مطلا کرنے کی متعدد روایتیں ملتی ہیں جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فن قدیم سے چلا آرہا تھا۔ ابن مسعودؓ کے سامنے ایک بار جب مطلا قرآن پیش کیا گیا، تو انھوں نے فرمایا کہ قرآن کی عمدہ زینت اس کی تلاوت ہے[11]، حضرت ابی نے چاندی چڑھے ہوئے قرآن کے نسخے دیکھے، تو سخت برہم ہوئے[12]۔

ظہور اسلام کے وقت عرب: یہاں میں بھی تعلیمی فقدان نظر نہیں آتا، اور مکاتب و مدارس نظر آتے ہیں؛ بنو ہذیل میں جو مکے اور طائف کے درمیان آباد تھے

---

[1] ۲: ۷۹ — خاص طور پر الفاظ "یکتبون بایدیھم" اور "لیشتروا بہ ثمنا قلیلا" ملاحظہ ہوں۔

[2] عہد صحابہ میں بہت سے لوگ مدینہ میں یہ کاروبار کرتے تھے حنظلہ کہتے ہیں: "مررت مع طاؤس علی قوم یبیعون المصاحف" ابن سعد ۴/۲۱۳

[3] بخاری میں ورقہ کے متعلق ہے: وکان یکتب کتاب العبرانی، فیکتب من الانجیل (تجرید باب)

[4] مسند ۳/۳۸۷

[5] ابن ہشام ۲/۸۶ طبری ۲/۲۳۳، سوید نے جب اس کو آنحضرت کے سامنے پیش کیا تو آپ نے فرمایا "ان ھذا الکلام حسن"۔

[6] A History of Historical writings-James Westfall, pp 337

[7] ...... عن زید بن ثابت: قال امرنی رسول اللہ ان أتعلم لہ کلمات من کتاب یہود ...... فلما تعلمتہ کان اذا کتب الی یہود کتبت الیھم، واذا کتبوا الیہ قرأت لہ کتابھم ...... (۲) عن زید بن ثابت یقول امرنی رسول اللہ ان اتعلم السریانیۃ (ترمذی ۲ باب فی تعلیم السریانیۃ) [8] حمید اللہ / ابن سعد ۲/

[9] حمید اللہ

[10] ابن سعد ۲/

[11] ...... جئی ابن مسعود بمصحف قد زین بالذھب فقال ان احسن ما زین بہ المصحف تلاوتہ (منتخب کنز العمال ۲/۴۲)

[12] منتخب کنز العمال ۱/۴۰۰

... کی ایک بیٹی ... فاطمہ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بچپن میں جب یہ مدرسے جاتی تو بچوں کے قلم دواتوں میں ڈال کر جلسی طبابت کو برانگیختہ کرتی تھی[1]، اس روایت سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں مخلوط تعلیم کا رواج عام تھا۔ یمن میں بھی دیہاتی مدارس کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ عہدِ رسالت میں جب نجرانیوں کا وفد مدینے پہنچا تو اس میں ان اطراف کے جملہ سبھی مدارس کا ناظمِ تعلیمات بھی تھا جس کا نام ابوحارثہ تھا۔[2]

یہ برکت غالباً انہیں چھوٹے چھوٹے دیہاتی مدارس کی تھی کہ جب حضرت نبی امی نے حجاز کے ساحلی علاقے کے قبائل، اور مدینے کے گرد و پیش کی بستیوں سے معاہدے کرنا شروع کیے تو وہ سب کے سب تحریری صورت میں تھے۔ ظاہر ہے کہ ان دیہاتی بستیوں میں تعلیمی فقدان ہوتا تو ان سیاسی دستاویز دیہاتی کا مرتبہ ایک دفتری معنی سے زیادہ نہ تھا، اور ان کی کوئی افادیت نہ تھی۔

ظہورِ اسلام کے وقت عربی سماج میں، اساتذہ اور معلمین کی بھی کمی نہیں معلوم ہوتی، بلکہ اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے بڑے لوگ تعلیم میں دلچسپی لیتے تھے، چنانچہ ابن حبیب نے "اشراف المعلمین" کے عنوان کے تحت جو نام گنائے ہیں، سب اونچے درجے کے لوگ ہیں ان میں کم سے کم پانچ نام ایسے جاہلی اساتذہ کے ہیں جن کی عظمت سب کو تسلیم تھی۔[3]

نہ صرف تعلیمی اغراض، بلکہ تصنیف و تالیف کے لیے کاغذ بہت ضروری شے ہے جس سے اس زمانے میں پورا مشرق وسطیٰ ناواقف تھا۔ مصر میں ایک خاص قسم کا کاغذ نرکل کی چھال سے بنایا جاتا تھا، جس کو پیپائرس Papyrus کہتے تھے، عربی میں اسی کا نام قرطاس ہے[4] قرطاس کے علاوہ دوسری شے جو اس کام میں آتی تھی، جانوروں کی کھلی تھی جسے دباغت کے بعد قابلِ نوشت بنایا جاتا، عربی میں اس کو رق کہا جاتا تھا۔ یہ دونوں لفظ قرآن مجید میں آئے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں اس وقت عربوں کے استعمال میں تھیں۔ غالباً ان کی درآمد مصر و فلسطین سے براہِ راست ہوتی، چنانچہ ایک مکی تاجر مالک بن دینار کا نام تاریخ میں آج بھی محفوظ ہے۔[5] غالباً یہ اشیا گراں تھیں۔

کتابتی ضروریات کے لیے اس زمانہ میں ایک خاص قسم کا ریشمی کپڑا بھی استعمال ہوتا تھا جس کو "حریر" کہا جاتا تھا اور غالباً لفظ تحریر کا تعلق بھی اسی "حریر" سے ہے۔ حریر پر لکھے ہوئے کم سے کم ایک خط کا حوالہ بخاری میں ملتا ہے جو شاہ غسان نے کعب بن مالک کو ۹ھ میں لکھا تھا۔[6] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شاید قرطاس اور رق سے بھی زیادہ قیمتی شے تھی، اور صرف روسا استعمال کرتے تھے۔ ان کے مقابلہ میں عام ضروریات کے لیے دیسی ساخت کی اشیائے کتابت بہ افراط نظر آتی ہیں، مثلاً ادیم، رقع، عسب وغیرہ۔ ادیم چمڑے کے کاغذ کو کہتے تھے، عسب کھجور کی چھال یا ڈنٹھل کو صاف کر کے بنایا جاتا تھا، علاوہ ازیں مختلف اشیا کی تختیاں یا لوحیں بھی استعمال میں آتی تھیں، جن کو "لخفہ"، "سبوہ" اور کتف کہا جاتا تھا۔ لخفہ اور سبوہ سفید پتھر کو باریک تراش کر بنائی جاتی تھیں گویا یہ پتھر کی سلیٹیں تھیں، کتف جانوروں کی شانے کی ہڈیاں تھیں جن کو چوکور کاٹ لیا جاتا۔ یہ تمام چیزیں سہل الحصول معلوم ہوتی ہیں، چنانچہ خلیفہ اول کے عہد میں جب قرآن کی تالیف کا کام شروع ہوا، تو اکثر لوگوں کے پاس قرآن کے اجزا انہیں سستی چیزوں پر لکھے ملے، اشیائے کتابت کی اس گوناگونی سے مختلف طبقات کی تعلیم کا اندازہ دشوار نہیں۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت تعلیم کسی خاص حلقے یا طبقے تک محدود نہ تھی، اور شاید اس جنسِ گراں سے سرمایہ اور مذہب تعلیم عام کی اجارہ داری ختم ہو چکی تھی، اور بلا کسی تخصیص کے امیر غریب، غلام، آقا، مرد و عورت سب بہرہ مند ہو سکتے تھے، امرا اور دولت مند طبقے کی مثالیں تو اس لیے ضروری نہیں کہ ہر ملک و قوم میں تعلیم ہمیشہ انہیں کی جاگیر رہی ہے، مگر مجھے یہاں ایسی مثالیں پیش کرنا ہیں جو غریب، کم مایہ اور خواتین کے طبقے سے تعلق رکھتی ہیں کیونکہ یہی طبقہ ہمیشہ اس نعمت سے محروم رکھا گیا ہے۔

کم مایہ لوگوں میں تعلیم کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اسیرانِ بدر میں تقریباً ستر قیدی مسلمانوں کے ہاتھ لگے تھے جن کو اس شرط پر رہا کرنے کا فیصلہ کیا گیا کہ مقررہ زرِ فدیہ بطور تاوانِ جنگ ادا کر دیں، چنانچہ بہت سے لوگ رہا کر دیے گئے، مگر پھر بھی کچھ ایسے قیدی بچ گئے جو غریب تھے۔ اور یہ رقم ادا نہیں کر سکتے تھے ایسے لوگوں کے لیے یہ تاوان مقرر کیا گیا تھا، کہ وہ مدینے کے دس دس بچوں کو لکھنا سکھا دیں۔[7] غلاموں میں، اگرچہ متعدد لکھے پڑھے نظر آتے ہیں مگر یہاں عامر بن فہیرہ کی مثال غالباً کافی ہوگی جو حضرت ابوبکر کے غلام تھے، اور ہجرت میں آنحضرت کے ہمرکاب تھے۔ دورانِ ہجرت میں سراقہ کو جو تحریر دی گئی وہ انھیں کے قلم کی تھی۔[8] خواتین میں بھی کئی نام لیے جا سکتے ہیں، خاص طور پر حضرت عمر کی بہن فاطمہ بنت خطاب کی مثال پیش کی جا سکتی ہے، جو حضرت عمر کے اسلام لانے کا باعث بنی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز حضرت عمر ان کے گھر پہنچے تو فاطمہ سورۂ طٰہٰ کی پ...

---

[1] ...... قالوا كانت ظلمة التي يضرب بها المثل في قيادة صبية في الكتاب فكانت تضرب دوى الصبيان واقلامهم .... عيون الاخبار ابن قتيبة الدينوري/ ۲، ۱۰۳/۱۰۲ [2] ابن النوفے نے بڑی تفصیل سے ابوحارثہ کے علم و فضل کو سراہا ہے، اور آخر میں یہ الفاظ لکھے ہیں "وصاحب مدارسهم" ابن ہشام ۲/۲۲۲۔ [3] ابن حبیب/ ۴۷۵۔ [4] قرطاس کے لیے دیکھیے "قرآن اور رق" کے بیچ۔
[5] المحاسن والاضداد جاحظ/ ۱۰۷۔ [6] بخاری ... [illegible]

یے ملتی تھیں، اور معلم سے درس قرآن جاری تھا۔[۱] حضرت حفصہ کو شفا بنت عبداللہ نے جو بڑی فاضلہ تھیں، لکھنے پڑھنے کی تعلیم دی تھی۔[۲] اس واقعہ سے استانیوں کی موجودگی ثابت ہوتی ہے۔

جاہلیت میں ابتدائی تعلیم کی عمر اگرچہ بچپن کا زمانہ تھا،[۳] اور بالعموم چھوٹی عمر کے بچے مدارس و مکاتب میں اساتذہ کے حوالے کیے جاتے، لیکن حیرت ہے کہ اسی زمانے میں تعلیم بالغان (Adult Education) اور مدارس شبینہ (Night School) کا تصور بھی نظر آتا ہے۔ چنانچہ اصحاب صفہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ دن بھر کام کرتے اور رات کو سب وہاں آتے تو معلمین سے لکھنے اور پڑھنے کی تعلیم حاصل کرتے۔[۴]

مدینے میں دستور تھا کہ مذہبی تعلیم کے ساتھ فنون سپہ گری بھی سکھائے جاتے۔ چنانچہ ان کے یہاں صرف اس شخص کو کامل کہا جاتا تھا، جو لکھنے پڑھنے کے ساتھ تیر اندازی اور تیراکی بھی جانتا ہو، ظہور اسلام کے وقت یہ سند کاملیت کئی لوگوں کے پاس موجود تھی، مثلاً سعد بن عبادہؓ، اسید بن حضیرؓ، عبداللہ بن ابی، اوس بن خولی، سوید بن صامت وغیرہ۔[۵]

اوراق تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ عہد رسالت میں لین دین کے تمسکات اور بیع وشریٰ کی دستاویزیں بھی لکھی جاتیں، چنانچہ حضرت ابو طالب کا ایک تمسک عرصہ تک محفوظ رہا۔ ابن ندیم نے بھی دیکھا تھا۔[۶] خود قرآن مجید میں بھی اس قسم کے تمسکات کو لکھ لینے کا حکم موجود ہے، جس پر دو گواہیاں ضروری ہیں۔[۷] اس حکم سے یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ عہد رسالت میں ان کی کتابت میں کوئی خاص دشواری نہ تھی، بلکہ لکھے پڑھے لوگ ہر جگہ مل جاتے۔ کاروبار میں ہنڈیوں اور چیکوں کا رواج تھا، سب سے بڑھ کر یہ کہ حساب کی تعلیم کا رواج بھی عام معلوم ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں مسلمانوں کو جو قانون وراثت دیا گیا وہ از اول تا آخر کسری حسابات پر مشتمل ہے۔ یہ حسابات آسان نہیں، اور چند مناسخہ کے بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کو آج بھی ایک اعلیٰ حساب داں حل کر سکتا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت اعلیٰ حسابی قابلیت رکھنے والے لوگ موجود تھے، ورنہ یہ قانون اس زمانہ میں ناقابل عمل ثابت ہوتا۔

ان واقعاتی شہادتوں کو پیش نظر رکھ کر ظاہر ہے کہ عہد رسالت کے سماج کو جاہل یا ان پڑھ تصور نہیں کیا جا سکتا، بلکہ ایک اچھا خاصا تعلیم یافتہ معاشرہ معلوم ہوتا ہے جس کی تمام تر ضروریات میں تعلیم کو پورا پورا دخل حاصل تھا، یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں بہت سے ایسے امور جو ایک ناخواندہ سماج میں محض زبانی طور پر تکمیل کو پہنچ سکتے تھے تحریری صورت میں نظر آتے ہیں: مثلاً:

(۱) قریش نے جب بنی ہاشم کا سوشل بائیکاٹ (SOCIAL BYCOUTT) کیا تو ایک ناخواندہ بستی میں اس کو زبانی طے کرنا کافی تھا، لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ اس مقصد کے لیے باقاعدہ ایک صحیفہ لکھا گیا اور اعلان عام کے لیے دیوار کعبہ پر لٹکا دیا گیا۔[۹]

(۲) ہجرت کے بعد جب قریش اور اہل مدینہ میں ان بن ہوگئی تو محض اظہار ناپسندیدگی کے طور پر کہ مسلمانوں کو مدینے سے نکال دینے کے لیے ایک تحریری الٹی میٹم ( ) بھیجا گیا،[۱۰] حالانکہ یہ کام بھی ایک معمولی سفارت کے ذریعے زبانی ممکن تھا۔

(۳) آنحضرت جب مدینے تشریف لے گئے اور مدینے کے سربرآوردہ قبائل نے اسلامی اقتدار کو تسلیم کر لیا، تو نئی حکومت کی طرف سے ایک دستور نافذ کیا گیا جو تحریری صورت میں تھا۔[۱۱] عام حالتوں میں اس تحریری منشور کی بھی کوئی ضرورت نہ تھی، اور صرف زبانی اعلان کافی تھا، خاص طور پر اس لیے کہ یہ تحریری دستور اس عہد کی پہلی مثال معلوم ہوتی ہے۔

(۴) قریش سے آویزش کے بعد اہل مدینہ کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ایام حج میں اپنی زرعی پیداوار کو مکے لاکر فروخت کریں، اور یہاں حسب دستور صنعتی مصنوعات حاصل کر سکیں، اس بنا پر رابغ اور ینبوع کی بندرگاہوں سے تعلقات استوار کرنا ناگزیر تھا۔ جس کے راستے میں جہینہ، اسلم اور غفار وغیرہ کی بستیاں پڑتی تھیں، اس بنا پر ان قبائل سے معاہدے ضروری تھے، یہ معاہدے سب کے سب تحریری تھے حالانکہ ان قبائل کے اکابر سے جملہ معاملات زبانی طے ہو سکتے تھے۔

(۵) آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے شاید کسی بھی ایک ملک کے لیے یہ ضروری نہ تھا کہ اس کے جملہ ممبروں کے نام باقاعدہ درج رجسٹر کیے جائیں، مگر تاریخ

---

[۱] Muir-life p   [۲] ابو داؤد کتاب الطب باب الرقی نیز دیکھیے فتوح البلدان /۳،۴   [۳] جامع بیان العلم /۴۰
[۴] مسند ۳/۱۳۷، اسد الغابہ لابن اثیر ۳/۱۷۵، استیعاب ۲/۳۹۳   [۵] ابن ہشام /   [۶] ابن ندیم فہرست /۸
[۷] قرآن   [۹] ابن ہشام ۱/۳۷۵ قرا الصحیفہ۔ طبری ۲/۲۲۵   [۱۰] ابن حبیب محبر /۲۷۱   [۱۱] اس دستور میں کل ۴۷ دفعات

بتاتی ہے کہ عہد رسالت میں ایسے رجسٹر موجود تھے، اور ایک بار جب یہ مردم شماری ہوئی تو پندرہ سو مسلمانوں کے نام درج کیے گئے۔[1]

جنگی ہدایات

(۶) معمولی جنگی ہدایات اور احکام کے لیے تحریرات کی کوئی ضرورت نہیں، معلوم ہوتی، مگر نخلہ کو روانگی کے وقت عبداللہ بن جحش کو جو ہدایت نامہ دیا گیا تھا وہ تحریری تھا۔[2]

تحریری فہرست

(۷) محاذ جنگ پر جانیوالے سپاہیوں کی فہرست سازی اور تحریری نامزدگی ایک جاہل معاشرہ میں بالکل ناممکن ہے، مگر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان فوج جب کہیں روانہ ہوتی، تو اس کے افراد کو پہلے سے نامزد کر دیا جاتا، اور ان کے نام باقاعدہ لکھ لیے جاتے، ابن عباس کہتے ہیں کہ ایک بار آنحضرت کے پاس ایک سپاہی آیا اور اس نے عرض کیا کہ میرا نام فلاں فلاں غزوہ کے لیے لکھ لیا گیا ہے، مگر میری بیوی حج کو جانا چاہتی ہے، تو آپ نے اس کی درخواست منظور کر لی اور حج کی اجازت دیدی۔[3]

خفیہ اطلاع

(۸) فوجی کارروائیوں کے سلسلہ میں خفیہ اطلاعات زبانی بھی ممکن تھیں لیکن جنگ بدر کے لیے جب قریش نکلے تو حضرت عباس نے اس کی اطلاع تحریری بھیجی تھی،[4] اسی طرح جب مسلمان مکہ پر حملہ کرنے والے تھے، تو ایک مسلمان ہی نے اس کی خفیہ اطلاع قریش کو کرنا چاہی لیکن یہ تحریر پکڑ لی گئی۔[5]

تقسیم غنیمت

(۹) تقسیم غنائم و عطیات کا مسئلہ ایسا نہ تھا جو ایک ان پڑھ سماج میں تحریری صورت میں لایا جا سکتا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں مال غنیمت کی جب تقسیم ہوتی تو بذریعہ تحریر ہوتی۔ چنانچہ خیبر کے اموال کی مثال پیش کی جا سکتی ہے، جس کی تحریر مرتب ہونے کا ثبوت موجود ہے۔[6]

(۱۰) اس سلسلے میں آخری بات مجھے یہ کہنا ہے کہ اگر واقعی عہد رسالت کا معاشرہ ان پڑھ ہوتا، تو خود قرآن مجید کی کتابت اتنے شروع زمانے سے بالکل ناممکن تھی۔

یہ اور اسی قسم کی بے شمار مثالیں کتب سیرۃ و احادیث میں موجود ہیں جن سے بدیہی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت، پورا ماحول مائل بہ تعلیم ہو چکا تھا جس کو اسلام نے اور فروغ دیا، نئے نئے مدارس و مکاتب کھلے، اساتذہ اور معلمین میں قابل ترین لوگوں کا انتخاب کیا گیا، تعلیم بالغان کو فروغ دینے کی تمام ممکن تدبیریں اختیار کی گئیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مدارس شبینہ کا اہتمام کیا گیا، جس کے نصاب میں لکھنے پڑھنے کے ساتھ دینی تعلیم کا لحاظ بھی رکھا گیا تھا، اس بنا پر یہ بات خارج از امکان نہیں کہ غزوات و سرایا کی ان تفصیلات کا اصل ماخذ کچھ ایسی دستاویزیں ہوں جو عہد غزوات میں مرتب ہوئی تھیں، اور ان کو ابتدائی سیرۃ نگاروں یا انکے رواۃ نے بچشم خود دیکھا تھا۔ ان مثالوں سے صرف یہی نتائج نہیں نکلتے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کے فوراً بعد جیسے اسلامی ریاست کی تشکیل ہوئی، اور مسلمان سیاسیات میں داخل ہوئے، تو ان کی تنظیم، اور ریاستی نظم و انصرام کیلئے ایک دفتری نظام بھی وجود میں آیا۔ اس نظام کو خواہ کتنا ہی ابتدائی نوعیت کا تصور کیا جائے لیکن بہرصورت اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

یہ بات قطعاً خارج از قیاس ہے، کہ تاسیس ریاست کے بعد جو دستور مدینے میں رائج کیا گیا تھا (دیکھیے مثال ۳) یا ان معاہدات کی اصل کا بیان جن کی ابتدا رسالت ہی سے ہو گئی تھی (دیکھیے مثال ۴) محفوظ رکھنے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔ اسی طرح یہ امر بھی قرین قیاس نہیں کہ وہ چھوٹے بڑے رجسٹر جو غزوات و سرایا کے ذیل میں یا اسلامی تنظیم کی غرض سے مرتب ہوتے رہے تھے (دیکھیے مثال ۵، ۷) فوراً ہی ضائع کر دیئے جاتے ہوں۔ مثال نمبر ۵ میں جس رجسٹر کا حوالہ دیا گیا ہے وہ کافی ضخیم معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ڈیڑھ ہزار افراد کی اسم نویسی کے لیے سیکڑوں صفحے درکار ہیں۔ اس رجسٹر کی ابتدائی غرض، اندازہ قوت، تحصیل زکوٰۃ، اور انتخاب عساکر کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں غزوۂ سرایا کے ذیل میں جو نامزدگیاں ہوتی تھیں (دیکھیے مثال ۷) تو فوجیوں کے نام (باقی صفحہ ۲۰۵ پر)

---

[1] دیکھیے بخاری باب عن حذیفۃ قال قال النبیؐ اکتبوا الی من یلفظ بالاسلام من الناس فکتبنا له الفا وخمسمائۃ رجل بخاری ۱/ ۴۳۰ — [2] طبری ۲/ ۲۶۴ — [3] دیکھیے بخاری ۱/ ۴۳۰ عن ابن عباس قال رجل الی النبیؐ، فقال یا رسول اللّٰہ انی کتبت فی غزوۃ کذا وکذا وامرأتی حاجۃ قال ارجع فحج مع امرأتک (بخاری) [4] [5] ابن ہشام ۴/ ۴۱ طبری ۳/ ۱۱۳ [6]

فنِ داستان نگاری اور باغ و بہار

سید ابوالخیر کشفی

"غزل" اور "داستان" یہی وہ دو اصنافِ ادب ہیں جن کے ہوتے ہوئے ہم اپنے ادب کو عالمی ادب کے مقابلے میں ٹھنگنا اور پستہ قد محسوس نہیں کر سکتے۔

داستان گوئی اور داستان سرائی ہمارے بزرگوں کے لیے محض ادبی صنف نہیں تھی بلکہ اُن کے اندازِ زیست کا ایک جز تھی۔ داستانوں کی مختلف تہیں ہماری صدیوں کی زندگی اور کلچر کی مختلف سطحوں کی امین رہی ہیں۔ داستانوں میں شعر گوئی کے اس ذوق کی تسکین کا سامان بھی تھا جو جنم جنم سے انسان کی ایک بنیادی خصوصیت ہے۔ اور داستانوں میں حقیقتوں کو سمجھنے اور بہ اندازِ دگران کے اظہار کا سامان بھی تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر داستانیں ذوق بخشی و نشاط انگیزی کا وسیلہ تھیں۔ ذوق بخشی کے بغیر تہذیبِ انسانی کا تصور محال ہے اور نشاط انگیزی توفیقِ آدم ہے۔ غالب کے الفاظ میں:

"ہر چند خردمند بیدار مغز تاریخ کی طرف بالطبع مائل ہوں گے۔ لیکن قصہ کہانی کی ذوق بخشی و نشاط انگیزی کے بھی دل سے قائل ہوں گے۔"

یہ ذوق بخشی و نشاط انگیزی افیون نہ تھی بلکہ خردمندی اور بیدار مغزی کی دلیل تھی۔ وہ خردمندی اور بیدار مغزی جس میں انسان کے کتنے ہی خواب اور ان کی تعبیروں کی تلاش مضمر تھی۔

داستانوں کے مطالعے سے ہمارے تخیل اور تصور کا سورج ہی طلوع نہ ہوا۔ بلکہ ہماری داستانیں اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ ان داستان نگاروں میں خواب دیکھنے کی کیسی غیر معمولی سکت تھی۔ وہ سکت جس کے فقدان نے ہمارے جدید ادب کے بہت بڑے حصہ کو قانونی دستاویزوں کی طرح بے رنگ بنا رکھا ہے اور داستان نگاروں کے خواب کو عہدِ حاضر کی تسخیری قوت نے حقیقت میں بدل دیا ہے۔ اب دیکھتے ہی دیکھتے زمین کے سینے سے فلک خراش عمارتیں ابھر آتی ہیں طلسمی قالینوں نے جیٹ ہوائی جہازوں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اور چاند کی بڑھیا ابنِ آدم کے انتظار میں ہے۔

داستانوں میں ہمیں مشرق اور برصغیر کی خارجی زندگی کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ اپنے اجداد کا ذہن اور اس کی پیچیدگیاں بھی نظر آتی ہیں۔ داستانوں کی علامتوں میں زندگی کی حقیقتیں بڑی کلبلاتی ہیں۔ ان داستانوں نے "عالمِ مخلوقات" سے ہمارا رشتہ استوار کیا ہے۔ ان داستانوں سے زندگی کی محرومیوں کی تلافی کی صورت نکلتی ہے۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ داستانیں نیند لانے کا نسخہ بھی تھیں اور عرفانِ کائنات کا وسیلہ بھی۔

میری ناچیز رائے میں داستانیں ہمارے معاشرے اور سوسائٹی سے ادب کے رشتے کی سب سے مضبوط کڑی کا درجہ رکھتی تھیں۔ داستان نگاری بعد میں شروع ہوئی۔ اس سے پہلے داستان سرائی کے سہارے انجمن آرائی ہوتی تھی۔ اور شاید ہمارے ادب میں ڈرامے کے فقدان کا ایک سبب داستان کی مقبولیت بھی تھی۔ داستان سرا کی ذات اپنی جگہ خود ایک اسٹیج۔ پردوں اور اداکاروں کے مجموعے کی حیثیت رکھتی تھی۔ کبھی وہ اپنی چشم و ابرو کے اشاروں اور ہاتھ کی حرکات سے ہمیں میدانِ رزم میں پہنچا دیتا۔ اور کبھی پریوں کے دیس میں۔ اب اس کی جگہ سینما (اور ترقی یافتہ ممالک میں اسٹیج) نے لے لی ہے۔ لیکن ہمارا لاشعور آج بھی کسی داستان سرا کو تلاش کرتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ داستان سرائی دلی میں میر باقر علی داستان گو کے ساتھ مر گئی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ فن آج بھی اُن علاقوں میں زندہ ہے جہاں خاندان اب بھی بنیادی اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں آج بھی نانی اماں کے پوپلے منہ سے ہر رات کہانی شروع ہوتی ہے "ایک تھا بادشاہ! ہمارا تمہارا خدا بادشاہ" .... اور یہ کہانی ختم ہونے کو نہیں آتی اور سننے والے جوان ہو کر کارخانوں میں کام کرنے لگتے ہیں۔ کالجوں میں پڑھانے لگتے ہیں۔ سیاہ لباس پہن کر کچہریوں میں "مائی لارڈ" کو مخاطب کرنے لگتے ہیں۔

میں نے اپنے لڑکپن میں داستان سرائی کی محفلیں دیکھی ہیں۔ نظیر آباد لکھنؤ میں ایک چائے خانہ تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ چائے والا چائے میں پوست

افیون ملا دیتا ہے۔ خدا جانے یہ بات سچ تھی یا جھوٹ۔ مگر یہ بات ضرور سچ تھی کہ جو ایک بار وہاں چائے پی لیتا۔ اس کے قدم بار بار اس چائے خانے کی طرف اٹھتے تھے۔ اور اسی چائے خانے میں چند آدمیوں کے درمیان۔ ایک آدمی دو تین موٹی موٹی کتابیں لیے بیٹھا رہتا۔ اور داستان سناتا رہتا۔ میں نے اُسے کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے کبھی نہ دیکھا۔ کتاب کا مقصد شاید توجہ کو مرکوز رکھنا تھا۔ اور اس محفل کا یہ عالم ہوتا تھا۔ جیسے ہوش دگمان دونوں اس دنیا سے واسطہ نہ رکھتے تھے۔ وہاں حقیقتوں کے پیمانے بدل جاتے۔ جب امیر حمزہ صاحبقراں کسی طلسمی قید میں پھنستے تو تمام حاضرین محفل ہاتھ اٹھا کر ان کی رہائی کے لیے خلوص دل سے دعا مانگتے اور جب اسم اعظم کی تاثیر سے امیر حمزہ طلسم کو درہم برہم کر دیتے تو نگاہوں میں چمک آجاتی۔ سننے والوں میں سے کوئی اٹھتا قریب کی دکان سے مٹھائی لاتا اور سب میں تقسیم کی جاتی۔ یہ جلیبیاں کبھی کبھی ہمارے حصے میں بھی آجاتیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان جلیبیوں کی مٹھاس نے میرے لیے ادب میں نشاط انگیزی پیدا کر دی۔ اسے فیضان کے علاوہ اور کس لفظ سے تعبیر کروں؟

پتہ نہیں میں اپنے لڑکپن کی باتیں آپ سے کیوں کرنے لگا۔ شاید یہ بھی داستانوں کا اثر ہے جہاں "افسانہ از افسانہ می خیزد" ــــ میں کہنا صرف یہ چاہتا تھا کہ آج جن داستانوں کے متعلق ہمارے بہت سے نقاد یہ کہتے ہیں کہ ان کا ماحول غیر فطری ہے ان کے کردار عجیب ہیں۔ ان میں مافوق الفطرت عناصر ہیں یہ داستانیں احساسِ تناسب سے عاری ہیں .... آج سے کچھ پہلے انہیں داستانوں میں سننے اور پڑھنے والوں کے لیے حکمت بھی تھی اور بصیرت بھی، ذوق جستجو بھی اور نشاط انگیزی بھی۔ ماہ و سال کی کروٹوں نے ہمیں دوبارہ اسی منزل سے قریب کر دیا ہے اور اب ہم زیادہ گہرے شعور کے ساتھ داستانوں کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔

مشکل یہ ہے کہ ہمارا کافر ذہن ان پیمانوں سے داستانوں کو ناپنا چاہتا ہے۔ جو داستانوں کے لیے وضع ہی نہیں کیے گئے۔ مغرب کی روشنی میں آپ ناول افسانہ اور جدید نظم کا مطالعہ شوق سے کیجیے لیکن اس ملگجے ہوئے اجالے کی، وسے اگر آپ داستانوں کے خط و خال کو دیکھنا چاہیں گے تو ہر راہ تاریک ہوجائے گی اور کوئی جگنو بھی آپ کی رہنمائی نہ کرے گا۔ پھر اس چشمۂ ظلمات سے شاید آپ لوٹ بھی نہ سکیں۔ اور اگر لوٹ بھی آئے تو آپ کی آنکھیں اپنے تہذیبی ماضی کو کبھی نہ دیکھ سکیں گی۔

ادب کو زندگی کی تعبیر و تفسیر اتنی بار کہا گیا ہے کہ اب اس جملے کو لکھتے یا بولتے وقت ابکائی سی آنے لگتی ہے۔ ادب صرف حقیقت (مروجہ اصلاح میں) نہیں بلکہ خواب بھی ہے۔ اور خواب بھی تو ایک بڑی حقیقت ہے۔ داستان اپنا عالم آپ ہے۔ اسی لیے اس کے ماحول کو غیر فطری اور اس کے کرداروں کو عجیب کہنے والے سے سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ

ع سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجاست

اور داستان سرائی کے بارے میں مرزا غالب یہ فیصلہ پہلے ہی دے چکے ہیں کہ "داستان سرائی منجملۂ فنونِ سخن ہے"۔ آپ میں اگر ہمت ہو تو غالب کے اس فیصلے کو نہ مانیے۔

مگر ع یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے

تخیل داستان کی بنیاد ہے اسی لیے داستان کی دنیا مثالی دنیا ہوتی ہے۔ جسے مناسب لفظ کی تلاش کے بغیر یاروں نے "عجیب" کا نام دے دیا ہے۔ بعض بڑے فن پاروں کی دنیا بھی تخیلی دنیا ہے۔ مگر تخیل کی اس دنیا کو سمجھنے کے لیے ہمیں اپنے انداز نظر کو بدلنا پڑتا ہے۔ اور پھر اس دنیا کی ہر چیز حقیقی معلوم ہونے لگتی ہے۔ مثال کے طور پر شکسپیر کے ڈرامے "خواب شب نیم گرما" کو پیش کیا جا سکتا ہے ادب کی اس سے بڑی قوت اور کیا ہوگی کہ وہ ہمیں نئی دنیاؤں میں پہنچا دیتا ہے۔ رہی یہ بات کہ یہ دنیا مثالی ہے تو جواب میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ مثالی دنیا داستانوں میں نہ ہوگی تو کیا ہمارے اس ذلیل معاشرے میں ہوگی؟ ــــ داستانوں میں ہمیشہ خیر کی فتح ہوتی ہے۔ حسن ابدی ہوتا ہے۔ بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں۔ "پھول، عورت بن جاتا ہے اور عورت ستارہ ہوتی۔ یہ فریب سہی، مگر یہ فریب بھی کتنا سچا ہے۔ یہ فریب ہمیں انسانیت کے تصور سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ اور رہا حسن ...... آپ جانتے ہی ہیں کہ کبھی یہ لالہ و گل بن جاتا ہے۔ کبھی خندہ برق و شرر .... عورت ہو یا زندگی یا حقیقت .. .. ان تینوں کو بھیس بدلنے میں بلکہ

حاصل ہے .... اور ؎ عاشق ہو تو معشوق کو ہر رنگ میں پہچان

اس بات کو جاننے کے بعد کہ داستان اپنی دنیا آپ ہے۔ یہ کہنا بے معنی ہو جاتا ہے کہ داستانیں احساسِ تناسب سے عاری ہیں۔ یہ "احساسِ تناسب" ہمارے ذہن میں ہندا دبی اصناف کی تنقید نے پیدا کیا ہے اور یہ اصطلاح اتنی مختصر ہے کہ داستانوں کے جسم پر پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ داستانوں میں اُلّو، طوطے اور گیدڑ کی باتیں تو ہم پڑھ لیتے ہیں۔ مگر انھیں سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ اُلّو فلسفی بھی ہے اور ہمارے اس وجود کا نمازی بھی جو خواب دیکھتا ہے .... جو طرز تپاکِ اہلِ دنیا سے جل کر وہاں جانے کی تمنا کرتا ہے "جہاں کوئی نہ ہو"۔ طوطا مارگ بھی ہے اور مرشد بھی۔ جو کبھی ہیرو کو شہزادی سے ملا دیتا ہے۔ اور کبھی حقیقت تک رسائی کا وسیلہ بنتا ہے۔ گیدڑ کے بارے میں اس دور میں کیا عرض کروں .... یوں سمجھیے کہ یہ جانور اور یہ علامتیں رموزِ مملکت کو بھی بے نقاب کرتی ہیں اور حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کو بھی۔

عدیم المثال کرداروں اور غیر معمولی چیزوں مثلاً چراغ الٰہ دین وغیرہ کے بارے میں چند اشارے پہلے کیے جا چکے ہیں۔ ایک بات اور کہتا چلوں (کچھ باتیں آگے آئیں گی) وہ یہ ہے کہ ایسے تصورات اس عہد سے مخصوص ہوتے ہیں جب آدمی لڑکپن سے گزر کر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک اُس دور میں جاگتے کے خواب دیکھتا ہے۔ کیا کبھی آپ کے دل میں یہ تمنا پیدا نہیں ہوئی کہ اگر آپ کے پاس کوئی طلسمی انگوٹھی ہوتی تو آپ اس کی قوت سے بہت بڑے "باؤلر" بن جاتے ہیں اور پھر ہندوستان، انگلستان کی ٹیم کو عبرت ناک شکست دیتا۔ یا چراغ الٰہ دین کی مدد سے ایفل ٹاور فرانس سے اٹھا کر اپنے دیس لے آیا جاتا۔ یہی حال تہذیبوں کا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کو تہذیبوں کے لیے عنفوانِ شباب کا زمانہ کہہ لیجیے۔ ہماری داستانیں قرونِ وسطیٰ کی یادگاریں ہیں۔ اور دنیا کے ہر ادب کے قرونِ وسطیٰ کے کارناموں میں بہت سی باتیں مشترک ہوتی ہیں۔

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ اب تک میں نے جو کچھ کہا ہے۔ اس کا "باغ و بہار" سے کیا تعلق ہے؟ میں نے اس کا جواب سوچ لیا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ مجھے یہ باتیں کہنی ہی تھیں۔ دوسری بات یہ کہ باغ و بہار بھی ایک داستان ہے اور اسے سمجھنے کے لیے ہمیں داستانوں کی تفہیم کے مرحلے سے گزرنا ہی ہوگا۔ ویسے اس بات پر تعجب ضرور ہوتا ہے کہ ایک طرف تو ہم خلاؤں کو فتح کر رہے ہیں اور دوسری طرف داستانوں کی دنیا کو اپنے لیے اجنبی پاتے ہیں۔ حسرت کی طبیعت ہی "طرفہ تماشا" نہ تھی ہماری طبیعت بھی طرفہ تماشا ہے۔ باغ و بہار میں داستان گوئی و داستان نگاری کے فن کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ مگر درمیان میں "میر امن" کی ذات بھی ہے۔ ہر خصوصیت اسی "فلٹر" سے گزر کر اپنا اظہار کرتی ہے۔ اسی لیے باغ و بہار ہماری داستانوں کی روایت کا حصہ بھی ہے۔ اور ان سے مختلف بھی۔

اردو کی اولین داستانوں میں تمثیلی رنگ غالب ہے۔ انھیں مثالیہ قصّہ کہنا مناسب ہوگا۔ ایسے قصّوں کی نمائندگی کے لیے "سب رس" موزوں رہے گی یہ انداز مشرقی داستانوں کا ایک مخصوص انداز ہے۔ مگر باغ و بہار یا بعد کی داستانوں میں اولیت مثالیہ یا تمثیلی کو حاصل نہیں ہے۔ بلکہ قصّے کو حاصل ہے اسی لیے باغ و بہار کے چاروں درویشوں کی سیر محض روحانی تجربے کا اظہار نہیں ہے۔ جیسا کہ ایک مادّہ پرست نقاد نے ہمیں باور کرانے کی کوشش کی ہے۔ میرے خیال میں یہ ارضی کہانیاں ہیں۔ روح اس سرزمین پر بھی ہمارا ساتھ دیتی ہے۔ اس لیے اِن کہانیوں میں روحانی تجربوں کی جھلک بھی ہے۔ مگر اولیت قصے ہی کو حاصل ہے۔ باغ و بہار میں "باطنی حقیقت" کا اظہار تو ہے۔ مگر یہ باطنی حقیقت "مقصود بالذّات" نہیں ہے۔

"تلاش و جستجو" "سب رس" میں بھی ہے اور "باغ و بہار" میں بھی۔ سب رس میں تلاش ابدی حقیقتوں کی ہے اور "باغ و بہار" میں "شہزادیاں" اور گمشدہ محبوبائیں گوشت پوست بھی رکھتی ہیں ـــ یہ الگ بات ہے کہ ان کی پیش کش پر روحانی تجربے کا گمان بھی گزرتا ہے۔ تلاش و جستجو کے یہ افسانے صرف ہماری زبان تک محدود نہیں بلکہ ان کا عالمگیر سلسلہ ہندوستان اور ایران سے لے کر "آئرستان" تک پھیلا ہوا تھا۔ "سب رس کے سلسلے میں افسانوں کا ذکر کرتے ہوئے عزیز احمد نے اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" میں لکھا ہے۔

"یہ سلسلہ تلاش و تجسس کے افسانوں کا سلسلہ ہے۔ کبھی یہ تلاش کسی پھول کی ہوتی ہے۔ جو پھول بھی ہے اور دنیا کی حسین ترین عورت بھی .... اس پھول کی تلاش رازِ حیات کی تلاش ہے اور یہ گل و بلبل کے قصوں سے زیادہ پرانی ہے۔ کبھی تلاش کے قصوں میں ہیرو کا مقصود کوئی ظرف مقدس یا نایاب ہیرا ہوتا ہے۔ جو اعلیٰ ترین شوکت و شانِ شاہانہ کا رمز ہے .... تلاش کے قصوں کا تیسرا گروہ وہ ہے جس میں "چشمۂ آبِ حیات" کی تلاش ہے .... مگر دراصل یہ تینوں گروہ ایک ہیں

بگاڑ لی بھول بھی ہے۔ چشمہ بھی اور عورت بھی ۔"

(ترقی پسند ادب صفحہ ۲۲۳ تا ۲۲۲)

ایسی تمام داستانوں میں ہمیں "دوران محض" سے واسطہ پڑتا ہے" زماں " (وقت) سے نہیں ۔ "مکان" کے سلسلے میں مشکل یہ آپڑتی ہے کہ تلاش کے عمل کے لیے "مکان" ضروری ہے۔" باغ و بہار" میں دوران محض نہیں بلکہ وقت ہے۔ اسی لیے میں اس داستان کو محض روحانی تجربہ نہیں سمجھتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ مثالیہ قصوں میں تلاش کے عمل سے "مکان" اور "اشکال" وابستہ ہیں۔ مگر باغ و بہار میں "وقت" ہے۔ اور اسی لیے اس میں "اشکال" نہیں بلکہ "کردار" ہیں۔ وقت اور اس کے تقاضوں کے مطابق یہ بدلتے ہوئے کردار اس بات کا ثبوت ہیں کہ باغ و بہار محض مثالیہ قصہ نہیں ہے۔

"باغ و بہار" کے کردار متحرک ہیں اور ہماری آپ کی طرح زندہ۔ پہلی کہانی کا درویش بھلا آدمی تھا مگر "آدمی کا شیطان آدمی ہے" ہر وقت کے کہنے سننے سے اس کا "مزاج بہک گیا۔ اور اگر اس کا مزاج نہ بہکتا اور وہ "آدمیت" کے تقاضوں کو پورا نہ کرتا تو کہانی آگے نہ بڑھتی۔ اسے سفر سے واسطہ نہ پڑتا۔ اور نہ بھی اپنے باپ "خواجہ احمد" کی طرح یمن کا "ملک التجار" بنکر چین کی بانسری بجاتا اور گھوڑے بیچ کر سوتا۔

میرامن کے فسانے میں صرف شہزادے، شہزادیاں، بادشاہ، وزیر اور امراء نہیں ہیں۔ ان کے کرداروں میں سوداگر، عام آدمی اور کٹنیاں بھی ہیں (آپ کا دل چاہے تو انھیں "سونیا نہ" شکلیں اور معنی دیدیں) تو دوسرے، تیسرے اور چوتھے درویش شہزادے ہیں۔ مگر پہلا درویش جس کی سیر میں سب سے زیادہ تکمیل موجود ہے، وہ سوداگر اور خواجہ زادہ ہی ہے۔ خواجہ سگ پرست کی کہانی میں انسانی فطرت کے کئی پہلو موجود ہیں۔ بہزاد خاں کی شجاعت۔ تیسرے درویش کی کہانی میں کٹنی کی مکاری۔ اور پہلے درویش کی "بہن کی ممتا" اور جذبے کی گہرائی ہمارے ذہن پر گہرے نقش چھوڑ جاتی ہے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ باغ و بہار کے بہترین عناصر پر شہزادوں اور شہزادیوں کی حکمرانی نہیں، بلکہ عام آدمی کا پھریرا لہراتا ہے۔

آدمی اور زمین سے میرامن کی بے پایاں محبت نے باغ و بہار کو اردو کی دوسری داستانوں سے بہت مختلف بنا دیا ہے۔ باغ و بہار داستانوں کے سلسلے کی ایک کڑی بھی ہے اور ایسا دریچہ بھی جس سے پہلی بار ہم آدمی کے دل میں جھانکتے ہیں۔ باغ و بہار میں بھی مافوق الفطرت عناصر ہیں۔ مگر ان کی حیثیت ثانوی ہے قصوں کی "ارضیت" ہے۔ مگر بچھڑے ہوؤں کو ملانے کے لیے میرامن کو "ملک شہبال" کا سہارا لینا پڑا۔ جن اور پری اس کہانی کی بنیاد نہیں ہیں۔ ان کا سایہ بہت دور سے باغ و بہار پر پڑا ہوا نظر آتا ہے اس کے علاوہ یہ بھی نہ بھولیے کہ باغ و بہار ایک ایسے شخص کی تصنیف ہے جو قرون وسطیٰ کا ذہن رکھتا تھا اسی لئے مافوق الفطرت عناصر سے نہ بھاگ سکتا تھا۔ جنوں اور پریوں کا ذکر اور مافوق الفطرت عناصر تو عہد وسطیٰ کے ادب کی خصوصیات ہیں اور میرامن بھی اسی دور کے آدمی ہیں۔ ان کے دور کا عام آدمی ان عناصر پر ذہنی طور پر اعتقاد رکھتا تھا۔ آج بھی آپ کی نانی جان یا دادی جان (اگر وہ زندہ ہوں تو خدا ان کا سایہ آپ کے سر پر سلامت رکھے) ان باتوں پر اعتقاد رکھتی ہیں۔ بچہ مضمحل ہوتا ہے تو اسے نظر بد سے تعبیر کرتی ہیں۔ محلے کی کسی کنواری لڑکی پر "ہسٹریا" کے دورے پڑتے ہیں تو "عامل" کو بلانے پر اصرار کرتی ہیں۔ میرامن کا کمال یہ ہے کہ وہ اس دور میں بھی دیر تک انسانی زندگی سے دور نہیں رہتے وہ "دیدۂ وا" کے ساتھ اس عہد کی زندگی اور اس کی رنگا رنگی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اسی لیے "باغ و بہار" میں ان کے عہد کا معاشرہ اور زندگی سمٹ کر آ گئی ہے۔ (نہ جانے یہ کس کا کمال ہے۔ میرامن کا۔ یا فارسی قصہ چہار درویش کے نامعلوم مصنف کا)

"باغ و بہار" قصہ گوئی کی اس غیر معمولی صلاحیت کا اظہار ہے جو قدرت نے میرامن کو ودیعت کی تھی۔ "باغ و بہار" میں "بوستان خیال" اور "طلسم ہوشربا" کی سی وسعت اور طلسم بندی تو نہیں ہے لیکن میرامن کہانیوں کا سلسلہ یوں ملاتے ہیں کہ پڑھنے والا کہانیوں کی فضا میں سب کچھ بھول جاتا ہے اور یہی کہانی کہنے کا فن ہے۔ (داستان کا ایک اہم عنصر دلچسپی ہے) ان کی کہانیوں کی رفتار میں حرکت بھی ہے اور توازن بھی۔ "باغ و بہار" پر جدید نقادوں کا یہ الزام عائد نہیں ہوتا کہ "داستانوں میں احساس تناسب نہیں ہے"۔ ان کی کہانیوں میں بعض پراسرار واقعات بھی ہیں جو شروع میں ہمیں ناقابل فہم معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن کہانی جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے۔ گرہیں کھلتی جاتی ہیں۔ اور واقعات سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔ مثلاً پہلے درویش کی کہانی میں شہزادی کا عجیب و غریب رویہ ــــ ان کہانیوں میں "ارضیت" صرف کہانی سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس میں میرامن کے اسلوب کا بھی دخل ہے۔

میرامن کے یہاں رکاوٹ اور ٹھہراؤ نہیں۔ نہ اسلوب میں، نہ کرداروں میں۔ رجب علی بیگ سرور کے کردار بڑی حد تک بے جان ہیں اس کے برعکس میرامن کے کرداروں میں ہمیں زندگی ملتی ہے اور تند و تیز انسانی جذبات بھی۔ یہاں "اسم اعظم" بھی جنسی جذبہ کو مغلوب نہیں کر سکتا۔ پہلے درویش کی

سیر میں شہزادی کی نفرت کتنی انسانی اور کتنی شدید ہے۔ یہ نفرت اس "سلے وفا" اور اس "بندوڑ" کے خون سے بھی اپنی پیاس نہیں بجھا سکتی اور درویش سے دوری کی تہہ میں ان "دونوں" کی نفرت ہے۔ آخر اس نے اپنے آپ کو ان کا شریک محفل اور شریک جام کیوں بنایا؟

میرامن کے کردار تخیلی یا ان کے "ہمزاد" نہیں ہیں۔ وہ اپنی شخصیت رکھتے ہیں اور داستان گو کو جہاں چاہتے ہیں اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ داستان گو مجبور بھی ہے اور مختار بھی۔ کرداروں کے ساتھ سیر کرنے پر مجبور ہے مگر اپنے "بیانیہ" میں وہ اپنی مختاری کا اظہار کرتا ہے مشرق بعلی کے ایک دیس میں اسے جون پور کا پلیاد آتا ہے۔ بصرے کی شہزادی سے وہ ہندی کے دوہے پڑھوا دیتا ہے۔ کسی بتکدے میں وہ لات و منات کو بٹھا دیتا ہے۔ (اس اعتبار سے میرامن اور انیس کے درمیان مجھے ہمیشہ مشابہت کا احساس ہوا ہے۔)

توبۃ النصوح کا ایک انگریزی ترجمہ

سید مبارز الدین رفعت

نذیر احمد نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ کس طرح شروع کیا، اس کی داستان بہت دلچسپ ہے۔ محض حسن اتفاق سے یہ سلسلہ شروع ہوا اور ایسے مبارک وقت اس کا آغاز ہوا کہ اس سے نذیر احمد کو لازوال شہرت نصیب ہوئی اور اردو زبان کو ایک ایسا عظیم المرتبت مصنف ہاتھ آیا جس کے ذکر کے بغیر اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں کہلا سکتی۔

یہ حسن اتفاق کیسے پیش آیا، اس کی تفصیل خود مولانا نے اپنے ایک لکچر میں بڑے دلچسپ اور ڈرامائی انداز میں بیان کی ہے اور انھیں کی زبانی سننے کے قابل ہے۔ فرماتے ہیں:

"میں اپنے بچوں کے لیے ایسی کتابیں چاہتا تھا کہ وہ ان کو چاؤ سے پڑھیں، ڈھونڈا، تلاش کیا، لیکن پتہ نہ لگا۔ ناچار میں نے ہر ایک کے مناسب حالات آپ کتابیں بنانی شروع کیں۔ بڑی لڑکی کے لیے مراۃ العروس، چھوٹی کے لیے منتخب الحکایات، بشیر کے لیے چند پند۔ یہ نہیں کیا کہ کتابیں سالم لکھ لیں، تب پڑھانی شروع کیں نہیں بلکہ ہر کتاب کے چار چار، پانچ پانچ صفحے لکھ کر ہر ایک کے حوالے کر دیے۔ مگر وہ بچوں کو ایسی بھائیں کہ جس کو پاؤ صفحہ پڑھنے کی طاقت تھی، وہ آدھے کے لیے اور جس کو ایک صفحہ کی استعداد تھی، وہ ورق کے لیے مستعجل تھا جب دیکھو ایک نہ ایک متقاضی ہے کہ میرا سبق ختم ہو گیا ہے۔ اسی وقت قلم برداشتہ لکھ دیا کرتا تھا۔ یوں کتابوں کا پہلا گمان پورا ہوا۔"

"اتنے میں کیمپسن صاحب ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن دورہ کرتے کرتے ضلع کے ہیڈ کوارٹر، اوری کے باغ میں فروکش ہوئے۔ شام کے وقت خیمے کے باہر درختوں کے تلے ٹہل رہے تھے کہ بشیر تانگن پر سوار دو تین آدمی ساتھ لیے ادھر سے نکلا۔ صاحب کو دیکھ کر تانگن پر سے اتر کر سلام کیا۔ صاحب نے نام و نشان کے بعد پوچھا کیا پڑھتے ہو!

بشیر: چند پند

صاحب: یہ نام تو ہم نے نہیں سنا۔

بشیر: یہ کتاب میرے ابا نے میرے لئے بنا دی ہے۔

صاحب: کتاب کا مضمون کیا ہے؟

بشیر: بڑی اچھی اچھی نصیحت کی باتیں ہیں۔

صاحب: مجھ کو وہ کتاب دکھا سکتے ہو؟

بشیر: میں ابھی جا کر گھر سے لے آتا ہوں۔ وہ نالے پار ہمارا ہی گھر دکھائی دیتا ہے۔

(تھوڑی دور سے لوٹ کر)

میں آپا اور چھوٹی آپا کی کتابیں بھی لیتا آؤں؟ وہ چند پند سے بھی اچھی ہیں۔

صاحب: ضرور سب لاؤ۔

"بشیر نے بستے کا بستہ گھر سے لا صاحب کے حوالے کیا۔"

"شام کو میں جو کچہری سے گھر آیا تو بہن بھائی لڑ رہے تھے۔ بہنوں کو شکایت تھی کہ ہماری کتابیں کیوں دے آئے۔ میں نے سن کر کہا گیا

مونا نسخہ ہے۔ میں تم سب کو ان سے بہتر کتابیں بنا دوں گا۔"

"اگلے دن میں جو کیمپسن صاحب سے ملا تو انھوں نے شاید ان کتابوں کو دیکھ بھال لیا ہوگا۔ فرمایا ان کی نقلیں مجھے پرسوں تک کاپی پہنچا دو۔ یہاں میرے پاس خسرے کی صفائی میں بہت سے اچھے اچھے خوش خط۔ اور کتابیں بھی چھوٹے چھوٹے رسالے۔ میں نے شیرازہ توڑ اوراق تقسیم کر دیئے۔ شاموں شام نقل ہو کر آ گئے۔ جلدی ہوئی جلدیں بنا کر، صاحب تو پرسوں تک کو کہہ گئے تھے، میں نے اگلے ہی دن کتابیں پہنچا دیں۔ کوئی دو مہینے بعد نینی تال سے کیمپسن صاحب کی چٹھی آئی کہ مراۃ العروس کو پڑھ کر میں بہت ہی محظوظ ہوا۔ یہ اپنے طرز مقبول میں پہلی ہی کتاب ہے اور ہزار روپے انعام کی مستحق ہے اور اسی غرض سے میں اس کو گورنمنٹ میں پیش کروں گا۔ وہی سر ولیم میور جن کی فرمائش سے میں نے انکم ٹیکس کا ترجمہ کیا تھا۔ انھوں نے مراۃ العروس کو آسمان پر چڑھا دیا۔ ہزار روپیہ گورنمنٹ سے سر دربار انعام دیا۔ ایک قیمتی گھڑی ٹائم پیس میرا نام کندہ کر کے جیب خاص سے کیمپسن صاحب اور اپنے ریویو کو گورنمنٹ گزٹ میں چھپوایا۔"

"وہ جو کہتے ہیں کہ مزدور خوش دل کار بیش کند، میں نے بھی تصنیف کا ڈربہ کھول دیا اور اب بھی کھلا ہی سا ہے۔ ہاتھ کے رعشے کی وجہ سے پٹ بھیڑ دیئے ہیں، بند نہیں کیئے۔" [1]

یہ ۱۸۶۸ء کا زمانہ ہے۔ اس سے پہلے مولانا الہ آباد میں ڈپٹی انسپکٹرس آف اسکولس کے عہدے پر فائز تھے۔ محض ایک حسن اتفاق سے ان کی رسائی سر ولیم میور تک ہو گئی تھی جو اس زمانے میں صوبہ متحدہ کے لفٹننٹ گورنر تھے۔ سر ولیم میور کے حکم پر انھوں نے انکم ٹیکس کے قانون اور اس کے بعد قانون تعزیرات ہند کا اردو میں بہترین ترجمہ کیا تھا، اسی بنا پر وہ محکمۂ تعلیم سے محکمۂ مال میں عہدہ دار بندوبست کی حیثیت سے لیے گئے تھے۔ محکمۂ تعلیم سے ان کا اب کوئی تعلق باقی نہیں رہا تھا۔ یہ محض دوسرا حسن اتفاق تھا اور اردو زبان کی خوش نصیبی تھی کہ اس صوبے کے انگریز ناظم تعلیمات میتھیو کیمپسن دورے پر اس مقام پر گئے جہاں مولانا نذیر احمد متعین تھے۔ بالکل ہی اتفاقی طور پر ان کی مڈبھیڑ مولانا کے صاحبزادے میاں بشیر الدین احمد سے ہوئی اور وہ کتابیں جو محض خانگی استعمال کے لیے لکھی گئی تھیں، ان کے ہاتھ آ گئیں۔ یہ کیمپسن کی جوہر شناسی تھی کہ انھوں نے بیک نظر ان کتابوں کی اہمیت اور ان کی خوبی کو پرکھ لیا۔ انھیں گورنمنٹ میں پیش کر کے ان پر انعام دلایا۔ اس ہمت افزائی نے مولانا نذیر احمد کے حوصلے بلند کر دیئے اور انھوں نے انتھک محنت سے ایک سے ایک اچھی کتاب لکھی اور اردو کے ایک بلند پایہ ادیب کی حیثیت سے ان کا مرتبہ تسلیم کر لیا گیا۔ ایک بلند پایہ ادیب کی حیثیت سے مولانا نذیر احمد کی دریافت کا سہرا انھی کے نہیں مسٹر میتھیو کیمپسن ناظم تعلیمات صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کے سر بندھتا ہے افسوس ہے کہ ان کے تفصیلی حالات مجھے نہ مل سکے مولانا کے اسی محولہ بالا لکچر کے ایک حاشیہ میں بشیر الدین احمد، مرتب "لکچروں کا مجموعہ" نے لکھا ہے کہ کیمپسن صاحب ایم، اے تھے [2]
انگلستان کی کس جامعہ کے ایم اے تھے، یہ واضح نہ ہو سکا۔ اس دور میں یعنی انیسویں صدی کے دوران میں جو بھی انگریز عہدہ دار ہندوستان بھیجے جاتے تھے ان میں بیشتر عہدہ دار عربی، فارسی، اردو اور دوسری ہندوستانی زبانوں میں کافی درک رکھتے تھے۔ غالباً کیمپسن عربی اور فارسی سے واقف تھے۔ اور مولانا نذیر احمد سے جو معاملہ پیش آیا اس کی بنا پر کہا جا سکتا ہے انھیں اردو بہت اچھی آتی تھی مولانا کے ادبی قدردان سر ولیم میور کے داماد بھی تھے۔ چنانچہ بشیر الدین احمد نے اسی حاشیہ میں لکھا ہے:

"سر ولیم میور ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے لفٹننٹ گورنر تھے۔ جو عربی کے بڑے ادیب اور فاضل اجل تھے۔ خدمت سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ اڈنبرا یونیورسٹی کے چانسلر تھے۔ کیمپسن صاحب ایم اے ان کے داماد ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن تھے انھوں نے ہی مراۃ العروس اور توبۃ النصوح کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور توبۃ النصوح کی ایک مبسوط شرح بھی انگریزی میں لکھی۔" [3]

مولانا نذیر احمد نے مراۃ العروس اپنی بچیوں کے لیے لکھی تھی اور اسے دریافت کر کے گورنمنٹ میں پیش کر کے انعام دلانے اور عوام تک

---

[1] نذیر احمد کے "لکچروں کا مجموعہ" جلد دوم، چالیسواں لکچر ص ۴۳۶ — ۴۳۸ — مرتبہ بشیر الدین احمد مفید عام اسٹیم پریس آگرہ، ۱۹۱۸ء

[2] ایضاً، حاشیہ ص ۴۳۹

[3] لکچروں کا مجموعہ، حصہ دوم حاشیہ، ص ۴۳۹

پہچاننے کی سعادت کیمپسن صاحب کے حصے میں آئی تھی، لیکن اس کتاب کے لکھنے کے چند سال بعد ۱۸۷۳ء میں مولانا نے عامۃ المسلمین کو پیش نظر رکھ کر توبۃ النصوح لکھی تو اس کتاب کو بھی گورنمنٹ میں پیش کرنے کا افتخار کیمپسن صاحب کو حاصل ہوا۔ اسی لکچر میں مولانا نذیر احمد فرماتے ہیں:

"اعظم گڑھ کے قیام کا زمانہ تصنیف و تالیف کے اعتبار سے اچھا کامیاب زمانہ تھا۔ میں نے اعظم گڈھ میں ایک تو توبۃ النصوح لکھی جو میری تصانیف میں سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ وہ مذہبی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی اور لاٹ صاحب کو گورنمنٹ کی نیوٹرالیٹی کے لحاظ سے تامل تھا کہ وہ اس کو انعامی کتابوں کے شمول میں لے بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ مگر کتاب کا پلاٹ کچھ ایسا بن پڑا تھا کہ لاٹ صاحب کہ لیتے ہی بن آئی اور کتاب باوجودیکہ اسلام کے سانچے میں ڈھالی گئی تھی مگر اس میں کہیں بھی کوئی ایسی بات نہ تھی جس کو کوئی دوسرے مذہب کا آدمی دیکھ کر برا مانے۔ اس پر بھی گورنمنٹ نے ایک ہزار روپیہ اول درجے کا انعام دیا اور انعام سے بڑھ کر یہ ہوا کہ سول سروس کے کورس میں داخل کی گئی۔" [1]

مسٹر میتھیو کیمپسن مولانا نذیر احمد کی کتابوں سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ ان کتابوں کو انھوں نے خود ہی گورنمنٹ میں پیش کیا، اپنے شخصی اثر سے کام لے کر ان پر مولانا کو انعام دلایا، ان کو نصاب میں شامل کرلیا[2] اتنا ہی نہیں بلکہ ان کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور ایک کی شرح بھی لکھی۔ انعام کے لیے توبۃ النصوح کو گورنمنٹ میں پیش کرتے ہوئے انھوں نے حکومت کو جو مراسلہ لکھا تھا اس میں اس کتاب کو مولانا کی اس وقت تک کی لکھی ہوئی تمام کتابوں سے افضل قرار دیا۔ انھوں نے لکھا تھا:

"میں اس کتاب کو مصنف کی مراۃ العروس اور بنات النعش سے افضل سمجھتا ہوں۔ اس میں طرز عبارت اور قوت بیان کی خوبی ان دونوں کی بہ نسبت زیادہ ہے۔" [3]

راقم نے مراۃ العروس کا انگریزی ترجمہ اور توبۃ النصوح کی شرح نہیں دیکھی لیکن توبۃ النصوح کا ترجمہ دیکھا ہے، اس مضمون میں اسی انگریزی ترجمہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مسٹر میتھیو کیمپسن نے توبۃ النصوح کا انگریزی ترجمہ مولانا نذیر احمد کی اجازت سے اس وقت کیا ہے جب کہ مولانا ریاست حیدر آباد دکن کے بیدار مغز وزیر اعظم نواب سالار جنگ اول کی طلب پر حیدر آباد چلے گئے تھے اور اس ریاست میں ناظم محکمہ مال کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ مسٹر کیمپسن کا یہ ترجمہ "THE REPENTANCE of NUSSOH" کے نام سے انگلستان کے ایک ایسے مشہور ناشر ادارے نے ۱۸۸۴ء میں شایع کیا جو اس زمانے میں مشرق اور مشرقی علوم سے متعلق بے شمار کتابیں شایع کر رہا تھا اس ادارے کا نام ہے:

" W.H.Allen & Co, 8, Waterloo Place, London, 1884 "

ترجمہ کی ابتدا میں مترجم کا ایک مختصر سا دیباچہ ہے۔ اس دیباچہ کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

مترجم کا دیباچہ

یہ ہندوستانی قصہ جس کا آزاد ترجمہ اس چھوٹی سی کتاب میں پیش کیا گیا ہے، ہندوستان میں ملازمت کے دوران میں میرے ہاتھ آیا تھا۔ اس کے بعد ہی اس کے مصنف (خان بہادر مولوی حاجی حافظ نذیر احمد، ناظم محکمہ مال ریاست حضور نظام، حیدر آباد دکن) نے اسے شایع کردیا۔ اگرچہ کہ اس کتاب کا علم اہل یورپ کو بہت کم ہے، لیکن آگرہ اور لکھنؤ کے مقامی مطبعوں سے اس کے کئی اڈیشن

---

[1] لکچروں کا مجموعہ، حصہ دوم حاشیہ، ص ۲۴۰

[2] توبۃ النصوح کی "تقریظ" کے ایک حاشیے میں مولانا نے لکھا ہے: "واضح ہو کہ اصل کتاب کے حاشیہ پر عند الملاحظہ جناب صاحب ڈائرکٹر بہادر جناب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے اپنے دست خاص سے اکثر جگہ کچھ کچھ عبارت بخط پنسل سے لکھ دی تھی۔ چنانچہ مصنف نے چھپنے سے پہلے کتاب پر نظر ثانی کر کے جہاں تک ممکن ہوا ایما و اشارہ کے مطابق کتاب میں ترمیم کردی۔"

[3] "چٹھی جناب صاحب ڈائرکٹر بہادر سررشتۂ تعلیم"، تقریظ توبۃ النصوح۔

شایع ہو چکے ہیں۔

میں نے تین وجوہ کی بنا پر اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ انگریزوں کو اپنی ہم جنس ہندوستانی رعایا کی حالت اور ان کی ترقی سے جتنی دلچسپی ہے، اگر وہ کتاب پڑھیں تو مجھے یقین ہے انھیں اس کے دیکھنے کا موقع ملے گا۔ دوسری وجہ یہ کہ اس کتاب میں ہندوستانیوں کی گھریلو زندگی کی جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں وہ ایسے لوگوں کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوں گی۔ جو ہندوستان میں قسمت آزمائی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ تیسری وجہ یہ کہ میں اصل کتاب کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ یہ کتاب ہندوستانی زبانوں میں سب سے زیادہ مستعمل زبان میں اب تک کی چھپی ہوئی کتابوں میں سب سے بہتر کتاب ہے۔ یہی زبان اس زبان کے وطن دہلی میں بولی جاتی ہے جہاں کا یہ قصہ ہے۔

توبۃ النصوح اور اس کے ساتھ ہی دوسرا قصہ مراۃ العروس دونوں ہی پہلے پہل مصنف کے افراد خاندان کے خانگی استعمال کے لیے لکھے گئے تھے۔ اس میں زندگی اور عادات و اطوار کی جیسی تصویر پیش کی گئی ہے وہ اس ملک کا باشندہ ہی پیش کر سکتا تھا۔

اس کتاب کے مصنف ایک بڑے عالم ہیں اور مشرقی مکتب فکر کے علم کلام کے ماہر ہیں وہ عرصۂ دراز تک انگریزی حکومت کے تحت ڈپٹی کلکٹر رہ چکے ہیں۔ ادھر چند سال پہلے سر سالار جنگ مرحوم نے انھیں حیدرآباد کا نظم و نسق چلانے کے لیے ایک اہم عہدے کے لیے منتخب کیا تھا اس عہدے پر وہ اب تک فائز ہیں۔ میں نے اس کتاب کا ترجمہ ان کی اجازت سے کیا ہے۔

متھیو کیمپن — اسکوٹ، ۱۸۸۴ء

اس کے بعد مترجم کے خسر سر ولیم میور کا مقدمہ درج ہے جو چار صفحوں میں آیا ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، سر ولیم میور، مولانا نذیر احمد کے اولیں قدر شناسوں میں تھے۔ مولانا کو جو شہرت، جو عزت اور جو مرتبہ حاصل ہوا اس میں سر ولیم میور نے صوبۂ متحدہ کے گورنر کی حیثیت سے بہت اہم حصہ ادا کیا ہے۔ ولیم میور ۱۸۱۹ء میں بمقام گلاسگو پیدا ہوئے۔ ان کے والد گلاسگو کے ایک تاجر تھے۔ اپنے والد کے چار بیٹوں میں سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ان کے سب سے بڑے بھائی جان میور سنسکرت کے بڑے عالم رہے ہیں۔

ولیم میور ۱۸۳۷ء میں پہلی بار ہندوستان آئے۔ مال گزاری کے تعین کا کام ان کے سپرد ہوا۔ اسی خدمت پر کانپور، بندیل کھنڈ اور فتح پور میں دس سال تک مقیم رہے ۱۸۴۷ء میں شمال مغربی صوبے کے گورنر معتمد مقرر ہوئے ۱۸۵۶ء میں وہ اسی صوبے کی مجلس مال کے معتمد بنائے گئے ۱۸۶۲ء میں انھیں شمال مغربی صوبہ کے لفٹنٹ گورنری کے عہدۂ جلیلہ میں ترقی دی گئی اور ۱۸۷۴ء تک وہ اسی عہدہ پر فائز رہے۔ اس کے بعد وہ ۱۸۷۶ء تک وائسرائے ہند لارڈ نارتھ بروک کی کونسل کے رکن فینانس رہے اور اسی خدمت سے وظیفۂ حسن خدمت پر حکومت ہند کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

وظیفۂ حسن خدمت حاصل کر کے وہ انگلستان پہنچے تو لارڈ سالسبری نے انھیں کونسل آف انڈیا کا رکن نامزد کیا۔ ۱۸۸۵ء میں کونسل آف انڈیا کی رکنیت سے استعفا دے کر انھوں نے اڈنبرا یونیورسٹی کی چانسلری قبول کر لی اور مرتے دم تک اسی خدمت پر مامور رہے اس یونیورسٹی کی بڑی خدمت کی اسی یونیورسٹی سے انھوں نے مولانا نذیر احمد کو ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری بھی دلائی۔

سر ولیم میور کو عربی اور اردو خوب آتی تھی۔ ملکہ وکٹوریہ نے انھیں کے مشورے سے قیصرِ ہند کا لقب اختیار کیا تھا۔ ملکہ کو اردو زبان سیکھنے میں بھی سر ولیم میور نے مدد دی تھی۔ الہ آباد کا میور کالج اور الہ آباد یونیورسٹی دونوں انھیں کی گورنری کے عہد میں قائم ہوئے۔ تاریخ اسلام سے انھیں شروع ہی سے دلچسپی رہی۔ ہندوستان میں قیام کے دنوں میں وہ "کلکتہ ریویو" میں مسلسل مضامین لکھتے رہے۔ ان ہی مضامین کی بنیاد پر انھوں نے اپنی مشہور کتاب "حیات محمد" (LIFE OF MOHAMMAD) چار جلدوں میں ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۱ء تک شایع کی۔ اس کتاب کا لب و لہجہ اور اس کے بعض مضامین ہندوستانی مسلمانوں کو سخت ناگوار گزرے۔ اسی کتاب کا جواب لکھنے کے لیے سر سید نے اپنا اثاثہ بیچ کر انگلستان کا سفر کیا اور "خطبات احمدیہ" کے نام سے اس کا جواب لکھا۔ اس کتاب کے سوا سر ولیم میور نے مسلمانوں سے متعلق اور بھی کتابیں لکھی ہیں، جن کے نام یہ ہیں:

(۱) ابتدائی خلافت اور اسلام کا عروج ۱۸۸۳ء (۲) سلاطین مملوک — مصر کا غلام خاندان ۱۸۹۶ء (۳) قرآن، اس کی ترکیب و تعلیم ۱۸۷۸ء (۴) قرآن مجید کے اقتباسات انگریزی ترجمہ کے ساتھ ۱۸۸۰ء (۵) الکندی کی کتاب الاعتذار کا انگریزی ترجمہ ۱۸۸۷ء — ۱۸۸۱ء (۶) ملاذ[illegible]

کو تورات زبور اور انجیل کے دیکھنے اور پڑھنے کی دعوت ۱۸۹۲ء۔

۱۸۸۴ء میں وہ اسلامیات کے ماہر کی حیثیت سے رائل سوسائٹی کے صدر منتخب ہوئے، اسی حیثیت سے انھیں ۱۹۰۳ء میں جوبلی گولڈ میڈل عطا ہوا۔ ۱۸۸۵ء میں جامعہ آکسفورڈ نے ڈی سی ایل کی اور جامعہ گلاسکو اور جامعہ اڈنبرا نے انھیں ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگریاں عطا کیں۔

سر ولیم میور نے ۱۹۰۵ء میں بمقام اڈنبرا وفات پائی۔

سر ولیم میور نے توبۃ النصوح کے انگریزی ترجمہ پر جو مقدمہ انگریزی میں لکھا ہے، اب اس کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو۔ یہ مقدمہ بھی ان کی کتاب "حیات محمد" کی طرح تعصب و تنگ نظری سے خالی نہیں۔

مقدمہ

"ہندوستان کی دیسی زبانوں میں دلچسپ اور کارآمد ادب کی بہت کمی ہے۔ ان زبانوں میں ایسی کتابیں بہت ہیں جن کا بڑا حصہ قابل اعتراض باتوں سے بھرا ہوا ہے۔ مثال کے طور پر ان زبانوں میں ایسی دلچسپ اور نصیحت آموز کہانیاں سرے سے موجود نہیں جو بچوں یا صنف نازک کے لیے موزوں ہوں۔ اس طرح تعلیم اور خاص طور پر لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلہ میں ایک بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شوہروں اور باپوں کو فطری طور پر قابل اعتراض کتابوں کے پڑھانے میں بڑا تامل ہوتا ہے۔

آج سے کوئی دس سال پہلے دیسی زبانوں میں چند کتابوں پر انعامات کے ایک اعلان کے سلسلہ میں کتاب توبۃ النصوح مسٹر کیمپسن ناظم تعلیمات صوبجات شمال مشرقی کے پاس پیش کی گئی تھی۔ اس کتاب پر مصنف کو ایک ہزار روپیہ کا انعام عطا کیا گیا تھا۔

مصنف کو توبۃ النصوح پر ایک ہزار روپیہ کا انعام عطا کرتے ہوئے حسب ذیل احکام مسٹر کیمپسن کے نام جاری کیے گئے تھے۔ یہی احکام صوبجات شمال مشرقی کے سرکاری گزٹ بابت ۱۸۷۴ء میں شایع کیے گئے تھے۔

"کتاب کا مقصد اور زبان دونوں نہایت قابل تعریف ہیں۔ واقعی بیان کی قوت اور جودت عبارت کی سادگی اور بے ساختگی اور محاورات کی مناسبت اور عمدگی جو اس کتاب میں ہے شاید اردو کی اور کسی کتاب میں نہ ہو۔ اور بڑی صفت یہ ہے کہ ہندی، فارسی، عربی الفاظ کی آمیزش اس بے تکلفی کے ساتھ ہے جو دلی کی زبان میں پائی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ضرب المثل باتیں اور خصوصی روزمرہ کی گفتگو کے مستعمل فقرے اس کثرت سے ہیں کہ ان کے سبب سے کتاب مذکور بہت ہی فائدہ مند معلوم ہوتی ہے۔ اور ایک بات نہایت عمدہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے خانگی حالات بھی اس میں مشرح بیان کیے گئے ہیں جس کے سبب مرآۃ العروس کے مانند یورپ کے لیے بھی جو اس کا مطالعہ کریں یہ آگاہی اور تفنن ہے۔

اگرچہ اصل مضمون اس کتاب کا مذہبی باتوں سے علاقہ رکھتا ہے، لیکن مصنف نے شروع کتاب میں صاف صاف اعتراف کیا ہے کہ مذہب علیحدہ اور خانگی میں اخلاق کی تعلیم کرنا میری طاقت سے باہر ہے اور اس بات میں اس نے اپنی رائے نہایت مستحکم عبارت میں ظاہر کی ہے چنانچہ لکھا ہے کہ پہلے میرا ارادہ تھا کہ خانہ داری اور بودوباش باہمی کے واسطے نیکی اور خوش خوئی کا ضروری ہونا بالتفصیل مذہبی ثابت کروں لیکن جب لکھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ ایسا قصد کرنا گویا روح کو قالب سے، شعاع کو آفتاب سے، عرض کو جوہر سے، ناخن کو گوشت سے جدا کرنا ہے سو اس بیان کے مطابق اس قصے سے یہ نصیحت نکلتی ہے کہ سرگرمی اور صدق دل سے عقائد مذہبی کی پیروی کرنا ہی خانہ داری میں خوش حالی کی مستحکم بنا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ مصنف کے اس قاعدے پر رایوں کا اختلاف واقع ہوگا مگر منشا اس کا یہ ہے کہ جس حسن عقیدت اور خلوص نیت سے اپنے مذہب کو برعایت، مذہب اسلام ادا کیا ہے، اس کی نسبت کسی کو اشتباہ نہ ہوگا .... لیکن جب نواب ممدوح نے کل کتاب کو بغور ملاحظہ فرمایا تو اس بات سے تسکین ہوئی کہ مصنف نے اپنے قصد کو کہ کوئی امر متعلق مذہب یا ایسا کہ غیر مذہب والوں کو ناگوار ہو، اس میں داخل نہ ہونے پائے، بہت خوبی کے ساتھ پورا کیا ہے۔ اور عموماً ایمان اور عقائد مذہبی کے ضمن میں جو جلائل حقائق مندرج ہیں ان کو اس قدر نہ استعمال کیا ہے کہ جو نصیحتیں اس میں کی ہیں ان سے استفادہ غیر مذہب والے بھی بوجہ احسن مستفید ہو سکتے ہیں۔ اور اس باب میں جناب لفٹنٹ گورنر بہادر آپ کے ساتھ اتفاق رکھتے ہیں کہ یہ کتاب نہ صرف اہل اسلام بلکہ ہندوؤں اور مسیحیوں کو بھی پسند خاطر ہوگی۔ ایسے مناظر جیسے چھوٹی لڑکی کے مکالمے

نصیحت کے ساتھ در باب ان امور کے جن کا ادا کرنا خالق کی جناب میں اس پر فرض تھا وہ بالکل مقتضائے طبعی اور رقت قلبی سے بھرے ہوئے ہیں اور ممکن نہیں کہ کسی مذہب کا آدمی اس کو پڑھے اور اس کے دل پر اثر نہ ہو۔

اس صورت میں جناب سر ولیم میور صاحب کو اس امر کے تسلیم کرنے میں کچھ تامل نہ ہوگا کہ اس کتاب کا داخل منشائے اشتہار مذکور کرنا مناسب ہے۔ اس کو داخل کر کے جناب ممدوح بخوشی تمام پورا انعام ایک ہزار روپیہ کا عطا فرماتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ یہ کتاب اردو زبان کے علم و ادب میں ایک عمدہ تصنیف ہے اور اہل اسلام کو بہت پسندیدہ ہوگی اور دیگر اقوام میں بھی بہت رواج پکڑے گی۔"[1]

میرا خیال ہے کہ ہندوستانی ادب کی اس وقت جو حالت ہے، اس کے پیش نظر انگریز طالب علموں کو بہترین اردو بولنا اور لکھنا سیکھنے کے لیے ہمارے مصنف کی مذکورہ دو کتابوں توبۃ النصوح اور مراۃ العروس سے بہتر اور کوئی کتاب نہیں ہو سکتی ان کا روزمرہ وہ خالص زبان ہے جو دہلی میں بولی جاتی ہے۔ ان کتابوں کی کہانیاں مسلمانوں کی مخصوص حالات اور ان کے عادات و اطوار کی مفید مثالوں سے بھری پڑی ہیں اس لحاظ سے یہ دونوں کتابیں خاص طور پر ان انگریز حکام کے لیے مفید ثابت ہوں گی جنھیں شمالی ہند کے زنان خانوں میں آنے جانے کا اتفاق ہوتا ہے۔

مسٹر کیمپسن نے اس کتاب کا ترجمہ ایمان داری اور لیاقت کے ساتھ کیا ہے انھوں نے اصل طرز ادا اور مقامی محاوروں کو بڑی خوبی کے ساتھ انگریزی کے سانچے میں ڈھالا ہے اور مشرقی تصورات اور خیالات کو یورپی قاری کے لیے آسانی کے ساتھ قابل فہم بنا کر پیش کیا ہے۔ یہ کام اکثر اوقات بہت مشکل ہوتا ہے۔ بعض ابواب اور مکالمے کہا طور پر مختصر کر دیے گئے ہیں۔ یہ ابواب اور مکالمے اصل میں غیر ضروری طور پر بہت طویل ہیں۔

اس کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اسلام کے بہتر رجحانات کی ترجمانی کرتی ہے یہ رجحانات ہیں جن کی ہمت افزائی اور سرپرستی کی جانی چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کتاب کے قصے کا مذہبی رنگ اپنی آپ مثال ہے اور میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کے لیے یہ ایک بالکل ہی نئی چیز ہے۔ مسلمانوں کی لکھی ہوئی جو کتابیں میری نظر سے گزری ہیں یہ کتاب ان سے اسی لحاظ سے بالکل مختلف ہے مسلمانوں میں جو مذہبی کتابیں مقبول ہیں وہ مسلمہ طور پر خالصتاً رسمی ہیں اور ان میں صرف فرائض و واجبات اور دینی احکام ہی سے بحث کی گئی ہے۔ یہ خیال کہ مذہب کو ایک ہمہ گیر اثر ہونا چاہیے اور خاندان کو اسی کی رہنمائی میں اپنی گھریلو زندگی بسر کرنا چاہیے کسی مسلمان کی لکھی ہوئی کتاب کے لیے ایک نیا موضوع ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی مسلمان کو اس قسم کی کتاب لکھنے کا خیال صرف ایسے ہی ملک میں آ سکتا ہے جو نصرانیت کے مذہبی تصورات سے متاثر ہوا ہو۔ ایسے ملکوں میں ایک ملک ہندوستان بھی ہے جہاں یہ اثرات ... کے ساتھ دیکھے اور محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اس حقیقت کو ہندوستان میں ہماری مذہبی تبلیغ کا ایک ہمت افزا اثر سمجھنا چاہیے۔ یہ واقعہ اور بھی قابل لحاظ ہے کہ نذیر احمد صاحب نے جب یہ کتاب لکھی ہے تو وہ انگریزی ادب سے قریب قریب ناواقف ہی تھے اسی طرح انھوں نے انگریزی ادب کا اثر بالکلیہ بالواسطہ قبول کیا ہے۔ بعض لحاظ سے یہ اثر اور بھی قابل قدر ہے کہ یہ بالواسطہ قبول کیا گیا ہے کتاب کا نقشہ کسی انگریزی کتاب کا چربہ نہیں۔ لیکن اس کے انگریزی خیالات اور تصورات کے حقیقی پیداوار ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

ان تمام امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نہایت اطمینان کے ساتھ مسٹر کیمپسن کے ترجمہ کو ان تمام حضرات کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جنھیں ہندوستان سے دلچسپی ہے۔ میں ان کے اس خیال کی بھی حمایت کرتا ہوں کہ ہندوستانی سیکھنے اور ہندوستانی میں مہارت کے امتحانوں کے لیے اصل کتاب بطور نصابی کتاب کے استعمال کی جانی چاہیے۔

---

[1] مسٹر میتھیو کیمپسن نے کتاب توبۃ النصوح پر انعام عطا کرنے کے لیے جو مراسلہ حکومت کو لکھا تھا اور حکومت نے اس کا جو جواب دیا تھا مولانا نذیر احمد نے ان دونوں مراسلوں کا ترجمہ کر کے توبۃ النصوح کے بعد کے اڈیشنوں کے ساتھ "تقریظ" کا عنوان دے کر چھاپا تھا۔ مولانا کا یہی ترجمہ منشی نولکشور لکھنؤ کے چھاپے ہوئے توبۃ النصوح کے بارھویں اڈیشن (دسمبر ۱۹۱۴ء) سے یہاں نقل کر دیا گیا ہے۔

ولیم میور ۱۸۸۴ء

اب جناب تھیوکیمپن صاحب کے کیے ہوئے توبۃ النصوح کے انگریزی ترجمے کی طرف آیئے۔ یہ ترجمہ چھوٹی تختی کے کل ایک سو اٹھارہ صفحات میں آیا ہے مترجم نے اس کتاب کا لفظی ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ بڑی حد تک یہ آزاد ترجمہ ہے اگر آزاد ترجمہ نہ ہوتا تو یقیناً اتنے کم صفحات میں یہ ضخیم کتاب نہ سماتی۔ مولانا نذیر احمد نے اس کتاب میں وقت بے وقت نصیحتوں کا جو پٹارا کھولا ہے وہ بجائے خود بالکل درست و بجا ہونے ہوئے بھی اکثر مقامات پر قصہ کی دلچسپی میں بہت حائل و مانع ہوتا ہے۔ یہ مواعظ کافی اکتا دینے والے ہیں۔ کیمپسن نے ان مواعظ کو اکثر جگہ حذف کر دیا ہے یا پھر مختصر الفاظ میں ان کا خلاصہ لکھ دیا ہے۔ اس سے قصہ کی روانی میں اضافہ ہو گیا ہے اور قاری کی دلچسپی آخر تک برقرار رہتی ہے۔ اس طرح ناول کی حیثیت سے کتاب زیادہ پرلطف ہو گئی ہے۔ مولانا نے اس کتاب میں ۱۲ باب قایم کیے تھے اور ان پر بڑے لمبے لمبے عنوان لگائے تھے۔ کیمپسن نے اپنے انگریزی ترجمے میں قصہ کے ابواب کی تقسیم میں بھی تھوڑی بہت تبدیلی کی ہے اور بارہ کی جگہ تیرہ باب قایم کیے ہیں۔ ابواب کے طویل طویل عنوانوں کی جگہ بہت مختصر عنوان دیئے ہیں۔ کہیں کہیں ہندوستانی رسوم سے متعلق مختصر حواشی بھی ثبت کیے ہیں۔

آج کل اردو ادب کے شاہکاروں کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ توبۃ النصوح کا یہ انگریزی ترجمہ کمیاب ہی نہیں نایاب ہے اور اس قابل ہے کہ تھوڑی سی نظر ثانی کے بعد اسے دوبارہ شایع کیا جائے۔ جب کبھی بھی توبۃ النصوح یا مولانا کی دوسری کتابیں کو انگریزی یا دوسری زبانوں میں پیش کرنے کی نوبت آئے کیمپسن صاحب کا آج سے لگ بھگ اسی سال پہلے کا کیا ہوا یہ انگریزی ترجمہ یقیناً ایک رہنما کا کام دے گا۔

"حل التضاد فی تواریخ سیرۃ خیر العباد" (بقیہ ص ۱۳)

اسی رجسٹر سے انتخاب کیے جاتے تھے۔

غالباً اس رجسٹر کی ضخامت چند ہی سال میں ہزاروں صفحات پر پہنچ گئی ہوگی، کیونکہ اسلام کی روز افزوں تحریک نے بہت جلد باز و پھیلانا شروع کر دیئے تھے۔ اور قبائل جوق جوق داخل اسلام ہو رہے تھے۔ گمان غالب یہ ہے کہ اس دیوان سے صرف اس قدر افراد کے نام قلمزد کیے جاتے ہوں گے، جو مر جاتے یا مرتد ہوتے! لیکن ظاہر ہے کہ یہ تعداد نو مسلمین کے مقابلے میں تھی ہی کیا۔

تاریخی نقطۂ نظر سے اس عمومی رجسٹر کے مقابلے میں وہ چھوٹے رجسٹر زیادہ اہم اور مفید تاریخ معلوم ہوتے ہیں۔ جو غزوات و سرایا کے ذیل میں مرتب ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ ان سے شرکائے جنگ اور مقتولین و مجروحین کی ٹھیک ٹھیک تعداد کا اندازہ ممکن تھا! اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ دونوں قسم کے رجسٹر عہد رسالت کے بعد بھی کچھ عرصہ محفوظ رہے تو ظاہر ہے تاریخ کا یہ بہت بڑا سرمایہ تھے جو ابتدائی مدونین اور رواۃ سیرۃ کی نظر سے گزر سکتا تھا۔

میں آئندہ فصل میں اس کی افادیت کو دوبارہ پیش کروں گا۔

نامۂ مومن

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

فارسی ادب میں ایک مدت تک سہ نثر ظہوری، مینا بازار اور پنج رقعہ کا سکہ چلتا رہا ہے۔ اور اسی انداز کو معیاری مقام حاصل تھا مومن کے فارسی انشا کا بھی یہی انداز رہا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کا وہ مرتبہ نہیں جو ظہوری کا ہے مگر ان کے انداز بیان نے ظہوری سے قربت ضرور حاصل کر لی ہے۔ اس وقت مومن کے فارسی انشا سے بحث مقصود نہیں۔ صرف چند باتیں اس خط کے متعلق عرض کرنا ہیں۔ تاکہ اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے۔ ادبیات کے حسن و قبح کا فیصلہ ذوق و وجدان پر ہوتا ہے۔ مگر اس دور میں فارسی کا سمجھنا چہ جائیکہ مومن کی فارسی کو سمجھنا مشکل ہے۔ یہی جذبہ تھا جس نے مجھے مومن کے خطوط کا ترجمہ کرنے کی طرف متوجہ کیا یہ خط اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

خط مذکور انشائے مومن کا ستائیسواں خط ہے۔[1] جو انھوں نے ایک مطربہ کے نازبے جا کی شکایت میں لکھا ہے۔ اس خط کا جو عنوان حکیم احسن اللہ خاں (مرتب انشائے مومن) نے تحریر کیا ہے وہ یہ ہے: "نامۂ لبریز گلۂ ناز بے جا۔ بنام مطربہ ماہ جبینے زہرا نوا" یہ خط کئی اعتبار سے دلچسپ اور اہم ہے۔

۱۔ یہ خط مومن کی حیات معاشقہ سے متعلق ہے اور ان کی جوانی کی رنگ رلیوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اگرچہ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس "ماہ جبیں" کا نام کیا تھا۔

۲۔ اس میں ایک حسین ڈومنی کے نازبے جا کی شکایت کی ہے اور بڑے مزے کی چٹکیاں لی ہیں جس میں مومن کا طنز اپنے پورے نکھار پر نظر آتا ہے۔

۳۔ تحریر میں بے حد رنگینی ہے اور اس رنگینی کے باوجود بے ساختگی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ مقفیٰ عبارتوں، برجستہ اشعار اور دلچسپ تشبیہات نے اور بھی زور پیدا کر دیا ہے۔

۴۔ حسب عادت مومن نے اپنے اس خط میں بھی "انا" اور "خودداری" کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔

مومن کی حیات معاشقہ کے سلسلے میں صرف "صاحب جی" کا نام ملتا ہے اگرچہ مومن نے اپنے چھ عشقوں کی داستان اپنی مثنویات میں لکھی ہیں۔ اور ان مثنویوں کو پڑھنے کے بعد بھی یہ پتہ نہ چل سکا کہ اس خط کا مکتوب الیہ ان محبوباؤں میں کون ہے۔ محض "صاحب جی" کا نام معلوم ہونے کی صورت میں ہر مثنوی اور ہر عشقیہ خط کو ان سے منسوب کر دینا مضحکہ خیز ہے۔ اس خط میں محبوبہ کے نازبے جا کی شکایت ہے اور اس کی جفاؤں کا شکوہ جو ان کی تقریباً ہر مثنوی کا بھی موضوع ہے۔ افسوس ہے کہ اس خط کی تاریخ کا تعین بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کاش حکیم احسن اللہ خاں نے جہاں اس کی ترتیب کا احسان کیا ہے وہاں تاریخ یا سنین کا بھی حوالہ دیتے۔

مومن کی جوانی عشق اور حسینوں کی چھیڑ چھاڑ میں گزری۔ اس لیے ان کے کلام میں بھی یہی انداز موجود ہے اور ان کے خطوط میں بھی بلکہ یہ رومانی کیفیت ان پر اس قدر حاوی ہے کہ جب وہ اپنی پھوپی (والدہ حکیم احسن اللہ) کو بھی خط لکھتے ہیں تو اس میں رنگین اور رومانی تشبیہات اور استعاروں کا سہارا لیتے ہیں غرض یہ کہ ان کا موضوع سخن جہاں حسینوں سے ہوگا وہاں شوخی بھی ہوگی اور طنز بھی۔ یہ طنز خواہ مقصد برآری کے لیے ہو یا دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے۔ مگر یہ ملحوظ خاطر رہے کہ شوخی اور طنز کا اظہار اعلیٰ ذہانت کے بغیر ممکن نہیں۔ چند فقرے قابل غور ہیں۔

"ایسی جلاد کہ بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگتی ہے اور حنا سمجھتی ہے؟

"ایسی صیاد کہ اگر مرغ بام حرم اس کے جال میں آئے تو ہلاک کیے بغیر نہ چھوڑے!

"ایسی سخت گیر کہ فرہاد اور اس کی کوہ کنی کے قصے کو مٹی ڈھونے کی محنت قرار دیتی ہے"۔[2]

---

[1] ملاحظہ ہو انشائے مومن مخزونہ ہارڈنگ لائبریری دہلی۔

[2] جلادے کہ دست بخون بے گناہ آلاید و حنا پندارد و صیادے کہ اگر طائر بام حرم بدامش آید بے کشتن نگزارد، سخت گیرے کہ قصۂ فرہاد و بے ستون بہ بحثیٔ گل بر گرفتن گیرد۔

مومن کی نثر میں شوخی کے ساتھ وہ تمام خوبیاں بھی موجود ہیں جو نثرِ مرصع کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ چوں کہ یہ انداز ان کا اپنا مزاج ہے اس لیے اس میں کسی قسم کا تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ اس خط میں بیشتر رعایتوں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ آخر میں نہ صرف قافیہ کا اہتمام کیا گیا ہے بلکہ اس میں صنعتِ تجنیس اور ایہام تناسب کی مثالیں بھی موجود ہیں[1]۔ نئی نئی تشبیہات سے خط کو اور بھی رنگین بنا دیا ہے۔

آخر میں ایک امر کی طرف خاص طور سے اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ اگرچہ یہ خط انھوں نے ایک محبوبہ کے نام لکھا ہے اور بارگاہِ حسن میں اپنی خودداری کا اظہار تو بڑی چیز ہے اپنے وجود کا تصور بھی محال ہے۔ اس خط میں جذبۂ خود نگہداری بھی موجود ہے۔ حوالہ جات ذیل سے نہ صرف ان کی سیرت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ذہنی تجزیہ کرنے میں بھی سہولت ہوگی۔

"میں عاشق معشوق مزاج ہوں اور باوجود نیازمندی کے بے احتیاج"

"اگر میرا مدعا بے نتیجہ ثابت ہو تو میں سرے سے اس مدعا ہی کو چھوڑ دیتا ہوں"

"عاشق وفا شعار ہوں لیکن غیرت مند"

"میری بلبل ہر باغ میں نغمہ سرائی نہیں کرتی اور میری طوطی ہر شکر لب کے سامنے منقار نہیں کھولتی"[2]

موجودہ طبائع ممکن ہے کہ اس انداز کو نہ پسند کریں اور اس کے مقابلے میں سادگی اور اختصار کو ترجیح دیں مگر انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر چیز کو اس کے ماحول میں دیکھیں۔

ایک مطربہ کے نام

(ناز بے جا کی شکایت میں)

اے خامۂ فریاد نوا و بلبل کی طرح نالے کر کہ ایک گل گوش، غنچہ دہن تیری آواز پر کان لگائے ہے۔ اے نامۂ خونیں تحریر لالے کی خوشی سے پھول جا کہ ایک رنگین ادا کے دستِ نگاریں میں تیری جگہ ہے۔ اے دلِ بے قرار مدد کر کہ ایک تغافل شعار نے تیرا حال پوچھا ہے۔ اے دردِ جاں فرسا رحم کر کہ ایک عیسیٰ لب میری بے چارگی کے علاج پر متوجہ ہوا ہے۔ اے نازک معانی یہ نوازش کا وقت ہے کہ ایک نازک دماغ نے پرسشِ حال کی ہے مگر میں اس کے دردِ سر سے ڈرتا ہوں اے مضامینِ لطیف دل سے زبان تک آنے کا ذریعہ ہے کہ لطیف مزاج میرے ملال کی چارہ جوئی پر آمادہ ہے مگر سخت کلامی کی سزا جانتا ہوں۔ اے میرے شب کی تیرگی میری سیاہی کے کام آ میں ایک ماہ رخسار کو دو حرف لکھنے والا ہوں اور اے میرے نصیب کی ظلمت مجھ سیہ کار کے خط کی تحریر میں مدد دے کہ میں ایک مہر لقا سے شامِ ہجر کی شکایت کرنے والا ہوں۔ اے دیدۂ خوں بار اشکوں میں جگر کے ٹکڑے گرا اس واسطے کہ میں لوحِ خط کی سرخی کے لیے حیران ہوں۔ اے زردیٔ رخسار میرے آنسوؤں میں شامل ہو جا اس واسطے کہ مکتوب کی زر افشانی کی اور کوئی تدبیر نظر نہیں آتی۔ اے دودِ جگر میرے نامہ کی سطروں کا پیچ و خم بن جا، زلفِ پرخم کی حسرت حوصلہ فرسا ہے۔ اے شعلۂ پر شرر مدد کر، مضامینِ غم کی گرمیٔ ہنگامہ کا وقت ہے۔

---

[1] اے خامۂ نظلم صریر بلبل آسا بناں، گل گوش غنچہ دہانے بر صدائے تست دل اے نامۂ خونیں تحریر چوں شقایق بر خود ببال نگاریں دستِ رنگیں ادا جائے تو۔ "صریر" اور "تحریر"، "خامہ" اور "نامہ"، "ببال" اور "بنال" یہ الفاظ ہم قافیہ ہیں۔ اس کے علاوہ "خامہ" "نامہ" "بنال اور "ببال" میں صنعتِ تجنیس ہے۔ آگے بڑھ کر مومن نے ایہام تناسب سے کام لیا ہے۔ "بلبل" کی رعایت سے "صریر" کا لفظ لانا کہیں کہیں چار چار فقرے آئے ہیں۔ اور ہر فقرہ اپنے متقابل فقرے کے قافیہ سے ہم آہنگ ہے۔

[2] عاشق معشوقانہ مزاجم و باصد نیازمندی با بے احتیاج۔ مدعایم اگر دل بہ بے حاصلی نہد آں مدعا ہی گزارم .... عاشق و فا شعارم اما غیرت مند .... بلبلم در ہر گلشن نغمہ نسراید و طوطیم بر ہر شکر لبے منقار نکشاید۔

رباعیات:-

اے لب! افسانۂ تمنا کی کچھ بات سنا
اے نالے! شوق حوصلہ فرسا کا کچھ ذکر کر
اے شخص! اس نے آج وفا کی حکایت پوچھی ہے
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہماری داستان کا کچھ ذکر سننا چاہتا ہے۔

میں دیوانہ ہوں اور اس کے ساتھ اپنی دور اندیشی پر خوش ہوں۔
ایسے دیوانہ پر سو عقلیں قربان
اپنے خط کو کبھی چومتا ہوں، کبھی دل پر رکھتا ہوں۔
جانتا ہوں کہ یہ محبوب کے ہاتھ میں جائے گا۔

اے زبان ہرزہ درا، بے ہودہ نالے نہ کر کیوں کہ ایک شوخ جفا شعار مخاطب ہے۔ اے نطق پریشاں نوا بے باکانہ فریاد نہ کر کیوں کہ ایک سخن ناشنو ظالم سے کام پڑا ہے۔

رباعی:-

ایسا شوخ جس نے کسی سے وفا نہ کی اور نہ کرے
جس نے کسی کی مشکل گرہ نہ کھولی ہے اور نہ کھولے
بے کار نالے کرنا کس لیے۔ میں جانتا ہوں
کہ ہمارے حال پر اس نے رحم نہ کیا اور نہ کرے

اے اثر! میری دادرسی کر میں ایک ظالم کے ہاتھ سے گرم فریاد ہوں۔ اے آسمان میری مراد کے مطابق گردش کر کہ میں ایک زہرہ جبیں کے سر کے گرد پھرنے سے محروم ہوں۔ اے آہ نارسا! یہ بے سرا پن کیوں ہے۔ اے شور فریاد کیا تجھے معلوم نہیں کہ تیرا روئے سخن کس کی طرف ہے (اس کی طرف ہے) جس کی ناہید نوائی دلوں پر اثر کرنے والی اور سرود سرائی محل افتخار۔ باربد کا ترانہ اس کی شیریں ادائی پر قربان اور حضرت داؤد کا نغمہ اس کے انداز کا دعا گو۔ اس کے کلام شیریں کی حسرت میں طوطی شیریں گفتار تلخ کام ہے اور اس کے سخن رنگین کے رشک میں باغ کا افسانہ بلبل کے لب سے ناتمام ہے۔ اس کی گوش آشنا آواز کی نرمی کے مقابل پھولوں کے کھلنے کی آواز خزاں کے پتوں کے شور سے مشابہ ہے اور اس کی طرب فزا گفتار کی نزاکت کے سامنے بانسری کا نغمہ کسی ماتم رسیدہ کے گلے کی فریاد کی مانند ہے۔

مثنوی:

اس کا لعل لب موتی برسانے میں
رخ معانی کے لیے آب و رنگ کا حکم رکھتا ہے
اس کے رنگین ہونٹ یاقوت کی تحریر ہیں
اس کے انفاس سحر ہاروت کا کام کرتے ہیں۔
اس کے انفاس کا افسانہ اعجاز سے کم نہیں
حضرت مسیح بھی اس کے غم میں جان دیتے ہیں
اس کے مژگاں کی تلوار مشتاقوں کی آہ کی طرح کاری ہے
اس کی چشم سیاہ عاشقوں کے نصیب کی طرح کالی ہے
اس کی نگاہیں دلبری میں سحر کرتی ہیں
اس نے جادوگری کو قصۂ ماضی بنا دیا ہے

اس کی پیشانی آئینہ تمثال ہے
صبح کی پیشانی اس کے روبرو سربسجود ہے
اس کا رخسار اپنے دل افروز جمال سے
آفتاب کے جگر کا داغ (باعث رشک) ہے
قیامت اس کے قامت کے گرد پھرتی ہے
سو طرح کی بلائیں اس کے قد پر قربان ہوتی ہیں
جب وہ جلوہ دکھاتی ہے تو ستم ڈھاتی ہے
جب وہ اٹھتی ہے تو فتنے اٹھاتی ہے
اس کی جلوہ گاہ کا غبار سراپا آشوب ہے
صحرائے قیامت اس کی گزرگاہ ہے
اس کے زلف کی حکایت بہت دراز ہے
یہ سمجھو کہ وہ میری شب ہجر کی ترجمان ہے
اس کے گیسوؤں کا ہر بال اپنے پیچ و خم سے
دانا اور ناداں سب کے دلوں کے لئے جال کا کام دیتا ہے
نزاکت کے باوجود اس کی طبیعت
سنگ دلی کا بار اٹھاتی ہے
اس عادت میں سمن زار کی سی لطافت ہے
اس کی گلی میں چمن زار کی سی طراوت ہے
اس کا ہر غمزہ عاشقوں پر نظر رکھتا ہے
اس کا ہر عشوہ مشتاقوں کا آرزو مند ہے
اس کا شیوہ دل ستانی
لوگوں کو لطف و مہربانی کے ساتھ زندگی بخشتا ہے

ارے میں نے کیا کہا۔ طریقۂ دل ستانی اور شیوہ مہربانی کا کیا ذکر وہ تو ایسی بے مہر ہے کہ دل بھی جبر سے چھینتی ہے۔ جفا اس کی طبیعت سے اتنی قریب ہے کہ فریاد بھی زبان مظلوم سے اس قدر قریب نہ ہوگی اور رحم اس کے دل سے اتنا دور ہے کہ ہنسی بھی غم رسیدہ کے منہ سے اس قدر دور نہ ہوگی۔ وہ ایسی خوں خوار ہے کہ میری چشم خوں فشاں کی طرح عاشقوں کا خون گراتی ہے اور ایسی ظالم جس کی گلی سے فتنۂ عرصۂ محشر کا غبار لے کر اٹھتا ہے۔ ایسی جلاد کہ بیگناہوں کے خون سے ہاتھ سے رنگتی ہے اور حنا سمجھتی ہے۔ ایسی صیاد کہ اگر مرغ بام حرم اس کے جال میں آئے تو ہلاک کیے بغیر نہ چھوڑے۔ ایسی سخت گیر کہ فرہاد اور اس کی کوہ کنی کے قصے کو مٹی ڈھونے کی محنت قرار دیتی ہے اور ایسی بدعہد کہ شیریں اور شیرویہ کے وعدے کو وفا شعاروں کی درستی عہد ٹھہراتی ہے۔ ایسی بے درد کہ مظلوموں کے نالوں پر ہنستی ہے۔ ایسی بے رحم کہ پروانہ کی بالیں پر شمع کا رونا پسند نہیں کرتی۔ ایسی غلط اندیش کہ محتسب کو قتل کرنے کے لیے مستی کا بہانہ بناتی ہے اور ایسی کافر کیش کہ بادہ گلگوں کا مزا لے لے کر مومن کا خون پیتی ہے۔ ایسی زود خشم کہ کسی کو سزا دیتے وقت اتمام حجت کی تاخیر اس کو درازی روز جزا نظر آتی ہے۔ ایسی سیاہ چشم کہ شب ہائے فراق کی سیاہی اس کی نگاہ میں نہیں جچتی۔ ایسی بے وفا کہ عہد باندھنے ہی کو ایفائے عہد سمجھتی ہے اور ایسی صبر آزما کہ عاشق کے دم واپسیں کو آغاز امتحان ٹھہراتی ہے۔

رباعی :

ایسی شوخ جس کی جفائیں نہیں اٹھائی جا سکتیں
ایک دن بھی اُن سے مرادِ دل حاصل نہیں ہو سکتی
اگر اس نے میرا سرتن سے قطع کیا تو مشکل نہیں
مشکل تو یہ ہے کہ اس سے قطع محبت نہیں کر سکتے۔

اے کافر بے وفا۔ اے غیروں سے محبت کرنے والی۔ اے ناشکر، انصاف دشمن، اے حق ناشناس، سخن ناشنو، اے درشتی پسند، سست عہد۔ اے وفا نہ ہونے والے وعدوں پر بھی پشیمان، اے ستم شعار، آسمان کو ستم سکھانے والی۔ اے گردش روزگار کی استاد۔ اے سفلہ پرور، رقیب نواز۔ اے لطف خدائے بے نیاز سے بے نیاز۔ اے نامرادوں کے خرمن کو جلانے والی برق۔ اے دلوں کے جگر کو پگھلانے والے شعلے، اے قیامت کی پرسش سے بے پروا رہنے والی۔ اے قتل مومن بے گناہ پر کمر باندھنے والی۔ اے اہل عزت کی ذلت چاہنے والی۔ اے بے تمیزوں کے دام میں اسیر۔ اے غرور سے تیوری چڑھائے ہوئے۔ اے بے پروائی سے میرے حال تباہ سے بے خبر اٹھائے ہوئے۔ اے وہ جس نے عمر بھر ظلم سے میرا امتحان لیا۔ اے وہ جس نے مدتوں میری مہر و وفا کو آزمایا۔ اے مہربانیوں پر نامہربانی کرنے والی اے وہ کہ سوغم و ملال کے باوجود میرے سر میں تیرا سودا ہے اور میری ناتواں، نیم جاں تجھ پر فدا ہے۔ آخر کب تک میں آتش فراق میں جلوں اور درد تنہائی سے تباہ کروں۔

شعر :

تیری جفا اور میری وفا دونوں حد سے گذر گئیں
تجھ کو اپنے سے اور مجھے خود سے شرم آنی چاہیے

وصل کی شب نے جو ایک گھڑی سے زیادہ نہ تھی۔ مجھے یہ دن دکھایا............ جب سے تو نے میرا ہاتھ تھاما، کبھی میں اس کو آنکھوں پر رکھتا ہوں، اور کبھی سر پر اور جب سے تو نے اپنی انگوٹھی ہاتھ سے میری انگلی میں پہنائی، کبھی انگلی کو بوسہ دیتا ہوں اور کبھی انگوٹھی کو۔ وہ محبت کی باتیں کیا ہوئیں اور وہ وفا کا ذکر کہاں گیا۔ راستی بزا جھوٹی قسمیں چھوڑ اور وعدہ ہائے تسلی آمیز یاد رکھ۔ آخر روز جزا آنے والا ہے۔ خدا دندے ہمتا کا سامنا ہونے والا ہے۔ خدا اس دن سے بچائے کہ میں تیرا دامن پکڑوں اور دل کے ٹکڑے داور محشر کے سامنے پیش کروں۔ اپنے نالہ ہائے قیامت گداز سے ایک نئی قیامت برپا کروں اور شعلہ ہائے عالم سوز سے اہل جنت کو دوزخ میں ڈال دوں۔ میری آہوں کے شعلے فرشتوں کے بال و پر تک جلا دیں اور سدرہ و طوبیٰ کی شاخیں آتش پرستوں کے ہاتھ پاؤں کی طرح بھڑک اٹھیں۔ میں ایسی فریاد کروں جن کے شعلوں کی گرمی کوثر کو آب گرم اور خلد بریں کو جہنم بنادے۔ سچ ہے۔

شعر :

اگر ایک دن جدائی کی آگ دوزخ پر مسلط ہو
تو یقیناً اس کے شعلے پگھل کر رہ جائیں

نہیں نہیں کہاں میں اور کہاں یہ بے مروتی۔ لیکن "یوم تبلی السرائر فما لہ من قوۃ ولا ناصر"[1] کے مفہوم سے ڈرتا ہوں اور دل میں "من یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ"[2] کی فکر سے دو نیم ہے۔

بیت :

میں نامراد تیرے مظالم سے کیوں کر نبھاؤں
میں نہیں کہتا کہ تو نے کیا کیا تو ہی بتا کہ میں کیا کروں

میرا غبار خاطر تیرے قدموں کے آزار کی ہوا سے اڑ جائے گا۔ میرے دل کی کدورت تیرے قدوم صفا لزوم سے پامال ہو جائے گی۔ اگرچہ میں شیشۂ شراب کی طرح صاف طینت ہوں لیکن ساقی کی دستگیری کے بغیر سر جھکانے والا نہیں۔ میں صیقل شدہ شمشیر ہوں اور چلّے تک کھنچا ہوا تیر۔ جب تک تو مجھے سر پر نہ رکھے گی، میں اپنے ناخن کو تیری عقدہ کشائی کی زحمت نہ دوں گا۔ اور اگر تو مجھے خشکی سے چھوڑے گی تو پھر تیرے ہاتھ نہ آؤں گا۔ میں عاشق معشوق مزاج ہوں اور باوجود نیاز مندی کے بے احتیاج۔ اگر میرا مدعا بے نتیجہ ثابت ہو تو میں سرے سے اس مدعا کو چھوڑ بیٹھتا ہوں اور اگر میری تمنا حاصل نہیں ہوتی تو اس تمنا ہی سے دست بردار

---

[1] جس دن لوگوں کے دلوں کے بھید جانچے جائیں گے تو انسان کے پاس نہ کوئی قوت ہوگی اور نہ مددگار

[2] جو کوئی ذرہ کے برابر بدی کرے گا اس کو دیکھ لے گا۔

ہو جاتا ہوں۔ میں عاشق وفا شعار ہوں لیکن غیرت مند اور بندہ حق گذار ہوں لیکن خود دار۔ پسند میری بلبل ہر باغ میں نغمہ سرائی نہیں کرتی اور میری طوطی ہر شکایہ کے سامنے منقار نہیں کھولتی۔ میرا پروانہ ہر شمع رخسار کے گرد نہیں گھومتا اور میرا دیوانہ ہر پری جمال کا مجنوں نہیں ہوتا۔ طور کو جلانے والی آگ سے میں بے خود ہو کر گرتا ہوں تاکہ بال و پر کے جلنے کا عذاب نہ دیکھوں .... میرا یوسف زلیخا کا غلام نہیں ہوتا کہ وہ اس کو زندان بلا میں ڈال دے اور میرا فرہاد دشت شیریں کی تلخی نہیں سہتا کہ وہ (شیریں) اپنے لب شیریں پرویز کے لیے وقف کر دے۔ میں حلقہ زنجیر ہوں جس کے پاؤں پر پڑا وہ اٹھا میرا گرفتار (گرفتار محبت) ہو گیا۔ میں رنگ حنا ہوں جس کے ہاتھ کو میں نے بوسہ دیا اس نے دوسروں کے قتل پر تلوار کھینچی۔ میں پایہ منبر ہوں جس کے پاؤں پر سر رکھوں وہ اپنی جبین نیاز میرے قدموں سے گھسے اور اور میں خطا پر کار ہوں اسی کے گرد پھروں جو میرے آغوش میں آئے۔

رباعیات:

مومن مجھے تو بت پرستی سے روکتا ہے
مگر خود خدا کی بندگی کیوں نہیں چھوڑتا
یوسف نے زلیخا کی خدمت کا حق نہ پہچانا
میں اس کا غلام ہوں جو مجھے اپنا آقا سمجھے

وہ شوخ جو خدائی کے دعوے کرتا ہے
اور کبریائی کی سینکڑوں شیخیاں مارتا ہے
مومن کی محرومی گوارا نہ کرے گا۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں
کہ خدا عقدہ کشائی کی شان رکھتا ہے

جب تک فتنہ روز قیامت نہ اٹھے تیرا قد محشر خرام جلوہ نمائی کرتا رہے۔ اور جب تک شور محشر ہنگامہ برپا نہ کرے تیری رفتار فتنہ انگیز ہنگامے اٹھاتی رہے۔

قطعہ:

جب تک عاشق کی شب ہجر کی درازی کے افسانے رہیں
تیری عمر تیری زلف مشکیں کی طرح دراز ہو
تو گرم صحبت رہے اور شمع محفل کی طرح
حاسد کی جان آتش غم سے پگھلتی رہے
میں تیرے ساتھ ہم کلام ہوں اور رقیب حسد سے گرم فریاد
میں تیرا ہم نشیں ہوں اور دشمن مارا مارا پھرے
میں کامیاب وصل ہو جاؤں اور غیر ناکامی کے باعث
مرنے کا امیدوار ہو
میں خدائے کارساز کی مہربانی کا شکریہ ادا کروں
اور وہ رقیب چرخ حیلہ ساز کی طرح شکایت کرتا رہے

غلام ربانی تاباں

کسے دوام کی فرصت یہاں خضر کی طرح — تپش کی زیست یہی ایک پل شرر کی طرح
طلب کی راہ سے گزرے ہیں یوں بھی دیوانے — زمانہ ساتھ چلا گردِ رہ گزر کی طرح
گلوں کو چاک گریبانیاں مبارک ہوں — نسیم آئی بہاروں کے نامہ بر کی طرح
کبھی گزر بھی گیا شوق حد تمکیں سے — کبھی چھلک بھی گیا جام چشمِ تر کی طرح
ہزار سادگی و صد ہزار پرکاری — نہ کوئی دوست نہ دشمن تری نظر کی طرح
جنوں وہ خام جو بن جائے انجمن کا چراغ — ہوا کی زد پہ رہو شمع رہ گزر کی طرح
وہ گفتگو کا سلیقہ بھی چاہیے تاباںؔ — کہ بات دل میں اتر جائے نیشتر کی طرح

امتیاز علی عرشی

شباب عمر دو روزہ کا اعتبار ہی کیا — چمک کے ساتھ جو بجھ جائے وہ شرار ہی کیا
نہ کر تو آمدِ فردا کا انتظار نہ کر — جو جا کے آ نہ سکے اس کا انتظار ہی کیا
اٹھ اور نگاہ کی خارا شگافیاں دکھلا — کہ جو علم نہ ہو وہ تیغِ آبدار ہی کیا
تلاش آہوئے رم خوردہ، اے خوشا لذت! — جو آپ دام میں آجائے وہ شکار ہی کیا
بہارِ دامن گلرنگ، اے لباسِ زینت! — جو خونِ دل نہ بہائے وہ دلفگار ہی کیا

سحر رامپوری

یاد آیا جہاں بھولے سے تمہارا دامن — وہیں بیساختہ آنکھوں نے پکارا دامن
ایسے کم ظرف کو مٹی ہی میں مل جانا تھا — اشکِ حسرت کو نہ دینا تھا سہارا دامن
میری وحشت سے کچھ اچھی نہیں چھیڑیں یعنی — ہے اسی چاک گریباں سے تمہارا دامن
لوٹ ہی لی تھیں گلستاں کی بہاریں میں نے — کہاں آ کر دلِ کج فہم پکارا دامن
فیصلہ ہوش و جنوں کا ہے بہار آنے دو — دیکھنا ہے، کہ کسے ہوتا ہے پیارا دامن
مسکراتی ہیں جو کلیاں تو اسی دامن میں — اور کانٹوں کے لیے ہے تو ہمارا دامن
اپنا افسانۂ غم اب نہ سنائے گا سحرؔ — اپنی آنکھوں سے ہٹائیں وہ خدارا دامن

غلام ربانی تاباں

تھکے ہیں لاکھ مسافر، سفر ہے کیا کیجے
ابھی وہی کششِ رہ گزر ہے کیا کیجے

جنوں پہ قیدِ مناسب بھی بہت گراں ہے مگر
جبیں نواز ترا سنگِ در ہے کیا کیجے

چمن میں کوئی نشیمن رہے رہے نہ رہے
بہار موسمِ رقصِ شرر ہے کیا کیجے

بڑا عجیب یہ آوارگی کا رشتہ ہے
غبارِ راہ سہی، ہمسفر ہے کیا کیجے

تمام عمر شکستوں سے دل کا کام رہا
خلوصِ شوق رقیبِ اثر ہے کیا کیجے

شکایتِ ستمِ روزگار لاحاصل
غمِ حیات سے کس کو مفر ہے کیا کیجے

ہنسے تھا عشق کی دیوانگی پہ کل تاباں
مگر وہ خود بھی تو آشفتہ سر ہے کیا کیجے

صبا اکبر آبادی

آگ بجھ گئی غم کی ہم ہنوز جلتے ہیں
دن بدل گئے لیکن دل نہیں بدلتے ہیں

وہ کہیں تو پہنچیں گے جو بہک کے چلتے ہیں
گمرہی سے بھی اکثر راستے نکلتے ہیں

وقت جب بدلتا ہے آدمی بدلتے ہیں
زندگی کے سانچوں میں انقلاب ڈھلتے ہیں

وہ عبور کر لیں گے قلزمِ مصا[illegible] ؟
روز جن سفینوں کے ناخدا بدلتے ہیں

ایک دن یہی شاید اس گلی میں لے جائے
دل جدھر چلے ہم بھی ساتھ ساتھ چلتے ہیں

وحشیوں کے رستے میں باغ ہو کہ جنگل ہو
پھول بھی کچلتے ہیں، خار بھی کچلتے ہیں

اتنی تیز رفتاری کیوں ہے سوئے میخانہ
اے صبا ذرا ٹھہرو ہم بھی ساتھ چلتے ہیں

انجم قریشی رامپوری

عالم تمام مطلعِ انوار ہو تو ہو
جلوہ بقدرِ وسعتِ ذوقِ نظر نہیں

محروم ہوں نشاطِ محبت سے کیا کہوں
ظالم کو پاسِ سوزشِ زخمِ جگر نہیں

انجم نے پھول اپنے نشیمن میں رکھ لیے
افسوس بجلیوں کو ابھی تک خبر نہیں

غالبیہ ——— تیسرا باب

اکبر علیخاں

اس عنوان کے تحت اس بار ایسی خبریں شریک کی جارہی ہیں جو غالب کی زندگی میں معاصر اخبارات کے صفحات پر جگہ پا چکی ہیں سوائے اردوئے معلیٰ اور عود ہندی کے اشتہارات کے جو غالب کی وفات کے صرف دو ماہ بعد شایع ہوئے تھے۔ زیر نظر خبروں کی تعداد یقیناً کم ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ بہت سی خبریں ہم تک نہیں پہنچ سکیں۔

مثال کے طور پر خود غالب نے اخبار لودھیانہ میں ایک خبر کی اشاعت کا ذکر کیا ہے جس میں ان کے درباری اعزاز کی تخفیف وترمیم کی اطلاع چھپی تھی۔

اخبار لودھیانہ میں میری نظر پڑی
تحریر ایک جس سے ہوا بندہ تلخ کام
سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک قلم
نمبر رہا نہ نذر نہ خلعت کا اہتمام

مگر اخبار لودھیانہ کے مذکورہ نمبر کا سراغ نہیں ملتا۔ اگر ہمارے پاس اُس عہد کے اخبارات و رسائل کی قابل لحاظ تعداد محفوظ ہوتی تو غالب اور معاصرین غالب کے بارے میں بڑے اچھے ذخیرے سے استفادہ کیا جا سکتا۔

بہر حال غالب کے معاصر اخباروں کے صفحات پر جو کچھ ملا ہے اسے ایک سلسلے میں پرو دیا گیا ہے۔

غالب کا اردو فارسی کلام بھی اخبارات میں چھپا کرتا تھا۔ مراسلات بھی شایع ہوتے تھے اور غالب کی بنز غالب سے چھیڑ چھاڑ بھی چلتی رہتی تھی۔ خبروں میں قاطع برہان کے ہنگامے، قمار بازی کے ذیل میں سزائے قید و بند کا ذکر، انگریزی حکومت سے تعلق اور دشاہ دہلی میں شرکت کا حال موجود ہے۔ جو غالب کی مقبولیت کا ایک ہلکا سا عکس ہے۔ یہ غالب کے مورخ کے لیے حسب مراد اور اطمینان بخش نہ سہی مفید اور کارآمد مواد کا درجہ ضرور رکھتا ہے۔

دہلی اردو اخبار ——— (۲۲؍اگست ۱۸۴۱ء)

قمار بازاں

سنا گیا کہ ان دونوں گزر قاسم خاں میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی قمار باز پکڑے گئے، مثل ہاشم خاں وغیرہ کے جو سابق بڑی علتوں میں دندہ تک سپرد ہوئے تھے۔ بڑا قمار ہوتا تھا لیکن بسبب رعب و کثرت عزدان کے یا کسی طرح سے کوئی تھانے دار دست انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ اب تھوڑے دن ہوئے یہ تھانیدار قوم سے سید اور بہت جری سنا جاتا ہے مقرر ہوا ہے .... یہ مرزا نوشہ ایک شاعر نامی رئیس زادہ نواب شمس الدین قاتل ولیم فریزر کے قرابت قریبہ میں سے ہے۔ یقین ہے کہ تھانیدار کے پاس بہت رئیسوں کی سعی و سفارش بھی آئی لیکن اس نے دیانت کو کام فرمایا سب کو گرفتار کیا۔ عدالت سے جرمانہ علی قدر مراتب ہوا۔ مرزا نوشہ پر سو روپیے، ادا نہ کریں تو چار مہینے قید۔ لیکن ان تھانیدار کی خدا خیر کرے۔ دیانت کو تو کام فرمایا انھوں نے لیکن اس علاقے میں بہت رشتے دار متمول اس رئیس کے ہیں۔ کچھ تعجب نہیں کہ وقت بے وقت چوٹ جھیٹ کریں اور یہ دیانت ان کی وبال جان ہو۔ بکام ایسے تھانیدار کو چاہیے کہ بہت عزیز رکھیں ایسا آدمی کمیاب ہوتا ہے۔

(ہندوستانی اخبار نویسی ص ۲۷۳)

اخبار مہر منیر کلکتہ ——— (۲؍ستمبر ۱۸۴۱ء)

از اخبار دہلی واضح شد کہ از مکان میرزا نوشہ، شاعر نامدار دہلی، یکی از عزیزان نواب شمس الدین خاں مرحوم، تنی چند مقامران نابکار کہ دلیل و نہار بجز قمار دیگر کار نداشتند، در حالت متاع ... با تھانیدار اسیر و گرفتار شدند و بر محکمہ حاکم حاضر گردیدند۔ حاکم نصفت شعار از شاعر یک صد روپیہ واز دیگران سی سی روپیہ جرمانہ گرفتہ آزاد فرمود۔

(ہندوستانی اخبار نویسی ص ۲۵۵)

احسن الاخبار بمبئی ——— (۲۰؍دسمبر ۱۸۴۴ء)

بتاریخ ۱۴؍ماہ اکتوبر میجر جان کرب اکبرآباد (آگرہ) سے دہلی وارد ہوئے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب نے رفاقت قدیم کے سبب سے مہمان داری اور استقبال کی رسومات کو شان و شوکت کے ساتھ انجام دیا۔ اور نواب ضیاء الدین خاں کے مکان میں جہاں پہلے ہی مہمانداری کا انتظام کیا گیا تھا ٹھیرایا دو دن کے بعد میجر صاحب بہادر نے ٹامس مٹکاف بہادر اور دیگر اشخاص سے ملاقات فرمائی۔ دہلی میں آپ کی خاطر مدارات بہت دھوم دھام سے ہوئی۔

(دہلی کا آخری سانس ص ۵)

احسن الاخبار بمبئی ——— (۱۹؍دسمبر ۱۸۴۵ء)

ماہ گزشتہ کی پندرہ اور سترہ تاریخ کو نواب گورنر جنرل بہادر نے ایک عظیم الشان دربار منعقد کیا۔ عمائدین رؤسا شرفا اور خاص خاص اصحاب شریک تھے۔ تمام اہل دربار کو ان کے مرتبے کے موافق انعام و اکرام دیا گیا .... ۱۷؍تاریخ کے دربار کی رپورٹ اور تقسیم انعام کی تفصیل حسب ذیل ہے:

دربار عام ہوا اور دور دور سے انگریزوں کو بلایا گیا بڑے بڑے صاحبان عالی شان تشریف فرما تھے۔ مجمع بہت بارونق تھا دو گھنٹے تک ملکی معاملات پر تقریریں ہوئیں اس کے بعد دو نئے آدمیوں نے نواب گورنر جنرل بہادر سے تعارف حاصل کیا محفل میں ہر شخص شاداں و فرحاں نظر آتا تھا۔ حاضرین میں سے ہر ایک کے بالخصوص حاکموں اور افسروں کے چہروں پر خوشی اور کامیابی کی سرخی جھلک رہی تھی اس کے بعد انعامات تقسیم کیے گئے۔

...... (۱۳) مرزا اسد اللہ خاں غالب کو خلعت ہفت پارچہ سہ رقم جواہر .... (۱۶) مولوی صدر الدین خاں بہادر صدر الصدور دہلی کو خلعت سہ پارچہ اور ایک گھنٹہ .... اس کے علاوہ مندرجہ ذیل حضرات کو اپنے دست مبارک سے ایک ایک شال مرحمت فرمایا۔ (۱) سید فیض الحسن صاحب کوتوال شہر ... اس موقع پر نذریں بھی پیش کی گئیں جو شکریے کے ساتھ قبول ہوئیں مولوی صدر الدین صاحب بہادر کے نذرانہ پیش کرتے وقت نواب گورنر جنرل بہادر نے کہا آپ لوگوں کی دیانتداری انصاف پسندی نیک نامی اور علم و فراست سے صاحب بہادر بہت مسرور اور رضامند ہیں۔ ۱۸؍تاریخ کو بدر الدین مہرکن نے زمرد کا ایک نگینہ جس پر نواب گورنر جنرل کا نام کھدا ہوا تھا تدر کے

طور پر پیش کیا۔ ان کو خلعت پنج پارچہ عطا کیا گیا۔

جس صورت سے موجودہ گورنر کے عہد میں ہر ایک کے ساتھ حسن سلوک اور اخلاق و عنایات کا برتاؤ کیا گیا اس سے پہلے ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ رعایا میں ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر ان کے عدل و داد کے تذکرے ہیں۔ ان کے عہد کی یہ خصوصیت ہے کہ انشا پردازوں، تحصیلداروں تک کو خلعت تقسیم کیا گیا (بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۲۷)

اخبار فوائد الناظرین۔ کلکتہ ——— (۳۱ مئی ۱۸۴۷ء)

۲۵ رمئی کو بیچ مکان جناب مرزا نوشہ اسد اللہ خاں صاحب کے قماربازی ہو رہی تھی۔ چنانچہ کوتوال صاحب خبر پاکر وہاں گئے اور جناب مرزا صاحب کو معہ چند قماربازوں کے گرفتار کر کے کوتوالی میں لے آئے۔ اب دیکھا چاہیے کہ صاحب مجسٹریٹ ان کے متعلق کیا حکم دیتے ہیں۔

(قدیم اخبارات کی کچھ جلدیں امتیاز علی عرشی نوائے ادب بمبئی اپریل ۵۸ء)

احسن الاخبار۔ بمبئی ——— (۲۵ جون ۱۸۴۷ء)

مرزا اسد اللہ خاں بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کی باعث قمار بازی کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ ... الدولہ بہادر کے نام سفارشی چٹھی لکھی گئی (یہ چٹھی بادشاہ نے لکھی تھی اس لیے کہ انھیں کی مصروفیات ... ربیع الثانی کے تحت یہ خبر آئی ہے) کہ ان کو رہا کر دیا جائے یہ معززین شہر میں سے ہیں یہ جو کچھ ہوا ہے محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے۔ عدالت فوجداری سے نواب صاحب کلاں بہادر نے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے ایسی حالت میں تا فیصلہ سفارش کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

(دہلی کا آخری سانس ص ۱۷۱)

احسن الاخبار۔ بمبئی ——— (۲ جولائی ۱۸۴۷ء)

میرزا اسد اللہ خاں غالب پر عدالت فوجداری میں جو مقدمہ دائر تھا اس کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ مرزا صاحب کو چھ مہینے کی قید بامشقت اور دو سو روپے جرمانہ کی سزا ہوئی۔ اگر دو سو روپیہ جرمانہ ادا نہ کریں تو چھ مہینے قید میں اور اضافہ ہو جائے گا اور مقررہ جرمانہ کے علاوہ اگر پچاس روپے زیادہ ادا کیے جائیں تو مشقت معاف ہو سکتی ہے۔ جب اس بات پر خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب عرصہ سے علیل رہتے ہیں۔ سوائے پرہیزی غذا قلیہ چپاتی کے اور کوئی چیز نہیں کھاتے تو کہنا پڑتا ہے کہ اتنی مصیبت اور مشقت کا برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اگر سیشن جج بہادر کی عدالت میں اپیل کی جائے اور اس مقدمے پر نظر ثانی ہو تو یقیناً یہ سزا منسوخ ہو جائے۔ بلکہ عدالت فوجداری سے مقدمہ اٹھا لیا جائے۔ یہ بات عدل و انصاف کے بالکل خلاف ہے کہ ایسے باکمال رئیس کو جس کی عزت و حشمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے معمولی سے جرم میں اتنی سخت سزا دی جائے جس سے جان جانے کا قوی احتمال ہے۔

(دہلی کا آخری سانس ص ۱۷۴ — ۱۷۵)

اسعد الاخبار آگرہ ——— (۱۲ مارچ ۱۸۴۹ء)

نقل اشتہار منظوم بسبب پنج آہنگ مصنفہ حضرت مرزا اسد اللہ خاں صاحب بہادر غالب۔ جو اپریل میں قیمت بھیجدے تین روپے اور جو بعد اس کے بھیجے گا چار روپے دینے پڑیں گے۔

مژدہ اے رہروان راہ سخن	بار سنجان دستگاہ سخن
طے کرو راہ شوق زود ا زود	آن پہنچی ہے منزل مقصود
پاس ہے اب سواد اعظم نثر	دیکھیے چل کے نظم عالم نثر
سب کو اس کا سواد ارزانی	چشم بینش ہو جس سے نورانی
یہ تو دیکھو کہ کیا نظر آیا	جلوۂ مدعا نظر آیا
ہاں یہی شاہراہ دہلی ہے	مطبع بادشاہ دہلی ہے
منطبع ہو رہی ہے پنج آہنگ	گل و ریحاں ولالہ رنگا رنگ

جو تیمور کے زمانے سے سلطنت سال تک مو ما مور کیا اور اس کے کاتبوں کے خرچ کو بالفعل پچاس روپیہ مشاہرہ مقرر کرکے آئندہ انواع پرورش کا متوقع کیا اور نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ خطاب دے کر چھ پارچے کا بیش بہا خلعت اور تین رقم جواہر عطا فرمائے۔ یقین ہے کہ تاریخ ایسی دل چسپ ہوگی کہ ہر ایک اس کے لطف عبارت سے فیضیاب ہوگا۔ (ہندوستانی اخبار نویسی ص ۲۸۸)

اسعد الاخبار آگرہ ——— (۲ ستمبر ۱۸۵۰ء)

تاریخ عطائے خطاب و خلعت، از حضور بادشاہ دہلی بہ جناب اسد اللہ خاں غالب

از روئے اخبارات کے ہر شہر و دیار میں مثل آفتاب روشن وظاہر ہو چکا ہے کہ شاہ دہلی نے جناب اسد اللہ خاں غالب کو، جو نظم و نثر میں استاد اکمل اور تمام کشور ہند میں لاثانی و بے بدل ہیں حضرت شاہ والا درگاہ نے بکمال اعزاز و اکرام اپنے حضور بلوا کر بہ عطائے خطاب خلعت معزز فرمایا اور کل سلاطین تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا جناب نغمہ نے ان کے خطاب و خلعت عطا ہونے کی تاریخ لکھی۔

سراج الدین بہادر شاہ غازی داد غالب را	عطا با تی کہ ہر ہر لفظ آں روشن تراز اختر
دبیر الملک نجم الدولہ و یک چند دیگر ہم	نظام اول بود، زاں بعد لفظ جنگ بے کسور
خطاب و خلعت شش پارچہ بخشید چو خلعت	فزودہ جیغہ و سرپیچ و مالای دُر و گوہر
بدیں توقیر دانستم کہ باشد خسرو دہلی	سخن فہم و سخن گو پرور دانا و دانشور
پی تحریر تاریخ خطاب و خلعت شاہی	بہ دریای تفکر غوطہ زد طبع سخن گستر
بہ ہنگامی کہ شد در غوطہ یابش برزمین نایم	بہ گوش نغمہ ہاتف گفت کای زندہ دلی در

بگو گر سال ایں پیش آمد اقبال می خواہی
یکی ساماں، دوم حشمت، سوم اعزاز چارم فر

(نشاط کار لاہور ص ۳۸ اپریل ۳۵ء)

سراج الاخبار دہلی ——— (یوم سہ شنبہ چہاردہم محرم (مطابق ۱۹ نومبر ۱۸۵۱ء)

چون بہ نسبت نجم الدولہ اسد اللہ خاں غالب تخلص، ہیچ کس غماز ...... سمت لامذہبی و مذہب امامی وانمودہ بود، بیتی چند بطور رباعی بکمال متانت و زرشی ادائی پیش بندگان قدسی اعلیٰ نمودند از جبلی پسند افتادگی ایای طبع فرمودند۔

رباعیات نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں غالب نظام جنگ

جن کو ہے مجھ سے عداوت گہری — کہتے ہیں وہ مجکو رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو جو کہ ہو وے صوفی — شیعہ کیونکر ہو ماوراء النہری

ایضاً

اصحاب کو جو کہ ناسزا کہتے ہیں — سمجھیں تو ذرا دل میں کہ کیا کہتے ہیں
سمجھا تھا نبی نے ان کو اپنا ہمدم — ہے، ہے نہ کہو کسے برا کہتے ہیں

ایضاً

یاران رسول یعنی اصحاب کبار — ہیں گرچہ بہت خلیفہ ان میں ہیں چار
ان چار میں ایک سے ہو جس کو انکار — غالب وہ مسلمان نہیں ہے زنہار

ایضاً

یاران نبی میں تھی لڑائی کس میں الفت کی نہ تھی جلوہ نمائی کس میں
وہ صدق وہ عدل وہ حیا وہ علم بتلاؤ کہ تھی برائی کس میں

ایضاً

یاران نبی سے رکھ تو لاگ باللہ ہر ایک ہے کمال دیں میں یکتا باللہ
وہ دوست نبی کے اور تم ان کے دشمن لاحول و لا قوۃ الا باللہ

(ہماری زبان ۱۵ اپریل ۶۲ء)

دہلی اردو اخبار ——— (۳۰ مارچ ۱۸۵۱ء)

قصیدہ جو کہ نواب محمد اسد اللہ خاں صاحب بہادر المتخلص بغالب نے مدح بندگان حضور والا میں نوروز کے دن پڑھا تھا اس ہفتے میں ہمارے پاس آگیا تھا۔ سو واسطے تفریح ناظرین اخبار کے درج ہوتا ہے:

خورشید به بیت الشرف خویش در آمد زانسان که شہنشاه به اورنگ برآمد

(نوائے ادب بمبئی۔ اپریل ۵۸ء)

دہلی اردو اخبار ——— (۱۱ مئی ۱۸۵۱ء)

اس ہفتہ میں ایک غزل جناب نواب اسد اللہ خاں صاحب بہادر المتخلص بغالب کی ہمارے ہاتھ آئی سو درج اخبار ہوئی:

کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے

(نسخہ عرشی حواشی ص ۳۶۳)

دہلی اردو اخبار ——— (۲۸ مارچ ۱۸۵۲ء)

حسب الحکم حضرت سلطانی خلد اللہ ملکہ، جو جناب نجم الدولہ اسد اللہ خاں غالب اور جناب خاقانی ہند ملک الشعرا شیخ محمد ابراہیم صاحب ذوق نے بتقریب شادی مرزا جواں بخت بہادر مرشد زادہ آفاق کے کچھ اشعار بسبیل مبارک بادی سہرا اس ہفتے میں حضور سلطانی میں سر دربار گزرانے تھے، مع چند اشعار علاوہ اس کے جو خاص نجم الدولہ بہادر نے پھر گزرانے، واسطے حظ اور کیفیت اپنے ناظرین اہل بصر و بصیرت و ماہرین دوا قفین خصائص و بلاغت کے بموجب ترتیب درپیش ہونے کے ہم درج اخبار کرتے ہیں۔ (نوائے ادب اپریل ۵۸ء)

دہلی اردو اخبار ——— (۲۸ اگست ۱۸۵۲ء)

اس ہفتے میں جو مشاعرہ مرزا نورالدین بہادر دام اقبالہ المتخلص بہ شاہی نبیرہ جناب مرزا سلیمان شکوہ بہادر مرحوم نے کیا جو کہ لکھنؤ سے تشریف لائے ہیں غزلہای شاعران کثیر پڑھی گئیں۔ اور شاہزادہ والا تبار اکثر رونق افزائے محفل مشاعرہ تھے۔ ایک غزل جناب مرزا ی محمد رضا یعنی میر مشاعرہ اور غزل جناب نجم الدولہ محمد اسد اللہ خاں بہادر المتخلص بغالب کی، راقم اخبار کے پاس پہنچی۔ سو درج اخبار ہوئی:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں

(نسخۂ عرشی، حواشی ص ۳۴۷)

دہلی اردو اخبار ——— (۱۳ فروری ۱۸۵۳ء)

ایک مخمس جناب صاحب عالم مرشد زادہ بہادر مرزا نورالدین المتخلص بہ شاہی، جن کے مدائح اخبارات گزشتہ میں لکھے تھے، بتحقیق سنا گیا کہ بعد مسودہ بندگان حضور والا جناب نجم الدولہ اسد اللہ خاں غالب سحر بیان نے ایک غزل اس ہفتے میں لکھی تھی، اور اس مقصود سے وہ غزل کہوائی

گئی تھی کہ مصرع لگانا جس میں دشوار بلکہ ناممکن ہو۔ صاحب عالم بہادر مرحوم نے اپنی غور و تامل میں کمال عجلت سے مخمس طیار کر کے پڑھ دیا۔ حضور والا اور سب حضار دربار والا نے نہایت پسند کیا۔ حضور نے پانچ دفعہ اس مخمس کو پڑھوایا اور بہت خوش ہوئے، اور سب لوگوں کو کمال تعریف و توصیف سے تر زبان پایا۔ جہاں سبحان اللہ سبحان اللہ کے سوا کوئی لب نہ ہلاتا تھا۔ (نسخۂ عرشی حواشی ص ۳۴۸)

دہلی اردو اخبار تتمہ —— (۲۲ مئی ۱۸۵۳ء)

منگل کے دن صبح کو شعرائے قلعۂ مبارک اور شہر کے دیوان خاص میں مجتمع ہوئے۔ حضور اقدس اعلیٰ برآمد اور جلوہ فرمائے تخت ہوئے جناب حضرت ولی عہد بہادر زیب افزائے کرسی اور مرزا مغل بہادر اور مرزا خضر سلطان بہادر اور مرزا جواں بخت بہادر اور شاہزادگان والا تبار بعد باریابی بجا حسب الحکم تھا تو ام شرف نشست سے حسب مراتب بمقام معزز و مکرم ہوئے بارہ پر ایک بجے تک حضور اقدس جلوہ فرما رہے۔

(نسخۂ عرشی، حواشی ص ۳۶۷ — ۳۶۸)

اودھ اخبار لکھنؤ[1] —— (یکم جنوری ۱۸۶۲ء)

"اشتہار طبع کلیات نظم" جناب میرزا غالب دہلوی۔

اک بشارت نئی سنو ہم سے گوہر آبدار لو ہم سے

ایسا مژدہ سنانے میں کہ کسی نے سنا نہیں، وہ سامان کرتے ہیں کہ اب تک ہوا نہیں۔ مرحبا کیسے شاہد شیریں کار آتا ہے۔ مبارک ہو یوسف سر بازار آتا ہے۔ عزیز ہر دل عزیز ہے۔ دلبری میں کامل ہے۔ جب مشتاق دو چار ہوں گے نقد تمنا سے خریدار ہوں گے۔ پردے میں جمال کیا دکھائیے۔ اب نقاب چہرۂ سخن سے اٹھائیے۔ آویزۂ گوش جہاں ہو۔ نزدیک و دور عیاں ہو کہ نواب میرزا اسد اللہ خاں صاحب بہادر غالب دہلوی کا فارسی کلیات مطبوع ہوا چاہتا ہے۔ نقش دلنگار اس دلارام، رنگین ادا کا شہرہ ہوا چاہتا ہے۔ اقسام سخن پر مشتمل ہے۔ ہر ایک شعر فرد لا جواب ہے، عالی مضامین تصائد لاجواب" رنگین غزلیں انتخاب کر انھیں دیکھیے کہ ظہیر کا کمال بھول جائیے۔ نظیری کی شوکت کبھی خیال میں نہ لائیے۔ مثنوی کی جادو بیانی میں جائے گفتگو نہیں، سحر حلال زلالی کی اس کے سامنے آبرو نہیں۔ رباعیوں کو پیکر سخن کے ارکان مناصر کہیے۔ آبدار قطعات کو بے تمہ قطعات جواہر کہیے۔ ہر مصرع قد موزوں سے بڑھ کر ہے۔ ہر بیت شاہد ماہ سیما کے معنی کا گھر ہے۔ دس ہزار چار سو کئی اشعار ہیں، کہ سب سلک گوہر شاہوار ہیں۔ خدا کے فضل سے نسخہ بھی وہ صحیح و درست بڑے کتب خانے کا ہاتھ آیا جس کو نواب ضیاء الدین خاں صاحب بہادر دہلوی نے جدو جہد تمام سے جمع فرمایا۔ مقبول آفاق کو تعریف کی حاجت نہیں۔ آفتاب کے صفات بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ناظم کی بے مثالی آشکار ہے۔ عالم کو ان کی استادی کا اقرار ہے۔ اس زمانے میں سحبان ثانی ہیں۔ جواب انوری و خاقانی ہیں۔ ہر لفظ ان کے قلم کا اختر اوج کمال ہے۔ جو سخن زبان سے نکلا سحر حلال ہے۔ ایسی نادر چیز کہاں میسر آتی ہے۔ کس خوش نصیب کی یہ امید بر آتی ہے۔ دیکھیے ہم در نایاب کے ڈھیر لگائے دیتے ہیں۔ موتی کوڑیوں کے مول لٹائے دیتے ہیں۔ سب کتاب تخمیناً چالیس جز میں چھپے گی۔ بعض مقام مناسب پر تصویر معنف کھنچے گی شروع ہی میں قیمت بھیجنے والے سے ہم کو پائیں گے۔ چھپ چکنے کے بعد پورے ۵ مقرر ہو جائیں گے۔ غالباً اہل ہنر سنتے ہی اہتزاز میں آئیں گے۔ بھیجنے تو دو ہاتھوں ہاتھ اٹھالے جائیں گے۔

اشتہار دینے کا یہ سبب ہے، صرف اتنا ہی مطلب ہے کہ درخواست بھیجنے والوں کو اطمینان یکسر رہے گا۔ پہلے ان کا استحقاق مد نظر رہے گا۔ اگر ابھی سے طلب گار ہوں کی قیمت کے حصہ دار ہوں۔ فقط

(ص ۱-۲)

[1] اودھ اخبار کے حوالے سے مندرجہ تحریروں کے لیے میں محترمی ڈاکٹر امیر حسن نورانی صاحب کے لطف و کرم کا شکر گزار ہوں یہ موصوف ہی کا عطیہ ہیں (اکبر)

اودھ اخبار لکھنؤ ـــــــ (۱۲ مارچ ۱۸۶۲ء)

نواب میرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی

سب جانتے ہیں کچھ حاجت دلیل نہیں کہ آج ہندوستان میں اُن کا عدیل نہیں، فصاحت و بلاغت میں سحبان ثانی ہیں۔ فن شعر میں انوری و خاقانی ہیں۔ زمین سخن کو آسمان پر پہنچا دیا۔ ہر نقطہ کو اختر اوج معانی بنایا۔ رو فکر اُن کا جہاں میں مشہور ہے۔ نتائج طبع عالی کا آوازہ دور دور ہے۔ جناب جہانیاں مآب ملکہ معظمہ ہند و انگلینڈ کی مداحی میں وہ پایۂ بلند و رتبۂ ارجمند پایا کہ ابتدائے عملداری سرکار سے کسی ہندوستانی کے لیے اُس کا دسواں حصہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ کیفیت نواب ممدوح نے خود لکھی ہے اپنی کتاب دستنبو میں مفصل بیان کی ہے۔ آگے ایک قصیدہ ملکۂ معظمہ کی شان میں کہا تھا۔ نظر انور سے گزرنے کو ولایت میں بھیجا تھا۔ وہاں تو ہر کمال کی قدر دانی ہے۔ کھلا ہوا باب فیض رسانی ہے جب فیضیاب سماعت ہوا۔ منظور نگاہ مرحمت ہوا۔ جذبہ و ذوال کی طرف ہمت آئی۔ صلۂ شاہانہ دینے پر طبیعت آئی۔ فروری ۱۸۵۷ء میں جناب رسل کلرک صاحب بہادر نے مصنف کو انگریزی چٹھی لکھی، ولایت سے ڈاک پر بھیجکر اس نوید سراپا امید سے خبر دی کہ تمہارے قصیدے کے انعام کا مقدمہ زیر تجویز ہے عنقریب خط اٹھاؤ گے۔ بعد صدور حکم انڈیا گورنمنٹ سے اُس کی اطلاع پاؤ گے۔ ناگاہ دستی سنہ مذکور میں سرزمین ہند پر آسمان ٹوٹا۔ فوج حوادث نے کاروان متاع امید کو لوٹا۔ بہتیرے بیگناہ یوں زیر آسیائے گردوں پسے۔ جس طرح چکی کے پاٹ تلے گیہوں پسے۔ کیا آغاز تھا کیا انجام ہوا کہ ہر مترصد بھی ناکام ہوا۔

نواب صاحب کا وہ معاملہ گویا خواب تھا۔ رع ؎ جب آنکھ کھلی تو کچھ نہ دیکھا ؎۔ عجب نہیں کہ پرورش سلطانی پھر توجہ فرمائے۔ عین حالت یاس میں لطف حق دانی سے امید بر آئے۔

اس تقریب میں ایک ذکر اور سنیے کہ ان دنوں جب تعزیت شاہزادۂ عالی پایہ کا عالمگیر تھی دہلی میں ایک ورق بخط انگریزی لکھا ہوا اور اُس کے ساتھ دو سرا ورق سادہ پیشگاہ حکام سے شاہیر شہر کے پاس پہنچا۔ ہر ایک نے اپنا نام لکھدیا۔ نواب صاحب (غالب) نے اس راہ سے کہ صاحب سخن ہیں مدحت سرائے حضرت ملکہ زمن ہیں۔ یہ شعر بدیہہ کہا ہوا لکھ کر مہر کر دی:

شاہ عالی گہر و گوہر پاکش صد حیف　　دیکہ نا پایہ سپرد و نہ بجا کش صد حیف　　(ص ۱۸۵)

اودھ اخبار لکھنؤ ـــــــ (۲۳ اپریل ۱۸۶۲ء)

ہندوستان کی سمجھ

افغانستان کا وزنامچہ مدت دراز سے سنا جاتا ہے۔ دس برس سے زیادہ ہوئے کہ صحائف اخبار میں دیکھا جاتا ہے۔ غرض سالہا سال گزر گئے سنتے سنتے کان بھر گئے۔ کسی امر کا ظہور نہ پایا۔ افسانے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ ان دنوں بھی ویسی ہی باتوں نے شہرت پائی۔ چاروں طرف لوگوں نے بے پر کی اڑائیں۔ ہندوستانیوں کی سمجھ کے قربان کیا کیا معقول ہیں۔ کیسے کیسے بنان نئے نئے باندھو باندھے۔ تو طبے اٹھائے۔ محض اپنے گمان پر سکندروں قیاس لگائے۔ اے بے فکرو! خدا سے ڈرو، ناحق عالم کو پریشان نہ کرو۔ معلوم نہیں کہ یہ بے اصل باتیں کون گھڑا کرتا ہے۔ خصوصاً وقائع نگار انہیں انگریزی کو کون لکھا کرتا ہے۔ کیا کریں سب عموماً صحیفوں کو ایسے اخبارات سے مملو پاتے ہیں تو ہم بھی حسب ضرورت کچھ انتخاب کر کے اپنے صحیفے میں پہنچاتے ہیں۔

آج کل دانائے روزگار، سرمۂ الوالابصار، ارسطو فطرت، افلاطون فطنت، جناب رفیع الاشان، عالی مناقب، مرزا اسد اللہ خاں غالب نے جن کی سلامت ذہن مستقیم پر قسم کھائیے، استقامت رائے سلیم کے صدقے جائیے۔ نافہموں کی فہمائش میں ایک نثر تحریر فرمائی۔ ہمارے ممنون خیالی سے توارد ہوا ایسی تقریر فرمائی۔ ہم اس کو درج اخبار کرتے ہیں۔ اہل جہاں پر آشکار کرتے ہیں۔ بعد اس کے بھی جو خبریں ملا کریں گی مندرج کر ذرفرین شائق ہوا کریں گی۔

نثر

یارب دنیا میں جتنے تیرے بندے ہیں، سب اپنا بھلا چاہتے ہیں۔ آیا کج فہم واقعہ طلب لوگ کیا چاہتے ہیں۔ فتنہ فساد سے خوش اور امن و امان

کے دشمن ہیں۔ گویا اپنے زن و فرزند و مال و جان کے دشمن ہیں۔ اگرچہ اس ہنگامے میں آپ بھی تباہ ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں ہنگامے کی خبر سننے میں شاد ہوتے ہیں۔ سینکڑوں بھری ہوئی کشتیاں اس دریا میں سرنگوں دیکھ چکے ہیں، بہ عافیت دشمن عبرت نہیں پکڑتے ہیں اور جو کوئی ان کو سمجھائے تو اس سے جھگڑتے ہیں۔ کابل کے اخبار بڑی رغبت سے کان دھرتے ہیں اور پھر اُس اخبار پر کیا کیا آثار مرتب کرتے ہیں۔ سرکار انگریزی کو از بسکہ توجہ طرف رفاہ عام کے ہے۔ اُدھر کا خیال یا قصد نہ کبھی ہے [illegible] کے ہے۔ بفرض محال اگر اُس گروہ میں کسی نے کچھ بڑھ کر حوصلہ کیا اور صاحبان عالیشان معدلت نشان کا مقابلہ کیا۔ بات صاف صاف ہے، جائے انصاف ہے جب دوست محمد خاں مرحوم نے اپنی فوج باغی کو ہرات پہ حملہ کرنے سے ضرب شمشیر سے زیر کیا ہے، اب جو یہ فوج جرار و لشکر بے شمار ساتھ ہے تو اس کا دفع کرنا مشکل کیا ہے۔ ہندو مسلمان جو اہل ہند اگلے فتنہ و فساد سے بچ رہے ہیں اور بعد اس کے وبا اور قحط کے دکھ سہے ہیں۔ وہ اپنی سرا [illegible] و عوض پر خدا کا شکر بجا لائیں۔ تیار پاکیزہ سستا اناج فراغت سے کھائیں، اگن بوٹ اور ریل گاڑی کی صنعت کو دیکھیں، تار بجلی میں پیام کے پہونچنے کی سرعت کو دیکھیں، مدرسوں کی رونق اور رواج علم کی کثرت ملاحظہ فرمائیں، حکام کی مہربانیاں اپنی نسبت ملاحظہ فرمائیں، ملک سراسر بے خس و خار ہو گیا ہے، قلمرو ہند غیرت گلزار ہو گیا ہے، بہشت اور بیکنٹھ جو مرنے کے بعد متصور تھا اب زندگی میں موجود ہے، وہ احمق ہے وہ ناقدر دان ہے جو انگریزی عملداری سے ناخوشنود ہے، حکام کو ملک کی آبادی اور رعیت کی آسودگی منظور بہر صورت ہے، اگر ایسا نا کوئی اپنے حق کو نہ پہنچے تو یہ اُس شخص کی خوبی قسمت ہے آدمی رحمت خاص کو نہ دیکھے رحمت عام پر نظر کرے۔ اگر اس کا کوئی مدعا حاصل نہ ہو تو اپنے بخت و قسمت کا گلا کرے، امن و اماں کا طالب بخت و قسمت کا شاکی. غالب. فقط (ص ۲۸۱)

اودھ اخبار لکھنؤ ——— (۱۴ مئی ۱۸۶۲ء)

خیال خیر مآلِ رعنا

بخدمت فیض درجت صاحب اودھ اخبار سلامت

آپ کے اخبار حق نگار مطبوعہ ۲۳ اپریل سنہ رواں صفحہ ۲۸۱ میں عبارت نثر ریختہ، قلم جواہر رقم، حضرت استادی جناب والامناقب مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی دام اقبالہم کی درباب، تہدید و تنبیہ عوام و کج فہماں نظر میری نظر سے گزری، جس سے یہ مقصود ہے کہ افواہ جنگ ایرانیاں با افغانان میں خام خیال لوگ کیا کیا خیال خام کرتے ہیں"

بہ تبعیت مضمون خیر اندیشی جناب مرشدنا و استادنا حضرت غالب دام فضلہم بمادہ تنبیہ ابلہان نسبت شہرت جنگ اہل ایران با افغانان ازبسکہ تحریر جناب ممدوح کی حق بجانب اور عین خیر اندیشی حاکم و محکوم ہے، اس لیے اس کو نتیجہ نتائج خیر و عافیت عام خیال کر کے اس مطلب مافی الضمیر کو میں حتی الوسع بسیط کرنا سعادت جان کر واسطے مزید تنبیہ خاص و عام عرض کر کے عارض ہوں کہ آپ بوسیلہ اندراج اخبار گوہر بار خود بندگان خدا کو اس سے متنبہ اور حکام عہد کو اس طرف متوجہ فرمائیے گا

اودھ اخبار لکھنؤ ——— (۲۴ ستمبر ۱۸۶۲ء)

جناب صاحب مہتمم اودھ اخبار زاد مجدہم

آپ کے اخبار ۱۷ ستمبر میں کالم ۶۲۱ پہ خبر الور میں مندرج ہے کہ مہاراجہ الور کے جنگل سے ایک شیر کو ٹٹی میں قید کر کر کئی روز گرسنہ رکھ کے جب وہ شور و شر سے باز رہا پنجرہ آہنی میں گرفتار کر لائے

اے صاحب مہاراجہ صاحب تو والی ملک اور صاحب اقبال ہیں وہ تو شیروں کو اگر چاہیں تو گوسفند سے گرفتار کرا منگا دیں۔ ان کے رعب عدل سے جب شیر بکری ایک گھاٹ پانی پئیں پھر اُن کو شیر کیا حقیقت ہے۔ میں اس پر ایک ذکر تعجب خیز اور فسانہ حیرت انگیز گرفتاری زندہ شیر کا بے سر و سامانی

میں ایک معزز شخص کا سناتا ہوں یعنی ۱۸۵۶ء میں محمد مردان علی خان صاحب نے کہ اُس وقت تحصیلدار کوہ مری دارالقرار گورنمنٹ پنجاب کے تھے اور اب ایک سرکار پنجاب میں اہلکار ہیں خود ایک شیر ژیاں جنگل کوہ مری سے زندہ یوں گرفتار کیا تھا کہ پتھروں کا ایک چھوٹا سا صندوق کے طور کا فقط اسی قدر کو تھا بنایا کہ شیر اس میں سما سکے اندر شکار لگا دیا تھا۔ ایک شیر مردم خور اس میں قضا کا مارا لگا کئی سو آدمی خان صاحب کے ساتھ اس علاقے کے جمع تھے ایک یارا پاس جانے تک نہ ہوا اور ان شیر دل جوانمرد نے رسّا اس کے اوپر بیٹھ کر رسّے سے پھنسا لیا اور تیغ اس کے منہ سے ہٹا کر خود ایک چوبی صندوق میں گرفتار کرکے قید کر لیا۔ اس وقت شیر کا گرج اور شور و غوغا کوسوں تک آدمیوں کے زہرے کو آب کرتا تھا اور لطف یہ کہ جس دن شیر لگا اُسی دن اس شجاعت خداداد اور جرأت سے اُس کو گرفتار کیا۔ اور وہ چار ماہ پالا پھر قضا سے مر گیا۔

یہ بات طشت ازبام اظہر من الشمس ہے وہ شیر پورے قد کا تھا۔ خان ممدوح سے صرف شیر کا پکڑ لانا اس لیے کچھ بعید نہ تھا کہ ان کی شجاعت کئی وقت پر ظہور میں آ چکی ہے۔ یعنی جب وہ اٹک کی حدود پر تحصیلدار وغیرہ رہے تو ملک باغی اور ملک آفریدی سے صرف جریدہ جا جا کر بہت سے خونی اشتہاری مسلح بہادر تھے پکڑ پکڑ لائے اور ہزارہا روپیہ سرکار انگریزی سے انعام پایا۔ غدر حال میں بھی بخیر خواہی سرکار وہ سینہ سپر رہے۔ کوہ مری کے بغاوت و فساد میں جب کہ وہ دوسری تحصیل میں تھے کوہستان میں جا کر دافع فساد رہے۔ غرض شجاعت اور جرأت و دلیری بھی ایک بڑی نعمت خداداد ہے اور جبلی ہے کچھ اختیاری نہیں اور امیر غریب پر بھی منحصر نہیں ہے۔ الغرض خان ممدوح بھی اسم با مسمیٰ ہیں اور حق یہ کہ جوانمردی کی صفت ہی مردانگی ہے۔ فقط

راقم بندہ اسد اللہ

مفصلائٹ دہلی — (مارچ ۱۸۶۸ء)

CORRESPONDENCE

Our columns are open to all but we do not hold ourselves responsible for any thing that appears in our correspondence-- Ed. Mof.

TO THE EDITOR OF THE MOFUSSILITE.

Dear Sir,

You have, I observe, in your issue of the 30th instt., taken notice of the liable case now under enquiry before the Assistant Commissioner, Delhi, in which Mirza Asadullah Khan alias Mirza Nausha Ghalib, the most celebrated Persian Scholar and the Poet laureate of India, is plaintiff.

The following are some further particulars relating to the same; they will, I hope, be interesting to your readers and expose at the same time the acts of injustice to which people in the Punjab are subject. The small army of Maulavis and Munshis, alluded to in your issue, consists of Lala Piaare Lall, Headmaster Delhi Normal School and secretary Delhi Literary Society; Hakim Latif Husain, first Oriental Master Delhi Collegiate School, and Maulavi Nasiruddin, first Oriental and Mathematical Master, Delhi Normal School; Hookum Chand, the famous Essayist and Persian scholar of Delhi. Maulavi Ziyauddin, Assistant Professor of Arabic, Delhi College

and several others of less note. The first four gentlemen approved as witnesses on the part of the plaintiff, the rest on that of Defendant. The evidence for prosecution was taken on Monday the 20th instant; of the witnesses for the defence, only one, Maulavi Ziyauddin was examined on Tuesday when a curious instance of partiality was shown him by the court. Some interested party, said to be an "awarda" of the presiding Magistrate, whispered in his ear that Maulave ziyauddin was the most respectable and learned of all the witnesses, and requested the Magistrate to give him a chair on the dais next to himself, while taking his evidence. This was done, although a practice followed nowhere but in the court of the Assistant Commissioner, Delhi. As far as my knowledge of law and the practice of Indian courts, is, no witness ever so respectable, can be allowed to remain seated while giving his deposition. "Nek Hairanam vo sakht parishan." What rule does the Assistant Commissioner observe in that respect? The witness, to whom injustice and a gratitous insult has been offered by this concession to Maulavi Ziyauddin, holds a very respectable position in society, was honoured with a seat at the Durbar of His Honour the Lieutenant Governer of the Punjab and took precedence of the gentlemen to whom such marked favour has been shown; and although not a very good Persian Scholar, he is in every other respect deserving of greater consideration.

I refrain at present giving you the evidence so far as it has been recorded, since the case will be resumed on Monday next. As soon as the evidence is concluded and judgement delivered, I will furnish you with the whole missul for publication.

In conclusion I would suggest that the opinion of Major Lees or any other European Orientalist be taken as to the proper interpretation of the defamatory passages printed and published in the work entitled the "Qateh-ul-Qateh." (Sic.)

Yours truly,

March, 1868 **IXION**

اکمل الاخبار دہلی ——— (۶ مئی ۱۸۶۸ء)

"ناظرین والاتمکین نیز شاگردان ارادت آئین حضرت ممدوح الصدر کو مژدہ ہو کہ بنیاد لاحضرت ممدوح کی تصویریں فوٹوگراف کی ترکیب سے ایک شخص نے تیار کرائی ہیں۔ پس جس صاحب کو یہ شبیہ مبارک لینی منظور ہو وہ دو روپے کے ٹکٹ بلف عنایت نامہ بنام لالہ بہاری لال کے نام اکمل المطابع دہلی میں بھیج دیں یہ صیغہ بیرنگ ان کی خدمت میں مرسل ہوگی۔

(ماہنامہ آج کل ستمبر ۶۰ء ص ۲۹)

اکمل الاخبار دہلی ـــــــــ (۲ر ستمبر ۱۸۶۸ء)

تہنیت

بفضل الٰہی ۲۶ ربیع الثانی ۱۲۸۵ھ روز یکشنبہ گھنٹہ بھر دن رہے۔ جناب معلی القاب نواب میر ابراہیم علی خاں صاحب بہادر رئیس اعظم سورت کے گھر بیٹا پیدا ہوا۔ گویا نواب صاحب چاند تھے اور یہ چاند کے پاس ایک درخشاں ستارہ چمکا حق سبحانہٗ تعالیٰ اس ماہ درخشندہ اور اختر تابندہ کو اوج عزت اقبال پر تا طلوع آفتاب قیامت پر تو ضیا گستر رکھے ....

جناب مستطاب نجم الدولہ نواب اسد اللہ خاں بہادر غالب مدظلہم نے ایک رباعی اور ایک قطعہ تہنیت نئی طرز کا کہ دیکھنے والے بشرط دید و فہمید اس کا لطف اٹھائیں گے، ارشاد فرمایا ہے ہم بہ افزائش رونق اخبار وہ رباعی اور قطعہ لکھتے ہیں۔

رباعی

حق داد بہ سیاز پی انغامش　　　فرخ پسری کہ داجبیت اکرامش
تاریخ ولادتش بود بے کم وبیش　　　ارشاد حسین خاں کہ باشد نامش

قطعہ　۸۵　۱۲

غالب حال سنین ہجری　　　معلوم کن از خجستہ فرزند
چوں یکصد وبست وچار ماند　　　انیست شمار عمر دلبند

عرض کی جائے کہ جب خجستہ فرزند سے ۱۲۸۵ عدد لیے جائیں تو ایک سو چوبیس باقی رہتے ہیں۔ اس کو بطریق دعا مولود کی عمر قرار دی ہے۔"

(ماہ نو جولائی ۱۹۵۲ء)

اکمل الاخبار دہلی ـــــــــ (۲۸ر اکتوبر ۱۸۶۸ء)

اسد اللہ بے گناہ جس کا تخلص غالب اور خود اہل ہند کا معلوم ہے۔ مہتمان اخبار بلاد ہند سے عموماً عرض کرتا ہے کہ یہ فقیر کا استغاثہ از روئے اکمل الاخبار اپنے صحائف میں درج فرما کر مجھکو اپنا ممنون فرمائیں۔"

استغاثہ غالب

"کئی ہفتے پہلے ایک خط لکھنؤ سے بسبیل ڈاک انگریزی بصیغہ بیرنگ میرے نام آیا راقم عبد اللہ رئیس و معافیدار ــــ یہ نہیں مرقوم کہ رئیس و معافیدار کہاں کا ـــ بہرحال محصول دے کر میں نے خط کو لیا اور پڑھا۔ اس میں لکھا تھا کہ تو نماز نہیں پڑھا کرتا۔ خبردار نماز پڑھا کر اور اگر نماز نہ پڑھا کرے گا تو بعد مرنے کے بھوت بن جائے گا۔ کل پنجشنبہ کے دن ایک اور خط بیرنگ آیا۔ سرنامہ پر یہ عبارت مرقوم "انشاء اللہ تعالیٰ فہذا ابتغام در شہر دہلی رسیدہ بملاحظہ اقدس جناب مستطاب نواب اسد اللہ خاں غالب مشرف باد مرسلہ مظہر علی از مارہرہ ضلع ایٹہ بیرنگ تاریخ ۹ رجب ۱۲۸۵ ہجری روانہ شد" مضمون بعینہٖ یہی کہ نماز پڑھا کر ورنہ بعد مرنے کے بھوت ہو جاؤ گے والسلام علیک نام نگار دفقط مرسلہ مظہر علی از مارہرہ ضلع ایٹہ سرکار خود تمام ہوا۔ اب فقیر مکتوب الیہ کہتا ہے کہ پہلے خط میں میں نے عبد اللہ کو اسم فرضی سمجھ لیا تھا مگر اب جب دوسرے خط میں اس تو ضیح سے کاتب کا اسم و مقام لکھا ہوا ہے کیونکر شک و شبہ باقی رہے بس اب میں تہر بر ولیش یجان درویش کے مفہوم پر عمل کر کے چپ ہو رہتا ہوں مگر یہ حافظ کا شعر جواب میں لکھتا ہوں ؎

من اگر نیکم اگر بد تو برو خود را باش　　　ہر کسی آں دِرَوَد عاقبت کار کہ کشت

یہ دوسرے شخص صاحب نام و نشان ہیں۔ اخبار میں دیکھ کر سمجھ لیں گے۔ شاید وہ پہلے صاحب بھی کسی اخبار میں مشاہدہ فرمائیں۔"

(ماہ نو جولائی ۱۹۵۲ء　　)

and several others of less note. The first four gentlemen approved as witnesses on the part of the plaintiff, the rest on that of Defendant. The evidence for prosecution was taken on Monday the 20th instant; of the witnesses for the defence, only one, Maulavi Ziyauddin was examined on Tuesday when a curious instance of partiality was shown him by the court. Some interested party, said to be an "awarda" of the presiding Magistrate, whispered in his ear that Maulave ziyauddin was the most respectable and learned of all the witnesses, and requested the Magistrate to give him a chair on the dais next to himself, while taking his evidence. This was done, although a practice followed nowhere but in the court of the Assistant Commissioner, Delhi. As far as my knowledge of law and the practice of Indian courts, is, no witness ever so respectable, can be allowed to remain seated while giving his deposition. "Nek Hairanam vo sakht parishan." What rule does the Assistant Commissioner observe in that respect? The witness, to whom injustice and a gratitous insult has been offered by this concession to Maulavi Ziyauddin, holds a very respectable position in society, was honoured with a seat at the Durbar of His Honour the Lieutenant Governer of the Punjab and took precedence of the gentlemen to whom such marked favour has been shown; and although not a very good Persian Scholar, he is in every other respect deserving of greater consideration.

I refrain at present giving you the evidence so far as it has been recorded, since the case will be resumed on Monday next. As soon as the evidence is concluded and judgement delivered, I will furnish you with the whole missul for publication.

In conclusion I would suggest that the opinion of Major Lees or any other European Orientalist be taken as to the proper interpretation of the defamatory passages printed and published in the work entitled the "Qateh-ul-Qateh." (Sic.)

Yours truly,

March, 1868 IXION

ل الاخبار دہلی —— (۶ مئی ۱۸۶۸ء)

ناظرین والاتمکین نیز شاگردان رشید حضرت ممدوح الصدر کو مژدہ ہو کہ ابھی حضرت ممدوح کی تصویریں فوٹوگراف کی ترکیب سے ایک شخص نے تیار
کی ہیں۔ پس جن صاحب کو یہ شبیہ مبارک لینی منظور ہو وہ دو روپے کے ٹکٹ بلف عنایت نامہ بنام لالہ بہاری لال کے نام اکمل المطابع دہلی میں بھیج دیں
تو بیرنگ ان کی خدمت میں مرسل ہوگی۔
(ماہنامہ آج کل ستمبر ۶۰ء ص ۲۹)

اکمل الاخبار دہلی ——— (۲ر ستمبر ۱۸۶۸ء)

تہنیت

بفضل الٰہی ۲۶ ربیع الثانی ۱۲۸۵ھ روز یکشنبہ گھنٹہ بھر دن رہے۔ جناب معلّی القاب نواب میر ابراہیم علی خاں صاحب بہادر رئیس اعظم سورت کے گھر بیٹا پیدا ہوا۔ گویا نواب صاحب چاند تھے اور یہ چاند کے پاس ایک روشن ستارہ چمکا حق سبحانہٗ تعالیٰ اس ماہ رخشندہ اور اختر تابندہ کو اوج عزت و اقبال پر تا طلوع آفتاب قیامت پر نور ضیا گستر رکھے ....

جناب مستطاب نجم الدولہ نواب اسد اللہ خاں بہادر غالب مدظلہم نے ایک رباعی اور ایک قطعہ تہنیت نئی طرز کا کہ دیکھنے والے بشرط دید و فہمید اس کا لطف اٹھائیں گے، ارشاد فرمایا ہے ہم بہ افزائش رونق اخبار وہ رباعی اور قطعہ لکھتے ہیں۔

رباعی

حق داد بہ سید از پی انعامش — فرخ پسری کہ واجبست اکرامش

تاریخ ولادتش بود بے کم و بیش — ارشاد حسین خاں کہ باشد نامش

۸۵ ۱۲

قطعہ

غالب حال سنین ہجری — معلوم کن از خجستہ فرزند

چوں یکصد و بست و چار ماند — انیست شمار عمر دلبند

عرض کی جاتی ہے کہ جب خجستہ فرزند سے ۱۲۸۵ عدد لیے جائیں تو ایک سو چوبیس باقی رہتے ہیں۔ اس کو بطریق دعا مولود کی عمر قرار دی ہے۔"

(ماہ نو جولائی ۱۹۵۲ء)

اکمل الاخبار دہلی ——— (۲۸ر اکتوبر ۱۸۶۸ء)

اسد اللہ بے گناہ جس کا تخلص غالب اور خود اہل ہند کا مغلوب ہے۔ مہتممان اخبار بلاد ہند سے عموماً عرض کرتا ہے کہ یہ فقیر کا استغاثہ از رو ئے اکمل الاخبار اپنے صحائف میں درج فرما کر مجھکو اپنا ممنون فرمائیں۔"

استغاثہ غالب

"کئی ہفتے پہلے ایک خط لکھنؤ سے بسبیل ڈاک انگریزی بصیغہ بیرنگ میرے نام آیا راقم عبد اللہ رئیس و معافیدار ــــ یہ نہیں مرقوم کہ رئیس و معافیدار کہاں کا ــــ بہرحال محصول دے کر میں نے خط کو لیا اور پڑھا۔ اس میں لکھا تھا کہ تو نماز نہیں پڑھا کرتا۔ خبردار نماز پڑھا کر اور گر نماز نہ پڑھا کرے گا تو بعد مرنے کے بھوت بن جائے گا۔ کل پنجشنبہ کے دن ایک اور خط بیرنگ آیا۔ سرنامہ پر یہ عبارت مرقوم "انشاء اللہ لفافہ ہذا بمقام در شہر دہلی رسیدہ بملاحظہ اقدس جناب مستطاب نواب اسد اللہ خاں غالب مشرف باد مرسلہ مظہر علی از مارہرہ ضلع ایٹہ بیرنگ تاریخ ۲ر رجب ۱۲۸۵ ہجری روانہ شد" مضمون بعینہٖ یہی کہ نماز پڑھا کر ورنہ بعد مرنے کے بھوت ہو جاؤگے والسلام علیک نام نہ نشان فقط مرسلہ مظہر علی از مارہرہ ضلع ایٹہ بسرکار خود تمام ہوا۔ اب فقیر مکتوب الیہ کہتا ہے کہ پہلے خط میں میں نے عبد اللہ کو اسم فرضی سمجھ لیا تھا مگر اب جب دوسرے خط میں اس توضیح سے کاتب کا اسم و مقام لکھا ہوا ہے کیونکر شک و شبہ باقی رہے۔ پس اب میں قہر درویش بجان درویش کے مفہوم پر عمل کر کے چپ ہو رہتا ہوں مگر یہ حافظ کا شعر جواب میں لکھتا ہوں ؎

من اگر نیکم اگر بد تو برو خود را باش — ہر کسی آں درود عاقبت کار کہ کشت

یہ دوسرے شخص صاحب نام و نشان ہیں۔ اخبار میں دیکھ کر سمجھ لیں گے۔ شاید وہ پہلے صاحب بھی کسی اخبار میں مشاہدہ فرمائیں۔"

(ماہ نو جولائی ۱۹۵۲ء)

اکمل الاخبار دہلی ـــــ (۱۴ر اپریل ۱۸۶۹ء)

"اشتہار کتاب اردوئے معلٰی"

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشک فارسی + گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

"فرزندگان و الانتظر و شائقان پاک گہر مژدہ ہو کہ ناظورۂ معانی نے جلوہ دکھایا، شاہد سخن نے نقاب چہرے سے اٹھایا، گلستان فصاحت نے خرمی و نضارت پائی، چمنستان بلاغت میں بہار آئی یعنی حصۂ اول نسخۂ دلپذیر و کتاب بے نظیر" اردوئے معلٰی " منشات زبدۃ الفصحا عمدۃ البلغا جناب نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر مرحوم غالب کہ جس کا ہر ورق حدیقۂ نکتہ پردازی و ہر صفحہ ریاض بذلہ گستری ہے اکمل المطابع دہلی میں بہ تصحیح و تنقیح احقر العباد چھپ کر تیار ہو گیا ہے۔ یہ کتاب خصوصاً واسطے طلبا مدارس کے ایک عمدہ دستور العمل زبان دانی اور عموماً برشائقین و محققین زبان اردو کے سرمایہ فصاحت و طلاقت لسانی ہے مضامین بلیغ اور روانی عبارت سے خود ایک معلم بے بدل اور استاد کامل ہے۔ غرضکہ بہتر اس سے زبان اردو میں کوئی کتاب ہاتھ نہ آوے گی۔

بنا بر علیہ اس شہر میں ہاتھوں ہاتھ اکثر متاع روئے دست خریداران خرد مند ہو گئی۔ باایں ہمہ ندرت قیمت اس کی زیادہ قرار نہیں دی گئی۔ حجم اس کا ۲۹ جزو ہے اور کاغذ ۲۰ ۲۶ پر بہت خوشخط منطبع ہوئی ہے پس جن صاحب کو اس صحیفۂ دانش و آگہی کی خریداری منظور ہو دو روپیہ بابت قیمت کتاب اور ۲ر محصول ڈاک کے ارسال فرما کر طلب فرمائیں۔

"المشتہر سید فخر الدین مہتمم اکمل الاخبار دہلی"

"محبان کرم گستر یعنی وقائع نگاران ہم عصر سے امید ہے کہ براہ عنایت اشتہار مرقومہ بالا کو اپنے اخبار گوہر بار میں درج فرما دیں"

(ماہ نو جولائی ۱۹۵۲ء)

اخبار عالم میرٹھ ـــــ (۲۲ر اپریل ۱۸۶۹ء)

عود ہندی

یہ کتاب لطافت مآب بزبان اردو نثر جس میں اکثر خطوط اور مضامین مختلف بطور دیباچہ کتاب لکھے ہیں نواب اسد اللہ خانصاحب غالب مرحوم کے نتائج فکر سے ہے، جس کا مطالعہ واسطے صفائی اور درستی زبان اردو کے مفید اور کارآمد ہے مطبع مجتبائی واقع میرٹھ میں صاف اور خوشخط ...... ۱۸۸ صفحے کی ...... چھپی ہے قیمت اس کی ایک روپیہ اور محصول ڈاک تین آنے ہیں۔ (اردوئے معلٰی غالب نمبر جلد دوم)

مطبوعات موصولہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

کچھ پرانے خط: جواہر لال نہرو کے نام لکھے ہوئے مشاہیر سیاست و ادب کے خطوط کا ایک انتخاب ۱۹۵۸ء میں شایع ہوا تھا۔ جس میں ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے خطوط شامل تھے۔ یہ مجموعہ انگریزی میں ہے اور اسے نہرو جی نے مرتب کیا ہے۔ ان خطوط میں سے بیشتر خط مرتب ہی کے نام ہیں مگر کہیں کہیں استثنا بھی برتا گیا ہے یعنی کچھ خطوط موتی لال نہرو کے نام اور کچھ موتی لال کے دوسرے عزیزوں کے نام بھی شریک ہیں۔ اسی طرح مرتب نے چند اپنے خطوط بھی شامل کر لیے ہیں اور لکھا ہے کہ ان کی شمولیت دوسرے خطوط کو سمجھنے میں مدد و معاون ہوگی۔

یہ مجموعہ نہ صرف اس لیے اہم ہے کہ اس میں ہندوستان کے بڑے بڑے لوگوں کے خط شامل ہیں، بلکہ اس اہمیت کی وجہ یہ بھی ہے کہ خود ان کے مکتوب الیہ کی شخصیت جدوجہد آزادی کے رہنما کی سی نمایاں ترین حیثیت کی ہے۔ نیز اس مجموعے کی قدر و قیمت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ خطوط جس دور سے تعلق رکھتے ہیں، اس کی تاریخ سیاست کو اتنی سچائی اور ایمانداری کے ساتھ کوئی اور مواد پیش نہیں کر سکتا۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی نے اپنی روایات کے مطابق یہ تحفہ اردو ترجمے کی شکل میں پیش کیا ہے۔ یہ ترجمہ دو حصوں میں شایع ہوا ہے اور ہر حصے کی قیمت ۸ روپے ہے۔ جو کتاب کی باطنی خوبیوں کے علاوہ سفید کاغذ، عمدہ اور نفیس طباعت اور مجلد ہونے کی وجہ سے بہت معقول ہے۔

اس کے مترجم مولانا عبدالمجید حریری نیاز آبادی کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے بہت رواں اور شستہ اردو میں خطوں کا ترجمہ کیا ہے۔ مگر کیا اچھا ہوتا کہ آخر میں انڈیکس بھی ہوتا تاکہ اسے حوالے کے طور پر استعمال کرنے والوں کو مطالب کی تلاش میں دشواری پیش نہ آتی۔

اُردو ڈائجسٹ: لاہور اردو میں یوں تو کئی ادبی ڈائجسٹ شایع ہوتے ہیں اور سب دل چسپ اور کامیاب ہیں مگر خالص معلوماتی نقطۂ نظر سے ایک ڈائجسٹ کی کمی ہمیشہ محسوس ہوتی رہی ہے۔ اس قسم کا رسالہ مرتبین سے جس لگن محنت اور سلیقہ مندی کا مطالبہ کرتا ہے وہ بجائے خود حوصلہ شکن ہے لیکن اب لاہور سے چند نوجوانوں نے ریڈرز ڈائجسٹ کو نمونہ بنا کر اردو ڈائجسٹ جاری کیا ہے۔ اس رسالے کی کامیابی کا یہی ایک ثبوت کیا کم ہے کہ دو سال کے مختصر وقفے میں اس کے عام شماروں کی تعداد اشاعت ۲۶ ہزار سے بھی تجاوز کر گئی ہے۔ گزشتہ نومبر میں اردو ڈائجسٹ نے اپنی دوسری سالگرہ پر ایک خاص نمبر شایع کیا تھا جو خاصا متنوع اور دلچسپ رہا۔ ہماری طرف سے اس ماہنامے کے مطالعے کی پرزور سفارش کی جاتی ہے اس لیے کہ اردو رسائل میں حسن صورت و سیرت دونوں کم نظر آتے ہیں اور یہ اردو ڈائجسٹ ان گنتی کے رسائل میں ہے جو ان اوصاف سے بہرہ ور ہیں۔

بچوں کے لیے نظمیں: ننھے منوں کے لیے جن لوگوں نے لکھا ہے ان میں جناب شفیع الدین نیر کا نام بہت ممتاز ہے۔ نیر صاحب نے بچوں ہی کی ہلکی پھلکی زبان میں شاعری کی ہے اور موضوعات کے انتخاب میں بھی بچوں کی نرم و نازک طبیعت اور معصومانہ دلچسپیوں کو سامنے رکھا ہے۔ وہ بچوں کو جو کچھ دیتے ہیں اس میں بچپن کی شوخیاں سمٹ آئی ہیں یہی وجہ ہے کہ نیر صاحب بچوں کے مقبول اور محبوب شاعر ہیں اس وقت ہمارے پیش نظر جو کتابیں ہیں ان کے نام یہ ہیں:

ہماری نعت۔ وطنی نظمیں۔ منی کا تحفہ اور بچوں کا کھلونا۔

ہر ایسے گھر میں جہاں بچے ہوں ان کتابوں کو بھی ہونا چاہیے اس لیے کہ ان کتابوں میں وقتی تفریح ہی نہیں اصلاح اخلاق و عمل کا مقصد بھی کار فرما ہے۔

ملنے کا پتہ: نیر کتاب گھر جامعہ نگر نئی دہلی

نذرِ وطن: ہندوستان کی قومی تحریکات میں اردو ہمیشہ پیش پیش رہی ہے۔ جنگ آزادی کا سب سے اہم نعرہ "انقلاب زندہ باد" اردو ہی کی دین ہے جس نے مخالف طاقتوں کے قدم اکھاڑ دیئے اور آج بھی جوش و ولولے کا عظیم نشان ہے۔ چین کی حالیہ جارحانہ یورش نے ہر ہندوستانی کو متاثر کیا۔ اس ہنگامی موضوع پر کہی گئی اردو نظموں کا ایک مجموعہ مرتبہ دور آفریدی علوی بک ڈپو بمبئی نے شایع کیا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ مرتب نے محنت کو چھوڑ کر ساری اہم نظمیں شریک کر لی ہیں۔ ضرورت تھی کہ انتخاب کچھ اور سختی برتی جاتی تاکہ بعض کمزور نظمیں درج نہ ہو پاتیں۔ پھر بھی اس انداز کی کتابوں کو خریدنا چاہیے۔ اس طرح قومی خیالات کی تدریجی ترقی ہوتی ہے جو کسی بھی ملک کی ترقی کی اور اس کی مضبوطی کی ضمانت ہے۔

نورانی تیل

ساختہ: انڈین کیمیکل کمپنی مئو ناتھ بھنجن یوپی

- آپ کے خاندان بھر کے تحفظ کے لیے
- حادثوں کے موقع پر نورانی تیل سب سے اہم ساتھی ہے۔

اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیے، اور درد، چوٹ، زخم اور ورم سے نجات پانے کے لیے اسے استعمال کیجیے۔

ایڈیٹر پبلشر نے ناظم پریس میں چھپوا کر دفتر نگار رکھیر تحی رام پور یوپی سے شایع کیا۔

REGD. NO. A—460

42ND YEAR OF PUBLICATION

NIGAR, URDU MONTHLY, RAMPUR U.P.

OCTOBER 1963

REGISTERED WITH THE REGISTRAR OF NEWSPAPERS AT R.N. NO. 2136/57

قیمت فی پرچہ ۵۷ نئے پیسے
سالانہ دس روپے

نگار

ایڈیٹر: اکبر علیخاں

ضروری اعلان
پاکستانی خریدار نگار کا سالانہ چندہ
اس نمبر پر ختم ہے۔ رسالہ جاری کر دیا جائیگا

نمائندہ نگار ۵/۱ ایبن سمن آباد۔ لاہور

جلد ۴۲ | فہرست مضامین تاریخ نمبر جولائی ۱۹۶۳ء | شمارہ ۷

ملاحظات		۲
افادہ تاریخ	سید ضامن علی جلال	۳
تاریخ لطیف (تعارف)	اکبر علی خاں	۱۷
تاریخ لطیف	مہدی علی خاں	۲۳

ملاحظات

موجودہ شمارے کے ساتھ نگار اپنی نئی زندگی کی دوسری ششماہی میں قدم رکھ رہا ہے۔ اس لیے ہم نے یہ طے کیا ہے کہ عام شمارے کے صفحات کے بہت د رہی سہی مگر کسی ایک ہی موضوع پر مفید مواد پیش کیا جائے۔ چنانچہ دو کتابیں ایک تمام و کمال اور دوسری بصورت تلخیص حاضر ہیں۔ ان میں سے پہلی کتاب افادہ تاریخ از جلال کو دوسری کتاب کے مقدمے کے طور پر پڑھنا چاہیے۔ جلال کا مرتبہ لکھنؤ اسکول کے نمائندہ اکابر کا ہوتا ہے۔ اس معتبر استاد کی کتاب شائع کرتے ہوئے یہ ذہن میں ہے کہ کوئی سند مانگ بیٹھے گا۔ تاریخیں اور وفات سے متعلق حسب پیش قیمت کتاب "تاریخ لطیف" کا خلاصہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس کی طوالت اگر مانع نہ آتی رہی ہوتی تو جیسا کہ ارادہ تھا فروری کے غالب سے متعلق شمارے کے بعد شائع کر دی جاتی۔ جنوری سے اب تک رکھی ہوئی اس کی کتابت شدہ کاپیوں کے بگڑ جانے کا اندیشہ نہ درپیش ہوتا تو ابھی اشاعت میں کچھ اور تاخیر کا امکان تھا۔ اب بھی حسب منشا چھپائی ہو جائے یہ احتمال کم ہے۔ بہرحال سال رواں کے ساتویں شمارے تک تعویق سے ایک یہ پہلو ضرور نکل آیا کہ نئی ششماہی کے آغاز پر قارئین نگار کو عام تعداد صفحات میں ایک خصوصی شمارہ پہنچ رہا ہے۔

کوشش تو یہ کی گئی ہے کہ تاریخوں کو پوری صحت کے ساتھ درج کیا جائے مگر اتنی بڑی تعداد میں غلطی کا امکان ہے۔ امید ہے کہ قارئین اس بے چارگی کو پیش نظر رکھیں گے۔

افادہ تاریخ

الحمد للہ والمنۃ کہ ایں نسخہ نایاب و رسالہ افادت انتساب یعنی

رسالۂ قواعدِ تاریخ گوئی

موسوم باسمِ تاریخی

افادۂ تاریخ

۱۳۰۲ھ

از تصنیفات جناب محقق دوراں علامہ زماں سرآمد شاعراں اہل کمال حکیم سید ضامن علی صاحب جلال لکھنوی

در مطبع جعفری واقع لکھنؤ باہتمام مولوی مرزا محمد علی صاحب طبع شد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی خیر خلقہ محمد و آلہ اجمعین و علی الائمۃ المعصومین الطیبین الطاہرین بعد اس کے عرض کرتا ہے ہیچمداں کم کج بیان خوشہ چین خرمن اہل سخن نابلد کوچہ ہر علم و فن کمترین بندگان ایزد متعال تنگ سخنوران ماضی و حال حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی کہ جو آج تک کوئی رسالہ قواعد تاریخ گوئی و شرح اقسام تاریخ میں اس شرح و بسط کے ساتھ کہ طبع تاریخ گو کو قواعد و قوانین تاریخ گوئی سے آگاہی دینے کے لیے کافی و وافی ہو جاتا نہیں لکھا گیا اور بعض احباب کو بھی اس امر میں نہایت مصر پایا علی الخصوص ہیچمداں کے ایک قدرداں کرم فرمائے بیکراں جناب شیخ عبدالقادر شمس القادری المدعو بہ شاہ مرشد علی صاحب الحنفی البغدادی اصلاً والمیرٹھی مولداً عاصی تخلص منیم کلکتہ سلمہ ربہ نے کہ ادعائے شاگردی ہیچمداں بھی فرماتے ہیں کمال اصرار فرمایا ناچار بہ توفیق کاس ہیچمداں کو قواعد مذکورہ سے آگاہی و اطلاع تھی اور جو کچھ اپنے اساتذۂ محقق سے اس باب میں پایۂ تحقیق کو پہونچا تھا بقید قلم لایا اور بنا اس رسالۂ مختصرہ کی ایک مقدمہ اور تین باب اور ایک خاتمہ پر کہ وہ بھی مشتمل چند فائدوں پر ہے قائم کی جاتی ہے اور نام تاریخی اس رسالہ کے آغاز تالیف کا مادۃ التاریخ (۱۲۹۳ھ) اور ختم تالیف کا افادۂ تاریخ رکھا جاتا ہے (۱۳۰۲ھ) وہو الموفق والمستعان۔

مقدمہ

جاننا چاہیے کہ تاریخ لغت میں کسی چیز کے وقت کے ظاہر کرنے کو کہتے ہیں اور مورخین یعنی تاریخ گویوں کی اصطلاح میں کسی امر عظیم اور واقعہ قدیم و مشہور مانند کسی بادشاہ کی سلطنت یا کسی فتنہ و فساد و جنگ و کارزار یا شادی و مرگ یا بنائے عمارت و باغ وغیرہ دیگر سوانح روزگار کی ابتدا کی مدت کے

معین کرنے کو بولتے ہیں اور جب تاریخ لغوی اور اصطلاحی دونوں کی تعریف بیان ہو چکی تو اب تاریخ گوئی بھی جاننا چاہیے کہ تاریخ کی جو ایک قسم معنوی ہے جس کا بیان انشاء اللہ تعالیٰ آگے بڑھ کر ہوگا۔ اس میں بحث اعداد حروف سے کی جاتی ہے۔

پس آگاہ ہونا چاہیے کہ تاریخ میں حروف کتابی کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ حروف ملفوظی معتبر نہیں ہوتے یعنی جو حروف کتابت میں آئے۔ اس کے عدد لیے جاتے ہیں۔ اور جو لفظ بولا جائے کتابت میں نہ آئے۔ اس کے عدد نہیں لیے ملتے ہیں۔ بخلاف حروف کے کہ عروضی کے نزدیک تقطیع میں حروف ملفوظی معتبر ہوتے ہیں مکتوبی کا اعتبار نہیں کیا جاتا مثلاً کتابت عربی میں بروالف بعد واو جمع کے لکھا جاتا ہے جیسے واوٴ آمنوا وغیرہ کے بعد یا لفظ انا کے آخر میں بدون حالت وقف کے آتا ہے یا الف وصل جو اثنائے کلمات میں متصل بکدیگر آجاتا ہے جیسے واتقوا ہم میں اور واو کہ نام عمرو بالنصب کے آخر میں لکھتے ہیں پس یہ سب الف اور واو تاریخ میں ضرور لیے جائیں گے اور مثلاً فارسی میں بھی الف وصل کا اور واو عطف کا جو دو کلموں کے درمیان میں لکھا جاتا ہے اور بعید نظم اکثر تلفظ میں نہیں آتا جیسے من او تو (بوزن فعولن) اور دل و جان (بوزن فعلن) ہیں یہ تاریخ میں اس الف اور واو کا بھی محسوب کرنا ضرور چاہیے۔ اور ہے (د) کہ لفظ کہ دیدہ کے آخر میں لکھی جاتی ہے اور تلفظ میں نہیں آتی اور واو جو لفظ دو و تو و جو وغیرہ کے آخر میں لکھا جاتا ہے اور تلفظ میں نہیں آتا ان حروف کا بھی تاریخ میں محسوب کرنا ضرور چاہیے۔ اور مثلاً کلمات ہندی میں بھی جو ہا و یاے مخلوط التلفظ اور واو و نون مخلوط التلفظ آتے ہیں جیسے اُبھار، پیار، گھار اور سیان گیان دھیان اور ماو باؤں اور انگال اور مانگ سانگ وغیرہ ان سب بھی تاریخ میں محسوب ہوں گے اور مثلاً عربی میں الف اللہ کا بعد لام کے اور سموات کا بعد میم کے اور اسحٰق کا بعد حا کے اور رہنما کا بعد ہاے اول کے جو ملفوظ ہوتا ہے اور داؤد کا اور یٰ یحییٰ کی جو بعد یا کے ظاہر ہوتی ہے اور تنوین کا نون اور حرف مشدد سے جو دوسرا حرف پیدا ہوتا ہے ان میں سے کوئی حرف تاریخ میں نہیں لیا جاتا اس واسطے کہ مکتوب نہیں ہے تو پس تاریخ وفات نواب آصف الدولہ بہادر مرحوم میں جو کسی بزرگ نے فرمایا ہے ع رہنما روح در ریحان و جنات النعیم ۱۲۱۲ھ اس میں الف رہنما کا جو بعد ہا ے اول کے تلفظ میں آتا ہے اس کا بھی ایک عدد لے لیا ہے یہ ہرگز درست نہ ہوگا۔ اور فارسی میں بھی الف ممدودہ مثل جیسے لفظ آب و آمد میں پایا جاتا ہے اور تشدید راے کے لفظ اره و برّان و خرّم و خرّخ وغیرہ سے جو دوسری رے پیدا ہوتی ہے یہ حروف تاریخ میں نہ محسوب ہوں گے اس لیے کہ کتابت میں نہیں آتے اور ہندی میں بھی الف ممدودہ جیسے لفظ آپ اور آگ میں آتا ہے تاریخ میں نہ محسوب ہوگا ؟

اور جب یہ بھی معلوم ہو چکا کہ تاریخ میں ان حروف کا اعتبار کیا جاتا ہے اور یہ حروف معتبر نہیں ہوتے تو اب طریقہ تاریخ کہنے کا بیان کیا جاتا ہے کہ کلمہ یا کلام یا فقرہ نثر یا مصرعہ نظم یا ایک بیت یا چند ابیات کو مورخ بہ فکر و غور و تامل مادہ تاریخ کا قرار دے گا شرط یہ ہے کہ جس لفظ یا جن الفاظ کو مادہ تاریخ کا قرار دے وہ با معنی ہوں بے معنی و مہمل نہ ہوں اور نہ وہ الفاظ کچھ مناسبت بھی ضرور رکھتے ہوں اس واقعہ سے جس کی تاریخ مورخ کو کہنا منظور ہے تاکہ سامع بھی سمجھ جائے کہ یہ تاریخ فلاں امر کی ہے کیونکہ اگر الفاظ مادہ تاریخ کے مہمل و بے معنے ہوں گے یا کچھ مناسبت اپنے واقعہ سے نہ رکھتے ہوں گے تو اس پر اطلاق تاریخ کا کسی طرح نہ کیا جائے گا جیسا کہ اکثر اشخاص الفاظ مہمل و بے معنی اور الفاظ غیر مناسب سے کسی واقعہ کی تاریخ پیدا کرتے ہیں پس یہ درست نہیں اور ناجائز محض ہے کیونکہ سامع کسی طرح مادہ تاریخ سے نہیں سمجھ سکتا کہ یہ فلاں واقعہ کی تاریخ ہے چنانچہ ایک بزرگ نے مولف کے دیوان اول کی طبع کی تاریخ غزلیں (۱۳۰۰ھ) فرمائی تھی مولف نے بسبب اس کی مہملیت کے اپنے دیوان میں اسے داخل نہ کیا یا کسی بزرگ نے کسی مسجد لکھنؤ کی بنا کی تاریخ لفظ تاریخ میں نکالی تھی اور وہ یہ ہے ؎

شنیدم خالق از خورشید مریخ ــ کہ تاریخ بنائے اوست تاریخ (۱۲۱۱ھ)

یا کسی نے کسی کی وفات کی تاریخ فی زمانہ لفظ اقتضا میں نکالی ہے ع

کہہ دو تقاضا مشیت خالق کا اقتضا ۱۳۰۲ھ

پس ملاحظہ ہو کہ کہاں طبع دیوان کا سال اور کہاں لفظ غزلیں اور کہاں مسجد کی بنا کے سنین اور کہاں کلمہ تاریخ اور کہاں وقت ارتحال اور کہاں لفظ اقتضا پس ان تینوں تاریخوں کے الفاظ کو کسی طرح کی مناسبت اپنے واقعے سے غور فرمایئے تو ہرگز نہیں ہے اور اس طرح کی تاریخوں کو تاریخ ہرگز مولف سمجھداں کی رائے ناقص میں نہ کہیں گے فافہم

پس اگر شعر تاریخ محض الفاظ مادہ تاریخ کے ہوں گے اس کو تاریخ صوری کہیں گے کہ گویا ظاہر اس کا شعر تاریخ ہے اور اگر اعداد جمل حروف مظہر تاریخ کے ہوں گے جس سن کے مظہر ہوں خواہ سنہ موسوی خواہ سنہ عیسوی خواہ سنہ ہجری خواہ سنہ فصلی وغیرہ اور ان سب اعداد کو یکجا کرنے سے تاریخ پیدا ہوگی اس تاریخ کو معنوی کہیں گے کہ گویا باطن اس کا مظہر تاریخ ہے اور اگر الفاظ اور اعداد حروف دونوں اظہار تاریخ میں شامل ہوں گے اس تاریخ کو ہم صوری و معنوی قرار دیں گے پس بحسب استقرائی تمام تین قسمیں تاریخ مصطلح کی قرار پاتی ہیں ایک صوری دوسری معنوی تیسری صوری و معنوی فقط

باب پہلا تاریخ صوری کے بیان میں

یعنی جس میں صرف الفاظ شعر تاریخ پر ہوتے ہیں یعنی ذکر سال و ماہ و روز واقعہ کا اس میں ہوتا ہے اور اعداد حروف سے کچھ سروکار نہیں ہوتا مثال اس کی جیسے شیخ سعدی علیہ رحمتہ نے تالیف کتاب گلستاں کی تاریخ کہی ہے ؎

درآں مدت کہ مارا وقت خوش بود ز ہجرت شش صد و پنجاہ و شش بود

یا جیسے کسی اور نے قدما میں سے یہ تاریخ شاہ تیمور کی ولادت و خروج و وفات کی کہی ہے

رباعی

سلطان تیمور کہ مثل او شاہ نبود
در ہفصد و سی و سہ بوجود آمد بوجود
در ہفصد و ہفتاد و یکے کرد خروج
در ہفصد و ہفت کرد عالم پدرود

(منقول از قلزم ہفتم کتاب ہفت قلزم)

باب دوسرا تاریخ معنوی کے بیان میں

یعنی جس میں محض اعداد حروف مظہر تاریخ ہوتے ہیں اور لفظ سال واقعہ ان اعداد سے پیدا ہوتا ہے اور الفاظ سے کچھ بحث نہیں ہوتی البتہ الفاظ کا بامعنی ہونا اور اپنے واقعے سے کسی قدر مناسبت رکھنا شرط ہے اور یہ

تین قسم پر ہے **سالم الاعداد۔ زائد الاعداد۔ ناقص الاعداد**۔ سالم الاعداد اس تاریخ کو کہتے ہیں جس کے اعداد پورے ہوں کم زیادہ نہ ہوں مثال اس کی جیسے نواب آصف الدولہ بہادر مرحوم کے انتقال کی تاریخ کسی نے غریب (۱۲۱۲ھ) کہی ہے کہ ایک کلمہ میں ہے یا جیسے ناسخ مرحوم استاذ الاستاذ نے مولف کے اپنے دیوان دوم کی ترتیب کی تاریخ در پریشانی آمد و رفت الہ آباد میں فرمائی ہے۔ **دفتر پریشان** (۱۲۳۸ھ) یا کسی کے دو فرزندوں کی وفات کی تاریخ فرمائی ہے **داغ جگر** (۱۲۲۸ھ) **وداغ دگر** (۱۲۲۹ھ) کہ ایک نے ایک سال میں وفات کی تھی اور دوسرے نے دوسرے سال میں یا مولف نے اپنی ولی نعمی نواب محمد کلب علی خاں صاحب بہادر خسرو خسروان دام اقبالہم کے دیوان نجم کے طبع کی تاریخ کہی ہے۔ **دفتر خوبی** (۱۳۰۲ھ) کہ یہ سب تاریخیں دو دو لفظوں میں یعنی کلام میں پائی جاتی ہیں یا جیسے مولف نے ایک شاعر کے ختم دیوان کی تاریخ کہا ہے **آئینہ معشوق سخن** (۱۳۰۲ھ) کہ یہ دفتر نثر میں ہے یا جیسے غنی کشمیری نے ابوطالب کلیم کی وفات کی تاریخ کہی ہے ؎

گفت تاریخ وفات او غنی طور معنی بود روشن از کلیم (۱۰۶۱ھ)

یا جناب شیخ ناسخ مرحوم نے مرزا غازی الدین حیدر بہادر بادشاہ لکھنؤ کے جلوس فرمانے کی اور نواب معتمد الدولہ بہادر کے وزیر ہونے کی تاریخ فرمائی ہے ؎

تاریخ سعید کرد ناسخ تحریر شہ اسکندر و وزیر ارسطاطالیس (۱۲۳۴ھ)

یا استاد اول مولف میر علی اوسط رشک مرحوم نے اپنے استاد جناب شیخ ناسخ مغفور کے انتقال کی تاریخ فرمائی ہے۔

مقتدای من و استاد من و قبلۂ من
حیف گردید تہ خاک نہان وا ویلا
رشک تاریخ پے لوح مزارش گفتم
مرقد ناسخ اعجاز بیان وا ویلا
۱۲۵۴ھ

یا استاد دوم مولف کے مرزا برق مغفور کتخدائی پسر واجد علی شاہ بہادر اعاد اللہ ملکہ و سلطنتہ کی تاریخ فرماتے ہیں ع

کدخدا او سلیمان جہاں را بلقیس

یا مولف نے اپنے ولی نعمی خسرو خسرواں اعلیٰ حضرت نواب محمد کلب علی خاں صاحب بہادر دام اقبالہم کی مسند نشینی اور دیوان دوم کی طبع کی ۱۲۶۰ھ

تاریخ کہی ہے ع　　جلوہ فرمود بر مسند اقبال و حشم

ع　　گوہر زیبا دہ گوش سخن

یا مولف نے نواب ضیاء الدین احمد خاں صاحب بہادر رئیس دہلوی نیر تخلص کی وفات کی تاریخ کہی ہے ع ۱۲۹۵ھ

دلی کا بجھا چراغ ہے آہ

کہ یہ سب تاریخیں ایک ایک مصرع نظم میں ہیں اور یہ قسم تاریخ کی کثر فی زمانتا ایک مصرع میں ہی کہی جاتی ہے اور بیشتر پورے مصرع میں ۱۳۰۲ھ ہوتی ہے اور اولیٰ تر یہی ہے کہ پورے مصرع میں ہو اور الفاظ مصرع کے بے تکلف ہوں اور بھرتی کے لفظ کم ہوں بلکہ نہوں تو بہتر ہے اور یہ قسم یعنی تمام الاعداد اگرچہ اپنی اور دونوں قسموں سے بہتر و خوب تر ہے اور بجائے خود یہی ایک صنعت ہے لیکن اساتذہ نے اس میں چند تکلفات و صنائع دیگر کو بھی دخل دیا ہے چنانچہ ایک ان میں سے صنعت منقوطہ ہے یعنی صنعت معجمہ اور وہ یہ ہے کہ حروف منقوطہ میں تاریخ نکالی جائے چنانچہ مولف کے ایک شاگرد دانش تخلص نے مولف کے رسالہ کارآمد شعرا کی طبع کی تاریخ جو بحث تذکیر و تانیث میں ہے اسی صنعت میں کہی ہے

دانش شدہ این نسخہ موصوف چو مطبوع　　در معجمہ تاریخ شدہ فیض جلال است

دوسری صنعت غیر منقوطہ ہے یعنی صنعت مہملہ اور وہ یہ ہے کہ حروف غیر منقوطہ میں تاریخ پیدا ہو ۱۲۹۲ھ چنانچہ مولف کے ایک شاگرد رفعت تخلص نے مولف کے دیوان اول کے طبع کی تاریخ اسی صنعت میں کہی ہے

کلام حضرت استاد باکمال چھپا　　تمام خلق ہو روشن قمر گر اس کو کہو

دماغ جاں ہو معطر نہ ہے گل خوشبو　　ہے زیب باغ سخن کا ثمر گر اس کو کہو

عجیب مہملہ میں نکلے سال اے رفعت　　سرور سرمل والا گہر گر اس کو کہو

تیسری صنعت بینات ہے اور وہ یہ ہے کہ بینات جتنے حروف ملفوظی مراد ہیں یعنی حرف باطنی سر حرف کے کہ تاریخ پیدا کریں ۱۳۱۲ھ اور زبر یعنی حروف مکتوبی کو ترک کر دیں چنانچہ با تا ثا حا خا را زا طا ظا فا ہا یا میں آ اور جیم میں یم اور دال ذال میں ال اور سین شین میں ین اور صاد ضاد میں اد اور عین غین میں ین اور قاف کاف میں اف اور لام میں ام اور میم میں یم اور نون میں ون اور واؤ میں او بینات ہوتے ہیں اور بینات کو اسم کہتے ہیں اور زبر بینتین کو کہو چنانچہ ایک شاعر نے مولف کے دیوان اول کے طبع کی تاریخ اسی صنعت میں کہی ہے

سال تاریخش محقق از رقم در بینات　　نظم دلکش راحت افزا جان فزا و با وقار

چوتھی صنعت یہ ہے کہ زبر اور بینات یعنی اسمی اور اسم ترف دونوں کے اعداد سے کرتے ہیں تاریخ نکالتے ہیں ۱۳۲۰ھ جیسے مولف کے ایک شاگرد یاس تخلص نے مولف کے دیوان اول کے ختم کی تاریخ اسی صنعت میں کہی ہے

سالش بہ زبر و بینات است　　دیوان جلال با کمال این

مگر اس میں یہ شرط ضرور ہے کہ جس طرح زبر تمام الفاظ تاریخ میں محسوب ہوتے ہیں اسی طرح بینات بھی تمام لیے جائیں یہ جائز نہیں کہ ۱۳۰۰ھ بعض بینات کو لے لیں اور بعض کو ترک کریں جیسا کہ مرزا سلامت علی دبیر مغفور مرثیہ گوئی مشہور نے میر ببر علی انیس مرثیہ گوئی مرحوم کی وفات کی تاریخ زبر و بینات میں فرمائی ہے اور وہ یہ ہے ع

طور سینا بے کلیم اللہ منبر بے انیس

۱۲۹۱ھ

تمیز تخلص نے مولف کے رسالہ کارآمد شعرا" کی طبع کی تاریخ اسی صنعت میں نکالی ہے قطعہ

مرے استاد نے حقیقت میں — یہ رسالہ لکھا عجیب غریب
فکر تاریخ اسے تمیز جو کی — مادہ مل گیا عجیب غریب
متحرک حروف کو جو لیا — ہوئی تاریخ کیا عجیب غریب

۱۲۹۳ھ

آٹھواں تکلف یہ ہے کہ الفاظ مادہ تاریخ میں جو حرف ساکن ہوں ان میں تاریخ نکلے

نویں صورت یہ ہے کہ کسی اور کے کلام یعنی تاریخی مشہور کو اپنا کلام کر کے اس میں تاریخ نکالے جیسے شیخ ناسخ مغفور نے شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے اس مصرع میں۔ ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

تاریخ وفات مرزا غازی الدین حیدر بہادر بادشاہ لکھنؤ کی نکالی ہے کہ ۱۲۴۳ھ اس میں پیدا ہوتے ہیں۔ الحاصل ایسے تکلفات و صنائع تاریخ منظوی میں بہت سے ممکن الوقوع ہیں کہ ان کا حصر نا ممکن ہے فقط۔

زائد الاعداد اس تاریخ سے مراد ہے کہ مادہ تاریخ میں کچھ عدد حساب سے زیادہ ہوتے ہوں پس مورخ تاریخ کے پورا کرنے کے لیے ان اعداد زائد کا تخرجہ معمے کے طور پر کرے یعنی کوئی لفظ ہم عدد ان اعداد زائد کا کہ مناسب مقام ہو تجویز کرے، اور مادہ تاریخ میں سے اس لفظ کے خارج کر دینے کا اشعار کرے مثال اس کی جیسے یہ تاریخ مشہور ہے قتل سید الشہدا علیہ السلام کی کہ سنہ ۶۰ھ میں قتل مذکور واقع ہوا تھا اور اس تاریخ کو منسوب مولوی روم علیہ الرحمتہ کی طرف کرتے ہیں ؎

من چہ گویم کربلا را دانقات — آہ بیرون آمدہ از اسم ذات

کہ لفظ اللہ کہ اسم ذات ہے پس یہ مادہ تاریخ ہے اور اس میں چھ عدد زیادہ ہوتے تھے پس مورخ نے لفظ آہ کو لے کر کہ اس کے بھی چھ عدد تھے اور مناسب مقام بھی تھا اللہ میں سے خارج کر دیا یعنی الف و ہا کو نکال ڈالا تاریخ پوری ہو گئی یعنی ۶۰ عدد دو لاموں کے باقی رہ گئے اور یہ بھی تاریخ اسی واقعہ کی اور اسی قسم کی ہے اور اس کو بھی لوگ منسوب مولوی روم علیہ الرحمتہ کی طرف کرتے ہیں ع

سر دین را برید بے دینی

کہ مادہ تاریخ لفظ دین ہے اور اس میں چار عدد زیادہ ہوتے تھے پس مورخ نے سر دین یعنی حرف د کو جدا کر دیا تاریخ پوری ہو گئی یعنی ۶۰ عدد ی اور ن کے باقی رہ گئے ایک تاریخ اور اسی واقعہ کی مشہور ہے اور اسی قسم کی ہے لا ادری ع

نبیؐ بیدل شدہ در ماتم او

کہ لفظ نبیؐ جب بے دل ہو گیا یعنی ب نبیؐ میں سے نکل گئی تو تاریخ پوری ہو گئی ایک تاریخ اور اسی واقعہ کی گوش زد مولف ہے کہ وہ بھی اسی قسم کی ہے کہ بعد تخرجہ اعداد زائد کے جو کچھ باقی رہتا ہے اس کے زبر اور بینات دونوں میں تاریخ پیدا ہوتی ہے اور وہ یہ ہے ؎ سر حسینؑ برید۔ فافہم یا جیسے یہ تاریخ مشہور ہے ع زلغوت خانہ بیرون کن نگس را۔ یا یہ تاریخ معروف کسی کی ع از حوض لطیف آب بردار یہ بھی دونوں تاریخیں اسی قسم کی ہیں۔ یا جیسے یہ تاریخ وفات شیخ عبدالحی حیاتی تخلص خلف شیخ جمالی دہلوی کی کہ سید شاہ میرک جو اولاد سید شریف جرجانی سے تھے ان کی کہی ہوئی ہے قطعہ

نادر العصر شیخ عبدالحی — کہ بوصفش مرا زبان نبود
وقت نزعش بسر رسیدم من — گفتم اے چون تو در جہان نبود
سال تاریخ خویش خود فرما — کہ جزاو درد در زبان نبود
گفت تاریخ من بود نامم — بندہ وقتیکہ درمیان نبود

شیخ عبدالحی مادہ تاریخ تھا اس میں لفظ عبد کے عدد زیادہ ہوتے تھے پس اس کا فارسی میں مرادف جو لفظ بندہ تھا اس کو مادہ تاریخ سے

اور ایک قسم تاریخ کی اور ہے کہ اگرچہ جداگانہ ہے لیکن قسم تاریخ زائد الاعداد و ناقص الاعداد میں داخل ہے یعنی تعمیہ یا تخرجہ و تتمیہ باندخلہ دونوں کو شامل ہے مثال اس کی جیسے یہ تاریخ مشہور نعمت خاں عالی کی۔ قطعہ

بوالحسن داشت جا بچار محل　　بدرش گردزان میاں تقدیر
ادچو برخاست بجاش نشست　　شاہ اورنگ زیب عالم گیر

مادہ تاریخ لفظ چار محل ہے اس کے ۷۸۲ عدد ہوتے تھے پس اس میں سے مورخ نے بوالحسن کو کہ اس کے ۱۰۵ عدد ہوتے ہیں خارج کیا اب رہ گئے مادہ تاریخ کے ۱۱۵ عدد ان میں شاہ اورنگ زیب عالم گیر کے عدد کہ ۹۷۲ ہوتے ہیں داخل کر دیے پس تاریخ تعمیہ یا تخرجہ و تتمیہ باندخلہ دونوں کو شامل ہو گئی اور ۱۰۸۷ھ حاصل ہوئے پس یہی سنین مورخ کو مقصود تھے۔

باب تیسرا قسم تاریخ ہم صوری و ہم معنوی کے بیان میں

تاریخ صوری و معنوی اُسے کہتے ہیں جس کے ظاہر و باطن دونوں تاریخ ہونے پر دلالت کریں یعنی الفاظ بھی شعر تاریخ پر ہوں اور اعداد حروف بھی یعنی ذکر سال و ماہ و روز و واقعہ بھی اس میں ہو اور اعداد بھی بہ حساب ابجد اُس سال پر دلالت کریں جس میں وہ واقعہ ہوا ہے مثال اس کی جیسے یہ تاریخ استاد اول مولف خیابان میر علی اوسط رشک مرحوم کی ہے ؎

مرد سہ جوان علی خاں فاضل　　کہ سالِ الف و دو صد و شصت و چہار
۱۲۶۴ھ

یا جیسے یہ تاریخ شیخ ناسخ مغفور کی کہ کسی کی وفات کی ہے ؎

طبع ناسخ سال تاریخ وفات　　گفت بست و ہشتم ماہ رجب
۱۲۲۸ھ

ولہ ایضاً ؏ دوشنبہ پنجم ذی حجہ اے وائے ولہ ایضاً ؏ حیف روز اول ذیقعدہ بود — یا جیسے استاد دوم مولف مرزا محمد رضا برق مغفور مخاطب بہ فتح الدولہ بہادر کی یہ دو تاریخیں وفات مرزا نصیر الدین حیدر بہادر و محمد علی شاہ بادشاہان لکھنؤ ؏
۱۲۱۰ھ　۱۲۴۹ھ

دہ سال و پنج روز حکومت نمودہ شد۔ ؏ دہ روز و پنج سال حکومت نمودہ شد۔
۱۲۵۳ھ

اور ایک قسم تاریخ صوری و معنوی کی یہ ہے کہ جس میں بجائے ذکر سال و ماہ و روز ذکر اسماء و صفات و امراض وغیرہ کا کیا جائے چنانچہ جناب میر علی اوسط رشک مغفور اپنے والد ماجد مرحوم کے انتقال کی تاریخ فرماتے ہیں ؎

این صوری و معنوی نوشتم تاریخ　　سید سلطان وائے وفاضل ہے ہے — ایضاً ولہ ؎
۱۲۲۹ھ

بر ہوئی انتقال کی تاریخ　　نوجواں خوشنویس سید ہائے
۱۲۳۰ھ

ایضاً ولہ ؎　　سر زد ش مصرع تاریخ انتقال نوشت
فقیہہ دعا بد و زاہد طبیب وفاضل آہ
۱۲۴۷ھ

ایضاً ولہ ؎　　مرد از سرطان وذات الجنب وا ویلاہ وائے
۱۲۴۰ھ

ایضاً ولہ ؎　　مرد نسیم ز ہیضہ ہے ہے

خاتمہ مشتمل ہے چند فائدوں پر۔ فائدہ لفظ اللہ کے چھیاسٹھ عدد لینا چاہیئے۔ اس لیے کہ اس لفظ میں ایک الف اور دو لام اور ایک ہے مکتوبی ہے موافق اس مصرع مشہور کے ؏ اللہ بود یک الف و ہا و دو لام اور دوسرا الف جو بعد لام کے تلفظ میں آتا ہے وہ معتبر نہ کیا جائے کیونکہ تاریخ میں حروف مکتوبی معتبر ہوتے ہیں حروف ملفوظی کا اعتبار نہیں کیا جاتا تنبیہ اگر کوئی اعتراض کرے کہ اللہ کا لام مشدد ہے اور دوسرا لام بسبب تشدید کے پیدا ہوتا ہے یعنی ملفوظی ہے پس اس کا اعتبار تاریخ میں کیوں کیا گیا اور اس کے عدد کیوں لیے گئے جواب اس کا یہ ہے کہ دوسرا لام باعتبار تلفظ کے اللہ میں نہیں لیا جاتا بلکہ باعتبار کتابت کے لیا جاتا ہے کہ مکتوبی ہے یعنی بعد لام کے جو ایک شوشہ بارسم الخط عربی میں لکھ دیا جاتا ہے

اور رسم الخط فارسی میں بھی اگر غور کیا جائے تو وہ شوشہ ہوتا ہے لیکن بہت مختصر سا اس کو دوسرا لام تصور کر لیتے ہیں گویا اللّٰہ سمجھ لیا ہے اور اگر معترض یہ کہے کہ شوشہ مذکورہ اس الف کی علامت ہے جو بعد لام کے ہے جواب اس کا یہ ہے کہ اس امر کی تصریح مقدمہ میں کردی گئی ہے کہ وہ الف جو بعد لام کے ہے مکتوبی نہیں ہے ملفوظی ہے جیسا کہ معیار الاشعار میں محقق طوسی علیہ الرحمۃ نے بھی لکھ دیا ہے۔ من اراد التحقیق فلیرجع الیہ پس شوشہ مذکورہ بجز دوسرے لام کے اور کوئی حرف نہیں تصور کیا جا سکتا کہ حقیقت میں بھی لفظ اللّٰہ میں دو لام ہیں یعنی اصل میں یہ لفظ الالٰہ ہے پس بقاعدہ عربی لام اول کو لام ثانی میں بعد حذف الف کے ادغام کر دیا ہے فائدہ جو فت کہ رسم الخط عربی میں جو یے یعنی دراز لکھی جاتی ہے مانند تائے جمع وغیرہ کے جیسے کائنات صفات ذات سبحانت مافات وغیرہ کی تے اس کے چار سیکڑے تاریخ میں لیے جائیں گے اور تائے تانیث یعنی تائے مدوری وغیرہ کے پانچ آحاد لینا چاہیئے کیونکہ ایسی تے کو رسم الخط عربی میں مدور ہی گرد لکھتے ہیں بشکل ہائے ہوز جو ہے کے عدد ہوتے ہیں وہی عدد اس تے کے بھی لینا چاہیئے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ الف مقصورہ کے بھی جو لفظ اعلےٰ ادنیٰ موسیٰ عیسیٰ مصطفیٰ مرتضیٰ وغیرہ کے آخر میں آتا ہے دس عدد لیے جاتے ہیں ایک عدد نہیں جاتا اس واسطے کہ رسم الخط عربی میں الف مقصورہ بشکل یائے تحتانی لکھا جاتا ہے پس مورخین محقق ثقات نے ایسی تے کے پانچ ہی عدد لیے ہیں یعنی اس تے کو ہے قرار دیا ہے اور محض کتابت کا اعتبار کیا ہے چنانچہ استاد اول مولف جناب امیر سلی اوسط رشک مغفور نے کسی کی کتاب موسوم بہ ہدایۃ الشعرا کے ختم کی تاریخ جو فرمائی ہے ؎

زعیب یافتم اے رشک مصرع تاریخ ہدایۃ الشعرا جلائے حل معضلات

۱۲۵۰ھ

تو اس میں تائے مدورہ لفظ ہدایۃ الشعرا کے پانچ آحاد لیے ہیں یا منشی مظفر علی اسیر مرحوم نے جو نواب امداد حسین خاں صاحب بہادر مغفور مخاطب بامین الدولہ وزیر اعظم امجد علی شاہ بادشاہ لکھنؤ کے کسی مرض سے صحت پانے کی تاریخ کہی ہے چنانچہ ان کے دیوان فارسی میں موجود ہے۔ اللھم احفظ من البلیۃ اس میں بھی تائے بلیۃ کے پانچ لیے ہیں یا منشی امیر احمد صاحب امیر تخلص سلمہ اللّٰہ تعالیٰ ارشد تلامذہ اسیر مرحوم نے جو اپنے دیوان کا نام تاریخی مرآۃ الغیب رکھا ہے اس میں بھی تائے مرآۃ کے پانچ ہی عدد لیے ہیں یا منشی سید اسمٰعیل حسین منیر مرحوم شاگرد رشک مغفور نے جو دیوان سوم اعلیٰ حضرت قدر قدرت خداوند نعمت نواب محمد کلب علی خاں صاحب بہادر دام اقبالہم والی ریاست رام پور کا نام تاریخی درۃ الانتخاب رکھا ہے اس میں بھی تائے درۃ کے پانچ ہی عدد لیے ہیں یا مولف رسالہ ہٰذا نے جو اسم تاریخی رسالہ ہٰذا کے آغاز تالیف کا مادۃ التاریخ رکھا ہے اس میں بھی لفظ مادۃ کی تے کے پانچ آحاد لیے ہیں اور بڑی دلیل تو اس تے یعنی تائے مدورہ کی ہے (ۃ) قرار دینے کی مولف کے پاس یہ ہے کہ صاحب مقامات نے جو مقدمہ نسبت دو ہشتم میں خطبہ منہ مہملہ یعنی غیر منقوط میں لکھا ہے اس میں اس طرح کی تائیں بہت سی آگئی ہیں کہ وہ سب ہا قرار دی جاتی ہیں چنانچہ اس خطبہ کی عبارت کسی قدر موافق ضرورت کے اس مختصر میں بھی لکھی جاتی ہے اور وہ یہ ہے۔

قال الحمد للّٰہ الممدوح الاسماء المحمود الآلاء الواسع العطاء المدعو لحسم اللاواء مالک الامم و مصور الرمم و مکرم اھل السماح والکرم و مھلک عاد وارم ادرک کل سر علمہ و وسع کل مصر حلمہ و عم کل عالم طولہ و ھد کل مارد حولہ احمدہ حمد موحد مسلم وادعوہ دعاء مومل مسلم وھو اللّٰہ لا الٰہ الا ھو الواحد الاحد العادل الصمد لا ولد لہ ولا والد معہ ولا مساعد ارسل محمدا للاسلام ممھدا وللملۃ موطدا ولا دلۃ الرسل موکدا وللاسود والاحمر مسددا وصل الارحام وعلم الاحکام ووسم الحلال والحرام ورسم الاحلال والاحرام کرم اللّٰہ محلہ وکمل الصلوٰۃ والسلام لہ الخ پس اکثر مورخین نے چار سیکڑے بھی تائے مدورہ کی تاریخ میں لیے ہیں چنانچہ مولوی فائق مرحوم صاحب کتاب مخزن الفوائد نے جو تاریخ بنائے مسجد مطہور کی جس کے بانی نواب زین العابدین خاں بہادر مغفور تھے کہی ہے ؎

تا ئق دوگانہ کرد بہ محراب ادادا تاریخ گفت خضر کہ قد قامت الصلوٰۃ

۱۲۰۲ھ

تائے صلوٰۃ کے چار سو لیے ہیں یا اپنی کتاب مخزن الفوائد کا جو نام تاریخی خزینۃ الاصول رکھا ہے اس میں بھی تائے خزینۃ کے چار سو لیے ہیں یا جیسے مولوی عبد الباسط مرحوم امیٹھوی نے کہ بعنایت الٰہی بہت بڑے مورخ تھے اپنے جد جدہ کی وفات کی تاریخ فرمائی

ے سے   گفت از خدا اش با احبا سب   اسکن انت وزوجک الجنۃ

۱۲۰۸ھ

تلائے جنۃ کے چار سیکڑے لیے ہیں یہ امر مولف ہجیداں کی رائے ناقص میں مخدوش ہے اور پایہ اعتبار سے ساقط کیونکر یہ نے صورتا ہے ہے اور ہے ہونا ایسی تے کا بہ دلائل و براہین اپنے مقام پر ثابت ہو چکا ہے پس تائے مدورہ کے چار سو لینا کیونکر جائز ہوگا ہاں چار سو اس وقت جائز ہو سکتا ہے کہ جب کوئی اس امر کو بہ دلائل باطل کر دے کہ کتابت حروف کو تاریخ میں کچھ دخل نہیں اور رسم الخط کا بھی بطلان ہے تو یہ محال ہے کہ بطلان ان دونوں امر ولسا کا ہو نہیں سکتا اور یہ دلیل اس پر لانا کا کثر لوگوں نے یہی تے کے چار سو لیے ہیں اور اس کے نظائر رنانا موجع محض ہے کیونکہ خلاف قاعدہ اور قرار داد اہل فن جو امر کسی سے وقوع میں آئے گا وہ کیونکر سراہا جائے گا گو کثرت سے ہو چنانچہ مولف ہیچمداں کا مویدیہ مقولہ صاحب تذکرہ خزانہ عامرہ میر غلام علی آزاد بلگرامی مرحوم کا بھی ہے کہ وہ تذکرہ خزانہ عامرہ میں ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ تاریخ مرزا قطب الدین مائل یعنی جعل جنۃ مثواہ وتفضلے خاندہ کہ مورخ آں یعنی محمد کعب از تلائے جنۃ کہ آخر اوراً ملائے عربی بشکل ہائے مدچہار صد گرفتہ حال آنکہ ہیچ بایدگر فتنی زیراکہ معتبر نزد اہل عمل صورت کتابت باشد نہ ملفظ منقول از تذکرہ خزانہ عامرہ صفحہ ۳۰۳ مطبوعہ منشی نولکشور تنبیہ سنا گیا ہے کہ مولوی امام بخش صہبائی مرحوم دہلوی نے تاریخ میں تلائے مدورہ مذکورہ کے چار سیکڑے اور پانچ احاد لینے کے میں ایک محاکمہ فرمایا ہے یعنی قول فیصل لکھا ہے اور وہ یہ ہے کہ تلائے مدورہ موقوف کے تو پانچ آحاد لیے جائیں اور ہو لکھا سکتے ہلا رب الکعبہ تے کے تو پانچ احاد لیے جائیں اور کعبۃ اللہ کی تے کے پانچ چار سیکڑے۔ واہ کیا خوب فیصلہ کیا ہے حضرت نے قاعدہ تاریخ ہی کو برہم کر دیا یعنی صورت کتابت کو کچھ دخل تاریخ میں نہ رہا حض تلفظ پر کہ جس کا مطلق اعتبار تاریخ میں نہیں ہے دارومدار رکھا گیا ہے یعنی رب الکعبہ میں جو دو رحالت وقف ہے (ہ) ملفوظ ہوتی ہے اس کے پانچ لیے جائیں اور کعبۃ اللہ میں برحالت اصل جو تے ملفوظ ہوتی ہے اس کے چار سو اس فیصلہ کو ان کے معتقدین ہی تسلیم فرمائیں دوسرا کیوں فکر مار دے کر قاعدہ تاریخ ہی مٹا جاتا ہے فقط۔

فائدہ۔ الف وصل کا عبارت فارسی میں جہاں لکھا جائے گا تاریخ میں اس کا ایک عدد لیا جائے گا اور جہاں بہ اعتبار محذوف ہونے کے کتابت میں نہ آئے گا کوئی عدد اس کا نہ لیا جائے گا مثلاً افتادست کے الف کا بضرورت اعداد لکھنا اور بے ضرورت نہ لکھنا دونوں طرح جائز ہے۔

فائدہ الف مقصورہ جو آخر الفاظ عربیہ میں آتا ہے جیسے عیسیٰ۔ موسیٰ۔ مصطفیٰ۔ مرتضیٰ وغیرہ میں اس کی تاریخ میں دس عدد لیے جائیں گے کتابت اس کی بصورت یائے تحتانی مقرر کی گئی ہے چنانچہ رشک مغفور نے مرزا فضل غافل ذاکر سید الشہدا کے انتقال کی تاریخ میں لفظ مصطفیٰ کے الف مقصورہ کے دس عدد لیے ہیں۔ سے

ذاکر سبط مصطفےٰ ہے ہے

۱۲۶۰ھ

فائدہ۔ الف ممدودہ کا جو اول الفاظ میں آتا ہے تاریخ میں ایک عدد لیا جائے گا۔ اس لیے کہ کتابت اس کی ایک الف کے ساتھ ہے مثلاً لفظ آجانے کے ۴۱ اور لفظ آزاد کے ۱۲ عدد لیے جائیں گے فائدہ ہائے مختفیہ جو الفاظ فارسی میں آتی ہے مانند ہائے بیان حرکت وغیرہ کے جہاں کتابت میں آئے گی اس کے پانچ عدد لیے جائیں گے اور جہاں نہ لکھی جائے گی۔ کوئی عدد اس کا نہ لیا جائے گا مثلاً کاف بیانیہ یعنی لفظ کہ جب وہ لکھا جائے گا یعنی دوسرے لفظ سے نہ ملے گا تو ۲۵ عدد اس کے لیے جائیں گے۔ کاف کے ۲۰ ہا کے ۵ یا جیسے شیخ ناسخ مغفور کی اس تاریخ میں سے

افسوس کہ موت نے گھسیٹا

اور جب کسی اور لفظ سے مل جائے گا جیسے لفظ کز کہ اس میں فقط کاف کے ۲۰ عدد لیے جائیں گے اور ہا کے ۵ عدد نہ لیے جائیں گے فائدہ ہمزہ جو خط منحنی سے عبارت ہے اس کا کوئی عدد تاریخ میں نہیں لیا جاتا اس لیے کہ یہ کوئی حرف حروف تہجی میں سے نہیں ہے تنبیہ کسی نے انشائے دھورام کی تالیف کی تاریخ جو کہی ہے سے

ہاتف گفت سال تاریخش   کہ زہے منشآت مادھورام

اس میں لفظ منشآت کے ہمزہ کا بھی ایک عدد لیا ہے یا کسی نے اس تاریخ میں وفات نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم رئیس دہلی کی تاریخ ہے برجا ہی

دردا کہ ضیاء دین احمد بربست　　رخت سفر از جہان کہ جائے سفر است
از طاق و زایوان و زبزم و طلبا　　بگسستہ برحمت الٰہی پیوست

ضیاء دین احمد کے ہمزہ کا بھی ایک عدد لے لیا ہے یعنی مادۂ تاریخ ضیاء دین احمد ہے پس بشرطیکہ اس فقرہ کے ہمزہ اضافت کا بھی ایک عدد لے لیا جائے تو ۲۹ ۹ ہوتے ہیں پس ان اعداد میں سے لفظ طاق و ایوان و بزم و طلبا کے عدد کہ ۲۱ ۳ ہوتے تھے پس پہلے مورخ نے نکال ڈالے تو ۷۰۸ باقی رہے بعد اس کے تاریخ کے پورا کرنے کے لیے رحمت الٰہی کے عدد کہ ۹۴ ۶ ہوتے ہیں ان میں داخل کر دیے۔ تو ۱۳۰۲ھ ہو گئے اور یہی سنین مورخ کو مقصود تھے اور یہ تاریخ مورخ نے صنعت تعمیہ یا تخرجہ و تعمیہ یا تذخلہ دونوں میں کہی ہے پس مولف بحیداں کے نزدیک ہمزہ کا ایک عدد لینا کسی طرح صحیح نہ ہوگا غلط بلکہ اغلط ہے کہ مورخین ثقات نے کبھی ہمزہ کا کوئی عدد تاریخ میں نہیں لیا فائدہ دہ یائے معروف جس پر ہمزہ یعنی خط مخفی لکھ دیتے ہیں عربی کی ہو خواہ فارسی کی خواہ ہندی کی اس کے بیس عدد لیے جائیں گے اس لیے کہ جب کسرہ ماقبل اس کا اشباع پائے گا وہ دوسری یا ہو جائے گی اور کتابت بھی اس کی دو یاؤں سے چاہیے ہے جیسے لفظ مائی۔ ہوائی۔ خدائی۔ رہائی۔ آئی۔ پائی۔ نبائی۔ کھائی گئی کہی بھی ہوئی نوہوائی وغیرہ کی یائے معروف کے بیس عدد لیے جائیں گے چنانچہ شیخ ناسخ مرحوم نے کسی کی شادی کتخدائی کی تاریخ فرمائی ہے اور اس میں لفظ کتخدائی کی یائے معروف کے بیس عدد لیے ہیں ؎

رقم سال کردم بدست خفائی　　ہمایون و مسعود شد کتخدائی

یا منشی مظفر علی اسیر مرحوم نے نواب یوسف علی خاں بہادر مغفور والی ریاست رام پور کے غسل صحت کی تاریخ میں لفظ آئی اور ؎ کی یائے معروف کے بیس عدد لیے ہیں۔ ع　دعائے خلق و دوا سے دکھی شفا پائی

یا مولف نے نواب مرزا خاں داغ دہلوی کے طبع دیوان اول کی تاریخ میں لفظ آئی کے بیس عدد لیے ہیں ع

بو گلزار داغ آئی آج
۱۲۹۶ھ

اور یائے مجہول کے عدد خواہ اس پر ہمزہ لکھا جائے خواہ نہ لکھا جائے دس عدد لیے جائیں گے جیسے لفظ جائے۔ خدائے۔ صفائے۔ آئے پائے۔ لائے کی یائے مجہول کے عدد دس لیے جائیں گے۔ خواہ یہ سب الفاظ بوزن فاع و فعول پڑھے جائیں گے خواہ بروزن فعلن و فعولن آئیں۔ اور کتابت بھی اس یا کی ایک یا سے چاہیے ہے اور لفظ کیجیے دیجیے اور دیے جیسے لیے کیے گئے تئے کی یائے مجہول کے بیس عدد لیے جائیں گے اس واسطے کہ یہ بولی بھی مکرر جاتی ہے اور کتابت میں بھی مکرر آتی ہے۔

فائدہ حروف مقطعات کے اعداد بہ اعتبار ان کے زبر کے لیے جائیں گے یعنی جس طرح لکھنے میں آتے ہیں مثلاً حمعسق کے ح کے ۸ م کے ۴۰ ع کے ۷۰ س کے ۶۰ ق کے ۱۰۰ ایسے جائیں گے بینات ان حروف کی تاریخ میں نہ محسوب ہوں گے ہاں اگر بینات کے اعداد لینے کا اشعار کر دیا جائے گا تو اس وقت وہ بھی محسوب کیے جائیں گے فائدہ لفظ رئیس و سئیس و آئین و آئینہ وغیرہ کی یا کے بیس عدد تاریخ میں لیے جائیں گے کیونکہ حقیقتاً بھی مکرر ہے اور کتابتاً بھی چنانچہ اس تاریخ میں جناب میر علی اوسط رشک مغفور نے لفظ رئیس میں دو یائیں لی ہیں ؎

ہاتف بگفت مصرع تاریخ رحلتش　　بودہ رئیس و سید و سردار افسران
۱۲۷۴

یا جیسے مولف نے خلعت مسند نشینی ولی نعمی نواب محمد کلب علی خاں صاحب بہادر دام اقبالہم کے ملکہ انگلستان کی طرف سے آنے کے جشن کی تاریخ کہی ہے اس میں لفظ آئین کی دو یائیں لی ہیں ؎

کہہ کے یہ تاریخ بہر پیش کش لایا جلال　　آج رشک جشن جم بزم طرب آئین ہوئی

اور یہاں لفظ ہوئی میں بھی دو یائیں مولف نے لی ہیں کیونکہ یہی یائے معروف ہے جس پر ہمزہ لکھ دیتے ہیں[1] یا جیسے اس تاریخ میں آئینہ مشوق سخن کہ دیوان حضرت موجد رام پوری شاگرد مومن خاں دہلوی کی ترتیب کی ہے لفظ آئینہ میں دو یائیں لی ہیں فائدہ لفظ نیتین و مبیتین وغیرہ میں ایک یا کے عدد تاریخ میں لیے جائیں گے کہ ان الفاظ کے رسم الخط میں مکتوب ایک ہی یا ہوتی ہے چنانچہ خاتم النبیین کے ۱۱۸۴ اور سید المرسلین

[1] مولف کی یہ رائے درست نہیں ہے نیتین و مبیتین میں دو یائیں لکھی جاتی ہیں ان میں پہلی یا مشدد ہے اور دوسری مصحف نگار

کے ۲۰۶۱۔ عدد تاریخ میں لینا چاہیئے فائدہ مصرع تاریخ کی موزونیت کے لیے جو مورخ زیادہ مادہ تاریخ سے کچھ الفاظ لے آتا ہے مانند کاف بیانیہ وگفت وگفتند نوشت ونوشتہ دبگو دبخوان وغیرہ کے یا ہندی میں مانند کہہ اور پڑھ اور بولا اور کہا اور لکھا وغیرہ کے یا مثل لفظ فلک ملک ہاتف سروش دل طبع عقل خرد تخلص مورخ وغیرہ کے ہیں ان کے عدد مادہ تاریخ میں محسوب نہ ہوں گے۔ چنانچہ ان تاریخوں میں شیخ ... مرحوم کی صرف اس قبیل کے الفاظ موزونیت مصرع تاریخ کے واسطے آگئے ہیں اور مادہ تاریخ میں ان کے اعداد محسوب نہیں ہیں۔

دلا سال تاریخ جشنش بگو — کہ این کدخدائی ہمایوں لواد
۱۲۳۱ھ

ولہ

سال تاریخ پے رحلت شاہ عالم — گفت دل زیر زمین بادشہ کشور ہند

سہ	سال تاریخ عروسی ناسخ	کدخدا شد مرزا ہم نیہ سنت ۱۲۲۱ھ
سہ	پے سال ہمایوں جلوسش	بگو تاسخ کہ ظل اللہ گردید ۱۲۳۴ھ
سہ	پے سال ولادت طبع ناسخ	بگفتا کوکب برج شرافت ۱۲۳۴ھ
سہ	تاریخ اس فرح کی مطلوب جب ہوئی	بولے ملک فرح قبول امام ہے ۱۲۵۲ھ

فائدہ یہ جو مشہور ہے کہ واقعہ شادی کی تاریخ میں ایک عدد کا بڑھا دینا اور واقعہ غم کی تاریخ میں ایک عدد کا کم کر دینا جائز ہے محض غلط مشہور ہے۔ جن صاحبوں نے یہ مشہور کیا ہے ان کو سند اس کی مورخین ثقات کی تاریخوں سے دینا چاہیئے۔

فائدہ۔ وہ سنین متعارف کہ جن میں تاریخ کہی جاتی ہے یہ ہیں ۱ سنہ ہجری اور وہ زمانہ ہجرت جناب رسالتمآب سے مراد ہیں یعنی مکہ معظمہ زاد اللہ شرفہا سے حضرت کا ہجرت فرمانا اور مدینہ منورہ تشریف لانا اور یہ مجوزہ خلیفہ ثانی کے ہیں اور اب ۱۳۸۱ ہیں ۲ سنہ فصلی کہ وہ سنہ ہجری سے ۹ سال کے فاصلے کے بعد تجویز کیے گیے ہیں اور زمانہ اکبر سے تجویز ہوئے ہیں اور وہ اب ۱۳۷۰ ہیں۔ ۳ سنہ مہدی ہیں اور وہ زمانہ غیبت امام مہدی آخر الزماں سے لیے جاتے ہیں اور بعضوں نے زمانہ ولادت باسعادت سے لیا ہے اور وہ اب ۱۰۴۹ ہیں تم۔ سنہ عیسوی ہیں اور اس کو مسیحی بھی کہتے ہیں اور وہ زمانہ غیبت حضرت عیسی سے مراد ہیں اور اب ۱۸۸۵ ہیں ۵۔ سنہ موسوی اور وہ بحساب کتب تواریخ زمانہ غرق فرعون سے لیے جاتے ہیں۔ اور تا زمانہ حضرت عیسیٰ وہی مروج رہے اور اب ۱۴۲۱ ہیں ۶ سنہ بسنت بکرماجیت ہیں کہ وہ اب ۱۹۴۲ ہیں فقط

تقریظ مع قطعات تاریخ طبع رسالہ ہذا

از نتائج افکار گہربار شاعر شیریں زبان فصیح بیان جناب سید علی عبد القادر شمس القادری عرف شاہ مرشد علی صاحب الحسنی البغدادی الاصل المیدنی پوری مولدا المتخلص بہ عاصی وجمال سلمہ اللہ المتعال ولد سید سندی مرشدی ارشدی غوث ازلی محبوب باری حضرت سید شاہ مہر علی القادری البغدادی الحسنی الحسینی مؤلف رسالہ ہذا:۔

چھپا ہے نسخۂ اکسیر ایسا جو خزینہ ہے — بلاغت کا فصاحت کا ملاحت کا متانت کا
صراط منزل تحقیق سطریں ہیں حقیقت میں — ہر اک بین السطور اسمیں ہے جادہ اک طریقت کا
تجلی روشنائی شاخ نخل طور ہے خامہ — کلیم اللہ ہے مضموں ہر اک طور طاقت کا
نتیجہ فکر طبع پاک کا الفاظ زیبا ہیں — دکھاتے ہیں معانی جلوہ اعجاز کرامت کا
جو اس کی لوح میں لوح نہیں کی شان ہے پیدا — قلم عالم دکھاتا ہے قلم کے دست قدرت کا

جو نقطے ہیں وہ ہیں گرداب جو سطریں ہیں موجیں ہیں
جو صفحہ اس صحیفے کا ہے دریا ہے فصاحت کا

جو صفحے ہیں رُخِ خوباں سواد ان کا ہے گیسو
مرقع مانیؔ نامی کا ہے یوسف کی صورت کا

خواش کنز لک افکار منکوحہ سے بری ہے یہ
مٹانے سے کسی کے کب لکھا مٹتا ہے قسمت کا

جلالِ پیشوائے شاعراں اس کے مصنف ہیں
ملا ہے مرتبہ تحقیق میں جن کو امامت کا

کیا ہر فن میں عالم حق نے اس کامل سہ دل کو
عروض و قافیہ تاریخ گوئی دھیا بست کا

ترش رو ہوں گے حکیم کر رشک کی تلخی کریں جلسہ
بہت کچھ شور ہے شیریں بیانی کی حکایت کا

خدا نے اس کریم النفس کو جامع بنایا ہے
شرافت کا نجابت کا سیادت کا کرامت کا

کیا خلاق نے گویا مجسم خلق میں اس کو
مروّت کا فتوت کا عطوفت کا عنایت کا

دمِ فکر سنین طبع کلک طبعِ عاصی کو
جو تھا سودا سواد سال ہجری کی کتابت کا

پکارا ہاتفِ غیبی کہ سال طبع تم اس کے
لکھو اب چھپ گیا ہے کارنامہ ریاضت کا

سنہ ۱۳۰۳ھ

الیضاً

طبع این نامہ شد بخوبی و حسن
مژدہ بادا بجملہ اہل کمال

زد رقم سال طبع عمدہ جمال
چہ قواعد نوشت طرفہ جلال

سنہ ۱۳۰۳ھ

الیضاً

شد ندا از جید و جید او ستادم
قواعد در فن تاریخ مجموع

سنین طبع عاصی اینچنین گفت
چہ دستور العمل شد پاک مطبوع

سنہ ۱۳۰۳ھ

الیضاً

جلال نامور نے یہ رسالہ ایسا لکھا ہے
کہ جس سے مادہ تاریخ کہہ لینے کا حاصل ہو

قواعد جتنے ہیں تاریخ گوئی کے سب اس میں ہیں
نہ لکھا تھا کسی نے یوں بشرح و بسط اس فن کو

یہ نسخہ نسخۂ اکسیر ہے تحقیق کے مس کا
طلا و سیم کی کیا اس کے آگے اصل ہے تا تو!

دمِ فکر سنین طبع بولی طبع عاصی کی
"بجا ہے مادہ تاریخ کا تاریخ یہ کہہ دو

سنہ ۱۳۰۳ھ

الیضاً

حضرت ضامن علی کے نسخۂ مطبوع کا
جب کے ظاہر ہونے کا ہر جا آکر چرچا ہے آج

عیسوی تاریخ عمدہ ہاتھ آئی یہ جمال
طرفہ قانون بس یہی تاریخ گوئی کا ہے آج

۱۸۸۵ء

از نتائج افکار سخنور معنی شناس سید ذاکر حسین صاحب یاسؔ شاگرد مؤلف رسالہ ہذا

نسخۂ بے مثل اُستادم نوشت
نقطہ نقطہ شاہد علم و کمال

سال طبعش یاسؔ در منقوطہ گفت
فن تاریخ ایں رقم کردہ جلال

سنہ ۱۳۰۳ھ

از نتائج افکار گہربار شاعر بلاغت انتمای جناب منشی دھنپت رائے صاحب محقق لکھنوی مختار سرکار فیض آثار نواب حیدالدولہ عضد الملک مرزا مہدی حسین خاں بہادر اسد جنگ دام اقبالہ

خوش طبع شد رسالہ ضامن علی جلال
کو شاعر است غیرتِ خاقانی و حزین

گفتم محقق از پئے توضیح سال طبع
مطلوب و سودمند و مفید مورخین

۱۳۰۳ھ

تاریخ لطیف

اکبر علی خاں

تاریخ گوئی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بلاشبہ اس فن کے ذریعے ہم تک بے حد اہم واقعات و حادثات کے صحیح ترین حوالے پہنچے ہیں اور توقیت میں بیش از بیش مدد ملی ہے ممکن ہے کہ اس صنعت کے موجد نے تو اسے صرف اپنی ہنرمندی اور بازیگری دکھانے ہی کے لیے ایجاد کیا ہو لیکن اس کی طباعی اور ذہانت نے ایک نہایت مفید اور کارآمد پہلو بھی اختیار کر لیا۔

فن تاریخ گوئی جس مہارت کا مطالبہ کرتا ہے اس کا پورا کرنا عام طور پر بہت مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھی تاریخیں بھی حادثاً ہی کہی جاتی ہیں اور اچھے تاریخ کہنے والے بھی خال خال نظر آتے ہیں۔ تاریخ کی خوبی یہ ہے کہ کم سے کم الفاظ میں اظہار مطالب ہو جائے اور ان لفظوں کی بندش چست اور نشست درست ہو۔ ان میں اتنی جان اور کشش ہو کہ بآسانی ذہن نشیں ہو سکیں اور بھلائے نہ بھلائے جا سکیں۔ سیدھی اور سچی تاریخیں شاذ و نادر ملتی ہیں تعمیہ اور تخرجہ کا جو طریقہ برتا جاتا ہے اسے ایک طرح کا عجز بیان ہی سمجھنا چاہیے۔

یوں تو اکثر شعراء کے دواوین میں تاریخیں پائی جاتی ہیں مگر باقاعدہ تاریخوں کے مجموعے نہیں ملتے۔ صاحب عالم مارہروی نے دیوان تواریخ کے نام سے اپنی تاریخوں کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ اس کے بعد دوسری کاوش رام پور کے ایک گمنام ادب دوست بزرگ کی توجہ سے ترتیب پا سکی۔ جس کا نام انھوں نے تاریخ لطیف رکھا ہے۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ جو بخط مولف ہے رامپور رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔

صاحب تالیف کا تعارف جناب عرشی صاحب نے فہرست مخطوطات میں اس طرح کرایا ہے: "مولوی مہدی علی خاں بن بندہ علی خاں عرف اختر بلند خاں رامپوری متخلص بہ ممتاز متوفی ۱۹۲۵ء" انھیں کی ایک اور تصنیف جو اسعد رباعیات پر مشتمل ہے۔ رباعیات آرام کے نام سے شامل فہرست ہے تاریخ لطیف میں مندرج ایک قطعہ تاریخ میں بھی آرام تخلص نظم ہوا ہے۔ انتخاب یادگار میں مہدی علی خاں کا ذکر ممتاز تخلص کے تحت آیا ہے اس لیے یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ آرام تخلص تذکرے کی ترتیب کے بعد اختیار کیا گیا ہوگا۔ تذکرہ نویس نے مہدی تخلص کا اضافہ کیا ہے۔ اور تاریخ وفات ۲۵ اکتوبر بتائی ہے آئندہ صفحات میں ایک قطعہ تاریخ شریک کیا جا رہا ہے جس میں مہدی بطور تخلص استعمال کیا گیا ہے اس سے تذکرہ کلیم کی تصدیق ہوتی ہے

مہدی علی خاں امیر مینائی کے عزیز شاگردوں میں تھے چنانچہ خود استاد نے بڑی شفقت سے اپنے تذکرے میں ان کا ذکر کیا ہے اور تذکرہ لکھنے میں ان کی محنت اور دن رات مشقت کا اعتراف کیا ہے اس طرح مہدی علی خاں کو انتخاب کی تالیف و ترتیب میں معاون قرار دیا جا سکتا ہے۔

مہدی علی خاں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ رامپور کی لائبریری ہی میں گزارا وہ یہاں تحویلدار کے عہدے پر ملازم تھے۔ اور کتابوں کے بڑے رسیا۔ چنانچہ اس عظیم الشان ذخیرۂ کتب کے بارے میں ان کی نظر بڑی وسیع تھی وہ اپنی معلومات کے ذریعے لائبریری کے مہمانوں کی جس انداز پر پذیرائی کرتے تھے اس کا اعتراف ہمارے بہت سے صاحب علم مشاہیر نے کیا ہے۔

مہدی علی خاں کی تخلیق "مجموعہ رباعیات" کے علاوہ اور کوئی نہیں لیکن ان کی مرتب کردہ مختلف اصناف سخن پر مشتمل کتابیں بیس سے بھی زیادہ اور اس سے بھی زیادہ تعداد ان کتابوں کی ہے جس کے صرف ناقل مہدی علی خاں ہیں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے چاہے اپنے ذوق سے کوئی مجموعہ مرتب کر رہے ہوں یا کسی کی فرمائش یا کسی وقتی مصلحت سے کوئی کتاب وغیرہ نقل کر رہے ہوں۔

مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی مرحوم رئیس حبیب گنج اس معاملہ خصوصی میں ان کے بڑے قدردان تھے اور ان کے کتاب خانے میں رامپور کے کتاب خانے کی کتابوں کی جو نقلیں ملتی ہیں وہ اکثر و بیشتر ہمارے مہدی علی خاں ہی کے قلم سے ہیں۔

کتاب خانہ رامپور میں مہدی علی خاں کی لکھی ہوئی جو کتابیں موجود ہیں ان میں سے صرف اردو مخطوطات کے نام درج ذیل ہیں اس سے اندازہ لگائیے کہ کتنے مختلف موضوعات میں انہیں دل چسپی تھی ۔

(۱) ترجمہ رسالہ شیخ رئیس (کیمیا) ۲۔ رسالہ علم مغیبات (مسمریزم) (۳) اخبار حسن (تاریخ رہیلہ) (۴) سیر گلبو ربلک للی پیٹ (سفرنامہ) (۵) الفاظ مختلف فیہ در تذکیر و تانیث (قواعد) (۶) رسالہ مذکورات (زبان و بیان) ۷۔ کان تاریخ (بلاغت) (۸) کتاب قوافی جلال (عروض) (۹) مناظرہ تیغ و قلم (نثر مرصع) (۱۰) قصہ مہر و ماہ (داستان و قصص) (۱۱) دیوان تسکین (نظم) (۱۲) دیوان حسن (مرزا حسن) (نظم) (۱۳) انتخاب نظام (نظم) (۱۴) مضامین رفیع (دیوان نواب کلب علی خاں) (۱۵) تنقیح سخن (نواب کلب علی خاں) (۱۶) دیوان خود ۔

ان کتابوں کے علاوہ کتاب [illegible] کرنے میں کبھی [illegible] ہے موجودات اور صرف و برآمد کے رجسٹروں وغیرہ کے علاوہ ان کتابوں کے نام جو مہدی علی خاں کی اردو [illegible] یہ ہیں ۔

۱۔ عقد ثریا (۲) پیام یار (۳) [illegible] (۴) مذاق سخن (۵) قاضی الحاجات (۶) محبوب کبریا (۷) گلزار عابدی (۸) مہر نیم شب (۹) سلک گوہر (۱۰) راز و نیاز (۱۱) ارشاد ناقانی (۱۲) [illegible] (۱۳) [illegible] (۱۴) حواشی طومار نغم (۱۵) انشتر غم (۱۶) دفتر غم (۱۷) فہرست دواوین نواب (۱۸) مطالع دواوین ۱۹۔ رقعات بیگمات (۲۰) انجمن مناظرہ (۲۱) انتخاب انتخاب یادگار (۲۲) بیاض عثمانی (۵ جلدیں) ۲۳۔ کہکشاں (۱۷ جلدیں)۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کہکشاں کی ۱۷ جلدوں کے صفحات کی مجموعی تعداد پانچ ہزار پینتیس (۵۰۳۵) ہوتی ہے ۔ اس سے مہدی علی خاں کی طاقت تحریر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔

جن کتابوں کا میں نے ذکر کیا ان میں بعض تو بہت [illegible] کتابیں ہیں اور مختلف ذوق کے لوگوں کے لیے ان میں دل چسپی کا بہت کچھ مواد نکل آئے گا لیکن تاریخ لطیف کے [illegible] اگر کوئی کتاب [illegible] متوجہ کرتی ہے تو وہ رسالہ مذکورات ہے ۔ اس مختصر سے رسالے میں مذکورات سے متعلق ان فیصلوں کو یکجا کیا گیا ہے [illegible] میں مصاحبوں کی نشستوں میں زیر بحث آتے تھے ۔ چونکہ رامپور کی ادبی تاریخ کا یہ دور سنہرا دور ہے [illegible] اس لیے اس رسالے کی قدر و قیمت اور بھی بڑھ گئی ہے ۔

رامپور [illegible] انجام دی ہیں ان کا [illegible] بلکہ سا اندازہ اس رسالے سے لگایا جا سکتا ہے مرتب نے ہر جگہ [illegible] سے افادیت اور بھی دو چند ہو جاتی ہے ۔ خدا بخشے راز یزدانی مرحوم نے اسے بڑی محنت سے ایڈٹ کیا تھا اور [illegible] ادارہ نگار اس کی اشاعت کا اہتمام کرے گا ۔

مہدی علی خاں کی زندگی کے حالات [illegible] جو تاریخ لطیف کے تحت فہرست مخطوطات میں پایا جاتا ہے ۔ اور [illegible] میں نقل کر چکا ہوں اس پر تاریخی حیثیت سے کوئی اضافہ ممکن نہیں سوائے اس کے کہ انتخاب یادگار میں امیر مینائی نے ان کی عمر ۳۴ برس لکھی ہے

تاریخ لطیف میں [illegible] اردو شاعروں کی تاریخہائے وفات جمع کی گئی ہیں یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تاریخیں معیاری ہیں لیکن تاریخ کے معاملہ میں ہر جگہ فنکارانہ خوبیاں ہی اہمیت نہیں رکھتیں بلکہ ان سے حاصل شدہ معلومات کی بنیاد پر ان کی قدر و قیمت کا تعین کیا جاتا ہے ۔ تاریخ لطیف بلاشبہ اس لحاظ سے بڑی قابل قدر کتاب ہے ۔

چنانچہ ان میں سے کئی تاریخیں ایسی ہیں جن میں تاریخ وفات کے علاوہ دن وقت اور مقام کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے ۔ مرض اور مدت مرض بھی بتائی گئی ہے ۔ چند ایک میں متوفی کی زندگی کے بارے میں اور مفید معلومات بھی مل جاتی ہیں ۔ مثلاً نواب خلد آشیاں سے متعلق قطعہ تاریخ میں پیدائش اور تخت نشینی کا بھی مذکور ہے ۔ یا داغ کے قطعہ تاریخ میں جو قاضی سید مقصود حسن حیرت شاہجہانپوری نے لکھا ہے ۔ داغ کے اکسٹھ شاگردوں کے نام بھی گنائے گئے ہیں ۔

بعض قطعات [illegible] اہم بھی ہیں اور معتبر [illegible] جیسے [illegible] قطعہ تاریخ جو خود ان کے بیٹے میر مہدی کمال نے لکھا ہے ۔

اس قطعے میں انھوں نے تاریخ اور دن دونوں کو نظم کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ بیٹے کا بیان حرف آخر کا حکم رکھتا ہے۔ یہی حیثیت شاگردوں کے کہے ہوئے قطعات کی بھی ہے۔

ان میں سے بہت سے قطعات اُردو کے اہم [illegible] سے متعلق ہیں۔ کچھ کے کہنے والے معروف ہیں کچھ کے غیر معروف۔ ان میں سے اکثر کے دواوین یا ملتے نہیں یا چھپے نہیں اس لیے ان کی افادیت [illegible] اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

تاریخ لطیف کے اکثر اندراجات صاحب [illegible] کے معاصرین نے [illegible] ان کی صحت شک و شبہ سے بڑی حد تک بلند ہے۔ اس کتاب کی ترتیب میں ذاتی یادداشتوں بیاضوں قلمی دواوین اور معاصر اخبارات و رسائل سے مدد لی گئی ہوگی لیکن اس زمانے کے مذاق کے عین مطابق کہیں بھی ماخذ کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی اُردو شعرا پر کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب بے حد مفید اور ضروری تھی اس لیے میری بڑی خواہش تھی کہ اسے باقاعدہ ایڈٹ کیا جاتا اور جن لوگوں سے متعلق تاریخیں ہیں یا جن لوگوں کی کہی ہوئی تاریخیں اس میں شریک ہیں ان کے بارے میں کچھ اور معلومات فراہم کی جائیں۔ اس خیال سے کام کا آغاز تفصیلی انداز سے کیا گیا تھا۔ لیکن میری دوسری مصروفیات کی وجہ سے حسب خواہش اس کی تکمیل نہ ہو سکی اور کتاب کی اہمیت کے پیش نظر اس بات کو گوارا کرنا پڑا کہ تنگ دامانی سے فریاد کا سہارا لیتے ہوئے فی الحال مکمل کتاب کی تلخیص ہی پر اکتفا کیا جائے۔ اس طرح کتاب کا بے حد ضروری حصہ عام ہو جائے گا اور فاضل یا غیر ضروری اشعار پر صفحات ضائع نہ ہوں گے۔ موجودہ خلاصے میں بعض مستثنیات کے ساتھ صرف وہ اشعار انتخاب کیے گئے ہیں جن سے مادہ تاریخ نکلتا ہے لیکن قطعے کے کل اشعار کی تعداد بھی دے دی گئی ہے۔ چنانچہ پہلے شعر کے دائیں [illegible] سے لکھے گئے ہیں وہ قطعے کے کل اشعار کی تعداد کو ظاہر کرتے ہیں۔

عنوانات اکثر جگہ بعینہٖ نقل کر دیے ہیں کیوں کہ ان [illegible] صاحب کے مفید مطلب کسی شخص کے نام کا کوئی جزو یا خطاب یا کوئی اور تعلق شکل لے۔ قوسین کے الفاظ حاشیہ کتاب یا فہرست [illegible] کیے گئے ہیں۔

کتاب کے کاغذ کا رنگ ہلکا بادامی۔ تحریر صاف اور [illegible] عنوانات [illegible] ہیں اور بیشتر مقامات پر حاشیے میں بھی اس شخص کا تخلص درج کر دیا گیا ہے جن کی تاریخ وفات پر قطعہ لکھا گیا ہے۔ [illegible] ان [illegible] دکھائے ہیں۔ مخطوطے میں مصرع کے نیچے اعداد تاریخ درج [illegible] کی منزل سے گزرتے گزرتے کچھ تبدیلیاں راہ پا گئی ہوں۔ سطروں کی تعداد فی صفحہ گیارہ ہے۔ کل [illegible] کی تعداد (۲۵۰) دو سو پچاس ہے۔ ان صفحات کے علاوہ کتاب کے آغاز میں متعلقہ [illegible] فہرست ہے جس میں مرنے والوں [illegible] درج ہیں ترتیب میں تخلص کا لحاظ رکھا گیا ہے اور [illegible] کی عام ترتیب کے مطابق حروف تہجی پر مرتب کیا گیا ہے۔

فہرست کا عنوان یہ ہے: فہرست [illegible] شعرا [illegible] کہ در سر زمین سخن ہم حکمرانی [illegible] مولف نے کسی دیباچے یا تمہید کی ضرورت بھی نہیں سمجھی ہے۔ خاتمہ کتاب سے معلوم ہوتا ہے [illegible] ذی الحجہ سنہ ۱۳۰۶ھ کو یہ تمام ہوئی۔ رجسٹر درآمد کے حوالے سے ایک اندراج کتاب کے آغاز میں ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب ۱۲ اردی بہشت ۱۳۲۲ھ کو کتب خانے میں داخل ہوئی۔

غیر مناسب نہ ہوگا اگر صاحب تالیف سے متعلق انتخاب یادگار اور کتاب خانہ رامپور کی کتاب معائنہ کے اقتباسات دے دیے جائیں کیونکہ جس شخص نے اپنی زیر بحث تالیف کے ذریعے اتنی شخصیتوں کی تاریخوں کو محفوظ کیا ہے۔ [illegible] اس کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ یادگار منظر عام پر آجائے۔ نیز حسن اتفاق سے رضا لائبریری کے متفرق کاغذات میں ایک قطعۂ تاریخ ملا ہے جو صاحب تاریخ لطیف نے دلپسند اسی منصب کے در ورود رامپور کے موقع پر لکھا تھا۔ یہ قطعہ بھی شریک اشاعت کیا جاتا ہے تاکہ ان کی تاریخ گوئی پر بھی کچھ نہ کچھ مزید روشنی پڑ جائے۔

پہلے انتخاب یادگار کا اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔

(۱)

ممتاز محمد مہدی علی خاں ولد (اختر) بلند خاں ملازم سرکار دولت مدار۔ [illegible] برس کی عمر ہے نہایت سعادت مند ہیں۔ اطبیعت شعار کبھی کبھی شعر بھی کہتے ہیں، راقم ہی کی صحبت میں رہتے ہیں۔ اس تذکرہ لکھنے میں راقم کے ساتھ انھوں نے بڑی محنت کی۔ دن رات منقصت کی یہ چند شعر ان کے لکھے گئے۔

ریختہ

درد ہی کا جسے مزا نہ ہوا ۔۔ ہے برابر وہ دل ہوا نہ ہوا

خواب بھی کیا خیال تھا اس کا ۔۔ کہ شب غم میں آشنا نہ ہوا

آہی جاتا کبھی اُس قاتل بیدرد کو رحم — بسملوں کو تہ شمشیر پڑا رہنا تھا
یہ دفعتاً ادھر آیا ادھر گیا ممتاز — بہار کا کوئی جھونکا تھا یہ شباب نہ تھا
شام وصال آتے ہی آتے سحر ہوئی — نوبت بھی آسکی نہ سوال و جواب کی
بڑھا ہے اُنس ایسا درد سے ممتاز ان رندوں — کہ بڑھ جائے تڑپ اپنی جو درد دل ذرا ٹھہر

امیر مینائی انتخاب یادگار ص ۳۴۸

(۲)

اس کے بعد ان کا قطعہ تاریخ پڑھیے :-

بتقریب تشریف آوری ہز ایکسلنسی نواب معلی القاب گورنر جنرل بہادر و لیسرائے کشور ہند دام اقبالہم

سارے عالم سے جو بہتر ہیں گورنر جنرل — آج مہمان سکندر ہیں گورنر جنرل
وزرا اور سلاطین کے بھی ہیں پر اُن سے — رتبے میں قدر میں برتر ہیں گورنر جنرل
جن کی دہشت سے نکل جاتا ہے دم شیروں کا — وہ جری ہیں وہ غضنفر ہیں گورنر جنرل
کرتے ہیں نرم دلوں سے یہ نہایت نرمی — سخت دل کے لیے پتھر ہیں گورنر جنرل
مدح میں مصرع تاریخ یہ مہدی نے کہا — "نیک اوصاف دلاور ہیں گورنر جنرل"

۱۳۲۳ھ

نذر گزرانیدہ فدوی مہدی علی خاں تحویلدار کتب خانہ ریاست رامپور ۶ اپریل سنہ ۱۹۰۵ء

اب کتاب خانے کا معائنہ کرنے والوں کی رائیں پڑھیے

(۳)

مہدی علی خاں صاحب کو اس قدر واقفیت اور تجربہ ہے کہ ایسے عظیم الشان دار الکتب کی ایک ایک کتاب کا نمبر و نشان اور اس کی حالت گویا ان کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ محمد شبلی پروفیسر مدرسۃ العلوم علی گڑھ ستمبر ۱۸۹۰ء

(۴)

منشی مہدی علی خاں صاحب اپنے عظیم الشان کتاب خانے کے لیے نہایت لائق ہیں کوئی کتاب ان سے منگائی جائے وہ فوراً لا دیتے ہیں گویا وہ کتاب ان کے پاس ہی تھی۔ ذکاء اللہ ۲۳ اکتوبر ۱۸۹۰ء

(۵)

در عہد نواب کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں) کے آخر میں...... اس ترقی خواہ دولت ترتیب فہرست کے واسطے ارشاد ہوا..... ترقی خواہ نے حسب منشائے عالیہ نواب خلد آشیاں چند اصول قائم کر کے تکمیل فہرست کا ارادہ کیا اور محمد مہدی علی خاں نے جو اب تحویلدار کتاب خانہ ہیں انھیں اصول کے موافق ترتیب فہرست شروع کی۔ اس زمانے میں میرا جانا وطن کی طرف ہوا مہدی علی خاں نے مرد جفاکش اور ذہین ہیں میری غیبت میں نہایت عرق ریزی سے فہرست کا ایک خاکہ تیار کر کے جناب نواب خلد آشیاں بہادر کے حضور میں پیش کیا جس کو جناب نواب ممدوح نے پسند فرما کر مزید تکمیل اور نظر ثانی کا حکم دیا۔ اور مہدی علی خاں کی پرورش اور عزت فرمانے کا ہنگام تکمیل فہرست اظہار فرمایا۔ اس عہد دولت مہد میں کما حقہ تکمیل نہ ہوئی تھی کہ عہد نواب محمد مشتاق علی خاں بہادر عرش آشیاں آیا .... مولوی محمد عبید اللہ صاحب کہ ایک مرد کامل اور جوہر قابل ہیں ملازم ہو کر اس کام کی تہذیب و ترتیب پر مامور ہوئے ...... ان کی جانفشانی اور مہدی علی خاں کی کاردانی سے فن وار فہرست گویا حد تکمیل کو پہنچی .... مختصر یہ

---

[1] حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ انتخاب یادگار کے اشعار کا ایک انتخاب مہدی علی خاں نے تیار کیا تھا اس میں انھوں نے اپنا صرف یہی ایک شعر درج کیا ہے۔

ہے کہ جو صورت کتب خانے کی اب ہے ایسی اس سے پیشتر کبھی نہ تھی۔ اور منتظمان کتب خانہ میں اولاً محمد مہدی علی خاں کی تجربہ کاری اور ہوشیاری اور جفاکشی اور عرق ریزی اور ثانیاً مولوی محمد عبید اللہ صاحب کی جانفشانی و مستعدی اور قابلیت نہایت قابل قدر ہے۔ امیر احمد مینائی، عفی عنہ ۲۳ دسمبر ۱۸۹۲ء

(۶)

...... منتظم اس کے مولوی مہدی علی خاں صاحب جو میرے ہمنام ہیں درحقیقت زندہ فہرست ہیں ان کی قابلیت اور توجہ کتابوں کی ترتیب اور بوقت طلب فی الفور پیش ہونے سے ظاہر ہوتی ہے۔ میں نے ایسا عمدہ انتظام کسی سرکاری کتب خانے میں ریاست حیدرآباد کے نہیں دیکھا۔ وہ ہر طرح سے شکریے اور تعریف کے مستحق ہیں۔ اور کام کی ذمہ داری اور محنت اور قدامت اور قابلیت کے لحاظ سے ترقی کا استحقاق رکھتے ہیں۔ امید ہے کہ سرکار ان کو اپنے فیض عام سے محروم نہ رکھیں گے............ محسن الملک ۱۲ دسمبر ۱۸۹۵ء

(۷)

میں نے آج اس کتب خانے کو دیکھا۔ اگرچہ بسبب علالت کے جس قدر جی چاہتا تھا اس قدر میں کتب خانے میں نہیں ٹھیر سکا۔ مگر مولوی مہدی علی خاں صاحب جو منصرم کتب خانہ ہیں ان کی رہبری سے تھوڑی سی دیر میں مجھکو کتب خانے کی ترتیب و تقسیم و انتظام اور ہر قسم کی کتابوں کی تعداد اور دیگر ضروری مراتب سے کسی قدر واقفیت حاصل ہوگی۔...... امید ہے کہ............ مولوی مہدی علی خاں صاحب جو تمام لائبریری کی ناطق فہرست ہیں اور جن کی کارگزاری کے سب لوگ مداح و ثنا خواں ہیں سرکار دولت مدار سے ان کی زیادہ قدر افزائی فرمائی جائے گی۔

الطاف حسین حالی عفی عنہ ۲۵ دسمبر ۱۸۹۶ء

(۸)

.... مولوی مہدی علی خاں صاحب مہتمم کتب خانہ کی نیک دلی اور وسیع واقفیت نے مجکو تعجب میں ڈالا انھوں نے تکلیف گوارا فرماکر مجکو نہایت نادر اور بے مثل چیزیں دکھائیں مثلاً بابر بادشاہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی رباعیات اور اسی طرح کی اور دوسری چیزیں ....

سید اکبر حسین جج عدالت خفیفہ الہ آباد ۱۶ اکتوبر ۱۸۹۷ء

(۹)

اس سے قبل کی رائیں جس قدر اس کتب خانے کی بابت لکھی ہوئی ہیں وہ ظاہر کر رہی ہیں کہ خادم دارالمکتب مولوی مہدی علی خاں صاحب تحویلدار کے حسن واقفیت و حسن انتظام اس کے متعلق درخور توصیف و ثنا ہے۔

آغا ابو المعظم سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی ۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۸ء مطابق ۱۱ رمضان المبارک ۱۳۲۶ھ

(۱۰)

...... تحویلدار مولوی مہدی علی خاں صاحب نہایت متدین اپنی ڈیوٹی پر اس کبرسنی میں نہایت مستعد وقت کے ایسے پابند کہ ہمارے عرصۂ قیام تین ماہ میں کبھی ۵ منٹ کا فرق میں نے نہیں پایا۔ دس بجے سے چار بجے تک برابر حاضر پایا۔ کتابوں سے ایسی محبت ہے جیسی کسی عاشق کو اپنے معشوقہ سے ہوتی ہے۔ ان کتابوں کی نگرانی اور حفاظت میں ہر تن مصروف رہتے ہیں علاوہ وہ اس عظیم الشان لائبریری کی ناطق فہرست ہیں۔ اس دارالعلوم کی ایک ایک کتاب کا نمبر و نشان و حالت گویا ان کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ ماشاء اللہ حافظہ بھی بہت قوی ہے۔ زبدۃ ہے حال میں تحویلدار صاحب نے عربی فہرست کو جو نہ تھی پر حسب ہوشیاری اور جفاکشی اور عرق ریزی سے ترتیب کیا ہے۔ عربی کا ذخیرہ تا بقائے فہرست ان کی مرہون منت رہے گا۔ ان کے حسن اخلاق ملنساری اور کارگزاری کے سب لوگ مداح و ثناخواں ہیں۔ اس پر میں بھی بہت زوروں سے صاد کرتا ہوں۔ منتظمین کتب خانہ کو ان کی زیادہ قدر افزائی کا خیال کرنا لازم ہے.......

خادم المحققین حافظ نذیر احمد کان اللہ لہٗ فی الدنیا والآخرہ صدر مولوی ایشیاٹک سوسائٹی بنگال برائے تحقیقات کتب قلمیہ قدیمہ وغیرہ از جانب گورنمنٹ انڈیا مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۱۴ء

میں اس کتاب خانے سے بارہا متمتع ہوا ہوں........ مہدی علی خاں صاحب تو خود ایک زندہ کتاب خانہ ہیں۔ (شبلی نعمانی ۶ اپریل ۱۹۱۴ء)

اور آخر میں موجودہ لائبریرین جناب عرشی صاحب کی رائے پڑھیے، جو معارف اعظم گڑھ میں شائع ہوئی تھی۔

مولوی مہدی علی خاں مرحوم کتب خانے کے تحویل دار تھے۔ فارسی کی تعلیم باضابطہ پائی تھی اردو میں شعر بھی کہتے تھے اور حضرت امیر مینائی سے تلمذ تھا۔ موصوف کو میں نے خود دیکھا تھا۔ آخر عمر میں ضعف کے باعث سواری میں کتاب خانے آتے جاتے تھے۔ لیکن حافظے کا یہ عالم تھا کہ کتاب کا حلیہ سن کر الماری میں سے نکال لاتے تھے ان کی متعدد تصنیفات کتاب خانہ (رامپور) میں موجود ہیں۔

ہجری سنہ رواں ۱۳۸۲

مہینوں کے نام اور ترتیب

۱۔ محرم
۲۔ صفر
۳۔ ربیع الاول
۴۔ ربیع الثانی
۵۔ جمادی الاول
۶۔ جمادی الثانی
۷۔ رجب
۸۔ شعبان
۹۔ رمضان
۱۰۔ شوال
۱۱۔ ذیقعدہ
۱۲۔ ذی الحجہ

دنوں کے نام اور ترتیب

شنبہ	سنیچر	سہ شنبہ	منگل	جمعہ
یکشنبہ	اتوار	چہار شنبہ	بدھ	
دوشنبہ	پیر	پنجشنبہ	جمعرات	

ابجد اور اس کے اعداد

حروف	اعداد
ا	۱
ب پ	۲
ج چ	۳
د	۴
ہ	۵
و	۶
ز ژ ڑ	۷
ح	۸
ط	۹
ی	۱۰
ک گ	۲۰
ل	۳۰
م	۴۰
ن	۵۰
س	۶۰
ع	۷۰
ف	۸۰
ص	۹۰
ق	۱۰۰
ر	۲۰۰
ش	۳۰۰
ت	۴۰۰
ث	۵۰۰
خ	۶۰۰
ذ ڈ	۷۰۰
ض	۸۰۰
ظ	۹۰۰
غ	۱۰۰۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تاریخ وفات خواجہ حیدر علی آتش (شاگرد مصحفی) از تدبیر الدولہ منشی مظفر علی خانصاحب بہادر اسیر مرحوم

۲ سروش غیب چنیں گفت مصرع فوتش — "نمودہ بزم جناں گرم جلوۂ آتش"
۱۲۶۳ھ

ایضاً از جناب امیر

۲ حیرت پس آئینۂ دل کرد سخن — "خاموش ابر طوطی گویا گردید"
۱۲۶۳ھ

ایضاً [illegible] امیر اعلی اللہ مقامہ

۲ مردن او ایجاد قیامت [illegible] اہل سخن را دل شگافت — "فیضی عرفی سعدی مجدی صائب حافظ بے وہا"
۱۲۶۳ھ

ایضاً از نواب [illegible] مقبول الدولہ بہادر مرحوم قبول

۵ دیکھ کر دیوان یہ [illegible] [illegible] — "اب فنا آتش نہیں سوز زبان دنیا میں ہے"
۱۲۶۳ھ

ایضاً از مرزا حاتم علی مہر شاگرد خواجہ حیدر علی آتش

۲ مہر مصراع دعائیہ بتاریخ نوشت — "ارم و جنت و فردوس بود جائے مقام"
۱۲۶۳ھ

ایضاً از میر وزیر نور تخلص

۵ آہ گل شد ز صرصر گردوں — نور مضطر بگو چراغ جہاں"
۱۲۶۳ھ

تاریخ وفات شیخ امیر الدین آزاد بریلوی شاگرد میر غلام علی عشرت از نواب نیاز احمد خاں ہوش شاگرد اسیر

۲ "بہشت بریں کا ہے آزاد سرو" — پئے سال رضواں نے پڑھ کر کہا
۱۲۸۴ھ

تاریخ وفات مفتی صدر الدین خاں صاحب دہلوی آزردہ تخلص از مولوی ظہور علی مخاطب بہ شمس الشعرا ظہور تخلص

۶ چراغش ہست تاریخ [illegible] — [illegible] "چراغ دو جہاں بود"
۱۲۸۵ھ

(۲۴ ربیع الاول پنجشنبہ ۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء)

ایضاً از عبد الغفور خاں صاحب نساخ ساکن کلکتہ

۲ گفت نساخ مصرع تاریخ — "صدر اسلام و دین امام بہشت"
۱۲۸۵ھ

تاریخ وفات حاجی ناظر عبد اللہ مرحوم آشفتہ تخلص رئیس سلہٹ از عبد الغفور خاں نساخ

۲ گفت نساخ بسال ترحیلش — مرگ [illegible] الکمال آشفتہ
۱۲۹۰ھ

تاریخ وفات نواب میر محبوب علی خاں بہادر نظام الملک آصف جاہ شاہ دکن آصف تخلص شاگرد نواب فصیح الملک داغ دہلوی از مولوی مظفر حسین صاحب یمانی شاگرد معالج الدولہ حکیم حاجی مولوی سید فرزند علی افسر الاطبا۔

۱۔ تاریخی ذیلی تفصیلات کا وہ حصہ جو توسین میں بند اور خط کشیدہ ہے قطعہ بالا کے محذوف اشعار سے ماخوذ ہے۔

۲۔ ی سے انتخاب یادگار ک سے تذکرہ کاملان رام پور تک سے تذکرہ کلیم مراد ہے جہاں کوئی حوالہ نہیں وہ مطبوعہ کتاب خانہ رام پور کے رجسٹر سے ماخوذ ہے۔

۵۴ ہاتف نے بہر سال ظفر یہ دی ندا "محبوب ملک داخل باغ جناں ہوئے"
(بعمر ۴۶ سال بعارضۂ فالج چارم شہر صیام بعد زوال روز سہ شنبہ) ۲۹ر اگست ۱۹۱۱ء مطابق ۱۳۲۹ھ

ایضاً از نواب جعفر علی خاں بہادر رئیس شمس آباد

۹ بگہ جعفر پے نقل مکانش "شہ ملک دکن سوئے جناں رفت"
۱۳۲۹ھ

تاریخ وفات نواب آصف الدولہ بہادر شاہ اودھ آصف تخلص از ندیم شاعر

۵ نقش بند کاف ونون بر تربت آصف نوشت "ہا ہنا روح و ریحان وجنات النعیم"
۱۲۱۲ھ

ایضاً از شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی

۲ نوشتم سال تاریخ وفاتش "بود با حیدر کرار محشور"
۱۲۱۲ھ

ایضاً از مولوی عبدالغفور خاں نساخ

۱ پے سال ترحیل آصف نوشتم "مقیم گلستان فردوس عالی"
۱۲۱۲ھ

تاریخ وفات حافظ عبدالرحمٰن احسان دہلوی از مفتی غلام سرور قریشی لاہوری

چونکہ احسان محسن عالم دولت وصل یافت از حق مفت

۲ سال وصلش خرد بصد احساں "جامع حسن فضل و احساں" گفت
۱۲۶۴ھ

ایضاً از مولوی عبدالغفور خاں نساخ

۲ سال ترحیل او ز روی حساب "شمع دار القرار احسان شد"
۱۲۶۷ھ

تاریخ وفات احسان علی خاں احسان شاہ جہاں پوری از مولوی عبدالاحد صاحب لکھنوی

۵ شمشاد نوشت سال فوتش "فردوس محل عزیز خاطر"
۱۳۳۲ھ
(چار شعبان شب دوشنبہ)

تاریخ وفات مولوی محمد احسن صاحب (کاکوروی) احسن تخلص برادر خورد مولوی محمد محسن صاحب کاکوروی

نائب وزیر دیوانی ریاست بھوپال

۹ گفت دل ہر گہ کہ آمد در زوال آں آفتاب مردہ در گورست احسن زندہ در گور من
۱۸۸۴ء

تاریخ وفات آغا احمد علی احمد تخلص صاحب موید برہان از مولوی انسخ ۱۳۰۵ھ

۲ فلک نے پے سال فصلی وہیں کہا آغا احمد علی وائے حیف[1]
۱۲۸۰ فصلی

تاریخ وفات واجد علی شاہ بادشاہ اودھ اختر تخلص از میر ضامن علی جلال لکھنوی

۲ کہی جلال نے اس کے زوال کی تاریخ کہ آہ آہ. بجھا یک بیک چراغ اودھ"
۱۳۰۵ھ

ایضاً از مرزا محمد زکی علی خاں صاحب زکی تخلص نبیرہ نواب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں بہادر شاگرد دبیر انیس مرحوم

۶۴ ہوا ہے با نقط حرفوں سے معلوم کہ واجد بود قوم شاہ مظلوم
۱۳۰۵ھ
اُسی صورت سے پھر ہوتا ہے مفہوم کہ ہجر او بوصل شاہ مغموم
۱۳۰۵ھ
زکی کیا فکر ہو آہ و فغاں میں کہ داخل ہو گئے اختر جناں میں
۱۳۰۵ھ
جمعہ ۲۱ر ستمبر ۱۸۸۷ء (۳ محرم)

[1] تشریح السنین کے حساب کے مطابق ۱۲۸۰ف ۱۲۹۰ھ اور ۱۸۷۳ء کے مطابق ہوتا ہے۔ امتیاز علی عرشی۔ حاشیہ مخطوطہ

ایضاً از شیخ محمد جان شاد لکھنوی

۲ بے سر ہوش شاد لکھ تاریخ "گل چراغ اودھ ہوا اے ہے" ۱۳۰۵ھ

تاریخ وفات خواجہ عبدالغفار اختر تخلص رئیس ڈھاکہ از مولوی عبدالغفور خاں نساخ

۲ قلم دل فگار اے نساخ "اختر نیکوئی رقم زدہ سال" ۱۲۹۶ھ

تاریخ وفات حیدر مرزا مرحوم ادب تخلص خلف عشق مغفور (لکھنوی) از کمال خلف میاں جلال

۳ کمال دل حزیں نے یہ لکھی تاریخ رحلت کی گیا کیا خلد کو افسوس مداح علی حیدر

بعمر ۳۲ سال جمعہ ۲۸ محرم ۱۳۱۴ھ

تاریخ وفات تدبیر الدولہ مدبر الملک جناب منشی مظفر علی خاں صاحب بہادر اسیر بہادر جنگ لکھنوی (شاگرد مصحفی) از جناب مفتی منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی ذراللہ تربتہٗ شاگرد حضرت امیر استاد نواب والا جناب سید محمد کلب علی خاں بہادر فرماں روائے رام پور ملقب بخلد آشیاں

۲۷ دیدم بفغان و نالہ می گفت امیر "سلطان سخن، امام فن، قبلہ من"

سہ شنبہ ۷ فروری ۱۸۸۲ ۱۷ ربیع الاول ۱۲۹۹ھ

ایضاً از سید غلام حسنین قدر بلگرامی

۴ قدر تاریخ وفات آورد اندر قید نظم شد زبحر المومنین آزاد قدسی نفس امیر ۱۲۹۹ھ

ایضاً از قدر بلگرامی در مثنوی

۷ قدر دو تا تاریخ بگفت تازہ بتازی گوہر سفت
مات سلیم طاب ثراہ ۱۲۹۹ھ "فات کلیم طاب ثراہ" ۱۲۹۹ھ

ایضاً از نواب نیاز احمد خاں ہوش بریلوی

۴ اسیر خوش سیر خوش وضع خوش فکر ہوئے راہی سوئے دار البقا جب
تو ہاتف نے برائے سال ہیہات صدائے تر اٹھا دیں انگلیاں سب
مگر ان کے دو انگلی کے پورے کہا لکھ لے انھیں اے ہوش تو اب
رہیں باقی جو دوان کا سر کبر جھکا دینا کہ ہو جلئے مہذب ۱۲۹۹ھ

ایضاً از مولوی عبدالحق حقی وصفا رام پوری

۴ سال فوت ان کا لکھا حقی نے "بند ہستی سے اسیر اب چھوٹے" ۱۲۹۹ھ

تاریخ وفات راجہ اشفاق علی خاں اشفاق تخلص تعلقہ دار محمدی از مولوی مظفر حسین صاحب سلیمانی

۵ سدھارے جوانی میں ملک عدم کو ہوا اُن سے آباد گلزار رضواں
مظفر جو تاریخ ہاتف سے پوچھی کہا "جنتی راجہ اشفاق علی خاں" ۱۹۱۵ء

تاریخ وفات نواب علی اصغر خاں مخاطب بہ ظفر الدولہ اصغر تخلص از مولوی عبدالغفور خاں نساخ

۲ شد بیک مصرع دو تاریخ ایں چنیں اے حال زار شنبہ ذی قعدہ ہے ہے، آہ دردہائے غم
۱۲۷۶ھ ۱۲۷۶ھ

تاریخ وفات از محمد اطہر حسین خاں اطہر (گورکھ پوری) خلف منشی اصغر حسین خاں صاحب گورکھ پوری از حافظ جلیل حسن صاحب جلیل شاگرد جناب امیر مینائی

۰ دہن گور سے صدا آئی — "قبر اطہر حسین خاں ہے یہ آہ"

ایضاً از مولوی عبدالاحد صاحب شمشاد لکھنوی

۵ در جمادی اولیں بر نہم — شانزدہ سالہ در دو شنبہ بمرد
گفت شمشاد سال رحلت او — "جاں بجاں آفریں خدای سپرد"
۱۲۴۲ھ

تاریخ وفات میاں اظہار شاعر از جناب تدبیر الدولہ بہادر اسیر لکھنوی

۲ ہاتف غیب نے کہی تاریخ — "آج اظہار ہو گئے پنہاں"
۱۲۷۰ھ

تاریخ وفات میر الم صاحب دہلوی متخلص بہ الم از مولوی عبدالغفور خاں نساخ

۱ سال ترحیل الم چوں خواستم — گفت ہاتف "جائے او باغ نعیم"
۱۲۹۴ھ

تاریخ وفات سید آغا حسن امانت (لکھنوی) از جناب تدبیر الدولہ اسیر لکھنوی

۳ تاریخ وفات او رقم کرد اسیر — "جاں داد امانت بخدا بود امین"
۱۲۷۵ھ

ایضاً از سید حسن لطافت خلف آغا حسن امانت

۴ دریں فکر بودم کہ رضوان فردوس — بگفتا رسید ندا "امانت بجنت"
۱۲۷۵ھ

ایضاً از میر وزیر نور تخلص لکھنوی

۵ بہر تاریخ وفاتش گفت نور — حیف بردہ آہ شاعر بے مثال
۱۲۷۵ھ
(سہ شنبہ ۲۸ جمادی الاول بوقت شام)

تاریخ وفات منشی امانت اللہ امانت شاگرد ناسخ از سید عصمت اللہ ناسخ

۳ پے لوح قبرش بہ صد رنج و غم — زہے تربت نور کردم رقم
۱۲۸۰ھ

تاریخ وفات سید محمد جعفر صاحب لکھنوی امید تخلص از سید محمد اسماعیل حسین منیر شکوہ آبادی

۵ سال مرگش منیر محزوں گفت — "زیب قصر بہشت معنی باد"
۱۲۹۳ھ

ایضاً از منیر

۳ منیر ہاتف غیبی نے یہ کہی تاریخ — "وہ عین خلد میں ہیں آل مصطفی کے پاس"
۱۲۹۳ھ

تاریخ وفات میاں امیر شاہ صاحب امیر تخلص رحمۃ اللہ علیہ خلف سید محمد جہانگیر شاہ مرید میاں غلام شاہ صاحب خلف ملا فقیر آخوند صاحب قدس سرہ العزیز از جناب منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی مرید میاں امیر شاہ صاحب

۲ سال رحلت فی البدیہہ بر زباں آمد امیر — صوفی کامل جنید وقت شبلی زماں
بعمر ۹۰ سال (دو شنبہ، ۲۳ صفر بوقت عصر) ۱۲۹۰ھ/ ۲۱ اپریل ۱۸۷۳ء

تاریخ ہائے وفات جناب منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی شاگرد جناب اسیر از حافظ علی احسن صاحب احسن مارہروی شاگرد نواب فصیح الملک داغ دہلوی

۱۶ نوشت سال وصالش ز جوش دل احسن — "بخوردہ جام اجل آں امیر مینائی"
۱۳۱۸ھ

ایضاً از احسن

۲　احسن زروے ابجد مصراع سال گوید　"بنہا در و بمرقد منشی امیر احمد" ۱۳۱۸ھ

ایضاً از منشی سلامت اللہ صاحب اسلم کانپوری منیجر اخبار ملک وملت

۴　گفت اسلم سال فوت اینک کہ شد　"گل چراغ شاعری ہند آہ" ۱۹۰۰

ایضاً از سید امیر اللہ صاحب امیر مدراسی مقیم دکن

۷　"باد از فضل حق بہشت نصیب" ۱۳۱۸ھ　بس ہمیں یک دعا بود زمنش

ایضاً از حکیم میر ضامن علی صاحب جلال لکھنوی

۲　جلال لکھ دو یہ تاریخ ان کی رحلت کی　"امیر ہو گئے صد وائے ایک مرد غریب" ۱۹۰۰

از حافظ جلیل حسن صاحب جلیل مانک پوری شاگرد امیر مینائی لکھنوی

۲　گئے جو خلد بریں کو تو ان کی تربت پر　جلیل نے یہ لکھا "روضہ جناب امیر" ۱۳۱۸ھ

ایضاً از جلیل

۲　"امیر کشور معنی امیر مینائی" ۱۳۱۸ھ

ایضاً از نواب فصیح الملک بہادر داغ دہلوی

۷　ہے دعا بھی داغ کی تاریخ بھی (بعارضہ صنعت صفر ادتریاسہال وزحیر)　"قصر عالی پائے جنت میں امیر" ۱۳۱۸ھ

ایضاً از داغ

۲　مل گئی تاریخ دل سے داغ کی　"آہ لطف شاعری جاتا رہا" ۱۳۱۸ھ

ایضاً از داغ

۲　آج اس غم کی یہ کہی تاریخ　"اب ہوا دل پہ آہ داغ امیر" ۱۳۱۸ھ

ایضاً از حافظ ساجد علی کاکوروی ساجد تخلص وکیل عدالت صوبہ اورنگ آباد دکن

۳　کنوں آں کجا آب و تاب سخن　"کہ شاعر جلیل القدر اتب بمرد" ۱۳۱۸ھ

ایضاً از منشی اودھم سنگھ سردار تخلص، ساکن امرتسر شاگرد حکیم میر ضامن علی جلال لکھنوی

۵　لکھ دے اے سردار تاریخ وفات　"آگیا ہے نظم اردو کو زوال" ۱۳۱۸ھ

ایضاً از مولوی سید ضامن حسین کنتوری ضامن تخلص فرزند حبیب کنتوری

۱۲　مومن پاک تھا وہ مرد بزرگ　پنجتن کا تھا دل سے شیدائی

بے تاریخ پانچ بار کہو　ضامن "آہ اے امیر مینائی" ۱۹۰۰

ایضاً از ضامن

۴　اس کی رحلت کی کہی ہم نے یہ ضامن تاریخ　از سر حسرت و یاس دغم "رشید افسوس" ۳۰۰ ۱۳۱۸ھ

ایضاً از راجہ راجایان مہاراجہ کشن پرشاد بہادر شاد تخلص پیشکار و وزیر افواج سرکار نظام شاگرد جناب آصف جاہ آصف تخلص

۲　گفتیم دعائیہ چنیں سال وفات　"محمود بود آخرت ادائے شاد" ۱۳۱۸ھ

ایضاً از کلیم لکھنوی شاگرد ولڈن صاحب خورشید

۳　لکھی ہجری کلیم نے تاریخ　"کی قضا کل من علیہا فان" ۱۳۱۸ھ

ایضاً از کلیم

۵ سال ہجری پے تاریخ رقم کرد کلیم — "چہ درآمد بجناں منشی امیر احمد امیر"

(۱۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء ۱۷ جمادی الثانیہ شب یکشنبہ) ۱۳۱۸ھ

ایضاً از حکیم میر مہدی کمال لکھنوی خلف میر ضامن علی جلال

۷ ان کی رحلت کا سال لکھ دو کمال — "جل کے کیسی بجھی یہ شمع سخن" ۱۳۱۸ھ

ایضاً از سید مولوی رضی الدین حسن کیفی شاگرد سجاد علی شاہ صاحب میکش حیدرآبادی

۲ از سر یاس میں نے لکھا سال — "بخشے اللہ امیر احمد کو" ۱۳۱۸ھ

ایضاً از شمس الحق سجاد علی شاہ صاحب میکش حیدرآبادی

۵ از سر جام فنا لکھ سال مرگ — "خلد میں آرام سے ہے اب امیر" ۱۳۱۸ھ

ایضاً از میکش

۳ جس کو میکش ایک عالم کہتا تھا نازک خیال — "اٹھ گیا وہ شاعر صنعت طراز و بے بدل" ۱۳۱۸ھ

ایضاً از منشی نوبت رائے نظر مہتمم خدنگ نظر

۲ از سر آہ است ایں مصراع سال — "شاعر جادو بیاں خاموش شد" ۱۳۱۸ھ

تاریخ وفات نواب میر محمد حسین خاں صاحب امیر تخلص از کلیم لکھنوی

۳ ارم را چہ کافی شدہ زیب و زیں — زنواب سید محمد حسین ۱۳۲۲ھ

تاریخ وفات میر ابو تراب انسخ تخلص از جناب اسیر لکھنوی

۲ تاریخ گفت دل تاریخ گفت دل — "اے وای بو تراب اے وای بو تراب" ۱۲۸۰ھ

تاریخ وفات انشاء اللہ خاں انشا تخلص از منشی بسنت سنگھ نشاط

۲ سال تاریخ او زجان اجل — "عرفی وقت بود انشا گفت" ۱۲۳۳ھ

ایضاً از مفتی غلام سرور

۲ از خرد آمد عیاں تاریخ او — عزت شعرائے ہندی پاکمال [؟] ۱۲۲۱ھ

تاریخ وفات میر ببر علی انیس (مرثیہ گوی)، لکھنو از جناب اسیر لکھنوی

۵ در رامپور ایں خبر آمد اسیر گفت — "خوش لہجہ آہ بلبل بزم عزا نماند"

دسمبر ۱۸۷۴ء ذی قعدہ ۱۲۹۱ھ

ایضاً از میر ضامن علی صاحب جلال لکھنوی

۲ سال مرگش نوشت کلک جلال — "مرد ہے ہے سخنور کامل" ۱۲۹۱ھ

ایضاً از جلال

۲ جلال مصرع تاریخ انتقال نوشت — "انیس بود بعالم چہ شاعر یکتا" ۱۲۹۱ھ

ایضاً از شیخ محمد جان شاد لکھنوی

۲ بیسر دیا تمام شد پے سال — فرد مصرعہ چہ مرثیہ چہ سلام

۱۲۹۱ھ

ایضاً از سید حسن لطافت خلف سید آغا حسن امانت

۹ جو میر ببر علی ہیں انیس ذاکر شاہ　　وحید دہر سب اہل جہاں کے رئیس و رئیس
فصیح کامل و حسان وقت و عبیل عصر　　جناں میں جاکے ہوئے ساتھ حوروں کے جلیس
قریب شام ہوئے آہ وہ کمال تمام　　اخیر چاند تھا گزرے تھے آہ دن انتیس
سنا یہ واقعہ جانکاہ جب کہی تاریخ　　کہ جس میں لفظ ہیں آئے مناسب اور سلیس
بیان مصرع آخر کے اب صنایع ہوں　　بفکر سمجھیں لطافت جسے حساب نویس
شروع مصرع تاریخ جو کہیں دو حرف　　مہینا ایک ہے اور دوسرا ہے روز خمیس
سنین بھی ہیں عیاں ماسبق عیسوی ہجری　　جو بینات زبر ہوں رقم بطور نفیس
وہ مرثیے نہ وہ پڑھنا نہ وہ بڑے مجمعے　　اداس مجلس ماتم ہے سامعین دس بیس
عجیب مصرع تاریخ ہے ملائکتا　　"یہ پنجتن کا ہے نوحہ انیس ہائے انیس"

(۹ دسمبر ۱۸۷۴ء چارشنبہ ۲۹ شوال)　　۱۲۹۱ھ

ایضاً از میر وزیر نور تخلص

۲ نور بہر سال ہاتف زد ندا　　"مرثیہ گو پاک طینت آہ بود" ۱۲۹۱ھ

تاریخ وفات مرزا (محمد جعفر) اوج صاحب خلف مرزا دبیر صاحب از نواب سید محمد جعفر علی خاں صاحب شمس آبادی جعفر تخلص

۲۹۰ ۲۵۰ ۱۰۰ ۲۹ ۱۰ ۲۹۲ ۲۱۲
۷ چشم انصاف سے اے معترض ذکر حسین　　قصر فردوس میں دیکھ اوج محمد جعفر
بلبل سدرہ مورخ سے ہوا یوں گرم سخن　　تیرے ہمنام کی تاریخ ہے سب سے بہتر ۱۳۳۵ھ

ایضاً از سید شفا الحسین موج تخلص رئیس زید پور ضلع بارہ بنکی

۳ رقم زد موج بہر سال رحلت　　بگو سہ بار اوج صد عالم ۱۳۳۵ھ

ایضاً از مرزا ہادی صاحب ہادی تخلص

۴ کلک شیون زائے ہادی سال تاریخش نوشت　　منبر بزم ذبیح اکبر بلا بے اوج شد را ۱۳۳۵ھ

تاریخ وفات ابوالنصر سلیمان جاہ نصیر الدین حیدر بادشاہ تخلص ولی بادشاہ ملک اودھ خلف غازی الدین حیدر بہادر

از فیض شاگرد مرزا قتیل لکھنوی

۲ ہاتفے گفت از سر افسوس　　"بارم رفت بادشاہ اودھ" ۱۲۵۳ھ

تاریخ وفات شیخ امداد علی (لکھنوی) بحر از جناب امیر لکھنوی

۲ ساختہ فکر بتاریخ وفاتش چو امیر　　"گفت دل ہے بحر بیک موج بکوثر پرسید" ۱۲۹۵ھ

ایضاً از شیخ محمد جان شاد لکھنوی

۴ مہملے کے حرف مصرع بحر　　بحر کے لیں سنین شاد لکھو
پھر دہائی سے جو بڑھیں آحاد　　ضرب وہ سات پانچ میں کر لو
ہو چکیں ضرب جب وہ سات اعداد　　سیکڑے پھر سہ چند کیجیے تو
رحلت بحر کی یہ ہو تاریخ　　آشنا تھا غریق رحمت ہو ۱۲۹۵ھ

؎ اوج کا عدد نکل جانے سے تاریخی مادہ نکلتا ہے۔ حاشیہ مخطوطہ

تاریخ وفات برشتہ از منشی لال چند انس لکھنوی

۲ بودم در فکر بہر تاریخ وفات "صد وائے برشتہ مرد کلکم بنوشت" ۱۲۶۲ھ

تاریخ رحلت (فتح الدولہ) مرزا محمد رضا خاں (بہادر) برق لکھنوی (شاگرد ناسخ) از منشی اسمٰعیل حسین منیر

۲ منیر از سال مرگش "فزدہ برق زیب ابر رحمت" ۱۲۷۴ھ

ایضاً از میر وزیر نور شاگرد برق

۳ بہر سال فوت ہاتف زد ندا "شاعر بے مثال بودہ حیف آہ" ۱۲۷۴ھ

ایضاً از احمد خاں ہوش بریلوی

۲ ہاتف نے ان سے کہتے ہی اے ہوش بہر سال "وہ خرمن کلام پہ بجلی گر گئی کہا" ۱۲۷۴ھ

تاریخ وفات میر بادشاہ علی بقا تخلص خلف میر وزیر صبا از سید امیر حسن فروغ لکھنوی مقیم حیدر آباد دکن

۹ بگو فروغ سن فوت حضرت استاد "بقا فنا شد و باقی است نام وے ز کلام" ۱۳۲۲ھ

ایضاً از کلیم لکھنوی

۲ کلیم از پے سال فوتش بہ ہجری بگو فی الحقیقت "بقا ہم فناشد" ۱۳۲۲ھ

تاریخ وفات منشی خواجہ غلام غوث صاحب خان بہادر ذوالقدر بے خبر تخلص میر منشی لفٹنٹی از شاہ محمد شفیع صاحب پیرزادہ صفی پور ضلع اونا و تیس تخلص

۳ چوں رفت خود برای ادب تیس گفت سال "تحت لوائے احمد صاحب لوا رسید" ۱۸ شوال ۱۳۲۲ھ

تاریخ وفات شیخ علی بخش صاحب بیمار تخلص از میر عابد حسین صاحب اوج رام پوری خلف میر احمد علی صاحب رسا

۲ حیفے بپرسید اے اوج سال بگفتم "علی بخش بیمار آہ"

رام پور بعمر ۶۷ سال ۲۴ ربیع الاول (ی) ۱۲۷۱ھ

تاریخ وفات کنور جسونت سنگھ پروانہ پسر راجہ بینی (پرشاد) بہادر از ناسخ

۲ تاریخ چنیں رقم نمودم ناسخ "پروانہ بمرد شمع ہم وائے بمرد" ۱۲۴۸ھ

تاریخ وفات نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ کراؤن آف انڈیا رئیسہ دلاور اعظم طبقہ اعلای ستارہ ہند والیہ ملک بھوپال تخلص تاجور و شیریں از مولوی علاءالدین جلال آبادی فرخ تخلص استاد نواب احتشام الملک عالی جاہ سلطان دولہا بہادر

۲ فرخ بسال رحلت او ایں دعا بخواند "شاہ جہاں بخلد ابد با دوار جمند" ۱۳۱۹ھ

۱۶ جون ۱۹۰۱ء

تاریخ وفات مرزا جان تپش تخلص از میر غلام حسین شایق

۳ ناگاہ صدائے زد یا درد و بکا ہاتف "حالا بکسوف آمد ماہ سخن اردو" ۱۲۶۱ھ

تاریخ وفات میر حسین تسکین دہلوی از نواب غلام حسین صاحب رئیس شاہ جہاں پور حسین تخلص صاحب دواوین

۲ مردنش انداختہ احباب را در اضطراب "آہ تسکیں رفت از دل" سال تاریخش بود ۱۲۶۸ھ

بمقام رام پور بعمر ۵۰ سال ۱۷ شوال (ن)

تاریخ بابت وفات مرزا زین العابدین خاں عارف و میر حسین تسکین و حکیم مومن خاں مومن از مرزا قربان علی بیگ سالک دہلوی شاگرد غالب

۳ کہا دل نے کہ داخل ہو گئے سب "ارم میں عارف و تسکین و مومن" ۱۲۶۸

تاریخ وفات منشی امیر اللہ صاحب تسلیم لکھنوی از محمد شریف خاں آزاد مہتمم جلوہ یار شہر میرٹھ

۳ رقم تاریخ رحلت کرد آزاد "مکان زیب گلشن در جناں یافت"

بعمر ۹۳ سال بوقت ۵ بجے شام بمقام لکھنؤ یک شنبہ ۲۸ جمادی الاول ۱۳۲۹ھ ۲۸ مئی ۱۹۱۱ء

ایضاً از منشی عاشق حسین بزم

۴ ہائے دنیا سے اٹھ گیا اے بزم "شاعر خوش کلام فرد جہاں" ۱۹۱۱ء

ایضاً از سید قدرت علی قدرت شاگرد میاں امیر اللہ تسلیم لکھنوی

۹ کہا رو کے قدرت یہیں نے دہیں "گئے باغ عالم سے وہ کامیاب" ۱۳۲۹ھ

ایضاً از شاد میرٹھی

۲ ہے دعا شاد کی تہ دل سے "داخل خلد ہو الٰہی اب" ۱۳۲۹ھ

تاریخ وفات منشی انوار حسین صاحب تسلیم سہسوانی از سید فرید احمد وفا مراد آبادی

۱۲ کہتے تھے وہ مرتے دم کہ یارب تسلیم کو آج بخش دے تو

بمقام مراد آباد ۲۳ مئی ۱۸۹۲ء

ایضاً از وفا در صنعت توشیح

۲ سرایں پنج بہم کردہ نوشت "تلق و ربح و غم و حیف و الم" ۱۳۰۹ھ

دو شنبہ ۱۹ شوال

تاریخ وفات نواب شبیر علی خاں تنہا تخلص رئیس اعظم مراد آباد از سید فرید احمد وفا مراد آبادی

۳ روتا ہوں وفا یہ پڑھ کے مصرع "تنہا نہیں، لطف شاعری کیا" ۱۸۹۲ء

تاریخ وفات شاہزادہ بشیر الدین توفیق تخلص ابن شاہزادہ شکر اللہ ابن ٹیپو سلطان از عبد الغفور خاں نساخ ساکن کلکتہ

۲ سال ترحیلش کہ اے نساخ جستم ناگہاں "رونق فردوس توفیق" از فلک گفتا سروش ۱۳۰۳ھ

تاریخ وفات خواجہ حسن ثابت سوداگر از شیخ امام بخش ناسخ

ناسخ سال وفاتش گفت "خواجہ حسن مردہ امروز" ۱۲۳۶ھ

تاریخ وفات نواب شہاب الدین احمد خاں بہادر ثاقب تخلص، رئیس دہلی خلف نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نیر تخلص از نساخ

۲ سال لکھا خامے نے وائے "حیف شہاب ثاقب نیر" ۱۲۸۶ھ

ایضاً از میرزا قربان علی بیگ سالک دہلوی

۲ تاریخ وفات او چنیں سالک گفت "روز ششم مہ محرم صد آہ" ۱۲۸۶ھ

تاریخ وفات میر کاظم علی ثامن تخلص برادر خورد میر ضامن علی جلال از جلال

۲ لکھا سال رحلت جلال حزیں نے "جواں مر گئے میر ثامن علی آہ" ۱۲۹۰ھ

تاریخ وفات سید مہدی صاحب جدید تخلص برادر رشید (صاحب) نواسہ میر انیس از مرزا احمد ہادی عزیز لکھنوی

۵ ملہم غیبی بی تاریخ او گفت از عزیز "زیب مجلس رفت؛ زد نیا بہنگام شباب" ۱۳۰۳ھ

تاریخ وفات قلندر بخش جرات تخلص (دہلوی) از شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی

۲ مصرع تاریخ ناسخ نے کہا "ہائے ہندوستان کا شاعر موا" ۱۲۲۵

ایضاً از مولوی عبدالغفور خاں نساخ

۱ پے فوت قلندر بخش میں نے کہی تاریخ "جرات وائے جرات" ۱۲۲۵ھ

تاریخ وفات مرزا محمد عباس علی خاں صاحب جگر تخلص خلف آغائی صاحب ناظم (لکھنوی) از صفی لکھنوی

۵ صفی آنکھوں میں ہے جہاں تاریک "ہائے گل ہوگیا چراغ اودھ" ۱۳۲۸ھ

ایضاً از عزیز لکھنوی

۴ گفتم ایں مصرع تاریخ بہ انداز سجع "رفت در بزم جناں نزد محمد عباس" ۱۳۲۸ھ

ایضاً از مرزا کاظم حسین صاحب محشر

۵ سال تاریخ رقم زد محشر "رفت عباس حزیں پیش حسین" ۱۳۲۸ھ

ایضاً از نواب سید محمد جعفر خاں بہادر جعفر تخلص رئیس شمس آباد

۲ رونق بزم عزا اٹھ گیا انا للہ "مجلس شاہ ہے عباس سے خالی ہے ہے" ۱۳۲۸ھ

تاریخ وفات میر ضامن علی صاحب جلال لکھنوی (شاگرد رشک) از حافظ علی احسن صاحب احسن مارہروی شاگرد نواب فصیح الملک داغ دہلوی

۱۳ تاریخ انتقال کہوں احسن اور کیا "بے کس سخن ہے مردہ وصال جلال سے" ۱۳۲۷ھ
۲۰ر اکتوبر ۱۹۰۹ء بمقام لکھنؤ (ک)

ایضاً از احسن

۹ تاریخ سن کے مطمئن احسن نہ کیوں ہوں سب "ضامن علی ہوا ہے عدم میں جلال کا" ۱۳۲۷ھ

ایضاً از سیف شاہ جہاں پوری

۲ گفت سال وفات سیف حزیں "ہای ضامن علی جلال بمرد" ۱۳۲۷ھ

ایضاً از مولوی عبدالحق صفا رام پوری

۲ اے صفا اندوہگیں تو مصرع سال وفات، لکھ او سکے "سر آمد اہل کمال اوستاد آہ" ۱۳۲۷ھ

ایضاً از سید تجمل حسین جلال پوری تجمل تخلص مقیم بمبئی

۲ تازہ یہ اور دل کو تجمل ہوا قلق "آخر جہاں میں تر ہے اک جلال بھی" ۱۳۲۷ھ

ایضاً از حکیم میر مہدی کمال خلف حضرت جلال

۳ کمال آنکھوں سے پنہاں ہیں جلال آج "چھپا ہے شاعری کا مہر تاباں" ۱۳۲۷ھ

(بروز چہار شنبہ ۴ شوال)

ایضاً از کمال

۱۲ کمال زار نے جب فکر کی تاریخ رحلت کی — صدا آئی "چھپا ہے ماہ تابان سخن کیسا" ۱۲۹۲ھ

تاریخ وفات مولوی جمیل الدین جمیل تخلص فرخ آبادی از نواب نیاز احمد خاں ہوش بریلوی

۲ کہا با دل ہوش رضواں نے تب — "گئے افزوں ہوئی زینت خلد آج" ۱۲۰۹ھ

تاریخ وفات حکیم محمد محسن علی خاں جوش بریلوی از نواب نیاز احمد خاں ہوش بریلوی

۲ ہوئے تیغ فرقت سے بے سر جو د — "طبابت، سخن، خلق، خلق و رحم و نکوئی" ۱۲۷۴ھ

تاریخ وفات منشی جواہر سنگھ جوہر لکھنوی از راجہ عنایت سنگھ

۲ تاریخ وفاتش در ہجری چوں جست عنایت ملہم غیب
"جوہر بسواری اسپ ابلق شد سوئے ارم صدا آہ بگفت"
۱۲۱۱ھ ۱۱

(چہار گوہر)

تاریخ وفات منشی جواہر سنگھ جوہر از راجہ عنایت سنگھ

۱۲ جوہر کا جو سال وفات لکھا دل ہائے عنایت کا ٹوٹا — "شمشیر زباں آرائی کا لو مٹ گیا جوہر آہ الم" ۱۹۵۰ بکرمی

تاریخ وفات مرزا جہاندار شاہ ولیعہد شاہ عالم بادشاہ متخلص جہاندار از ناسخ

۲ سال فوتش چو من طلب کردم — "رضی اللہ عنہ" گفت سروش ۱۲۲۱ھ

تاریخ وفات خواجہ الطاف حسین حالی شمس العلما مرحوم از مرزا دولہا صاحب دہلوی یادگار مرزا نوشہ صاحب غالب

۲ کس چو پرسد سال تاریخ وفاتش سالیا — گو مکش "حالی گزشت از دور گیتی دوں جہاں" ۱۳۳۳ھ

۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء ۱۱ صفر

تاریخ وفات مولوی حامد علی خاں صاحب حامد امروہوی بیرسٹرایٹ لکھنؤ از محمد غافر حسین سرسوی مفتوں

۱۱ کہو یوں مصرع تاریخ مفتوں — "بسے فردوس میں حامد علی خاں"
۱۳۳۶ھ ۱۱ ستمبر ۱۹۱۸ء

تاریخ وفات مرزا جعفر علی حسرت لکھنوی از مولوی عبد الغفور خاں نساخ

۱ بہر سال فوت حسرت ہاتفم — "مرد ہے ہے میرزا حسرت" بگفت ۱۲۰۶ھ

تاریخ وفات میر حسن صاحب مثنوی از میاں مصحفی

۲ بسکہ شیریں بود نطقش مصحفی — "شاعر شیریں زباں" تاریخ یافت

تاریخ وفات نواب غلام حسین خاں صاحب شاہجہاں پوری حسین تخلص از حافظ بدھن خاں صفا تایب

۲ اندھیرا ہے جہاں میں وفات حسین سے — ہاتف نے یوں کہا کہ "ہوا گل چراغ ہے" ۱۲۸۱ھ

ایضاً از نواب عبد العزیز خاں صاحب عزیز بریلوی

۲ جستم چو سال وفات او برخواند ہاتف مصرعی — "پرواز کردہ از چمن ایں عندلیب بوستاں"
۱۲۸۱ھ

تاریخ وفات آغا محمد حسین صاحب کہا چی صاحب غذب البیان حسین تخلص از جناب امیر لکھنوی

۲ سال تاریخ فوت گفت اسیر "ہائے دبندار و ذاکر و عابد" ۱۲۹۵ھ

تاریخ وفات حکیم مرزا باقر حشم تخلص شاگرد ناسخ از میر وزیر نور

۳ دل سرآہ کشیدہ بہر سال گفت "مرزا باقر شیریں مقال" (بست و چارم ماہ صیام) ۱۲۹۱ھ

تاریخ وفات مرزا غلام فخر الدین دہلوی حشمت تخلص از نساخ

۱ سال ترحیل حشمت اے نساخ "حشمت حق شناس" ہاتف گفت ۱۲۶۷ھ

تاریخ وفات حکیم (رحمت الدولہ) غضنفر علی خاں صاحب غضنفر الدولہ خلف و شاگرد جناب امیر از کلیم لکھنوی

۲ سن فوتش بہ عیسوی است کلیم "از جہاں گل شدہ چراغ اسیر" ۱۹۰۱ء

ایضاً از کلیم

۳ کلیم از بہر تاریخش بگفتم "حکیمی زیب جنت شد بجنت" ۱۳۱۹ھ
دگر ہم مصرع تاریخ خوانم "محیط لطف پیوستہ برحمت" ۱۳۱۹ھ

تاریخ وفات حاجی مولوی سید عبد الحمید مرحوم حمید تخلص از النسخ شاگرد ناسخ

۶ سن فوتش دل النسخ بصد غم "دریغا وائے واویلا" بگفتا ۱۲۸۹ھ

تاریخ وفات دلیر الدولہ مرزا حیدر صاحب بہادر حیدر تخلص از جناب امیر

۲ بتاریخ فوتش ندا کرد ہاتف کہ "جا یافت حیدر بقرب پیمبر"

تاریخ وفات مولوی نجف (علی) خاں خستہ تخلص اوستاد نواب صاحب ناظم باشندہ جھجر از مولوی عبد الغفور خاں صاحب نساخ

۲ مرد و نساخ سن ترحیلش زد رقم "منزل خستہ مینو" ۱۲۷۵ھ

تاریخ وفات مرزا ظہور (علی) خلیق تخلص (لکھنوی) (مرثیہ گو) از نساخ

۱ سال ترحیل خلیق اے نساخ خامہ ام بر نگاشت "صدمہ سخت" ۱۱۹۹ھ

تاریخ وفات (میر) خلیل شاعر مرثیہ گو از منشی آل احمد

سہ شاعر از زوال آمد بیک سال کہ ہند از شعرشاں چوں اصفہاں بود
یکے آں غالب استاد سانین کہ او خود پیر دشعرا و جوان بود
دوم آں نہا سپہر استاد اردو کہ شعر او سرور افزای جاں بود
سوم شاعر خلیل مرثیہ گو کہ در ملک سخن صاحب نشاں بود
ہمہ عالم ز فوت ایں سہ شاعر پُر از فریاد و از شور و فغاں بود

۶ زبر با بینہ از بہر تاریخ فراہم شد "زوال شاعراں بود"

تاریخ وفات سید (میر) باقر حسین صاحب خنداں تخلص از کلیم لکھنوی

۲ کلیم ایں سال ہجرش گفت ہجری "سہیل نیک پیوستہ برحمت" ۱۳۱۸ھ

تاریخ وفات مولوی عبد العزیز تخلص خواجہ باشندہ کلکتہ شاگرد عصمت اللہ النسخ

۲ ہاتم ورنج بیکراں الشیخ — "حیف تلمیذ" سال رحلت گفت
۱۲۷۸ فصلی

تاریخ وفات محمد عابد علی خاں خورشید تخلص از نواب سلیمان خاں اسد شاگرد جناب امیر لکھنوی

۲ درچنیں اندوہ از ردی الم کلک اسد — "حشمت دیں یافتہ" تاریخ سالش زد رقم ۱۳۰۹ھ

تاریخ وفات سید محمد اصطفی عرف لڈن میاں خورشید (لکھنوی) استاد کلیم لکھنوی

۳ لکھ دو ہجری میں سن مرگ کلیم — "آیا خورشید گہن میں آیا" ۱۳۱۹ھ

تاریخ وفات محمد علی میاں خیال تخلص رئیس شاہ جہاں پور شاگرد جناب امیر مینائی از مولوی مظفر حسین صاحب سلیمانی

۴ چو جست سال مظفر سروش داد ندا — "بسوی ملک عدم شد خیال سید پاک" ۱۳۲۴ھ

ایضاً از مولوی مظفر حسین سلیمانی

۵ فکر تاریخ چوں مظفر ہست — از سر جاں بگو کہ "رفت خیال" ۱۳۲۴ھ

ایضاً مادہ تاریخی

۱ "ہوگیا ہائے ہائے خواب خیال" ۱۳۲۴ھ

تاریخ ہائے وفات استاد السلطان خان بہادر بلبل ہندوستان ناظم یار جنگ نواب مرزا خاں صاحب داغ امیر الدولہ فصیح الملک دہلوی استاد حضور بندگان عالی آصف جاہ (خامس) نظام دکن

از آزاد صاحب شیخ پوری شاگرد جناب امیر مرحوم

۱۱ داغ کا داغ اور امیر کا داغ — دل آزاد داغ داغ ہوا
مصرعہ سال کہہ کے "دم" نکلا — "آج راہی جہاں سے داغ ہوا" ۱۳۲۲ھ

ایضاً از احسن صاحب مارہروی شاگرد جناب داغ

۱۲ احسن نے جو سال فوت ڈھونڈا — پایا "نواب میرزا داغ" ۱۳۲۲ھ

ایضاً از سید محمد اختر صاحب اختر لکھنوی شاگرد داغ

۷ اختر برائے رحلت او سال عیسوی — گفت ست "آہ آہ شدہ انتقال داغ" ۱۹۰۵ء

ایضاً از حکیم بدر الدین صاحب بدر شامی

۶ تاریخ سروش نے سنائی — "ہیہات اے وائے میرزا داغ" ۱۳۲۲ھ

ایضاً از مولوی نجم الدین صاحب ثاقب سہواری

۵ سن لو ثاقب سے داغ کی تاریخ — "قمری بوستان جنت ہے" ۱۳۲۲ھ

ایضاً از میر ضامن علی صاحب جلال لکھنوی

۲ گفت جلال حزیں سال وفاتش چنیں — "بست بفردوس پاک بلبل ہند آشیاں" ۱۳۲۲ھ

ایضاً از جمیلہ اہلیہ خان بہادر مولوی خدا بخش خاں سی آئی ای ساکن بانکی پور شاگرد داغ صاحب

لہ بزم مشاعرہ میں تابش کے اس مصرع پر 'دوڑی ہوئی آئی سوے مقتل ہے قضا بھی' تحسین کی آواز نعتگر گئے ۱۲ مؤلف۔ حاشیہ مخطوطہ

۹ اے جمیلہ خوں رلایا ہے غم استاد نے — داغ دل میں صورت اختر نمایاں ہو گیا

ایضاً از مولوی حسن رضا خاں صاحب بریلوی شاگرد جناب داغ

۱۰ مرگ استاد کی حسن تاریخ — "داغ نواب میرزا" کہیے ۱۳۲۲

ایضاً از قاضی سید مقصود حسن حیرت شاہ جہاں پوری سررشتہ دار عدالت ججی غفیفہ گوالیار شاگرد نواب مرزا صاحب داغ دہلوی

۱۱ سال زبرد بینہ میں اور لکھ — "حیرت دلخستہ ختم شاعری" ۱۳۲۲

دیگر از حیرت شاہ جہاں پوری

"دم" نکلتا ہے سن کے یہ تاریخ — "آج راہی جہاں سے داغ ہوا" ۱۳۲۲ھ
تخرجہ

دیگر از حیرت

۲ کیا شان کرم ہے دیکھ حیرت — بلبل کو خدا نے کیا دیا داغ
دریا کو گہر فلک کو انجم — "جنت کو نواب میرزا داغ" ۱۳۲۲ھ

دیگر از حیرت

۳ جگر شق کیوں نہ ہو اس غم سے سب کا — "قضا کی ہے فصیح الملک نے آہ" ۱۳۲۲ھ

دیگر از حیرت در صوری و معنوی

۴ حیرت دلخستہ یہ تاریخ ہے — "تیرہ سو بائیس کہو سال موت" ۱۳۲۲

ایضاً از حفیظ صاحب جونپوری شاگرد امیر مینائی

۵ سال غم پڑھ کے خون ناب بہا — "شاعری داغ کے گی ہمراہ"

(بعارضہ فالج ۹ ذی حجہ (شنبہ) یوم الحج ۱۳۲۲ھ ۱۷ فروری ۱۹۰۵ء تدفین یوم عید)

ایضاً از رشید احمد صاحب رشید تھانہ بھون

۲ سال وفات کے لیے ہاتف غیب نے کہا — "حضرت داغ اے رشید مر گئے آج آہ آہ"

ایضاً از شیخ محمد حنیف صاحب رعب قریشی انصاری شکوہ آبادی

۲ گفت تاریخ وفاتش رعب زار — "آہ داغ دہلوی مرد آہ آہ" ۱۳۲۲ھ

دیگر از رعب

۲ رعب سے تاریخ جب پوچھی تو رو رو کر کہا — "ہو گیا زیر زمیں اب نہاں سپہر شاعری"

ایضاً از منشی ریاض احمد صاحب ریاض خیرآبادی شاگرد جناب امیر مینائی لکھنوی

۱۴ کہہ رہا ہے مصرعہ سال وفات — "اے خدا اب داغ لاکھوں دل میں ہے" ۱۳۲۲

ایضاً از زوار صاحب الہ آبادی

۲ چلا ہائے ہائے دنیا سے — "بلبل ہند داغ ملک عدم" ۱۳۲۲

ایضاً از ابو المعظم مرزا سراج الدین احمد خاں سایل دہلوی برادر زادہ جناب داغ دہلوی کہ بہ مزارش کندہ شدہ است

۵ شد وفاتش بشام یوم الحج — دفن شد روز عید سامی ہند
آہ دل برکشید و سایل گفت — "مدفن پاک داغ نامی ہند" ۱۳۲۲

ایضاً از منشی اودھم سنگھ سردار امرتسر

۵ عیسوی سردار لکھ دے سال مرگ "داغ مرگ بلبل ہندوستاں" ۱۹۰۵ء

ایضاً راجہ راجایان مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد صاحب بہادر یمین السلطنت پیشکار مدار المہام سرکار عالی تلمیذ جناب آصف فرماں روائے سابق حیدرآباد دکن

۹ شاد نے لکھی یہ تاریخ وفات "کعبہ جاں بلبل باغ جناں" ۱۳۲۲ھ

دیگر از شاد صاحب بہادر

۷ دل سے کہی شاد نے یہ تاریخ (مدت علالت یک ہفتہ) دلی کا چراغ بجھ گیا آہ ۱۳۲۲ھ

دیگر از شاد صاحب بہادر

۷ شاد نے موزوں کیا یہ مصرع سال وفات "چھپ گیا آنکھوں سے اب وہ آفتاب شاعری" ۱۳۲۲ھ

دیگر از شاد صاحب بہادر

۲ نکالو شاد دو لفظوں میں تاریخ ہے اردو زباں تھے "داغ فیضی" ۱۹۰۵ء

ایضاً از شاعر صاحب شاگرد داغ

۲ شاعر لکھے کس دل سے بھلا مصرع تاریخ جس شخص کی نظروں میں ہو "گلزار جہاں داغ" ۱۳۲۲ھ

ایضاً منشی مرتضیٰ علی صاحب شرر کاکوروی شاگرد داغ دہلوی

تھے چرخ سخن کے دو ہی نیر اک مہر تھا اور دوسرا ماہ

۵ عبرت کہتی ہے تربتوں پر "یہ داغ ہے یہ امیر ہے آہ" ۱۳۲۲ھ

ایضاً دیگر از شرر صاحب کاکوروی

۲ دلم خواست تاریخ رحلت زہاتف بگفتا "نہاں زیر خاک دکن شد" ۱۳۲۲ھ

ایضاً از قاضی شوکت حسین خاں صاحب شوکت رئیس اعظم مراد آباد شاگرد داغ دہلوی

۱۰ سن فوت ڈھونڈھا تو ہاتف نے شوکت کہا غیب سے "وائے داغ مکرم" ۱۳۲۲ھ

ایضاً از ضیا صاحب دہلوی

۲ کی ضیا نے جو مغفرت کی دعا "داغ بخشا گیا" صدا آئی ۱۹۰۵ء

ایضاً از محمد حسین صاحب طاہر فرخ آبادی

۱۹ طاہر بخستہ نے داغ کی رحلت کی سن رو کے کہی "آہ آہ دل میں ہے داغ نہاں" ۱۳۲۲ھ

ایضاً از سید ظفر حسین صاحب تعلقہ دار رسول پور

۳ "شاعری ہو گئی یتیم افسوس" ۱۳۲۲ھ

ایضاً از محمد عماد الدین صاحب عالم امروہوی

۳ ربودہ عقل و ہوشم مرگ استاد "فصیح الملک و استاد جہاں داغ" ۱۳۲۲ھ

ایضاً از خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی

۹ سنیے سال وفات برجستہ "داغ نواب میرزا کہیے" ۱۳۲۲ھ

۹ اے جمیلہ خوں رلایا ہے غم اوستاد نے — داغ دل میں صورت اختر نمایاں ہوگیا

ایضاً از مولوی حسن رضا خاں صاحب بریلوی شاگرد جناب داغ

۱۰ مرگ استاد کی حسن تاریخ — "داغ نواب میرزا" کہیے ۱۳۲۲

ایضاً از قاضی سید مقصود حسن حیرت شاہ جہاں پوری سر رشتہ دار عدالت ججی خفیفہ گوالیار شاگرد نواب مرزا صاحب داغ دہلوی

۱۱ سال زہرہ دبینہ میں اور لکھ — "حیرت دلخستہ ختم شاعری" ۱۳۲۲

دیگر از حیرت شاہ جہاں پوری

"دم" نکلتا ہے سن کے یہ تاریخ (تخرجہ) — "آج راہی جہاں سے داغ ہوا" ۱۳۲۲ھ

دیگر از حیرت

۲ کیا شان کرم ہے دیکھ حیرت — بلبل کو خدا نے کیا دیا داغ
دریا کو گہر فلک کو انجم — "جنت کو نواب میرزا داغ" ۱۳۲۲ھ

دیگر از حیرت

۳ جگر شق کیوں نہ ہو اس غم سے سب کا — "قضا کی ہے فصیح الملک نے آہ" ۱۳۲۲ھ

دیگر از حیرت در صوری و معنوی

۲ حیرت دلخستہ یہ تاریخ ہے — "تیرہ سو بائیس کہو سال موت" ۱۳۲۲ھ

ایضاً از حفیظ صاحب جونپوری شاگرد امیر مینائی

۹ سال غم پڑھ کے خون ناب بہا — "شاعری داغ کے گی ہمراہ"

(بعارضہ فالج ۹ ذی حجہ (شنبہ) یوم الحج ۱۳۲۲ھ ۱۷ فروری ۱۹۰۵ء تدفین یوم عید)

ایضاً از رشید احمد صاحب رشید تھانہ بھون

۲ سال وفات کے لیے ہاتف غیب نے کہا — "حضرت داغ اے رشید مرگئے آج آہ آہ"

ایضاً از شیخ محمد حنیف صاحب رعب قریشی انصاری شکوہ آبادی

۲ گفت تاریخ وفاتش رعب زار — "آہ داغ دہلوی مرد آہ آہ" ۱۳۲۲ھ

دیگر از رعب

۲ رعب سے تاریخ جب پوچھی تو رو رو کر کہا — "ہو گیا زیر زمیں پنہاں سپہر شاعری"

ایضاً از منشی ریاض احمد صاحب ریاض خیرآبادی شاگرد جناب امیر مینائی لکھنوی

۱۴ کہہ رہا ہے مصرعہ سال وفات — "اے خدا داغ لاکھوں دل میں ہے" ۱۳۲۲ھ

ایضاً از زوار صاحب الہ آبادی

۲ چلا ہائے ہائے دنیا سے — "بلبل ہند داغ ملک عدم" ۱۳۲۲ھ

ایضاً از ابوالمعظم مرزا سراج الدین احمد خاں سایل دہلوی برادر زادۂ جناب داغ دہلوی کہ بر مزارش کندہ شدہ است

۵ شد وفاتش بشام یوم الحج — دفن شد روز عید سامی ہند
آہ دل برکشید و سایل گفت — "دفن پاک داغ نامی ہند" ۱۳۲۲ھ

ایضاً از منشی اودھم سنگھ سردار امرتسر

۵ عیسوی سردار لکھ دے سال مرگ "داغ مرگ بلبل ہندوستاں" ۱۹۰۵

ایضاً راجہ راجایان مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد صاحب بہادر یمین السلطنت پیشکار مدار المہام سرکار عالی تلمیذ جناب آصف فرماں روائے سابق حیدرآباد دکن

۹ شاد نے لکھی یہ تاریخ وفات "کعبہ جاں بلبل باغ جناں" ۱۳۲۲ھ

دیگر از شاد صاحب بہادر

۷ دل سے کہی شاد نے یہ تاریخ دلی کا چراغ بجھ گیا آہ ۱۳۲۲ھ
(مدت علالت یک ہفتہ)

دیگر از شاد صاحب بہادر

۷ شاد نے موزوں کیا یہ مصرع سال وفات "چھپ گیا آنکھوں سے اب وہ آفتاب شاعری" ۱۳۲۲ھ

دیگر از شاد صاحب بہادر

۲ نکالو شاد دو لفظوں میں تاریخ ہے اردو زباں تھے "داغ فیضی" ۱۹۰۵ء

ایضاً از شاعر صاحب شاگرد داغ

۲ شاعر لکھے کس دل سے بھلا مصرع تاریخ جس شخص کی نظروں میں ہو "گلزار جہاں داغ" ۱۳۲۲ھ

ایضاً منشی ارتضیٰ علی صاحب شہر کاکوروی شاگرد داغ دہلوی

تھے چرخ سخن کے دو ہی نیر اک مہر تھا اور دوسرا ماہ

۵ عبرت کہتی ہے تربتوں پر "یہ داغ ہے یہ امیر ہے آہ" ۱۳۲۲ھ

ایضاً دیگر از شہر صاحب کاکوروی

۲ دلم خواست تاریخ رحلت زہاتف بگفتا "نہاں زیر خاک دکن شد" ۱۳۲۲ھ

ایضاً از قاضی شوکت حسین خاں صاحب شوکت رئیس اعظم مرادآباد شاگرد داغ دہلوی

۱۰ سن فوت ڈھونڈھا تو ہاتف نے شوکت کہا غیب سے "وائے داغ مکرم" ۱۳۲۲ھ

ایضاً از ضیا صاحب دہلوی

۲ کی ضیا نے جو مغفرت کی دعا "داغ بخشا گیا" صدا آئی ۱۹۰۵ء

ایضاً از محمد حسین صاحب طاہر فرخ آبادی

۱۹ طاہر دلخستہ نے داغ کی رحلت کی سن رو کے کہی "آہ آہ دل میں ہے داغ نہاں"

ایضاً از سید ظفر حسین صاحب تعلقہ دار رسول پور

۳ "شاعری ہو گئی یتیم افسوس" ۱۳۲۲ھ

ایضاً از محمد عماد الدین صاحب عالم امروہوی

۳ ربودہ عقل و ہوشم مرگ استاد "فصیح الملک استاد جہاں داغ" ۱۳۲۲ھ

ایضاً از خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی

۹ سنیے سال وفات برجستہ "داغ نواب میرزا کہیے" ۱۳۲۲ھ

ایضاً از امیر حسن فروغ لکھنوی

۲ آئی ندائے غیب دم فکر سال فوت "داغ اے فروغ دل کو بڑا داغ دے گئے" ۱۳۲۲ھ

ایضاً از منشی فیاض احمد صاحب فیاض تخلص شاگرد داغ دھلوی

۱۸ فیاض گر تلاش ہے سال وفات کی کہہ "لعل دہلی نذر زمین دکن ہوا" ۱۳۲۲ھ

ایضاً از سید احمد اللہ صاحب قیصر وکیل عدالت العالیہ حیدرآباد دکن

۱۵ کس نے سوچ اس قدر قیصر کہہ دے "علم سخن یتیم ہوا" ۱۳۲۲ھ

ایضاً از کلیم صاحب لکھنوی شاگرد لطافت

۵ سال ہجری کلیم کرد رقم "داغ سوئے جناں بود لب پاس" ۱۳۲۲ھ

دیگر از کلیم

۱۴ عیسوی سال وفاتش چہ ہجری است کلیم "داغ در لالہ جنت بود از لطف ازل" ۱۹۰۵ء

ایضاً از حکیم میر مہدی صاحب کمال خلف جناب جلال لکھنوی

۹ کمال حزیں نے لکھا سال مرگ "اجل دے گی آہ داغ جگر" ۱۳۲۲ھ

ایضاً از منشی چراغ الدین صاحب لایق تخلص لاہوری اہلکار مطبع ریاست بھوپال

۶ مصرع تاریخ لایق نے کہا "داغ دے کے عید کے دن چل بسے"

ایضاً از مولانا مبارک صاحب اینچ بانکی پور

۴۲ "کب لب بام آفتاب نہ تھا" ۱۳۲۲ھ

از جناب محمود خاں صاحب محمود تخلص ساکن رام پور شاگرد نواب فصیح الملک بہادر داغ

۴ داغ دنیا سے کیا گئے محمود "گل ہوا گویا شاعری کا چراغ" ۱۹۰۵ء

دیگر از جناب محمود خاں صاحب

۳ جن کی تھی محمود اک عالم میں دھوم "چل بسے صد حیف وہ داغ آج آہ" ۱۳۲۲ھ

دیگر از جناب محمود خاں صاحب

۳ فرما دیا خدا نے محمود ہم نے بخشا ۱۳۲۲ھ نواب میرزا خاں سیدھا جناں میں پہنچے

ایضاً از حکیم مولوی غلام غوث خاں (؟) صاحب منت دہلوی یادگار خاندان جناب شیفتہ

۱۵ مصرع تاریخ منت نے کہا بے ساختہ "آج وہ تاج سر ہندوستاں بھی چل دیا" ۱۳۲۲ھ

ایضاً از چھوٹو لال صاحب موج

۴ کہا ہاتف نے مصرع تاریخ "چل بسا حیف داغ بلبل ہند" ۱۳۲۲ھ

ایضاً از شیخ حافظ محمد سلام الدین صاحب نادر تخلص رئیس اجمیر

۷ لکھیے نادر مٹا کے "دلی" کو "آج راہی جہاں سے داغ ہوا" ۱۳۲۲ھ

ایضاً از وجاہت صاحب صدیقی

۱۰ ہے یہ تاریخ رحلت استاد "آہ کیا داغ دے گے دل پر" ۱۳۲۲ھ

ایضاً از عزیز جنگ صاحب ولا، شاگرد داغ صاحب

۶ مصرع سال ہے فغان و لا "ہائے وہ داغ دے گئے دل پر" ۱۳۲۲ھ

تاریخ وفات مولوی وجہ اللہ خاں بہادر داغ تخلص ڈپٹی مجسٹریٹ پورنیہ از نساخ

۲ جو میں پوچھا خرد نے سال وفات "مر گیا داغ آہ آہ" کہا ۱۲۸۸ھ

تاریخ وفات مرزا سلامت علی صاحب دبیر (مرثیہ گو لکھنوی از جناب اسیر لکھنوی

۵ اسیر از غیب تاریخش شنیدم دبیر از ہند سوئے کربلا رفت ۱۲۹۲ھ

ایضاً از میر ضامن علی صاحب جلال

۲ لکھی جلال نے تاریخ انتقال دبیر "فلک پہ اوٹھ گئے مرزا دبیر وا ویلا" ۱۲۹۲ھ

ایضاً از شیخ محمد جان صاحب شاد لکھنوی

۲ از پے سالش بصنع تخرجہ شد مصرعہ "خار بی طوطی چمن بر ہم قلم رفتے دبیر" ۱۲۹۲ھ

ایضاً از سید حسن صاحب لطافت خلف امانت

۹ ہاں الم سے سر اٹھا کر لکھ دے تاریخ وفات باغ بے بلبل ہے ہند: ستاں لطافت بے دبیر ۱۲۹۲ھ

(سہ شنبہ وقت صبح سلخ محرم)

ایضاً از منشی اسماعیل حسین صاحب منیر شکوہ آبادی

۳ سال ہجری و مسیحی نظم کردم اے منیر "بے نظیر دہر" یکتا بود آں "استاد فن" ۱۸۷۵ء ۱۲۹۲ھ

ایضاً از میر وزیر نور لکھنوی

۲ از فلک نور ندا بہر سنینش آمد "شہ اقلیم سخن بود دبیر نیا اے آہ" ۱۲۹۲ھ

دیگر از نور

۲ سروش غیب بلوحش نوشت از سر دل "مزار پاک جناب دبیر خلد مکاں" ۱۲۹۲ھ

تاریخ وفات خواجہ میر درد علیہ الرحمہ دہلوی از نساخ

۱ سال ترحیل درد اے نساخ خامہ ام برنگاشت "صدمہ سخت" ۱۱۹۹ھ

۷ جنوری ۱۷۸۵ء جمعہ ۲۴ صفر

تاریخ وفات دلگیر (لکھنوی) مرثیہ گو از جناب اسیر لکھنوی

۲ گفت ہاتف اسیر تاریخش "وائے دلگیر عاشق شبیر" ۱۲۶۴ھ

تاریخ ہائے وفات شیخ ابراہیم صاحب ذوق دہلوی (استاد بہادر شاہ ظفر)

از شاہزادہ محمد قادر بخش صابر دہلوی

۵ سر بربادی فن نے سخن میں دخل جب پایا "لباس حرف سے معنی نے پہنا جامہ ماتم" ۱۲۷۱ھ

پنجشنبہ ۱۶ نومبر ۱۸۵۴ء ۲۴ صفر

ایضاً از منشی اسماعیل حسین منیر

۳ نظم کی میں نے یہ تاریخ منیر "نرہا ذوق زباں دہلی میں" ۱۲۷۱ھ

ایضاً از منشی عبدالغفور نساخ

۲ کی طلب میں نے جو تاریخ وفات "ذوق ہے فردوس میں" دل نے کہا ۱۲۷۱ھ

تاریخ وفات مولوی عبدالرحمٰن راسخ دہلوی (شاگرد مولوی محمد حسین فقیر) از آغا شاعر قزلباش دہلوی

۱۱ مصرع تاریخ شاعر کیا لکھے "ہائے راسخ فرد کامل گم ہوا"[۱]
۱۳۲۵ھ

ایضاً از مولوی عبدالقدوس صاحب قدسی برادر ماموں زاد مولانا راسخ دہلوی

۵ لکھا ہے سال یہ قدسی نے لوح تربت پر "ہے قبر راسخ طوطی ہند واویلا"
۱۳۲۵ھ

ایضاً از فیاض صاحب فاروقی دہلوی مقیم جودھپور

۳ گفت فیاض سال تاریخش "ثانی میر و میرزا مرد آہ"
۱۳۲۵ھ

دیگر از ایضاً

۲۲ لکھ دے فیاض مصرع تاریخ "بجھ گیا ہے چراغ دلّی کا"
۱۳۲۵ھ

از منیرالدین صاحب منیر دہلوی

۱۳ منیر اب ان کا سال فوت لکھیے "ہوئی شعبان میں بس ان کی رحلت"

تاریخ وفات نواب ظفریاب خاں راسخ (بریلوی) از نواب سلیمان خان اسد شاگرد جناب اسیر

۲ عیسوی گفتمش اینک تاریخ "رفت راسخ بارم از دنیا"
۱۸۵۷ء

تاریخ انتقال شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی از ناسخ

۱ سال فوت راسخ فخر جہاں "گفت ہاتف راسخ شیوا زباں"
۱۲۳۸ھ

تاریخ وفات شاہ رؤف احمد رافت مجددی از ناسخ

۲ بہر تاریخ رحلتش ناسخ شد رقم "قدوہ جنت رافت"

۱۶ اپریل ۱۸۳۴ء بعمر ۶۵ سال ۲۵ ذی قعدہ ۱۲۴۰ (دی) ۱۲۴۹ھ

تاریخ وفات خواجہ بدرالدین عرف خواجہ امان (دہلوی) مترجم بوستان خیال راتم تخلص[۲] از مرزا قربان علی بیگ صاحب سالک دہلوی

۵ مپرس از من آشفتہ در قومی پرسی "نیافت خواجہ اماں آہ از اجل سال مست"

سہ شنبہ ۱۲ اگست ۱۸۷۹ء ۲۳ شعبان ۱۲۹۶ھ

ایضاً از غلام حسنین صاحب قدر بلگرامی

۲ قدر نے تاریخ کا مصرع کہا "آہ بدر آیا خسوف گور میں"
۱۲۹۶ھ

تاریخ وفات جناب شیخ وجیہہ الزماں خاں سفیر خاص دارالریاستہ رامپور رحیق تخلص کہ در عہد جناب نواب محمد یوسف علی خاں بہادر (ناظم تخلص) طاب ثراہ بعہدہ سفارت مقرر بودند از جناب منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی

۲ رحلت کی امیر ان کی کہی میں نے یہ تاریخ "بالله ملک تھے وہ لباس بشری میں"

سہ شنبہ ۹ جولائی ۱۸۷۲ء بعمر ۴۰ سال ۲ رجمادی الاول (دی) ۱۲۸۹ھ

ایضاً از جناب اسیر لکھنوی

---

[۱] ۱۶ شعبان روز چہارشنبہ قبل از نصف النہار[۲] سہواً مصنف نے خواجہ امان کا تخلص راسخ لکھ دیا ہے۔ یہ تخلص خواجہ قمرالدین کا ہے جو خواجہ امان کے بیٹے ہیں۔
[۲] حاشیہ مخطوطہ

۲ کہی اسیر یہ تاریخ رحلت مرحوم "جناب شیخ وجیہ الزماں جناں کو گئے"
۱۲۸۹ھ

تاریخ وفات حسین علی خاں رزم فرخ آبادی شاگرد میاں منیر از منیر

۳ منیر مصرع تاریخ رحلتش گفتم "بود حسین علی وارد زمین بہشت"
۱۲۷۵ھ

تاریخ وفات سید ناصر علی خاں بہادر ذوالقدر رزیں تخلص از جناب منیر

۵ مصرع سال وفاتش نظم کردہ لے منیر "آسمان رائے صاحب بند میں افتادہ ولے"
۱۳۸۲ھ

دیگر از جناب منیر

۳ بنوشت منیر آہ چنیں سال وفاتش "افسوس رزین الشعرا صاحب من ہائے"
۱۲۸۱ھ

تاریخ وفات حکیم مرزا شبیر علی خاں صاحب (لکھنوی) رسا و شوکت تخلص از کلیم لکھنوی

۴ بنوشت کلیم از سن فوتش بہ مسیحی "شبیر علی خاں بیباں زیب ارم شد"
۱۹۰۲ء

تاریخ وفات منشی رستم علی رستم تخلص شاگرد مولوی عصمت اللہ ناسخ از ناسخ

۲ کلک ناسخ نے بہر سال وفات لکھ دیا "انتقال رستم آہ"
۱۲۸۸ھ

تاریخ وفات میر علی اوسط رشک تخلص شاگرد ناسخ از جناب اسیر

۲ گفت تاریخ سراسیمہ دلم "شد نجا میر علی اوسط رشک"
۱۲۸۴ھ

ایضاً از شیخ محمد جان صاحب شاد لکھنوی

۲ الف بر شک فزود سنین مرگش گیر بچہار مرتبہ بے ردیف رشک کن تکرار
۱۲۸۴ھ

ایضاً از صغیر صاحب لکھنوی

۳ ہاتف غیب ندا دا دپئے تاریخ "دیدار باب جناں میر علی اوسط رشک"
۱۲۸۴ھ

ایضاً از منشی سید اسمٰعیل حسین منیر

۵ یافت از غیب چنیں مصرع تاریخ منیر "عابد کامل وخاقانی عالم افسوس"
۱۲۸۴ھ

ایضاً از جناب منیر شاگرد رشک

۳ گفتم بسنین عیسوی سال وفات "شاہنشہ ملک نظم بود حقا"
۱۸۶۰ء

تاریخ وفات نواب محمد علی خاں بہادر رئیس جہانگیر آباد رشکی تخلص (ریونیو ممبر ریاست رامپور) برادر نواب اسحاق خاں صاحب بہادر سابق مدارالمہام ریاست رامپور از میر مجروح دہلوی

۴ پے سنین وفاتش خرد بمن فرمود "بگوی رفت ز دنیا امیر ابن امیر"
۱۳۱۰ھ

تاریخ وفات سید محمد مصطفےٰ عرف پیارے صاحب رشید تخلص مداح اہلبیت از سید مہدی حسن احسن لکھنوی

۲ صدائے ہاتف غیب است از سر بالیں "فراق مدح سرائی رسول و آل رسول"
۱۳۳۶ھ

ایضاً از مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی

۱۷ سن وفات پہ محشر سے کہہ اٹھا رضواں "ہر ایک بیت پہ اک پاک گھر ارم میں ملا"

۴ ستمبر ۱۹۱۸ء بعمر ۷۷ سال (بعارضہ فالج بوقت سحر ۲۶ ذی قعدہ) ۱۳۳۶ھ

تاریخ وفات مرزا شمشاد علی بیگ رضوان تخلص برادر خورد مرزا قربان علی سالک دہلوی شاگرد غالب

۳ از عالم ناپائدار بگذشت ۲۹۸ گردید بخلد جای رضوان ۱۲۹۳ھ

تاریخ وفات نواب واجد علی خاں رضوان تخلص دہلوی شاگرد میاں منیر

۶ منیر ایں چنیں سال مرگش نوشتم "بخلد بریں دایما جای پاکش" ۱۲۹۱ھ

تاریخ وفات مولوی غلام جیلانی صاحب رفعت رام پوری (مولف جنگ نامہ دو جوڑا)
از عنبر شاہ خاں عنبر و آشفتہ

۵ ازاں بہر حساب سال نوتش بتاریخش دل خلد بریں شد"

بعمر ۸۰ سال بوقت چاشت دوشنبہ ۲۷ ذیحجہ (ی) ۱۲۳۴ھ

تاریخ وفات نواب سعادت یار خاں رنگین دہلوی رنگین تخلص از ناسخ

۱ مرد رنگیں سال ترحیلش گفت ہاتف "فضایل رنگیں"

بعمر ہشتاد سال (۱۸۳۵ء) ۱۲۵۱ھ

ایضاً از شاہ نصیر دہلوی تاریخ وفات رنگین دہلوی

۵ کن قلم اول سر بید یا زبے باک ایں بگو "آں سعادت یار رنگیں یاد می آید مرا"

تاریخ وفات (مولوی) حبیب احمد رویت تخلص (رامپوری) استاد نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ
والیہ بھوپال از ناسخ

۲ ملہم غیبی پے سال وفات "رویت مرحوم بفردوس" گفت

سہ شنبہ ۲۴ مارچ ۱۸۴۶ء بمرض ہیضہ ۲۵ جمادی الاول ۱۲۶۲ء

تاریخ وفات مرزا مغل سبقت تخلص از شیخ امام بخش ناسخ

۲ نوشتم سال تاریخ رحیلش "کہ مرد افسوس ہی افسوس سبقت" ۱۲۳۵ھ

تاریخ وفات امیر الدولہ سعید الملک سر راجہ امیر حسن خاں بہادر ممتاز جنگ سحر تخلص کے سی ایس، آئی،
والی ریاست محمود آباد از میر مہدی صاحب کمال خلف میر ضامن علی جلال

۶ لکھ دو اس طرح کمال ان کے سنین رحلت "بادۂ موت سے لبریز ہے یوں جام حیات"

بعمر ۵۴ سال ۸ بجے صبح ۳۰ مئی ۱۹۰۳ء (دوشنبہ ۲ ربیع الاول) ۱۳۲۱ھ

تاریخ وفات مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی از منشی دیبی پرشاد سحر بدایونی

۲ ہست جاری بزبان ہر کس "ہائے آمد الم و رفت سرور" ۱۲۸۴ھ

تاریخ رحلت نواب معین الدولہ باقر علی خاں بہادر ظفر جنگ ساحر تخلص از منیر

خواب میں ہاتھ لگا مصرع تاریخ منیر (جائے وفات ساحر) "وارد گلشن فردوس گرامی نواب" ۱۲۹۱ھ

تاریخ وفات مرزا قربان علی بیگ سالک (دہلوی) شاگرد غالب از منشی غلام حسنین قدر

۲ مصراع تاریخ وصال اندر رجز بداں "نواب قربان علی سالک ہزار افسوس مرد" ۱۲۹۷ھ

تاریخ وفات مولوی نصیر الدین حیدر مرحوم سامی تخلص مصنف سنہٹ از مولوی عبد الغفور خاں بہادر نساخ

۲ پی سال ترحیل او از حساب بگفتا خرد "سامی بی نظیر"

تاریخ وفات نواب نصر اللہ خاں بہادر سلطان تخلص کہ در عہد ریاست نواب (سید) احمد علی خاں بہادر مرحوم
سابق رئیس رام پور نائب ریاست بودند از مولوی عنبر شاہ خاں عنبر

یک ہزار و دو صد بہ بیست و پنج | بود از ہجرت رسول گواہ
ماہ شوال بود بست و ششم | کہ بجنت رسید لفسر اللہ

(۲۴ نومبر ۱۸۱۰ء بعمر ۶۴ سال شنبہ دی) ۲۶ شوال ۱۲۲۵ھ

ایضاً از اکبر شاہ خاں حسرت رام پوری

۱ کہا ہاتف نے ندوی افسوس | "باغ برباد ہوا" ہے تاریخ

تاریخ وفات مرزا رفیع السودا سودا تخلص از شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی

۲ گفتم سال وفاتش ناسخ | "شاعر ہندستان واویلا"

(۲۸ جون ۱۷۸۱ء پنجشنبہ ۴ رجب ۱۱۹۵ھ

ایضاً از مولوی عبدالغفور خاں بہادر نساخ

۱ پی ترحیل سودا بے تردد | بگو ناسخ "سودا جو ہر فضل" ۱۱۹۵ھ

تاریخ وفات میر وارث علی سیفی تخلص از مولوی ناسخ

۲ ناسخ برای سال ترحیل آہ | "وارث علی دقیقہ رس" گفت سر دش ۱۱۹۲ھ

تاریخ وفات شیخ محمد جان (لکھنوی) شاد تخلص پیر و میر از منشی تجمل حسین تجمل استاد راجہ امیر حسن خاں بہادر والی محمود آباد

۷ تجمل سال رحلت کرد تحریر | جہان شاعری ناشاد شد وای

(بعارضہ فالج یک شنبہ ششم ربیع الآخر ۱۳۱۷ھ تدفین تاریخ ہفتم)

ایضاً از راجہ عنایت سنگھ عنایت لکھنوی

لکھنؤ خالی ہوا جاتا ہے جنت آباد | عیش کے بعد گئے شاد بھی اس عالم سے
۲ لکھو سمت میں عنایت زسر آہ و بکا | "عیش ہی جب نہیں تو شاد یہاں کیا کرتے" ۱۹۵۶ بکری

ایضاً از کلیم لکھنوی

۲ سال مرگش درین ہجری نوشتم ای کلیم | "موجب گل ہا بجنت شد محمد جان شاد" ۱۳۱۷ھ

تاریخ وفات شاداں تخلص مرزا حسین علی خاں دہلوی ابن مرزا زین العابدین خاں مرحوم (دہلوی) عارف تخلص از محمد عبدالغفور خاں بہادر نساخ

برفت آہ شاداں ز دنیاے دوں | خدایا مقامش بفردوس باد
۲ برای سن رحلتش خامہ ام | رقم کرد "شادان فرخ نہاد"

پنجشنبہ ۱۸ استمبر ۱۸۷۹ء بعمر ۳۰ سال یکم شوال ۱۲۹۶ھ

تاریخ وفات منشی سید فضل حسین صاحب تعلقہ دار جلال پور شاعر تخلص صاحب دیوان از مولوی مظفر حسین صاحب سلیمانی

۳ مظفر جو ہی فکر سال وفات | رقم کر "ملا آج باغ ارم" ۱۳۱۹ھ

تاریخ وفات آغا مرزا صاحب شاغل مرحوم (دہلوی) برادر (خورد) نواب فصیح الملک داغ دہلوی از محمود خاں صاحب محمود تخلص شاگرد حضرت داغ مقیم رام پور

۴ خوش ہوای حوران بہشت "آئے مرزا آغا جان" ۱۳۱۵ھ

(بعمر ۶۰ سال نصف شب جمعہ ۴ فروری ۱۸۹۸ء ۱۲ رمضان)

تدفین روز شنبہ احاطہ مزار مولانا جمال الدین صاحب رام پور

ایضاً

کیا کوچ دنیا سے جب سوئے عقبیٰ — ملک بولے "اب آئیے جنت میں شاغل" ۱۸۹۸ء

۲ فرشتوں کی یہ بات محمود حسن کر — خدا نے کہا "چلئیے جنت میں شاغل" ۱۸۹۸ء

تاریخ وفات (مولوی) عبدالرحمٰن خان صاحب مالک مطبع نظامی (کانپور) شاکر تخلص از منشی امیر اللہ صاحب تسلیم لکھنوی

۲ رقم کرد تسلیم تاریخ فوت — "برفتہ بفردوس دیندار آہ" ۱۳۱۴ھ

تاریخ وفات جناب مفتی میر محمد عباس صاحب شباب تخلص لکھنوی از میر ضامن علی صاحب جلال —

۳ خاک بر سر کرد و سال رحلتش گفتہ جلال — "عالمی بمثل او ہی بود بی ہمتای این" ۱۳۰۶ھ

تاریخ وفات جناب صاحبزادہ سید مصطفیٰ علی خان صاحب بہادر شہرہ تخلص (رامپوری) سابق ہوم سکریٹری ریاست رامپور) خلف صاحبزادہ جناب سید محمود علی خان صاحب بہادر خلف والی جناب نواب محمد یوسف علی خان صاحب بہادر ناظم سابق فرمانروای رام پور از خواجہ ... صاحب صادق تخلص

۵ صادق خستہ دل تو و سال وفات نظم کر — "... بجاہ اب ... لطیف مصطفیٰ"

بعمر ۴۵ سال ۶ بجے شام شنبہ ۲۷ مارچ ۱۹۱۱ء ۲۷ جمادی الثانی ۱۳۳۵ھ

تاریخ وفات منشی خیراتی لال شگفتہ تخلص لکھنوی از راجہ عنایت سنگھ

۲ فصلی میں یہ لکھے ہیں عنایت نے سال مرگ — "کمہلایا پھول عمر شگفتہ کا ہائی اب" ۱۳۰۵ فصلی

تاریخ وفات مولوی ظہیر احسن صاحب شوق نیموی عظیم آبادی از کلیم لکھنوی

۵ سن رحلتش گفت ہجری کلیم — "... جہان شوق کامل ... شوق"

بعمر ۴۴ سال جمعہ ۵ نومبر ۱۹۰۰ء ۱۷ رمضان ۱۳۲۲ھ

تاریخ وفات مولوی قدرت اللہ شوق (رام پوری) از حکیم احمد خان صاحب فاخر رام پوری

۲ دلم تاریخ گفت از روی افسوس — "سراج شاعری از بزم شد وای" ۱۳۲۴ھ

تاریخ وفات شیخ الہی بخش اکبر آبادی شوق تخلص از ناسخ صاحب

۱ پی سال وفات شوق ناسخ — رقم زد خامہ ام "شوق سخن فہم" ۱۲۴۱ھ

تاریخ وفات جناب مولوی غلام امام شہید صاحب (الٰہ آبادی) شہید تخلص کہ در مولود خوانی یکتائے دہر بودند و خاص عاشق رسول مقبول ؐ میرزا قربان علی بیگ سالک دہلوی

۵ آہ "ارباب درد ... — پھر ہوا ماتم امام شہید"

بعمر ۱۰۰ سال چہارشنبہ بعد عصر ۱۴ شوال ۱۲۹۶ھ

تاریخ وفات مولوی محمد بخش لکھنوی شہید تخلص از میر وزیر نور لکھنوی

۲ نور تاریخ رحلتش بنوشت "در جہاں بود شاعر یکتا"
۱۲۶۶ھ

تاریخ وفات منشی کرامت علی شہیدی بریلوی شہیدی تخلص از ڈپٹی عبدالغفور خاں بہادر نساخ

۱ پئے سال فوت کرامت علی نوشتم "شہیدی شہ شاعران"

چارشنبہ ۱۸ اپریل ۱۸۴۰ء ۴ صفر ۱۲۵۶ھ

ایضاً از عبدالغفور خاں

۲ گفت ہاتف مصرع سال وفات "جا بہ جنات ممتاز الزمان"
۱۲۵۶ھ

تاریخ وفات نواب محمد مصطفےٰ خان بہادر دہلوی شیفتہ وحسرتی تخلص (دہلوی) از نساخ صاحب

۲ نساخ مصرع از پئے تاریخ زد رقم "صد حیف حیف وای صد افسوس حسرتی"

تاریخ وفات میر حسن صاحب (لکھنوی) صابر تخلص از کپتان مقبول الدولہ قبول ۱۲۸۶ھ

۲ تاریخ این مصیبت عظمیٰ قبول گفت "در چہلم حسین حسن رفتہ ہای وای"

تاریخ وفات شاہزادہ محمد قادر بخش صابر دہلوی از محمد ناصر الہام تخلص ۱۲۴۷ھ

۲ بتاریخ ہاتف ز الہام می گفت "شہ شاعران زماں مرد ہی ہی"

تاریخ وفات میر وزیر علی صبا لکھنوی شاگرد خواجہ حیدر علی آتش از منشی اسمٰعیل حسین منیر (دو شنبہ سوم شعبان) ۱۲۹۵ھ

۳ مجھ سے رضواں نے کہی تاریخ رحلت اے منیر "مثل بوئے گل ابھی پہنچی صبا فردوس میں"
۱۲۹۵ھ

ایضاً از غلام حسنین قدر بلگرامی

۳ اشہب کلک قدر سالش یافت "او فتادہ صبا ز اسپ فرود"
۱۲۷۱ھ

ایضاً از جناب امیر لکھنوی

۲ تاریخ وفات او چنین گشت رقم "افتاد از اسپ شد صبا سوی ارم"
۱۲۷۱ھ

از مرزا حاتم علی صاحب مہر

۳ مصرع تاریخ سنو مہر سے "بود صبا گلشن جنت میں ہے"
۱۲۷۱ھ

از مولوی عبدالغفور خان نساخ

۲ بے تردد بہر سال رحلتش خامۂ من "وای درد و غم" نگاشت

تاریخ وفات خواجہ عبدالرحیم معروف بہ بچا میاں صبا تخلص رئیس ڈھاکا از مولوی عبدالغفور خان نساخ

۲ مصرع تاریخ خرد نے کہا "داخل فردوس بریں ہو گئے"
۱۲۸۸ھ

تاریخ وفات نواب اشارت علی خان صدق رئیس میرٹھ از مولوی عبدالجلیل خان صاحب صبور تخلص

۵ سن رحلت او چہ پرسی صبور بگو "در خلد بریں شد مکیں"
۱۳۲۹ھ

تاریخ وفات جناب صاحبزادہ سید محمد جعفر علی خاں صاحب بہادر (خلف نواب جنت آرامگاہ تالی رامپور) شاگرد جناب امیر مینائی لکھنوی از منشی امیر اللہ صاحب تسلیم لکھنوی

۱۵ بگفتم ز یاران چو ایں را در رفت "ز دنیا امیر نکو کار رفت"
۱۳۱۰ھ
(کلام ... [illegible])

تاریخ وفات سید فرزند احمد صغیر بلگرامی از حکیم میر مہدی کمال خلف جلال

۲ کلک نے لکھ دیا کمال اُن کی وفات کا یہ سال — "ملو ہوئے جا کے ابصفیر معہ قدس کے ہمصفیر"

۱۱ مئی ۱۸۹۰ء دوشنبہ ۲۱ رمضان ۱۳۰۷ھ

تاریخ وفات مولوی عبد الباری فرید پوری صید تخلص شاگرد مولوی رشید النبی صاحب وحشت از مولوی عبد الغفور خاں نساخ

۲ ایسی حالت میں ہوئی مجھ کو جو تاریخ کی فکر — "دل یہ بولا کہ قضا کی ہے مرے بھائی نے" ۱۲۷۴ھ

تاریخ وفات سید مظفر حسین ضمیر تخلص مرثیہ گو (لکھنوی) از جناب اسیر لکھنوی

۳ گفت سال وفات او دل من — "بود سید ضمیر محو امام"

(۶ اکتوبر ۱۸۵۵ء شنبہ ۲۳ محرم) ۱۲۷۲ھ

ایضاً از مرزا حاتم علی صاحب مہر

۵ ہجری و عیسوی لکھی تاریخ — "جا کے حیدر سے مل ضمیر اب تو" ۱۸۵۵ء

تاریخ وفات میر ضیاء الدین ضیا تخلص دہلوی از ناسخ صاحب

۱ سال نقل ضیا ز روی حساب — "طور معنی ضیا" بگفت خرد

تاریخ وفات حافظ اکرام احمد مرحوم ضیغم تخلص (رام پوری) کہ مع اہل و عیال خود غرق شدند ۱۲۹۶ھ

از مولوی عبد الغفور خاں صاحب نساخ

۲ میں نے لکھا مصرع سال وفات — "ناظم ملک معانی وای وای"

بعمر ۳۰ سال بمقام ڈھاکا دک) ۱۲۸۶ھ

دیگر تاریخ از نساخ

۲ بہر تاریخ مرگش ای نساخ — "گو مقامش بجنت فردوس" ۱۲۸۶ھ

تاریخ انتقال سید طاہر علی طاہر تخلص (فرخ آبادی) متوطن فتح گڈھ شاگرد صغیر از نواب جعفر خاں صاحب بہادر شمس آبادی

۲ روز یکشنبہ دسوم شعبان — "رفتہ طاہر علی بسوی ارم" ۱۳۲۹ھ

۲ تاریخ وفات محمد سعادت علی خاں رسالدار طلعت تخلص (رامپوری) از حشمت علی خاں موجد خلف شان

۲ دلیل نجاتش ہمیں است موجد — شد اعداد تاریخ "نام غفور"

پنجشنبہ ۲۷ مئی ۱۸۶۹ بعمر ۶۲ سال ۱۴ صفر (ی) ۱۲۸۶ھ

تاریخ وفات سراج الدین ابو ظفر بہادر شاہ بادشاہ دہلی ظفر تخلص شاگرد ذوق دہلوی

از محمد عبد الغفور خاں بہادر نساخ

سال ترحیلش ملک از آسمان — ناگہاں "بخشایش اللہ" گفت

۷ نومبر ۱۸۶۲ء جمعہ ۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۹ھ

ایضاً تاریخ وفات بہادر شاہ بادشاہ دہلی ظفر تخلص

سراج دین ابو ظفر مسافرو سوئے جنت ہوئے روانہ — کہ جس کے باعث سے خوش سے چھلک رہا تھا ایاغ دہلی

? ۲ جلوس کا سال ہے سو اب مطابق ادسکے — سروش غیبی نے سال رحلت کہا "بجھا ہے چراغ دہلی" ۱۲۷۹ھ

تاریخ وفات مولوی ظہور علی ظہور (دہلوی) شاگرد احسان دہلوی از منشی منور علی صاحب رئیس قصبہ گنگوہ مخاطب بہ شمس الشعرا تلمیذ ذوق مرحوم

مولوی ظہور علی شاعر بیثال حیف　　　خود بہ اجل جہاں جہاں سوئے جناں رسیدہ اند

۲۷۰　۲۵۰　۲۵۰　۱۰۲۰۹

۲　　لیک ز دست بے سری وز غم ہجر جاودان　　　شعر و سخن ہنر فنون جو د بجان رسیدہ اند

۱۲۸۶ھ

تاریخ وفات راقم الدولہ سید ظہیر الدین ظہیر دہلوی شاگرد ذوق دہلوی از اختر سہارنپوری

۱۲　　لکھو مصرع سال اختر یہ تم　　　"کہ استاد ملک سخن چل دیے"

۱۳۲۹ھ

ایضاً از غلام محمد خاں دانش تخلص عرف جاگیردار شاگرد ظہیر

۱۱　　سال رحلت لکھا یہ دانش نے　　　"اندرون خلد میں ہے روح ظہیر"

۱۳۲۹ھ

ایضاً از منشی پیارے لال صاحب رونق دہلوی

۴　　گفت تاریخ رحلتش رونق　　　"آہ مرگ ظہیر نکتہ دان"

۱۹۱۱ء

تاریخ وفات سید ظہیر حسین (قدوائی) از شیخ نظیر حسین قدوائی تعلقہ دار گدیہ ضلع بارہ بنکی

۲　　برائے سال وفاتش نظیر قدوائی　　　بگفت "جای خد ظہیر مینو باد"

۱۳۴۲ھ

تاریخ وفات مرزا زین العابدین خاں عارف دہلوی از مرزا قربان علی بیگ سالک دہلوی

۳　　یوں لکھی سالک نے تاریخ وفات　　　"روے دل پر داغ ہجراں چھا گیا"

اپریل ۱۸۵۲　　　جمادی الثانی ۱۲۶۴ھ

ایضاً از مولوی عبد الغفور خاں صاحب نساخ

۲　　سال مرگش چو از خرد جستم　　　"خلد اعلا مقام عارف" گفت

۱۲۶۴ھ

تاریخ وفات مرزا محمد بیگ عاشق تخلص (لکھنوی) از کلیم لکھنوی

۳　　کلیم گفت بمن سال فوت او بنویس　　　"ہزار و سہ صد ہجری ز عہد یازدہم"

۱۳۱۱ھ

تاریخ وفات مرزا والاجاہ عاشق تخلص لکھنوی از میر ضامن علی جلال

جستم چو سال ارتحال آمد صدا دل جلال　　　"پیک اجل زد و آمد بر داشت والاجاہ را"

۲۸ نومبر ۱۸۷۲　　پنجشنبہ ۲۶ ماہ صیام　　　۱۲۸۹ھ

ایضاً از سید حسن صاحب لطافت لکھنوی

۹　　بوقت این غم جانکاہ سال ہجری بود　　　"ہزار و دو صد و ہشتاد و نہ بماہ صیام"

(بعد نصف شب)　　　۱۲۸۹ھ

ایضاً از منشی اسمٰعیل حسین صاحب منیر

۵　　مصرع تاریخ کہتا ہوں میں حق حق اے منیر　　　"ماتم نواب والاجاہ زخم دل ہے آہ"

۱۲۸۹ھ

ایضاً از میر وزیر نور لکھنوی

۲-　　حیف والاجاہ بست و ششم ماہ صیام　　　نالہاں از دار دنیا مایل فردوس شد

نور تاریخ وفاتش چوں ز رضواں خواستم　　　گفت با صوت حزیں او داخل فردوس شد

تاریخ وفات جناب مولانا قلندر علی صاحب زبیری پانی پتی متخلص بہ عالم از خواجہ امداد حسین مرحوم متخلص بہ مظہر برادر مولوی الطاف حسین حالی۔ ۱۲۲۹ھ

۶ گفت سال وفات او مظہر　"رفت عالم بہ جنت ابدی"
۱۲۹۳ھ

تاریخ وفات منشی غلام عباس تخلص عباس شاگرد منشی اسمٰعیل حسین منیر

۳ ہوگئی غیب سے الہام یہ تاریخ منیر　کہ "جناں میں لب کوثر ہے مقام عباس"
۱۲۹۱ھ

تاریخ وفات میر یعقوب . . . . تاریخ

۲ تاریخ وفات او نوشتم یا رب　"عباس بفردوس کند عیش مدام"
۱۲۸۰ھ

تاریخ وفات مولوی عبید اللہ مرحوم میدنی پوری عبیدی تخلص . . . . . مدرسہ ڈھاکہ از مولوی عبد الغفور خاں بہادر نساخ

۱۵ رفت ناگہ زدہر از سر آہ　"دفعتہ رفت از جہان" شد سال
۱۳۰۶

۱ عدیل میر عوض علی صاحب خوشنویس اوستاد نواب . . . آشیاں طاب ثراہ از سید قاسم علی خواہان ساکن بریلی

۲ آہ سید عوض علی صاحب　قطع نمود خوشنویسی را
سال تاریخ زد برقم خوبیاں　پے جنت بہشت دنیا را
بعدد معنی (افلاطون ۲۹۳)　۱۲۹۰ھ

تاریخ وفات منشی احمد حسن خاں صاحب عروج (رئیس کانپوری) از مولوی عبد الحق صفا حقی تخلص
ساکن رام پور

۴ ای صفا لکھ مصرع سال وفات　"اٹھ گیا کیا شاعری کا یادگار"
دسمبر ۱۸۹۴ء بمکان داماد خود بمقام آگرہ　۱۳۱۲ھ

تاریخ وفات عزیز مرزا عزیز تخلص (لکھنوی) از خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی

۹ دارد این نوحہ بر زبان ہاتف　"آہ جان ناگہان زتن ہا رفت"
۱۳۳۰ھ

تاریخ وفات نواب عبد العزیز خاں عزیز بریلوی (رئیس بریلی حافظ رحمت خانی) فی البدیہ بعد دفن گفتہ شد
از نواب نیاز احمد خاں ہوش بریلوی

۲ "عزیز مصر سخن چل بسے عدم" جو آج　تو رنج و غم ہوا اتنا شمار جس کا نہیں
برائے سال تو اے ہوش پہلے مصرع سے　مٹا دے شہر کہ اس وقت کام آنا کا نہیں
۱۳۰۹

تاریخ وفات نواب عبد العزیز خاں بریلوی خود شاعر کے ایک شعر کے مصرعہ ثانی سے مادہ تاریخ تخرجہ سے نکلتا ہے جس کو حافظ رحمت خاں بہادر رئیس بریلی کے مقبرہ کے قریب عبد الرشید خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر فرزند شاعر موصوف نے قبر پر کندہ کرایا ہے

۱ ابر آید بر تربت من گرید و گوید　"ایں قبر عزیز است کہ از یاد دلشاں بود"
۱۳۰۹ھ

تاریخ وفات نواب عبد العزیز خاں صاحب عزیز بریلوی از نواب سلیمان خاں اسد شاگرد جناب امیر

۲ تاریخ وفات آں عزیز دلہا　گفتم "بود از مقیم در خلد بریں"
۱۳۰۹ھ
ایضاً از راجہ عنایت سنگھ عنایت لکھنوی

۱۳ بنوشتم ز روی بیتابی　"زین جہان شد بگلشن رضوان"
بمرض اسہال　۱۲ ربیع الثانی　۱۸۹۱ء

تاریخ وفات مرزا یوسف علی خاں عزیز تخلص (دہلوی) از مرزا قربان علی بیگ سالک دہلوی

۵ بفکر سال ہمی بودہ ام کہ سالک گفت　"عزیز یوسف مصر سخن" بگو سالش
۱۲۹۰ھ

تاریخ وفات میر غلام علی (بریلوی) عشرت تخلص (مصنف پدماوت) از کرم خاں کرم رامپوری

۰ بی خامہ کرم نے اس کی تاریخ　　　لکھی یہی "ہائے میر عشرت"

۲۹ جولائی ۱۸۲۱ء یک شنبہ (۲۸ شوال ۱۲۳۶ھ)

تاریخ وفات مرزا عظیم بیگ دہلوی عظیم تخلص از مولوی نساخ

۱ از برائے سال ترحیل عظیم　　　گفت ہاتف "جوہر فضل و کمال"
۱۲۲۱ھ

تاریخ وفات شاہ محمد عمر صاحب مجددی عمر تخلص ابن شاہ احمد سعید صاحب از نساخ

۲ سنین رحلت او را کہ خواستم نساخ　　　بگفت ہاتف غیبی "برفت شاہ عمر"
۱۲۹۸ھ

۵ دسمبر ۱۸۸۰ء یک شنبہ ۲ محرم (ٹنک)

تاریخ وفات مرزا عوض بیگ عوض تخلص شاگرد منشی اسمعیل حسین منیر

۵ منیر اس کی لحد پر لکھ یہ مصرع　　　"بنای تربت اقدس ہے صیب"

تاریخ وفات فدا علی عیش تخلص لکھنوی شاگرد میر کلو عرش از محمد جان شاد

۲ شاد بز دچون پای قضا شد سال وفاتش چار مصاف　　　نخل طوبی، حلہ جنت حور بہشتی عیش جنان

بعمر ۷۲ سال مارچ ۱۸۹۹ء (دو شنبہ ذی قعدہ) بتاریخ ہشتم ۱۳۱۶ھ

ایضاً از راجہ عنایت سنگھ لکھنوی

۲ تاریخ مرگ گفت عنایت بہ معجمہ　　　"غم آمدہ چو عیش بدار البقا برفت"
۱۹۱۹ء

تاریخ وفات مرزا اسد اللہ خاں غالب (بہادر) دہلوی (استاد نواب صاحب بہادر ناظم والی رامپور) از مرزا قربان علی بیگ سالک (۱)

۸ تاریخ ہم کمال چلے پڑھ بغیر فکر　　　حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

دو شنبہ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء بعمر ۷۴ سال ۲ ذی قعدہ (ی) ۱۲۸۵ھ

تاریخ وفات مرزا غالب از منشی دیبی پرشاد سحر بدایونی

۲ ہے سحر یہ مصرع مرے لب پہ جاری　　　"دنیا سے آج چل دیا غالب بھی"
۱۲۸۵ھ

ایضاً از مہدی حسین مجروح دہلوی شاگرد غالب

۲ دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروح　　　ہاتف نے کہا "گنج معانی ہے تہ خاک"

ایضاً از مرزا حاتم علی مہر　　　۱۲۸۵ھ

۲ گفت ہاتف پے تاریخ ای مہر　　　"ہ بجناں غالب نامی آمد"
۱۲۸۵ھ

تاریخ وفات از منشی اسمعیل حسین صاحب منیر

۵ تاریخ وفات او چنین گفت منیر　　　"آہ افصح عہد وحیف ثانی حزین"
۱۲۸۵ھ

ایضاً از مولوی عبد الغفور خاں بہادر نساخ

---

(۱) یہ قطعہ تاریخ مرزا قربان علی بیگ سالک سے مؤلف کتاب نے غلط منسوب کر دیا ہے۔ در اصل یہ مولانا حالی کا کہا ہوا ہے اور دیوان حالی مع مقدمہ مطبوعہ نامی پریس کانپور ۱۸۹۳ء کے صفحات ۲۲۰ - ۲۲۱ پر درج ہے۔

۲　نساخ من کہ جستم تاریخ انتقالش　　گفتا سروش غیبی "عین الکمال غالب" ۱۲۸۵ھ

ایضاً از میر وزیر نور صاحب لکھنوی

۲　پے سال آن شاعر بے نظیر　　فلک زد ندا "آہ غالب بمرد" ۱۲۸۵ھ

ایضاً از نواب نیاز احمد خاں ہوش بریلوی

۲　کہا ہاتف نے ہوش اب ہے یہ وہ　　اسد بیشۂ سخن سنجی ۱۲۸۵ھ

تاریخ وفات میر فخر الدین دہلوی فخر تخلص از نساخ

۱　سال فوت فخر از روی حساب　　گفت ہاتف "فخر دریائے کمال" ۱۱۹۶ھ

تاریخ وفات منشی شنکر دیال فرحت لکھنوی از راجہ عنایت ربانی

۴　از روی بکا بسال ہجری　　گفتم "شنکر دیال فرحت" ۱۲۰۵ھ

تاریخ وفات فیروز شاہ خاں فیروز تخلص ساکن رام پور شاگرد داغ دہلوی از تسلیم صاحب

۴　ہمیں است تسلیم تاریخ فوت　　"بباغ ارم باد ماوائے او"

۴ اگست ۱۹۰۰/۲۶ ربیع الثانی (تک)　　۱۳۱۸ھ

تاریخ وفات حکیم حافظ علی احسن صاحب قاصر تخلص (قادری وچشتی) ساکن رام پور از حکیم غلام حیدر خان صاحب خلف ارشد حکیم صاحب مغفور

۲　بود وقت عصر دوشنبہ دوم ماہ صفر　　رفت از عالم حکیم عقلمند بے عدیل ۱۳۲۳ھ

تاریخ وفات مرزا مہدی علی خان قبول الدولہ بہادر (کپتان) مصاحب واجد علی شاہ بادشاہ اودھ اختر تخلص از مولوی عبد الغفور خان بہادر نساخ

۲　مصرعۂ تاریخ نساخ حزیں نے یوں کہا　　"وائے ہے ہے مرگیا مہدی علی خاں قبول"

یوم الجمعہ ۲۶ رشوال　　۱۲۷۶ھ

تاریخ وفات منشی غلام حسنین (بلگرامی) قدر تخلص از غلام حیدر ارشد بلگرامی تلمیذ قدر

۳　سنہ رحلت او ارشد مغموم نوشت　　"شد روان قدر بسوئے ارم انا للّٰہ"

(یکشنبہ ۲۳ ذی قعدہ)　　۱۳۰۱ھ

دیگر از ارشد صاحب شاگرد قدر

۵　سال رحلت بدعا نیز بگوائے ارشد　　"بگلستان ارم قدر بود با حسنین" ۱۳۰۱ھ

تاریخ وفات سید غلام حسنین صاحب قدر از حسد لکھنوی

۱　زد رقم سال وفاتش حمد صوری معنوی　　"در ہزار و سہ صد و یک قدر از دنیا بشد" ۱۳۰۱ھ

خود قدر کے ایک شعر کے مصرعہ آخر سے مادۂ تاریخی نکلتا ہے اور وہ یہ ہے۔

۱　بہار آخر ہوئی ہے قدر کی تربت پہ میلا ہے　　"یہاں بیڑی بڑھلنے کو ہر اک دیوانہ آتا ہے" ۱۳۰۱ھ

تاریخ وفات شاہ قدرت اللہ دہلوی قدرت تخلص از نساخ صاحب

۱　سال تاریخ قدرت اے نساخ　　"داخل گلشن نعیم" بگفت

۱۲۰۵ھ

تاریخ وفات آفتاب الدولہ مہر الملک خواجہ ارشد علی خاں شمس جنگ تلق تخلص لکھنوی (شاگرد وزیر)
از راجہ عنایت سنگھ لکھنوی

۲　چو در خلد شد گفتم از روی آہ　　"بہ مرگ تلق شد جہان با قلق"

۲۷ ذی قعدہ ۱۲۹۶ھ پنجشنبہ ۱۳ دسمبر ۱۸۷۹ء　　۱۲۸۷ف

تاریخ وفات حکیم غلام مولا بخش قلق ساکن میرٹھ از منشی گلاب سنگھ مشتاق ——

۲　بولا مشتاق بے سر امید　　"حیف ہے اب سخن یتیم ہوا"

۱۷ جولائی ۱۸۸۰ء　　۱۲۹۷ھ

تاریخ وفات مولوی محمد عثمان خان صاحب بہادر (رامپوری) قیس تخلص کہ در عہد ریاست جناب نواب کلب علی خان بہادر طاب ثراہ مدار المہام ریاست بودند از جناب امیر لکھنوی

۲　خواستم تاریخ سال فوت او　　گفت ہاتف "کشتہ شد بے جرم آہ"

بعمر ۴۳ سال ۱۱ ربیع الاول　　۱۲۹۰ھ

ایضاً از مولوی حبیب الدین سوزان دہلوی

۲　در حلق عالم از سر ہر دو دو بکار دگر　　آوازہ در فتاد کہ عثمان شہید شد
۱۲۹۰ھ

از مولوی عبد الغفور خاں بہادر نساخ

۲　سال فوتش چو از خرد جستم　　"آہ عثمان شہید شد" گفتا
۱۲۹۰ھ

تاریخ وفات نواب باقر علی خاں کامل تخلص (دہلوی) خلف نواب زین العابدین خاں عارف برادر نسبتی نواب ضیاء الدین بہادر نیر درخشاں دہلوی از سالک دہلوی

۵　یہ ہی نوحہ ہے یہی تاریخ سن　　نوجوان باقر علی خاں حیف ہے[1]
۱۲۳۳ھ

تاریخ وفات مولوی سید علی میاں کامل تخلص لکھنوی از حکیم میر مہدی کمال لکھنوی

۱۰　کمال سال وفات علی میاں لکھ دو　　"خزاں کا دور ہے کیا کل من علیہا فان"
۱۳۲۲ھ

ایضاً از کلیم صاحب لکھنوی

۵　سال فوتش نظم کردہ در سن ہجری کلیم　　"چوں مہ کامل بود کامل بعیش جاوید خلد"
۱۳۲۲ھ

تاریخ وفات کرم خان صاحب کرم رام پوری (شاگرد غفلت) از احمد خان غفلت اخوند زادہ

۷　طلب اُس غمزدہ ثانی کا کیا سال وصال　　آئی ہاتف کی یہ آواز کہ "خوش فکر موا"

۴ مارچ ۱۸۳۸ء بمرض ضیق بعمر ۶۱ سال بوقت ظہر یکشنبہ ۷ ذی الحجہ ۱۲۵۳ھ

تاریخ وفات خواجہ کرامت اللہ پانی پتی کرامت تخلص از سالک دہلوی

۵　بہ سالک گفتم این سال وفاتش　　"کرامت از جہان شد آہ امروز"
۱۲۹۲ھ

تاریخ وفات نواب محمد کریم اللہ خاں کریم تخلص (رام پوری) از اکبر شاہ خاں فرحت

۲　کہی تاریخ دل نے کھینچ کر آہ　　"کریم اللہ خاں نواب افسوس"
۱۲۴۷ھ

---

[1] یہ اعداد سہواً غلط درج ہوئے ہیں۔ مصرع سے ۱۲۹۳ھ نکلتے ہیں اور یہی صحیح تاریخ وفات ہے۔ عرشی (حاشیہ مخطوطہ)

تاریخ وفات صاحبزادہ کفایت اللہ خان کفایت (رام پوری) ابن نواب نصر اللہ خان بہادر از عزیز شاہ خاں صاحب عزیز

بیک ہزار و دو صد سال ہجر دبیست و ہشت | بہ بست پنجم ماہ صفر بہ جنت رفت ۲
۱۲۲۸ھ | بعمر ۲۶ سال بروز شنبہ ۲۷ فروری ۱۸۱۳ء

تاریخ وفات سید محمد مہدی صاحب کمال خلف میر ضامن علی صاحب جلال از نواب جعفر علی خان صاحب بہادر جعفر تخلص رئیس شمس آباد

رفت چو زیر زمیں گفت مورخ چنیں | "ماہ صفر با دوم گشتہ زوال کمال" ۲
بمقام رام پور ۲ر فروری ۱۹۱۱ء (تک) | ۱۳۲۹ھ

از سید انوار حسین صاحب عرف منجو صاحب لکھنوی شاگرد جلال

اس کش مکش میں آئی صدائے سروش غیب | "بعد جلال ہو گیا ختم کمال ہائے" ۷
۱۳۲۹ھ

ایضاً از مولوی سید محمد حسن صدیقی محسن تخلص بدایونی

تاریخ یہ ہوئی ہے وفات کمال کی | "عہد کمال شاعری دنیا سے اٹھ گیا" ۲
۱۳۲۹ھ

تاریخ وفات [illegible] تخلص [illegible] شندہ ڈھاکا از مولوی عبد الغفور خاں نساخ

بہر سال [illegible] ازفلک | گفت ہاتف "خواجہ شیریں کلام" ۲
۱۲۷۶ھ

تاریخ وفات محمد افضل حسین خاں کوکب تخلص (دہلوی) از سالک دہلوی

گفتمش سال وفاتش چیست گفت | چون نویسم سال آن خاکم بسر ۸
۱۲۹۰ھ

دیگر از مرزا قربان علی بیگ سالک

گفت سالش بگو دگر ایں باش | گفتم از دی کہ "سخت بیدردی" ۲
۱۲۹۰ھ

تاریخ وفات کوکب شاعر (لکھنوی) از منشی لال چند انس لکھنوی

انس تاریخ وفاتش چو ز ہاتف پرسید | گفت او با دل صد داغ غروب کوکب ۴
۱۲۹۰ھ

تاریخ وفات شیخ فضل احمد کیف لکھنوی شاگرد آتش از منشی اشرف علی اشرف لکھنوی

اشرف زباں پہ مصرع تاریخ آ گیا | "کیف شراب موت سے ہے آنکھ بند ہائے" ۲
۱۲۹۲ھ

ایضاً از خواجہ عزیز لکھنوی

فضل احمد چو رفت ہاتف پرسید چہ رفت و تو اے کیف (کلا) | گفتا کہ بامت گنہگار "فضل احمد بعد بہر کیف" ۱
۱۲۹۲ھ

ایضاً از تسلیم صاحب لکھنوی

گفت تسلیم بہر سال وفات | "با محمد خدائے حشر کند" ۲
۱۲۹۲ھ

تاریخ وفات فقیر محمد خاں گویا تخلص (ملیح آبادی) از نواب غلام حسین خان شاہ جہان پوری

رو چو گویا نہفت از عالم | رفتے دل از سخن نہفت حسین
لیک سال وفات آن مرحوم | "ہائے گویا دریغ" گفت حسین ۲
۱۲۹۶ھ

تاریخ وفات سید حسن صاحب لطافت تخلص (لکھنوی خلف امانت) از جناب منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی

خرد چوں وفات لطافت شنید | پے سال رحلت بہر سو دوید
گزشت از شمار حروف و نقاط | ہم از مصرع سال اضافت کشید

۳ پس آنکہ بگفتا کہ بشنو امیر — لطافت. بحر لطافت رسید
۱۳۲۸ منہا ۲۷ (۱۳۰۱ھ)

ایضاً از سید عباس حسن فصاحت لکھنوی

۲ تا گہ دل گفت سال ہجری — "بود جان سخن لطافت" ۱۳۰۱ھ

ایضاً از مرزا محمد حسین صاحب فراست خلف لطافت

۲ لکھ فراست یہ مصرع تاریخ — "مرگیا آہ بادشاہ سخن" ۱۳۰۱ھ

ایضاً از کلیم صاحب لکھنوی شاگرد لطافت

۲ رقم کر پے سال ہجری کلیم — "فنا آج بے مثل شاعر ہوا" ۱۳۰۱ھ

تاریخ و مرثیہ در حالات وفات میر مہدی حسین ماہر لکھنوی شاگرد جناب امیر لکھنوی از مولوی مرزا احمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی

۴۲ سال فوتش را بجز نعمہ دام نشان — داخل خلد بریں شد ماہر معجز بیان
(یوم الخمیس پانزدہ ربیع الآخر) ۱۳۲۵ھ

تاریخ وفات مولوی محمد محسن صاحب کاکوروی از مولوی حسن مرتضیٰ شفق عماد پوری تلمیذ جناب امیر مینائی لکھنوی علیہ الرحمۃ

۲ از حروف معجمہ گفتہ شفق — "شاعر شیریں سخن جادو کلام" ۱۳۳۴ھ

ایضاً از منشی محمد ارتضا علی صاحب شر تخلص انسپکٹر رئیس کاکوری

۷ شر ہے مخبر سال وفات یہ مصرع — "چراغ کعبہ سے پر نور یہ لحد ہے آج" ۱۹۱۵ء

تاریخ دیگر از شر صاحب کاکوروی

۲ گفت ہاتف از پے سال وفاتش اے شر — "مولوی محسن وکیل و شاعر دربار پاک" ۱۳۳۴ھ

تاریخ وفات مرزا حسین علی محنت تخلص (لکھنوی) شاگرد شیخ امام بخش ناسخ از ناسخ

دلا تلمیذ من محنت تخلص — زدنیا کرد رحلت وائے افسوس
۲ نوشتم سال تاریخ رحیلش — کہ شد بر باد محنت وائے افسوس ۱۲۳۵ھ

تاریخ وفات مولوی محمد علی مخمور تخلص شاگرد ناسخ از ناسخ

۲ مصرع سال نقل یوں لکھا — "داخل جنت نعیم ہوئے" ۱۲۷۹ھ

تاریخ وفات حکیم اشرف علی مست تخلص رئیس سلہٹ از ناسخ

۲۷ شد سن این واقعہ از صبر کاہ؟ — حیف ز اشرف علی مست آہ" ۱۳۰۲ھ

دیگر از ناسخ صاحب

۲ سال رحیل خامہ ناسخ دل فگار — "مست مے طریقۂ توحید تو درقم" ۱۳۲۰ھ

تاریخ وفات میر سید فرزند علی متکلم تخلص ساکن کلکتہ شاگرد ضیغم از ناسخ

۲ میں نے یہ تاریخ کہی ہے — "مسلم ہے اب داخل جنت" ۱۲۷۹ھ

تاریخ وفات حکیم مسیح الدولہ بہادر در کلکتہ مسیح تخلص (لکھنوی) از جناب امیر مرحوم

تا بر قی نہم ماہ عشر ازادہ بمن — خبر منتشر مرگ مسیح الدولہ
۲ سال تاریخ ہمان وقت بر آمد ز دلم — "آہ آہ از خبر مرگ مسیح الدولہ" ۱۲۷۵ھ

دیگر از جناب اسیر لکھنوی

۲　آمد ندائے غیب بتاریخ فوت او　"رفت از جہان جناب مسیحا بر آسمان"

۱۲۶۵ھ

تاریخ وفات نواب باقر علی خاں عرف نواب بنے میاں مرحوم مشاق تخلص (لکھنوی) از سید مہدی کمال لکھنوی

۴　کمال لکھ دو یہ مشاق کے سنین وفات　"بہ شوق کیا گیے مشاق سوئے ملک عدم"

۱۳۲۲ھ

ایضاً از کلیم صاحب لکھنوی

۵　مصرع سال وفاتش سن ہجری ست کلیم　"شدہ مشاق بجنت چو ادیب کامل"

۱۳۲۲ھ

تاریخ وفات سید حسین مطہر تخلص برادر سید اسمٰعیل حسین منیر از منیر

۴　حاجت نہیں ہے مصرع تاریخ مرگ کی　"قبر مطہر بقعہ جنت ہے دیکھ لو"

۱۲۹۶ھ

تاریخ وفات سید محمد جمال شاہ صاحب مظلوم تخلص کہ در ریاست رام پور باغچہ خرما۔ بر در مزارش کندہ است از مولوی محمد کریم اللہ خان خوش نویس ریاست رام پور کریم تخلص

۳　بہ تسخیر ملک یقین ای کلیم　"وفات شہنشاہ سید جمال"

۱۱ اگست ۱۸۷۹ء　(دوشنبہ ۲۸ شعبان)　۱۲۹۶ھ

تاریخ وفات مرزا مظہر صاحب جانجانان رحمۃ اللہ علیہ (دہلوی) از مرزا رفیع سودا

۲　تاریخ زروی درد یہ سن کے کہی　سودا نے کہ "ہائے جان جاناں مظلوم"

۱۱۹۵ھ

تاریخ وفات خواجہ امداد حسین مظہر (پانی پتی) از منشی مولوی الطاف حسین حالی پانی پتی

۱　سلام علی عبادہ الذین اصطفٰے

۱۳۰۳ھ

تاریخ وفات مرزا وصی علی خاں مظہر تخلص لکھنوی کہ در ریاست رام پور در عہد عالی جناب معلی القاب نواب سید سر محمد حامد علی خان صاحب بہادر دام اقبالہم و ملکہم ملازم بودند از عزیز لکھنوی

۴　بنوشت سال رحلت او خامہ عزیز　"مرزا وصی علی بہ جنان رفتہ از جہان"

۱۳۲۷ھ　(بوقت صبح　۲۷ رجب)

ایضاً از عالم لکھنوی

۶　گفت عالم سال ہجر آن جناب　"رفتہ عرفی جہان عالی نسب"

۱۳۲۷ھ

ایضاً از سید اعجاز حسین اعجاز لکھنوی

۷　گفت اعجاز سنین فوتش　"حیف اے واے جناب مظہر"

۱۳۲۷ھ

تاریخ وفات (۲ رجب) نواب الٰہی بخش خان صاحب معروف دہلوی از ناسخ

۲　گفت تاریخ فوت او ہاتف　"ساکن جنت برین معروف"

۱۲۴۲ھ

تاریخ وفات میر نظام الدین سونی پتی متخلص ممنون از ناسخ

۲　برائے سال تاریخ وفاتش　خرد گفتا کہ "ممنون معدن فضل"

۱۲۶۰ھ

ایضاً تاریخ میر ممنون دہلوی نام تاریخ گو معلوم نشد

۲　سر بجیب عقل بردم گفت آنکہ پیر عقل　"شاعر شیرین زبان ہند" تاریخ وفات

۱۲۶۰ھ

تاریخ وفات مرزا سیتا بیگ صاحب منتہی تخلص شاگرد خواجہ حیدر علی آتش از نواب میر خیرات علی خاں صاحب بہادر سخی تخلص رئیس حیدر آباد دکن تلمیذ رشید منتہی صاحب مرحوم

۲ دھیان تاریخ کا آیا جو سخی — لکھی تاریخ "تواریخ الم" ۱۲۸۴ھ

تاریخ وفات مولوی منصب علی خاں صاحب منصب تخلص رئیس شاہ آباد شاگرد مولوی امیر علی صاحب شہید معرکہ اجودھیا از مولوی مظفر حسین صاحب مظفر

۲ مظفر بہر تاریخش نداشد — "بجنت رفت دانائی زمانہ" ۱۲۷۲ھ

تاریخ وفات (مولوی) سید منصور علی صاحب منصور تخلص (رامپوری) از مولوی عبدالحق صفا و حقی تخلص

۳ مصرع تاریخ لکھو تم صفا — "ہائے وائے اوستاد ذی کمال"

بتاریخ ... بروز پنجشنبہ بوقت عصر تدفین بروز جمعہ ۱ بجے دن ۲۰ ذیقعد ۱۳۰۶ھ

تاریخ وفات سید اسمعیل حسین صاحب منیر شکوہ آبادی شاگرد رشک از مولوی مظفر حسین صاحب سلیمانی مظفر تخلص

۱ انتقال منیر عالی قدر

بمقام رام پور بعارضہ ہیضہ جمعہ ۱۳ اگست ۱۸۸۰ء ۵ رمضان ۱۲۹۷ھ

ایضاً از مولوی عبدالحق صفا و حقی تخلص

۲ صفا صاف بنوشت سال وفات — "ز اندوہ شد بیت بیت الحزن" ۱۲۹۷ھ

تاریخ وفات میر فرزند علی موزون تخلص از عبدالغفور خاں بہادر ناسخ

۱ چو موزون مرد تاریخ وفاتش — عیاں شد از "غم جانکاہ موزون" ۱۲۲۹ھ

تاریخ وفات حکیم مومن خاں صاحب مومن دہلوی از ناسخ

۲ ناسخ فکر سال تاریخ میں نہ رہ تو — کہہ "ہائے ہائے مومن کیا خوب آدمی تھا" ۱۲۶۸ھ

دیگر تاریخ وفات حکیم مومن خاں صاحب از ناسخ

۲ بہر سال رحلتش کلک قضا — "ساکن فردوس مومن خاں" نوشت ۱۲۶۸ھ

تاریخ وفات مرزا زین العابدین خان عارف و میر حسین تسکین و حکیم مومن خاں دہلوی از مرزا قربان علی بیگ سالک دہلوی

۳ کہا دل نے کہ داخل ہو گئے سب — ارم میں عارف و تسکین و مومن (۲۴۱، ۳۵۱، ۵۴۰، ۱۳۶)

۱۲۶۸ھ

تاریخ وفات میر نواب مونس لکھنوی از سید حسن صاحب لطافت خلف امانت

۷ بہر سال اعداد مونس را بغیر صفر گیر — وادکن مقلوب میم و نون بہم سین را دو چند

۱۱ نومبر ۱۸۷۵ء بعارضہ وجع القلب شب جمعہ (۱۲ شوال) ۱۲۹۲ھ

ایضاً از منشی اسمعیل حسین منیر شکوہ آبادی

۳ میں نے یہ تاریخ پائی اے منیر — "ذاکر نامی موا افسوس ہائے"

۱۲۹۲ھ

ایضاً از کلیم لکھنوی

۲ نور تاریخ وفاتش چون ز رضوان خواستم — گفت یاوہ مدح خوان بادشاہ کربلا ۱۲۹۲ھ

تاریخ وفات حکیم محمد بخش مہجور لکھنوی مصنف نورتن از نساخ

۱ بہر تاریخ وفات مہجور — گفت دل "بیاکن باغ بیوز" ۱۲۱۴ھ

تاریخ وفات مرزا حاتم علی صاحب مہر تخلص اوستاد تسلیم سہسوانی از تسلیم سہسوانی

۴ اے ہم مہر تو سے سال وفات ۱۲۹۶ھ

ایضاً تاریخ وفات مرزا حاتم علی مہر از سید محمد ہادی وحید تخلص خلف کلان خواجہ حیدر علی آتش

۵ وحید از سر آہ تاریخ گفتم — کہ آن مہر اوج فصاحت بیان شد ۱۲۸۷ھ

تاریخ وفات میر محمد تقی میر تخلص (دہلوی) از میاں مصحفی مرحوم

۴ از سر درد مصحفی نے کہا — "حق میں اس کے ہو نظیر آج" ۱۲۲۵ھ

ایضاً از شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی

۲ ناسخ تاریخ وفاتش نوشت — "واویلا مرد شہ شاعران" ۱۲۲۵ھ

ایضاً از مولوی عبد الغفور خان بہادر نساخ

۱ کہا میں نے یوں سال ترحیل میر — "مقیم گلستان جنت ہوئے" ۱۲۲۵ھ

تاریخ وفات صاحبزادہ سید محمود علی خان بہادر نادر تخلص رامپوری کہ در لندن انتقال فرمودند خلف عالیجناب نواب معلی القاب نواب سید محمد یوسف علی خان بہادر سابق والی رام پور از نواب محمد جعفر علی خان بہادر رئیس شمس آباد عرف پیارے صاحب

۲ از شہر لندن یوم شنبہ ماہ ذی حجہ نہم — "شد رونق افزائے ارم نواب والا یادگاہ" ۱۳۲۶ھ

ایضاً از نواب جعفر علی خان بہادر

جعفر بگفت مصرع تاریخ رحلتش — "نواب دین پناہ فرشتہ خصال ہائے" ۱۹۰۹ء (۲ر جنوری)

تاریخ وفات مرزا عباس بیگ نادر تخلص ملازم نواب صاحب باندہ از منیر

۶ مصرع تاریخ گفتم اے منیر — "بود ہے ہے شاعر شیریں کلام" ۱۲۷۶ھ

تاریخ وفات مولوی سید نجم الدین نادر تخلص رئیس آٹھ گانون ضلع میمن سنگھ از عبد الغفور خان نساخ

۲ رفت چون از جہان بسوی عدم — گشت "سوگ غریب" سال وفات ۱۲۹۱ھ

تاریخ وفات شیخ امام بخش ناسخ تخلص (لکھنوی) از شیخ کرامت علی اظہر

۲ گفت بہم حور و ملک برفلک — "شاہ ز اقلیم سخن آمدہ" ۱۲۵۴ھ

ایضاً از میر علی اوسط رشک تخلص شاگرد ناسخ

۲ رشک تاریخ پے لوح مزارش گفتم — "مرقد ناسخ اعجاز بیان داویلا" ۱۲۵۴ھ

ایضاً از کپتان مقبول الدولہ مقبول شاگرد ناسخ

۵ تاریخ گفتم اے قبول "رفت از جہان اوستاد ما"
۱۲۵۴ھ

ایضاً از مرزا حاتم علی مہر ساکن آگرہ

۵ تاریخ فوت اپنی کہیں کیوں نہ دل سے آپ "تاریخ ازل سے بندہ وشاہ حجاز ہے"
۱۲۵۴ھ

ایضاً از مولوی عبد الغفور خان نساخ

۱ سال ترحیل ناسخ اے نساخ "زردہ عم گفت ہاتف غیبی"
۱۲۵۴ھ

ایضاً از میر وزیر نور شاگرد مرزا فتح الدولہ برق

۲ گفت تاریخ وفاتش ہاتف "آہ استاد سخن دان بودہ"
۱۲۵۴ھ

تاریخ وفات عالی جناب معلی القاب نواب سید محمد یوسف علی خان بہادر فردوس مکان طاب ثراہ سابق فرمان روائے دار الریاست رام پور از جناب منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی

۷ بہر سال آں عزیز مصر وہا گفت امیر "مسند آرائے جنان شد یوسف دوران من"

۲۱ اپریل ۱۸۶۵ بعمر ۴۹ سال ۸ ماہ ۲۵ دن بمرض سرطان، ۲۲ ذی قعدہ بوقت نصف النہار (ی) ۱۲۸۱ھ

ایضاً از ضامن علی صاحب جلال لکھنوی

۲ جلال خستہ جان نے کی رقم تاریخ رحلت کی "جہاں سے آہ سب اہل ہنر کا قدر دان اٹھا"
۱۲۸۱ھ

ایضاً از امیر [illegible] بریلوی

۵ جو کی رحلت تو ہاتف نے کہا ہوش "سدھارے ہیں ناظم ملک بقادہ"
۱۲۸۱ھ

تاریخ وفات میر نجف علی صاحب نجف تخلص شاگرد میر مہدی علی صاحب صبا ساکن شاہ آباد ضلع اودھ دوست جناب امیر مینائی لکھنوی از مولوی مظفر حسین صاحب سلیمانی مظفر تخلص

۵ فکر تاریخ وفاتش چون مظفر را بدل گفت "والامنزلت جنت نصیب اہل کمال"
۱۲۹۰ھ

تاریخ وفات صاحبزادہ سید مہدی علی خان بہادر نحیف تخلص (رام پوری) از میاں منیر

۵ سرلوح تربت رقم کر منیر "امیر سخنی کی یہ ہے قبر آہ"

۲۹ نومبر ۱۸۷۲ھ بعمر [illegible] جمعہ ۲۰ رمضان (ی) ۱۲۸۹ھ

ایضاً از عبد الغفور خان بہادر نساخ

۲ پے سال تاریخ او حسانہ ام رقم زد "مقامش میان بہشت"
۱۲۸۹ھ

تاریخ وفات مولوی نذیر احمد صاحب نذیر مرحوم دہلوی مترجم قرآن شریف) از سید قمر الدین احمد قمر بریلوی

۱۴ ملک معنی میں ہے بپا ماتم "بے سرو پا ہیں علم و فضل وداثر"
بعارضہ فالج جمعہ بوقت شب ۳ مئی ۱۹۱۲ء ۱۳۲۰ھ

تاریخ وفات مرزا اصغر علی خان صاحب نسیم دہلوی از منشی امیر اللہ صاحب تسلیم لکھنوی شاگرد نسیم دہلوی

۴ منہ سے نکلی وم شیون تاریخ "ناظم ملک معانی ہے ہے"
پنجشنبہ ۱۴ رمضان ۱۲۸۲ھ

تاریخ وفات مولوی شبیر حسین نسیم بھرتپوری شاگرد نواب مرزا خان داغ دھلوی
از ابو الفخر سیماب صدیقی وارثی اکبر آبادی

۱۴ پہلے تو خوب رد کئے وہ پھر سینہ کوٹ کر — بولی یہی ہے قبر نسیم بھرتپوری

اقتباس از مصنف صاحب

سیماب کل ہوا جو مرا اک جگہ گزر — بے چارگی یہاں مجھے سر پیٹتے ملی
۲ پوچھا جو میں نے اس سے یہ کس کا مزار ہے — بولی "یہی ہے قبر نسیم بھرتپوری"

تاریخ وفات شاہ نصیر دہلوی از شاہ بہاء الدین تخلص بشیر سجادہ نشین درگاہ نبیرہ شاہ نصیر دہلوی[1]

۲ مصرع تاریخ گفت آگہ بشیر — "پیشوائے شاعران ہند مرد" ۱۲۵۴ھ

تاریخ وفات میاں نظام شاہ صاحب نظام تخلص (رام پوری) از محمود خاں صاحب محمود تخلص شاگرد نواب فصیح الملک داغ دہلوی

۳ ہوا معاملہ گوئی کا خاتمہ محمود — "میاں نظام گئے ہائے ہائے دنیا سے"

سہ شنبہ ۲۹ اکتوبر ۱۸۷۲ بعمر ۵۰ سال ۲۵ شعبان ۱۲۸۹ھ

ایضاً از مولوی نظفر حسین صاحب سلیمانی مظفر تخلص

۱ نظام نام آمد

۱۲۸۹ھ

تاریخ وفات نظیر اکبر آبادی از مفتی غلام سرور لاہوری قریشی

۲ "والی بی نظیر" گو سال نش — ہم بخوان "بی نظیر والا جاہ"

۱۲۱۹ھ ۱۲۱۹ھ

تاریخ وفات حافظ نعمت اللہ واعظ مشہور کلکتہ نعمت تخلص شاگرد رشید مولوی عصمت اللہ نسیخ
از محمد عبد الغفور خان نساخ

۲ ہے سال ترحیل نساخ محزون — رقم کرد "واحسرتا نعمت اللہ" ۱۳۰۲ھ

تاریخ وفات میر خورشید علی نفیس تخلص (لکھنوی) خلف انیس از سید محمد مہدی حسن الکمال

۶ لکھ دو تاریخ مرگ تم یہ کمال — "گل ہوئی شمع خاندان انیس"

۵ مارچ ۱۹۰۱ء ۱۳۱۸ھ

ایضاً از کلیم صاحب لکھنوی شاگرد دولہن صاحب خورشید

۲ ہجری کلیم کردس رضتش رقم — "جائے نفیس یافت بجنت زہے سکون" ۱۳۱۸ھ

تاریخ وفات عالی جناب مستطاب غفران پناہ نواب سید محمد کلب علی خان بہادر ملقب بہ خلد آشیان طاب ثراہ سابق فرمان روائے دار الریاست رام پور
از جناب منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی اوستاد حضور ممدوح الصدر

---

[1] صحیح تاریخ وفات دوشنبہ ۲۶ صفر ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۶ اگست ۱۸۳۰ء ہے۔ زندگانی بے نظیر

در ہزار و دو صد پنجاہ پیدا گشت شد — در ہزار و دو صد و ہشتاد و یک مسند نشین
در ہزار و سہ صد و چار از جمادی الاخرہ — بست و ہفتم چار شنبہ بود ساعت چار میں
ناگہاں زد کوس رحلت سوے دار آخرت — ذوق دین می داشت از دنیا بر افشاند آستین

۳۱ نقش کن از خامہ حسرت سر لوح مزار — "خانگاہ حامی اسلام امیر المومنین"

۲۳ مارچ ۱۸۸۷ء — ۱۳۰۴ھ

ایضاً از حکیم میر ضامن علی صاحب جلال لکھنوی

۲ جلال این مصرع تاریخ سال انتقالش گفت — "بمردی آہ ای کلب علی خان بہادر آہ" ۱۳۰۴ھ

تاریخ وصال شاہ نیاز احمد صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ از شاعر ایران

۶ سال وصالش ہاتفی گفتا ز غیب — قطب ایزد خاص احمد شہ نیاز

۱۰ اکتوبر ۱۸۳۴ جمعہ — ۶ جمادی الثانی — ۱۲۵۰ھ

تاریخ وفات نواب ضیاء الدین احمد خان صاحب بہادر نیر درخشان تخلص (دہلوی)
از نیر محمد روح دہلوی

۸ اب نہ باقی رہی وہ رونق شہر دہلی — بہر تاریخ یہ کیا خوب ہے ہاتف کا مقال

۱۳۰۲ھ ایضاً از مولوی الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی

۲ صد داکہ ضیاء دین احمد بر بست — رخت سفر از جہان کہ جائے الم است
از طاق و رز ایوان وہ بزم دجلسا — بگسستہ بہ رحمت الہی پیوست

۱۰ ۶۸ ۴۹ ۹۴ — ۶۹۴

ایضاً از مولوی عبد الغفور خان بہادر نساخ

۷ کہ و عطارد ندا عمر دہ نساخ را — "نیر قدسی تزاد رفت بعدن است سال"

ایضاً از میر ضامن علی صاحب جلال لکھنوی ۱۳۰۲ھ

۲ لکھ دو یہ جلال سال رحلت — "دہلی کا بجھا چراغ اے آہ" ۱۳۰۲ھ

تاریخ وفات قاری میر محمد رضا نیسان تخلص از کلیم لکھنوی

۲ لکھ مصرع سال ہجری کلیم — "وہ آیا جناں میں محمد رضا" ۱۳۰۲ھ

تاریخ وفات مولوی منشی سید فضل رسول صاحب تعلقہ دار و آنریری اسسٹنٹ کمشنر و مجسٹریٹ سندیلہ واسطی تخلص از تدبیر الدولہ مدبر الملک جناب منشی سید مظفر علی خاں صاحب بہادر جنگ اسیر لکھنوی استاد واسطی

۷ حسرت تاریخ ہجر جان و تن گفت — "کہ رنگ از لالہ بود از گل بدر رفت" ۱۲۹۲ھ

تاریخ دیگر از جناب اسیر لکھنوی

۲ تاریخ بسال عیسوی گفت اسیر — "از فضل رسول یافت ایمان بجنان" ۱۸۷۵ء

تاریخ وفات مولانا حافظ رشید النبی (مجددی) مرحوم دہشت تخلص ساکن امیٹھ مفتی عدالت دیوانی ہوگلی از مولوی عبد الغفور خان بہادر نساخ

۲ فکر تھی تاریخ کی کلک نے مصرع لکھا "وحشت جادو بیان مرگئے افسوس آہ" ۱۲۶۴ھ

تاریخ وفات خواجہ وزیر لکھنوی شاگرد شیخ ناسخ از جناب اسیر لکھنوی

۲ کی رقم کلک نے صفحہ پہ یہ تاریخ وفات "خواجہ عالم ارواح ہوئی جان وزیر" ۱۲۷۰ھ

ایضاً از شیخ محمد جان صاحب شاد لکھنوی

۱ بے سر و پا تمام شد پے سال "مصرع الفاظ حرف شعر سخن" ۱۲۷۰ھ

ایضاً از مولوی عبدالغفور خان نساخ

۲ یوں کہا میں نے مصرع تاریخ "داخل جنت نعیم ہوا" ۱۲۷۰ھ

ایضاً از کپتان مقبول الدولہ بہادر قبول تخلص

۵ گذاشت او چو جہاں را نوشت سال قبول "وزیر بادشہ شاعران نامی بود" ۱۲۷۰ھ

ایضاً از سید بادن علی صاحب بحو لکھنوی شاگرد خواجہ میر وزیر

۵ کرتا ہوں نالے پڑھ کے یہ مصرع سال فوت "ویران ہے وزیر سے اقلیم شعر آب" ۱۲۷۰ھ

تاریخ وفات سید خواجہ ناصر وزیر تخلص دہلوی از مولوی الطاف حسین صاحب حالی

۳ عیش میں شعر و غزل سوگ میں تاریخ مرگ "غیب سے آئی ندا" "خلد میں ناصر وزیر" ۱۲۹۸ھ

تاریخ وفات محمد مستقیم خان وسعت [illegible] پوری) از کریم خان کریم رام پوری

۱ سنین رحلت وسعت کریم گفت : "سہ ز اول جمادی معبد رش خلد"

چہار شنبہ، ۲۷ اکتوبر ۱۸۳۰ بعمر ۶۸ سال ۹ جمادی الاولیٰ (ی) ۱۲۴۶ھ

تاریخ وفات محمد سرفراز علی صاحب وصفی از مرزا قربان علی بیگ سالک دہلوی

۷ دیکھ کر موت اہل ماتم کا کہا سالک نے سال "سرفراز ملک معنی وصفی مرحوم آہ" ۱۲۹۵ھ

تاریخ وفات حکیم محمد عبدالہادی خان صاحب مرحوم رام پوری وفا تخلص شاگرد جناب امیر مینائی صاحب لکھنوی از مہدی علی خان جامع این رسالہ

دنیا سے گئے حکیم عبدالہادی | برہم ہوئی اہل علم کی محفل آج
۲ آرام کو دی سر بسر قلبی نے صلا | جنت میں ہوئے جا کے وفا داخل آج

سہ شنبہ ۲۷ ستمبر ۱۹۱۶ء بعمر ۵۲ سال، ۲ ذی قعدہ (تک) ۱۳۳۴ھ

تاریخ وفات حیدر علی ہاتف تخلص از شیخ امام بخش ناسخ

۲ تاریخ وفات گفت ناسخ "ہاتف بستہ اب مردہ صد حیف" ۱۳۳۴ھ

تاریخ وفات امیر علی خان ہلال (لکھنوی) از شاہ غلام حیدر صغیر لکھنوی

۵ افسوس ہلال ازیں جہاں رفت | دل در غم او پر اضطراب است
شیریں سخنی بشاعراں بود | دیواں کہ از دست خوش کتابست
جستیم چو اے صغیر تاریخ | دل گفت حیات چوں حباب است
بنویس دو حرف از سر و پا | باقی ز حباب غرق آب است
اعداد حروف چوں نوشتم | "یک یک کم شد ہمیں حباب است" ۱۳۰۷ھ

تاریخ وفات نواب نیاز احمد خان ہوش بریلوی شاگرد جناب منشی مظفر علیخان صاحب بہادر اسیر لکھنوی از راجہ عنایت سنگھ

۰۲　از ردی الم کہو عنایت تاریخ　"جنت کو گئے نیاز احمد خان دا ے"

۱۳۰۹ھ

تاریخ وفات آغا جو صاحب ہندی تخلص ساکن لکھنؤ نبیرہ نواب شجاع الدولہ کہ در عہد عالی جناب نواب سید کلب علی خان بہادر خلد آشیان سابق فرمان روائے رام پور ملازم ریاست بودند از حکیم میر ضامن علی صاحب جلال لکھنوی

تاریخ جلال نے لکھی رحلت کی　"آغا جو گئے جناں کو صید دا ے" ۱۳۰۹ھ

تمام شد

۱۰ ذی حجہ

۱۳۳۹ھ

REGD. NO. A—466
42ND YEAR OF PUBLICATION
NIGAR, URDU MONTHLY, RAMPUR U.P.
OCTOBER 1963
REGISTERED WITH THE REGISTRAR OF NEWSPAPERS AT R.N. NO. 2136/57

قیمت { فی پرچہ ۵۷ نئے پیسے
سالانہ دس روپے

نگار

ایڈیٹر اکبر علی خاں

ضروری اعلان
پاکستانی خریدار نگار کا سالانہ چندہ اس پتہ پر بھیجیں
رسالہ جاری کر دیا جائے گا
نمائندہ نگار ۶/۱۶ حسن آباد لاہور

جلد (۴۲) — فہرست مضامین اگست سنہ ۱۹۶۳ء — شمارہ (۸)

مضمون	صفحہ
ملاحظات	۲
حل التضاد فی تواریخ سیرۃ خیر العباد ۔ اسحاق النبی خاں	۴
بہار عجم کے مخطوطے پر خان آرزو کے حواشی ۔ راز یزدانی	۱۴
خدا ۔ ایک لسانی تحقیقی جائزہ ۔ سید قدرت نقوی	۲۰
مآثر الامراء کی تاریخی فروگذاشت ۔ سید نقی احمد ارشاد	۲۶
نواب مردان علیخاں رعنا (شاگرد غالب) ۔ سید امیر حسن نورانی	۳۵
فورٹ ولیم کالج کی ایک ناقابل فراموش شخصیت (شیخ اکرام علی) ۔ ڈاکٹر اعزاز نقوی	۴۰
منظومات	۴۶
مطبوعات موصولہ	۴۷

ملاحظات

پچھلے مہینے تاریخ لطیف اور افادۂ تاریخ دو اہم کتابیں نگار کے تاریخ نمبر کی صورت میں پیش کی جا چکی ہیں۔ ان کی وجہ سے دو سلسلے منقطع کرنا پڑے۔ پہلا غالبیہ کا اور دوسرا اسحاق النبی خاں صاحب کے مقالے "حل التضاد فی تواریخ سیرۃ خیر العباد" کا۔ ان میں سے دوسرا اس بار شریک اشاعت کیا جا رہا ہے۔

ہند و پاک کے ان لوگوں کو میں نے اس مقالے کی طرف توجہ دلائی تھی جو اسلامیات سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہیں یا دلچسپی رکھتے ہیں اور یہ درخواست کی تھی کہ خان صاحب اپنا جو نظریہ پیش کر رہے ہیں اس پر جرح و نقد کے ذریعے تلاش حق میں موصوف کی مدد فرمائیں۔ اس مقالے کا مرکزی خیال یہ ہے کہ بظاہر اسلام کی ابتدائی تاریخ یعنی سیرۃ کی تاریخ میں جو تضاد مختلف رواۃ سیرۃ کے ہاں نظر آتا ہے اور جس کو بنیاد بنا کر اکثر مستشرقین اسلامی تاریخ کی صداقت پر شک کا اظہار کرتے ہیں وہ غلط ہے۔ دراصل نہ واقعات غلط ہیں نہ تاریخیں یہ تضاد محض ایک غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ وہ غلط فہمی کیا ہے اور اس کا ازالہ کس طرح ہوا ہے یہ آئندہ قسطوں میں نگار کے صفحات پر آئے گا۔

میں نے ساتھ ہی یہ درخواست بھی کی تھی کہ ابھی جب تک یہ مقالہ مکمل طور پر سامنے نہ آجائے کوئی حکم نہ لگایا جائے لیکن میرے جواب میں جو خطوط آئے ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان بزرگوں نے پچھلی قسط کو بہت جذباتی ہو کر پڑھا۔ اس میں سرے سے ہی یہ بحث نہیں آئی تھی کہ رسول اکرم اُمّی تھے یا نہیں۔ بحث صرف یہ تھی کہ جس عرب معاشرے کو ہم قطعاً جاہل سمجھ رہے ہیں وہ علم سے اتنا ہی متعلق یا بیگانہ تھا جتنا آج سے تیرہ سو سال پہلے کا کوئی بھی ملک ہو سکتا تھا۔ لیکن نوے فی صد حضرات نے مجھے یہی لکھا کہ خان صاحب نے مسلمانوں کے ایک متفقہ عقیدے کو کو ہر

ت

ئج تھے غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔
یہاں یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ہمارے پڑھے لکھے حلقے جن سے ہم بڑی بڑی توقعات وابستہ کرتے ہیں ایک مضمون سے صحیح نتائج
ہیں نکالتے، نکال سکتے کا میں استعمال نہیں کروں گا اس لیے کہ نکال تو سکتے ہیں۔ ان حضرات میں بہت پرانے خیال کے اسلام
تا بھی تھے اور بالکل نئے انداز سے سوچنے والے اسلام پسند بھی۔ مگر جذبات کو پورا پورا دخل دونوں کے ہاں تھا۔
اس بار میں پھر یہ درخواست کر رہا ہوں کہ مقالہ کا پیش نظر حصہ بغور ملاحظہ فرمائیں۔ اس کے مخالف یا موافق جو بھی باتیں ذہن میں آئیں انھیں
ہا کرتے جائیں اور مقالے کی تکمیل پر مفصل اپنی رائے کا اظہار فرمائیں۔ نگار کے صفحات اس کے لیے حاضر ہیں۔

راز یزدانی مرحوم نے نگار کے لیے ایک مسلسل مضمون لکھنا شروع کیا تھا۔ اس کی پہلی قسط ان کی زندگی ہی میں کتابت کی منزلوں سے
ر چکی تھی لیکن اس کی اشاعت کی نوبت اس بار آرہی ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ ان کی دوسری کاوشیں جو ادھر ادھر بکھری ہوئی ہیں
تاً فوقتاً نگار کے ذریعے شائع ہوتی رہیں۔ مرحوم نے نظام رام پوری کا ایک مختصر سا انتخاب میری ہی درخواست پر کیا تھا جو عنقریب شائع
ہو رہا ہے
کتاب خانۂ رام پور کے چند مختصر رسائل بحر البیان، رسالہ متروکات وغیرہ کو ایڈیٹ کیا تھا۔ بڑی محنت سے مقدمے اور حاشیے لکھے
تھے۔ رامپور سے تعلق رکھنے والی چیزوں کے وہ شیدائی تھے۔ پچھلے سال برادرم رشید حسن خاں استفادے کے لیے ان سے یہ مسودے
پنے ساتھ مستعار لے گئے تھے۔ رشید حسن خاں سے میں نے استدعا کی ہے کہ وہ مرحوم کے یہ مسودے مجھے عطا فرما دیں تاکہ ان کی محنت رائیگاں
نہ جائے اور میں نگار کے ذریعے انھیں شائع کر سکوں۔ کچھ اور مضامین ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔ جن میں "نقوش" کے مثنوی نمبر کے لیے ایک مضمون ہے
نگار پاکستان کے نیاز نمبر کے لیے بھی ایک مضمون مرحوم نے لکھا تھا مگر وہ شریک اشاعت نہیں کیا گیا۔ یہ مضمون فرمان فتح پوری کی فرمائش پر لکھا
گیا تھا، میں انھیں بھی لکھ رہا ہوں کہ مرحوم کی کاوشوں کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے یہ مضمون مجھے واپس کر دیا جائے۔

حل التضاد فی تواریخ سیرۃ خیر العباد

(تواریخ سیرۃ کا تضاد اور ان کا حل)

مقالہ اوّل

(قسط سوم)

اسحاق النبی خاں

اس نتیجے پر پہنچ جانے کے بعد کہ ظہور اسلام کے وقت عربی معاشرے میں نہ تو تعلیم کی غیر معمولی کمی تھی، نہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کا فقدان تھا، تصنیف و تالیف
کی ابتداء ہو چکی تھی۔ ترجمے ہو رہے تھے اور تقریباً ہر شعبہ حیات میں تعلیم نے وابستگی حاصل کر لی تھی۔ قدرتی طور پر ہماری نگاہیں خود عہد رسالت اور اس کے
متصل زمانے کے مکتوبی باقیات کی تلاش میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ اور ہم یہ یقین نہیں کر سکتے کہ جس قوم میں شروع ہی سے یہ صلاحیتیں موجود تھیں وہ تحریک اسلام
سے متاثر ہونے کے بعد معطل ہو گئیں اور وہ بکار نہ آسکیں۔ حتیٰ کہ مسلمانوں نے اپنی موت و حیات کی اس عظیم کشمکش کا بھی کوئی ادنیٰ ریکارڈ نہیں چھوڑا جس سے
اس دور میں وہ دو چار ہوئے تھے۔

میرا مطلب عہد رسالت کی تاریخ سے ہے جس کے متعلق بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ تمام تر زبانی افسانوں کا مجموعہ ہے۔ سرسید سے زیادہ و کالت اسلام
کا شرف کم لوگوں کو حاصل ہوگا۔ مگر کتب سیرۃ کی تدوین پر بحث کرتے ہوئے ایک موقع پر لکھتے ہیں:

"ان کی (یعنی سیرۃ نگاروں کی) تحریرات کا سب سے بڑا خزانہ زبانی روایتیں تھیں، جس کسی نے جو قصہ ان سے بیان کیا، انھوں نے نہایت اشتیاق
سے اس کو سنا۔ اور اس قصے کی اصلیت اور راوی کے چال چلن کے متعلق ذرا بھی تفتیش نہیں کی اور اس قصہ کو اپنی کتاب میں لکھ لیا۔"[1]

سرسید کی رائے میں یہ افسانے بھی کسی قریب العہد مصنف کے قلم سے نہیں نکلے بلکہ ان کی تدوین میں بھی صدیاں گذر گئیں، اور تقریباً ... سال لگ گئے
چشم دید گواہ ختم ہو گئے۔ ان کے بیٹے، پوتے، پر پوتے بھی چل بسے، پانچویں اور چھٹی پشت بھی ختم ہو گئی تب کہیں جا کر مسلمانوں میں شعور تصنیف پیدا ہوا چنانچہ
تدوین روایات کے سلسلے میں ان کا خیال ہے ہے:

"اس زمانے میں فن تصنیف عرب میں محض ایک ابتدائی حالت میں تھا، اس وقت میں ایسی باتوں کے لیے حافظہ بہترین مخزن خیال کیا جاتا تھا،
ان اسباب سے نبوت سے دو سو برس تک اور ہجرت سے دو سو برس قریب تک حدیثوں کا قلمبند ہونا عمل میں نہیں آیا۔"[2]

یہ رائے علامت پسند یا کسی فرسودہ ذہن عجائب پرست کی نہیں، بلکہ ایک محقق کی ہے، اور ایسے بے خوف محقق کی ہے جس کی زبان قلم اظہار خیال
میں کبھی جھجکی، نہ رکی، اور بلا کسی ادنیٰ تکلف کے ہمیں جدید طرز فکر اور نئے نئے تصورات سے روشناس کیا۔

سرسید کی عظمت ایک طرف، اور واقعات و حقائق دوسری طرف۔
دیکھنا یہ ہے کہ کیا واقعی مسلمانوں کے پاس عہد رسالت کی کوئی مستند تاریخ نہیں؟ کیا حقیقتاً سیرۃ کی کتابوں کے اصل ماخذ وہ افسانے ہیں
جو زبانی روایتوں کے ذریعے سیرت نگاروں کو پہنچے تھے، اور انھوں نے بلا کسی تحقیق و تفتیش کے ان کو قبول کر کے مدون کر لیا تھا؟

اس سلسلہ میں غالباً یہ موزوں ہوگا کہ یہاں ہم قدیم سیرۃ کی کتابوں کی داخلی شہادتوں کو پیش نظر رکھ کر ان کے ابتدائی ماخذوں کا ایک
مختصر جائزہ لیں، اور اس کے بعد یہ فیصلہ کریں کہ روایات سیرت کی تاریخی منزلت کیا ہے؟ اور وہ کس درجہ قابل اعتماد ہیں۔ ان کتابوں کا اگر بغور و امعان
مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ ذیل پانچ ماخذ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۔ قرآن مجید۔

۲۔ عہد رسالت کے سرکاری اور دفتری ریکارڈ۔

---

[1] خطبات احمدیہ/۳۳۳

[2] ایضاً /۳۲۲

۳۔ اسی عہد میں صحابہ نے جو نجی یادداشتیں مرتب کیں۔
۴۔ آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد صحابہ کی قلمی کاوشیں۔
۵۔ تابعین کا وہ سرمایۂ تاریخ جو صحابہ کی مدد سے اکٹھا کیا گیا۔

یہاں میں علی الترتیب ان ماخذوں کی تاریخی اہمیت علیحدہ علیحدہ پیش کرتا ہوں۔

پہلا ماخذ سب سے پہلے قرآن کو لیجیے، جو مسلمانوں کے نزدیک اگرچہ کلام الٰہی اور منزل من اللہ ہونے کا مرتبہ رکھتا ہے، مگر اس سے کسی کو بھی انکار نہیں کہ اس مقدس صحیفے کی کتابت نہایت ہی ابتدائی زمانے سے شروع ہو گئی تھی بلکہ یہ کہ اس کا کوئی لفظ ایسا نہیں جو خاص پیغمبر اسلام کی زبان سے نہ نکلا ہو؛ یا اس میں کوئی خفیف سی بھی تبدیلی کی گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن سے نہ صرف آنحضرتؐ کے تمام تر تصورات، اعتقادات، رجحانات اور عزائم کا ٹھیک ٹھیک اور پورا پورا پتہ چلتا ہے، بلکہ تحریک اسلام کی اصل روح بھی سامنے آ جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس زمانے کی سماجی ضروریات پر بھی روشنی پڑتی ہے؛ اس لیے ظاہر ہے کہ واقعاتِ سیرۃ کو سمجھنے کے لیے قرآن سے بہتر کوئی دوسرا ماخذ نہیں۔

یہ سچ ہے کہ قرآن تاریخ کی کتاب نہیں اور اسی لیے اس میں تاریخی تفصیلات کا پتہ نہیں چلتا، جو تاریخ نویسی کے لیے سب سے ضروری شے ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آنحضرتؐ کی پوری زندگی کا شاید ایک بھی اہم واقعہ ایسا نہیں جس کے متعلق قرآن میں ٹھیک وقت پر کوئی بیان نہ دیا گیا ہو یا اس کی مناسب توجیہ نہ کی گئی ہو۔ تقریباً تمام اہم غزوات کے متعلق قرآن میں واضح بیانات ہیں حتیٰ کہ آنحضرتؐ کی نجی اور خانگی زندگی بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں، اسی لیے سیرۃ کی قدیم کتابوں میں اس کے حوالے جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ اور آج بھی کوئی سیرۃ نویس اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

دوسرا ماخذ قرآن کے بعد دوسرا نمبر ان سرکاری ریکارڈوں کا ہے جو خاص عہد رسالت میں مرتب ہوئے تھے، مثلاً آنحضرتؐ کے مکاتیب، معاہدات، اور فرامین وغیرہ، جن کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ اور اس تعداد سے اس زمانے کے سیاسی انتشار اور عرب قبائل کی لامرکزیت کا پورا پورا پتہ چلتا ہے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے بھی اس قسم کی جملہ دستاویزیں انتہائی قیمتی اور قابل اعتماد ماخذ تصور کی جاتی ہیں۔ جن سے اس زمانے کے اکثر سیاسی اور سماجی مسائل خود بخود سلجھتے آ جاتے ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ ان دستاویزوں کو اصلی کہا جا سکے۔ اور ان کے اصل متن ہمارے سامنے ہوں۔ چنانچہ علمائے سیرت نے شروع سے ان بیش بہا دستاویزوں کو محفوظ کرنے کی پوری کوشش کی تھی، نیز موقع بہ موقع ان کا تذکرہ کیا ہے، بلکہ اصل عبارتیں تک نقل کی ہیں۔ چوں کہ یہ دستاویزیں بجائے خود بھی ایک تاریخ کا مرتبہ رکھتی تھیں۔ اس لیے غالباً دوسری صدی کے اختتام سے پہلے ان کو یکجا جمع کرنے کے اقدامات شروع ہو گئے تھے، ابن ندیم نے مدائنی (۱۳۵ھ۔ ۲۱۵ھ) کی متعدد تصنیفات کا تذکرہ کرتے ہوئے مندرجہ ذیل کتابوں کے نام بھی گنائے ہیں:۔

۱۔ کتاب عہود النبی
۲۔ کتاب رسائل النبی
۳۔ کتاب کتب النبی الی الملوک
۴۔ کتاب من کتب له النبی کتاباً و اماناً۔[1]

ان ناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدائنی کے زمانہ (یعنی دوسری صدی میں) ان قدیم دستاویزوں نے کتابی صورت اختیار کر لی تھی۔ اور ان میں سے سب کو نہیں تو اکثر کو ایک جگہ جمع کر لیا گیا تھا۔

میور نے خود ان قدری کے متعلق بیان کیا ہے کہ ان کی (Biography) میں ایک مستقل باب خاص ان معاہدات کے متعلق ہے۔ جس میں تقریباً دو یا تین بیسی (Two or Three Score) معاہدات کی نقلیں موجود ہیں اور بقول میور نقلیں اس طرح کی گئی ہیں کہ ان میں

---

[1] ابن ندیم (اخبار المدائنی) ۱۴۷

سے اکثر دستاویزوں کو یا تو خود واقدی نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا یا اس کے کسی راوی نے بچشم خود دیکھ کر نقل کیا تھا[۱] میرے سامنے واقدی کا یہ باب نہیں، البتہ واقدی کے شاگرد خاص ابن سعد نے اپنی مشہور کتاب طبقات کی تیسری جلد میں بھی ان دستاویزوں کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے جو میرے پیش نظر ہے، انہیں مجھے صرف دو تحریریں ایسی مل سکیں جو واقعی واقدی کی نظر سے گذری تھیں[۲] اور معلوم ہوتا ہے ان کا لفظ لفظ اصل دستاویزوں سے نقل کیا گیا ہے۔

ابن سعد نے اس باب میں الگ الگ سو مکتوبات اور معاہدے نقل کیے ہیں، اور ہر مکتوب یا معاہدے سے پہلے بطور تعارف تقریباً ایک ہی قسم کے الفاظ تحریر کیے ہیں۔ مثلاً، "اور اہل علم بیان کرتے ہیں" اور "علماء کا بیان ہے"۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن سعد کے عہد تک مدائنی کے علاوہ دوسرے علماء بھی اس موضوع پر کتابیں لکھ چکے تھے، جو ابن سعد کے پیش نظر تھیں۔ ورنہ صرف مدائنی یا واقدی کا حوالہ کافی ہوتا۔

قدیم مورخین کو ان قیمتی دستاویزوں کی نقلیں کہاں سے ملیں، اور کس طرح ان کو جمع کیا گیا؟ اس کے متعلق قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا، البتہ قیاس غالب یہ ہے کہ یا تو یہ [illegible] سرمایہ سرکاری دفاتر کے ریکارڈوں سے نقل کیا گیا ہوگا یا پھر ان قبائل کے قبضے سے دفتیں تک پہنچا ہوگا جن کے حق میں یہ تحریریں لکھی گئی تھیں۔ عہد رسالت میں دستور تھا کہ معاہدات کی دو نقلیں ہوتی تھیں، ایک مدینہ میں رہتی اور دوسری قسم ثانی متعلقہ کے پاس۔ بہرصورت ان میں سے جو بات بھی ہو اتنا یقینی ہے کہ ان دستاویزوں کا بڑا حصہ ایک مدت مدید تک اصل حالت میں محفوظ رہا، جس کی وجہ غالباً ایک یہ بھی تھی کہ ان فرامین اور معاہدات میں مختلف قبائل کو جو مراعات دی گئی تھیں، ان پر مسلسل عمل ہوتا رہا تھا۔

اشپرنگر کا خیال ہے کہ ہارون الرشید کے زمانہ خلافت میں بھی ان پر پورا عمل ہوتا رہا تھا[۳] ظاہر ہے کہ اس طرح یہ جملہ دستاویزیں سیرۃ کا ایک اہم ماخذ تھیں۔ جو ہمارے سیرۃ نگاروں کے سامنے رہیں، اور آج بھی ان کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بشرطیکہ ہمیں ان کی صحت کا یقین ہو سکے؛ میرا خیال ہے کہ اگرچہ ان کا بڑا حصہ صحیح اور اصلی ہے، لیکن انہیں بعض مکتوبات ایسے بھی ہیں جن کی اصلیت بڑی حد تک مشکوک ہے، اور بعض صاف طور پر اصل دستاویزوں کا خلاصہ معلوم ہوتے ہیں۔

ابن ندیم کا بیان ہے کہ ان دستاویزوں میں سے چند اس کے زمانے تک محفوظ تھیں جن کو اس نے [illegible] پرانی کتابوں کے شوقین کے پاس بچشم خود دیکھا تھا[۴]

ان دستاویزوں کے علاوہ، عہد رسالت کے سرکاری ریکارڈوں میں وہ رجسٹر بھی کم اہمیت نہیں رکھتے جو مختلف اغراض کے تحت اس زمانہ میں مرتب ہوتے رہے تھے، فصل دوم میں بیان کیا جاچکا ہے (دیکھیے نگار جون ۶۳ء) کہ عہد رسالت میں ایک جنرل رجسٹر بھی موجود تھا جس میں تمام مسلمان مردوں کے نام درج تھے، غزوات و سرایا کے سلسلے میں جو رجسٹر مرتب ہوتے، ان کا بھی ذکر آچکا ہے (دیکھیے نگار جون ۶۳ء) یہاں مجھے صرف اتنا اضافہ کرنا ہے کہ عہد رسالت میں غالباً ان رجسٹروں کو "کتاب حافظ" کہا جاتا تھا۔ کعب بن مالک جو نہایت قدیم الاسلام صحابی ہیں اور تقریباً ہر غزوے میں بجز غزوۂ تبوک کے شریک رہے، کہتے ہیں کہ غزوۂ تبوک میں آنحضرت کے ہمراہ مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ان کے نام "کتاب حافظ" (یعنی دیوان میں) نہ آسکے تھے[۵] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غزوۂ تبوک کے علاوہ باقی تمام غزوات میں یہ "کتاب حافظ" ضرور تیار ہوتی۔ گمان غالب ہے کہ ابتدائی رواۃ یا مدونین سیرۃ کے سامنے یہ مواد پورا کا پورا موجود تھا جسکو پیش نظر رکھ کر شریک غزوات صحابہ یا مقتول و مجروح مجاہدین کی انھوں نے نام بنام نشاندہی کی تھی اور صحیح اعداد و شمار بیان کیے تھے۔

مثال کے طور پر ابن اسحٰق نے بڑی تفصیل کے ساتھ شرکاء بدر کے سیکڑوں نام مع ولدیت اور خاندان بیان کیے ہیں[۶] جنگ احد کے ایک ایک مقتول اور مجروح سپاہی کی نام بنام فہرست پیش کی ہے[۷] اس طرح دوسرے غزوات میں جو مجاہدین شہید ہوئے ان کی مکمل فہرستیں کتاب میں

---

[۱] MUIR LIFE XXII [۲] طبقات ۳/۲۰ [۳] MUIR LIFE XXII [۴] ابن ندیم /۷۱ [۵] والمسلمون مع رسول اللہ کثیر ولا یجمعھم کتاب حافظ یریدبہ الدیوان (کتاب المغازی) [۶] ابن ہشام / [۷] ابن ہشام /

شامل ہیں، سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابن اسحٰق کو یہ جملہ تفصیلات کہاں سے ملیں اور کس نے ان طویل فہرستوں کو پوری تفصیلات کے ساتھ روایت کیا تھا؟ اس کا جواب شاید کسی کے پاس نہیں، کیوں کہ خود ابن اسحٰق بھی اس سلسلے میں خاموش ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ جملہ فہرستیں بلا کسی تحریری ریکارڈ کے ممکن نہیں، اور اگر اس قسم کے ریکارڈوں کا تذکرہ تاریخ میں موجود نہ ہوتا تو ہمیں حق پہنچتا تھا کہ ان تمام تر تفصیلات کو مشکوک نظر سے دیکھیں اور تنقیدی اصولوں کو سامنے رکھ کر اس بات کی تلاش کریں کہ اس فہرست سازی میں کن کن اغراض کی کارفرمائی ہو سکتی ہے۔ مگر ان رجسٹروں کی موجودگی میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ تفصیلات شاید ان پچھلے ریکارڈوں سے ماخوذ ہوں گی جن کو ابن اسحٰق کے کسی ابتدائی راوی نے بچشم خود دیکھ کر نقل کیا تھا؟

اسی طرح ابن اسحٰق نے بلا کسی ادنیٰ حوالے کے مقاسم خیبر کی تفصیل دی ہے۔ اور خاص خاص لوگوں کو جو عطیات دیئے گئے تھے ان کے نام گنائے ہیں۔ اس فہرست میں عطیات کے اوزان تک کا خیال رکھا گیا ہے، میں یہاں ان کا ایک حصہ نقل کرتا ہوں جو اگرچہ تھوڑا طویل اور اکتا دینے والا ہے۔ تاہم معاملے کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لیے اس پر نظر رکھنا ضروری ہے، ابن اسحٰق کہتے ہیں:-

"پھر آنحضرت نے کتیبہ کو جس کا تعلق خاص وادی سے تھا، اپنے رشتہ داروں اور ازواج کے درمیان تقسیم فرمایا، اور چند مسلمان مردوں اور عورتوں کو بھی اس میں سے عطیات دیئے۔ چنانچہ آنحضرت صؐ نے اپنی صاحبزادی فاطمہؓ کو دو سو وسق دیئے اور علی بن ابی طالب کو ایک سو وسق اور اسامہ بن زید کو دو سو اور پچاس وسق کھجوریں، اور ام المومنین عائشہ کو دو سو وسق اور حضرت ابوبکر کو سو وسق، اور عقیل بن ابی طالب کو ایک سو چالیس وسق اور جعفر کی اولاد کو پچاس وسق، اور ربیعہ بن حارث کو سو وسق، اور صلت بن مخرمہ کو مع ان کے دونوں بیٹوں کے سو وسق اس طرح کہ صلت کے چالیس اور ابی نبقہ کے پچاس، اور رکانہ بن عبد یزید کو پچاس وسق اور قیس بن مخرمہ کو تیس اور عبیدہ بن حارث کے بیٹوں اور ان کے بیٹے حصین بن حارث کو سو وسق، اور بنی عبید بن عبد یزید کو ساٹھ اور اوس بن مخرمہ کے بیٹے کو تیس وسق اور مسطح بن اثاثہ اور الیاس کے بیٹے کو پچاس وسق اور ام رمیثہ کو چالیس وسق اور نعیم بن ہند کو تیس، اور بحینہ بنت حارث کو تیس وسق، اور عجیر بن عبد یزید کو تیس وسق اور ام حکیم کو تیس وسق اور جمانہ بنت ابی طالب کو تیس وسق اور ابن ارقم کو پچاس اور عبد الرحمٰن بن ابی بکر کو چالیس، اور حمنہ بنت جحش کو تیس وسق اور زبیر کی ان کو چالیس وسق اور ضباعہ بنت زبیر کو چالیس اور ابن غنیم کو تیس وسق اور ام طالب کو چالیس وسق اور ابی بصرہ کو بیس اور نمیلہ کلبی کو پچاس وسق اور عبد اللہ بن وہب کو مع ان کے دونوں بیٹوں کے نوے وسق جن میں سے بیٹوں کے چالیس تھے اور ام حبیب جحش کو تیس وسق اور ملکو بن عبدہ کو تیس وسق اور اپنی کل ازواج کو ۷۰۰ وسق عطا فرمائے۔"[1]

ان تفصیلات کو دیکھنے کے بعد یہ نتیجہ تو شاید کوئی بھی نہیں نکال سکے گا، کہ ابن اسحٰق نے اس فہرست کو کسی کتاب یا دستاویز سے نقل کیا ہے اور یہ جملہ تفصیلات محض زبانی روایت کا نتیجہ ہیں۔ کیوں کہ اول تو روایت کی ساخت سے یہ اندازہ نہیں ہوتا، کیوں کہ ذہن انسانی سوا سو سال تک ان غیر اہم اور غیر متعلق تفصیلات کو یاد رکھنے سے قاصر ہے اور اگر بالفرض اس کا امکان بھی تسلیم کر لیا جائے تو شاید مصنف اس فہرست کے راوی کا حوالہ ضرور دیتا، جیسا کہ دوسری روایتوں کے سلسلے میں التزام ہے، اسی طرح یہ نتیجہ نکالنا بھی ممکن نہیں کہ یہ تمام تفصیلات خود ابن اسحٰق کی خود ساختہ یا بالفاظ دیگر جعلی ہیں کیوں کہ ان سے نہ تو کسی خاص عقیدے کی تائید ہوتی ہے، اور نہ کسی غیر معمولی واقعہ کی طرف ہمارے ذہن منتقل ہوتے ہیں، پوری فہرست میں شاہیر کے نام محض گنتی کے ہیں جو خود اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ تمام نام فرضی نہیں، بلکہ اصلی ہیں اور ان کے بیان کرنے سے مصنف کا کوئی خاص مقصد نہ تھا۔

تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ کم سے کم متذکرہ مال غنیمت کی تقسیم تحریری صورت میں ہوئی تھی۔ یحییٰ بن آدم جو دوسری صدی کے مشہور فقہا اور محدثین میں ہیں، اپنی کتاب الخراج میں بشر بن یسار کا قول اس طرح نقل کرتے ہیں،

"فکتب فیہا رسول للناس وکان لازواجہ من ذالک"[2]

---

[1] ابن ہشام ؟ [2] کتاب الخراج ص ۱۱۹ قاہرہ

بنا بریں یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ جملہ تفصیلات عہد رسالت کے کسی سرکاری یا دفتری ریکارڈ سے نقل کی گئی ہیں یا ان کی نقل کسی اہل معاملہ کی یا کسی منتقل تابعی بہر صورت ابن اسحٰق کو بہ روایت مکتوبی صورت میں پہنچا ہے۔ سیرۃ کی کتابوں میں اس قسم کی اور متعدد مثالیں موجود ہیں، جن کو میں یہاں ترک کرتا ہوں۔

تیسرا ماخذ

سرکاری ریکارڈوں کے بعد کتب سیرۃ کا سب سے اہم ماخذ صحابہ کی وہ تحریریں کہی جا سکتی ہیں جو خاص عہد رسالت میں مرتب ہوئیں اور جن کو تاریخی نقطۂ نظر سے معاصرین اور چشم دید گواہوں کی شہادتوں کا مرتبہ حاصل ہے:

ان تحریرات کا پتہ نہ صرف روایات سیرۃ کی بناوٹ اور پیرایۂ بیان سے چلتا ہے بلکہ تاریخ کی کتابوں میں ان کے متعدد حوالے اور تذکرے موجود ہیں۔ جن پر ہمیں بڑی احتیاط اور غور و فکر کے ساتھ نظر ڈالنا چاہیے، تاکہ بے جا افراط و تفریط سے بچ سکیں، چونکہ یہی ماخذ ایسے ہیں جن پر واقعاتی تفصیلات کا بیشتر مدار ہے۔ اس لیے میں یہاں تھوڑی تفصیل سے کام لوں گا۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں متعدد صحابہ آنحضرت کے احکام، افعال اور واقعات کو ضبط تحریر میں لاتے رہتے تھے، ان میں سے اکثر کی یادداشتیں غالباً بہت مختصر تھیں، اور یہ لوگ خاص خاص امور کے متعلق کچھ نوٹ کر لیتے، اس لیے ان پر لفظ تالیف یا تصنیف کا اطلاق مشکل ہے، تاہم کئی اہل قلم ایسے بھی تھے جن کے پاس ضخیم مجموعوں کا پتہ چلتا ہے اور انھیں اس عہد کی کتابیں یا تالیفات کہنا بیجا نہ ہوگا؛ ان میں سے کم سے کم ایک کتاب کا نام بھی اوراق تاریخ میں محفوظ ہے یعنی "صادقہ" کا جس کا میں آئندہ تفصیلی تذکرہ کروں گا۔ یہاں ایک اور غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ اور وہ یہ کہ اس قسم کی تحریرات کا تعلق صرف مدینے کے رہنے والے صحابیوں تک محدود تھا۔ جو پیغمبر اسلام کی ذات اور شخصیت سے خاص طور پر متاثر تھے اور ان کے وسائل حیات کا تعلق بھی اسلامی تحریک کی کامیابی سے وابستہ ہو چکا تھا، جس کی بنا پر یہ ہمہ وقت دربار نبوت میں حاضر رہتے، اور آپ کے ایک ایک حکم اور ایک ایک عمل کا بغور مطالعہ کرتے۔ یہ خیال اگرچہ ایک حد تک صحیح ہے مگر پھر بھی تھوڑی ترمیم کا محتاج ہے کیونکہ اسلام کی ہمہ گیر قوت انجذاب نے گرد و پیش اور دور و نزدیک کے قبائل کو بھی اتنا ہی متاثر کیا تھا جتنا خود اہل مدینہ کو۔

جو قبیلہ مسلمان ہو جاتا اس کے سربراہ مدینے آتے، اور حلقہ بگوش اسلام ہو کر اس محبوب و دلفریب شخصیت کے ویسے ہی دلدادہ ہو جاتے جیسے مدینے والے تھے، مسلمان ہونے کے بعد ان کے تمام تر روحانی اور مادی وسائل کا واحد حل مرکز ثقل صرف آنحضرت کی ذات گرامی بن جاتی اور مدینے کی راہ سے دینی، سیاسی، اور معاشی رشتے قائم ہو جاتے، جن کا ریکارڈ نہ صرف سرکاری طور پر ضروری تھا، بلکہ افراد متعلقہ کے لیے بھی عین سعادت تھی۔

خوش قسمتی سے اوراق تاریخ میں کم سے کم دو شہادتیں ایسی موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مدینے سے باہر بھی اس قسم کی تحریریں لکھی جاتی تھیں اور بعض قبائل میں بڑے عرصے تک یہ اپنی اصل شکل و صورت میں باقی رہیں۔ میرا مطلب بنو عذرا اور سلامان کی تحریری یادداشتوں سے ہے جن کا تذکرہ بصراحت ابن سعد نے کیا ہے۔ یہ دونوں قبیلے سنہ ۹ھ اور سنہ ۱۰ھ میں علی الترتیب اسلام لائے تھے۔ ان میں سے پہلے بنو عذرا کی یادداشت ملاحظہ فرمائیے جو ایک عذری نے اپنے بزرگوں کے باقیات میں دیکھی تھی اور گویا بنو عذرا کے مسلمان ہونے کی کہانی خود انکی زبانی ہے۔ عمرو بن حریث العذری کہتے ہیں کہ میں اپنے بزرگوں کے ایک مکتوب میں دیکھا کہ

> صفر سنہ ۹ھ میں رسول اللہ کے پاس ۱۲ آدمیوں کا ایک وفد آیا جس میں حمزہ بن نعمان العذری اور مالک کے دونوں بیٹے سلیم اور اسد بھی موجود تھے، اور مالک بن رباح بھی، یہ لوگ رملہ بنت الحارث النجاریہ کے مکان میں مقیم ہوئے، نبی علیہ السلام کے پاس پہنچے تو جاہلی سلام کیا، اور کہا کہ ہم لوگ قصی کے اخیافی بھائی ہیں۔ ہمیں نے خزاعہ اور بنو بکر کو مکے سے نکالا تھا اور ہماری آپ سے قرابت داری اور رشتے ہیں۔
>
> رسول اللہ نے فرمایا مرحبا و اہلاً۔ مجھ سے کسی نے تمہارا تعارف نہ کرایا تمہیں اسلامی سلام سے کس بات نے روکدیا
>
> ان لوگوں نے کہا کہ ہم اپنی قوم کی فکر میں آئے ہیں۔
>
> بعد ازاں آنحضرت سے چند دینی باتیں دریافت کیں۔ جن کی آپ نے تشریح کی، تو سب مسلمان ہو گئے چند روز

قیام کے بعد اپنے عیال میں واپس آگئے۔

آنحضرت نے انھیں اسی طرح انعام و اکرام سے نوازا جس طرح آپ دوسرے مومنوں کو نوازتے تھے۔ ایک شخص کو آپ نے چادر بھی مرحمت فرمائی۔ [1]

اس عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ حریث کے سامنے ان کے بزرگوں کی لکھی ہوئی کوئی نہ کوئی یادداشت موجود تھی جس کا خلاصہ اور نچوڑ انھوں نے اپنے لفظوں میں دہرایا ہے، اور صرف ایک ہی واقعہ یعنی اسلام بنو عذرا کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ تحریر اتنی مختصر نہ تھی اور اس میں کچھ اور باتیں بھی ہوں گی۔ جن کو خارج از بحث سمجھ کر قصداً ترک کر دیا گیا ہے۔ کیوں کہ جو لوگ اپنے اسلام لانے کی داستان کو تحریری صورت میں محفوظ رکھتے تھے ان کے سامنے دوسرے مسائل اور دوسری قابل تحریر باتیں بھی ہیں۔

حریث کے بیان میں صفر ۹ھ کا حوالہ، بعد کا اضافہ معلوم ہوتا ہے۔ یعنی خود حریث کے زمانے کا جبکہ سنہ ہجری رائج ہو چکا تھا۔ اس لیے اصل دستاویز میں بہ صراحت ممکن نہیں، سنہ ہجری کا اجرا خلیفہ ثانی کے عہد کا واقعہ ہے۔

اب بنو سلامان کی یادداشت پر نظر کیجیے، یہ بھی اگرچہ ایک طویل دستاویز کا مختصر حصہ معلوم ہوتی ہے مگر اس کی عبارت سے یہ اندازہ ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ یہ اصل دستاویز سے لفظاً لفظاً نقل کی گئی ہے۔

محمد بن یحییٰ بن سہیل بن ابی حثمہ سے مروی ہے کہ میں نے اپنے والد کی تحریرات میں دیکھا کہ

"حبیب بن عمرو السلامانی بیان کرتے تھے کہ ہم لوگ وفد سلامان میں رسول اللہؐ کے پاس آئے۔ ہم سات آدمی تھے۔ رسول اللہؐ کے پاس پہنچے تو آپ مسجد سے نکل کر ایک جنازے میں شرکت کے لئے جا رہے تھے۔ جس کی طرف آپ نے مدعو کیا تھا۔ ہم نے کہا السلام علیک یا رسول اللہ" تو آپ نے "وعلیکم" کہہ کر جواب دیا (پھر فرمایا) تم کون ہو؟ عرض کی کہ ہم بنو سلامان سے ہیں اور اس لیے آئے ہیں کہ آپ کی اسلام پر بیعت کریں کہ ہم پسماندگان میں سے ہیں اور ان کے نمائندے ہیں۔

آنحضرت اپنے غلام ثوبان کی طرف بڑھے اور فرمایا کہ اس وفد کو بھی وہیں ٹھہراؤ جہاں دوسرے قیام کرتے ہیں۔ نماز ظہر کے بعد آپ اپنی رہائش گاہ اور منبر کے درمیان تشریف فرما ہوئے تو ہم آپ کے پاس حاضر ہوئے، نماز اور شریعت اسلام اور جھاڑ پھونک کے متعلق سوالات کیے۔

آپ نے ہم میں سے ہر شخص کو پانچ پانچ اوقیہ چاندی عطا فرمائی اس کے بعد ہم اپنے گھروں کو واپس آگئے۔

یہ واقعہ شوال ۱۰ھ کا ہے۔ [2]

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اس روایت کی بناوٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ بنو سلامان کے وفد نے جب باریابی حاصل کی تھی تو یہاں سے واپسی کے بعد، حبیب بن عمرو السلامانی نے جو اس وفد کے لیڈر معلوم ہوتے ہیں، مدینے کی پوری روداد یحییٰ بن سہیل کو سنائی جنھوں نے اس کو قلمبند کر لیا۔ اور اس کے بعد ان کے لڑکے محمد نے اصل دستاویز سے نقل کر کے متلاشیان تاریخ کے حوالے کیا، آخری نوٹ یعنی یہ واقعہ شوال ۱۰ھ کا ہے" حریث کی طرح یا تو خود محمد بن یحییٰ کا ہے، یا کسی سیرۃ نگار کا۔

بنو عذرا کی یادداشت کی طرح غالباً یہ دستاویز بھی مختصر نہ تھی، بلکہ شاید طویل تھی محمد نے صرف وہی حصہ نقل کیا ہے جس کا تعلق بنو سلامان کے اسلام لانے سے تھا۔

ان دونوں دستاویزوں کو مثال قرار دے کر یہ بات پوری قطعیت سے کہی جا سکتی ہے، کہ سیرت کی کتابوں میں کم سے کم وفود و قبائل کے سلسلے میں جو تفصیلات موجود ہیں وہ اگر سب نہیں تو بیشتر اسی قسم کی یادداشتوں کا نتیجہ ہیں جو خاص مدینے میں بھی ریکارڈ ہوئیں یا ان متعلقہ

---

[1] ابن سعد ۶۶/۳ [2] ابن سعد ۶۶/۳

قبائل میں بھی ان کو تبرکاً محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی۔

یہ بات قطعاً خلاف قیاس ہے کہ اس قسم کی یادداشتیں صرف بنو عذرا اور بنو سلامان نے ہی تحریر کی تھیں، اور دوسرے قبائل نے جو میدان تعلیم اور سیاسی شعور میں ان سے آگے تھے کوئی تحریری ریکارڈ نہ چھوڑا ہوگا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں ملک کے طول و عرض میں روایات سیرت کا ایک معتد بہ حصہ غالباً تحریری صورت میں موجود تھا۔

اب میں قارئین کی توجہ خاص مدینے کی طرف منعطف کرنا چاہتا ہوں جو مرکز اسلام تھا اور جہاں چند در چند ضروریات کے تحت آنحضرت کے اقوال و احکام اور حالات تحریری یادداشتوں کی صورت میں منتقل ہو رہے تھے، افراط تحریر کا یہ عالم تھا کہ کم سے کم ایک بار خود آنحضرت نے بعض صحابہ کو حکم دیا کہ قرآن کے سوا کچھ نہ لکھیں اور اگر کسی نے لکھ لیا ہے تو اس کو مٹا دے۔ ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے (دوبارہ) اجازت چاہی تو انکار کر دیا گیا[2]

اس سے اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں صحابہ کی ایک جماعت کثیر اس کام میں مشغول تھی۔ جن میں بہت سے بے احتیاط اور کم سوجھ بوجھ کے افراد بھی شامل تھے۔ لیکن محتاط اور صاحب شعور افراد کی بھی کمی نہیں تھی، اور تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو آج بھی درجنوں صحابہ کے نام گنائے جا سکتے ہیں جن کے پاس چھوٹے بڑے صحیفے موجود تھے، بلکہ بعض نے تو شاید مستقل تصنیفیں چھوڑی تھیں۔

ان میں سے چند اکابر صحابہ کے نام بطور مثال پیش کرتا ہوں جن کے متعلق قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان مصنفین نے خاص پیغمبر اسلام کی حیات اور اوقات یا تعلیمات کے متعلق کچھ نہ کچھ تحریر کیا تھا، مثلاً:

سعد بن عبادہ، جابر بن عبداللہ، عبداللہ بن مسعود، سمرہ بن جندب، رافع بن خدیج، ابو موسیٰ اشعری، ابو رافع، عبداللہ بن عمرو بن عاص، انس بن مالک وغیرہ۔

ان میں دو آخر الذکر ایسے صحابیوں کے نام ہیں جن کی تالیفات کو آنحضرت کا شرف قبول بھی حاصل تھا۔ باقی کتابوں کے متعلق ایسی کوئی شہادت ہمارے علم میں نہیں جس کی بنا پر ان کو زمانہ بعد کی تصنیف قرار دیا جائے بہر صورت یہ پورا لٹریچر تابعین کے عہد تک ہر طرح محفوظ تھا اور اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔

سعد بن عبادہ کی کتاب کا حوالہ ترمذی میں موجود ہے اور اگرچہ اس کے اصل موضوع کے متعلق کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ تاہم اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب انتہائی بلند پایہ ہوگی، سعد نہ صرف خزرج کے رئیس اور انصار کے چوٹی کے لوگوں میں تھے، بلکہ تعلیمی اعتبار سے بھی ان کی شخصیت بہت بلند تھی، مدینے کی سب سے اونچی تعلیمی ڈگری یعنی "سند کاملیت" ان کے پاس تھی۔ سیاسی سوجھ بوجھ اور اثر و رسوخ کی کیفیت یہ تھی کہ آنحضرت کی رحلت کے بعد ابو بکر صدیق کے مقابلے میں منصب خلافت کا کوئی دوسرا امیدوار کھڑا ہو سکتا تھا، تو وہ صرف سعد بن عبادہ کی ذات تھی۔ ترمذی کی اس روایت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کتاب میں غالباً بعض قانونی مسائل تھے۔ سعد کے ایک صاحبزادے کے بقول گواہ کو حلف دینے کا مسئلہ اس کتاب میں موجود تھا[3]

اسی طرح جابر بن عبداللہ کی کتاب بھی مدتوں تابعی علماء کے زیر مطالعہ رہی۔ اس صحیفے کی منزلت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ قتادہ کو سورہ بقرہ اتنا عبور نہ تھا جتنا اس صحیفے پر[4] حسن بصری کے مطالعہ میں بھی یہ کتاب رہی، کہا جاتا ہے کہ ان کی روایات کا ایک ماخذ یہ صحیفہ بھی تھا[5]

---

[1] عن ابی سعید الخدری، ان النبیؐ قال لا تکتبوا عنی شیئاً الا القرآن. فمن کتب عنی شیئاً فلیمحہ القرآن

[2] عن ابی سعید الخدری، انهم استاذنوا النبی فی ان یکتبوہ عنہ فلم یاذن لهم۔

[3] قال ربیعہ واخبرنی ابن لسعد بن عبادۃ قال وجدنا فی کتاب سعد ان النبی قضی بالیمین مع الشاهد (ترمذی کتاب الاحکام ۸۹/۱)

[4] التاریخ الکبیر ۱۸۲/۴ [5] کفایہ/ ۳۵۴

عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ ہم جابر سے اکثر سنن رسول اللہ کے متعلق باتیں دریافت کرتے اور ان کو لکھ لیتے تھے[1] وہب بن منبہ نے بھی جو مشہور مصنف ہیں ان سے روایات کا مجموعہ تیار کیا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صحیفہ جابر کو خود ان کی حیات میں کئی مشہور مصنفین نے نئے نئے جنم دیئے اور اپنے پاس اس کے اقتباسات کو محفوظ کرنے کی کوشش کی۔

اس سلسلے میں عبداللہ بن مسعود کی کتاب بھی قابل ذکر ہے اور اگرچہ اس کے اصل موضوع و تفصیلات کے متعلق ہمیں کچھ نہیں معلوم لیکن یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہ بڑے عرصے تک ان کے خاندان میں محفوظ رہی، معن کہتے ہیں کہ ایک بار ان کے بیٹے عبداللہ نے جب یہ کتاب مجھے دکھائی تو قسم کھا کر کہا کہ یہ صحیفہ خود ان کے والد کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے[2]

عبداللہ بن مسعود قرآن کے بہت بڑے عالم تھے، ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب صرف قرآن پر ہو، یا اس کی تشریحات پر بہر صورت اس میں کوئی ایسا لفظ نہیں جس سے اس کتاب کے اصل موضوع کا پتہ چل سکے، ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ عبداللہ سے بہت سی روایتیں منقول ہیں اور ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کا تعلق روایات سے ہو۔

کہتے ہیں کہ سمرہ بن جندب کی کتاب بھی تابعی علماء کے لیے بڑی حد تک باعث کشش رہی یہ کتاب ان کے بیٹے سلیمان کو ورثہ میں پہونچی ابن سیرین کا بیان ہے کہ سلیمان نے اپنے والد کے حوالے سے ایک بڑی کتاب (نسخہ کبیرہ) روایت کی ہے[3] ابن سیرین کہتے ہیں کہ سمرہ نے اپنے مطالعہ کے لیے جو کتاب مرتب کی تھی، اس میں علم کثیر تھا۔

اوپر گزر چکا ہے کہ آنحضرت نے خاص خاص لوگوں کے لیے کتابت حدیث کی ممانعت کر دی تھی اور جب ان لوگوں نے دوبارہ اجازت چاہی تو بھی نہ ملی، رافع بن خدیج ان لوگوں میں ہیں جنھوں نے آنحضرت سے استمزاج کیا تو ان کو اجازت دیدی گئی اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ کام کرتے رہے، چنانچہ مروان کے زمانے میں جب یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ مدینہ حرم ہے یا نہیں تو انھوں نے خود اپنی کتاب کے حوالے سے مدینے کے حرم ہونے پر استدلال کیا اور کہا کہ تم چاہو تو میں اس کی عبارت پڑھ کر سنا دوں۔ یہ کتاب ادیم خولان پر لکھی گئی تھی[4]

متذکرہ بالا کتابوں میں غالباً سب سے اہم کتاب عبداللہ بن عمرو بن عاص کی صادقہ ہے، جس کی اہمیت شاید عہد رسالت میں بھی سب کو تسلیم تھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا نام بھی اس عہد کی یادگار ہے۔ کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جس وقت یہ لکھی جا رہی تھی تو اس کے مندرجات و مضامین سے خود عبداللہ کے دوست اور قرابت دار بھی ڈرتے تھے۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں کہ ایکبار قریش نے ان سے شکایت کی اور کہا کہ آنحضرت بہر حال بشر ہیں کبھی عام انسانوں کی طرح غصہ کی حالت میں ہوتے ہیں[6] اور کبھی عالم رضا میں، اور تم سب کچھ لکھ لیتے اس پر عبداللہ نے آنحضرت سے استمزاج کیا۔ اور آپ کی اجازت سے پھر لکھنے لگے۔ عبداللہ کا یہ استمزاج اور پھر آنحضرت کی اجازت کے متعلق بکثرت روایتیں موجود ہیں۔

اور بقول الفریڈ گیوم۔ کم سے کم تین مختلف طرق سے یہ روایتیں حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں جن میں بہت معمولی لفظی اختلافات ہیں[7]۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صادقہ کا وجود فرضی نہیں اور اس کی تصنیف خاص عہد رسالت میں ہوئی تھی۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ تابعین میں سے اکثر علماء نے اس کتاب کو بچشم خود دیکھا اور استفادہ کیا تھا۔ چنانچہ مجاہد کو بھی یہ سعادت حاصل تھی[8] یہ صحیفہ مدتوں ان کے خاندان میں محفوظ رہا اور عبداللہ کے پوتے عمر بن شعیب جب اپنے دادا سے روایت کرتے تو بطور سند کتاب ان کے ہاتھ میں ہوتی[9]۔ قیاس چاہتا ہے کہ ان کی روایات کا بڑا حصہ خود اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔

---

[1] شرح معانی الآثار للطحاوی ۲/۳۸۴ [2] تہذیب التہذیب ۱/۲۱۶ [3] جامع بیان العلم ۱/۷۰ [4] تہذیب التہذیب ۴/۳۹
[5] مسند ۲/۱۶۲ [6] عن عبداللہ بن عمرو قال قالت لی قریش تکتب عن رسول اللہ وانما رسول اللہ بشر یغضب کما یغضب البشر فاتیت رسول اللہ ...... [7] مستدرک ۱/۱۰۴ جامع بیان العلم ۱/۳۶
[8] [9] ترمذی

آخر میں انس بن مالک کی قلمی کاوشوں کا ذکر بھی ضروری ہے، اس لیے کہ انھوں نے بھی آنحضرت کے حالات بکثرت جمع کیے تھے ایک روایت مستدرک حاکم میں معبد بن ہلال سے اس طرح منقول ہے کہ جب ہم انس سے زیادہ سوالات کرنے لگتے، تو وہ ایک مجال نکال لاتے اور کہتے کہ یہ وہ باتیں ہیں جو میں نے خاص رسول اللہ سے سنی تھیں، اور ان کو لکھ لیا تھا، اور اس نوشتے کو میں نبی علیہ السلام کے سامنے پیش کر چکا ہوں۔ گویا اس تالیف کو آنحضرت کا شرف قبول بھی حاصل تھا۔

انس اگرچہ اپنی اولاد کو بھی ترغیب کتابت دیتے[2] مگر ان کی روایات بیشتر مشہور تابعی عاصم بن عمرو بن قتادہ سے مروی ہیں۔ جن کا شمار سیرۃ کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ سیرۃ کی کتابوں میں ان سے کثیر روایتیں ملتی ہیں کہ اگر ان کو علیحدہ کر دیا جائے تو واقعات سیرۃ بالکل تشنہ رہ جائیں گے۔ گمان غالب ہے کہ انس کی تصنیف عاصم کے ہمیشہ پیش نظر رہتی۔ عاصم کے علاوہ دوسرے تابعی بھی ان سے تحصیل علم کرتے چنانچہ آبان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ انس کے پاس بیٹھے الواح پر لکھا کرتے۔

مندرجہ بالا مثالوں کو پیش نظر رکھ کر یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ عہد رسالت میں بہت سے صحابہ اپنے اپنے ذوق کے مطابق آنحضرت کے حالات، اوامر، نواہی، قانونی نکات اور واقعات لکھ لیا کرتے تھے اور ان میں سے اکثر کی یادداشتیں اور کتابیں عہد تابعین تک محفوظ رہیں۔ پہلی صدی کے آخر میں جب علم حدیث و سیرۃ کی عمارت نئے انداز سے تعمیر ہونا شروع ہوئی تو اس کے آب و گل میں یہی قدیم لٹریچر استعمال کیا گیا یا بالفاظ دیگر اس لٹریچر نے نیا جنم پا کر پیغمبر اسلام کی سیرۃ اور قانون اسلام کی شکل اختیار کر لی۔ تاہم یہ دعویٰ کسی عنوان نہیں کیا جا سکتا کہ عہد رسالت کے یہ مکتوبات بہ تمام و کمال علمائے اسلام کو مل گئے تھے اور ان کا کوئی حصہ زمانے کی دستبرد کا شکار ہو کر ضایع نہیں ہوا مجھے تسلیم ہے کہ دور آخر کے صحابہ اور تابعین نے اس قیمتی لٹریچر کو محفوظ کرنے کی بھرپور کوششیں کیں، اور طرح طرح سے اسے زندہ رکھنے کے اقدامات کیے۔ لیکن مختلف تاریخی شہادتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا ایک حصہ پھر بھی ضایع ہو گیا۔

عہد رسالت کے فوراً بعد جب مصر، شام، اور عراق فتح ہوئے تو اندرون عرب کے سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں خاندان ترک سکونت کر کے وہاں آباد ہو گئے۔ ان میں مدینے کے گھرانے بھی تھے اور مکے کے بھی مہاجر بھی تھے اور انصار بھی، قدرتی طور پر یہ لپنے گھروں کی تمام ضروری اشیاء ساتھ لے گئے ہوں گے، کتابیں بھی۔ قرآن بھی، سامان کتابت بھی، اور یادداشتیں بھی۔ خاندانی سربراہ کے مرنے کی صورت میں، اور چیزیں تلف ہوں یا نہ ہوں، کتابیں ضرور ضایع ہو جاتی ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ عمر بھر کی کمائی دوسروں کے ہاتھ لگ جاتی ہے جنھیں ان کے مصنف کا نام بھی نہیں معلوم ہوتا؟

تاریخ میں ایسی شہادتیں موجود ہیں جو اسی قسم کی لاوارث کتابوں کے متعلق ہیں، میں یہاں دو کتابوں کو بطور مثال پیش کرتا ہوں ان میں سے ایک کتاب عراق میں مشہور تابعی حسن بصریؒ کو ملی تھی، جس سے انھوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ محدثین جانتے ہیں کہ حسن کی اکثر روایتیں مرسل اور بے سند ہیں کسی نے ان سے سوال کیا کہ یہ حدیثیں آپ کس طرح بیان کرتے ہیں؟ (اور ان کا اصل ماخذ کیا ہے؟) تو حسن نے جواب دیا کہ ہمیں ایک کتاب مل گئی ہے[3]

یہ صحیفہ کس کا لکھا ہوا تھا، کسی مہاجر کی تالیف تھا، یا انصاری کی؟ حسنؒ کے پاس کس طرح پہنچا؟ کس کس کے قبضے میں رہا، اوراق تاریخ میں ان باتوں کا کوئی جواب نہیں، علمائے متاخرین نے ان کی روایات کی اندرونی شہادتوں سے کچھ نتیجے نکالنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا[4]

---

[1] ...... عن معبد بن ہلال قال کنا اذا اکثرنا علی انس بن مالکؓ اخرج علینا مجالا عندہ فقال ہذہ سمعتہا وقال النبیؐ فکتبتہا وعرضتہا علیہ (مستدرک ۳/ ۵۷۴ [2] دارمی ۱/ ۶۸

[3] قال حدثنا سوادۃ بن ابی الورقاء عن اخیہ یسار، قال قیل للحسن یا ابا سعید عمن ہذہ الاحادیث النبی تحدثنا　　صحیفۃ وجدناہا، کفایہ ۳۵۴/ [4] ترمذی کتاب العلل)

حسن بصریؒ سے سیرت کی کتابوں میں بہت سی روایتیں منقول ہیں جن کے متعلق کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس صحیفے سے ماخوذ نہیں ہیں۔

دوسری کتاب تقریباً اسی عہد میں ایک مصری عالم یزید بن ابی حبیب کو ملی تھی جس کا تعلق خاص طور پر تاریخ یا یوں کہیے کہ سیرۃ سے تھا آنحضرتؐ نے ۶ھ میں کچھ سفیر بیرونی ممالک کو روانہ کیے تھے اور ان کو خطوط دیکر کچھ خاص خاص ہدایتیں فرمائی تھیں، اس کتاب میں سفیروں کے ناموں کے ساتھ ساتھ یہ ہدایتیں بھی تفصیلی طور پر درج تھیں۔

امام زہری کے زمانے میں جب تالیف سیرت کا کام زور شور سے ہو رہا تھا اور تحقیق حالات کے سلسلے میں حکومت وقت بھی ہاتھ بٹا رہی تھی تو اس قسم کے مخطوطات کا واحد مرجع صرف زہری کی ذات ہو سکتی تھی، چنانچہ یہ کتاب دمشق بھیجی گئی اور اس نزک کے ساتھ کہ ثقات سنہ کا ایک وفد بھی ساتھ تھا ؎

ظاہر ہے کہ یہ کتاب آنحضرتؐ کے کسی قریبی رفیق کار کے قلم سے نکلی ہوگی، جو واقعات کو بغائر نظر مطالعہ کر رہا تھا لیکن یہ کون تھا، کس کے ہاتھ سے یہ تحریر نکلی تھی؟ کچھ نہیں معلوم، حتیٰ کہ اس کے مکتشف یعنی یزید بن ابی حبیب المصری بھی یہ نہ بتا سکے کہ ان کے قیاس میں یہ کس کی تالیف تھی؟

اس قسم کی معلوم نہیں کتنی اور تالیفیں ہمارے ابتدائی سیرت نگاروں کے ہاتھ آئیں، اور کتنی ضایع ہو گئیں۔ کتنی کتابوں سے انھوں نے فائدہ اٹھایا اور کتنی زمانے کے گرداب میں بہہ گئیں؟ بہرصورت ان دونوں شہادتوں سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ خاص صحابہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے دفاتر مصر شام اور عراق کے گلی کوچوں اور گھروں میں مدتوں گردش کرتے رہے، اور کسی کو نہ معلوم ہو سکا کہ ان کا لکھنے والا کون تھا۔

میری رائے میں کتب سیرت کی بے شمار ایسی روایتیں جنھیں قدیم سیرت نگاروں نے بالکل بے سند بیان کیا ہے سب نہیں تو ایک قابل لحاظ حد تک انھیں گمنام مصنفین کی رہین منت ہیں۔

اور ان کے بے سند ہونے کی بنیادی وجہ غالباً ایک یہ بھی ہے کہ ابتدائی سیرت نگاروں کو ان کے اصل مصنفین کے نام نہیں مل سکے تھے۔ روایتی اسناد کا تذکرہ آ گیا ہے تو یہاں یہ بھی سمجھ لیجیے کہ یہ طریقہ تابعین اور تبع تابعین کا ایجاد ہے صحابہ کے عہد میں اس کا رواج بہت کم بلکہ شاذ و نادر نظر آتا ہے۔ چنانچہ کتب حدیث و سیرت میں، نو عمر یا جدید الاسلام صحابہ سے بے شمار ایسے واقعات کی روایتیں موجود ہیں جن میں یہ لوگ خود شریک نہ تھے۔ اور محض سن کر یا کسی کتاب میں پڑھ کر انھوں نے ان واقعات کو بلا کسی ادنیٰ نزک کے بیان کیا ہے۔

تابعین کے عہد میں بھی روایتی سند پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا تھا۔ خاص طور پر اس صورت میں جبکہ یہ روایت کسی قابل اعتماد کتاب سے ماخوذ ہوں۔ چنانچہ اکثر تابعین کی بہت سی روایتیں بے سند ملتی ہیں، مثلاً عروہ بن زبیر، زہری۔ قتادہ وغیرہ نے سیرت کے سلسلے میں جو روایتیں بیان کی ہیں اکثر بے سند ہیں، کفایہ میں حیوۃ بن شریح سے ایک روایت اس طرح منقول ہے کہ انھیں یزید بن ابی حبیب نے بتایا کہ فلاں شخص میرے پاس ایک کتاب چھوڑ گیا، یا ایسا ہی کوئی کلمہ کہا، تو میں نے اس میں اعرج کی روایتیں پائیں (حیوۃ کہتے ہیں کہ یزید نے) اس کتاب میں سے بہت سی باتیں ہمارے روبرو بیان کیں، مگر کسی کے ساتھ نہ "اخبرنا" کہا نہ حدثنا" ؎۲ (باقی آئندہ)

؎ ...... حدثنی ابن اسحٰق عن یزید بن ابی حبیب المصری انہ وجد کتابا فیہ تسمیۃ من بعث رسول اللہ الی ملوک الخاشین وما قال لاصحابہ حین بعثھم فبعث بہ الی ابن شہاب الزہری مع ثقۃ من اھل بلدہ فعرفہ تشبہ ھذہ طبری تاریخ الرسل ۱/۸۵

؎۲ ... قال حدثنا حیوۃ بن شریح عن یزید بن ابی حبیب، قال اودعنی فلان الکتاب لا یقول اخبرنا ولا حدثنا ...... کفایہ ۳/ فوجدت فیہ عن الاعرج وقال وکان یحدثنا با

بہارِ عجم کے مخطوطے پر خانِ آرزو کے حواشی

راز یزدانی (مرحوم)

تصنیف و تالیف کی دنیا بظاہر اہل قلم اور ارباب علم کی دنیا ہے۔ اگر اس دنیا میں شرفائے علم و ادب میں بھی چور بازاری اور بلیک میلنگ ہونے لگے تو اخلاق و تہذیب علم و فن کا خدا حافظ و ناصر" لیکن بعض اوقات اس دنیا میں بھی ایسی دھاندلی ہو جاتی ہے کہ توبہ۔ مجھے تو خیر کئی اردو زبان کے باباؤں اور ناخداؤں کے بہت سے ایسے واقعات معلوم ہیں کہ جن سے پردہ اٹھے تو ڈکار لیے بغیر پرایا مال ہضم کر جانے والوں کے مکروہات کا پس منظر عوام کے سامنے آ جائے لیکن جب تک چھپی باتیں چھپی رہیں تو ان سے چھیڑے بغیر گزر جانا ہی بہتر ہے۔

ایسے ہی بدقسمت مولفوں میں ایک نام ٹیک چند بہار کا ہے۔ بہار عجم کا مشہور مولف ٹیک چند بہار جس کی کتاب کو سب جانتے ہیں لیکن لائبریریوں کے علاوہ وہ ہمارے سامنے آئی تو مصطلحات بہار عجم کے نام سے رائے اندرمن کی تالیف کا روپ بدل کر۔ اندرمن بہار عجم کے مصنف کا شاگرد عزیز تھا۔ بہار عجم میں مولف نے سات بار ترمیم و تنسیخ کی اور ہر بار اس کا نیا مسودہ تیار کیا۔ ساتویں بار ترمیم و تنسیخ کے بعد مولف کا ارادہ اس ساتویں مسودے کو بھی صاف کرنے کا تھا لیکن ضعف پیری نے اس کے ارادے کا ساتھ نہیں دیا اور بستر مرگ پر وہ اپنا یہ "مسودہ ہفتمین" اور دوسری نادر کتابیں جن میں نوادر المصادر بھی شامل تھی اپنے شاگرد عزیز اندرمن کے سپرد کر گیا۔ لیکن اس شاگرد عزیز اور تلمیذ رشید نے استاد کے مال پر جس طرح ہاتھ صاف کیا اس کے نتیجے میں اب بہار عجم کا مطبوعہ نسخہ کہیں نہیں پایا جاتا لیکن "مصطلحات بہار عجم" ہر جگہ ملتی ہے۔

"مصطلحات بہار عجم" پہلی بار ۱۸۵۳ء میں دہلی سے محب العلوم پریس نے شائع کی لیکن اسی میں اندرمن پر وہ مثل صادق آئی کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑ گئے۔ ہر سیر کو سوا سیر اور ہر فرعون کو موسیٰ اس دنیا میں خود بخود مل جاتا ہے "مصطلحات بہار عجم" پر خاتمۃ الطبع لکھا منشی دھرم چند نے اور اندرمن کی پول کھول کے رکھ دی۔ کہتے ہیں:

> "بندہ درگاہِ خداوند دھرم چند ابن منشی دیپ چند خلف لالہ برج لال مرحوم دیوان مندسور۔ مضاف صوبہ مالوہ) قوم کھتری ساکن شہر کہنہ حضرت دہلی و مقیم حال شہر مبینت بہر دار الحکومت شاہ جہاں آباد حرسہا اللہ عن الآفات والفساد در باب شرح حال نسخہ متبرکہ بہار عجم۔ حسب فرمودہ جناب صد معظم صاف صاف میگوید کہ منشی ٹیک چند المتخلص بہ بہار مولف نسخہ مذکور قوم کھتری ساکن شہر نواب سعادت خاں مغفور واقع شاہ جہاں آباد بہار عجم تالیف خود را بعد حک و اصلاح ہفت بار از قلم بدست رقم خود بخط نستعلیق از سواد بہ بیاض آورد میخواست کہ بار ہشتم ہم صاف نماید مگر چون در توابش ضعف پیری راہ یافت ازاں جہت غنچہ مرادش ناشگفتہ ماند۔ رائے اندرمن قوم بیس باشندہ حصار صاحب دستور الحساب تلمیذ خاص مصنف بود و در وقت آخرین نسخہ مذکور یعنی مسودہ ہفتمین بہار عجم و نسخہ نوادر المصادر دستخطی و تالیفی او مع چند کتب دیگر بطور تبرک و یادگار از استاد خود حاصل نمود۔ چون نسخہ مرحوم بالکل مسودہ لائق صاف کردن بود مولف دستور الحساب بطور خود انتخاب مسطور گردانیدہ و دیباچہ خاتمہ آن از نام خود بران کتاب فیض انتساب برنگاشتہ و خنجر گمنامی و بے انصافی بر گردن شہرت و ناموری استاد خود راند۔ چنانچہ بعد انتخاب نسخہ مذکور در جہان مشہور گردید از ان جا کہ دیوان پر جلال صاحب بیکنٹھ باشی جد بزرگوار این ہمہ دان میدان جہل و نادانی در علم حساب و سیاق شاگرد رشید رائے اندرمن بود جناب ممدوح

اصل نسخہ مرحوم را بہ نسبت و رابطہ شاگردی و حق عوض خدمت از استاد خود یافتند و سہ بار بلا امداد و اعانت دیگر صرف بذات خود در شہر دہلی دودر مندسور) درعین کم فرصتی بسیار بکار سرکار مقابلہ و تصحیح نسخہ منتخب رائے مفخم علیہ باصل مسودہ ہفتمین منشی ٹیک چند بہار نمودہ ۔ عبارت معانی و لغات و اصطلاح و ابیات و نشترات استاد فرد گزاشت را ۔ داخل نسخہ منقول خود نمودند حرف بحرف موافق و مطابق بلکہ بہتر از نسخہ دستخطی خاص صاحب بہار عجم گردانیدہ جانِ تازہ در قالب کتاب اندا ختند و نام مردہ بہار را بعین سعی خود زندہ جاوید ساختند در شہر و دیار و قصبہ و امصار نسخہ اندرمن پیرایہ شہرت پوشیدہ بود و ایں نسخہ کہ طابق النعل[1] بالنعل نسخہ ہفتمین است بجز ایں خاندانِ عالیشان جائے دیگر نبود ...... الخ ...... کاتب الحروف مستہام بندہ دولت رام کانیتھ "

گویا یہ نسخہ مصطلحات بہار عجم " حرف بحرف نقل ہے مسودۂ ہفتمین صاحب بہار عجم کی اور اندرمن نے اپنے استاد کی گردن پر جو خنجر بے انصافی چلایا تھا اس کی ڈھال خود اندرمن کا ایک شاگرد رشید بن گیا اسے کہتے ہیں جیسے کو تیسا ۔

مصطلحات بہار عجم کا یہ نسخہ جو نسخہ ہشتمین بہار عجم کہا جا سکتا ہے دو جلدوں میں شایع ہوا ہے اس طرح کہ پہلی جلد میں ۸۱۷ صفحات اور حرف " ر " پر ختم ہوئی ہے اور دوسری جلد میں صفحات ہیں اور حرف " ی " پر ختم ہوئی ہے تاریخ طباعت ۲۷ جنوری ۱۸۵۲ء مطابق ۱۸ ربیع الثانی ۱۲۲۹ھ ہے ـــــ کتاب پر مصنف اصلی نے جو دیباچہ لکھا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ختم تحریر پر مصنف کی عمر ۳۵ سال کی تھی اور بیس سال کی محنت سے اس نے ترمیم و تنسیخ کے بعد کتاب کا ساتواں مسودہ تیار کیا تھا اس کتاب کے اتمام کی تاریخ اس نے " یادگار رفیق حقیر بہار " سے نکالی ہے جس کے اعداد ۱۱۵۲ ہوتے ہیں ۔ اس موقع پر ڈاکٹر ریو اور ڈاکٹر اینتھے کی ایک غلطی کی طرف اشارہ کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جس کی نشاندہی عبدالمقتدر صاحب کیٹلاگر کتابخانہ بانکی پور نے بھی کی ہے ۔

کتاب خانہ برٹش میوزیم اور باڈلین لائبریری میں بہار عجم کے جو مخطوطے پائے جاتے ہیں ان میں " یادگار رفیق حقیر بہار مادہ سالِ تاریخ اتمام است " کے فقرے میں لفظ " مادہ " پر غلطی سے دو لفظوں کا اضافہ ہو گیا ہے اور کیٹلاگر صاحبان نے اس عبارت کو اس طرح پڑھا ہے کہ یادگار رفیق حقیر بہار نادہ سال ۔ تاریخ اتمام است ۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ یادگار رفیق حقیر بہار کے اعداد میں دس سال اور بڑھائے جائیں تو اصل کتاب کا صحیح سن تالیف حاصل ہو یعنی ۱۱۵۲ کی جگہ نادہ سال کی شرط پوری کر کے ۱۱۶۲ھ کو کتاب کی تالیف کے اتمام کی سال سمجھنا چاہیے ۔ لیکن آج چونکہ مصطلحات بہار عجم شایع ہو چکی ہے اور دیباچہ میں نادہ سال نہیں بلکہ " یادگار رفیق حقیر بہار مادہ سال تاریخ اتمام است " کے الفاظ واضح طور پر موجود ہیں اس لیے اب اس مغالطے کا کوئی امکان نہیں میرا اپنا قیاس یہ ہے کہ مادہ پر تشدید کی موجودگی کو ان کیٹلاگرس نے حرف تا کے نقطے سمجھ لیا ہوگا اور " مادہ تاریخ سال اتمام است " کی عبارت " تادہ تاریخ سال اتمام است " پڑھی گئی ہوگی ۔

ٹیک چند بہار کا ذکر اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ کہیں نہیں ملتا ۔ ہونے کو یہ نام میر کے نکات الشعرا مرتبہ ۱۱۶۵ھ ۔ سید فتح علی الرضوی المعروف بہ گردیزی کے تذکرہ ریختہ گویان مرتبہ ۱۱۶۶ھ قائم کے تذکرہ مخزن نکات مرتبہ ۱۱۶۸ھ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کے تذکرہ چمنستان شعرا مرتبہ ۱۱۸۵ھ گلزار ابراہیم مرتبہ ۱۱۹۸ھ اور مصحفی کے تذکرہ ہندی گویان مرتبہ ۱۲۰۹ھ میں بھی پایا جاتا ہے ۔ ان تذکروں میں نکات الشعرا، تذکرہ ریختہ گویان اور مخزن نکات سے علی العموم اور گردیزی سے علی الخصوص بڑی مایوسی ہوتی ہے ۔

میر اور قائم تو خیر نہ پورے واقعات بیان کرنے کا دعوی کرتے ہیں نہ اپنی حسب مطلب باتوں کے علاوہ کسی کے متعلق ضروری تفصیل میں جاتے ہیں غیر ضروری کا تذکرہ ہی کیا اور میر نے تو بعض اوقات اپنے جذبات کی رو میں غیر ضروری اور بے جا تفصیل سے داستان سرائی اور یاوہ گوئی تک سے دریغ نہیں کیا واضح رہے کہ یاوہ گوئی سے راقم الحروف کا مقصد یہ ہے کہ ایک تذکرہ کی دیانت تحریر کے لیے جو حدود مقرر کیے جا سکتے ہیں ان کی خلاف ورزی کی جائے لیکن گردیزی کے تذکرے سے شکایت کی وجہ بڑی معقول ہے کیونکہ وہ اپنے تذکرے کے دیباچہ میں اس تذکرہ کا سبب تحریر یہی یہ بیان کرتا ہے کہ حالات شعرا میں کمی اور خامی دیکھ کر اسے قلم اٹھانے کی ہمت ہوئی ۔ یہ دیکھ کر توقع بندھتی ہے کہ گردیزی کے تذکرے میں ضروری معلومات کا اضافہ ملے گا مگر ہماری مایوسی کی کوئی حد نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ گردیزی

---

[1] طابق النعل بالنعل ۔ (جس طرح ایک جوتی دوسری [illegible] کی جائے ۔ یعنی نقل مطابق اصل ۔ (راز)

نے بھی اس عہد کی مروجہ ڈگر سے ہٹ کر کسی شاعر کے متعلق کہیں ایسی معلومات فراہم کرنے کی کوشش نہیں کی جو اس کے لیے آسان تھیں اور آنے والوں کے لیے بے حد قیمتی۔

بہار کے سلسلے میں ہی اس کی تفصیل سن لیجئے۔ نکات الشعراء صفحہ ۱۳۳ پر تحریر فرماتے ہیں کہ "با فقیر ہم آشنا است" لیکن اس "ہم آشنا است" کا مرتبہ عالیہ عطا کرنے کے باوجود میر نے نہ لیتے اس "آشنا" کی عمر لکھی نہ اس کا سن پیدائش نہ حسب و نسب نہ وطن۔ گویا ساتھ کھا کے ذات پوچھنے کی کیا ضرورت تھی بس صیغۂ "آشنائی" کا اظہار کافی تھا۔ گردیزی کا معاملہ اس سے زیادہ گرفت کے لائق ہے کیوں کہ وہ لکھتا ہے (صفحہ ۲۱) "ٹیک چند بہار بفقیر اخلاص می دارد واکثر ملاقات می نماید" خلوص ملاقات کا یہ تذکرہ گردیزی کو بہار کے کمالات کے ذکر پر مجبور کر دیتا ہے یہاں تک کہ "در تحقیق لغت ہائے فارسی و موقع استعمال آن کتاب ضخیم مسمی بہ "بہار عجم" تالیف نمودہ" پھر کہتا ہے کہ ایسا باکمال شخص بہت کم نظر سے گزرا ہے "بایں کمال کم بنظر درآمد" لیکن اس کے بعد وہ اپنے "ملاقاتی" اور "یار باخلاص" کے متعلق سال پیدائش، موجودہ عمر، اور حسب و نسب یہ تمام باتیں گول کر جاتا ہے جیسے ان باتوں کا بتانا اپنے "یار باخلاص" کی "بارگاہ مودت پناہ" میں جرم کرنے کے مترادف ہو معلوم ہوتا ہے کہ قائم کے تذکرے مخزن نکات کی تحریر یا تکمیل تک یعنی ۱۱۶۸ھ سے پہلے بہار کا انتقال ہو چکا تھا۔ کیوں کہ مخزن نکات صفحہ ۲۵ پر اس نے لکھا ہے کہ "از زرگر بود" لیکن صحیح تاریخ انتقال قائم نے لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی حالانکہ صحیح تاریخ کا معلوم کرنا اس کے لیے دشوار نہ تھا کیونکہ ۱۱۶۶ھ تک تو بہار زندہ ہی تھے ان ہی درمیانی دو سالوں کے اندر اندر ان کا انتقال ہوا ہوگا اور دو سال کے اندر اندر کی بات صحیح طور پر معلوم کر لینا کیا دشوار ہے۔ لیکن کسی "زرگر" کے لیے اتنی زحمت اٹھانے کی کیا ضرورت جبکہ وہ اچھے اچھے سب تراد ول کے لیے بھی اتنی زحمت نہیں اٹھاتا۔ اور پھر لطف یہ کہ "یہ زرگر پسر" کی بات بھی سنی سنائی اور کسی یار دوست کی ہوائی معلوم ہوتی ہے کیوں کہ بعد کی اطلاع ہے "گلزار ابراہیم" اور تواتر کے ساتھ کہ ٹیک چند بہار کھتری تھے۔

غرض بہار کے خود نوشت حالات (جس قدر بھی ممکن ہیں) کتاب کے خاتمۃ الطبع۔ اور دیگر تذکروں سے آج جو اندازہ کیا جا سکتا ہے وہ ان حدود سے آگے نہیں بڑھتا۔ کہ بہار تھے تو ضرور۔ انھوں نے کئی کتابیں بھی لکھیں اور کئی کتابیں ان کی پائی جاتی ہیں اس لیے شکسپیئر کی طرح بہار کوئی ایسی ہستی موہوم نہیں ہو سکتے جس کے ہونے میں شبہ کیا جائے ذات کے لحاظ سے وہ کھتری تھے اور دہلی مرحوم کو ان کے وطن ہونے کا شرف حاصل تھا۔ بہار عجم پر انھوں نے بیس سال صرف کیے۔ سات بار اس کتاب کے مسودہ پر کاٹ چھانٹ اور قطع و برید کرتے رہے جسے مصنفین اور مؤلفین کی اصطلاح میں ترمیم و تنسیخ اور اضافے کہتے ہیں۔ آٹھویں بار وہ ضعف پیری کی بنا پر مسودہ کتاب کو صاف نہ کر سکے اور مسودہ ہفتمین اور دوسری دستخطی تالیفات کو بطور یادگار کے اپنے شاگرد آنند من کے سپرد کر گئے۔ اور یہی مسودہ ہفتمین آج "مصطلحات بہار عجم" کے نام سے "ہو بہو" ہمارے سامنے موجود ہے۔ پہلا نوادر المصادر ۱۲۷۲ھ میں دہلی سے اور جواہر الحروف ۱۲۲۸ھ میں کانپور سے شایع ہو چکی ہیں۔ امید سنگھ نے گلزار ابراہیم کے حوالے سے ان کے سفر ایران کے بارے میں بھی لکھا ہے ممکن ہے کہ بہار نے ایران کا یہ سفر بہار عجم میں ترمیم اور اضافوں کی غرض سے کیا ہو اگر اس حقیقت سے پردہ اٹھ جاتا تو کتاب اور وقیع ہو جاتی فی الحال تو صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ بہار عجم کے ماخذوں میں حزیں کا کلام۔ سراج اللغت۔ ملحقات برہان قاطع اور ابوالحسن فراہانی کی شرح قصائد انوری ہیں۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ہمارا "غریب شہر" اپنے "سخنہائے گفتنی" میں بہار کی فارسی دانی کا معترف نہیں کیونکہ جو شخص حزیں کا معترف ہو اور برہان قاطع پر "قاطع برہان" لکھے وہ "خان آرزو" اور "بہار عجم" کو کب خاطر میں لائے گا۔ چنانچہ "جہان غالب" (معاصر حصہ نمبر ۱) میں قاضی عبدالودود صاحب نے لکھا ہے:

> "آرزو (۱۰۹۹ تا ۱۱۶۶ھ) خان آرزو ہندوستان کے مشہور فارسی دان اور شاعر تھے۔ حزیں سے ان سے نہیں بنی لیکن امید دو الہ و غیرہ ایرانی جوان کے زمانے میں وارد ہند ہوئے تھے۔ ان کے قدر شناس تھے۔ غالب نے ایک خط میں جہاں ہندوستانی فارسی گویوں کی نسبت کسی قدر تفصیل کے ساتھ رائے ظاہر کی ہے خسرو اور فیضی کے بعد لکھتے ہیں ۔۔۔ یہ سپاہی نالہ (کذا) آرزو فتیل اور شیدا اور بہار وغیرہم انھیں میں گئے ناصر علی اور بیدل اور غنیمت ان کی فارسی کیا منت اور رنگین ۔۔۔ الف اور فتیل۔ یہ تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجیے ۔۔۔ ۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔ وارستہ سیالکوٹی نے خان آرزو کی تحقیق پر سو جگہ اعتراض کیا ہے اور ہر اعتراض بجا ہے

(عود ہندی صفحہ ۱۴۳) " وارستہ نے اپنی مصطلحات میں (اور اس کا ثبوت موجود نہیں کہ وارستہ کی کوئی اور کتاب غالب کی نظر سے گزری تھی) آرزو کو کہیں سراج المحققین صفحہ ۲۹۵ اور کہیں سراج المدققین صفحہ ۲۲۲ لکھا ہے اور ان کے اشعار کی سند دینے میں تامل نہیں کیا صفحات ۲۵ و ۶۵ وغیرہ آرزو پر وارستہ کے جو اعتراضات ہیں ان کی تعداد پانچ سے زیادہ نہیں صفحات ۱۲۱ و ۹۵ و ۲۳۵ و ۲۹۵ و ۳۹۷ ــــ آرزو نے ہزاروں الفاظ سے بحث کی ہے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ وارستہ کے کل اعتراض بجا ہیں جب بھی ان کا مرتبہ کم نہیں ہوتا ہاں اغلاط بہت زیادہ نکلیں تو اور بات ہے غالب نے ایک خط میں ایک محاورے کی بحث میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب تک کلام اہل زبان میں نہ دیکھ لیں " جائز نہ جانئے مگر کلام سعدی و نظامی و حزیں اور ان کے امثال و نظائر کا معتمد علیہ ہے نہ آرزو اور واقف اور قتیل وغیرہم کا) عود ہندی صفحہ ۱۳۲ ــــ قاطع برہان میں غالب نے ایک حکایت بھی لکھی ہے کہ برسات کی اندھیری رات تھی ۔ مینہ برس رہا تھا ہوا تیز چل رہی تھی کہ آرزو نے ایک مصرعہ کہا " کشاں حزن کا ہکدو بیا کہ (حقا کہ اگر گویند کہ ایں زمزمہ از فغانیست یا از نظیری کسے است کہ باور نہ کند ۶) اور پیش مصرعہ یہ سوجھا تندو پر شور و سیہ مست نہ کہسار آمد اسی وقت مرزا مظہر کے پاس گئے مطلع سنایا اور داد لی ۔ مطلع شہر میں شہور ہوا اور ایک سوداگر نے جو شیراز سے تازہ آیا تھا اسے سنا ۔ آرزو ایک مطلع سنانے لگے پہلا مصرعہ ان کی زبان سے نکلا تھا کہ سوداگر خوب ہنسا اور کہا کہ میں جانتا ہوں کہ آپ دوسرے مصرعہ میں کیا کہیں گے ۔ آرزو کو ناگوار ہوا بولے بتلایئے میں کیا کہوں گا جواب دیا " خواہی گفت کہ خرمن آمد " آرزو نے زہر خند کیا اور اپنا مصرعہ پڑھا ۔ سوداگر نے دوسرے مصرعہ کی تعریف کی اور پہلے کے بارے میں کہا کہ اگر یوں ہوتا تو بہتر تھا ــــ "قطرہ افشاں بسوے شہر ز کہسار آمد ۔ غالب اپنی رائے دیتے ہیں با آنکہ میرزائے شیرازی سخنور و بلطف طبع با میرم کہ تندی و پر سوزی و سیہ مستی کہ میان ابر و خرمن اشتر کے است نہ پسندید و مصرعے مدنہ از مصرعۂ استاد و لغز تر و مستروبدیہہ گفت " صاحب موید برہان کے اس خیال سے مجھے (قاضی صاحب کو) اتفاق ہے کہ آرزو کا مصرعہ بمراتب بہتر ہے اور اعتراض لغو انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ یہ حکایت اختراعی ہے ۔ غالب نے تیغ تیز میں اس کا جواب نہیں دیا قاطع برہان کے علاوہ یہ حکایت اور کہیں نہیں ملتی اور اس میں شک نہیں کہ بالکل بے بنیاد ہے ۔ معاصر نمبر ا صفحہ ۵۲ و ۱۵۲)

حزیں کے ساتھ جو سلوک آرزو و بہار و وارستہ نے کیا تھا غالب اس کے متعلق اپنی اسی کتاب میں رقمطراز ہیں حاشا کہ بعد از صائب و کلیم چوں حزیں دیگرے از خاک پاک ایران برخاستہ باشد می بایست مقدم او گرامی داشتن و سخنش بر ورق دل نگاشتن خواہش تعلق پارسی ازو سے فرا می گرفتند ز نگار شک آئینہ دانش بقولہ ارشاد وے می زدودند ..... (معاصر نمبر ا صفحہ ۱۵۴)

ظاہر ہے کہ ان خیالات کے ہوتے ہوئے اور حزیں کو اتنا بلند مرتبہ سمجھتے ہوئے غالب کے خیالات آرزو کے متعلق کیا ہوں گے بہرحال وہ بہار کی لغت دانی میں شک رکھتے ہیں اور اس شک کی تفصیل تو آگے آئے گی لیکن اس موقع پر ہم کو خود بہار سے بھی ایک شکایت ہے اور شکایت پرانے دیباچہ لکھنے والوں میں عام ہے اس لئے نہ صرف بہار سے بلکہ اس عہد کے تمام مصنفوں سے یہ شکایت ہوسکتی ہے شکایت یہ ہے کہ دیباچہ میں جہاں تک حمد و نعت کا تعلق رہتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ کا دریائے زخار ہے جو ایک بحر ناپیدا کنار کی طرح مصنف یا مؤلف کے قلم سے اُمڈا چلا آتا ہے لیکن جہاں سے حمد و نعت ختم ہوتی ہے اور " می گوید فقیر حقیر ہیچ مدان کہ ہیچ بیاں محرر ایں داستاں " کی منزل شروع ہوتی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے یہاں تک مولف یا مصنف نے جس قلم سے لکھا تھا اس کا قلمدان بھولے سے کھلے آسمان کے نیچے کھلا ہوا رکھا رہ گیا اور رات بھر قلمدان میں رکھے ہوئے قلموں پر اوس پڑتی رہی ۔ نتیجہ ظاہر ہے صبح کی پہلی کرن کے ساتھ مصنف یا مولف دوبارہ لکھنے بیٹھا تو قلمدان کے سب قلم " شبنم زدہ " ہو چکے تھے ان ٹھٹھرے ہوئے قلموں کے ہوش خود ہی بجا نہ تھے کوئی ڈھنگ کی بات مصنف یا مؤلف کے بارے میں کیا لکھتے ۔ اظہار خاکساری اور ناظرین سے استدعائے عیب پوشی کے سوا ان قلموں سے اور نکلتا بھی کیا بہار نے خیر پھر بھی سبب تالیف لکھتے ہوئے اتنا بتا دیا کہ لوگ دوسروں کے نوشتوں کو دیکھ کر کہدیتے ہیں کہ :-

"این ترکیب درست نیست و این عبارت خلاف محاورہ است و این لفظ بایں معنی مستعمل نشدہ"

اٹھائے ہیں اور اس قسم کے دوسرے اعتراضات سن کر بہار کو ایک ایسی کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا جو ان سب باتوں کے سمجھنے میں آسانی پیدا کرے۔ لیکن بہار کون تھے۔ وہ کب پیدا ہوئے۔ ان کا مبلغ علم کیا تھا اور کب ان کا انتقال ہوا۔ آج ہم ان سوالوں کا جواب بیان کردہ حالات کی روشنی میں اندازوں سے ہی دے سکتے ہیں' سنیے:

۱۱۵۲ھ یعنی تکملہ بہار عجم کے وقت مولف کی عمر خود اس کے بیان کے مطابق ۵۳ سال کی تھی اس لیے یقین ہے کہ وہ ۱۰۹۹ھ میں پیدا ہوئے اور یہی آرزو کی پیدائش کا سال ہے۔ گو بہار اور وہ ایک ہی سال کی پیدائش ہیں۔ اس کے بعد میر اور گردیزی کی شہادت ہے کہ با فقیر ہم آشنا است اکثر با ملاقات می پرداز" اس کے معنی ہیں کہ ۱۱۶۶ھ تک وہ زندہ تھے اس کے بعد قائم ۱۱۶۹ھ میں کہتا ہے کہ "درگذشت" اس کے یہ معنی ہیں کہ ۱۱۶۹ھ میں بہار کا انتقال ہو چکا تھا۔ اگر اس انتقال کو دو چار مہینے گذرے ہوتے اور قائم کے مخزن نکات لکھتے وقت بات تازہ ہوتی تو وہ ضرور ذکر کر دیتا۔ ان تمام اندازوں سے میرا قیاس ہے کہ ہم آسانی سے ۱۱۶۸ھ کو ان کے انتقال کے لیے موزوں سمجھ سکتے ہیں۔

یہ بات کہ اتنی ضخیم کتاب میں لغات کی تشریح اور ان کے بیان میں انھوں نے حتی الوسع عربی الفاظ سے گریز کی اس بات کی ضمانت ہے کہ ان میں کتب اولہ اور علوم مروجہ پر کافی عبور حاصل تھا۔ بہار کی کتابیں نوادر المصادر ۱۲۷۲ھ میں اور جواہر الحروف ۱۲۶۰ھ میں کان پور سے شائع ہو چکی ہیں مگر شاید ان کی موجودگی کا کھوج" ہے ستون" کو کاٹنے سے کم نہیں۔ اشپرنگر نے یہ بھی لکھا ہے کہ بہار کا انتقال گلزار ابراہیم کی تالیف سے پہلے ہو چکا تھا اور گلزار کی تالیف ۱۱۹۸ھ کی بات ہے ظاہر ہے کہ ۱۱۹۸ھ اور ۱۱۶۷ھ میں ۳۱ برس کا فرق ہے۔

کتاب خانہ لہ بانکی پور میں نوادر المصادر کا قلمی نسخہ موجود ہے۔

کتاب خانہ رام پور میں بہار عجم کے مخطوطے کی دوسری جلد موجود ہے۔ مخطوطے کا جو نسخہ کتاب خانہ رام پور میں ہے اسے میں دوسری جلد اس لحاظ سے کہتا ہوں کہ مطبوعہ جلدوں کی تقسیم اس مخطوطے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں سوائے اس کے کہ مخطوطے کے پہلے صفحہ پر "حرف ر" کے بھی دو چار لفظ آگئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ٹیک چند بہار نے کتاب کی ضخیم دیکھ کر دو جلدوں میں تقسیم کیا تھا اور تقسیم یہی رکھی تھی کہ حرف "د" تک پہلی جلد اس کے بعد دوسری جلد مگر اس تقسیم کی پابندی صحیح صحیح نہ ہو سکی اور مخطوطے کی دوسری جلد میں "حرف ر" کے بھی کئی لفظ آگئے۔

میں سالق میں کسی جگہ لکھ آیا ہوں کہ غالب بہار سے آزردہ معلوم ہوتے ہیں یہ آزردگی درحقیقت ایک اصولی اختلاف سے پیدا ہوئی ہے جو غالب اور خان آرزو اور ان کے متبعین میں پایا جاتا ہے خان آرزو اور ان کے متبعین کا عقیدہ یہ تھا کہ ہر وہ شخص جو فارسی کو جاننے کی حد تک جانتا ہے اس زبان میں اہل زبان کی طرح مساوی حق رکھتا ہے اور غالب کا عقیدہ یہ تھا کہ ہر لفظ ایرانی فصحا کے یہاں جو معنے رکھتا ہے اس معنے کے علاوہ دوسرے معنی میں اسے لینا اور اس کے استعمال کی اجازت دینا غلط ہے۔ اس عقیدے کی غالب نے جس شد و مد سے پیروی کی ہے وہ برہان قاطع پر قاطع برہان لکھنے اور اس کے مضامین سے ظاہر ہے ہر چند غالب نے اپنے خطوط میں کھل کر تو بہار کا نام ایک جگہ کے علاوہ کہیں نہیں لیا۔ مگر صاحب غیاث اللغات کو کھل کر کہتے ہیں اور کئی جگہ (ملاحظہ ہو ادبی خطوط غالب) لیکن ٹیک چند بہار کا نام انھوں نے خلد آشیاں نواب کلب علی خاں خلف الرشید فردوس مکان نواب یوسف علی خاں کے نام ایک خط میں لیا ہے فرماتے ہیں:-

"میاں نجو جامع فرہنگ۔ جہانگیری۔ شیخ رشید راقم فرہنگ رشیدی علمائے عجم میں سے نہیں ہندی ہیں ان کا مولد ماخذ ان کا اشعار قدما۔ ہادی ان کا قیاس۔ ٹیک چند اور سیالکوٹی مل ان کے پیرو۔ سبحان اللہ۔ ہندی بھی اور ہندو بھی۔

فقیر اشعار قدما کا معتقد اُن لوگوں کے کلام کا عاشق مگر جو لغات ان کے کلام میں ان کے معنی تو اہل ہند نے اپنے قیاس سے نکالے ہیں' میں ان کے قیاس پر کیوں کر تکیہ کروں" (مکاتیب غالب صفحہ ۶۱)

ظاہر ہے کہ آج کے علمائے لسانیات کے نزدیک یہ نظریہ تنگ دلانہ ہے بہر حال اس نظریہ کی بنا پر غالب ہمارے ٹیک چند سے ناراض نظر آتے ہیں۔ بہار کے مخطوطے پر میرے بزرگ محترم مولانا عرشی نے جو شناختی کارڈ لکھا ہے اس سے بھی اور اس مخطوطے پر جو حاشیے ہیں بیشتر ان سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حاشیے

خان آرزو کے تحریر کردہ ہیں۔ کیوں کہ ان میں کئی جگہ جیسا آپ دیکھیں گے، حاشیہ فقیر آرزو ہی کو بیت سے شروع ہوتا ہے لیکن مصطلحات بہارِ عجم کے شنائی کارڈ پر محترم موصوف ہمیں ایک دوسری بات بتاتے ہیں:

"آغا محمد حسین صاحب کشمیری کے پاس بہارِ عجم کے اصل نسخہ کی دوسری جلد محفوظ ہے۔ اس میں جا بجا حواشی بھی پائے جاتے ہیں۔ میں نے بجز ایک دو کے سب کے سب اپنے نسخہ میں اپنے مواقع پر نقل کر دیئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیشتر خان آرزو کے نوٹ ہیں جو انہوں نے بہار کے مسودے پر لکھے تھے۔ آغا صاحب کے نسخے کے کاتب نے انہیں، جوں کا توں نقل کر لیا۔ ہمارے موجودہ نسخوں میں ان کے حواشی کے پیش نظر ترمیم و تغیر نظر آتا ہے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ بہار نے خان آرزو کے اکثر اعتراضوں کو قبول کر لیا ہے۔"

(امتیاز علی عرشی ناظم کتاب خانہ یکم اگست ۱۹۶۱ء)

میرے سامنے اس وقت بہارِ عجم کے مخطوطے کی وہ جلد ہے جسے میں بوجوہ بالا دوسری جلد کہتا ہوں) اور مصطلحات بہارِ عجم مطبوعہ کی دوسری جلد بھی۔ میں حرف ز سے ابتدا کر رہا ہوں۔ میں اس مخطوطے پر خان آرزو کے حواشی کا مطبوعہ نسخے سے مقابلہ کرکے یہ بھی بتاتا جاؤں گا کہ ٹیک چند بہار نے کس کس اعتراض کو قبول کرکے متن میں داخل کر دیا ہے۔ یا درصورت قبول کیا تغیر و تبدل کیا۔ (باقی آئندہ)

خُدا

ایک لسانی تحقیقی جائزہ

سیّد قدرت نقوی

کائنات کا نظام حرکت پر قائم ہے۔ اسی لیے ذرّہ ذرّہ محوِ گردش ہے۔ اسی گردش کے نتیجہ میں چیزیں عدم سے وجود میں آتی، اور وجود سے عدم کی راہ اختیار کرتی ہیں۔ وجود سے عدم تک کا فاصلہ طے کرنے میں یہ اشیاء عروج و زوال کے مراحل طے کرتی رہتی ہیں۔ ان ہی عمل تہذیب و تزئین ہوتا رہتا ہے۔ عمل تعلیم سے تہذیب و ارتقا اور عمل تقلید سے وسعتِ اثر و رواج عامہ کی منازل طے ہوتی رہتی ہیں ایک چیز کسی مقام پر وجود پاتی ہے عمل تعلیم و تقلید سے منازل ارتقاء کہیں اور طے کرتی ہے اور اثر و رواج کا حلقہ کہیں اور قائم ہوتا ہے۔ یہ فطرت کا فیضان عام ہے۔

نسل انسانی کی تاریخ ارتقا سے پتہ چلتا ہے کہ مدنیت کا رجحان طبعی، ارتقا کا سبب حقیقی ہے۔ ورنہ یہ بھی حیوانات ارضی کی مانند ہی رہتا۔ مدنیت کا رجحان حیات انسانی کی بدلتی ہوئی اقدار کے سبب پیدا ہوا۔ موسم کے تغیرات سے پناہ لینے کے لیے، دھوپ کی تپش، بارش کے سیل، ہواؤں کے جھکڑوں سے بچاؤ کے لیے مکانات کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا۔ انسان کی ابتدائی تعلیم گاہ فطرت تھی۔ درختوں، جانوروں، پرندوں کے ذریعہ بہت سی باتیں حاصل ہوئیں مدنیت کے ابتدائی تصور میں جانوروں کے اعمال کا مطالعہ و مشاہدہ راہنما بنا۔ انسان کا اپنا تجربہ بھی ارتقا میں ممد و معاون بنتا گیا۔ مدنیت کے اصول رسم و رواج، حرکت و عمل کے نتائج زوال و ارتقا کے شکار ہوتے رہے۔ اور آج ہم ترقی کی موجودہ منزل پر اسلاف کے تجربوں اور کوششوں ہی کی بدولت پہنچے ہیں۔ ہماری حیات بھی حرکت پر مبنی ہے۔ اس لیے ہماری حیات کی اقدار بھی متحرک، متغیر، متبدل اور نمو پذیر ہیں۔ ترقی و تنزلی کے اسباب حقیقی بھی یہی ہیں۔ اگر اقدار حیات میں سے کوئی قدر ان مراحل سے دوچار نہیں تو وہ خود بخود اپنا وجود ختم کر کے آغوشِ عدم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے روپوش ہو جاتی ہے۔

مدنیت نے انسانی تقسیم کار کی بدولت طبقات پیدا کیے اور ضروریات حیات نے گروہ و قبائل بنائے۔ یہ گروہ تلاش معاش میں ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف کوچ کرنے پر مجبور رہے۔ ان مراحل حیات میں تجربوں سے دوچار ہونا پڑا۔ ان تجربات کے اظہار کے لیے ذرائع تلاش کرنے پڑے، اس طرح نئے نئے الفاظ وجود میں آنے لگے ساتھ ضروریات و نتائج تجربات کے اظہار کے لیے جو الفاظ تھے وہ رفتہ رفتہ ذہنِ انسانی سے یا تو ختم ہوتے چلے گئے یا نیا مفہوم اختیار کر کے مروج رہے۔ جیسے "خلیفہ" ابتدا میں جانشین رسول اکرم کے لیے استعمال ہوا۔ پھر اسلام کی مرکزی سلطنت کے حکمراں کے لیے استعمال ہونے لگا، اور بادشاہ شہنشاہ کا مترادف قرار پایا۔ یہ اس کا نقطۂ عروج تھا۔ زوال کا زمانہ آیا تو ابتدا میں استاد یا پیر کے نائب و جانشین کے لیے استعمال ہوتے ہوتے مطلق استاد کے معنی میں رائج ہو گیا۔ یہاں تک عزت، وقار، احترام کا کوئی نہ کوئی پہلو باقی رہا آخری منزل میں پہنچا تو کسی زندہ پیر کے کارندے، محصل اور کسی پیر کے مقبرہ کے مجاور کو خلیفہ کہا جانے لگا اور اسی کے ساتھ ساتھ حجام بھی خلیفہ کے لقب سے ملقب ہوئے اب ہر نائی خلیفہ بن گیا۔ حضرت ابوبکر کی اولاد میں سے جن کا سلسلۂ نسب حضرت محمد ابن ابی بکر سے شروع ہوتا ہے ان میں سے بعض افراد اپنے نام کے ساتھ بھی لفظ "خلیفہ" لکھتے اور کہلواتے ہیں۔ یہ اس کی نوعیت بالکل "قاضی" کی مانند ہے۔ یہ خاندانی نام ہے، صفاتی حیثیت سے نہیں ہے۔ اس لفظ کی آخری حیثیت کہ کارندہ، محصل مجاور اور حجام کے لیے استعمال ہوتا ہے ابھی تک باقی ہے لیکن یہ بھی رو بہ زوال ہے اور مستقبل قریب میں ان طبقوں سے بھی معدوم ہو جائے گا۔ اور صرف تاریخ تک محدود ہو کر رہ جائے گا یا اگر احیا ہوا تو مفہوم نئے کر رائج ہوگا یہ اس کی حیات کا نیا دور ہوگا۔ یہ لفظ لغوی حیثیت کے علاوہ ان معنوی ادوار سے گزرا ہے۔ (۱) جانشین رسولؐ (۲) بادشاہ، شہنشاہ (۳) جانشین پیر و استاد (۴ استاد) (۵) پیر کا محصل کارندہ۔ مقبرہ کا مجاور اور حجام۔ اس آخری

دور کے آثار کہیں کہیں باقی ہیں۔

اس لفظ کی منازل عروج و زوال سے معلوم ہوا کہ الفاظ تغیر کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ ان تغیری مراحل میں معنوی حیثیت کے علاوہ صوری ہیئت بھی تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ بعض کی املائی اور ہجائی شکل ایسی بدل جاتی ہے کہ اپنی اصل سے اسے کوئی مناسبت ہی نہیں رہتی۔ بعض کے تبدل کی درمیانی اشکال باقی رہ جاتی ہیں اور بعض کی بالکل نابود ہو جاتی ہیں مثلاً "بہرام" (نام بادشاہ ایران) اصل میں "ورترغن" تھا یہ نام قدیم ایرانیوں میں بارش کے دیوتا کا نام تھا جو اپنے نیزے سے بادلوں کو ہنکاتا اور بارش کرتا ہے۔ سنسکرت میں اس کا نام "ورترہان" تھا فارسی میں ورترغن کی ثقالت دور ہو کر "ورہران" بنا اور ساسانیوں کے زمانے میں "وہران" پھر "ویرام" بن کر بہرام کی شکل میں مروج ہوا اور اب تک ہے۔ لفظ خدا بھی اسی طرح تغیر و تبدل عروج و ارتقا کا شکار ہوا ہے۔ اس کے متعلق ذرا تفصیلی گفتگو مقصود ہے۔

خدا: یہ لفظ تقریباً آٹھ ہزار سال سے زبان زد خاص و عام ہے۔ حسب ذیل معنی میں سب متفق ہیں: (۱) اللہ، ذات واجب الوجود (۲) مالک، آقا، صاحب، حاکم، بادشاہ۔ یہ لفظ بحالت مفرد بجز ذات باری تعالیٰ اور کسی کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔ بحالت مرکب کسی اسم کے ساتھ بحالت مضاف معنی ۲ میں استعمال ہوتا ہے جیسے کدخدا، ناخدا وغیرہ۔

جن لغت نویس نے ان معنی اور تشریح سے آگے قدم بڑھایا اس نے ٹھوکر کھائی۔ یعنی اس مفرد لفظ کو مرکب ٹھہرانے اور اجزائے ترکیبی کی تلاش میں ان حضرات کے قیاس نے لغزش کی ہے اس دور حاضر سے پہلے کے تمام قدیم لغات نویس اور ان کے متبعین نے اس لفظ کو مرکب قرار دیا کہ یہ لفظ خدا مرکب ہے۔ خود + آ (امر از آمدن) سے جس کے معنی ہیں خود آنے والا۔ صاحب غیاث اللغات نے اس ترکیب کو بحوالہ خان آرزو صاحب سراج اللغات، علامہ دوانی اور علامہ فخر الدین رازی سے منسوب کیا ہے۔ صاحب فرہنگ نظام نے صاف صاف تو مرکب نہیں لکھا لیکن ان کے بیان سے مرکب ہونا مترشح ہے وہ لکھتے ہیں:

"در عصر اوستائی ذات واجب الوجود را لبذ (ب ۔ ۹ ۔) و آہورہ (۔ ۱ ۔) مزدہ (6 ۔ ۹ ۹ ۔) میگفتند و در عصر ساسانی آہورمزدہ و خدای (خوتای) (۔ ۴ ۔) و در فارسی اسلامی علاوہ بر الٰہ عربی خدای پہلوی ہم استعمال شد۔ ریشۂ لفظ خدا در اوستائی (۳ ۔ ۳ ۔) است بمعنی بخودی خود (واجب الوجود) کہ مخلوق دیگری نیست و در سنسکریت سوتہ ([illegible]) بہمان معنی است سو ([illegible]) کہ یک حرف مرکب در سنسکریت است در استاد فارسی بہ حرف خ تبدیل شود" (فرہنگ نظام ج ۲ صفحہ ۵۴۸)

ان دونوں بیانات پر بحث کرنے سے پیشتر ایک اور جدید تحقیق ملاحظہ فرمائیے یہ بیان بہت طویل ہے اسمیں مندرج امور کو ہم بالترتیب مختصراً پیش کرتے ہیں اس مضمون میں "خدا" کو سہ لفظی مرکب ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ خلاصہ یہ ہے:

(ا) "خود" اور "خدا" کا ماخذ ایک ہے اور دونوں میں "خو" بمعنی فطرت، حقیقت، عادت، جبلت اور خصلت شامل ہے۔ سنسکرت میں اس کا قبیل باہم تبدیل لفظ "سو" ([illegible]) ہے جس کے معنی خود، آپ اور روح ہیں "سو" پر "تس" اضافہ ہوا اور "سوتس" یا "سوتہ" بنا جس کے معنی خود بخود یا آپ سے آپ ہیں۔ فارسی میں "خوت" تھا جس نے "خود" کی شکل اختیار کی لہٰذا "خود" اور "سوتہ" جس طرح یکساں ہیں اسی طرح "خو" اور "سو" بھی ہیں۔ "سوتہ" مرکب ہے سو + تہ سے اسی طرح "خود" مرکب ہے خو + د سے۔

(ب) خدا کی قدیم شکل "خودای" (پاژند)۔ قدیم تر "خوتای" (پہلوی اشکانی) "خوتاذ" (پہلوی ساسانی)، اور قدیم ترین "خودھائی" (قدیم فارسی)، "خوذای" (اوستائی) ہے۔ ارتقائی ترتیب یہ ہے: خودھای، خوتای، خودای، خدای، خدا۔ مگر "ت" کا تبادل "د" سے مسلم ہے "خوتای" سے "خودای" ہو سکتا ہے۔ "خودھای" کے "دھ" کا تبادل "ت" سے خلاف اصول ہے۔ اس لیے سہل بات یہ ہے کہ "خوتای" کو "خودھای" سے ماخوذ خیال کیا جائے۔ اور "دھ" کا تخفیف پا کر "د" ہو جانا قبول کیا جائے۔

(ج) فارسی "خود" اور سنسکرت "سوتہ" یکساں ہیں جو مرکب ہیں۔ خو + د اور سو + تہ سے "خدا"، خود یا سو + کسی اور دوسرے کلمہ سے مرکب۔ ڈاکٹر

بلیشس یہ دوسرا کلمہ "ذات" فارسی اور "دھات" سنسکرت بتاتے ہیں پس خود : خوت + ذات : خوتوذات . اور سوتہ + دھات : سوتہ دھات یعنی وہ ہستی جو اپنی ذات سے زندہ اور پائندہ ہو۔

(د) صاحب فرہنگ نظام نے صحیح لکھا ہے کہ خدا کا اوستائی مادہ "خوتو" اور سنسکرت "سوتہ" ہے جس کے معنی واجب الوجود بخودی خود ہیں۔ لیکن خوتو خدا کا ایک جز ہے دوسرا جز "دات" ہے۔ "خوتودات" اولاً "خوتاد" (بحذف "دو" تبدیل "ت" با "د") ہوا اس کے بعد "خوتای" (بحذف "د") ہوا یا خوتودات، خودای (بحذف "ت") ہوا اور پھر "خدای" سے "خدا" ہو گیا۔

(ه) مسٹروان نولڈیکے، "خوتای" پہلوی کو سنسکرت "سونتہ + آی (عمراست) ماخوذ بتاتے ہیں بمعنی اپنی ذات سے زندہ۔

(و) "خوتای" بمعنی حاکم، مالک، قادر (بادشاہ) مستعمل تھا۔ ساسانی عہد میں خالق و مالک کل (اہرمزد) کے لئے استعمال ہوا۔ قدیم فارسی میں بھی بمعنی اللہ استعمال ہوا ہے، کتاب گجستک اباش (پہلوی) میں ہے۔ "لخو اردل لوین اوہرمزد خوتای مدروند" (بازپیش اہرمزد خدا ببرند) البتہ جدید فارسی اور اردو میں اللہ تعالیٰ کی ذات ہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

اگر ان توجیہات و قیاسات کو صحیح مان لیا جائے تو یہ دشواری پیدا ہوتی ہے کہ قدیم الایام سے چند تراکیب اردو فارسی میں مستعمل ہیں جن میں لفظ خدا بمعنی مالک استعمال ہوا ہے جیسے، کدخدا، دہ خدا، ناخدا وغیرہ پس ان معنی کے لیے کیا وجہ جواز ہوگی۔ اگر اللہ کی صفت، مالکیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بطور مجاز یہ معنی تصور کیے جائیں تو خدائی نامہ بمعنی شاہنامہ موجود ہے جس میں "خداہ بمعنی بادشاہ ہے اس کی کیا توجیہہ ہوگی؟ حقیقت یہ ہے کہ قدیم فارسی میں بمعنی مالک، آقا بادشاہ اور بادشاہ بزرگ (شہنشاہ) استعمال ہوا ہے۔ بمعنی اللہ نہیں ہے۔ مندرجہ بالا آرا، بوجوہ ذیل قابل قبول نہیں ہیں۔

اجزائے ترکیبی، خود + آ، خدا بمعنی خود آنے والا، ذات واجب الوجود، خلاف قاعدہ ہیں جن کا عہد قدیم میں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ یہ قیاس کی لغزش ہے۔ "سو" سنسکرت فارسی "خ" سے تبدیل ہو سکتا ہے لیکن فارسی میں "ختو" نہیں ہے "خوتای" ہے۔ فارسی میں "و" کا تبادل "الف" "ت" ثابت نہیں ہے۔ خوتای کے معنی واجب الوجود، بخودی خود، قدیم فارسی میں نہیں ہیں بلکہ بادشاہ وغیرہ ہیں۔ مزید بحث آگے ہوگی کیوں کہ طویل بیان کے سلسلہ میں یہ باتیں بھی زیر بحث آجائیں گی اس بیان کے خلاصہ کی ترتیب کے مطابق امور مذکورہ پر غور کرتے ہیں۔

(۱) خود اور خدا کا ماخذ "خو" بمعنی فطرت و عادت قرار دینا قیاس مع الفارق ہے کیوں کہ "خو" بمعنی فطرت و عادت ابتدا میں "خیم" تھا پہلوی زبان کی کتابوں کے یہ تمام دلیل ہیں۔ "ابزخیم وخرد فرخ مرت" (درخوی وخرد مرد فرخ) "ابوارنج خیم ہوسرواں" (دریخ خوی خسرواں) ان کے علاوہ "دژخیم" بمعنی بدخو، بدخصلت فارسی میں استعمال موجود ہے۔ پس خو جس کی ابتدائی شکل خیم ہے خود محتاج تحقیق ہے۔ خیم کی "م" ندرسقوط ہوئی اور "ی" کا تبادل "و" سے ہو کر خو بنا۔ خیم دور پہلوی تک تھا اس کے بعد خو کی شکل اختیار کرتا ہے پس قدیم فارسی میں خو تھا ہی نہیں تو یہ خدا اور خود کی اصل کیسے بن سکتا ہے۔ نیز خدا کی ابتدائی شکل "خوتای" میں جو "خو" ہے وہ اوستا کا ایک مفرد حرف (ہے) ہے اور تلفظ میں واو معدولہ ہے حالانکہ "خو" بمعنی عادت میں واو معروف ہے۔ پس اس سے خود بنانا اور پھر خدا کا ماخذ قرار دینا درست نہیں ہے کیونکہ اگر خود میں اس "خو" کو اصل قرار دیں تو پھر خویش، خوش، خواب، خواہش، خوب، خور، خوار میں بھی اس کو اصل قرار دیا جا سکتا ہے حالانکہ ایسا ممکن نہیں۔ خود کے معنی آپ اور اس کے ہم قبیل یا مثیل سنسکرت سونہ کے معنی، خود بخود، آپ سے میں مطابقت کیوں کر ہو سکتی۔

(ب) خدا کی قدیم ترین شکل "خودای" نہیں بلکہ "خوتای" ہے۔ فارسی باستان کا کوئی مخطوطہ نہیں جس میں اس کا سراغ مل سکے۔ چند سکوں اور کتبوں کے علاوہ فارسی قدیم کے آثار ناپید ہیں سکوں میں لاحقہ دات ملتا ہے۔ دہ یا دھات کا وجود نہیں جیسے "بغ دات" سپند دات" "مہرزات" وغیرہ اس کے معنی عطا ہے۔ بغ دات: خداداد ہے۔ عہد ہخامنشی کے جو کتبے برآمد ہوئے ہیں ان میں "بغ" بمعنی پروردگار عالم کے لیے استعمال ہوا ہے۔ خوتائی، خودای، خودھای نہیں ہے، فارسی قدیم، اوستا، پہلوی، ساسانی اور پہلوی اشکانی میں ذات الٰہی کے لئے بغ، مزد، اہورامزدا، یزتان، یزداں، یزد استعمال ہوتے رہے ہیں۔ اس معنی میں خوتای، خودای، خودھای کا وجود ہی نہیں ہے۔ خوتای بمعنی بادشاہ و بادشاہ بزرگ عہد قدیم (پہلوی) سے مستعمل ہے۔ خوتا ذبھی پہلوی اشکانی میں نہیں بلکہ خوتای خوذای ہے۔ اس ضمن میں جو سہل طریقہ استعمال کیا گیا ہے اس سے زیادہ سہل طریقہ تو خود + آ یعنی خود آنے والا، اپنی ذات سے وجود میں آنے والا واجب الوجود ہے۔ ارتقائی ترتیب بھی غلط ہے۔ البتہ خوتای، خوذای، خذای، خدای، خدا ارتقائی ترتیب ہے۔

(ج) خود = خو + ت یا دا اور سوتہ = سو + تس یا تہ، کے معنی "آپ سے یا خود بخود" معین کیے گئے ہیں۔ ان دونوں کو خدا کی اصل قرار دینے کے لئے ایک اور کلمہ "دات" فارسی اور "دھات" سنسکرت کا اضافہ کرکے، خداتک سلسلہ پہنچایا گیا ہے اور معنی اپنی ذات سے پائندہ یا زندہ کیے گئے ہیں۔ پس خو + یاد + دات میں "خو" کے معنی فطرت یاد = دہ دل کے معنی میں خلقت، اور "دات" کے معنی خلقت و عطیہ ہیں جیسے "بن دہش" بمعنی اصل خلقت اور "بغ دات" بمعنی عطیہ الٰہی ہے اگر ان لاحقوں کے ساتھ خو بمعنی عادت و فطرت تسلیم کرکے معنی متعین کیے جائیں تو خلقت و عطیہ فطرت معنی بنتے ہیں ظاہر ہے کہ اس سے واجب الوجود کا مفہوم تعین نہیں ہوسکتا کیوں کہ فطرت خود تخلیق میں خالق کی محتاج ہے۔ پھر اختلاف تلفظ خُدا، خِدا، خُوَدا، خدا کی حالت میں "خو" بمعنی فطرت سے کیسے مطابقت ہوگی؟

(د) صاحب فرہنگ نظام نے "خوتو" نہیں بلکہ "ختو" لکھا ہے جس کو انھوں نے پہلوی رسم الخط میں بھی "ختو" ہی ظاہر کیا ہے۔ کیوں کہ ان کے نزدیک "سو" (۳۹) سنسکرت، فارسی "خ" سے بدل جاتا ہے۔ "خو" سے نہیں۔ نیز مؤلف فرہنگ نظام "ختو" کے معنی بخودی خود بتلاتے ہیں اور اس بیان میں "خوتو" پر دات لاحقہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اگر ان کے معنی کیے جائیں تو لفظ مہمل بن جاتا ہے کیوں کہ فارسی میں دات = داد بمعنی عطیہ ہے جس کی مثالیں کافی ہیں لہذا "ختو" = بخودی خود، "ختوتات" عطیہ بخودی خود یعنی چہ؟ سنسکرتیت سے ہر قدیم لفظ کی تطبیق ناممکن ہے۔

(ہ) سوتہ + آ ی = خوت + آ ی یعنی اپنی ذات سے زندہ کی نظیر فارسی میں نہیں ملتی۔ خود + آ کی ترکیب اس سے زیادہ قرین قیاس ہوسکتی ہے حالانکہ وہ بھی غلط ہے۔

(و) خدا، قدیم فارسی میں، مالک، آقا، بادشاہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے خالق کل کے معنی میں نہیں۔ اور ہرمزد خوتای میں "خوتای" کے معنی آقا یا بادشاہ ہی کے تھے بمعنی واجب الوجود نہیں۔ اور ہرمزد خوتای یعنی اورمزد آقا یا بادشاہ عہد ساسانی سے پہلے بمعنی اللہ کیوں نہیں استعمال ہوا؟ جبکہ اس طویل بیان میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کے معنی واجب الوجود ہی ہیں قدیم ایرانیوں میں اللہ کے لیے واجب الوجود کا تصور ہی غیر محقق ہے تو اس کے لیے یہ لفظ بنانا یا بننا ہی مشکوک ہو جاتا ہے۔ آخر میں خود بھی تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اوستا اور پہلوی اشکانی میں بمعنی مالک و بادشاہ تھا اور یہ دونوں زرتشتی ساسانیوں سے مقدم ہیں۔ پس منطقی طور پہ استدلال ہی غلط ہے کہ لفظ اصل کے لحاظ سے ابتدا میں اپنے معنی میں مطابقت نہ رکھے، یہ بات بداہتہً غلط ہے کیوں کہ لفظ کی تخلیق ہی معنی کے پیش نظر ہوتی ہے۔ اگر یہ لفظ واجب الوجود یا بخودی خود کے پیش نظر وجود میں آتا تو ابتدا میں یہی معنی مروج ہوتے تبدیلی بعد میں واقع ہوتی۔ پس جبکہ ابتدا میں یہ معنی ثابت نہیں تو ان معنی کا قیاس کرنا ہی غلط ہے اور اجزائے ترکیبی تلاش کرنا نری موشگافی ہے معنی ہی کی صحت سے ترکیبی اجزا کی صحت ثابت ہوسکتی ہے۔ ابتدا میں بادشاہ، مالک، آقا کے معنی میں استعمال ملتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انہی معنی کے لئے یہ لفظ وضع ہوا اور ان معنی سے مرکب کا تصور پیدا نہیں ہوتا۔ قدیم فارسی میں ذات الٰہی کے لیے کون کون سے لفظ مستعمل تھے خدا کب سے مستعمل ہے، معنی کیا تھے، املائی اور ہیئی اشکال کیا کیا تھیں، ان امور کا سراغ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔

فارسی قدیم میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے، بَغ، ہُرمَزد، اَہُورامَزدہ، یزتان، یزدان اور یزد، الفاظ ملتے ہیں بغ بادشاہ آشور کے کتبہ سارگوں میں ایک ایرانی کے نام (بغ داتی) کے جز کی شکل میں ملتا ہے۔ کتبہ دار یوش میں "بغ ویدیش" خدا کی ستائش کے مہینہ کا نام ملتا ہے۔ دیگر کتبوں اور اوستا میں بھی بغ بمعنی خدا آیا ہے "بغ دات" اور "بغ کرت" دو بادشاہوں کے نام ہیں۔ "انور خورنہ بغ" یعنی آتش جلالت ایزدی ایک آتشکدہ کا نام ہے۔ ساسانی بادشاہوں کے زمانہ کے سکوں میں بھی بغ بمعنی خدا پایا جاتا ہے۔ اس عہد کے بعد اس لفظ کی حالت بدلتی ہے تدریجاً زوال ہوتا ہے اور بجز چند مرکبات بالکل ہی نابود ہو جاتا ہے۔ کتبہ شاہ پور سکانشاہ میں بھی یہ لفظ موجود ہے:

"مَزدیسن بغی شہپوہری شہانِ شہی شہانِ شہی ایران و اَنیران کی چیتر ہچ یزدان" یعنی خدا پرست و خدا نگان شہپور شہنشاہ ایران وغیر ایران جس کا خاندان خدا سے پیوستہ ہے۔

ساسانی سکوں پر یہ عبارت کندہ ہے جس میں مزد، بغ، یزدان بمعنی خدا آئے ہیں "مزدیسن بغی شہپوہری ملکان ملکا، ایران منوچتر من یزدان" یعنی خدا پرست، خدا نگان شاہ پور شہنشاہ ایران، جس کا خاندان خدا سے تعلق رکھتا ہے۔

خط میخی مادی میں خط میخی آشوری پر چھ علامتوں کا اضافہ ہوا ان میں دو علامتیں "اہُرمزدا" اور "بغا" بھی ہیں جن کے معنی خدا اور خدا بزرگ ہیں۔ ان دونوں لفظوں کے متعلق ملک الشعرا بہار لکھتے ہیں: "در عہد ہخامنشی و تا چند قرن بعد بغ نام پروردگار عالم بودہ است" اور "اہورمزد در اصل اہورا

مزدہ بمعنی خداوند بزرگ بودہ است" بمطلق "خدا" و بمعنی خدا استعمال ہوتا ہے۔ "مزدیسن" مرکب ہے مزد بمعنی خدا اور یسن بمعنی خدا اور یسن بمعنی عبادت کرنیوالا خدا پرست۔ تغیر کی تدریج ہوتا ہوا" اہورمزدہ" اسم ذات الٰہی سے بادشاہ کا نام ہو گیا۔ اہورمزدہ، اورمزد، اہرمزد، ہرمزد تغیری اشکال ہیں" یزتان" بمعنی خدا کتیبۂ اردشیر بابکان میں پایا جاتا ہے" ارتخشتری ملکان ملکا اریان منوشیہرمن یزتان" (اردشیر شاہان شاہ ایران دارندہ نژاد از خدایان) تبادل ہ سے ہوکر یزدان بنا اسی طرح ایزد' یزد ہو گیا۔ "یزد کرت" یزدگرد ہے۔

خدا، دراصل "خوتای" بتاجس کے معنی بادشاہ، سروار، فرماں روا، مالک اور آقا ہیں، پہلوی زبان میں انہی معنی میں استعمال ہوا ہے اس کی املائی اشکال، خوتای، خوذای، خودای، خذای، خدای اور خدا ہیں۔ کارنامۂ اردشیر بابکان میں یہ عبارت ہے:

"پس ہچ مرگ الکساندری اددنیک ایران شترو ۲۴۰ کتک خوتای بوذ" (سکندر رومی کے مرنے کے بعد ایران ۲۴۰ کدخدا (سردار یا فرماں روا) بٹ گیا) اسی طرح "جینک مندرج فرجود کیشاں" میں ہے: "فریوبانیہ این کہ اوہرزد پت ہستیہ پاک بوذ یزدان شک خوتائیہ" (ہماست اعتقادی یہ ہے کہ اوہرمزد (اللہ) کی ہستی دائمی و بادشاہی جاویدہے) اسی طرح "شترو ہای ایران" میں لکھا ہے" انیک گجستاک سکندر سوہت وانددر و دریا پا افکند نیکرتی ہپت خدایاں" (پس سکندر ملعون نے دینکرت ہفت خدا کو جلا کر دریا میں ڈال دیا) ہفت خدا یعنی سات بادشاہ۔ اصطلاح کتب سنت پہلوی میں "ہفت خدایاں (سات بادشاہ) جم، فریدوں، منوچہر، کاؤس، کیخسرو، لہراسپ اور گشتاسپ ہیں۔ اور سہ خدائیہ: سہ خدا سے مراد اردشیر پسر اسفندیار، دارا اور دارای دارہاں ہیں۔ اسد اشکانیوں کی اصطلاح میں کنک خوتای دکدخدا کہتے تھے نہ کہ خوتای: خدا بمعنی بادشاہ بزرگ سامانی اندر ہمین نامہ نویسی کی اس عبارت میں یزداں بمعنی اللہ اور خدا بمعنی بادشاہ استعمال ہوا ہے "بہ از زرتشت سپیتمان ..... اپیترک، بہ گوہر، بذیرہ یتک ندر یزدان، آفریکان اندر خدایان" (پاک جان زرتشت کے لیے تعظیم ہے....... نہ صرف اس کا قبیلہ دخاندان خدا کے نزدیک مقبول اور بادشاہوں کے نزدیک صاحب عزت ہے)

پہلوی میں خوتای نامک یعنی شاہنامہ اور" اوریتیان کتک خدای" بر یکان کدخدای۔ کتابوں کے نام ہیں۔ خوتای نامک کا ذکر جاحظ نے بی کتاب البیان و التبیین میں بھی کیا ہے۔ اس کی حقیقت ملک الشعرا بہار نے جو بیان کی ہے وہ بہر طرح قابل غور ہے" خوتای بواو معدولہ یعنی راکہ در قدیم بمعنی بادشاہ، صاحب بودہ و بعد از اسلام بطور یافتہ معنی اہورمزدا را نیز گرفتہ، در خوتاینامک) خداینامہ بمناسبت کہ شاہنامہ شد[1] لفظ خداوند خواجہ کے متعلق لکھتے ہیں:-

"این ہر دو لغت (خواجہ و خداوند) ظاہراً در فارسی دری بعد از اسلام از لغت خوتای پہلوی کہ بمعنی صاحب و آقا و مدیر وگاہی ہم نسب فرشتگان چوں ماہ خدای وہ دیر ند خدای وغیرہ بودہ بود ساختہ شد، چہ خدای را در اسلام بجای اللہ و رب عربی گزاشتند و بجائے شاہ و صاحب قا خداوند را با ضمیمہ وند کہ از ادات تشبیہ یا نسبت، است ساختند کہ از ہماں ریشہ ولی عین آں نباشد"[2]

مندرجہ ذیل بیانات سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ آخری بیان سے تلفظ اور املا پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

"خدا کہ نام پادشاہ بود بعد از اسلام مختص ذات باری تعالیٰ قرار گرفت با آنکہ مشتقات آں چو خانہ خدای، کدخدای، دہخدای و کشور بای وغیرہ بحال خود باقی ماند و معنی اصلی را کہ صاحب باشد محفوظ داشت"[3]

"خدای را کہ ما بروزن شما دا مینامیم در زمان فردوسی "خوذآی" بواو معدولہ بزبان میآوردہ اند"....... بختیاریان، خار مفتوح و بستانیان، خار مکسور و سائرین خار مضموم ادا سازند چوں، خَوذا، خِذا، خُذا"[4]

پس نتیجہ یہ نکلا کہ خوتای، خوذای، خذای، خدای سے خدا ہوا ہے اس کے معنی، بادشاہ، صاحب، مالک، اور آقا تھے۔ وہ خدا و کدخدا اور خدامیں بمعنی مالک اور خدا ینامہ میں بمعنی بادشاہ استعمال ہوا ہے۔ دیرند خدا، زروان کا لقب ہے جو فرشتۂ دہر (زمان و مکان) ہے اس لیے

[1] سبک شناسی ص۲۴۲ ج ۱ [2] ایضاً ص۱۸۳ [3] ایضاً ص۲۶۷ [4] ایضاً ص۱۹۳

بھی خدا کے معنی مالک یا صاحب کے ہیں دیرند خدا، مالک دہر، صاحب زمان و مکان ۔ عروج اسلام اور بالخصوص رواج تصوف کے بعد اس لفظ کو بمعنی اللہ، ذات واجب الوجود استعمال کیا گیا ہے۔ پس یہ قیاس کہ یہ مرکب ہے اور قدیم سے اللہ تعالیٰ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ۔غلط ہے اہرمزد کے ساتھ خدا کا استعمال بمعنی بادشاہ ہے۔ جبکہ پہلوی سے پہلے اس کا وجود ثابت نہیں ہے تو فارسی قدیم میں کیسے ہو سکتا ہے۔ پہلوی میں بمعنی بادشاہ استعمال ہوا ہے تو معنی بخودی خود یا واجب الوجود کیسے ہو سکتے ہیں ۔ قدیم آثار بصورت مرکب بمعنی صاحب و مالک و فرمانروا تا حال پائے جاتے ہیں جیسے دہ خدا دکھیا، نمبردار) کشور خدا (فرمانروا ملک) کدخدا (صاحب خانہ) ناخدا (ناؤ کا مالک) وغیرہ بمعنی حاکم و فرماں روا طبری نے چند القاب لکھے ہیں جیسے وردان خداہ، بخارا خداہ وغیرہ یعنی فرمانروائے وردان اور بخارا طبری دور اول کا مورخ ہے اس نے یہ القاب براہ راست پہلوی کتب خوتای نامک وغیرہ سے اخذ کیے ہیں۔

لسانیات میں اس اصول سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ لفظ مادہ کے لحاظ سے جس معنی و مفہوم پر دلالت کرتا ہے ابتدا میں وہی معنی مندرج ہوتے ہیں اضافی یا مجازی معنی بعد میں رائج ہوتے ہیں۔ جو تغیر و تحول کے زیر اثر مراد لے لیے جاتے ہیں مثلاً "گلستاں" بلحاظ ساخت (اجزائے ترکیبی) گلاب کے تختے یا پھولوں کے قطعے کے معنی رکھتا ہے ابتدا میں اسی معنی میں مستعمل ہوا لیکن بعدہٗ مجازاً باغ کے لیے بھی استعمال کرنے لگے یہ ناممکن ہے کہ بلحاظ ساخت تو گلاب یا پھولوں کے تختے کے لیے مخصوص ہے مگر ابتدا ہی میں باغ کے لیے استعمال کر لیا گیا ہو اور دو چار صد یاں گزرنے کے بعد ہوش آیا کہ باغ کے لیے استعمال غلط ہے یہ تو تختۂ گل کے معنی رکھتا ہے ۔ خدا جبکہ قدیم فارسی، اوستا اور پہلوی اشکانی و ساسانی میں اللہ کے معنی میں استعمال نہیں ہوا تو بلحاظ ساخت و بلحاظ مادہ اس کے یہ معنی کس طرح ثابت ہو سکتے ہیں ۔ اجزائے ترکیبی کی معنی سے مطابقت معنی کی موجودگی ہی میں ثابت کی جا سکتی ہے حالانکہ لفظ خدا بمعنی اللہ جل شانہٗ ذات واجب الوجود فارسی میں عہد اسلام میں استعمال کیا گیا ورنہ پہلے معنی بادشاہ مالک وغیرہ استعمال ہوتا رہا ہے۔ پس اجزائے ترکیبی کی حیثیت قیاسی موشگافی سے زیادہ نہیں ہے۔ میرے نزدیک خدا و مفرد ہے ابتدا میں اس کے معنی ، بادشاہ اور مالک تھے اسلام کی اشاعت کے بعد بمعنی اللہ استعمال ہونے لگا۔

مآثر الامرا کی تاریخی فروگذاشت

سید نقی احمد ارشاد

مولانا امتیاز علی خاں عرشی وقائع عالم شاہی کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"حصول اقتدار کے لئے ان طاقتوں (مرہٹہ، روہیلے، سکھ اور انگریز) نے جو پیہم کوشش کی اس کی روداد تاریخ کی مختلف کتابوں میں بیان ہوئی ہے۔ مگر ان کے مصنف کسی نہ کسی ایسی سرکار کے متوسل تھے جو فریق کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس لئے ان تصانیف کا دامن جانب داری سے بالکل پاک نہ رہ سکا۔ اس عہد کی مختلف تاریخوں کو پڑھئے اور پھر کسی ایک واقعہ کے اسباب و علل متعین کرنے کی کوشش کیجئے بہت جلد آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ بغیر کڑی نکتہ چینی کئے آپ حقیقت تک نہیں پہونچ سکتے"

یہ ریمارک بالکل صحیح ہے اور اس اعتبار سے تاریخ کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ خود مورخ کے کردار اخلاق اور تعلقات کا بھی جاننا بے حد ضروری ہو جاتا ہے۔ آج تک یہی مشہور ہے کہ مآثر الامرا نے نہایت غیر جانبداری سے واقعات کو چھان بین کے پیش کیا مگر جب میں نے غور سے دوسری تاریخوں کے حوالے سے مطالعہ کرنا شروع کیا تو یہ بات ظاہر ہو گئی کہ صرف امرائے اکبری جہانگیری و شاہجہانی کے حالات مستند تاریخوں سے جمع کئے گئے ہیں اور ان میں خامیاں نہیں ہیں مگر عہد اورنگ زیب کے بعد سے جن امرا کا حال بیان کیا گیا ہے ان میں صاف صاف جانب داری کی جھلک پائی جاتی ہے۔

مآثر الامرا بظاہر میر عبد الرزاق خاں (شاہ نواز خاں صمصام الدولہ) کی تالیف ہے مگر ان کی شہادت ۱۱۷۱ ہجری کے بعد ان کے صاحب زادے میر عبد الحی نے اس تاریخ میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ چنانچہ خود میر عبد الحی تحریر فرماتے ہیں۔ انھوں نے اپنے والد شاہ نواز خاں سے کہا۔

"روزے محرر ایں کلمات ظاہر نمود کہ نسخہ خوبے تمہید یافتہ۔ اگر اتمام می پذیرفت۔ آں بزرگ برز بال آورد کہ تو تمام خواہی کرد"

چند سطروں کے بعد "چوں راقم بافرمودۂ آں بزرگ بجا طرمی خلید ہموارہ بخیال آں سرگرمی داشت۔ تا آنکہ در سال ۱۱۸۲ ہجری شروع نمود۔ احوال تتمۂ مردم (از کتاب تاریخ فراہم آوردہ انضمام دادہ تمہیدے (کہ والد مرحوم در ابتدا خود نوشتہ و محرر بہ بیاضے نقل گرفتہ بود)، عبد و تمہیدے (کہ ازاد نوشتہ) با چہار ترجمہ (کہ آں ہم رقوم قلم میر آزاد است) نیز ثبت فرمودۂ شاہ نواز خاں ۱۱۷۱ ہجری میں عالم قید میں قتل کر دیئے گئے۔ چنانچہ میر غلام علی آزاد بلگرامی مذکور نے تاریخ وفات کہی ہے ؎

رفت صمصام الدولہ زجہاں	سوم ماہِ شریف رمضان
سال ایں واقعہ آں سید خود	گفت ماکشتہ عبد الرحمان

عبد الرحمان ملعون سے مراد حیدر جنگ جو پانڈی چری کے فرانسیسیوں کا پروردہ اور نمک خوار تھا۔ میر عبد الحی (شمس الدولہ دلاور جنگ) خلف شاہ نواز خاں نے تاریخ اتمام مآثر الامرا۔ یوں پیش کی ہے ؎

دبیر عقل رقم کرد سال اتمامش	زہے ادیب مصاحب مآثر الامرا

گویا شاہ نواز خاں کی موت ۱۱۷۱ھ کے ۲۳ برس بعد یہ کتاب تمام کی گئی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ میر جعفر کے بعد میر قاسم، پھر میر جعفر کی دوبارہ مسند نشینی ۱۱۷۷ھ نجم الدولہ خلف میر جعفر اور سیف الدولہ تک کے حالات میرزا محمد (علی وردی خاں مہابت جنگ) کے حالات کے ساتھ درج ہیں۔ میر جعفر سے لے کر سیف الدولہ ناظم بنگال کے حالات شاہ نواز خاں کی وفات کے بعد کے ہیں۔ اس وقت تاریخ بنگالہ نہیں لکھی گئی تھی۔ اس لئے محض سنی سنائی باتوں سے کام لیا گیا ہے۔

غلام علی آزاد اپنے دیباچہ میں تحریر کرتے ہیں۔

"ترجمۂ قطب الملک عبداللہ خاں وزیر اعظم محمد فرخ سیر بادشاہ (کہ مصنف علیہ الرحمۃ بقلم داؤ بود) بہ معرض تلف در آمد و ترجمۂ امیر الامرا سید حسین علی خاں برادر قطب الملک از اول ناقص بدست افتاد۔ و ترجمۂ نواب آصف جاہ و خلف او نواب نظام الدولہ شہید مصنف علیہ الرحمۃ خود بہ تحریر درنیاورد و تنگ چشمی روزگار فرصت نہ داد۔ جلالت شان این ہر چہار امیر آفتاب نظیر ظاہر۔ اتفاقاً فقیر تراجم اربعہ را در تالیف خود سر و آزاد لباس رقم پوشانیدہ۔۔۔۔"

خلاصہ یہ کہ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے ان چار امرا کے حال کا اضافہ کر دیا ہے۔ اتنی طویل عبارت سے مطلب یہ نکلا کہ درحقیقت مآثر الامرا تین اشخاص کی تالیف ہے۔ اول شاہ نواز خاں جنھوں نے ۱۱۷۱ھ کے بہت پہلے یعنی ۱۱۵۵ھ تا ۱۱۶۰ھ کے درمیان اس کتاب کو لکھا۔ اس پانچ برس میں جب وہ مصاحب نواب آصف جاہ اول تھے۔ ۱۱۶۰ھ میں بعد رحلت آصف جاہ اول ان کے بیٹے نظام الدولہ ناصر جنگ ریاست دکن پر بحال ہوئے اور شاہ نواز خاں اپنے قدیم آقا حریف آور سرپرست سے وابستہ ہو گئے۔ مآثر الامرا کی تالیف بند ہو گئی یہاں تک کہ ۱۱۷۱ھ میں سیاسی طور پر قتل کر دیئے گئے۔ میر عبدالحئی کتاب قلعہ گولکنڈہ میں نظر بند تھے وہ ۱۱۷۲ھ میں حراست سے باہر کئے گئے اور ۱۱۸۲ھ میں مآثرالامرا کی از سر نو ترتیب و تدوین شروع کی گئی یہاں تک کہ ۱۱۹۴ھ میں غلام علی آزاد نے تتمہ و مقدمہ اور حالات کے ساتھ اس کتاب کو مکمل کیا۔ جو مزید اضافہ حالات سے خود ظاہر ہے۔

چونکہ یہ کتاب دکن (اورنگ آباد) میں تالیف و تصنیف کی گئی اور اس کے مولفین و مرتبین کا تعلق ریاست حیدرآباد سے رہا، اس لئے امرائے محمد شاہی و احمد شاہی میں بعض ایرانی جماعت کے امرا کا ذکر بالقصد نہایت رکیک الفاظ میں کیا گیا ہے۔ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نظام آصف جاہ اول کا تعلق تورانی پارٹی سے تھا جو ایرانی پارٹی کی حریف سیاست تھی۔ یہ پارٹی ... در عہد محمد شاہ میں روز روز بڑھتی اور انہیں دو پارٹیوں کی سیاسی بازی گری نے حکومت مغلیہ کا خاتمہ کر دیا۔

میں نے عرض کیا ہے کہ تاریخ کے مطالعہ کے ساتھ مورخ کے کردار کا بھی جاننا ضروری ہے اور بغیر اس کے اس کی تصنیف یا تالیف پر پوری روشنی نہیں پڑ سکتی ہے اس لئے مختصراً شاہ نواز خاں کا حال درج ذیل ہے۔

شاہ نواز خاں کا اصلی نام میر عبدالرزاق تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے اجداد خوافند کے سادات تھے۔ ان کے جد اعلیٰ کمال الدین عہد اکبری میں خواف سے ہندوستان آئے۔ شاہ نواز خاں کے دادا میر کاظم خاں ملتان کے دیوان تھے۔ شاہ نواز خاں کے والد کا نام میر حسن علی تھا۔ یہ جا مران اورنگ آباد دکن میں رہتا تھا۔ شاہ نواز خاں کی پیدائش ۱۱۱۱ ہجری میں لاہور میں ہوئی چونکہ ان کے اقربا اورنگ آباد میں رہتے تھے۔ یہ اورنگ آباد لائے گئے۔

پہلے انھوں نے نظام آصف جاہ اول کی ملازمت اختیار کی۔ ناصر جنگ خلف نظام آصف جاہ کے دربار میں رسوخ پیدا کیا اور صوبہ برار کے دیوان مقرر ہوئے جب ۱۱۵۵ھ میں آصف جاہ کی طلب دہلی میں قلمدان وزارت سپرد کرنے کو ہوئی تو وہ حکومت دکن اپنے بیٹے نظام الدولہ ناصر جنگ کے حوالے کر کے دہلی روانہ ہو گئے۔ شاہ نواز خاں نے دربار ناصر جنگ میں پورا پورا رسوخ حاصل کر لیا۔ یہاں تک کہ جب ۱۱۵۵ھ میں نظام آصف جاہ دہلی سے واپس آئے تو حکومت دکن کے لئے باپ بیٹے میں لڑائی شروع ہو گئی۔ ناصر جنگ نے حکومت دکن سے اپنے باپ آصف جاہ اول کو بے دخل کرنا چاہا۔ اس جنگ میں شاہ نواز خاں ناصر جنگ کی طرف سے میدان جنگ میں موجود تھے۔ ان کا ہاتھی ناصر جنگ کے ہاتھی کی پشت پر تھا۔

"نواب صمصام الدولہ بذیل ردیف نواب نظام الدولہ بود" اس سے دو مطلب نکلتے ایک تو یہ کہ ناصر جنگ سمجھے کہ یہ میرے ساتھ ہیں۔ دوم ناصر جنگ کی پشت پر رہنے سے آصف جاہ کی آنکھیں ان پر نہ پڑیں سوم باپ بیٹے کی لڑائی میں جب بیری کی وجہ سے جان جانے کا خوف نہ رہے۔ چنانچہ جب اس معرکہ میں ناصر جنگ کو شکست ہوئی اور میدان جنگ سے گرفتار کر کے لے جایا جا رہا تھا تو عین میدان جنگ میں حرز اللہ خاں نبیرہ سعد اللہ خاں (وزیر شاہجہاں) نے از راہ خندگی شاہ نواز خاں سے پوچھا۔

"نظام الدولہ (ناصر جنگ) انجا بدر می رود۔ شما کجا می روید"

ناصر جنگ تو اپنے باپ کے گھر جاتا ہے تم کہاں جاؤ گے۔ اس طنز سے شاہ نواز خاں کے کردار پر پوری روشنی پڑتی ہے۔ جب ۱۱۵۵ھ میں وہ مصاحب آصف جاہ

ہوئے تو تو کتاب "مآثر الامرا" کی تصنیف شروع کی یہاں تک کہ ۱۱۶۰ھ میں یہ کام بند ہوگیا۔ آصف جاہ و نظام الدولہ کا حال کیوں چھوڑ دیا جیسا کہ غلام علی آزاد کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے۔ نظام الدولہ کے عہد میں وہ مختلف عہدوں پر سرفراز ہوتے رہے صلابت جنگ کے زمانے میں یعنی ۱۱۶۷ھ میں شاہ نواز خاں کو ہفت ہزاری کے منصب کے علاوہ صمصام الدولہ کا خطاب بھی حکومت نظام سے ملا اور ان کا ستارہ اقبال چمکا۔ وہ وکیل حکومت دکن مقرر ہوئے ۱۱۶۹ھ میں جب بالاجی راؤ نے ساور کے افغان سرداروں پر حملہ کیا تو شاہ نواز خاں نے افاغنہ کے خلاف بالاجی راؤ کی پوری پوری مدد کی۔

اسی زمانے میں فرانسیسی حکومت پانڈی چری کا اقتدار دربار نظام میں بڑھ رہا تھا۔ فرانسیسیوں کا بڑا مؤید خود ان کا پروردہ عبدالرحمن (لقب حیدر جنگ) تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ شاہ نواز خاں گرفتار کئے گئے ان کا گھر بار لوٹ لیا گیا اور آخر جب نظام آصف جاہ دوم نے حیدر جنگ کو اپنے ساتھ دھوکے سے بلوائے ذبح کرا دیا تو حیدر جنگ کے ذبح ہونے کے چند گھنٹوں کے اندر فرانسیسیوں کے ملازم لچھمن نامی ایک ہندو نے قید خانے کے اندر شاہ نواز خاں کا معہ ان کے دو صاحب زادوں کے تلوار سے کام تمام کر دیا۔ غلام علی آزاد نے کئی موثر تاریخی رباعیاں کہی ہیں۔

آزاد کی تحریر تنگ چشمی روزگار فرصت نہ دادشے تشفی نہیں ہوتی ہے۔ شاہ نواز خاں نے نظام آصف جاہ اول اور نظام الدولہ خلف آصف جاہ کا حال غالباً اس لئے چھوڑ دیا ہوگا کہ خود اس میں ان کی تضحیک مضمر تھی جیسا کہ میں نے حرز اللہ کی کہی ہوئی عبارت میں پیش کر دیا "نظام الدولہ بخانہ پدری رد و شما کہا می روید"۔

ذوالفقار الدولہ نصرت جنگ جہاں جہاں اس کتاب میں امرائے ایرانی النسل (جن کا تعلق بہادر شاہ اول یا محمد شاہ سے تھا) کا ذکر آیا ہے تضحیک سے خالی نہیں ہے۔ کوئی نہ کوئی بات ایسی لکھ دی ہے جو تاریخ کے خلاف ہو یا اگر وہ باتیں تاریخ کے خلاف نہیں ہیں انھیں اس طرح توڑ مروڑ کے بیان کیا گیا ہے کہ وہ اس امیر جلیل الشان کے خلاف سراسر ہو گئی ہیں اور اس کے ہنر کی پردہ پوشی کرتی ہیں۔ مثلاً نصرت جنگ وزیر بہادر شاہ کے متعلق یہ تحریر ہے "گویند نصرت جنگ بدستاں سرائی و فریب طرازی رفیع الشان و جہاں شاہ را بہ تقسیم ملک راضی ساختہ با جہاندار شاہ بیعت و یکدل گردانید واز سر سرافراز وزارت بنام خود گرفت"

تاریخ مظفری یا سیر المتاخرین کو دیکھ جائیے کہیں بھی یہ الفاظ "دستاں سرائی و فریب طرازی" نہ ملیں گے بلکہ سیر المتاخرین کے مطابق "امیرے بہ جمیع فضائل و محاسن واتصاف حمیدہ" ہے۔ غلام حسین خاں صاحب سیر المتاخرین کا تعلق نہ دربار دہلی سے تھا نہ حکومت دکن سے۔ آگے چل کے تحریر کرتے ہیں "چوں مردم بہ سیرت ملوک مہ طوار اند ذوالفقار الدولہ خاں نیز بہ اختیار سماجند کمتری (کہ در شرارت و بدذاتی یکتا بود) کار گذاشتہ بعیش و عشرت پرداخت و در عجبیہ شہر یار جہاں"۔

یہ صحیح ہے کہ جہاندار شاہ مرد لا ابالی تھا۔ وہ لال کنور کے عشق میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ خلوت ہو یا جلوت ہر جگہ لال کنور کی جلوہ گری تھی جب جلوس شاہی نکلا تو بھی لال کنور بادشاہ کے ساتھ ہاتھی پر سوار تھی۔ مگر جو الفاظ شاہ نواز خاں نے ذوالفقار الدولہ کی شان میں استعمال کئے ہیں اس کی تصدیق کسی اور معتبر تاریخ سے نہیں ہوتی ہے۔

ذوالفقار الدولہ نصرت جنگ (محمد اسمٰعیل) یہ آصف الدولہ اسد خاں وزیر بہادر شاہ اول کا بیٹا تھا اس کی ماں مہر النسا بیگم آصف خاں یمین الدولہ کی بیٹی تھی۔ اس کی پیدائش ۱۰۶۷ھ میں ہوئی۔ مصرعہ تاریخ ہے سہ

زیر برج اسد رو نمود آفتاب

اورنگ زیب اور بہادر شاہ کے عہد میں اس نے دکن میں بڑے بڑے معرکے انجام دیئے تھے۔ مرہٹوں کو گویا نیست و نابود کر دیا تھا۔ اس کے خوف سے راجہ رام خلف شیوا جی بھاگا پھرتا تھا۔ بہادر شاہ کے مرنے کے بعد جب اس کے چاروں لڑکوں میں سلطنت کا جھگڑا شروع ہو گیا تو اس نے عظیم الشان کے خلاف تین بھائیوں جہاندار، رفیع الشان اور جہاں شاہ کو متفق کر دیا۔ کیونکہ عظیم الشان (بانی عظیم آباد) صاحب ثروت و دولت و صاحب اقتدار تھا عظیم الشان کی شکست ہوئی یہ واقعہ ۱۱۲۴ھ ہجری کا ہے ذوالفقار الدولہ کی پیدائش ۱۰۶۷ ہجری میں ہوئی۔ گویا ۱۱۲۴ھ میں اس کی عمر ۵۷ سال کی تھی اب اس پر بھی اگر یہ کہا جائے کہ "بہ عیش و عشرت پرداخت" تو یہ ریمارک کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔

اس کے برخلاف میر غلام علی آزاد بلگرامی نے اس کتاب میں جہاں نظام الدولہ کا حال بیان کیا ہے۔ تعریف کا دریا بہا دیا ہے۔

نظام الدولہ ناصر جنگ امیرے بود دیندار و کرم گستر غیور صاحب عزم صف آرائے بزم و رزم۔ احکام شریعت غرا جہد وافی می نمود و در فریاد رسی عاجزو نالاں بے دست و پا لوجہ تام می فرمود۔ در فصاحت تقریر داد و اک لطائف سخن کو کس یکتائی می نواخت غرض امیرے بود خلیفہ وقت۔ باپ کے

خلاف تلوار اٹھانا اور بغاوت کرنا شاید احکام شریعت میں داخل نہیں ہے وہ بھی ایسے باپ کے خلاف جس نے حکومت دکن بطور امانت دولت اسلامیہ ایسے نازک وقت میں سپرد کردی ہو۔

میر میران امیر خاں اسی طرح امیر خاں میر میران صوبہ دار کابل کے متعلق صفحہ ۲۹۶، ماثر الامرا مطبوعہ کلکتہ پریس میں تحریر ہے "بالجملہ امیر خان را از صاحب جی فرزند نہ شد (چوں او بر خان مزبور رحمت غالب بود) در کمال عفاف خواجہ نگاہ داشتہ اولاد بسیار بہم رسانید" مدخولہ کے معنی ہوئے داشتہ حقیقت یوں ہے کہ جب صاحب جی کے بطن سے امیر خاں کو کوئی اولاد نہیں ہوئی تو صاحب جی کی مرضی سے انھوں نے دہلی کے ایک معزز خاندان میں عقد ثانی کیا۔ ان ہندوستانی بیوی کے بطن سے نواب امیر خاں انجام پیدا ہوئے۔ جہاں امیر خاں انجام کا ذکر کیا گیا ہے اس بات کو قطعی فراموش کر دیا گیا۔

وہ زمانہ عالمگیر اورنگ زیب کا تھا جو سلطنت کے گوشے گوشے کی خبر رکھتا تھا۔ مرشد قلی جعفر خاں ناظم بہار و بنگال داڑیسہ نے ایک دفعہ اورنگ زیب کے پاس عظیم الشان (اورنگ زیب کے پوتے) کی شکایت لکھ بھیجی اس زمانے میں عظیم الشان نائب ناظم بہار تھا فوراً عتاب شاہی نازل ہوا کہ آئندہ اگر ایسی شکایت پھر سنی گئی تو پا بہ جولاں دہلی لایا جائے گا اور سر تبہ شہزادگی کا خیال نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ وہ خط رقعات عالمگیری میں موجود ہے جس عہد میں شاہزادوں کی ایسی حالت ہو وہاں ایک سرحد کے ایسے شورش افزا صوبہ دار کی کیا مجال تھی کہ مدخولہ رکھتا وہ بھی اس صورت میں کہ صاحب جی جیسی بیوی نہ صرف صوبہ دار پر حاوی ہو بلکہ امور حکومت پر بھی۔

چونکہ صفدر جنگ نواب اودھ اور امیر خاں انجام سے غایت درجہ کی دوستی تھی اور دونوں نے مل کے درانی پارٹی کو نیچا دکھایا تھا اسی وجہ سے صاحب ماثر الامرا نے ایک غلط روایت جوڑ دی۔ امیر خاں انجام کے متعلق خود ماثر الامرا کی تحریر ملاحظہ ہو "حسب العرض او صفدر جنگ ناظم اودھ (کہ با ایں ہر دو اخلاص بسیار بود) طلب حضور شدہ بہ داروغگی توپ خانہ اختصاص گرفتہ ہر دو متفق شدہ فردوس آرام گاہ (محمد شاہ) را بر سر علی محمد خاں روہیلہ بردند۔ اما بہ سبب نفاق اعتماد الدولہ قمر الدین خاں پیش رفت نشد۔ دریں ایام بر زبان خاص و عام بود کہ وزارت بار می شود "عجب ایسا تھا تو عماد الملک (نظام آصف جاہ اول کے پوتے) نے کیوں عہدہ وزارت کو قبول کیا اور صرف وزارت حاصل کرنے کے لئے دکن سے مرہٹوں کو بلوایا۔ یہاں تک کہ سکندر آباد خالصہ شاہی کو بھی ہولکر کے حوالے کر دیا۔

"ہولکر آمدہ بے ممانعت تمام اثاثہ سلطنت را غارت کرد ملکہ زمانیہ (دختر فرخ سیر بادشاہ) کہ زوجہ فردوس آرام گاہ بود و دیگر بیگیاں سر اوقات بادشاہی با سر رسیدند ہولکر ایشاں را بہ حرمت نگاہ داشت" جہاں تک حرمت مستورات کا سوال ہے تاریخوں میں یہ واضح طور سے درج ہے کہ ہولکر نے انھیں دہلی لا کر خواصی پورے میں رکھدیا تھا۔ اس بات کی شاہ غازی خاں نے پردہ پوشی کی ہے یہ وہی شاہ نواز خاں ہے جنھوں نے نظام کی فوجوں کو بالاجی راؤ کی مدد کے لئے افاغنہ سانور کے خلاف بھیجا تھا۔ مرہٹے جیسی اخیر کے سلاطین مغلیہ کی حرمت کرتے تھے وہ وقائع عالم شاہی سے ظاہر ہے۔ پردہ پوشی تو درکنار عماد الملک کے حال میں ماثر الامرا میں یہ درج ہے کہ ہولکر نے بغیر عماد الملک کی مرضی اور اطلاع کے سکندر آباد پر حملہ کر دیا تھا۔ حالانکہ یہ بات تاریخ کے خلاف ہے۔

اس تاریخی فروگذاشت کا احساس خود میر عبدالحی خاں کو بھی تھا۔ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں۔

"امید از مطالعہ کنندگان ایں کتاب آنست کہ اگر سہوے یا خطائے بہ نظر آید در اصلاح کوشند و بہ نظر عیب پوشی پوشند" عیب پوشی بہترین صفت ہے مگر اس صورت میں جب کسی کی تضحیک و توہین نہ کی جائے۔ میر میران کے حال میں مدخولہ کا ذکر کر دیا مگر امیر خاں انجام کے حال میں اس کو واضح نہ کیا۔ اس سے اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔

سعادت علی خاں برہان الملک یہ صفدر جنگ کے حقیقی ماموں تھے اور خسر بھی۔ چنانچہ وقائع عالم شاہی میں مولانا عرشی کی تحریر ملاحظہ ہو "ذیقعدہ ۱۱۵۱ھ (۱۰ مارچ ۱۷۳۹ء) میں برہان الملک کا انتقال ہوا تو محمد شاہ بادشاہ نے ان کے صغیر السن بیٹے کو صوبہ دار مقرر کر کے صفدر جنگ کو بدستور نائب اور متولی امور حکومت رکھا۔ اس کی خوش قسمتی سے وہ بچہ مر گیا اور یہ بالاستقلال صوبہ دار بنا یا گیا مگر اس عہدے کے حاصل کرنے کی غرض سے نادر شاہ کو دو کروڑ روپے کی رشوت دینا پڑی (وقائع عالم شاہی مطبوعہ رامپور صفحہ ۱۷۲)"

آثرالامرا صفحہ ۲۲۶ مطبوعہ کلکتہ پریس ۱۸۸۵ء میں تحریر ہے "پسرے از دا برهان الملک) نماند حمیدۂ او با ابوالمنصور خاں منسوب بود" کے مطابق گویا برهان الملک کو کوئی اولاد نرینہ نہ تھی جو سراسر تاریخ کے خلاف ہے۔ آثرالامرا کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ تین شخصوں کے بعد مرحوم پروفیسر عربی و فارسی پریسیڈنسی کالج کلکتہ نے اس میں مزید تصحیح و تالیف کردی ہے گویا بجائے تین چار مؤلف ہو گئے۔

نواب لطف اللہ خاں صادق آثرالامرا کی تحریر ہے "از شیخ زادہائے انصاری وطنش پانی پت است دقتیکہ خلد منزل عہدہ بار پادشاہی آ نمود از کم رتبگی بہ پایہ عمدگی رسید" خلد منزل سے مراد بہادر شاہ اول اتنی سی عبارت میں ابتدائے اسلام سے زوال سلطنت مغلیہ تک کی تاریخ پوشیدہ ہے۔ بجائے شیخ زادہائے انصاری یوں بھی تحریر کیا جاسکتا تھا کہ از اولاد حضرت ایوب انصاری۔ لطف اللہ خاں صادق کے دوسرے بیٹے شاکر خاں اپنی گلشن صادق میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت ایوب انصاری کے صاحبزادے حضرت ابو منصور مست نے جناب خلیفۂ ثالث کے عہد میں بڑے معرکے انجام دیئے ان کا شمار اولیائے دولت اسلامیہ میں ہے انھوں نے ہرات میں اقامت اختیار کی اور وہیں وفات پائی۔ ابو منصور کی ساتویں پشت میں شیخ الاسلام حضرت ابی اسمعیل خواجہ عبداللہ انصاری ہوئے جنھوں نے نظام الملک طوسی کے عہد میں علوم دینیات و فقہ و فقر و غنا میں کافی نام پیدا کیا تھا۔ انھوں نے چند کلمات نظام الملک طوسی کو بطور نصیحت کہے تھے جو حسب ذیل ہیں "در رعایت رعایا کوش و عیب مردم بپوش و دین و دنیا مفروش۔ یا نظام ہرکہ دو خصلت شعار خود سازد در دنیا و آخرت کار خود سازد...... وغیرہ وغیرہ"

شیخ الاسلام ابو اسمعیل کی ساتویں پشت میں محمد امیر شیخ ابو اسحاق ہوئے جو بادشاہ شیراز تھے۔ ان کا زمانہ وہی تھا جو حافظ شیرازی کا چنانچہ حافظ شیرازی ایک قصیدے میں ان کا ذکر یوں کرتے ہیں ؎

خدایگان سلاطین مغرب و مشرق — خدیو کشور عفو و کرم باستحقاق

سپہر علم و حیا آفتاب جاہ و جلال — جمال دنیا و دیں شاہ ابواسحاق

ابو اسحاق کے بعد کئی پشتیں ایران میں گذریں۔ آخر خواجہ ملک علی سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں وارد ہندوستان ہوئے غیاث الدین بلبن نے انھیں مناسب عہدہ دیا۔ عہد شاہ جہاں میں اسی خاندان کے بزرگ خواجہ عبدالرزاق کو میر عبداللہ مشکیں رقم استاد بادشاہ نے بادشاہ کے حضور میں پیش کیا۔ بادشاہ نے چار ہزاری منصب عطا کیا اور کچھ دنوں کے بعد انھیں گورکھپور کی صوبہ داری پر فائز کیا خواجہ عبدالرزاق نے گورکھپور کے سرکش زمینداروں کو سر کیا اور غنیم کا قلع قمع کیا۔ بادشاہ کی طرف سے انھیں "گروہ توڑ" کا خطاب ملا۔ شاہ جہاں کے عہد میں عربی کے مناسب الفاظ کا ترجمہ اردو میں کیا جارہا تھا چنانچہ یہ لفظ گروہ توڑ ترجمہ ہے عربی کے لفظ "ہادم القلاع" کا۔ عبدالرزاق خاں کے تین صاحبزادے دلیر دل خاں، لطف اللہ خاں صادق اور شیر افگن خاں سب کے سب اونچے عہدوں پر فائز ہوئے۔

دلیر دل خاں عہد عالمگیر میں دیوانی و میر سامانی و بخشی گیری کے عہدوں پر فائز رہے۔ یہاں تک کہ عہد محمد شاہ میں ملتان، ٹھٹھہ اور لاہور کے صوبہ دار بھی رہے بادشاہ نے "معین الدولہ نصیر جنگ" کا خطاب عطا کیا تھا۔ ان کی ایک صاحبزادی کی شادی جمیل الدین ابن لطف اللہ خاں صادق سے ہوئی تھی (گلشن صادق)

شیر افگن خاں عبدالرزاق خاں کے تیسرے صاحبزادے تھے عہد محمد شاہ میں ہفت ہزاری کا منصب پایا۔ مالوہ، ملتان اور کڑہ الٰہ آباد کے صوبہ دار بھی رہے بادشاہ نے عزت الدولہ بہادر صفدر جنگ کا خطاب بھی دیا تھا۔ آثرالامرا کی تحریر ہے "دلیر دل خاں برادر راست کہ ہمراہ ابرار الامرا بہ منصب ۳ ہزاری رسیدہ و برادر سوم او شیر افگن خاں است کہ بہ فوجداری کڑہ مضاف الہ آباد سرافراز شدہ۔ از پسرانش (لطف اللہ خاں) عنایت خاں راسخ و شاکر خاں بقدر ترقی کردند"

نواب جعفر خاں راغب نبیرہ عنایت خاں راسخ اپنی تالیف "گلزار جعفری" (مجموعہ خطوط فارسی میرزا ناخر مکین) میں تحریر فرماتے ہیں "محمد جعفر خاں المتخلص براغب ابن ہدایت اللہ خاں مرحوم نبیرہ شمس الدولہ لطف اللہ خاں صادق و نبیرہ عزت الدولہ شیر افگن خاں" گویا شجرہ نسب یوں ہوا۔

عبدالرزاق خاں گروہ توڑ
- دلیر دل
- لطف اللہ خاں صادق
  - عنایت خاں راسخ
  - شاکر خاں
- شیر افگن
  - دختر — ہدایت اللہ خاں

جعفر خاں راغب

جعفر خاں راغب
مہدی علی خاں

جلال الدین علی خاں ناثر — عارفہ بیگم
بہادر شاہ عظیم آبادی
اولاد

جب محمد شاہ نے قطب الملک عبد اللہ خاں اور امیر الامرا سید حسین علی خاں کو کا کو پھینکنا چاہا تو شیر افگن خاں نے بادشاہ کا ساتھ دیا (عام مورخ عبید اللہ خاں کو عبد اللہ خاں لکھتے ہیں مگر یہ غلط ہے۔ قطب الملک عبید اللہ خاں کے والد کا نام عبد اللہ خاں تھا جن کے کئی صاحب زادے تھے۔ عبید اللہ خاں۔ سید حسین علی خاں، سید نجم الدین حسین خاں، سید زین الدین حسین خاں عرف میر زنیا)

کہتے ہیں کہ عین لڑائی میں جب سید نجم الدین حسین خاں کا ہاتھی شیر افگن خاں کے ہاتھی کے سامنے آیا تو شیر افگن خاں نے ایک تیر ایسا تاک کے چلایا کہ نجم الدین حسین خاں کی آنکھیں جاتی رہیں۔ شیر افگن خاں نے عین حالت اضطراب میں آگے بڑھ کے اپنا ہاتھی نجم الدین خاں کے ہاتھی سے ملا دیا۔ صاحب سلامت اور مزاج پرسی کی۔ سید نجم الدین حسین خاں نے ہاتھ بڑھا دیا اور شیر افگن خاں ان کے ہاتھی پر سوار ہو کے انھیں عین میدان جنگ سے بادشاہ کے حضور میں لے گئے۔ بادشاہ کو رحم آگیا اور انھیں شیر افگن خاں کے حوالے کر دیا۔ شاکر خاں نے تفصیل سے اس واقعہ کو گلشن صادق میں لکھا ہے۔ گلشن صادق کا قلمی نسخہ خدا بخش خاں مرحوم کی لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ ۱۱۴۳ھ میں شیر افگن خاں نے بیمار ہو کر رحلت کی۔

لطف اللہ خاں صادق خواجہ عبد الرزاق کے منجھلے بیٹے تھے۔ اورنگ زیب کے عہد میں محمد معظم شاہ بہادر شاہ اول کے بیٹے جہاں شاہ کے اتالیق تھے اور بخشی۔ اس کے بعد شہزادے کے مدار علیہ مقرر ہوئے۔ جہاں شاہ نے یہ تحریر اپنے ہاتھوں سے لکھ دی تھی "ارادت مند صادق خیر خواہ لائق لطف اللہ خاں صادق موفق بہ توفیقات حسنہ بود بداند کہ آں سعادت مند مسخر طلب نمودہ کہ مشتمل بر رضا مندی خود نوشتہ دادہ شود۔ بنا برآں کلمہ چند نوشتہ شود بیاد صادق الحمد کہ او مسلم صادق است"۔

چند سطروں کے بعد شاہزادے جہاں شاہ نے یہ قطعہ لکھا ہے ؎

یاد روزے کہ بعد زادن تو — ہمہ خنداں شدند و تو گریاں
ہم چناں زی کہ بعد مردن تو — ہمہ گریاں شوند و تو خنداں

جب بہادر شاہ اول نے اپنے بھائیوں پر فتح پائی تو وزارت کا سوال پیدا ہوا۔ وہ منعم خاں خانخاناں کو وزارت کا عہدہ دینا چاہتا تھا مگر اسد خاں آصف الدولہ (پدر ذوالفقار الدولہ) نے اپنے حقوق کو بادشاہ پر ظاہر کر دیا۔ وہ عالمگیر کے عہد میں وزیر رہ چکا تھا۔ تذبذب کے عالم میں بادشاہ نے جہاں شاہ کے مدار علیہ لطف اللہ خاں صادق سے استفسار کیا اور لطف اللہ خاں نے اسد خاں کے حق میں رائے دی۔ بادشاہ خوش ہو گیا اور اس نے ان کو خان صادق کا خطاب مرحمت کیا۔ علم و نقارہ سپرد کیا۔ اسی واقعہ کو صاحب مآثر الامرا نے یوں مختصراً لکھا ہے "در لقب او لفظ صادق افزودند کہ آں زبان زد عوام است"

بہادر شاہ اول کے مرنے کے بعد حصول اقتدار کے لئے اس کے چاروں لڑکوں میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ بہادر شاہ کی لاش بے گور و کفن ایک ماہ تک کس مپرسی میں پڑی رہی۔ عظیم الشان متمول اور صاحب اقتدار تھا۔ وہ عظیم آباد کا بانی تھا اور دلی ہی کی طرح اس نے اپنے عہد نظامت بہار میں پٹنہ کے محلوں کے نام مغل پورہ دیوان محلہ گذری بیوا ان شکوہ وغیرہ رکھا تھا۔ ذوالفقار الدولہ نے عظیم الشان کی قوت و ثروت دیکھ کے تینوں شاہزادوں، جہاندار شاہ رفیع الشان اور جہاں شاہ کو آپس میں ملا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عظیم الشان کی شکست ہوئی۔ لطف اللہ خاں صادق اس معرکہ میں جہاں شاہ کی طرف تھے۔ مگر جب سلطنت کے تقسیم کرنے کا سوال پیدا ہوا تو جہاں دار شاہ نے ٹالنا چاہا۔ پھر دوسری جنگ شروع ہو گئی۔ جہاں شاہ نے مختصر سے لشکر سے حملہ کر دیا بقول مآثر الامرا "جہاں شاہ در عین معرکہ با قلیلے از کمر گاہ خود را بر قول معز الدین زدہ متفرق ساخت حتیٰ لال کنور۔ معشوقہ جہاندار شاہ (کہ بے او آنے بسر نمی برد) ہراگندہ شدہ بہ لاہور گریخت و جہاندار شاہ خود را بہ پناہ بڑا دھا کشید۔ نقارچیان فتح جہاں شاہ بہ نوازش درآمد۔ چنانچہ بہمیں خبر دہلاد و در دست خطبہ او خواندند کہ ناگاہ تفنگے بہ جہاں شاہ رسیدہ درگذشت۔ ذوالفقار الدولہ (کہ در مراحل جنگ توپ و تفنگ استعمال داشت) مطلع شدہ، بر فوج حق تاختہ منہزم م ...."۔

مآثر الامرا صفحہ ۲۶۴ مطبوعہ کلکتہ پریس ۱۸۸۵ء میں تحریر ہے "پسرے از (برہان الملک) نماند ہمشیرزادہ با ابو المنصور خاں منسوب بود۔ مآثر الامرا کے مطابق گویا برہان الملک کو کوئی اولاد نرینہ نہ تھی جو سراسر تاریخ کے خلاف ہے۔ مآثر الامرا کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ تین شخصوں کے بعد مرتب ہوا اور پروفیسر عربی و فارسی پریسیڈنسی کالج کلکتہ نے اس میں مزید تصحیح و تالیف کر دی ہے گویا بجائے تین چار مؤلف ہو گئے۔

نواب لطف اللہ خاں صادق مآثر الامرا کی تحریر ہے "از شیخ زادہائے انصاری وطنش پانی پت است۔ وقتیکہ خلد منزل عہدہ دار پادشاہی آمد وقت نمود از کم رتبگی بہ پایہ عمدگی رسید" خلد منزل سے مراد بہادر شاہ اول ہے۔ اتنی سی عبارت میں ابتدائے اسلام سے زوال سلطنت مغلیہ تک کی تاریخ پوشیدہ ہے بجائے شیخ زادہائے انصاری یوں بھی تحریر کیا جا سکتا تھا کہ از اولاد حضرت ایوب انصاریؓ۔ لطف اللہ خاں صادق کے دوسرے بیٹے شاکر خاں اپنی تالیف گلشن صادق میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت ایوب انصاری کے صاحبزادے حضرت ابو منصور مست نے جناب خلیفہ ثالثؓ کے عہد میں بڑے معرکے انجام دیئے ان کا شمار اولیائے دولت اسلامیہ میں ہے انھوں نے ہرات میں اقامت اختیار کی اور وہیں وفات پائی۔ ابو منصور کی ساتویں پشت میں شیخ الاسلام حضرت ابو اسمٰعیل خواجہ عبداللہ انصاری ہوئے جنھوں نے نظام الملک طوسی کے عہد میں علوم دینیات و فقہ و فقر و غنا میں کافی نام پیدا کیا تھا۔ انھوں نے جو چند کلمات نظام الملک طوسی کو بطور نصیحت کہے تھے حسب ذیل ہیں "در رعایت دلہا کوش و عیب مردم بپوش و دین و دنیا مفروش۔ یا نظام ہر کہ دہ خصلت شعار خود سازد در دنیا و آخرت کار خود سازد ...... وغیرہ وغیرہ"

شیخ الاسلام ابو اسمٰعیل کی ساتویں پشت میں محمد امیر شیخ ابو اسحاق ہوئے جو بادشاہ شیراز تھے۔ ان کا زمانہ وہی تھا جو حافظ شیرازی کا چنانچہ حافظ شیرازی ایک قصیدے میں ان کا ذکر یوں کرتے ہیں ؎

خدایگانِ سلاطین مغرب و مشرق — خدیو کشور عفو و کرم باستحقاق
سپہر علم و حیا آفتاب جاہ و جلال — جمال دنیا و دیں شاہ ابو اسحاق

ابو اسحاق کے بعد کئی پشتیں ایران میں گذریں۔ آخر خواجہ ملک علی سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں وارد ہندوستان ہوئے۔ غیاث الدین بلبن نے انھیں مناسب عہدہ دیا۔ عہد شاہ جہاں میں اسی خاندان کے بزرگ خواجہ عبد الرزاق کو میر عبد اللہ مشکیں رقم استاد بادشاہ نے بادشاہ کے حضور میں پیش کیا۔ بادشاہ نے چار ہزاری منصب عطا کیا اور کچھ دنوں کے بعد انھیں گورکھپور کی صوبہ داری پر فائز کیا۔ خواجہ عبد الرزاق نے گورکھپور کے سرکش زمینداروں کو سر کیا اور غنیم کا قلع قمع کیا۔ بادشاہ کی طرف سے انھیں "گرہ توڑ" کا خطاب ملا۔ شاہ جہاں کے عہد میں عربی کے مناسب الفاظ کا ترجمہ اردو میں کیا جا رہا تھا چنانچہ یہ لفظ گرہ توڑ ترجمہ ہے عربی کے لفظ ہادم القلاع کا۔ عبد الرزاق خاں کے تین صاحبزادے دلیر دل خاں، لطف اللہ خاں صادق اور شیر افگن خاں۔ سب کے سب اونچے عہدوں پر فائز ہوئے۔

دلیر دل خاں عہد عالمگیر میں دیوانی دیبر سامانی و بخشی گیری کے عہدوں پر فائز رہے۔ یہاں تک کہ عہد محمد شاہ میں ملتان، ٹھٹھہ اور لاہور کے صوبہ دار بھی رہے بادشاہ نے "معین الدولہ نصیر جنگ" کا خطاب عطا کیا تھا۔ انکی ایک صاحبزادی کی شادی جمیل الدین ابن لطف اللہ خاں صادق سے ہوئی تھی (گلشن صادق)

شیر افگن خاں عبد الرزاق خاں کے تیسرے صاحبزادے تھے۔ عہد محمد شاہ میں ہفت ہزاری کا منصب پایا۔ مالوہ، ملتان اور کڑہ الہ آباد کے صوبہ دار بھی رہے بادشاہ نے عزت الدولہ بہادر صفدر جنگ کا خطاب بھی دیا تھا۔ مآثر الامرا کی تحریر ہے "دلیر دل خاں برادر راست کہ ہمراہ امیر الامرا بود بمنصب ہفت ہزاری رسیدہ و برادر سوم او شیر افگن خاں است کہ بہ فوجداری کڑہ مضاف الہ آباد سرافراز شدہ۔ از پسرانش (لطف اللہ خاں) عنایت خاں راسخ و شاکر خاں بقدر ترقی کردند"

نواب جعفر خاں راغب نبیرہ عنایت خاں راسخ اپنی تالیف "گلزار جعفری" (مجموعہ خطوط فارسی میرزا فاخر مکین) میں تحریر فرماتے ہیں "محمد جعفر خاں المتخلص براغب ابن ہدایت اللہ خاں مرحوم نبیرہ شمس الدولہ لطف اللہ خاں صادق و نبیرہ عزت الدولہ شیر افگن خاں" گویا شجرہ نسب یوں ہوا۔

عبد الرزاق خاں گرہ توڑ
- دلیر دل
- لطف اللہ خاں صادق
  - عنایت خاں راسخ
    - ہدایت اللہ خاں
  - شاکر خاں
- شیر افگن
  - دختر — ہدایت اللہ خاں

جعفر خاں راغب

جعفر خاں راغب
مہدی علی خاں

جلال الدین علی خاں تائب — عارفہ بیگم
بادرشاہ عظیم آبادی

اولاد

جب محمد شاہ نے قطب الملک عبید اللہ خاں اور امیر الامرا سید حسین علی خاں کا تختہ الٹنا چاہا تو شیر افگن خاں نے بادشاہ کا ساتھ دیا (عام مورخ عبید اللہ خاں کو عبد اللہ خاں لکھتے ہیں مگر یہ غلط ہے۔ قطب الملک عبید اللہ خاں کے والد کا نام عبد اللہ خاں تھا جن کے کئی صاحب زادے تھے۔ عبید اللہ خاں۔ سید حسین علی خاں، سید نجم الدین حسین خاں، سید زین الدین حسین خاں عرف میر زنیا)

کہتے ہیں کہ عین لڑائی میں جب سید نجم الدین حسین خاں کا ہاتھی شیر افگن خاں کے ہاتھی کے سامنے آیا تو شیر افگن خاں نے ایک تیر ایسا تاک کے چلایا کہ نجم الدین حسین خاں کی آنکھیں جاتی رہیں۔ شیر افگن خاں نے عین حالت اضطراب میں آگے بڑھ کے اپنا ہاتھی نجم الدین خاں کے ہاتھی سے ملا دیا۔ صاحب سلامت اور مزاج پرسی کی۔ سید نجم الدین حسین خاں نے ہاتھ بڑھا دیا اور شیر افگن خاں ان کے ہاتھی پر سوار ہو کے انھیں عین میدان جنگ سے بادشاہ کے حضور میں لے گئے۔ بادشاہ کو رحم آگیا اور انھیں شیر افگن خاں کے حوالے کر دیا۔ شاکر خاں نے تفصیل سے اس واقعہ کو گلشن صادق میں لکھا ہے۔ گلشن صادق کا قلمی نسخہ خدا بخش خاں مرحوم کی لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ ۱۱۴۳ھ میں شیر افگن خاں نے بعارضہ سل رحلت کی۔

لطف اللہ خاں صادق خواجہ عبد الرزاق کے منجھلے بیٹے تھے۔ اورنگ زیب کے عہد میں محمد معظم شاہ بہادر شاہ اول کے بیٹے جہاں شاہ کے اتالیق تھے اور بخشی۔ اس کے بعد شہزادے کے مدار علیہ مقرر ہوئے۔ جہاں شاہ نے یہ تحریر اپنے ہاتھوں سے لکھ دی تھی: "ارادت مند صادق خیر خواہ لائق لطف اللہ خاں صادق موفق بہ توفیقات حسنہ بود۔ بداند کہ آں سعادت مند مستحق طلب نمودہ کہ مشتمل بہ رضا مندی خود نوشتہ دادہ شود۔ بنا بر آں کلمہ چند نوشتہ شود۔ بار صادق الحمد کہ او مسلم صادق است۔"

چند سطروں کے بعد شاہزادے جہاں شاہ نے یہ قطعہ لکھا ہے ؎

یاد روزے کہ بعد زادن تو	ہمہ خنداں شدند و تو گریاں
ہم چناں زی کہ بعد مردن تو	ہمہ گریاں شوند و تو خنداں

جب بہادر شاہ اول نے اپنے بھائیوں پر فتح پائی تو وزارت کا سوال پیدا ہوا۔ وہ منعم خاں خانخاناں کو وزارت کا عہدہ دینا چاہتا تھا مگر اسد خاں آصف الدولہ (پدر ذو الفقار الدولہ) نے اپنے حقوق کو بادشاہ پر ظاہر کر دیا۔ وہ عالمگیر کے عہد میں وزیر رہ چکا تھا۔ تذبذب کے عالم میں بادشاہ نے جہاں شاہ کے مدار علیہ لطف اللہ خاں صادق سے استفسار کیا اور لطف اللہ خاں نے اسد خاں کے حق میں رائے دی۔ بادشاہ خوش ہو گیا اور اس نے ان کو خان صادق کا خطاب مرحمت کیا۔ علم و نقارہ سپرد کیا۔ اسی واقعہ کو صاحب مآثر الامرا نے یوں مختصراً لکھا ہے "و لقب او کہ لفظ صادق افزودہ شدہ وجہ آں زبان زد عوام است"

بہادر شاہ اول کے مرنے کے بعد حصول اقتدار کے لئے اس کے چاروں لڑکوں میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ بادشاہ کی لاش بے گور و کفن ایک ماہ تک کس مپرسی میں پڑی رہی۔ عظیم الشان متمول اور صاحب اقتدار تھا۔ وہ عظیم آباد کا بانی تھا اور دہلی ہی کی طرح اس نے اپنے عہد نظامت بہار میں پٹنہ کے محلوں کے نام مغل پورہ دیوان محلہ گذری نیو ان شکوہ وغیرہ رکھا تھا۔ ذو الفقار الدولہ نے عظیم الشان کی قوت و ثروت دیکھ کے تینوں شاہزادوں جہاندار شاہ رفیع الشان اور جہاں شاہ کو آپس میں ملا دیا۔ نتیجہ ہوا کہ عظیم الشان کی شکست ہوئی لطف اللہ خاں صادق اس معرکہ میں جہاں شاہ کی طرف تھے۔ مگر جب سلطنت کے تقسیم کرنے کا سوال پیدا ہوا تو جہاندار شاہ نے نام لیا چاہا۔ پھر دوسری جنگ شروع ہو گئی۔ جہاں شاہ نے مختصر سے لشکر سے حملہ کر دیا بقول مآثر الامرا "جہاں شاہ در عین معرکہ با قلیلے از کمرگاہ خود دار بر قول معز الدین زدہ متفرق ساخت حتیٰ لال کنور معشوقہ جہاندار شاہ (کہ بے او آنی صبر نمی بود) سراگندہ شتہ بہ لاہور گریخت و جہاندار شاہ خود را بہ پناہ بہ پڑا دحا کشید۔ نقارہ ہائے فتح جہاں شاہ بہ نوازش در آمد۔ چنانچہ بہمیں خبر و بلاد و در دست خطبہ او خواندند کہ ناگاہ تفنگے بہ جہاں شاہ رسیدہ در گذشت۔ ذو الفقار الدولہ (کہ در ہر اول جنگ توپ و تفنگ اشتعال داشت) مطلع شدہ، بر فوج تاختہ منہزم .... "۔

یہ خوافی خاں کے حال میں تحریر ہے مگر اس میں لطف اللہ خاں صادق کا کہیں ذکر نہیں ہے اور نہ اس معرکہ کا لطف اللہ خاں صادق کے حال میں ذکر ہے۔ یادگار سعادت خاں بن کفایت خاں جو اس معرکہ میں شریک تھے تحریر کرتے ہیں۔

"زماں زد و گیر و دار خاں صادق را تیر تفنگ مار علیہ حملہ کار ہائے آں شاہزادہ نمودہ غبار بود تا رمقے از حیات شاہزادہ باقی بود بہ ایں کہ ہمراہیاں بہ زخم مقتول و مجروح برتے مغز در شدن، خان مرحوم رو از عرصہ کار زار نہ پیچید۔"

بہادر شاہ نے کچھ سمجھ کے خان صادق کا خطاب عطا کیا تھا۔ سچے دیندار مسلمان ایسے ہی ہوتے ہیں۔ فرخ سیر کے عہد میں ایک واقعہ اور ہوا تھا جس کا ذکر مآثر الامرا اور تاریخ مظفری دونوں میں ہے۔

"قطب الملک دیوانی خالصہ بنام او (لطف اللہ خاں) تجویز نمود و بادشاہ دیوانی تعلقہ بنام چھیلا رام ناگر مقرر کردہ بود۔ بدیں تقریب ابین بادشاہ و حضرت کدورت واقع شد۔ قطب الملک گفتہ کہ بہر گاہ تجویز اول وزیر پذیرا شد استقلال او معلوم۔ آخر تعلقہ مزبور بنام خان سطور بحال یافت"

یہ واقعہ صحیح ہے کہ سید برادران اور بادشاہ کے درمیان میں کدورت کا سب سے بڑا سبب فرخ سیر کی بد زبانی تھی۔ وہ تعلیم یافتہ نہ تھا۔ کم سن اور ناتجربہ کار وہ آداب شاہی کے خلاف حرکتیں کر جاتا تھا چنانچہ بقول صاحب سیر المتاخرین و صاحب تاریخ مظفری فرخ سیر نے دونوں بھائیوں کو بھرے دربار میں گالیاں دیں۔ تذکرۃ الاسلاف مولفہ شاہ عظیم آبادی میں دونوں تاریخوں کے حوالے سے یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔

"امیر الامرا و قطب الملک از برائے اتمام حجت چنانکہ بارہا اتفاق افتادہ بود پیش فرخ سیر رفتہ بودند۔ در جواب نصائح سودمند نواب امیر الامرا و قطب الملک را دشنام مغلظہ بر زبان راند، امیر الامرا کہ شجاعت بے نہایت و غیرت بدرجہ غایت داشت تاب نہ آوردہ خواست کہ جیب آں بیہودہ دہن بے باک کو پاس حرمت آل اطہر سید البشر ہم روا نداشتہ بفرماید۔ اما فرخ سیر از سر سلطنت گریختہ پناہ در نسوان حرم خود برد"

یہ صحیح ہے کہ جھگڑے کی ابتدا دیوانی خالصہ سے ہوئی مگر فرخ سیر کی معزولی کی وجہ درحقیقت اس کی بد زبانی تھی پھر کوئی دوسری ایسی مثال نہیں ہے کہ ان دونوں نے کسی اور بادشاہ کو تخت پر بٹھا کے اتارا ہو رفیع الدرجات اور رفیع اللہ اپنی موت سے مر گئے۔ محمد شاہ نے پارٹی سے سازش کر کے ان دونوں کو ختم کر دیا۔ اس کے برخلاف عماد الملک نے جو تین بادشاہوں کے ساتھ سلوک کیا وہ اظہر من الشمس ہے۔ تورانی پارٹی جب برسر اقتدار آئی تو عماد الملک کے عہد وزارت میں صاحب مآثر الامرا شاہنواز خاں کو دہلی سے دکن میں ماہی و مراتب بھیجے گئے بقول غلام علی آزاد:

"دریں ایام سلطان دہلی عالمگیر ثانی برائے نواب صمصام الدولہ ماہی و مراتب فرستاد۔ شخصے ایں مصرعہ تاریخ یافت سہ لہ شاہ ہند آمد ماہی و مراتب"

یہ وہ زمانہ تھا جب عماد الملک بادشاہ گر بنا ہوا تھا۔ ۱۱۶۷ھ میں اس نے احمد شاہ کو نابینا کرا دیا۔ اس کو مع اس کی ماں ادھم بائی کے قید کیا اور آخر قتل کرا دیا۔ اس کے بعد اس نے عالمگیر ثانی کو قید سے باہر کر کے تخت پر مثل شطرنج بٹھا دیا۔ شاہزادہ عالی گوہر اس کے خوف سے بھاگ نکلا اور الہ آباد و بہار میں آوارہ پھرنے لگا۔ شاہ عالم کے اس زمانے کے حالات پر میرزا فاخر مکین کے فارسی کے خطوط سے روشنی پڑتی ہے۔

میرزا فاخر مکین کے خطوط کا مجموعہ ان کے عزیز ترین شاگرد نواب جعفر خاں راغب نے "گلزار جعفری" کے نام سے مرتب کیا ہے اور اس کا اصلی مسودہ راقم الحروف کے پاس اس وقت تک محفوظ ہے چونکہ اس کے خاندان کی چیز ہے۔ اس میں زیادہ تر خطوط نواب جعفر خاں راغب (لطف اللہ خاں صادق کے پرپوتے اور عنایت خاں راسخ کے پوتے) کے نام ہیں۔ ایک خط محمد علی خاں مرحوم مصنف تاریخ جعفری و محمدی برادر عینی نواب جعفر خاں راغب کے نام لکھا ہے۔ فاخر کے اس خط سے پتہ چلتا ہے کہ تاریخ مظفری کا خطبہ فاخر مکین کا لکھا ہوا ہے۔

"بہ تقریب ارسال مسودہ خطبہ تالیف خطے کہ نوشتہ اند محظوظ ساختہ الہی بزیر سایۂ بزرگاں دیر گاہ بسلامت باشند۔ بارے غنیمت است کہ برخلاف نوجوانان عصر بیکاری را باشتغال کتب صرف می کنید۔ تد ہم اوقات افسوس کہ عمر ہا بغفلت بر باد دادیم۔ حالانکہ نزدیک پیری رسیدیم چوں بچشم نظر کشادیم جہاں آخر یار بینہ کہ بودیم خود را دیدیم۔ در لیغا حسرتا سہ

عمر آخر شد دا لکارہ آدم نشدیم ‎ ‎ ‎ ‎ گرچہ مو دا ست قضا ایں ہمہ سوہاں مارا

شما کہ بفضل و کرمہ خدا ہنوز در عمر جوانی بدانید سہ

جہاناں رہ طاعت امروز گیر ۔۔۔۔ کہ فردا جوانی نہ آید ز پیر "

چند سطروں کے بعد "مسودہ دیدہ نجیدہ مرسل شد زیادہ شوق"

تاریخ مظفری کا سن تصنیف ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء ہے ۔ چنانچہ فاخر مکیں کا یہ خط بھی اسی زمانہ کی یادگار ہے ۔ جعفر خاں راغب نے جو رباعی "گلزار جعفری" کے متعلق کہی ہے حسب ذیل ہے ؎

این نسخہ کہ رنگینیٔ اتمام گرفت ۔۔۔۔ صد شکر بدلخواہ سرانجام گرفت
بشگفت چوں راغب ازل گل باغ مراد ۔۔۔۔ صد برگ ولوا گلشن ایام گرفت

اسی گلزار جعفری میں میرزا فاخر مکیں نے میرزا سودا سے ... اپنے جھگڑے کا ذکر نپے تلے لفظوں میں کیا ہے ۔ اس مختصر سے واقعہ کو صاحب آب حیات نے ایک افسانہ بنا ڈالا ہے ۔ انشاء اللہ کبھی آئندہ اس پر تفصیل سے مقالہ پیش کیا جائے گا ۔ سودا کے متعلق جو فاخر مکیں نے ایک طویل غزل کہی ہے وہ ایک دوسرے خط میں موجود ہے ۔ میں صرف دو شعر پیش کر دیتا ہوں ؎

نہ دید از خود فرد شی دشمن ما جنس بہبودی ۔ بہ بازار جہاں دارد متاع سود لئے بے سودی
ندارد دیگر غیر از آہ محرومی دم دوری ۔۔۔۔ بر این بے مایگی جوش خریداران ملیح (پڑھا نہیں گیا)

الغرض لطف اللہ خاں صادق ایسے تھے کہ ان کی اولادوں نے ایسی ایسی نادر کتابیں "گلشن صادق" "تاریخ مظفری" "گلزار جعفری" اور کلام شاد عظیم آبادی چھوڑی ہیں ۔ جب احمد شاہ کے عہد میں تورانی پارٹی برسر اقتدار آئی تو لطف اللہ خاں صادق نے عہدہ خانسامانی اور منصب ہفت ہزاری کو ترک کیا اور خانہ نشیں ہو گئے ۔ ان کے صاحبزادے عنایت خاں راسخ نے بھی یہی کیا اور سہ ہزاری کے منصب کو ترک کیا ۔

خاں صادق نے ۱۱۵۵ھ میں اٹھاسی سال کی عمر میں اپنی حویلی جو دہلی میں کشمیری دروازے کے متصل تھی قضا کی ۔ حسب وصیت لاش پٹنہ لائی گئی ۔ قطعہ تاریخ رحلت یہ ہے ؎

خان صادق کہ بحر جنید ایران زماں ۔۔۔۔ بہتر از جملہ بہ توقیر دا مانت آمد
بے سر و صف نگر و از قوم رحلت او ۔۔۔۔ نائب سلطنت هند بہ جنت آمد
۱۱۵۵ھ

خان صادق فقرا و مساکین پر اس قدر بے دریغ خرچ کرتے تھے کہ ایک دفعہ فرخ سیر بادشاہ نے خود ان سے پوچھا تھا خان صادق شما از برائے عیال ہم چیزے میگذارید یا ہمہ را خرچ ساختہ امور خیر میکنید ۔ "گلشن صادق تذکرۃ الاسلاف" ۔

غرض ایسے پاکباز اور دین دار امیر کے متعلق آپ نے مآثر الامرا کی تحریر دیکھ لی ۔ اس سے مؤلف کی تنگ نظری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ خان صادق کو شعر و شاعری میں بھی دخل تھا ۔ چنانچہ ایک خط میں دو اشعار جو انھوں نے برہان الملک سعادت علی خاں صوبہ دار اودھ کو لکھ بھیجے تھے ملاحظہ ہوں ؎

گہے چو شانہ بہ زلف سیاہ می پیچم ۔۔۔۔ گہے چو سرمہ بہ بلائے نگاہ می پیچم
چناں بہ دیدن روئے خوش تو مشتاقم ۔۔۔۔ کہ نامہ را بہ حریر نگاہ می پیچم

اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی چلے گئے
پھر پھر گل آ چکے، پہ سجن تم بھلے گئے
سودا

نواب مردان علی خاں رعنا

بحیثیت شاعر اور انشا پرداز

امیر حسن نورانی

رعنا غالب کے شاگرد رشید تھے اور ان کو اس پر فخر و ناز تھا۔ جس کا اظہار انھوں نے اپنے متعدد مضامین میں کیا ہے۔ خود غالب بھی ان کے مداح تھے۔ اسی لیے بعض تحریروں میں رعنا کا ذکر تحسین آمیز انداز میں کیا ہے۔ جب ان کو رعنا کی بہادری اور جرأت کا ایک واقعہ معلوم ہوا تو اس کے متعلق اودھ اخبار میں ایک مختصر مضمون لکھا۔ جو ماہ اکتوبر سنہ ۱۸۶۲ء کے ایک شمارے میں شایع ہوا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا غالب کو رعنا سے خصوصی لگاؤ تھا[1]۔ ایک شعر میں رعنا نے غالب کی شاگردی کا اظہار اس طرح کیا ہے؂

طالب اسد اللہ کا غالب کا ہوں شاگرد		بیعت مجھے بے واسطہ ہے شیر خدا سے

رعنا کے حالات زندگی "تلامذۂ غالب" میں تفصیل سے موجود ہیں چند مضامین بھی ان کے حالات اور شاعری پر شایع ہوئے ہیں مگر ان میں کوئی ایسا اضافہ نظر نہیں آیا جو "تلامذۂ غالب" کے علاوہ ہو۔ اسی لیے مناسب نہیں معلوم ہوا کہ ان کے حالات زندگی کو یہاں نقل کیا جائے۔ سطور ذیل میں رعنا کے متعلق ایسی معلومات پیش کرنا مقصود ہے جو اب تک منظر عام پر نہیں آئی ہیں۔ عام طور پر ان کو ایک شاعر سمجھا جاتا ہے۔ اور چوں کہ وہ مرزا غالب سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے اس لیے "تلامذۂ غالب" کے زمرہ میں شامل ہونا ہی ان کی شہرت کا سبب خیال کیا جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ رعنا صرف شاعر ہی نہیں تھے۔ بلکہ ایک اچھے مضمون نگار بھی تھے۔ جو ہر قسم کے علمی ادبی، اصلاحی، سیاسی اور معاشرتی عنوانات پر قلم برداشتہ مضامین لکھا کرتے تھے۔ جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ جنوری سنہ ۱۸۶۲ء سے دسمبر سنہ ۱۸۶۳ء تک ان کے تقریباً پچاس مضامین اور دس بارہ مراسلے اودھ اخبار میں شایع ہوئے۔ اس وقت اخبار مذکور ہفتہ وار شایع ہوتا تھا۔ بعض شماروں میں رعنا کے دو دو مضامین شایع ہوئے۔ ان میں کچھ تو معمولی قسم کے ہیں لیکن بعض قابل قدر ہیں اور علمی و فنی نقطۂ نظر سے اچھے خاصے معیاری ہیں۔ رعنا کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت میں شوخی اور ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی ملک کے سیاسی معاشرتی اور اقتصادی حالات سے پورے طور پر باخبر رہتے تھے۔ اور اکثر معاملات اور مسائل پر آزادی سے اظہار خیال کرتے تھے۔ علمی و ادبی حلقوں میں بھی ان کی قدر و منزلت تھی، لاہور کے ایک شاعر دیوان امرناتھ متخلص بہ اکبری سے ان کی بڑی چشمک تھی اور غالباً اس کا آغاز اسی زمانہ سے ہوا تھا جب رعنا کا قیام بسلسلۂ ملازمت پنجاب میں رہا تھا۔ اکبری کی غزلیں، قصائد اور مضامین "کوہ نور" اخبار لاہور میں شایع ہوتے تھے۔ رعنا کا کلام بھی کوہ نور میں شایع ہوتا تھا رعنا نے اکبری کے کلام پر تنقید کی ان کی غزلوں پر غزلیں لکھیں۔ اور اسی طرح اکبری بھی کرتے تھے۔ دونوں میں بڑی نوک جھونک رہتی تھی۔ اکبری لاہور کے ایک معزز اور دولت مند خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جس کا علم رعنا کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ اودھ اخبار میں تین نہایت طویل تنقیدی مضامین رعنا نے اکبری کے کلام پر لکھے ہیں اور ان کے اعتراضات کے جواب دیئے ہیں۔ چند مضامین ایسے عنوانات پر ہیں جن پر کم لوگوں نے لکھا ہوگا۔ مثلاً فرقہ مختستان کی تاریخ، ارتقا اور ان کی معاشرت پر ایک مفصل مضمون ہے۔ اس طرح "ایک مضمون" التماس فحش فرقہ ملعونہ طوائف "کے عنوان سے لکھا ہے۔ رعنا کو نجوم اور مسمریزم سے بہت دل چسپی تھی اور ان دونوں میں مہارت بھی رکھتے تھے۔ متعدد مضامین ان علوم پر بھی لکھے ہیں۔

---

[1] مرزا غالب کا یہ مضمون میں نے مختصر تعارف اور حوالوں کے ساتھ مرتب کیا تھا جو اردو ادب (علی گڑھ) میں شایع ہو چکا ہے		(امیر حسن نورانی)

تنقیدی مضامین میں اچھی خاصی موشگافیاں نظر آتی ہیں۔ انداز تنقید متوازن نہیں۔ کہیں کہیں شدّت جذبات سے مغلوب ہو کر ایسی عامیانہ سطح پر اتر آتے ہیں کہ تنقید سراپا تنقیص بن جاتی ہے۔ تاہم ان مضامین کو اردو میں تنقید کے ابتدائی دور کی مبادیات کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

رعنا کبھی مقفّیٰ، مسجّع عبارتیں بھی لکھا کرتے تھے۔ "گلدستۂ رعنا" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں انگریزی اقتدار سے قبل ملک کی ابتری اور انتشار کا ذکر استعارہ و کنایہ میں کیا ہے اور انگریزی دور کی خوش انتظامی، امن و سکون کو سراہا ہے۔ اس مضمون کی چند سطور درج ذیل ہیں:۔

ایک باغ سو برس آگے تاراجِ خزاں تھا۔ نام کو باقی اس کا نام و نشان نہ تھا۔ گروہ یارانِ طریقت کا خراماں خراماں اس پر گزر ہوا۔ اہتمام اس کا مدِّنظر ہوا۔ جب عملداری اس پر معمور ہوا۔ نام ظلمت خزاں کا صاف کافور ہوا۔ سعیٔ باغبان سے رفتہ رفتہ رشک رضوان ہوا۔ خار و خس تک پھول پھول سنبلستاں ہوا۔ رشک آب روانی نہر دُرِ آب جوئے کوثر و تسنیم کو پانی کیا۔ صفا و راستی نے ہر روش کو صاف خط کہکشانی کیا۔ غارستان سواد باغ تک سبزۂ بیگانہ ہوا۔

مرغانِ چمن طائرِ سدرہ کے ہم صفیر تھے۔ بجز بادِ صبا کے صرصر کا وہاں کام نہ تھا۔ صیاد و گل چیں کا نام نہ تھا۔ یہ باغبان نے ایک عمر چین سے بسر کی۔ یارانِ طریقت نے دن گلگشت میں کاٹا۔ رات عیش میں سحر کی۔ نہ گل کو گل چیں کا خوف و بیم تھا۔ نہ کسی مرغِ چمن کا ورد ترسِ صیاد سے دل دو نیم تھا۔ پھول پھولے نہ سماتے تھے۔ شاخ پر ثمر شاخ سدرہ کے ہمسر زمین پر بچھے جاتے تھے۔ خاک سرزمین چمن خاک شفا تھی۔ رفعت میں ہر کوشک عرش سے بالا تھی۔ . . .

عام طور سے رعنا صاف و سادہ زبان میں لکھا کرتے تھے۔ محاورات و ضرب الامثال کا برمحل استعمال ان کو خوب آتا تھا۔ طنز و مزاح کی چاشنی بھی ان کی تحریروں میں موجود ہے تاہم وہ کوئی صاحب طرز انشا پرداز نہیں کہے جا سکتے لیکن اردو زبان کے ایک اچھے ادیب ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ ان کا ایک مضمون ہے "تکیہ کلام" اس کی چند سطریں پڑھیے:

"تکیۂ کلام ہزاروں طرح کے ہوتے ہیں۔ ہر ایک کا جدا تکیۂ کلام ہے" جیسے، کیا نام، ہاں صاحب، سمجھے صاحب، آیا خیال، پھر لو، اس کا کیا نام ہے۔ صاحب میرے، محض لوگوں سے تکیۂ کلام الفاظ ثقیلہ ہو جاتے ہیں۔ اور افسوس ہے ؟" (ص ۳۰)

کہ وہ لوگ کیسے بھلے مانس ہیں کہ کسی بھلے مانس کی صحبت میں بیٹھنے کے لائق نہیں۔ (اودھ اخبار ۷ رمئی ۶۲)

رعنا کو چھوٹے چھوٹے نئے اور شگفتہ نام رکھنے کا بہت شوق تھا۔ یہ ان کی عادت سی ہو گئی تھی کہ ہر مضمون کے خاتمے پر اپنا ایک نیا ادبی نام لکھ دیتے تھے۔ اس طرح کے متعدد نام ان کے مضامین کے آخر میں درج ہیں۔ مثلاً "راقم حق نگار" "تجزیہ کار" "راقم چشم دیدہ" "راقم شفا خواہ" "حق پسند" "طلسم شکن" "راقم حسن ظن" "راقم صلح کل" "راقم احسان بے منت" "راقم قیود" "راقم موشگاف" "راقم تن بتقدیر" وغیرہ۔

اودھ اخبار کے مضامین سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۵ فروری ۱۸۶۲ء سے ۳ راکتوبر ۱۸۶۲ء تک رعنا کا قیام لکھنؤ میں رہا۔ یہ تو نہیں معلوم کہ اس طویل قیام کی غرض کیا تھی لیکن اتنا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس زمانہ میں قلمی جہاد بہت زور و شور سے جاری رکھا۔ منشی نولکشور اور غلام محمد خاں تپش ایڈیٹر اودھ اخبار رعنا کے بڑے قدردان تھے اور ان کی بڑی آؤ بھگت کی جاتی تھی۔ رعنا کے بعض مضامین کے آغاز میں منشی نولکشور نے چند سطور بطور تعارف لکھی ہیں اور ان کی شعر گوئی، سخن فہمی اور ذہانت و ذکاوت کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ ٹاڈ کی تاریخ راجستھان کا اردو ترجمہ رعنا کی توجہ اور کوشش سے منشی نولکشور نے طبع کرایا تھا۔

رعنا کے حسب ذیل مطبوعہ مضامین میرے پاس موجود ہیں۔

فہرست مضامین رعنا

نمبر شمار	عنوانات	نوعیت	تاریخ و سن اشاعت
۱	زنانِ مردانہ وار ہند	اصلاح معاشرت	۱۵ مئی ۱۸۶۲ء

۳-	ترمیم در امور تنجیم	علم نجوم	ماہ مئی ۱۸۶۲ء
۴-	تکیہ کلام	اخلاقی	" "
۵-	خیالاتِ رعنا	اخلاقی	" "
۶-	دورۂ ارضی	جغرافیائی	" "
۷-	اطبائے ہند	اصلاحی	ماہ جون ۱۸۶۲ء
۸-	نقار خانے میں طوطی کی آواز	اصلاحی	" "
۹-	خیال خیر مآلِ رعنا بہ تبعیت مرشدنا غالب	سیاسی	" "
۱۰-	حق اللہ و حق العباد	اخلاقی	" "
۱۱-	خدا مہربان توکل مہربان	معاشرتی	" "
۱۲-	طلسم شکن طوائفان	اصلاح معاشرت	" "
۱۳-	اسباب زیرکی اہل فرنگ	سیاسی و علمی	ماہ جولائی ۱۸۶۲ء
۱۴-	رواج فہرست رسائل و اخبارات مطبوعہ	صحافتی	" "
۱۵-	چون کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی	اصلاحی و اخلاقی	" "
۱۶-	خطاب رعنا	اصلاحی	"
۱۷-	وجود باری تعالیٰ	مذہبی	ماہ اگست ۱۸۶۲ء
۱۸-	صلاح بر فلاح	اخلاقی	" "
۱۹-	تعلیم علم خواب مقناطیسی (مسمریزم)	فنی	" "
۲۰-	لکھنؤ کی عزاداری	تاریخی	" "
۲۱-	چراغ روشن مراد حاصل		" "
۲۲-	ترتیب تاریخ ہر شہر و ضلع	تاریخی	" "
۲۳-	فرقہ مختاران کی تاریخ	تاریخ معاشرت	ماہ ستمبر "
۲۴-	تہذیب و تعلیم اولاد طوائف	اصلاحی	" "
۲۵-	خیالات رعنا در باب آمنی مہر راج	سیاسی	" "
۲۶-	امام باڑہ حسین آباد و مقبرہ محمد علی شاہ	تاریخی	" "
۲۷-	کمیٹی واقع انسداد حیوانات	اصلاحی	" "
۲۸-	حق اقبال محترم	قانونی	" "
۲۹-	گلدستۂ رعنا	ادبی	" "
۳۰-	گریم مشکل و گرنگویم مشکل	ادبی و تنقیدی	اکتوبر "
۳۱-	رواج باغ شاہی در ہر ضلع	اصلاحی	" "
۳۲-	انسداد فحش فرقہ ملعونۂ طوائف	اصلاح معاشرت	" "
۳۳-	جواب اعتراض اکبری (امرنامۂ اکبری)	تنقیدی	" "

۳۴۔	خطاب رعنا از حضرت پادریان	مذہبی و اخلاقی	ماہ ستمبر ۱۸۶۳ء
۳۵۔	تحقیق حال کافرستان	تاریخی	" " "
۳۶۔	تدبیر آبادی جنگل افتادہ از طائفہ مساکین	معاشی	" " "
۳۷۔	جنگ زرگری و زرگراں	"	" " "
۳۸۔	عادت خلق	"	ماہ اگست "
۳۹۔	من خوب می شناسم پیران پارسا را	تنقیدی و ادبی	ماہ ستمبر "
۴۰۔	فاش می گویم	علم قیافہ	ماہ مارچ "
۴۱۔	اخبار نویسی بڑا مشکل کام ہے	صحافت	" " "
۴۲۔	حلوا خوردن را روئے باید	اصلاحی	ماہ اپریل "
۴۳۔	سوال رعنا	ادبی تنقیدی	" " "
۴۴۔	تتمہ مضمون طلسم شکن طوائف	اصلاح معاشرت	" " "
۴۵۔	حسن تدبیر بند و بست استمراری	اقتصادی	" " "
۴۶۔	احوال ملکہ وکٹوریہ	سوانح	ماہ اگست "
۴۷۔	وثیقہ داری	معاشرتی	" " "
۴۸۔	تقرر مجلس عام لیجسلیٹو ہوس آف کامنس	قانونی اصلاحی	" جون "

رعنا کی شاعری

رعنا فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کے کلام میں کوئی امتیازی خصوصیت تو نظر نہیں آئی البتہ وہ ایک قادر الکلام شاعر ضرور تھے۔ الفاظ پر بڑی قدرت تھی۔ قصائد کے علاوہ غزلیں بھی خاصی طویل ہوتی تھیں۔ غالباً انھوں نے ہر صنف سخن پر کم و بیش طبع آزمائی کی ہوگی۔ لیکن میرے پیش نظر ان کے متعدد قصائد، غزلیات اور چند قطعات ہیں جو فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں ہیں۔ ایک غزل کا عنوان ہے "عالم آشوب" حافظ کی مشہور غزل ع این چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم" پر امرناتھ اکبری نے ایک غزل لکھی تھی" ع این چہ شوریست کہ در دور زحل می بینم" رعنا نے اکبری کی غزل پر غزل کہی۔

این چہ شور یست کہ در دور فلک می بینم ۔۔۔ شور و شر را ز سما تا بہ سمک می بینم
شور در عالم و شر در بشر خاص و عام ۔۔۔ سربسر فتنہ بہر جن و ملک می بینم
حیف از زہر چرا نام شفا شد کافور ۔۔۔ دور علت ز کتک تا بہ تک می بینم

مرزا غالب کی ایک مشہور غزل کا مصرع ہے: "بحسرت مردن استغنائے قاتل را جوا لبتی" اس پر رعنا کی ایک طویل غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

جہاں آمد بجان، جان جہانے در نقا بستی ۔۔۔ دو عالم محو دیدار است و تو اندر نقا بستی
جہاں بحر فنا عمر رواں نقشے بر آب استی ۔۔۔ مزن دم بر حیات خویش کہ عین حبا بستی
بقول اوستادم شوق وصلش جان نشاں باشد ۔۔۔ بحسرت مردن استغنائے قاتل را جوا لبتی

اسی طرح پر ایک اور غزل بھی لکھی تھی جس کا مطلع ہے۔

دل مضطر چرا مشاطہ در زلف رسا بستی ۔۔۔ سر سودا تو دش تا بلا اندر بلا بستی

اردو میں رعنا کی بہت سی غزلیات اور قصائد اودھ اخبار لکھنؤ اور کوہ نور لاہور میں شائع ہوئے مہاراجہ کپورتھلہ کی شان میں ایک طویل قصیدہ کوہ نور مورخہ ۸ راگست ۶۲ء اور اودھ اخبار مورخہ ۱۶ راگست ۶۲ء میں شائع ہوا تھا جس کا مطلع یہ ہے:

نسیم گل نے کیا باغ دہر کو تسخیر
بہار گلشنِ عالم میں اب ہے عالمگیر

لارڈ کیننگ کی وفات پر قطعہ تاریخ لکھا تھا:

وہ اقبالِ مجسم تھا کیننگ آہ
کہ تھا عالم میں اس کا جابجا شور

خلیق و محسن و مونس، مربی
شجاع و عاقل و فیاض و غم خور

دلِ مغموم رعنا سے یہ سن کر
صدا آئی "بصد غم ہائے غم خور"
۱۸۶۲ء

رعنا کی متعدد غزلیں پیش نظر ہیں بطور نمونہ ایک مختصر غزل کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

اللہ رسائی نہ کرے زلف رسا کی
الجھے دل دشمن بھی نہ گیسوئے دوتا سے

بگڑے ہوئے تیور ہیں خدا خیر کرے
بے وجہ مجھے وہ نظر آتے ہیں خفا سے

اللہ رے یہ گرمیٔ اختلاطِ محبت
بگڑا جو وہ بت مجھ سے تو بگڑا میں خدا سے

طالب اسد اللہ کا غالب کا ہوں شاگرد
بیعت مجھے بے واسطہ ہے شیرِ خدا سے

رعنا بڑے ذہین اور طباع تھے۔ وہ ایک وقت میں مختلف اور گوناگوں میدانوں میں اپنی دماغی قوتوں کو صرف کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کسی ایک علم یا فن میں امتیازی خصوصیت نہ حاصل کر سکے۔ ایک طرف ان کو شعر و سخن اور انشا پردازی کا شوق تھا۔ دوسری طرف ملکی اور سیاسی معاملات و مسائل سے بڑی دلچسپی تھی۔ اسی کے ساتھ نجوم، رمل اور موسیقی سے ذوق تھا۔ اگر ان کا ذوق صرف شعر و سخن اور انشا پردازی پر اکتفا کرتا تو یقیناً وہ ایک بلند پایہ شاعر اور اچھے انشا پرداز ہوتے تاہم ان کا سرمایہ نظم و نثر قابلِ قدر ہے۔ اور اردو زبان و ادب کا ایک قیمتی خزانہ ہے۔

فورٹ ولیم کالج کی ایک ناقابل فراموش شخصیت

ڈاکٹر احراز نقوی

اردو شاعری جب اپنے پورے شباب پر تھی اس وقت کلکتے میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی گئی اور نثری اسالیب کی طرف توجہ کی گئی۔ فورٹ ولیم کالج کا نثری سرمایہ خواہ سیاسی یا سامراجی استحکام کی منصوبہ بندی ہو یا لسانی سازش بہر حال اس کی افادیت یا ادبی احتیاج سے تو انکار نہیں ہو سکتا مگر اس زمانے میں لکھنؤ اور دلّی والوں کی نظر میں فورٹ ولیم کالج کا نثری سرمایہ ادبی تمیز اور اس کے سلیقے سے باہر تھا۔ ان کے نزدیک فارسی، انشاء اور شاعری ہی ادب تھا اس لئے فورٹ ولیم کالج کے رشحات درخور اعتنا نہ سمجھے گئے۔ مؤلف تذکرۂ گلشن ہند لکھتا ہے۔

"اکثر اہل لکھنؤ پکارتے تھے کہ کلکتے میں شاعری کی جا تحالی ہے۔"[1]

پھر بھلا فورٹ ولیم کالج کے دانشوروں کو کون پوچھتا؟ اور کون ان کی تاریخ لکھتا؟ یہاں تک فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ تصنیف و تالیف میں بھی ایسی معتبر تصنیف نہیں ملتی جو ان ارباب فن کے کوائف اور شغل و زندگی کا احاطہ کرے۔ یہی بات کہ آج ان قلم کاروں کی تحریریں تو کسی حد تک زمانے کی دستبرد سے محفوظ نظر آتی ہیں۔ مگر ان کی شخصیت اور سیرت کے خط و خال قدر ناشناسی کے غبار سے معدوم ہیں اور ادب کا ہر جدید مورخ یہاں آکر گم اور گنگ نظر آتا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کی وہ قابل قدر ہستیاں جو آج کنج خمول میں ہیں انھیں میں سے ایک بد نصیب، شیخ اکرام کا بھی نام ہے۔ شیخ اکرام کے سلسلے میں ہماری معلومات کا سرمایہ بےحد حقیر بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ سید محمد فورٹ ولیم کالج کا محقق لکھتا ہے۔

"مولوی اکرام علی بہت ہی گمنام شخص ہیں۔ ان کے حالات معاصرین نے بھی نہیں بیان کئے ہیں۔ مؤلف طبقات الشعرائے ہند نے ان کا ذکر تو کیا ہے مگر حالات پر کچھ روشنی نہیں ڈالی۔"

ابھی کچھ عرصہ ہوا۔ "اکرام علی اور فورٹ ولیم کالج"[2] کے نام سے ایک کتاب نادم سیتاپوری کی طبع ہوئی ہے۔ نادم صاحب کا یہ تحقیقی کام قاضی الیاس سیتاپوری کا مرہون منت ہے۔ غالباً جہاں تک میرا علم ہے اس کی بنا پر یہ خیال ہے کہ قاضی الیاس کا مقالہ جو شیخ اکرام کے سلسلے میں یکم نومبر ۱۹۱۲ء میں طبع ہوا۔ وہی موصوف کے سلسلے کا سب سے اہم ماخذ بنا اور اسی مضمون کو نادم سیتاپوری نے اپنی کتاب کی اساس بنایا ہے۔ جس کا خود انھوں نے اعتراف بھی کیا ہے۔ مگر صرف یہ ایک مضمون شیخ اکرام کے سلسلے میں جہاں ہماری تحقیق اور تجسس کی راہوں کو کھولتا ہے۔ وہاں نہ جانے کتنی اور تدقیق استفسارات کے راستوں کو پیدا کرتا ہے۔ نادم صاحب کی کتاب واقعی اس سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ مگر مواد کی عدم فراہمی کا بھی قدم قدم پر احساس ہوتا ہے۔ اور تحقیقی تسامحات سے بھی مبرا اس کتاب کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ میرے اس مقالے کا مقصد اس کتاب کی تنقیص یا بحث مقصود نہیں ہے۔ بہت سے مقامات پر میرا اُن کا تحقیقی اختلاف ہے اور نتائج برعکس نظر آتے ہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میرا مقالہ حرف آخر کا حکم رکھتا ہے مگر جہاں تک اس کی اہمیت کا سوال ہے۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

مولوی شیخ اکرام فورٹ ولیم کالج میں کئی اعتبار سے ایک بڑی شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی پہلودار شخصیت ایک عالم، اُستاد، حکیم، مترجم محقق اور اپنے عہد کے ایک اہم انشاپرداز کی حیثیت رکھتی ہے۔ موصوف کا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروق سے ملتا ہے۔ اور اُن کے بُزرگوں میں بڑے بڑے صوفی بزرگ، اللہ والے، عالم، مورخ اور حکیم گذرے ہیں۔ جن میں بابا فرید گنج شکر، ہمام الدین خاوند شاہ اور شیخ یکی قادری جیسے جلیل القدر بزرگ قابل ذکر ہیں۔ شیخ اکرام کا وطن سیتاپور (یو۔پی) ہے اور جس محلّے کے ساکن تھے اس کا نام شیخ سرائے ہے جو اُن ہی کے

۱۔ ملاحظہ "ارباب نثر اردو" ص ۲۳۳۔ مکتبۂ ابراہیمیہ ۱۹۳۶ء۔ ۲۔ فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ۔ ادارۂ فروغ اردو ۱۹۵۹ء

بزرگوں کا بسایا ہوا تھا اور آج بھی وہ اسی نام سے شہر سیتاپور میں قائم ہے۔ باپ کا نام شیخ احسان علی تھا۔

وحکیم موصوف سیتاپور کے رئیس اور محلہ شیخ سرائے میں سکونت پذیر تھے۔ مرحوم کے والد ماجد کا نام شیخ احسان علی صاحب تھا حکیم صاحب (شیخ اکرام) کے آباؤ اجداد ارباب تصوف میں شمار ہوتے تھے۔ لیکن خدا نے دنیاوی مال وجاہ سے سرفراز کیا تھا دربار شاہی میں مناصب جلیلہ پر ممتاز تھے۔ محمد شاہ دہلی اور لکھنؤ کے دربار سے اُن کیلئے جاگیریں اور وظائف معیّن تھے" (الناظر۔ یکم نومبر ۱۹۱۵ء)

حکیم شیخ احسان علی کی شادی قصبۂ باڑی (تحصیل سدھولی) ضلع سیتاپور میں رئیس قاضی شیخ غلام رسول صدیقی کی لڑکی سے ہوئی اور حکیم شیخ احسان علی نے اپنے لڑکے شیخ اکرام علی کی شادی سبحان علی خاں کی لڑکی سے کی۔ جو سرکار اودھ کے منصب دار تھے اور شیخ سرائے سیتاپور میں سکونت پذیر تھے اور شہر کے عمایدین میں شمار کیئے جاتے تھے۔ اس اعتبار سے شیخ اکرام علی کا ننہال اور دادھیال دونوں علم وفضل کا گہوارہ تھے۔ اسی ماحول میں موصوف کی علمی اور اخلاقی تربیت ہوئی۔ قاضی الیاس مرحوم کی روایت کے بموجب شیخ اکرام علی کی جب عمر نو برس کی تھی تو اُن کے باپ مولوی احسان پر نہ جانے کیا افتاد پڑی کہ تن تنہا گھر بار چھوڑ کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔ وجہ اور سبب نہ معلوم ہو سکا۔ بعض لوگوں نے دماغی خلل کا جواز تراشا ہے۔ مگر یہ روایت ثقہ نہیں معلوم ہوتی ہے۔

بچپن میں باپ سے بچھڑ جانے کا صدمہ موصوف کی زندگی پر بہت گہرا پڑا۔ اور یہ غم کی خلش انھیں زندگی بھر رہی۔ غالباً اسی غم کے رجحان نے انھیں بے حد حساس اور ذمہ دار بنا دیا۔ چنانچہ ان کی ساری توجہ کسب علم کی طرف مائل ہو گئی۔ طبّاعی اور ذہانت نے بہت جلد علم وفضل کی منزلوں کو طے کرنا شروع کر دیا۔ ابتدائی اکتساب علمی کے بعد کلکتے کے "مدرسۂ[۵۱] عالیہ عربیہ" میں داخل ہو گئے قاضی الیاس اپنے قلمی نسخے میں تحریر فرماتے ہیں۔

"آخر ایک ناصح مشفق کی نصیحت سے متاثر ہو کر ترک وطن کر کے پہلے مولوی حاجی تراب علی صاحب نامی خیرآبادی مدرس مدرسۂ ایسٹ انڈیا کمپنی مدراس کے ذریعہ سے سفر کی ناقابل برداشت صعوبتیں اٹھا کر کلکتے کے مدرسۂ عالیہ عربیہ میں داخل ہوئے[۵۲]"

حاجی تراب علی فرنگی محلی شیخ اکرام کے حقیقی بھائی نہیں بلکہ رشتے کے بھائی تھے اگرچہ تراب علی کی پوری زندگی ہماری لاعلمی کے اندھیرے میں ہے مگر وسیلۃ النحو کے مطالعے اور نتائج الافکار، تذکرۂ شعرائے دکن اور گنگا پرشاد ورما کی سوانح عمری مولوی محمد کاظم[۵۳] اور ڈاکٹر صفدر[۵۴] کے تحقیقی

۵۱ مدرسۂ عالیہ وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل اول نے مسلمانوں کی درخواست پر عربی، فارسی، اردو اور فلسفہ وغیرہ کی تعلیم کے لئے ۱۷۸۱ء میں قائم کیا اس کی نگرانی کے لئے ۱۸۲۶ء میں کپتان اروِن کو اس کا سکریٹری مقرر کیا۔ میجر باسو نے اپنی کتاب "تاریخ تعلیم" ص ۲۲ پر لکھا ہے کہ ایک سو سے زیادہ طلبا کو تین تین سو روپے کا ماہوار کا وظیفہ دیا جاتا تھا۔ علامہ عبداللہ یوسف علی (انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ) وساطت سے یہ بھی تحقیق کر سکتے ہیں کہ مولوی خلیل الدین اشک خیرآبادی (مترجم داستان امیر حمزہ) کے علاوہ مولوی حفیظ الدین احمد نے بھی اسی کالج سے تعلیم حاصل کی تھی۔ "تاریخ تعلیم" خالد یار خاں کی تصنیف ہیں اس کالج کے قیام کی تاریخ ۱۸۲۶ء دی ہوئی ہے ملاحظہ ہو ص ۲۲ سید طفیل احمد منگلوری نے اپنی کتاب (مسلمانوں کا روشن مستقبل) میں اسکے قیام کی تاریخ ۱۷۸۱ء لکھی ہے۔

۵۲ قلمی نسخہ ص ۱۹ قاضی الیاس سیتاپور کے بڑے عالم بزرگ تھے جنھوں نے اپنی ساری زندگی تھارہ کر اور لکھ پڑھ کر گذاری آخر عمر میں کسی عزیز کی تعزیت میں (باڑی تحصیل سدھولی) تشریف لیگئے۔ وہاں ساتھ خیریت رخصت ہوئے مگر پھر اس کے بعد آج تک پتہ نہ چل سکا کہ کہاں غائب ہو گئے۔ سیتاپور میں اُن کا آج بھی کتب خانہ نجی اور قلمی نسخوں کا ذخیرہ اور خود ان کی تحریروں کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مذہبی، علمی اور ادبی نسخے موجود ہیں۔ ان کے بارے میں یہی گمان اغلب ہے کہ وہ فوت ہو چکے ہیں۔

۵۳ سوانح عمری مولوی محمد کاظم کے مصنف نے برسبیل تذکرہ ان دونوں تذکروں سے کچھ زیادہ روشنی ڈالی ہے۔ اور فرنگی محل کے علماء کی فہرست میں موصوف کے علم وفضل کی تصدیق ان کے معاصروں کے ساتھ یوں کی ہے "مولوی عبدالحکیم مولوی عبدالحلیم، مولوی عبدالحیٔ، مولوی محمد ابراہیم، مولوی سعداللہ، مولوی تراب علی، واجد علی نقلی اور عقلی کے جامع تھے۔ (سوانح عمری مولوی محمد کاظم ص ۱۳۶)

۵۴ ڈاکٹر صفدر اپنے تحقیقی مقالے میں تراب علی کے ساتھ کچھ دانشوروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "ان سب نے مل کر (یعنی علماء فرنگی محل) صرف نحو معنی اور بیان، ادب، شعر، عروض، عربی، ہیات، فقہ، اصول فقہ، کلام، عقائد، منطق، فلسفہ، طبعیات، الٰہیات وغیرہ میں لکھنؤ کا پایہ بہت بلند کر دیا (شاہان اودھ کے دور میں لکھنؤ کی اردو شاعری ص ۶۵ نسخہ غیر مطبوعہ)

مقالے (غیر مطبوعہ) سے واضح ہوتا ہے کہ تراب علی بڑے پائے کے عالم بزرگ گذرے ہیں۔ عربی فارسی میں کمال حاصل تھا۔ فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ ناتی تخلص تھا اور ہندوستان کے فارسی شعراء میں ان کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی علمی تصانیف کا سراغ نہیں ملتا۔

باپ کے اچانک صدمے نے شیخ اکرام علی کی زندگی کی باگوں کو علم کی طرف موڑ دیا۔ یہی اُن کی زندگی کا نفسیاتی ردعمل تھا۔ جو انھیں پہنچ کر کلکتے لے گیا پھر اس کے بعد کلکتے سے دہلی لے آیا۔ شیخ اکرام کلکتے سے دہلی کیوں آئے؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے۔ جو تمام تحقیق کے بعد بھی واضح نہیں ہوتا مگر گمان یہی ہوتا ہے کہ دہلی میں اکتساب علم کی خاطر وہ آئے ہوں گے۔ تحقیق سے اتنا بھی واضح ہو جاتا ہے کہ دہلی میں شیخ اکرام کے چچا مردان علی بھی سکونت پذیر تھے۔ جو دربار سے منسلک تھے مگر یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ شیخ اکرام کے دہلی آنے میں ان کے چچا کا تلطف اور رفاقت کہاں تک شامل رہی یہ بھی توجہ طلب نکتہ ہے کہ وہ اس وقت تک حیات بھی تھے یا نہیں۔ اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا۔ قاضی الیاس مرحوم بھی اس کی وضاحت نہ کر سکے اور انھوں نے یہی لکھا ہے

دہلی آئے اور بمقام جامع مسجد یہاں کے نصاب کے موافق یہاں کے علماء کو امتحان دے کر سند حاصل کی ــــــــ (قلمی نسخہ صفحہ ۱۹)

دہلی میں تحصیل علم سے فراغت کے بعد یہ عین قرین قیاس تھا کہ وہ یہیں رہ پڑتے مگر وہاں کے ناسازگار حالات نے انھیں دہلی چھوڑنے پر مجبور کیا۔ دہلی کی محفلیں تو یوں بھی اجڑ رہی تھیں۔ اب رہا لکھنؤ کا معاملہ۔ لکھنؤ میں جس امراء کی درباری زندگی لہو ولعب کے ساتھ فروغ پا رہی تھی۔ شیخ اکرام کا طبعی میلان اور مذہبی عقائد قطعی منافی تھے۔ مناسب یہی تھا کہ شیخ اکرام اپنے بھائی تراب علی کے پاس پھر چلے جائیں۔ اس زمانے میں تراب علی کا مقام بڑی حیثیت رکھتا تھا اسی تقویت اور بھروسے پر شیخ اکرام کلکتے واپس چلے آئے۔ اور یہی وہ زمانہ تھا جب گل کرسٹ اور لارڈ ولزلی کی کوششوں سے کلکتے میں (گل کرسٹ کا مدرسہ ختم ہو کر) فورٹ ولیم کالج[۱] کا سنگ بنیاد رکھا جا چکا تھا۔ اور بڑے لکھنوں کی چھٹیاں کلکتے میں جمع ہو رہی تھی چنانچہ تراب علی کی سفارش اور توسل سے فورٹ ولیم کالج میں شیخ اکرام کو مسٹر براہم لاکٹ کی اردو تدریس کے لئے مامور کیا گیا۔ یہ موصوف کے معلمی اور تبحر کا نتیجہ تھا کہ براہم لاکٹ جیسا فوجی ذہنیت کا شخص علم و ادب کی طرف مائل ہو گیا اور جان گل کرسٹ کے مستعفی ہونے یعنی ۱۸۰۴ء کے بعد شعبۂ تصنیف و تالیف میں براہم لاکٹ کا شمار ارباب حل و عقد میں ہونے لگا۔ براہم لاکٹ اپنے استاد کے مرتبہ سے بخوبی واقف تھے چنانچہ انھوں نے اپنے ساتھ شعبۂ تصنیف و تالیف میں شیخ اکرام کو منسلک کر لیا۔ اور کتاب اخوان الصفاء کے ایک حصے کا ترجمہ کروایا۔ قاضی الیاس اپنے تحقیقی قلمی نسخہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"اخوان الصفاء کا اس حصے کا ترجمہ اردو میں شروع کیا۔ بیں الانسان اور جانور کا مناظرہ ہے۔ ۱۲۲۵ھ ہجری ۱۸۱۰ء میں یہ ترجمہ ختم ہوا۔" (صفحہ ۲۲)

اخوان الصفاء تریں رسالوں کا مجموعہ ہے جس کے مصنف کا مسئلہ صدیوں سے آج تک تحقیق نہ ہو سکا۔ موضوعات کے لحاظ سے یہ رسالے اخلاقیات مذہبیات معاشیات علم تصوف اور فلسفے کا بحر بیکراں ہیں۔ جن کی تفصیل اور تجزیہ کی گنجائش یہاں نہیں ہے۔ اس بحث سے قطع نظر شیخ اکرام نے یہ ترجمہ[۲] عربی سے کیا ہے۔ کرنل نیکنگ نے اپنے مضمون میں برسبیل تذکرہ اخوان الصفاء کے ضمن میں بجائے شیخ اکرام علی کے تراب علی ناتی کا نام لکھا ہے

"The Ikhwanus afa in urdu Translated from Arabic by Toorab Ali."

قاضی الیاس ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں۔

۱۸۱۰ء میں یہ ترجمہ ختم ہو کر اول اول ٹائپ میں وہیں چھپا جس کے سرورق پر مترجمہ اکرام[۳] علی حنفی درج تھا۔ (قلمی نسخہ صفحہ ۲۰)

شیخ اکرام علی کے اس ترجمہ کے بعد کسی دوسرے مطبوعہ ترجمے یا تصنیف کا سراغ نہیں ملتا تذکرۃ المصنفین کا حوالہ قاضی محمد الیاس کے نسخے میں ان الفاظ کے ساتھ ملتا ہے۔

---

[۱] انگریزی ملازمین کے لیے ہندوستانی تعلیم اور ان کی تہذیب و معاشرت کے لازمی علم کا اعلان ۱۸۰۰ء میں کیا گیا مگر اس کی تکمیل ۱۸۰۱ء میں کی گئی جس کے پرنسپل ریورنڈ ڈیوڈ براون ــــ (Rev. David Brown) (ملاحظہ ہو گل کرسٹ اور اس کا عہد ـــ محمد عتیق صدیقی) صفحہ ۳۲ ہوئے۔

[۲] اخوان الصفاء کا ترجمہ قریب قریب ہر زبان میں ہو چکا ہے مگر شیخ اکرام کے پیش نظر نسخہ عربی کا تھا فارسی کا نہیں۔

[۳] اخوان الصفاء کے کئی ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔ راقم الحروف کے پاس بھی دو نسخے ہیں پہلا ـــ ۱۹۱۷ء کا جو شیخ اکرام کے پوتے مفتی حسن رضا ادیب نے امیر المطابع سے شائع کیا اور دوسرا ـــ ۱۹۳۱ء کا جو انجمن ترقی اردو دہلی کا ہے۔

"تذکرۃ المصنفین بھی آپ ہی کی تالیف تھی جو نہایت تحقیق سے لکھی گئی تھی لیکن اس کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی یہ کتاب عرصے تک آپ کے (شیخ اکرام) خاندان میں رہی اس کے بعد خاندانی لوگوں کی غفلت و بے پروائی سے یہ کتاب کسی طریقے سے سیتاپور کے سب جج عبدالسلام رامپوری کے یہاں پہونچ گئی اور یہ کتاب ہمیشہ کے لیے اس خاندان سے رخصت ہو گئی۔" (قلمی نسخہ صفحہ ۲۲)

پھر ایک اہم بات اپنے قلمی نسخے میں یہ تحریر فرماتے ہیں۔

"آپ کے بعد داماد سید وزیر علی اجمیر شریف جاکر آپ کے متعلقین کو سیتاپور لے آئے۔ آپ کا کل اسباب بیس لڑھیوں (گاڑیوں) پر لاد کر اجمیر شریف سے سیتاپور لایا گیا۔ جن میں نایاب کتابیں بھی تھیں اکثر نادر اور نایاب کتابیں ضائع ہوئیں۔" (قلمی نسخہ صفحہ ۲۵)

ابھی کچھ عرصے کی بات ہے کہ راقم الحروف کو ایک نسخہ قلمی سیتاپور کے قیام میں ان کے قدیمی مکان میں بوسیدہ اور کرم خوردہ کتابوں میں "اسرار قاسمی" کا دستیاب ہوا۔ کتاب کے آخر میں نام "شیخ اکرام علی" درج ہے یہ نسخہ شیخ اکرام کا تصنیف کردہ نہیں ہے۔ اس کتاب کا مصنف ملا واعظ کاشفی ہے اور علم نجوم سے متعلق ہے۔ مگر کتاب میں ملا واعظ کاشفی کا نام القط ہے۔ بہرحال موصوف کا نام درج ہونے سے ان کی ملک کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی گمان ہو سکتا ہے کہ شیخ اکرام نے اس کتاب کو خود نقل کیا ہو اور ان دونوں باتوں سے قطع نظر ظاہر یہ ضرور ہے کہ شیخ اکرام کو علم نجوم سے اسی طرح سے شغف تھا جس طرح حکیم مومن خاں مومن کو تھا اور حکمت سے بھی شیخ اکرام کو بہت گہرا ذوق تھا۔ اپنی عمر کے آخر حصے میں موصوف نے حکمت کو خلق خدا کی خدمت کا ذریعہ بنایا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ گلکرسٹ کے عہد میں کوئی ایسا ریکارڈ نہیں ملتا جس کے بل بوتے پر یہ ہم کہہ سکیں کہ شیخ اکرام نے بھی کسی نوعیت کا کوئی معلمانہ یا مولفانہ کارنامہ انجام دیا۔ یہ بات محض قیاس کے توسط سے ہی کہی جا سکتی ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے آخری زمانے میں کالج کے حلقۂ ارباب میں شامل ہوئے۔ اور "اخوان الصفاء" کا پہلا اڈیشن ۱۸۱۰ء میں فورٹ ولیم کالج نے ہندوستانی پریس سے طبع کروایا۔ اور یہ مسئلہ مابہ النزاع ہے کہ ہندوستانی پریس شیخ اکرام کا قائم کردہ ہے۔ دراصل اس تحقیق کا ماخذ اختر شہنشاہی[۹۱] ہے۔ تحقیق کے اس ثانوی ماخذ کو مختلف محققوں نے برحق مانا ہے۔ قاضی عبدالغفار فرماتے ہیں۔

"جہاں تک میری رسائی ہو سکی ہے اردو کا پہلا مطبع ۱۸۰۱ء میں بمقام کلکتہ قائم ہوا۔ پریس کا نام "ہندوستانی پریس" تھا اور اس کے مالک کوئی اکرام علی صاحب[۹۲] تھے۔"

اسی طرح قاضی الیاس سیتاپوری اور نادم سیتاپوری کا بھی اصرار خصوصیت کے ساتھ ہے۔ مگر عتیق صدیقی اپنے ایک تحقیقی موقف کی بنا پر اس تحقیق کو رد کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے۔

"فارسی رسم الخط کا پہلا باضابطہ تجارتی چھاپہ خانہ ۱۸۰۲ء کے اواخر یا ۱۸۰۳ء کے اوائل میں قائم ہوا اس کا نام ہندوستانی پریس تھا[۹۳]۔"

اس کے بعد اپنی دوسری کتاب "گلکرسٹ اور اس کا عہد" میں اپنے قول کی پوری توثیق اس طرح کرتے ہیں۔

"گلکرسٹ نے اپنے خط مورخہ ۲۰ جنوری ۱۸۰۲ء میں ہندوستانی شعبے کے لیے خود کتابیں چھاپنے کی تجویز کالج کونسل کے سامنے پیش کی تھی اس کے متعلق کونسل کے کسی قطعی فیصلہ کا ہم کو پتہ نہیں چلتا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ گلکرسٹ نے عملاً طباعت کا کام اعلیٰ پیمانے پر شروع کر دیا تھا۔ اس کام کے لیے اس نے سب سے پہلے ایک چھاپے خانے کا انتظام کرنا ضروری سمجھا[۹۴]۔"

ہندوستانی پریس کی تاریخ اول الذکر کتاب میں ۱۸۰۲ء کے اواخر یا ۱۸۰۳ء کے اوائل میں لکھی ہے۔ اور موخرالذکر کتاب میں بغیر حوالے اور بغیر ثبوت کے تاریخ قیام ۱۸۰۲ء لکھی ہے۔ اس سے قطع نظر عتیق صاحب کی تحقیق سے بہرحال اتنا تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہندوستانی پریس کی بنیاد شیخ اکرام سے نہیں بلکہ گلکرسٹ کے ہاتھوں پڑی۔ دوسرے تقدم کا شرف بھی گلکرسٹ کو ملتا ہے۔ مگر اشرف نقوی کی تحقیق کی اس سے تردید نہیں ہوتی اور نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ شیخ اکرام علی کی ملکیت ہندوستانی پریس نہ تھا اس سلسلے میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ اشرف نقوی کو اپنے زمانے میں جو ماخذ میسر تھے اسی کی بنا پر موصوف کا یہ تحقیقی استنباط

۹۱۔ "اختر شہنشاہی" پر راقم الحروف کا مضمون ملاحظہ ہو ماہنامہ سب رس جولائی ۶۶ء

۹۲۔ ملاحظہ ہو ماہنامہ نگار۔ لکھنؤ ۱۹۴۰ء ۔ ۹۳۔ ہندوستانی اخبار نویسی صفحہ ۴۳ ـــ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔ دسمبر ۱۹۵۷ء

۹۴۔ گلکرسٹ اور اس کا عہد ـــ صفحہ ۱۵۱ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سنہ ۱۹۶۰ء

شیخ اکرام، اشرف نقوی کے ہم وطن ہونے کے علاوہ دونوں ایک ہی معزز برادری تعلق رکھتے تھے۔ اگرچہ دونوں کے زمانوں میں خاصا بُعد تھا۔ اس لیے اشرف نقوی سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ انھوں نے یہ بات ہوا میں کہہ دی ہو۔ بہرحال ان کے پاس اس وقت یقیناً کوئی معتبر ذریعہ تھا۔ مگر یہ واضح رہے کہ اشرف نقوی نے یہ کہیں یہ نہ لکھا ہے کہ ــــ یہ ہندوستانی پریس اردو کا سب سے پہلا مطبع تھا۔ یہ بات دیگر ہے کہ دوسرے محققین ماخذ کی عدم موجودگی کی بنا پر اس کو اردو کا پہلا پریس مان لیں۔ عتیق صدیقی کی تحقیق سے یہ ثابت ضرور ہو گیا کہ پہلا پریس گل کرسٹ نے قائم کیا ہے مگر ہندوستانی پریس پر ملکیت کا دعویٰ غلط نہیں ہو سکتا بلکہ اس سلسلے میں یہ ضرور ذہن میں رکھنا ہوگا کہ گل کرسٹ کا مطبع سے تعلق دو سال سے زیادہ نہیں رہا یعنی ۱۸۰۲ء سے ۱۸۰۳ء تک اور ۱۸۰۳ء میں جب وہ استعفیٰ دے کر واپس وطن جاتا ہے تو اپنی چھوڑی ہوئی چیزوں کی فہرست میں چھاپے اور ٹائپ کا اندراج کرتا ہے۔ اور آخر میں یہ تحریر کے الفاظ ہیں۔

"فی الحال ڈاکٹر ہنٹر، مسٹر میک ڈاگل ــــ (Mac dou gal) اور میکن ٹوش فل ٹن اینڈ کمپنی (Mac Kin Tosh futon) کی مشترکہ نگرانی میں چھوڑ رہا ہوں[۵۱]"

اور اسی طرح سے ہندوستانی پریس کا کام شیخ اکرام کے ہاتھوں آیا۔ یہ عمل کس طرح سے ہوا۔ اس کے عواقب یا عوامل کیا ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے پاس کوئی معتبر ماخذ نہیں ہیں مگر اختر شاہنشاہی کے حوالے کے بعد یہ نہیں انکار کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس پریس کے مالک نہیں ہوئے ہیں۔ اس اعتبار سے چاہے ہندوستانی پریس کی تاریخ اجراء میں تسامح ہو جائے۔

دوسری اس سلسلے کی تحقیق کڑی اردو اخبار کی ہے جس کے بارے میں سید حامد حسن قادری نے "داستان اردو تاریخ" میں لکھا ہے۔

مولوی محمد باقر (مولانا محمد حسین آزاد کے والد) نے دہلی سے اردو اخبار جاری کیا۔ اردو کا یہ دوسرا اخبار تھا ــــ پہلا اردو اخبار مولوی اکرام علی نے کلکتہ سے ۱۸۱۰ء میں نکالا تھا[۵۲]۔

اس تحقیق کی تائید میں عبدالرزاق راشد[۵۳] اور بالخصوص نادم سیتاپوری کا یہ اصرار ہے کہ اردو کا پہلا اخبار کلکتے سے شیخ اکرام نے نکالا۔ مگر اس تحقیق کی پائیداری میں ثبوت بہت ضعیف ملتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں گارساں دتاسی اور اشرف نقوی بھی خاموش ہیں اس کی تردید اور ثبوت میں عتیق صدیقی کے دلائل اور ثبوت زیادہ معتبر معلوم ہوتے ہیں اور اس روشنی میں اگر اردو کا پہلا اخبار ہو سکتا ہے تو وہ "اردو اخبار" (اس اخبار کی کوئی حقیقت نہیں) نہیں بلکہ "جام جہاں نما"[۵۴] ہے جو سنہ ۱۸۲۲ء میں کلکتے سے طلوع ہوا۔

شیخ اکرام کب تک فورٹ ولیم کالج سے منسلک رہے اور کتنے عرصے تک ہندوستانی پریس سے متعلق[۵۵] رہے اس کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ اتنا ضرور تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ براہم لاکٹ کی سفارش سے موصوف کا عمل دخل کالج میں رہا۔ اور تبحر علمی کی بدولت شیخ اکرام کلکتے کے صدر الصدور بھی مقرر ہوئے۔ رسالہ الناظر میں قاضی الیاس لکھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو الناظر یکم نومبر ۱۹۱۵ء

"یہ عہدہ اس زمانے میں جج کے برابر ہوتا ہے۔"

مگر موصوف کی طبیعت اس پیشے سے بھی بھر گئی اور دنیاوی دھندوں اور جھمیلوں سے گھبرا کر اپنے اجداد کے روحانی اور مذہبی انداز و روش پر چل پڑے اسی نفسیاتی میلان کے باعث ۱۸۲۸ء میں موصوف نے اپنے وطن (سیتاپور) میں ایک مسجد تعمیر کروائی جو آج تک ان کے نام اور کتبے سے مشہور ہے اور انھیں کی ایما سے احمیر میں دارالافتاء قائم ہوا۔

۵۱۔ ملاحظہ ہو۔ بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ــــ عتیق صدیقی ــــ صفحہ ۱۵۲ Proceedings of The college of fort Wiliam op. cit. 169

۵۲۔ داستان تاریخ اردو صفحہ ۸۶ ــــ حامد حسن قادری۔ ۵۳۔ ماہنامہ نگار ــــ اگست ۱۹۳۶ء

۵۴۔ مگر اس تحقیق کو ہم عتیق صدیقی سے نہیں منسوب کر سکتے کیونکہ یہ بات تحقیق کی دنیا میں بڑی جانی پہچانی ہے۔ اس سے پہلے مولانا مالک، وقار انبالوی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ جس طرح سے فورٹ ولیم کالج کے پرنسپل اور گل کرسٹ" کا تحقیقی مسالہ جمیل نقوی کے مقالے (مشرب۔ جون ــ جولائی ۱۹۵۶ء) کو سامنے رکھ کر عتیق صدیقی سے نہیں منسوب کر سکتے اسی طرح یہ تحقیق بھی ان کی نہ سمجھی جائے گی۔

"چنانچہ آپ کا انتخاب بحیثیت مفتی اجمیر شریف کے لیے تین سو روپے ماہوار پر ہوا - اور آپ نے اس نازک اور اہم کام کو نہایت خوبی سے انجام دیا۔"[1]

اجمیر شریف شہر کلکتے سے زیادہ راس آیا - یہاں مادی اور روحانی فیوض دونوں نعمتیں میسر تھیں - اور سکون قلب کیلئے یہ جگہ زیادہ مناسب ثابت ہوئی - اس سلسلے میں زیادہ مواد نہیں فراہم ہو سکا - قاضی موصوف اپنے قلمی نسخے میں تحریر فرماتے ہیں -

آپ کو اس نزاعی عہدے اور جلیل القدر منصب کے کاموں کو مستعدی اور دیانت اور امانت سے انجام دینے کے بعد جو فرصت کا وقت آپ کو ملتا وہ طبابت میں صرف فرماتے تھے - اس پیشے میں وہ بہت کامیاب ثابت ہوئے - آپ کے دست شفا کی دھوم مچ گئی - آپ اپنے گھر کے مصارف کے لیے ہر ماہ ایک ہزار روپیہ بھیجا کرتے تھے - اس سے قیاس کر لینا چاہیئے کہ وہاں آپ کی کیا آمدنی ہوتی ہوگی؟![2]

اجمیر میں شیخ اکرام کی حکمت وعلم کی دھوم مچ گئی - حسن اتفاق سے ان کے والد (مولوی شیخ احسان علی) نے جو ایک عرصے سے مفقود الخبر تھے اپنے لائق بیٹے کا سراغ لگا لیا - اس زمانے میں احسان علی حیدر آباد میں تھے - آخر رہا نہ گیا اور خون پدری کو جوش آ ہی گیا اور اشتیاق ملاقات کی چنگاریاں بھڑک اٹھیں - اُدھر شیخ اکرام باپ کا خط پاتے ہی مودت پدری سے ماہیٔ بے آب ہو گئے - مگر فطرت کو منظور کچھ اور ہی تھا - غیب سے ملنے کے اسباب مہیا ہو گئے - مگر جب مولوی احسان علی کے لے پالک بیٹے کو علم ہوا تو ڈرے کہ کہیں یہ مال و متاع ہاتھ سے نہ نکل جائے - چنانچہ اس حرص و ہوس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس لڑکے نے شیخ احسان علی کو زہر دے دیا اور اسی زہر نے قصہ تمام کر دیا - اس حادثہ کی خبر سے شیخ اکرام کو بڑا شدید صدمہ ہوا اور کچھ ہی عرصے کے بعد ۱۲۵۳ھ ہجری میں اجمیر میں ان کا انتقال ہو گیا - موصوف کا مقبرہ اجمیر ہی میں تعمیر ہوا۔

۱- ملاحظہ ہو الناظر یکم نومبر ۱۹۱۵ء
۲- قلمی نسخہ ص ۲۱

احمد فراز

ہر ایک بات نہ کیوں زہر سی ہماری لگے
کہ ہم کو دست زمانہ سے زخم کاری لگے

اداسیاں ہوں مسلسل تو دل نہیں روتا
کبھی کبھی ہو تو یہ کیفیت بھی پیاری لگے

بظاہر ایک ہی شب ہے فراق یار مگر
کوئی گذارنے بیٹھے تو عمر ساری لگے

کسی کی پرسش احوال بھی قیامت تھی
وہ درد دل میں اٹھا جسطرح کٹاری لگے

ہمارے پاس بھی بیٹھو بس اتنا چاہتے ہیں
ہمارے ساتھ طبیعت اگر تمہاری لگے

علاج اس دل درد آشنا کا کیا کیجے
کہ تیر بن کے جسے حرف غمگساری لگے

فراز تیرے جنوں کا خیال ہے ورنہ
یہ کیا ضرور وہ صورت سبھی کو پیاری لگے

ریورنڈ مبین ریحانی

ذرہ سے مانوس جب اپنی خودی ہو جائیگی
عالم امکاں کی رونق زندگی ہو جائے گی

کچھ بھی اس اندھیر نگری میں نہ آئے گا نظر
کیا خبر تھی تیز اتنی روشنی ہو جائے گی

یوں ہی میری تشنگی ساقی اگر بڑھتی رہی
بے پیے ہی ایک دن آسودگی ہو جائے گی

جو بھی چاہے بن مگر مفلس نہ بن اس دہر میں
جنس ہستی ورنہ داغ نیستی ہو جائے گی

ہم کو اس ظلمت کے عالم میں بھی ہے اتنا یقیں
آپ گذریں گے جدھر سے روشنی ہو جائے گی

یہ گماں کس نے کیا تھا آدمی کو ایک دن
آدمی سے اسقدر بیگانگی ہو جائے گی

گر نہیں شیریں کلامی، تلخ گفتاری سہی
یہ زباں اک روز وقف خامشی ہو جائے گی

وہ بھی دن آئے گا ریحانی کہ رندوں کے لیے
اس چمن میں جام گل کے ہر کلی ہو جائے گی

سعادت نظیر

ستم تو دیکھ! کرم کی کوئی کمی نہ رہی
جب آرزو مرے دل میں سکون کی نہ رہی

ترے فراق نے وہ دردِ جاوداں بخشا
کہ زندگی میں مری اب کوئی کمی نہ رہی

جنون شوق نے دونوں سے کر دیا آزاد
کہاں کے دیر و حرم؟ قید بندگی نہ رہی

بھری بہار میں ہے بجلیوں کی زد پہ چمن
کسی بھی پھول کے چہرے پہ تازگی نہ رہی

یہ اضطراب کی دنیا ہے درد و غم کی فضا
اب اے تسلیٔ یاراں! وہ زندگی نہ رہی

ملیں جو ان سے نگاہیں تو یہ ہوا محسوس
کہ اب جہاں میں کسی چیز کی کمی نہ رہی

بہار آتے ہی اٹھا دھواں نشیمن سے
یہ کیا کہ شمع جلی اور روشنی نہ رہی

فضا نکھر کے ہوئی جاذب نظر لیکن
وہ کیا گئے کہ کسی شے میں دلکشی نہ رہی

نہ کیوں ہو مجھ کو غم عشق ہی متاع عزیز!
نہیں خوشی کا بھروسہ، رہی رہی، نہ رہی

دیار غیر میں سب کچھ سہی، نظیر! مگر
وہ کوئے دوست کی پُرکیف زندگی نہ رہی

مطبوعات موصولہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

طنز و تبسم

رضا نقوی واہی
مکتبۂ ادب روڈ نمبر ۵/۱۶ گردنی باغ پٹنہ (بہار)
صفحات ۱۵۲ قیمت ۳ روپے

"طنز و تبسم" واہی کی طنزیہ اور مزاحیہ نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ۱۹۵۰ میں "واہیات" کے عنوان سے ان کا پہلا مجموعہ شائع ہوا تھا۔ ان کے تخلص کے اعتبار سے یہ نام بہت ہی اچھا تھا اور اس مجموعہ کا بھی یہی نام ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ پہلے مجموعے کو لوگ بھول چکے ہیں۔ "طنز و تبسم" اتنا سجتا ہوا نام نہیں ہے نہ اس نام میں وہ کشش اور طنز ہے۔

اردو کے مزاحیہ شعرا کی موجودہ نسل میں واہی کا نام جانا پہچانا ہوا ہے۔ ان کے یہاں سید محمد جعفری کا تیکھاپن اور شاد عارفی کی نشتریت نہ سہی مگر فرقت اور دلاور فگار کی طرح عمومیت بھی نہیں ہے۔ ان کو قبول عام تو مل سکتا ہے مگر وہ مقام نہیں مل سکتا جو فکر و مسائل کے توازن اور فن کے ساتھ خلوص اور ریاضت کے ذریعے واہی نے حاصل کر لیا ہے۔

زیر نظر مجموعہ میں ہندو پاک کے رسائل و اخبارات میں واہی کی شائع ہونے والی نظموں میں سے، منتخب نظمیں شامل ہیں۔ جن میں "ٹیلیفون"، "گویا شاعر"، "نقاد"، "محقق"، "نیڈی گرل"، "انتقال کے بعد"، "پی ایچ ڈی"، "لیڈری کا نسخہ"، "انٹرویو"، "لال فیتہ"، "انٹ گرہ" اور "اے میری زبیر یا" اس کتاب کی آبرو ہیں۔ "جنرل اسپتال"، "مچھروں کا گیت"، (مچھروں کا سوراج) "بلیک مارکیٹ"، "بلیک مارکیٹیر"، "کنٹرول"، "لال فیتہ"، "لیڈری کا نسخہ" اور "جاگیرداری" ان کے اولیں مجموعہ "واہیات" سے "طنز و تبسم" میں شامل کی گئی ہیں۔

مسائل اور رجحانات پر واہی کی نظر خاصی گہری ہے۔ مگر موضوعات کی تکرار ان کے یہاں ضرورت سے کچھ زیادہ ہے۔

طنز و تبسم کی لکھائی چھپائی اچھی ہے اور قیمت بھی مناسب ہے۔ واہی اس مجموعہ پر قابل مبارکباد ہیں۔

تذکرۂ جگر

محمود علی خاں مرحوم جو اپنے سو شعروں والے سلسلۂ انتخاب کے لیے مشہور ہیں۔ جگر مرادآبادی کے مخصوصین میں تھے۔ اور ان سے بہت خلوص و یگانگت کے تعلقات رکھتے تھے۔ زیر نظر مجموعہ میں محمود علی خاں نے جگر کی زندگی اور شعر گوئی پر خود اپنے مشاہدات ترتیب دیے ہیں۔ مرتب نے جن حقوق کی بنیادوں پر یہ کام انجام دیا ہے وہ اس کتاب کی اہمیت کے ضامن ہیں۔

کتاب کا انداز بیان دلچسپ ہے۔ جگر پر کام کرنے والوں کے لیے خصوصی طور پر اور عقیدت مندوں کے لیے عمومی طور پر یہ کتاب باعث کشش ثابت ہوگی۔

کتابت طباعت اور کاغذ تینوں عمدہ ہیں۔ اور کتاب مجلد ہے۔ اس کتاب کو مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔

فردوسِ گوش

داغ کے نام لیواؤں میں جوش ملسیانی کا نام ہر لحاظ سے قابل ذکر ہے اور ان کا شمار اساتذہ میں کیا جاتا ہے۔ وہ جدید و قدیم دونوں سے بہرہ ور ہوئے ہیں۔ اس لیے اردو شاعری میں انھیں ایک مناسب مقام حاصل ہے۔ جوش اردو کے پرخلوص پرستار ہیں۔ اور پنجاب میں ان کے دم سے اس زبان کا بول بالا ہے۔

جوش ملسیانی کی شاعری کا انتخاب مرکز تصنیف و تالیف نکودر نے شائع کیا ہے۔ اس کی قیمت چھ روپے ہے۔ ادارہ ناشر ہی کے پتے سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ ہر اردو دوست کو اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔

مقابلہ نہ کیجئے

ہمارا مقابلہ پڑوسیوں سے کیا جائے، ہم میں سے بیشتر اِس بات کو پسند نہیں کرتے یہی بات
میٹرک باٹوں کے سلسلے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

میٹرک باٹوں کی خوبیوں کو پہچانیئے ان کا استعمال اِن کی موجودہ شکلوں ہی میں کیجئے جیسے
۱۰۰ گرام، ۲۰۰ گرام، ۵۰۰ گرام اور ۱ کیلوگرام وغیرہ۔ جبھی آپ میٹرک نظام کا پورا پورا
فائدہ اٹھا پائیں گے۔

میٹرک اوزان کا جوڑ توڑ کرکے من سیر کا حساب نہ لگائیے۔
اِس میں آپ کا وقت ضائع ہوگا اور لین دین میں اکثر نقصان رہے گا۔

سہولت اور واجبی لین دین کے لئے

مکمل اکائیوں میں

میٹرک باٹوں

کا استعمال کیجئے....

REGD. NO. A—466
42ND YEAR OF PUBLICATION
NIGAR, URDU MONTHLY, RAMPUR U.P.
OCTOBER 1963
REGISTERED WITH THE REGISTRAR OF NEWSPAPERS AT R.N. NO. 2136/57

قیمت { فی پرچہ ۷۵ نئے پیسے
سالانہ دس روپے

خاندان کے ہر فرد کے تحفظ کیلئے

ملان

رکا چندہ اس پتہ پر

ری کر دیا جائیگا

نمائندہ نگار ۶۱۷ سمن آباد لاہور

ایڈیٹر :- اکبر علی خاں

جلد ۴۲ — فہرست مضامین ستمبر ۱۹۶۲ء — شمارہ ۹

ملاحظات		۳
مکاشفات الاسرار	میکش اکبر آبادی	۵
حکایت اور داستان	ڈاکٹر گیان چند	۱۰
دیسی کا خط پردیسی کے جواب میں	عطا محمد شعلہ	۱۴
شوکت — ایک شکست ایک ساتھی	قاضی عیاذ انصاری	۱۹
روح الامین ادیب	سید مرتضیٰ حسین بلگرامی	۲۵
داستان بے ستون و کوہکن	شمیم کرہانی	۳۳
مطبوعات موصولہ	(میر نمبر دلی کالج میگزین)	۳۷

ملاحظات

نگار کا اشاریہ نمبر نگار نے چالیس سال تک علم و ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ اردو صحافت کا ایک روشن باب ہیں۔ اردو ادب کا کوئی مورخ نگار کے ذکر سے دامن کشاں نہیں گزر سکتا۔ نگار نے انداز فکر و اظہار کو نئے نئے افق عطا کیے ہیں اور لب و لہجے کو شگفتگی اور خوش سلیقگی کے رنگا رنگ پہلو بخشتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان صفحات پر جو خیالات پیش کیے گئے ان میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں تھی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس بات کا اعتراف بھی ضرور کرنا چاہیے کہ ذہنی بالیدگی کے لیے کسی قدر جرأت رندانہ بھی درکار ہوتی ہے۔ اور اُردو داں طبقے کو اس جرأت رندانہ سے متعارف کرانے میں نگار کو بڑا دخل رہا ہے۔ یوں بھی خالص ادبی علمی تحقیقی اعتبار سے جو تحریریں نگار کے ہزاروں صفحات میں موجود ہیں ان سے علم و ادب کے طالب علم کو اکثر و بیشتر رجوع کرنا پڑے گا۔ اس لیے اس بات

ایڈیٹر:- اکبر علی خاں

ضروری اعلان
پاکستانی خریدار نگار کا چندہ اس پتہ پر بھیجیں۔ رسالہ جاری کر دیا جائیگا
نمائندہ نگار ابن ۶۱/۷ سمن آباد لاہور

جلد ۴۲ | فہرست مضامین ستمبر ۱۹۶۳ء | شمارہ ۹

ملاحظات		۳
مکاشفات الاسرار	میکش اکبر آبادی	۵
حکایت اور داستان	ڈاکٹر گیان چند	۱۰
دیسی کا خط پردیسی کے جواب میں	عطا محمد شعلہ	۱۴
شوکت — ایک شست ایک ساتھی	قاضی عیاذ انصاری	۱۹
روح الامین ادیب	سید مرتضیٰ حسین بلگرامی	۲۵
داستان بے ستون و کوہکن	شمیم کرہانی	۳۳
مطبوعات موصولہ	دمیر نمبر دلی کالج میگزین ۔	۳۷

مُلاحظات

نگار کا اشاریہ نمبر

نگار نے چالیس سال تک علم و ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ اردو صحافیت کا ایک روشن باب ہیں۔ اردو ادب کا کوئی مورخ نگار کے ذکر سے دامن کشاں نہیں گزر سکتا۔ نگار نے انداز فکر و اظہار کو نئے نئے افق عطا کیے ہیں اور لب و لہجے کو شگفتگی اور خوش سلیقگی کے رنگا رنگ پہلو بخشے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان صفحات پر جو خیالات پیش کیے گئے ان میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں تھی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس بات کا اعتراف بھی ضرور کرنا چاہیے کہ ذہنی بالیدگی کے لیے کسی قدر جرأت رندانہ بھی درکار ہوتی ہے۔ اور اُردو داں طبقے کو اس جرأت رندانہ سے متعارف کرانے میں نگار کو بڑا دخل رہا ہے۔ یوں بھی خالص ادبی علمی تحقیقی اعتبار سے جو تحریریں نگار کے ہزاروں صفحات میں موجود ہیں ان سے علم و ادب کے طالب علم کو اکثر و بیشتر رجوع کرنا پڑے گا۔ اس لیے اس بات

کی ضرورت ہے کہ ایک جلد میں نگار کی ساری تحریروں کا تفصیلی اشاریہ مرتب کر دیا جائے۔ مجھے یہ اعلان کرتے ہوئے مسرت ہے کہ نگار رام پور جلد از جلد نگار کا مکمل اشاریہ ایک خاص نمبر کی صورت میں شایع کرے گا۔ یہ کام محترمہ سعدیہ حفیظ اور محترمہ خالدہ عباسی نے ڈاکٹر محمود الٰہی کی نگرانی میں بڑی محنت اور ذوق و شوق کے ساتھ انجام دیا ہے۔ نگار کا یہ اشاریہ نگار دوستوں کے لیے خصوصاً اور عام ادبی ذوق رکھنے والوں کے لیے عموماً باعث کشش ہوگا تحقیقی کام کرنے والوں کو قدم قدم پر اس انداز کے اشاریوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر 'مخزن' 'زمانہ' 'معارف' 'برہان' جیسے اہم رسائل کے اشاریے مرتب کر دیئے جائیں۔

احوال و آثار آزردہ

شاید ہی کوئی خوش ذوق ایسا ہو جس نے مندرجہ ذیل اشعار نہ سنے ہوں۔

میں اور ذوق بادہ کشی لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تری بزم شراب میں

کامل اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

مکھڑا وہ بلا زلف سیہ فام وہ کافر
کیا خاک جیے جس کی شب ایسی سحر ایسی
یا تنگ نہ کر ناصح ناداں مجھے اتنا
یا لا کے دکھا دے دہن ایسا کمر ایسی

لیکن شاید بہت کم حضرات کو علم ہوگا کہ یہ اشعار مفتی صدر الدین آزردہ کے ہیں جو اپنے زمانہ کے ایک جید عالم ادب دوست اور خوش گو شاعر تھے آزردہ کی فنکارانہ عظمت کا اعتراف ابھی تک باقاعدہ طور پر نہیں کیا گیا نہ ان کے احوال و آثار پر کوئی مستقل تالیف شایع ہوئی تھی۔ نگار کے صفحات پر پہلی بار آزردہ سے متعلق اس قسم کی ایک ہمہ جہت کتاب کو قارئین کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ یہ کتاب اردو کے جواں سال باصلاحیت نقاد و محقق ڈاکٹر خلیق انجم نے تیار کی ہے۔ اس میں آزردہ کی زندگی تصانیف اور کلام کا جائزہ لیا گیا ہے اور جتنا کچھ اردو فارسی عربی کلام تذکروں وغیرہ میں مدفون تھا۔ اس سب کو ایک لڑی میں پرو لیا گیا ہے۔ یہ تالیف نگار کے ایک ہی شمارے میں شایع کر دی جائے گی۔

مکاشفات الاسرار

میکش اکبرآبادی

حضرت جی سید علی غمگین[۱] دہلوی رحمۃ اللہ علیہ متاخرین صوفیہ میں شاعرانہ اور صوفیانہ دونوں اعتبار سے ایک بلند درجہ رکھتے ہیں۔ اس دوران میں حضرت کے حالات اکثر ادبی رسائل میں شائع ہوئے ہیں اور مزید تعارف کی احتیاج نہیں ہے۔

مکاشفات الاسرار حضرت کی رباعیات کا مجموعہ ہے۔ جو تقریباً ۱۰۰۰ رباعیات پر مشتمل ہے۔ ان رباعیات کی شرح خود حضرت نے فرمائی جس کا نام مراۃ الحقیقت ہے۔

حضرت جی غمگینؒ سے پہلے بھی اردو کے ایسے شعراء گذرے ہیں جن کا کلام ادبی اعتبار سے اور حقائق و معارف کے بیان کے اعتبار سے بہت بلند ہے مگر حضرت غمگین غالباً پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اردو رباعیات کے ذریعہ تصوف کے تمام ضروری مسائل بیان کر دیئے ہیں۔

کوئی علم اور کوئی زبان بہ ذات خود نہ اچھی ہے نہ بری طریق استعمال اور نیت و مقصد ہر شے کو اچھا اور برا کر دیتے ہیں۔ یہی حال فلسفے اور تصوف کا ہے۔ مسلمان جب فلسفۂ یونان سے آشنا ہوئے تو ایک طبقے نے ہر نئی چیز کی طرح اس کی بھی مخالفت کی اور دوسرے طبقے نے اس کا مطالعہ اور اس سے واقفیت حاصل کرنا ضروری سمجھا۔ یہ نفرت اور توجہ تقریباً اہل علم کے ہر طبقے میں رہی چنانچہ بعض صوفیا نے بھی اِن جدید علوم کا مطالعہ کیا اور ان کی اصطلاحات اور نظریوں کو اپنے اصول اور مسلک کی تائید میں استعمال کیا جب کہ بعض صوفیہ نے ان علوم سے احتراز کیا اس طرح کی دونوں مثالیں حسن اتفاق سے ہمیں ایک ہی زمانے کے دو بڑے مشائخ میں ملتی ہیں۔ حضرت شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردی کی مشہور کتاب عوارف المعارف کا پورا انداز ایک مستند حدیث کی کتاب کا سا ہے۔ لیکن آپ ہی کے ہم عصر حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی مشہور تصنیف فصوص الحکم اس زمانے کے فلسفیانہ رجحان کی پوری نمائندگی کرتی ہے حالانکہ دونوں کتابیں تصوف پر لکھی گئی ہیں اور دونوں کتابیں عام صوفیوں میں مقبول اور مستند سمجھی جاتی ہیں۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ دونوں بزرگ ایک ایک واسطے سے حضرت غوث اعظم میراں محی الدین عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ سے فیض یاب ہیں۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اپنے چچا شیخ ابوالنجیب عبدالقاہر سہروردی کے خلیفہ اور تعلیم یافتہ ہیں اور شیخ ابن عربی کی تعلیم و تربیت حضرت ابومدین مغربی نے فرمائی ہے۔ اور شیخ ابوالنجیب اور شیخ ابو مدین مغربی دونوں حضرت غوث الاعظم کے اجل خلفا میں سے ہیں۔

تصانیف اور انداز بیان کا یہ اختلاف ہر عہد میں برقرار رہا ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں اکثر صوفی مصنف حضرت ابن عربی سے متاثر رہے ہیں اور مولانا جامیؒ کی معرفت ابن عربی کے تصوف کا اثر ہندوستان کے تمام ہی صوفی مصنفین پر پڑا ہے۔ البتہ حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادیؒ سے پہلے کے صوفیائے چشت کی تصانیف میں یہ اثر نہیں ملتا۔

مکاشفات الاسرار کی رباعیات میں جو تصوف بیان کیا گیا ہے۔ وہ وہی ہے جو متاخرین صوفیہ میں عام تھا اور جس میں ابن عربیؒ کے فلسفے کی آمیزش تھی چنانچہ ان رباعیوں میں جہاں ایک طرف قدیم تصوف کے اصول توبہ، پاکیزگی نفس، عشق، فقر، ذکر و فکر، وغیرہ بیان کیے گئے ہیں۔ تو دوسری طرف احاطۂ ذہنی

---

[۱] ولادت ۱۱۶۳ھ مطابق ۱۷۵۰ء ـ دہلی ــــــــ وفات ۱۲۶۷ھ مطابق ۱۸۵۱ء ـ گوالیار ـ

[۲] یہ تمام تصانیف غیر مطبوعہ ہیں اور حضرت جی سردار محمد صاحب و حضرت جی رضا محمد صاحب کے کتب خانہ واقع گوالیار میں موجود ہیں۔ جو حضرت جی کے سجادہ اور صحیح وارث ہیں۔

اعیان ثابتہ، اعیان خارجیہ - بحث مجعولیت - وجود علمی، وجود ذہنی وغیرہ پر بہت سی رباعیات ملتی ہیں - اور شاید تصوف کا کوئی اہم مسئلہ ایسا نہیں ہے جس پر کوئی رباعی نہ ہو - اس موقعہ پر وحدۃ الوجود کا شمار فلسفیانہ تصوف کے ضمن میں میں نے قصداً نہیں کیا کیوں کہ یہ اصطلاح اگرچہ فلسفیانہ ہے اور یہی وہ مسئلہ ہے جو خصوصیت سے صوفیہ اور مخالفین صوفیہ میں مختلف فیہ ہے - لیکن یہ لفظی اعتبار ہی سے فلسفیانہ اصطلاح ہے ورنہ فلسفی صوفی اور غیر فلسفی صوفی سب ہی اس مسئلہ پر متفق ہیں - جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا ہے -

تو اے ناداں دل آگاہ دریاب　　بخود مثل نیاگاں راہ دریاب
چساں مومن کند پوشیدہ را فاش　　ز لا موجود الا اللہ دریاب

علامہ اقبالؒ کی یہ رباعی قدیم اور سادہ تصوف کی مثال میں پیش کی جا سکتی ہے - اس کے ساتھ ہی حضرت غمگینؒ کی رباعی سنیئے اور اندازہ کیجیے کہ اردو فارسی کے فرق کے باوجود حضرت غمگین کی رباعی کتنی فلسفہ آمیز ہے -

ممکن کو قیام صرف ہے غیر کے ساتھ　　از خود ہو اگر تو پھر عدم سے ہو نجات
موجود نہیں ہے تو وجود واجب　　اس کا ہے وجود جو ہے قائم بالذات

مکاشفات الاسرار کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ دیوان شاہ غمگین نے مرزا غالب کے لیئے لکھا تھا چنانچہ دیباچے میں اپنے حالات اور نسب وغیرہ بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں -

"پہلے میں نے ایک دیوان ریختہ میں لکھا تھا اُسے دور کر دیا - اب کہ میری عمر ساٹھ سال ہونے آئی جو واردات اور ذوق شوق عشق حقیقی اور مجازی کے تھے وہ میں نے ترتیب دیئے اور بعض خاص غزلیں پہلے دیوان کی دوسرے دیوان میں شامل کر دیں - جب نیا دیوان مکمل ہو گیا تو چونکہ ابھی واردات اور کیفیات کا میرے دل پر غلبہ باقی تھا - میں نے چاہا کہ برادر ذی عزیز از جان اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ متخلص بہ غالب واسد کے واسطے جو اس زمانے میں نظم و نثر میں اپنا نظیر نہیں رکھتے ہیں - رباعیات کے پیرایہ میں تصوف کا رسالہ ترتیب دوں - اور بیئے تمام مضامین اعلیٰ سے ادنیٰ تک جو لوگوں کو معلوم ہیں یا نہیں رباعیات میں درج کر دوں جس سے مبتدی اور منتہی دونوں فائدہ اٹھالیں" (ترجمہ)

اسی سلسلے میں حضرت نے تحریر فرمایا کہ ——————

"اگر یہ دیوان رباعیات کسی بزرگ کے ہاتھ لگے تو مجھے امید ہے کہ وہ اس کو مقلدوں، ملحدوں اور خلاف شرع لوگوں سے پوشیدہ رکھیں گے - ہر چند کہ مقلد اور ملحد غیر حق نہیں ہیں بلکہ عین حق ہیں - لیکن بزرگان متقدمین و متاخرین کا طریقہ اسی طرح چلا آتا ہے کہ اسرار باطنی کو ظاہر بینوں سے پوشیدہ کرتے آئے ہیں - اس لیئے ہمیں بھی اُن کا اتباع واجب ہے" (ترجمہ)

یہی بات حضرت جیؒ نے مرزا غالب کو ایک خط میں لکھی مرزا غالب نے اس کے جواب میں جو خط حضرت جی کو لکھا ہے اس کی نقل یہاں غیر مناسب نہ ہو گی - اس خط کا ترجمہ دانستہ نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ مرزا صاحب کا اصل خط ہی پیش کیا جا رہا ہے -

قبلۂ حاجات - انچہ نخست دل را بہ نشاط تو نگر کرد دیدن روئے سید امانت علی بود سلمہ اللہ تعالیٰ کہ دیدہ را فروغ دیگر بخشید - چوں از بازیافتگانِ قدسی انجمن اندگرد سرشاں گردیدم دکف پائے شاں بوسیدم مشاہدۂ منشورِ آگہی کہ عبارت از والا نامہ است نورے دیگر افزود غزل ہم بہ ذریعہ سید صاحب وغیر صاحب فرستادہ آمد مقارن آں آدم دیگر رسید و بردانۂ دیگر رسانید شادماں شدم و عنوانِ دیوانِ رباعیات شادماں تر ساخت سرمایہ آں گونہ کہ آں ہمہ گہر بہ رشتۂ نگارش از بہر من کشیدہ آید وآں گاہ ایں مایہ مکرمت کہ خود از بندۂ خود می پسند کہ اگر دستوری دہی دیباچہ را بنام تو نگار بندم - ایں پرسش خود ادائے نوازش دیگر است کہ زبان اندازۂ سپاس آں بر نتابد - قبلۂ گاہا فضولی می کنم و چوں فرمان چنیں است می گویم کہ گنجیدن نام من در آں نامہ نہ تنہا از بہر من بلکہ از بہر آبائے من سرمایۂ نازش جاودانی است لیکن ہمہ آں خواہم کہ مرید خود را بیش از اندازہ دراں نگارش نہ ستائید و کم ترین بندۂ خود وا نمائید کہ ہر آئینہ اندریں صورت ہم مدعائے خدام حاصل می شود و ہم خواہش ایں

ننگ آفرینش روائی نیز دیا بالجملہ چنیں بہ داہم کردیوان رباعیات کے می رسد و من بداں کے رسم فرمان چنانست کہ آں نوشتہ را از نظر اغیار نہاں دارم ہم چنیں خواہم کرد اما کو غیر پس از گزارش ایں بذکر البتہ خلاف رائے دانش آرائے نہ خواہد بود سنخے دیگری گویم تا حضرت را ذوق و مرا اعتبار افزاید بیتے از بیت ہائے قیصر داخلِ صحیفہ منتخب است۔

گرخامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے　　　　خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

من خود فرماں پذیرفتم لیکن فرمان خود اندریں باب آں ست کہ ہر نگرندہ بہ دیدن آں الفاظ بہ کنہ معنی نہ تواند رسید و ہر کہ معنی را نیک تواند فہمید بر آئینہ غیر نیست چہ دریں عالم تفرقہ کعبہ و دیر نیست سخن ہائے دل آویز کہ گستاخانہ گزارد ہ شد خاطر نشین و دل نشین باد زیادہ حد ادب ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ عریضہ نگار اسد اللہ

"روز نگارش نامہ دہم ذالحجہ ہنگام شام کہ مشفقی سید حیدر علی صاحب و اکبر جیاں کہ با من گفتند اگر رسیدہ باشند د بہ سید پیر علی صاحب نیز سلام ہائے مشتاقانہ خوانند و مشتاق دانند۔"

اور اس خط کے بعد جواب اور جواب الجواب کا سلسلہ شروع ہو گیا جس میں اہم مسائل تصوف موضوع بحث بنے رہے یہاں تک کہ حضرت جی نے مرزا غالب کو لکھ دیا کہ آئندہ خطوں میں تصوف کا مذکور نہ ہو۔ حضرت جی نے مرزا صاحب کو جو اخفا کے لیئے تاکید کی تھی وہ بے جا نہ تھی مثال میں حضرت جی کی ایک رباعی ملاحظہ فرمایئے۔

ایک عمر رہی ہے میری اللہ کی جنگ　　　　دیتا میں رہا شکست تو تو فرسنگ
غمگین مغلوب اب ہوا ہوں ایسا　　　　نہ خروج رہی نہ میں نہ وہ نام و ننگ

یہ رباعی کتنی وجہ اعتراض بن سکتی ہے اس کے بیان کی ضرورت نہیں ہے ایسی ہی بہت ہیں جن کی وجہ سے تصوف ہدف ملامت بنتا رہا ہے لیکن اس کی شرح خود حضرت جی کی زبان مبارک سے سنیئے۔ اس کے بعد اس رباعی کا مفہوم قابل اعتراض نہ ٹھیرے گا۔ اور حضرت جی کی اخفا کی تاکید کی اہمیت بھی روشن ہو جائے گی۔ خود پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے۔ کلموا الناس علیٰ قدر عقولہم (او کما قال) لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق بات کرو ــــــــــ شرح ملاحظہ ہو۔

"جس وقت کہ تم حق سبحانہٗ تعالیٰ سے صلح کر لو گے اور توبہ کر لو گے اور اپنے گناہوں پر پشیمان اور شریعت و طریقت نبوی کی اطاعت کر لو گے۔ خدا کی محبت تم میں پیدا ہو جائے گی اور ذکر و مراقبہ کرنے لگو گے۔ تو اس وقت تم میں اور خدا میں جنگ عظیم واقع ہو جائے گی اور ہنگامہ دار و گیر گرم ہو جائے گا۔ کیونکہ تم اس وقت اپنی خودی کے علم کے سلطان ہو گے اور تمہارے ساتھ تعینات اور خطرات اور دوسری صفات ظاہری و باطنی کا ایک عظیم لشکر ہو گا۔ اور یہ جنگ ایک مدت جاری رہے گی۔ اور اکثر غلبہ اور فتح تم ہی کو حاصل ہو گی۔ حالانکہ وہ غلبہ اور فتح تمہاری شکست ہے پس اس وقت لازم ہے کہ اپنے آپ کو کسی صاحب نسبت جذبی کی خدمت میں حاضر کر دو تاکہ تمھیں جلد شکست ہو جائے۔ اور یہی شکست تمہارے لیئے فتح باب بن جائے گی۔ اور تھوڑے دن بعد تمہارے لشکر کو شکست فاش ہو جائے گی۔ اور تعینات و خطرات کا لشکر برباد ہو جائے گا تمہاری سلطنت پر زوال آ جائے گا۔ اور تمہاری خودی مٹ جائے گی۔ پھر اس شکست کے بعد صلح کا دروازہ تم پر کھل جائے گا۔ تم فنا ہو جاؤ گے اور اپنی اصل تک پہونچ جاؤ گے۔" ــــــــــ (ترجمہ)

اب تصوف کے مختلف مسائل پر مشتمل کچھ رباعیاں پیش کی جاتی ہیں۔ جن سے مکاشفات الاسرار کی ادبی اور علمی حیثیت کا اندازہ ہو سکے گا۔ رباعیات کے عنوان اصل کتاب میں جس طرح ہیں اسی طرح نقل کیئے جاتے ہیں۔

در وحدۃ وجود

جو کہتے ہیں لوگ سب یہ کثرت کثرت　　　　آتی ہے سخن پہ ان کی مجھکو حیرت

غمگین نہیں قال و حال پر موقوف کثرت کو وجود ہی نہیں جز وحدت

در احاطۂ ذاتی گوید

غمگین گر تری اس دوئی سے ہو نجات جو دید میں آئے عین ہے اُس کی ذات
بالذات نہ ہو یہاں اگر وہ موجود کس طرح سے اس کے پھر ہوں اسما و صفات

در حقیقت تنزیہہ

بے فائدہ کرنہ اس کی تو گفت و شنود جس کا نہ مشاہدہ ہو نہ جس کی ہو دید
توحید پر اعتقاد رکھنا نہ کبھی بس اس کے سوا نہیں ہے غمگیں توحید

در بیان توحید ایمانی کہ اول است

توحید کے چار مرتبے ہیں اے یار اول ایمانی جس میں سب ہیں دیندار
وہ یہ ہے کہ حق کی واحدیت کا تو باصدق کرے زبان و دل سے اقرار

در بیان حقیقت ایمان کامل

مشکل ہے لانا خدا پر ایمان میں رکن بتاؤں جس میں سب ہوں ارکان
وہ یہ ہے خودی نہ رہوے اپنی غمگین بن اس کے نہ ہوگی تیری مشکل آسان

در تعریف صوفی گوید

غمگین صوفی غرض لقب اس کا ہے جس کو کہ وجود ہی نہیں ہوتا ہے
صوفی کی نہ پوچھ تو حقیقت مجھ سے صوفی نہیں پوچھتا کہ صوفی کیا ہے

در معنی تصوف

سب صوفی کہیں ہیں یہ ہے غمگیں اعلا جز اس کے نہیں ہے کچھ تصوف بخدا
اُس شغل میں بسر کرے وقت عزیز جو دونوں جہان میں ہو سب سے اعلیٰ

در معنی تصوف و حقیقت فقر

غمگیں کوئی پوچھے گر تصوف کیا ہے کہہ بے خودی اپنی میں شہود اس کا ہے
جو پوچھے فقیر کس کو کہتے ہیں تو کہہ مفلس آپ سے اپنے جو ہوتا ہے

در حقیقت کفر

غمگیں ہے کفر ظاہری تو ظاہر یہ کفر حقیقی سے نہیں تو ماہر
وہ یہ ہے کہ محو حق میں ہو تیرا وجود بن اس کے نہ کفر سے تو ہوگا طاہر

در بیان اعیان ثابتہ

اعیانِ ثابتہ کا سُن مجھ سے تو بیاں موجود قدیم علم حق میں ہے نہاں
معدوم وہ ہوئے نہ ہوں گے غمگین یہ صورتیں کوئی سب ہوئیں ان سے عیاں

یعنی ممکنات خارجیہ را ہم عیان گویند

کہتے ہیں ممکنات کو بھی عیان عارف سے نہیں ہے یہ راز کچھ پنہان
سونگھی ہی نہیں انھوں نے بوئے وجود معدوم ہیں یہ ہمیشہ اے غمگین جان

اعیان ثابتہ را با وحدت ہماں نسبت است را کہ برف را با آب و ہم چنیں اعمال صالحہ را با جنت

اعیان ثابتہ میں یوں ہے وحدت　　ہے برف میں جیسے آب بالعینیت
ایسے ہی سمجھ لے سب مثالیں جیسے　　اعمال صالحہ ہیں عین جنت

در بیان آں کہ اولیت و آخریت اعتباری است

تو جس کو سمجھ لے ابتدا ہے غمگین　　اور جان لے جس کو انتہا ہے غمگین
یہ دونوں تعین خیالی ہیں ترے　　اُس کو تو نہ حد نہ منتہا ہے غمگین

در ترغیب شرع شریف کہ اہم مقامات اولیا است

غمگین اُس سے اگر تجھے ہے کچھ کام　　عرفان کو اپنے رکھ تو بالائے بام
منظور تجھے اگر خوشی ہے میری　　جاری اپنے پہ شرع کے کر احکام

در برئیت آدم علیہ السلام

غمگین مرضی ہے اور امر ہے اور　　اس میرے سخن کو تو سمجھ خوب بغور
آدم کو کہا کہ تو نہ کھانا گندم　　اور مرضی یہ تھی کہ اس کو کھائے بطور

در ترغیب خدمت خلق

خدمت سے خلق کی نہ رہنا محروم　　اور ہو نہ سکے تو چاہیئے ہو مغموم
ممکن نہیں جو جہاں میں غمگین کوئی　　بے خدمت خلق یار ہووے مخدوم

موتوا قبل ان تموتوا

ہر چند بلائے ناگہانی ہے موت　　اک روز مگر ضرور تو آنی ہے موت
مرنے سے پہلے ہی جو مرتے ہیں غمگین　　واللہ کہ اس کی زندگانی ہے موت

در اظہار [illegible] گوید

کب تک کروں درد عشق کا اپنے بیاں　　کب تک کروں اپنے سرِ پوشیدہ عیاں
غمگین ہے آہ کم بہت فرصت عمر　　اور قصۂ حال ہے میرا بے پایاں

حکایت اور داستان

ڈاکٹر گیان چند

اردو کے قدیم افسانوں کو حکایت اور داستان دو صنفوں میں تقسیم کیا ہے لیکن یہ تقسیم نہ بالکل واضح ہے نہ تشفی بخش۔ ایک عام عقیدہ یہ ہے کہ حکایت مختصر ہوتی ہے اور داستان طویل۔ لیکن یہ کوئی اصولی بنیادی فرق نہ ہوا۔ داستان بھی حکایت کی طرح کوزے میں دریا کی مثال ہو سکتی ہے۔ مثلاً طوطا کہانی کی چوبیسویں کہانی کا خلاصہ ملاحظہ ہو:

"کابل کے ایک سوداگر کی لڑکی حسن میں شہرۂ آفاق تھی کسی ملک کے تین ہنرمند جوان سوداگر کے پاس درخواست لے کر آئے۔ ان میں سے ایک گمشدہ چیز کا پتہ بتا دیتا تھا۔ دوسرا ایسا کل کا گھوڑا بناتا تھا جو تخت سلیمان سے بھی آگے نکل جائے۔ تیسرا ایسا تیر انداز تھا جس کا تیر خطا نہ کرتا تھا۔ رات کو نازنین کہیں غائب ہو گئی۔ پہلے جوان نے دریافت کیا کہ اسے ایک پری فلاں پہاڑ پر لے گئی ہے۔ دوسرے جوان نے کاٹھ کا گھوڑا بنا کر دیا جس پر تیر انداز جوان سوار ہو کر گیا اور پری کو مار کر شہزادی حسن کو لے آیا۔ اب ہر جوان یہ چاہتا تھا کہ حسینہ کی شادی اسی سے ہو۔ طوطے نے فیصلہ کیا کہ پہلے دو نے محض اپنا ہنر دکھایا لیکن تیسرا اپنے جی پر کھیل کر ایسی جان جوکھوں کی جگہ گیا اسی لیے وہ دولت بیدار اسی کا حق ہے۔"

اس مختصر کہانی میں داستان کے تمام خصائص پائے جاتے ہیں۔ اسے ہم حکایت نہ کہ داستان کہنے پر مجبور ہیں۔ یہاں یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ فوق فطرت عنصر داستان کی لازمی خصوصیت نہیں۔ یہ داستان کو رنگینی اور استعجاب فراہم کرتا ہے۔ لیکن داستان اپنے وجود کے لیے اس کی تابع نہیں۔ الف لیلہ کی "سوتے جاگتے کی کہانی" بہت دلچسپ اور اعلیٰ درجے کی داستان ہے۔ لیکن اس میں کوئی فوق فطرت مخلوق یا واقعہ نہیں۔ طوطا کہانی کی بیسویں داستان ملاحظہ ہو:

"کسی شہر میں ایک شخص بشیر اور ایک منکوحہ عورت چندو میں معاشقہ تھا۔ اس کے شوہر کو اس کا علم ہوا تو وہ بیوی کو اس کے میکے میں لے گیا۔ بشیر ایک اعرابی کے ساتھ اس شہر میں گیا اور اعرابی کی معرفت چندو کے پاس خبر بھیجی۔ چندو نے کہلا دیا کہ رات کو فلاں مقام پر ملاقات ہوگی۔ حسب وعدہ وہ وہاں پر آئی اور اعرابی سے کہا کہ تو میرے کپڑے پہن کر میرے گھر جا اور گھونگھٹ سے منہ چھپا کر انگنائی میں بیٹھ جانا۔ شوہر دودھ کا پیالہ پینے کو دے گا تو کچھ نہ بولنا۔ تھک ہار کر وہ باہر چلا جائے گا۔ اعرابی نے ایسا ہی کیا لیکن اس کے خاموش رہنے پر شوہر نے دل کھول کر کوڑے بازی کی اور پھر باہر چلا گیا۔ چندو کی بہن اسے سمجھانے آئی اس نے چندو کی بہن پر سب راز منکشف کر کے کہا کہ تو میرے ساتھ سوا دلر مازداش نہ کرنا ورنہ تیری بہن کی رسوائی ہوگی۔ بہن ہنس کر راضی ہو گئی اور اعرابی نے مار کھانے کے بعد زندگی کا حظ اٹھایا۔"

اس مختصر داستان میں نہ فوق فطرت ہے نہ اس کا ہیرو کوئی شاہزادہ یا سوداگر بچہ ہے۔ لیکن اسے بھی حکایت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مختصر داستان ہی کہنا پڑے گا۔ پھر حکایت اور داستان کے درمیان مابہ الامتیاز کیا ہے۔ ڈاکٹر جانسن نے Life of John Gay کے دیباچے میں Fable کی تعریف یوں کی ہے۔

"یہ ایک بیانیہ ہے جس میں حیوان یا بے جان اشیاء اخلاقی تلقین کے لیے آدمی کی طرح بولتے چلتے ہیں۔ اور انسانوں جیسے کام کاج کرتے ہیں"

اس تعریف میں حکایت کی سب سے بڑی خصوصیت اخلاقی تلقین کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے اور اس کے کرداروں کی طرف بھی۔ جانوروں کی حکایات بھی دو قسم کی ہوتی ہیں۔ اول وہ جن میں جانور محض حیوان کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں مثلاً ایسپ کی ذیل کی کہانی میں

"ایک کتا منہ میں آدھی روٹی لیے دریا کے کنارے جا رہا تھا اس نے پانی میں اپنا عکس دیکھ کر سوچا کہ پانی والے کتے کی آدھی روٹی بھی مل

جلائے تو پوری ایک روٹی ہو جائے گی۔ اس غرض سے وہ اپنے عکس کی طرف منہ بڑھا کر بھونکا اور آدھی روٹی سے بھی ہاتھ دھو لیا"

دوسری نوع میں حیوانات انسانوں کی فہم و فراست سے متصف کر دیے جاتے ہیں۔ مثلاً مذہب عشق (نثری گل بکاؤلی) میں مرغ زیرک اور صیاد کی حکایت میں طوطا ایک ذی ہوش حکیم کی سی باتیں کرتا ہے۔ کلیلہ و دمنہ میں حیوانات کے پردے میں گویا انسانوں کو مدبری کی تعلیم دی ہے۔ حکایتوں میں فوق فطرت عنصر صرف اس قدر ہوتا ہے کہ جانور انسانوں کی طرح بولتے ہیں اور اکثر انسانی ادراک اور انسانی جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔

حکایات کا ایک بڑا حصہ حیوانات سے متعلق ہے لیکن ڈاکٹر جانسن کی تعریف کے علی الرغم کم از کم اردو حکایت کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ حیوانات ہی کی روداد ہو۔ مہجور کے نورتن کے چھٹے باب کی ایک حکایت ملاحظہ ہو

ایک دانش مند افلاس کا مارا کسی شہر میں گیا۔ لوگوں نے کہا کہ فلاں شخص حاتم طائی ہے تو اس کے پاس جائے تو مالا مال ہو جائے گا۔ وہ دانشمند حال کثیف سے اس امیر کے پاس گیا لیکن وہ امیر اسے مطلق خیال میں نہ لایا۔ اگلے دن وہ عاقل کرائے پر لائی ہوئی صاف ستھری پوشاک سے ملبوس ہو کر گیا۔ امیر نے خوان نعمت حاضر کیا۔ دانشمند لقمہ تیار کر کے جیب دامن و آستین میں رکھنے لگا۔ امیر نے کہا کپڑے کیوں خراب کرتا ہے۔ عاقل نے اپنا احوال بتا کر کہا کہ تو جو آج اس قدر تکلف کیا وہ لباس ہی کا حق ہے۔"

اب تک ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ حکایت میں اخلاقی سبق کا ہونا ضروری ہے۔ بعض حکایات میں اخلاقی تلقین اتنی نمایاں نہیں ہوتی جتنا کسی کی فہم و فراست کی تیزی مثلاً نورتن کے تیسرے باب کی یہ مشہور کہانی سنیے:

" ایک شخص کے گھر میں کچھ اسباب دیوان خانے سے چوری ہو گیا۔ وہ قاضی کے پاس فریاد لے گیا۔ قاضی برابر کی کئی چھڑیاں لایا اور صاحب خانہ اور اس کے ملازمین کو ایک ایک چھڑی دے کر کہا کہ اس چھڑی کا خواص یہ ہے کہ چور کے پاس یہ ایک انگل بڑھ جاتی ہے۔ کل صبح تم لوگ اسے واپس لاؤ۔ چور نے اپنی عقل لڑائی کہ اسے ایک انگل تراش ڈالیے تاکہ راز فاش نہ ہو۔ اس نے ایسا ہی کیا اور قاضی نے اسے گرفتار کر لیا"

اس کہانی پر انگریزی لفظ Fable کا اطلاق نہیں ہو سکتا لیکن اردو میں بلا تامل حکایت کہہ سکتے ہیں۔ اس میں فہم و ذکاوت کے مظاہرے کے ساتھ ایک اخلاقی پہلو بھی ہے کہ سانچ کو آنچ نہیں جھوٹ اور چوری کا بھانڈا کبھی نہ کبھی پھوٹ ہی جاتا ہے۔ اب ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ حکایت اخلاقی یا نیم اخلاقی ہوتی ہے لیکن محض حکایت کے لیے اخلاق کافی نہیں اس میں قصہ پن کا ہونا ضروری ہے۔ مثلاً "گلستان سعدی" یا اخلاق محسنی میں جن واقعات یا مکالموں کو حکایت کہا گیا ہے ان میں سے اکثر میں قصہ پن نہیں اس لیے ان پر لفظ حکایت کا اطلاق صحیح نہیں مثلاً "گلستان کے اردو ترجمے باغ اردو سے ملاحظہ ہو:

" ایک بزرگ نے کسی پرہیزگار سے پوچھا کہ فلانے عابد کے حق میں آپ کیا کہتے ہیں کہ اکثر اشخاص اس کے حق میں طعنہ آمیز باتیں کہتے ہیں۔ کہا اس نے کہ بظاہر اس میں کچھ عیب نہیں دیکھتا اور باطن سے اللہ آگاہ ہے"

اسے خواہ ایک مکالمہ کہیے خواہ ایک واقعہ اس میں قصہ پن کا نام نہیں محض ایک شریفانہ قول ہے اسے اور اس قبیل کی دوسری چیزوں کو حکایت کے زمرے میں کیونکر شامل کر سکتے ہیں اس مفصل جانچ پڑتال سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حکایت ایک بہت مختصر اور سادہ کہانی ہے جس میں ایک بہت چھوٹا واقعہ بہت کم کرداروں کے ذریعے بیان کر دیا جاتا ہے۔ اکثر یہ کردار حیوان ہوتے ہیں۔ حکایت کی غایت تفریح نہیں بلکہ کسی نہ کسی شکل میں اخلاقی اصلاح اور بدی کی مذمت ہوتی ہے اس میں رنگینی اور رومان کے نشاط و سرور کیلئے کوئی گنجائش نہیں ہوتی:

داستان کے بارے میں ہمیں کسی قدر تفصیل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو کی مشہور داستانیں یہ ہیں۔ قصۂ حسن و دل۔ قصۂ ملک محمود گیتی افروز۔ چہار درویش۔ حاتم طائی۔ گل بکاؤلی۔ گل صنوبر۔ فسانۂ عجائب۔ سروش سخن۔ طلسم حیرت۔ داستان امیر حمزہ۔ بوستان خیال۔ مختصر داستانوں کے مجموعوں میں طوطا کہانی۔ سنگھاسن بتیسی اور بیتال پچیسی ممتاز ہیں۔ الف لیلیٰ میں مختصر داستانیں بھی ہیں اور متوسط یا طویل داستانیں بھی۔ ان سب میں کہیں نہ کہیں فوق فطری عناصر کی کارفرمائی ملتی ہے۔ جس سے غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ یہ جزو لاینفک ہی داستان

کا امتیازی رنگ ہے لیکن جیسا کہ اوپر درج کیا گیا یہ داستان کی حیثیت کا جزو نہیں۔ چار درویش کی بہترین داستان پہلے درویش کی سیر ہے اس کے انجام میں سبز پوش سوار کے ظہور کے علاوہ کہیں کسی دیو و پری۔ سحر و طلسم کا مذکور نہیں۔ الف لیلہ میں سوتے جاگتے کی کہانی میں بھی فوق فطرت کا کوئی شائبہ نہیں۔

داستانوں میں ایک اور قدر مشترک حسن و عشق کا عنصر ہے۔ کیا اسی کو داستان کا مابہ الامتیاز قرار دیا جائے۔ حسن کا آفاقی اور دوامی جذبہ یقیناً داستان کا ایک اہم عنصر ہے لیکن اسے بھی ناگزیر نہیں قرار دیا جا سکتا مثلاً الف لیلے میں سند باد جہازی۔ سوتے جاگتے کی کہانی یا علی بابا چالیس چور میں حسن و عشق کا کوئی ذکر نہیں۔ سند باد اور علی بابا ایسے قصے ہیں جو بجائے خود آزاد اور مکمل داستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آرائش محفل کے پانچویں سوال حاتم کے جانے اور کوہ ندا کی خبر لانے میں بھی کہیں کوئی معاشقہ نہیں ہوتا۔

معلوم ہوتا ہے ایسا کوئی سر رشتہ نہیں جو تمام داستانوں کو منسلک کرتا ہو ان میں یک رنگی نہیں بوقلمونی ہے پھر بھی ہم داستانوں کو حکایتوں یا جدید ناولوں سے الگ شناخت کر سکتے ہیں۔ یعنی ہمارے ذہن کے کسی گوشہ میں اس صنف کے خدوخال کا کوئی نہ کوئی شعور یقیناً موجود ہے۔ مغرب میں داستانوں کو رومانس کہا جاتا ہے یہ کلیدی لفظ ہی داستان کی کماحقہ نشاندہی کرتا ہے۔ داستان ہمیشہ رومانی اور غیر اصلی ہوتی ہے۔ جو لوگ رومان کے معنے محض حسن و عشق سمجھتے ہیں ان کی معصومیت پر درگزر کیا جا سکتا ہے۔ رومان خیالی جذباتی فضا ہوتا ہے۔ جذبات انسانی میں جذبۂ عشق سب سے شدید ہوتا ہے لیکن یہ سب کچھ نہیں۔ رومان کا عشق سے گہرا تعلق ہے لیکن حسن و عشق کی قید سے آزاد وہ کر بھی رومان لکھے جا سکتے ہیں۔ شاعری کی دنیا سے دو مثالیں ملاحظہ ہوں

اقبال کی نظم ایک آرزو جس کی ابتدا یوں ہے:

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب — کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا — ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو
مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری — دامن میں کوہ کے ایک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

اور [illegible] کی [illegible] جس کا مقطع یہ ہے

دل [illegible] رہتے ہیں — خلق میں کہلائیے صحرانشیں
[illegible] — دیکھیے دیوانہ پن کی خوبیاں
[illegible] — بے تکلف زندگانی کیجیے

[illegible] رومانی [illegible] رومانی داستانوں میں ایک خیالی دنیا خیالی واقعات کا بیان ہوتا ہے اس پر تخیل کا رنگین [illegible] ہوتا ہے [illegible] کبھی جلوہ آرا ہو تب بھی اس میں جو واقعات بیان کیے جاتے ہیں وہ ایسے ہوتے ہیں جو [illegible] زیادہ [illegible] ہوتے ہیں۔

مافوق الفطرت کی تخیل انگیزی۔ حسن و عشق کی رنگینی۔ [illegible] کی حیرت انگیزی۔ بیان کا لطف انہیں عناصر سے داستان عبارت ہے ایک دل کو اٹکا لینے والی کیفیت اور اس کے بعد ایک فرحت و آسودگی کا احساس داستان کی خصوصیت۔ داستان گو کا منشا ہے کچھ لمحے ہنس کھیل کر گزار دینا کچھ گھڑیوں کے لیے اس علت و معلول کے خوشگوار نظام سے آزاد کرا دینا۔ غرضکہ داستان کی غایت اصلی تفریح ہے گو بظاہر اس میں اخلاق کی ترغیب دی جائے لیکن یہ دین داری محض ایک بھرم ہے۔ داستان کا مصنف واعظ اور ناصح نہیں ہوتا اس میں زہد کی خشونت اور خشکی نہیں پائی جاتی وہ خیالی تلطف کا قائل ہے۔ اس کا دار عقل سے زیادہ دل پر ہوتا ہے۔ وہ فکر سے زیادہ جذبہ کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔ جب کہ حکایت میں اس کے برعکس ہوتا ہے۔ حکایت میں ایک بوڑھا بچوں سے خطاب کرتا ہے۔ داستان میں ایک مست شباب دوسرے متان شباب کے سامنے مٹی [illegible] اڑاتا ہے۔ حکایت نویس ایک حکیم بزرگ ہوتا ہے۔ داستان کا راوی ایک انجمن خانہ سوز ہے۔

اس مضمون کی ابتدا میں چند ایسی مختصر داستانیں درج کی گئیں جو طول میں حکایت سے زیادہ نہیں۔ ان میں داستانوں کی مخصوص فضا پائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ طول اور ضخامت داستان کا بنیادی عنصر نہیں لیکن اس اجمال میں داستان کا رنگ روپ اجاگر نہیں ہونے پاتا۔ مہمات کا تواتر۔ پیچیدگی۔ کشمکش و پیچ۔ استعجاب اور اضطراب۔ یہ سبھی داستان کے اجزا ہیں اور یہ سب اطناب ہی میں رونما ہو سکتے ہیں۔ اس لیے عرف عام میں داستان کا اطلاق محض طویل داستانوں پر ہوتا ہے۔ رواج عام کو آسودہ کرنے کے لیے ہم مختصر داستانوں کو داستان نہ کہہ کر رومانی کہانیاں کہہ سکتے ہیں۔ کہانی چونکہ کہی جاتی ہے اس لیے وہ شیطان کی آنت نہیں ہو سکتی۔ رومانی کی صفت لگا کر ہم ایک طرف ان کہانیوں کا داستان سے رشتۂ اتحاد ظاہر کرتے ہیں تو دوسری طرف ان ہی حکایات سے بھی کر دیتے ہیں۔ اس طرح ہم داستان کی اصطلاح کو طویل قصوں تک محدود کر دیتے ہیں۔ داستان اور رومانی کہانی میں ناول اور جدید مختصر افسانے کا سا رشتہ ہے۔ اردو کے قدیم افسانوں کی موٹے طور پر یوں تقسیم کی جا سکتی ہے
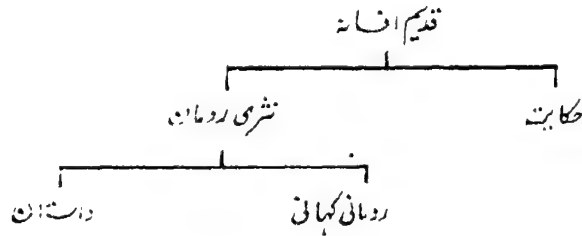
حکایت کے بہترین نمونے کلیلہ و دمنہ میں اور طوطا کہانی کی بعض کہانیوں میں ہیں۔ رومانی کہانیوں کی نمائندگی سنگھاسن بتیسی۔ بیتال پچیسی اور طوطا کہانی کی بیشتر کہانیوں سے ہوتی ہے۔ داستان کے سب سے اچھے نمونے باغ و بہار اور داستان امیر حمزہ ہیں۔
داستان اردو ادب کی سب سے موہنی صنف ہے۔ غزل جو شاہوں کے ایوان اور شاہ صاحبان کے تکیوں کی رونق محفل ہونے کی مدعی ہے۔ گیرائی میں داستان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ داستان کیا ہے ملکہ بہار کا جادو ہے کہ جس پر اس کا گلدستہ چل گیا وہ ہاتھ باندھ کر عاشق کا دم بھرنے لگا۔

دیسی کا خط پردیسی کے جواب میں

عطا محمد شعلہ

(محترمی مجنوں گورکھپوری سے معذرت کے ساتھ)

۵ مئی ۱۹۶۳ء پیاری گلنار۔ ابھی ابھی میرا چپراسی ڈاک لایا تو سب سے پہلے مجھے جس کی تلاش ہوئی وہ تمہارا محبت نامہ تھا۔ اس ایک ہفتے سے زیادہ اسی بے چینی میں گذر گیا کہ تمہارا خط نہیں آیا۔ سوچا پتہ نہیں کیا بات ہے۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے سماتے رہے۔ اور بدگمانیوں کا ایک طویل انبار جمع ہوتا گیا۔ میرا چپراسی بھی کچھ کم ذہین نہیں ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ صاحب بہادر کسی خط کے منتظر ہیں۔ اور وہ بھی کسی ایسی ہستی کے خط کے جس سے ان کا سرکاری واسطہ نہیں بلکہ تن اور من کا واسطہ ہے۔ آج تمہارا گلابی حاشیے کا لفافہ ڈاک میں دیکھتے ہی وہ کم بخت سب کچھ تاڑ گیا۔ آتے ہی بولا کہ صاحب بہادر مبارک آج بیگم صاحبہ کا خط ڈاک میں ہے۔ اس کو کیا پتہ کہ میری زندگی میں یہ کتنی بڑی کمی ہے۔ خدا اُس کی زبان مبارک کرے۔ مگر سچ کہو تم ایسی بات کا بُرا تو نہ مانو گی؟ ہاں خیر چھوڑو اس بات کو۔ جب کبھی ملاقات ہوگی تو اس باب میں بھی تمہارا فیصلہ معلوم ہو جائے گا۔ معاملہ جب تمہاری ماں اور بہن ہی پر موقوف ہو تو مجھے اس کی فکر بھی نہ کرنا چاہیئے۔ تم اتنی ذہین اور سمجھدار ہو کہ مجھے اس بارے میں کسی ایسے فیصلہ کا شبہ رہ ہی نہیں گیا ہے جو میرے اور تمہارے مفاد کے خلاف جا سکے۔

مگر یہ کیا؟ گلنار قسم ہے پیدا کرنے والے کی کہ میں تمہاری ذہانت کا قائل ہو گیا اور اس بھیانک تنہائی میں بھی جو ڈاک بنگلہ کی خصوصیت ہوتی ہے لطف آ کر رہ گیا۔ ہاں بھئی کچھ تو بتاؤ کہ یہ "پردیسی" کون ہیں؟ اور کہاں سے ٹپک پڑے؟ اور یہ کیوں تم پر لٹنے ریجھے ہیں کہ ناول کے ناول تیار کر کے تمہاری طبیعت کو منغص کر رہے ہیں؟ یہ بھی عشق کا اچھا طریقہ ہے کہ مختلف ادیبوں اور شاعروں پر گفتگو کر کے اپنی جنسی آسودگی کا سامان مہیا کر رہے ہیں۔ اُن کے خطوط کا ایک طویل پشتارہ جو تم نے میرے پاس بھیجدیا ہے یہ بہت ہی اچھا کیا ہے۔ فرصت کے لمحات اب آسانی سے گذر جائیں گے۔ تم جانتی ہو کہ جب تنہائی بہت ستانے لگتی ہے تو ہم کو وہ لوگ بھی عزیز معلوم ہونے لگتے ہیں کہ جو عرف عام میں بور (Bore) کہلاتے ہیں۔ اس لیئے ایسے وقت کسی کی رفاقت کا ہاتھ آ جانا اور ان کٹھن گھڑیوں میں دل بہلانے کا ایک ذریعہ پیدا ہو جانا بھی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ہوتا۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ تمھیں یہ سوجھا کیا؟ کہیں گلنار اور کہیں یاسمین؟ ایک پیکر ناز کے دو نام! نام پر تو مجھے اعتراض نہیں۔ تم چاہو تو ان گنت نام اختیار کر لو۔ حسن کی ایک نہیں لاتعداد شکلیں بھی ہو سکتی ہیں۔ اور اسی نسبت سے لاتعداد نام بھی۔ مگر حسن کا اصلی نام صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اور وہ ہے حُسن۔ مختلف اوقات میں مختلف کیفیات اور خارجی روابط کی بنا پر نام بدلتے رہتے ہیں۔ یوں تمیز او تشخص کی خاطر ماں باپ کا مجوزہ نام پیدائش سے تا دم مرگ لیبل کی طرح چپک کر رہ جاتا ہے۔ مگر خدا کے لیئے میرے ساتھ بھی یہی کھیل نہ دُہرا دینا۔ تم میرے لیئے گلنار رہو اور گلنار ہی رہو گی۔ یاسمین نام میں کچھ زیادہ سنجیدگی اور زیادہ عمر رسیدگی کا انداز ملتا ہے۔ مگر پردیسی جی بھی تو شاید اب لگ بھگ ساٹھ کے ہو رہے ہیں۔ اس خیال سے انھیں اگر اپنا نام تم نے یاسمین ہی بتا دیا ہو تو کچھ برا بھی نہیں۔

ہندو دیو مالا میں ایک چیز ہوتی ہے مایا۔ بھگوان کی مایا اپار ہے۔ وہ جب چاہیں جو روپ اختیار کر لیں۔ اور جس طرح چاہیں اپنے بھگتوں کا امتحان لیں یا انھیں اپنے درشن دیں۔ مسلمانوں کے یہاں بھی یہ تصور رہا ہے۔ مگر ذرا مختلف انداز میں۔ ہم لوگوں کے یہاں صرف شیطان مختلف روپ اختیار کر کے خدا کے بندوں کو بہکایا کرتا تھا۔ بعد میں صوفیہ نے مشائخ دین کے ساتھ لگ بھگ مایا جیسا تصور وابستہ کر دیا مگر اسلامی فلسفہ میں اس چیز کا کوئی نام نہیں ملتا ہندوؤں نے اس کو ایک خوبصورت نام مایا کا دیا ہے۔ اور اس تصور کے ساتھ کچھ ایسی حسین روائتیں وابستہ کر دی ہیں۔ اور اس کی بنیاد پر اپنی دیو مالا کی وہ عظیم الشان عمارت تعمیر کی ہے۔ کہ یہ اک نہایت ہی دلچسپ اور مفید مطلب فلسفیانہ تصور بن کر سامنے آ گیا ہے۔ میں اس فلسفہ کا بالکل قائل نہ تھا۔ مگر

آج آنکھیں کھل گئیں۔ تم نے اداکاری کا وہ جوہر دکھایا ہے کہ کیا کہوں!

ہاں تو گلنار۔ یہ تمہارے پردیسی جی تو کوئی بڑے سرکاری افسر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا چپراسی روزانہ گاڑی سے ان کے بیوی بچوں کی خیریت معلوم کرنے جاتا ہے۔ اور تمہارے بیس بیس صفحوں والے خط انھیں لاکر دیتا ہے۔ یہ کیا کر رہی ہو غریب کو بیس بیس صفحات کے خط لکھ رہی ہو۔ مجھ کو تو کبھی تم نے دس لائن سے زیادہ کا خط لکھا ہی نہیں۔ اگر ان حضرت کی بیوی کے ہتھے تمہارا کوئی خط کہیں پڑ گیا تو ان کی کیا گت بنے گی؟ اس پر بھی کبھی کچھ سوچا ہے؟ مگر شاید یہی سوچ کر تم اس قدر طویل خطوط انھیں لکھتی ہو کہ کسی نہ کسی دن یہ راز اسی طرح کھل جائے۔ اور ان حضرت کی اچھی خاصی تواضع ہو جائے۔

ہاں ان حضرت پردیسی جی کی انا بھی غضب کی ہے۔ یہ جہاں رہتے وہاں بے انتہا آبادی ہوگئی اور بارونق خطے بن گئے۔ جن کی روح رواں یہی حضرت رہے۔ انھیں اکبر کا کلام اس لئے یاد نہیں تھا کہ وہ کوئی یاد رکھنے کی چیز تھی، بلکہ اس لیئے کہ انھیں اپنے حافظہ پر ناز تھا۔ اسی عشق ناز کے لیئے اکبر الہ آبادی کے کلام پر بھی ان کی نظر عنایت ہو جاتی تھی۔ ان کو یہ بھی احساس ہے کہ وہ بڑی توانائیوں کے مالک ہیں۔ مگر جب تم ان کی تخلیقی توانائیوں پر فریفتگی کا اظہار کرتی ہو تو ان حضرت کے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ کیوں کہ ان کے بقول وہ عملی اور خارجی زندگی جو ان کے حصے میں آئی ان کی تخئیل کے ساتھ ہمیشہ برسر پیکار رہی۔ مگر آخر کار تمہاری جادوگری کے وہ بھی قائل ہوئے۔ اور مان لیا کہ تمہارے کاٹے کا منتر نہیں۔ فرماتے ہیں کہ ان کو سانپ کا کاٹا سمجھا جائے جس کو ابھی لہریں تو آرہی ہیں مگر جس کو کوئی منتر نہیں بچا سکتا۔ اتنے پر بھی کچھ نہیں سمجھیں۔ میں تو محض اتنا کہوں گا۔

ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا — جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

دیکھا تم نے یہ مومن خاں ہیں۔ عشق بازی کے کامیاب ترین فن کار۔ خانوادۂ داغ کے باوا آدم۔ یوں تو کہنے کو داغ ذوق کے شاگرد تھے مگر وہ معنوی چیلے ہیں مومن خاں کے۔ اگرچہ مومن کی سطح سے کچھ نیچے اتر کر انھوں نے اپنی فن کاری کا مظاہرہ کیا۔ مگر پھر بھی دل کی آنچ سے اپنے انداز شاعری کو کچھ ایسی گرمی عطا کی کہ بازاری ہوتے ہوئے بھی یہ شرفا کا دل لبھا ہی لیگا۔ اور اپنے لیئے ایک مستقل مقام پیدا کر گئی۔ مگر بات تو پردیسی جی کی ہورہی تھی۔ اور ان کے سلسلے سے اکبر الہ آبادی کا ذکر تھا۔ عبدالماجد دریا آبادی لپیٹ میں آگئے۔ دو چار بے نقط انھیں بھی سننا ہی پڑیں۔ اگرچہ عبدالماجد دریا آبادی کے بارے میں میں پردیسی جی کی رائے سے متفق ہوں۔ وہ غریب نثر کا نہیں نظم کا آدمی تھا۔ شاعر ہوتا تو اس کا دل ٹوٹ کر کسی پر آگیا ہوتا۔ اور وہ ایسی رومانی اور جذباتی شاعری کرتا کہ اللہ غنی۔ حالانکہ اس کا انجام بھی بخیر نہیں ہوتا۔ تان آخر میں مایوسیت اور شکست پر ٹوٹتی۔ ایسوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ اس دنیا میں نہ جانے ایسے کتنے تماشے ہو چکے ہیں۔ دور کیوں جائیں اپنے پردیسی جی کو ہی دیکھ لو۔ جہاں تک کچھ اندازہ ہوتا ہے دنیا نے ہو سکتا ہے ان کی تمناؤں کی حد تک انھیں نہ نوازا ہو۔ مگر ان کی استعداد تک تو ضرور نوازا ہے۔ مگر پھر بھی حضرت شاکی ہیں ایک زمانے کے۔ رو رہے ہیں۔ منہ بسور رہے ہیں۔ دنیا کو گالیاں دے رہے ہیں کہ میں بڑی توانائیوں کا مالک تھا۔ اس دنیا کی چکی میں میری توانائیاں پس کر رہ گئیں۔ حال حضرت کا یہ ہے کہ۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ — پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

کبھی آپ پر شوپنہار اور دوسرے کلبی قسم کے غم پسندوں کا غلبہ تھا۔ کبھی آپ بھوت پریت اور مسمریزم کے قائل تھے۔ اور اپنے افسانوں سے تمام دنیا کو اس کا قائل کرنا چاہتے تھے۔ کبھی آپ اشتراکی بنے تو دنیا کے پیچھے ڈنڈا لے کر دوڑے کہ سب اشتراکی کیوں نہیں بن جاتے۔ پتہ نہیں آج یہ کون سی کیفیت ہے۔ جس پر اپنی عملی صلاحیتوں کے ضائع ہو جانے کا ماتم کر رہے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ یہ دنیا ان کے غم میں شریک ہو کر مجلس عزا میں تبدیل ہو جائے۔ اور بگڑ رہے ہیں اکبر پر۔ جس غریب نے دنیا کو مرتے دم تک ہنسایا اور اس طرح دنیا کے غم مٹائے۔

آپ کو شکایت ہے کہ اکبر کے یہاں فکر و نظر کی متعین بحث نہیں ملتی۔ وہ اکبر کو کم و بیش تنگ خیال۔ حاسد اور کینہ پرور بتاتے ہیں۔ اور اسی سانس میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ۔

"اکبر اردو شاعری میں پہلے شخص ہیں کہ جنھوں نے مزاح اور ظرافت کو معاشرتی اور اخلاقی تنقید اور تدریس کا ذریعہ بنایا۔ ان کی قرآت

شاعری ایک مقصد لیئے ہوتی ہے۔ انھیں شکوہ ہے کہ اکبر مغربی تہذیب کی اچھائیوں اور مشرقی تہذیب کی برائیوں پر نظر نہیں رکھتے۔
ان کو ایک رٹ ہے کہ مغربی تہذیب خراب ہے"!

اب تم ہی کہو کہ کیا وہی عیب جو تمہارے پردیسی جی عبدالماجد صاحب دریاآبادی میں پاتے ہیں۔ خود پردیسی جی کے انداز نظر میں پایا جاتا ہے۔
اکبر کوئی فلسفی یا معاشیات کا ماہر　　یا حکیم تو تھا نہیں جو وہ ایک مفصل کتاب لکھتا اور بتاتا کہ مغربی تہذیب میں کیا خرابی ہے اور مشرقی تہذیب میں کیا خوبی ہے۔ وہ یقیناً مغربی تہذیب کی خوبیوں کے قائل تھے ورنہ اپنی اولاد کو جدید مغربی تعلیم کی آخری منزل تک نہیں پہونچاتے س کے ساتھ ساتھ وہ مشرقی تہذیب کے کام کے اجزا کو یکسر چھوڑ دینا نہیں چاہتے تھے۔ اور اسی لیئے انھیں اپنے اندازے کے مطابق دونوں میں جہاں بھی کوئی خامی نظر آتی تھی اس کا خاکہ اڑانا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نہ صرف مغرب زدہ طبقے پر طنز و تعریض کرتے ہیں بلکہ اگلے وقتوں کے شیخ و ملا پر بھی پھبتیاں کستے رہتے ہیں۔ اب پردیسی جی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تو لگے پوچھنے کہ ان استفسار کی بحث کیا ہے؟۔ اور اُن سے ہماری کیا رہنمائی ہوتی ہے؟۔ مثلاً۔

ہند میں شیخ رہ گیا افسوس　　اونٹ گنگا میں بہہ گیا افسوس

اس شعر کا مطلب صاف ہے کہ اسلامی تعلیم میں جو ایک قلندرانہ بے نیازی، بے جا رسومات کی بیخ کنی، اور ماسوا اللہ کے کسی غیر کی اطاعت کا انکار ملتا ہے۔ وہ مسلمانوں کے درمیان سے غائب ہو گیا۔ اور یہاں صرف نام کے شیخ ہی رہ گئے۔ گنگا کی لہروں میں ایک عجیب انجذابی کیفیت ہے۔ زمانہ قدیم سے جتنی تہذیبیں اور قومیں ہندوستان میں آئیں بالآخر ہندو تہذیب میں جذب ہو گئیں۔ رہ گئے تو صرف ایک شیخ جی جو عملی حد تک تو جذب ہو گئے مگر نام کے لیئے ابھی علیحدہ ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اونٹ ایک علامت ہے قلندرانہ صبر و قناعت آس اور جذبہ عمل کی جو اسلام کی تعلیم کا جزو خاص ہے

اسی طرح مجنوں اور لیلیٰ کی ماں کے درمیان ایک گفتگو جو قلم بند کی گئی ہے۔ اور جس میں مجنوں کو ایم۔ اے پاس کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اس نظم سے پردیسی جی یہ نتیجہ نہیں نکال سکے کہ شاعر کہنا کیا چاہتا ہے۔ شاعر صاف کہہ رہا ہے کہ زمانہ اور زمانے کی ہوا بدل گئی۔ اور اب جدید تعلیم کے بغیر اور اس سے ہم آہنگی کے بغیر زندگی کے مختلف خانوں میں کوئی سانچہ فٹ نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ رشتۂ ازدواج کے لیئے بھی دقتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اس کی واضح تعبیر آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ اکبر نے کتنے پہلے کہا تھا کہ۔

لے لیا نیرس نے کمسریٹ میں ٹھیکہ دودھ کا　　دیں ہوا نے لگا فریاد اب کہار کی

یہ زندگی کا وہ واضح اور عملی خاکہ ہے جو ہر قدم پر ہمارے سامنے ہے۔ اکبر نے اگر اب سے بہت پہلے اس کا نقشہ پیش کر دیا تھا تو یہ تو ان کے دور میں دماغ کی ایسی کارگزاری تھی جس پر ہم ان کی جتنی بھی تعریف کریں کم ہے۔ آج مثالی فرہاد کے لیئے دنیا میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ موجودہ سماج میں کوئی بھی بلا کمائے کھانے کا حق دار نہیں ہے۔ زمانہ اور زمانے کی روش اس تیزی سے بدل رہی ہے کہ اب سے دس برس بعد شاید ہر گھر میں ہر فرد کو کمانا پڑے۔ شہروں میں تقریباً یہ پوزیشن آ چکی ہے۔ قصبات میں آ رہی ہے اور دیہات میں آنے والی ہے۔ پورے سماج کا ڈھانچہ بدل رہا ہے۔ اور بدل جانے کے بعد سماج کا ڈھانچہ کیا ہوگا وہ آج اہل نظر ہی کو نہیں عوام الناس کو بھی نظر آ رہا ہے۔

اکبر کے سلسلے میں پردیسی جی کا ارشاد ہے کہ " میں نے کبھی ہجو واستہزاء اور طنز و تضحیک کو صحت بخش صورت کا اظہار نہیں سمجھا۔ مصوری میں ہو یا ادب میں۔ میں نے طنز و تضحیکات کو ہمیشہ ادنیٰ درجے کی تخلیقات سمجھا"! ایک عجیب و غریب قسم کا دعویٰ معلوم ہوتا ہے۔ بھلا گلنار۔ تمہیں بتاؤ کہ کیا کوئی ایسا انسان ہے جو منہ چڑانے کو قدرتی سبھاؤ پر ترجیح دے۔ مگر اس سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ بعض اوقات منہ چڑھا کر انسانوں کے خود اپنے بگاڑے ہوئے چہروں کو قدرتی وضع پر واپس لانا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ اکبر کی شاعری نے یہی کارنامہ انجام دیا ہے۔ اور اس طرح انھوں نے ایک زبردست سماجی کارنامہ انجام دے کر اپنی تاریخی اہمیت کو منوا لیا ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جب مغرب زدگی کا سیلاب ہمارے مشرقی اقدار کو اپنے ساتھ خس و خاشاک کی طرح بہائے لیئے جا رہا تھا۔ اور اس کا خطرہ تھا کہ کہیں یہ Macaulay کا خواب کہ ایک ایسی قوم پیدا کی جائے کہ جو محض دفتروں میں کلرکی کیا کرے۔ اور جس میں غلامانہ ذہنیت کوٹ کوٹ کر بھر دی جائے۔ اپنی تعبیر سے روشناس

ہونے والا تھا کہ اکبر اپنے طنز و مزاح کے کاری نشتروں اور ہتھیاروں سے لیس ہو کر میدانِ شاعری میں کود پڑے۔ اور انھوں نے اعلان کیا۔

کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے ‌ ‌ ‌ بی۔ اے کیا۔ نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے

اکبر کی شاعری مغرب کی ظاہری نقالی کے خلاف ایک محاذ ہے۔ یہ ان مغرب زدوں کے خلاف ایک اعلانِ جنگ ہے جو پڑھ لکھ کر باقی ہندوستانیوں کو کالا آدمی سمجھنے لگے۔ جو کوٹ پتلون کی ادا کے ایسے پرستار تھے کہ کرتے اور پاجامے اور شیروانی کا استعمال خلافِ تہذیب سمجھنے لگے تھے اور انھیں دقیانوسی چیزیں ماننے لگے تھے۔ جو مشرقیت سے ایک وبائی مرض کی طرح گھبرا کر اپنی مادری زبان کو انگریزوں کی نقل میں بگاڑ کر بولنے لگے تھے۔ فرماتے ہیں۔

آگاہ ہوں معنیٔ خوش اقبالی سے ‌ ‌ ‌ واقف ہوں بنائے رتبۂ عالی سے

شرطیں عزت کی اور ہیں اکبرؔ ‌ ‌ ‌ چلتا نہیں کام صرف نقالی سے

انھیں مغرب کی روحِ عمل کا پورا احساس تھا۔ اس روحِ عمل اور مغرب کی علمی لگن کی ان کے دل میں بہت عزت تھی وہ اپنے زمانے کے بڑے ترقی پسند لوگوں میں تھے۔ وہ اشیاء کی ماہیت اور جدید علوم کی افادیت پر خاص نگاہ رکھتے تھے۔ دیکھیئے کوآپریٹو تحریک پر (coopera tuie move meut) کیا خوب کہا ہے۔

خواہش ہے اگر تجھے غنی بننے کی۔ ‌ ‌ ‌ دولت کی ہوس ہے اور دھنی بننے کی

شخصی حالت کو چھوڑ کر لے ضدی ‌ ‌ ‌ کوشش لازم ہے کمپنی بننے کی

میں نے مانا کہ کوآپریٹو تحریک کا اتنا واضح خاکہ جو آج ہے۔ ان کے دماغ میں نہ تھا۔ مگر چند انسانوں کی مجموعی کوششوں اور مشترکہ سرمایہ سے ایک کمپنی بنا کر تجارت کے میدان میں سرمایہ کمانا اور انفرادی تجارت پیشہ لوگوں سے بازی لیجانے کا طریقہ انھیں معلوم تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس کا کتنا گہرا شعور انھیں حاصل تھا وہ ان اشعار سے ظاہر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انھیں طنز و مزاح کا شاعر مان لینے کے بعد ان کے اشعار کے اس رخ پر کسی کی نگاہ جا ہی نہ سکی۔

گلنار۔ مجھے تعجب ہے تو اس بات پر کہ پردیسی جی جن کی تنقید کا بصیرت کی تم معترف ہو، خطوط میں کچھ عجیب چوں چوں کا مربہ معلوم ہوتے ہیں۔ اور ہر نئے پیراگراف پر پچھلے پیراگراف میں دی ہوئی رائے کے خلاف اک نئی راہ کا اظہار فرماتے ہیں۔ وہ اکبر کو اردو شاعری میں سب سے بڑا حیوان ظریف بھی مانتے ہیں۔ ان کی شاعری کو مقصدی بھی کہتے ہیں۔ ان کو اردو کا سب سے بڑا مزاحیہ شاعر بھی تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ طنز و مضحکات کو ادنیٰ درجے کی تخلیق سمجھتے ہیں۔ اس لیئے ظاہر ہے کہ اکبر کو لائقِ اعتبار بھی نہیں سمجھتے اور پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کے یہاں فکر و نظر کی کوئی متعین سمت نہیں ملتی۔ وہ اکبر کو سر سید اور علی گڑھ تحریک کے خلاف رجعتی میلان کا سرگردہ بھی کہتے ہیں۔ ہر جگہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ اکبر الہ آبادی۔ عبدالماجد دریا آبادی۔ مرثیہ و غزل اور اردو شاعری ان سب کا ذکر تو محض برائے بیت ہے۔ ذکر مقصود ہے اک ذات بزرگ و برتر کا جو ذہانت و خلاقت کی اعلیٰ ترین معراج پر ہے۔ جو ہمہ وقت ہر شے کا ادراک رکھتی ہے۔ ہر علم و فن میں حاوی ہے۔ اور علوم جدید و قدیم جس کی گرفت میں۔ اور وہ ہے خود پردیسی جی کی ذات جس کا مکمل عرفان خود انھیں ہی حاصل نہیں ہے۔ اس لیئے وہ اپنے ماضی و حال اور مستقبل پر ہمہ وقت غور فرماتے رہتے ہیں۔ اور تم اگر انھیں یوں ہی خط لکھتی رہیں تو شاید وہ اپنی زندگی کا ثبوت دے سکیں۔ اللہ غنی۔ معرفت کی یہ کون سی منزل ہے کہ خود اپنے زندہ ہونے کا یقین نہیں ہے؟ مجھے تو ڈر ہے کہ اگر تم اسی طرح چھیڑا کرتی رہیں تو غریب تنگ آ کر کہیں خودکشی نہ کر بیٹھے۔ مگر جاٹ مرا جب جانیئے جب تیرہیں ہو جائے۔ مرتے مرتے بھی یہ بہت سے شاعروں اور ادیبوں کے متعلق اک عام بدگمانی تو پیدا کر ہی جائیں گے۔

حضرت کی ادبی بصیرت جس کے وہ خود ہی ڈھنڈورچی ہیں یہ پہچاننے سے قاصر ہے کہ اکبر نے اپنے دور کی معاشرت کو آئینہ دکھایا ہے اور بروقت متنبہ کیا ہے کہ نہ بگڑتے بگڑتے کہیں خد و خال کی مسخ شدہ صورت ہی مستقل نہ ہو جائے۔ اس لیئے ہوش میں آؤ اور اپنے چہرے

شاعری ایک مقصد لیئے ہوتی ہے۔ انھیں شکوہ ہے کہ اکبر مغربی تہذیب کی اچھائیوں اور مشرقی تہذیب کی برائیوں پر نظر نہیں رکھتے۔
ان کو ایک رٹ ہے کہ مغربی تہذیب خراب ہے"

اب تم ہی کہو کہ کیا وہی عیب جو تمہارے پردیسی جی عبدالماجد صاحب دریا آبادی میں پاتے ہیں۔ خود پردیسی جی کے انداز نظر میں پایا جاتا ہے۔
اکبر کوئی فلسفی یا معاشیات کا ماہر　　یا حکیم تو تھا نہیں جو وہ ایک مفصل کتاب لکھتا اور بتاتا کہ مغربی تہذیب میں کیا خرابی ہے اور مشرقی تہذیب میں کیا خوبی ہے۔ وہ یقیناً مغربی تہذیب کی خوبیوں کے قائل تھے ورنہ اپنی اولاد کو جدید مغربی تعلیم کی آخری منزل تک نہیں پہونچاتے اس کے ساتھ ساتھ وہ مشرقی تہذیب کے کام کے اجزاء کو یکسر چھوڑ دینا نہیں چاہتے تھے۔ اور اسی لیئے انھیں اپنے اندازے کے مطابق دونوں میں جہاں بھی کوئی خامی نظر آتی تھی اس کا خاکہ اڑانا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نہ صرف مغرب زدہ طبقے پر طنز و تعریض کرتے ہیں بلکہ اگلے وقتوں کے شیخ و ملا پر بھی پھبتیاں کستے رہتے ہیں۔ اب پردیسی جی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تو لگے پوچھنے کہ ان استفسار کی بحث کیا ہے؟۔ اور اُن سے ہماری کیا رہنمائی ہوتی ہے؟۔ مثلاً۔

ہند میں شیخ رہ گیا افسوس　　اونٹ گنگا میں بہہ گیا افسوس

اس شعر کا مطلب صاف ہے کہ اسلامی تعلیم میں جو ایک قلندرانہ بے نیازی، بے جا رسومات کی بیخ کنی، اور ماسوا اللہ کے کسی غیر کی اطاعت کا انکار ملتا ہے۔ وہ مسلمانوں کے درمیان سے غائب ہو گیا۔ اور یہاں صرف نام کے شیخ ہی رہ گئے۔ گنگا کی لہروں میں ایک عجیب انجذابی کیفیت ہے۔ زمانہ قدیم سے جتنی تہذیبیں اور قومیں ہندوستان میں آئیں بالآخر ہند و تہذیب میں جذب ہو گئیں۔ رہ گئے تو صرف ایک شیخ جی جو عملی حد تک تو جذب ہو گئے مگر نام کے لیئے ابھی علیحدہ ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اونٹ ایک علامت ہے قلندرانہ صبر و قناعت اس اور جذبہ عمل کی جو اسلام کی تعلیم کا جزو خاص ہے
اسی طرح مجنوں اور لیلیٰ کی ماں کے درمیان ایک گفتگو جو قلم بند کی گئی ہے۔ اور جس میں مجنوں کو ایم۔ اے پاس کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اس نظم سے پردیسی جی یہ نتیجہ نہیں نکال سکے کہ شاعر کہنا کیا چاہتا ہے۔ شاعر صاف کہہ رہا ہے کہ زمانہ اور زمانے کی ہوا بدل گئی۔ اور اب جدید تعلیم کے بغیر اور اس سے ہم آہنگی کے بغیر زندگی کے مختلف خانوں میں کوئی سانچہ فٹ نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ رشتۂ ازدواج کے لیئے بھی دقتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اس کی واضح تعبیر آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ اکبر نے کتنے پہلے کہا تھا کہ۔

لے لیا تیریں نے کسرٹ میں ٹھیکہ دودھ کا　　ریل ہوا نے لگا فرہاد اب کہسار کی

یہ زندگی کا وہ واضح اور عملی خاکہ ہے جو ہر قدم پر ہمارے سامنے ہے۔ اکبر نے اگر اب سے بہت پہلے اس کا نقشہ پیش کر دیا تھا تو یہ تو ان کے دور میں دماغ کی ایسی کارگزاری تھی جس پر ہم ان کی جتنی بھی تعریف کریں کم ہے۔ آج مثالی فرہاد کے لیئے دنیا میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ موجودہ سماج میں کوئی بھی بلا کمائے کھانے کا حق دار نہیں ہے۔ زمانہ اور زمانے کی روش اس تیزی سے بدل رہی ہے کہ اب سے دس برس بعد شاید ہر گھر میں ہر فرد کو کمانا پڑے۔ شہروں میں تقریباً یہ پوزیشن آ چکی ہے۔ قصبات میں آ رہی ہے اور دیہات میں آنے والی ہے۔ پورے سماج کا ڈھانچہ بدل رہا ہے۔ اور بدل جانے کے بعد سماج کا ڈھانچہ کیا ہو گا وہ آج اہل نظر ہی کو نہیں عوام الناس کو بھی نظر آ رہا ہے۔

اکبر کے سلسلہ میں پردیسی جی کا ارشاد ہے کہ "میں نے کبھی ہجو و استہزا، اور طنز و تضحیک کو صحت بخش صورت کا اظہار نہیں سمجھا۔ مصوری میں ہو یا ادب میں۔ میں نے طنز و تضحیکات کو ہمیشہ ادنیٰ درجے کی تخلیقات سمجھا" ایک عجیب و غریب قسم کا دعویٰ معلوم ہوتا ہے۔ بھلا گلنار۔ تمہیں بتاؤ کہ کیا کوئی ایسا انسان ہے جو منہ چڑانے کو قدرتی سیما پر ترجیح دے۔ مگر اس سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ بعض اوقات منہ چڑھا کر انسانوں کے خود اپنے بگاڑے ہوئے چہروں کو قدرتی وضع پر واپس لانا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ اکبر کی شاعری نے یہی کارنامہ انجام دیا ہے۔ اور اس طرح انھوں نے ایک زبردست سماجی کارنامہ انجام دے کر اپنی تاریخی اہمیت کو منوا لیا ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جب مغرب زدگی کا سیلاب ہمارے مشرقی اقدار کو اپنے ساتھ خس و خاشاک کی طرح بہائے لئے جا رہا تھا۔ اور اس کا خطرہ تھا کہ میکالے (Macaulay) کا خواب کہ ایک ایسی قوم پیدا کی جائے کہ جو محض دفتروں میں کلرکی کیا کرے۔ اور جس میں غلامانہ ذہنیت کوٹ کوٹ کر بھری جائے۔ اپنی تعبیر سے روشناس

ہونے والا تھا کہ اکبر اپنے طنز و مزاح کے کاری نشتروں اور ہتھیاروں سے لیس ہو کر میدان شاعری میں کود پڑے۔ اور انھوں نے اعلان کیا۔

کیا کہیں احباب کیا کار نمایاں کر گئے　　بی۔ اے کیا۔ نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے

اکبر کی شاعری مغرب کی ظاہری نقالی کے خلاف ایک محاذ ہے۔ یہ ان مغرب زدوں کے خلاف ایک اعلان جنگ ہے جو پڑھ لکھ کر باقی ہندوستانیوں کو کالا آدمی سمجھنے لگے۔ جو کوٹ پتلون کی ادا کے ایسے پرستار تھے کہ کرتے اور پاجامے اور شیروانی کا استعمال خلاف تہذیب سمجھنے لگے تھے اور انھیں دقیانوسی چیزیں ماننے لگے تھے۔ جو مشرقیت سے ایک وبائی مرض کی طرح گھبرا کر اپنی مادری زبان کو انگریزوں کی نقل میں بگاڑ کر بولنے لگے تھے۔ فرماتے ہیں۔

آگاہ ہوں معنی خوش اقبالی سے　　واقف ہوں بنائے رتبۂ عالی سے

شرطیں عزت کی اور ہیں اکبر　　چلتا نہیں کام صرف نقالی سے

انھیں مغرب کی روح عمل کا پورا احساس تھا۔ اس روح عمل اور مغرب کی علمی لگن کی ان کے دل میں بہت عزت تھی وہ اپنے زمانے کے بڑے ترقی پسند لوگوں میں تھے۔ وہ اشیاء کی ماہیت اور جدید علوم کی افادیت پر خاص نگاہ رکھتے تھے۔ دیکھیئے کوآپریٹو تحریک پر (cooperative movement) کیا خوب کہا ہے۔

خواہش ہے اگر تجھے غنی بننے کی　　دولت کی ہوس ہے اور دھنی بننے کی

شخصی حالت کو چھوڑ کر لے ضدی　　کوشش لازم ہے کمپنی بننے کی

میں نے مانا کہ کوآپریٹو تحریک کا اتنا واضح خاکہ جو آج ہے۔ ان کے دماغ میں نہ تھا۔ مگر چند انسانوں کی مجموعی کوششوں اور مشترکہ سرمایہ سے ایک کمپنی بنا کر تجارت کے میدان میں سرمایہ کمانا اور انفرادی تجارت پیشہ لوگوں سے بازی لیجانے کا طریقہ انھیں معلوم تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس کا کتنا گہرا شعور انھیں حاصل تھا وہ ان اشعار سے ظاہر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انھیں طنز و مزاح کا شاعر مان لینے کے بعد ان کے اشعار کے اس رخ پر کسی کی نگاہ جا ہی نہ سکی۔

گلنار۔ مجھے تعجب ہے تو اس بات پر کہ پیر دلیسی جی جن کی تنقیدی بصیرت کی تم معترف ہو، خطوط میں کچھ عجیب چوں چوں کا مربہ معلوم ہوتے ہیں۔ اور ہر نئے پیراگراف پر پچھلے پیراگراف میں دی ہوئی رائے کے خلاف اک نئی راہ کا اظہار فرماتے ہیں۔ وہ اکبر کو اردو شاعری میں سب سے بڑا حیوان ظریف بھی مانتے ہیں۔ ان کی شاعری کو مصوری بھی کہتے ہیں۔ ان کو اردو کا سب سے بڑا مزاحیہ شاعر بھی تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ طنز و مضحکات کو ادنیٰ درجے کی تخلیق سمجھتے ہیں۔ اس لیئے ظاہر ہے کہ اکبر کو لائق اعتنا بھی نہیں سمجھتے اور پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کے یہاں فکر و نظر کی کوئی متعین سمت نہیں ملتی۔ وہ اکبر کو سرسید اور علی گڑھ تحریک کے خلاف رجعتی میلان کا سرگروہ بھی کہتے ہیں۔ ہر جگہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ اکبر الہ آبادی۔ عبدالماجد دریا آبادی۔ مرثیہ و غزل اور اردو شاعری ان سب کا ذکر تو محض برائے بیت ہے۔ ذکر مقصود ہے اک ذات بزرگ و برتر کا جو ذہانت و خلاقت کی اعلیٰ ترین مواج پر ہے۔ جو ہمہ وقت ہر شے کا ادراک رکھتی ہے۔ ہر علم و فن میں حاوی ہے۔ اور علوم جدید و قدیم جس کی گرفت میں۔ اور وہ ہے خود پیر دلیسی جی کی ذات جس کا مکمل عرفان خود انھیں ہی حاصل نہیں ہے۔ اس لیئے وہ اپنے ماضی حال اور مستقبل پر ہمہ وقت غور فرماتے رہتے ہیں۔ اور تم اگر انھیں یوں ہی خط لکھتی رہیں تو شاید وہ اپنی زندگی کا ثبوت دے سکیں۔ اللہ غنی۔ معرفت کی یہ کون سی منزل ہے کہ خود اپنے زندہ ہونے کا یقین نہیں ہے؟ مجھے تو ڈر ہے کہ اگر تم اسی طرح چھیڑ کرتی رہیں تو عزیز تنگ آ کر کہیں خودکشی نہ کر بیٹھیں۔ مگر جاٹ مرا جب جانیئے جب تیرہیں ہو جائے۔ مرتے مرتے بھی یہ بہت سے شاعروں اور ادیبوں کے متعلق اک عام بدگمانی تو پیدا کر ہی جائیں گے۔

حضرت کی ادبی بصیرت جس کے وہ خود ہی ڈھنڈورچی بھی ہیں یہ پہچاننے سے قاصر رہی ہے کہ اکبر نے اپنے دور کی معاشرت کو آئینہ دکھایا ہے بروقت متنبہ کیا ہے کہ منہ بگڑتے بگڑتے کہیں خد و خال کی مسخ شدہ صورت ہی مستقل نہ ہو جائے۔ اس لیئے ہوش میں آؤ اور اپنے چہرے

چہرے کو فطری شکل و صورت سے قریب لانے کی فکر کرو۔ ہاں اس آئینہ کی سطح اتنی ہموار نہیں ہے۔ جتنی کہ ہونا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ عکس کہیں کہیں اصل سے بھی زیادہ مضحک نظر آتا ہے۔ مگر یہی تو ایک طنز نگار کا صحیح آرٹ بھی ہے اور مقصد بھی۔ اکبر نے معاشرے کو کچھ زیادہ ہی مضحک بناکر دکھانے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ وہ عیوب جن پر ان کی نگاہ ہے زیادہ واضح طور پر سامنے آسکیں۔ اور معاشرے کی اصلاح ہو سکے رہا یہ کہ پردہ یا تعلیم نسواں اور دوسرے چند مسائل پر انھوں نے اس وسعت قلب و نظر کا ثبوت نہیں دیا جس کی آج کے مفکرین سے توقع کی جاتی ہے۔ تو میں اس سے بھی متفق نہیں ہوں۔ یہ ضروری نہیں کہ اکبر ہر مسئلہ پر ہماری ہی نظر سے دیکھتے وہ ایک خاص زمانے میں تھے اور جس زمانے میں اکبر تھے اس زمانے میں اس طرح سوچا ہی نہ جا سکتا تھا کہ جس طرح آج سوچا جا سکتا ہے۔ وہ معاشرے کی ایک سطح سے تعلق رکھتے تھے اور ایک خاص زمانے میں پیدا ہوئے۔ ان دونوں چیزوں کی اپنی حدیں اور اپنے تقاضے تھے۔ ان حدبندیوں اور تقاضوں کے پیش نظر جب ہم اکبر کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ان کی عظمت، دوربینی اور ترقی پسند طبیعت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

مگر تم بھی کہو گی کہ خط کیا ہے شیطان کی آنت ہے۔ اس لیئے سر دست اس بحث کو ختم کرتا ہوں اگرچہ یہ سمجھتا ہوں کہ اکبر پر بحث کا صحیح حق ادا نہیں کر سکا۔ اس کے لیئے میں نے سوچا ہے کہ ایک تفصیلی مضمون لکھوں جس کو کسی اچھے رسالے میں شائع کرا دوں۔ تاکہ اس طرح خطوط کو ذاتی دائرے تک محدود رکھا جا سکے اور ان میں زیادہ اچھی اور دلچسپ باتیں کی جاسکیں۔ خطوط اصل میں اس لیئے ہی بھی نہیں کہ ان کے ذریعہ اپنے پندار علمی کو ظاہر کیا جائے۔ یہ دماغ کی باتوں سے زیادہ دل کی باتوں کا ذریعۂ اظہار ہیں۔ ان میں صرف لطیف احساسات اور عمدہ جذبات ہی کی گنجائش ہے۔ یہ دماغی استفراغ کے لیئے اگالدان کا کام نہیں دیتے بلکہ یہ ایک دوسرے کی باہمی معرفت ذات کے لیئے نازک ترین آلے کا کام دیتے ہیں۔ جو ادب کی بارگاہ میں نصب کیئے گئے ہیں۔ آئندہ میں اس طرح کی بحث میں کبھی نہ الجھونگا۔

ہاں موقع ملے تو پردیسی جی سے کسی دن ملاقات کرا دونا! وقت ضرورت کام آنے والے لوگوں میں معلوم ہوتے ہیں!! ۔

زیادہ پھر کبھی۔ نہیں، نہیں اگلے خط میں۔

تمھارا اپنا

"دیسی"

شوکت ۔ ایک دوست اور ایک ساتھی

قاضی عیاذ انصاری

۱۹۴۹ء کا ابتدائی زمانہ تھا۔ میں دہلی کے ریڈیو اسٹیشن سے بدل کر لکھنؤ پہونچا تو مرحوم سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ ان دنوں لکھنؤ اسٹیشن پر اتفاق سے کچھ ایسی شخصیتیں جمع تھیں جن میں باہمی یگانگت اور میل جول قائم تھا۔ نشریات میں کارگزار اچھے ہوں اور ان میں بے تکلفی اور بے ساختگی کے ساتھ یکجہتی اور وحدت خیال کا جذبہ بھی ہو یہ نشریات کے لئے فال نیک ہے اور پروگراموں کی بہتری اور نیک نامی کی ضمانت بھی۔ ہندوستانی نشریات کی تاریخ میں لکھنؤ اسٹیشن کی وہ ٹیم جو اس وقت وہاں کام کر رہی تھی، اپنی کارگزاری کے اعتبار سے بہت نیک نام ثابت ہوئی۔ ملک حبیب احمد، انصار ناصری، عشرت رحمانی، کرشن سروپ ملک موجودہ ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل فرید اور شوکت یہ سب الگ الگ نام تھے۔ ایک ہی جذبے اور ایک ہی خیال کے۔ کام سے دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی ایک کو ان میں سے رات کے وقت کسی ضرورت سے اسٹوڈیوز کی حاضری ضروری ہوتی تو اس ایک کی طمانیت خاطر کے لئے سب ہی وہاں جمع رہتے۔ دفتری زندگی اور باہر کی زندگی میں ایسا تال میل پھر کہیں کسی اور اسٹیشن پر میں نے نہیں دیکھا۔ باہر کی زندگی میں یہ لوگ اس قدر یکجہت تھے کہ اس وقت تک کوئی نشست گرم نہ ہوتی جب تک سب کی موجودگی مستحق نہ ہو جاتی۔

شوکت ان محفلوں کی روح رواں تھے۔ ریڈیو کے اندر بھی اور ریڈیو کے باہر بھی۔ ان کے بغیر کوئی محفل کوئی مجلس جیسے مکمل ہی نہ تھی۔ وہ خود جان محفل تھے۔ لیکن تہ دار، ایسا روپ دھارن کرتے اور جھوم جھوم کر ایسی لٹکی باتیں کرتے جیسے ابھی ابھی ساغر کسی سے چھوٹ پڑا ہو شراب کا۔ وہ عمر کے بھی اس نشیلے دور میں تھے جب انسان ہر پا چال چلتا ہے تو بن پئے بھی لڑکھڑا لڑکھڑا کر بہک بہک کر چلنے میں اسے مزہ آتا ہے۔ بیٹھتے ہی وہ محفل کو گرم کر دیتے جیسے کسی نے اندھیرے میں یکایک بجلی کا قمقمہ روشن کر دیا ہو۔ پھر ایک سے ایک حسین شعر سن لیجئے۔ چٹکلوں، لطیفوں اور فقروں کا دریا بہہ نکلتا اور پھر ان میں یہ خوبی تھی کہ وہ چوکھے بھی تھے۔ کسی ایک کا پیچھا نہ لیتے۔ اب عیاذ سے چہل کر رہے ہیں تو اب عشرت کی جان کو آ رہے ہیں تو اب حبیب کی خبر لے رہے ہیں۔ انصار ناصری ان کے مشق ستم ہیں تو اب ملک صاحب کو گرما رہے ہیں۔ انہی میں ایک بزرگ جی۔ ایم۔ شاہ بھی تھے ان کے جی حضوری کردار کی مناسبت سے شوکت نے ان کا نام ہی "حضور" رکھ چھوڑا تھا۔ عشرت رحمانی کو پروفیسر کے خطاب سے شوکت ہی نے نوازا۔ اور میں سمجھتا ہوں احباب میں آج تک وہ اسی نام سے معروف بھی ہیں۔ مجھے 'بھائی' کا عطیہ بھی شوکت ہی کی طرف سے ہے۔ لکھنؤ اسٹیشن پر 'بھائی' پھر اس قدر مقبول ہوا کہ آج بھی وہاں کے پرانے کارگزار مجھے اسی نام سے پکارتے ہیں۔

شوکت کو ہزاروں اشعار یاد تھے۔ ہر طرح کے، ہر مضمون کے، وقت کے تقاضے کے ساتھ وہ شعر کو اس خوبی کے ساتھ پیوستہ کرتے کہ گھٹیا شعر بھی سناتے تو ان کی زبان سے اچھا ہی لگتا تھا۔ اس سلسلے میں شوکت کے خاص دوست مرحوم رفیع احمد خاں کا ذکر بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ وہ بزرگ ہیں جو صاحب دیوان نہ ہوتے ہوئے بھی اردو سے دلچسپی رکھنے والوں میں زندہ جاوید ہیں اور لطف یہ کہ بڑی بڑی سنجیدہ محفلوں اور مجلسوں میں ان کی پہونچ ہے۔ وہ اس صدی کے جعفر زٹلی ہیں۔ ہزلیات کے بے تاج بادشاہ۔ تضمین پر انھیں بلا کا عبور تھا۔ غالب کے سنجیدہ سے سنجیدہ شعر پر ایسی تضمین لگاتے کہ الامان الحفیظ۔ کچھ دیر کے لئے غالب کا شعر خود ان کا شعر معلوم ہونے لگتا۔ پھر فنی اعتبار سے کیا مجال جو وزن سے گرا ہو یا معنوی اعتبار سے شعر کی انفرادیت مجروح ہوئی ہو۔ شوکت ان کے چلتے پھرتے دیوان تھے جو کچھ خاں صاحب نے کہا شوکت گرہ سے کر اسے محفوظ کر لیتے۔ خاں صاحب کی ہزلیات کو "نعوذ باللہ" شوکت الہیات کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ ان کی شوخیٔ طبع کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔ محفل کی ضبط سماعت کا انھیں ایسا اچھا سلیقہ تھا وقت کے تقاضے کا ایسا بھرپور تجربہ تھا اور پھر تنوع کے وہ ایسے ماہر تھے کہ گھنٹوں محفل کو گرم رکھتے نہ خود تھکتے اور نہ سننے والے سنتے سنتے تھکتے۔ شوکت کے تکلم میں نرمی بھی غضب کی تھی۔ لوچ بھی بلا کا تھا۔ اس کے چبھتے فقرے بھی قہقہوں میں اڑ جاتے تھے۔ ایسے کبھی نہیں دیکھا کہ شوکت سے کوئی گراں خاطر اٹھا ہو۔ تین سال سے کچھ زائد ان کے ساتھ لکھنؤ میں گزرے۔ دن میں ہر وقت کا ساتھ دفتر میں اور راتوں کو اکثر محفلوں اور مجلسوں میں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے ذرا بھی تکلف نہیں کہ میری ذات کے ساتھ شوکت ہمیشہ ایک طرح کی خصوصیت برتتے تھے میں بلا سعی و کوشش خود بخود ایک طرح کا

صحت مند حد فاصل قائم ہوگیا تھا۔ ہنسی مذاق کی باتوں میں بھی وہ اس تعلق کا خیال رکھتے تھے۔ دراصل میں ان سے اور وہ مجھ سے ریڈیو کی دفتری ملاقات سے کچھ زیادہ ہی واقف ہو چکے تھے۔ وہ تھانہ بھون کے رہنے والے اور دور کے سہی حضرت مولانا تھانوی سے ان کی عزیزداری مسلم۔ میں گنگوہ کا باشندہ اور حضرت گنگوہی کے خاندان سے میری نسبت۔ یہ اپنے اپنے اعتقاد پر ہے۔ مجھے جنھیں شوکت نے کبھی چاک نہیں ہونے دیا۔ ان پاکیزہ ہستیوں کا ذکر کر کے یہاں میں نے ایک طرح کا سوءِ ادب ضرور کیا ہے لیکن شوکت کی سیرت میں ثقافتی قدروں کی جو بے سمجھی بوجھی شدت ملتی ہے وہ اس تذکرہ کے بغیر تشنۂ تشریح رہتی۔ ایک روز میں اپنے گھریلو معاملات کی فکر میں گم اپنی کرسی پر دراز تھا کہ دبے پاؤں شوکت نے مجھے پیچھے سے آلیا۔ میرا دماغ اس پر کچھ ایسا بے لطف تھا کہ غیر ارادی طور پر میرا بازو دراز ہوا اور الٹے ہاتھ کا ہلکا سا چپت ان کے رخسار پر پڑ گیا۔ شوکت کے وقار کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اب میں ریڈیو اسٹیشن پر کہیں کا نہ رہتا لیکن اس کی انسان دوستی میرے اس حمق سے زیادہ موثر ثابت ہوئی۔ حضرت عیسیٰ کے ایک حقیقی پیرو کی طرح انھوں نے دوسرا گال بھی میرے سامنے کر دیا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگے "بھائی! ایسی کیا مصیبت تجھ پر نازل ہے جس نے تجھے دیوانہ بنا رکھا ہے۔" شرم سے میں پانی پانی تھا۔ انتہائی شکست خوردگی کے عالم میں بیٹھا میں شوکت کے مسکراتے چہرے کو تکتا رہا

آج جب شوکت کی اس نیک مسکراہٹ اور اس نظر مودت پر غور کرتا ہوں تو قلب میں ایک طرح کا جذبہ عبادت پیدا ہوتا ہے اور سوچتا ہوں کہ بزرگوں نے "مودت فی اللہ" شاید اسی کو کہا ہو۔ میں نے شوکت سے وہ سب کچھ کہہ دیا جو ان دو چار دنوں میں کسی سے بھی نہ کہہ سکا تھا۔ اور اب آپ سے بھی کیا پردہ ہے! لیجئے سن لیجئے! میری بھانجی کی شادی مقرر تھی اور میری بہن کو شادی کے لئے رقم کی ضرورت تھی اور میری مدد پر وہ پوری طرح منحصر تھیں۔ مگر تھی جوں جوں دن قریب آرہے تھے میری خلش ابھر رہی تھی۔ دن رات میں اسی الجھن میں تھا۔ اپنی بے بسی کا احساس شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ رقم اتنی تھی کہ لکھنؤ بیٹھ کر اس کا مہیا کرنا ممکن نہ تھا۔ میری زندگی ایسی خودفراموشی کے عالم سے گزر رہی تھی کہ میں کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کے قابل بھی نہیں تھا۔ شوکت نے سن کر قہقہہ لگایا اور کہا "بس اتنی سی بات! چلو میں دلاتا ہوں جتنی رقم درکار ہے۔" میں نے کہا "ایک ہزار" کہنے لگے "ہاں ہاں ایک ہزار"۔ اپنے خاں صاحب کی جیب کاٹنی ہوگی وہ مجھے اٹھا کر رفیع احمد خاں صاحب کے پاس لے گئے اور دو تین روز کی پیروی کے بعد انھوں نے کچھ سو روپیہ کی رقم کو آپریٹیو سے قرض دلا دی۔ شوکت کے نقاد ان کی زندگی سے ہزاروں خود ساختہ داستانیں سنا سنا کر انھیں چلبلا، الھڑ، بے باک، منھ زور، بے ضبط، بے ربط اور ان کی غیر ذمہ داری اور غیر سنجیدگی کے تذکرے کرتے رہیں گے لیکن میں اس انسان شوکت کا ذکر کر رہا ہوں جس نے میری اس کمزوری کا پھر کبھی کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ قریب سے قریب احباب حبیب اور قریبی آج تک اس راز سے واقف نہ ہوسکے۔ میں خود ہی آج بیس برس بعد بطور اظہار تشکر اور بسلسلہ احسان اس کا ذکر کر رہا ہوں یوں اسی شوکت نے ایک مرتبہ اتنی ہی بڑی رقم کے لئے اپنے ایک دوست کی خاطر مجھے ضمانت میں پھانس لیا تھا اور آج بھی اس رقم کا کچھ حصہ پاکستان کے اس عزیز دوست کے ذمہ واجب الادا ہے۔ لیکن اس کی نہ مجھے کوئی شکایت ہے اور نہ شوکت سے کوئی گلہ۔ دوستوں کی خاطر شوکت سب کچھ کر گزرنے والے دوست تھے۔ اپنی جیب کو چھوڑ کر جو ان کے اختیار میں اور جو کچھ ہوتا اس سے کبھی نہ چوکتے تھے۔ دوستوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی شدت میں بھی ایک کیف ہے ایک چٹورپن ہے اور یہ ایسا نشہ ہے جس کی سرشاری میں بہک کر لڑکھڑا کر چلنا تو ایک طرف انسان گر کر چوٹ کھانے اور سر پھوڑ لینے کی بھی پروا نہیں کرتا۔ انسان کی ساری بے باکیاں، غیر سنجیدگیاں، غیر ذمہ داریاں اور دل آزاریاں اپنی ذات سے زیادہ کبھی کبھی دوسروں کی خاطر ظہور میں آتی ہیں۔ لکھنؤ میں شوکت کا حلقۂ احباب جس قدر وسیع تھا وہ اسی قدر دوست نواز بھی تھے۔ دوسروں کے پھٹے میں پاؤں اڑانے کی انھیں جیسی چاٹ سی پڑ گئی تھی اور اسی لئے وہ ضبط و نظم اور نصب و احتیاط کی منزلوں سے بہت آگے تھے۔ لکھنؤ کے احباب میں ایک صاحب تھے نلینی بھٹاچاریہ الٰہ آباد کے مشہور پروفیسر بھٹاچاریہ کے صاحبزادے۔ آل انڈیا ریڈیو میں وہ موسیقی کے پروگرام کی خدمت پر فائز تھے۔ ہم لوگوں میں خوب گھل مل گئے تھے۔ راتوں کی رنگین نشستوں میں بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوتے لیکن جیب و دامن کے فاصلے کے وہ کچھ زیادہ ہی قائل تھے۔ ان کی اس سمجھی بوجھی اعتدال پسندی کی وجہ سے اکثر ان کے خلاف سازشیں چلتی رہتی تھیں۔ ایک مرتبہ شوکت نے ایسا اقدام کیا کہ ہفتوں اور مہینوں کی کسر نکل گئی اور بھٹاچاریہ سے وہ ایسی یادگار دعوت لینے میں کامیاب ہوگئے کہ آج بھی جسے یاد کر کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ ہوا یوں کہ شوکت کو جعلی دستخط بنانے میں کمال حاصل تھا۔ ایک حکم نامہ تیار کر کے پروفیسر بخاری کے جعلی دستخطوں سے آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کو روانہ کر دیا گیا۔ اس میمورنڈم میں نلینی بھٹاچاریہ کی ترقی کے احکامات تھے۔ اب کیا تھا، مبارکبادیوں کے شور میں شام ہی کو دعوت اور دعوت خیام کے انتظامات مکمل ہوگئے۔ مرغ و ماہی اور رقص و سرود کے ساتھ کیف و سرور بھی ہو تو پھر کون نہ مر جائے اسے خدا۔ رات کے دو بجے یہ کارِ محفل ختم ہوئی۔ اگلے دن صبح

بھی سے سفر کی تیاریوں کی باتیں ہونے لگیں۔ دفتر کی طرف سے رخصتی پارٹی کے انتظامات کی بات نکلی تو شوکت کچھ کھوے کھوے سے ہال میں اِدھر اُدھر ٹہلتے کچھ کچھ بوکھلاتے ہوئے نظر آئے۔ دوپہر تک بالآخر بات پھوٹ کر رہی۔ معاملہ یکایک سنگین ہو گیا۔ تاسف کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ سب علیمی کی دلجوئی میں لگ گئے اور شوکت علیمی کے سامنے ہاتھ جوڑے معافی کے طلبگار بیٹھے نظر آئے۔

شوکت کے فن میں غیر متوازن اور بے ربط بھول بھلیوں اور انارپاخوں کی سی کیفیت کا جو احساس ہمیں ہوتا ہے اس کی تہہ کو ٹٹولئے تو اس کے ڈانڈے شوکت کی زندگی سے جا ملتے ہیں۔ زندگی کا ہر عمل انسانی مقاصد کے تابع ہے۔ مقصد جتنا بلند اور ارفع ہے زندگی اسی قدر نکھری ہوئی صاف اور ستھری ہوگی اور مقاصد میں جس قدر تضاد اور گنجلک تشکیک اور تذبذب ہے زندگی اسی قدر بے نظم اور الجھی ہوئی ہوگی۔ قدرت کی ستم ظریفی شوکت کے ساتھ یہ تھی کہ ان کی گھریلو زندگی ان کی باہری تیز رو بے ضبط و بے ربط زندگی سے میل نہ کھاتی تھی۔ ان کی اہلیہ محترمہ پرانی وضع کی سیدھی سادی مومن مسلمان تھیں۔ شوکت جس قدر بولنے والے فقرہ باز چست و چرب زبان تھے سعیدہ بھابی اسی قدر خاموش طبع اور غم کھانے والی بی بی تھیں۔ ریڈیو کی نوکری کے زمانے میں وہ ان کو پردے سے باہر بھی کھینچ لاتے تھے۔ شوکت کے ساتھ اگر کسی نے سعیدہ بھابی کو دیکھا ہے تو یہ بات محسوس کیا ہے کہ دونوں انمل بے جوڑ ہیں۔ نیچی نگاہ، جھکی جھکی شرمائی اور لجائی وہ آکر کونے میں بیٹھ جائے گی اور شوکت ہیں کہ اپنی طلاقتِ لسانی کے جوہر دکھا رہے ہیں اور لفاظی کے موتی لٹا رہے ہیں۔ گھر کی زندگی اس تضاد سے وہ کچھ کبیدہ خاطر بھی تھے اور دل کی بھڑاس نکالنے کی خاطر وہ حسن پرستی کی طرف کچھ زیادہ ہی مائل تھے اور اکثر ان مصائب و آلام کا شکار بھی رہے ہیں جو اس منزل کے نبرد آزماؤں کا شیوہ ہے۔ عشق، محبوب اور رقیب ان کی شاعری کے محض کردار ہی نہیں تھے۔ ان کی زندگی کے وہ جیتے جاگتے عوامل بھی تھے۔ ایک مرتبہ بڑے دلآویز انداز میں کہنے لگے، بھائی! ہم تو اب جاتے ہیں آل انڈیا ریڈیو میں۔ کیوں خیریت، کیا ہوا آپ کی نوکری کو؟ میں نے ٹٹولتے ہوئے کہا۔ ایک رقیب جو گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا آج صبح سے میری نوکری کے پیچھے پڑ چکا ہے۔ اتفاق سے وہ رقیب مجھ سے کچھ پردہ نہ رکھتے تھے اور رات کی بے لطف صحبت کی روئیداد وہ مجھے شوکت سے پہلے سنا چکے تھے۔ میں نے مزا لے کر کہا تم دونوں بدھو ہو۔ یہ منزل بڑی صبر آزما ہے۔ یہاں بڑے بڑوں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ بچا غالب جیسے جہاندیدہ بھی نہ سمجھ پائے تھے کہ غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے۔ میں نے موقع پا کر ان کے ایک منظوم فیچر رقاصہ پر چھینٹا دیا۔ جو کچھ ہی دن پیشتر نشر ہو چکا تھا۔ طوائفوں کی زندگی پر فیچر لکھنا آسان ہے شوکت۔ ان کی نفسیات کو سمجھنا دشوار ہے۔ یہ کام تو صرف ان سوختہ سامانوں کو زیب دیتا ہے جو اس منزل کی گرد راہ بن چکے ہیں۔ شوکت میں تنقید کی برداشت بالکل نہیں تھی وہ رات کی بے لطف صحبت کو بھول کر رقاصہ کی نشری حیثیت پر مجھ سے الجھ پڑے۔ شوکت نے اپنے مذاق سے ہٹ کر اس فیچر کے لئے سنجیدہ اسلوب اختیار کیا تھا۔ معاشرہ میں طوائف کی زندگی اور اس کی بے بسی اور مجبوری کے حزنیہ عناصر کو اکٹھا کر کے انھوں نے ایک طرح کی روایتی کہانی تو تیار کر لی تھی لیکن منظوم فیچر میں وہ ڈرامائی عناصر کو اجاگر کرنے میں بری طرح ناکام رہے تھے۔ رقاصہ کا پورا ڈھانچہ بیانیہ تھا۔ مثنوی کی وجہ سے کہانی کے تسلسل کو تو وہ قائم رکھ سکے لیکن پلاٹ کے ضروری اجزا شعری ضرورتوں میں گم ہو کر رہ گئے۔ نظم میں مکالموں کی مشکلات سے بھی وہ نبرد آزما نہ ہو سکے۔ رقاصہ ایک ناکام فیچر ہو جانے کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ پہ ہے کہ آل انڈیا ریڈیو میں منظوم ڈرامہ کی ابتدا کا سہرا شوکت ہی کے سر ہے۔ اور رقاصہ آل انڈیا ریڈیو کا سب سے پہلا اردو منظوم فیچر ہے۔

شاعری کے ناطے وہ عرصہ تک سنجیدہ شعر کہتے رہے۔ غزل اچھی خاصی کہہ لیتے تھے۔ ان کی بعض غزلیں اس دور کے بہترین فنکاروں کی آوازوں میں ریڈیو کے ذریعہ اور ریڈیو سے باہر بھی عوام تک پہونچ چکی تھیں۔ فیض آباد کی اختری بائی، الہ آباد کی مناد اور مظفر پور کی پیارا بائی نے ان کے کلام کو خوب خوب گایا۔ ادھر لکھنؤ ریڈیو مشاعروں کے لئے بھی اپنا ایک خاص مقام حاصل کر چکا تھا۔ ان مشاعروں کی بدولت ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں بڑے شعرا سے شوکت کا راست رابطہ قائم تھا لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود شاعر کی حیثیت سے میں سمجھتا ہوں کہ ان کی سعی لاحاصل ہی رہی۔ تقسیم ہند تک وہ نثر میں مزاح اور نظم میں سنجیدگی کی دو عملی میں مبتلا رہے۔ پاکستان پہونچ کر البتہ انھوں نے اپنی شعری کاوشوں کا حقیقت پسندی کے ساتھ جائزہ لیا ہوگا اور انھیں یہ احساس ہوا ہوگا کہ ان کے لئے اپنے اسلوب خاص کی شاعری کرنا ہی زیادہ مناسب تھا۔ چنانچہ دو چار نظموں کے بعد ہی وہ اپنے ہم عصر مزاحیہ شعرا سے آگے دوڑتے نظر آتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں شوکت اگر قیام لکھنؤ میں نثر کے ساتھ نظم میں بھی

مزاح کے تجربے کرتے رہتے تو اردو ادب کو شوکت کی سنجیدہ شاعری سے کہیں افضل تر مزاحیہ شاعر نصیب ہو جاتا۔ اور میں تو اس کا امکان سمجھتا ہوں کہ وہ اس خلا کو بھی پر کرنے میں کامیاب ہو جاتے جو اکبر الہ آبادی کے بعد سے اردو شاعری میں ابھی تک موجود ہے۔

نثر نگاری میں وہ ریڈیو کی ملازمت سے پہلے مقبولیت کے بہت ابتدائی منازل میں تھے "سودیشی ریل" کے مصنف پر کسی نے قرار واقعی توجہ نہیں کی تھی۔ مشکل یہ آن پڑی تھی کہ ۱۹۳۵ء کے قانون آزادی نے ہندوستان میں سماجی اور سیاسی انقلاب کو یکایک اور محسوس شکل میں سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ شوکت اب مکمل کر نہ حزب مخالف میں خود کو شمار کرا سکتے تھے اور نہ ہی سودیشی ریل کے متبادل کسی نئے رجحان پر وہ توجہ کر سکتے تھے کہ وہ حکومت کے طرفداروں میں گنے جاتے۔ سنہ ۴۲ء تک وہ بڑی خوبی سے اس عبوری دور سے گزر گئے۔ دراصل وہ کوئی سیاسی آدمی بھی نہ تھے۔ سودیشی ریل کا محرک بھی ان کا کوئی سیاسی جذبہ نہیں تھا۔ وہ طبعاً ہنسوڑ تھے۔ اور زندگی کو وہ ایک قہقہہ سے زیادہ اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ریڈیو میں ان کی کامیابی بھی دراصل ان کی غیر طرفدار حیثیت تھی جو انگریز کی حکومت کے زیر سایہ انھیں حاصل ہو گئی تھی۔ اب وہ اطمینان سے اپنے اسلوب کو ترقی دینے اور اپنی ذات کے لئے مقام پیدا کرنے میں لگ گئے۔ لکھنؤ ریڈیو کے لئے شوکت نے انبار کے انبار لکھ ڈالے ہیں۔ ان میں زیادہ تر مزاحیہ قسم کے دار فیچر، نظمیں، تقریریں اور مختصر ڈرامے ہیں۔ اردو ادب کے تعلق سے ان مسودات کی اب کوئی حیثیت بھی نہیں ہے اور شوکت کے اسلوب سے تواتر کا دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ وہ ایک کہنہ مشق زود نویس تھے۔ جو کچھ ان سے کہا گیا وہ بے تکلف گڑھ کر کاغذ پر جما دیتے تھے۔ پھر ان مسودات کے لئے ان پر کوئی نگران بھی نہیں تھا۔ انھیں کسی کی تنقید یا تضحیک کا کبھی کوئی خوف نہیں رہا۔ وہ اپنے کام میں مختار کل تھے۔ جو چاہتے لکھتے جیسے چاہتے لکھتے اور نشر کرتے رہتے۔ اس دور کی یادگار تخلیق دو چار اچھوتے مضامین کے علاوہ صرف منشی جی ہے۔ رتن ناتھ سرشار کے میاں خوجی کی بنیاد پر ایک کردار کا تصور ریڈیو کے لئے بالکل نیا تھا مسئلہ یہ تھا کہ کتابی کردار کے خد و خال کو کس طرح آوازوں میں ڈھالا جائے رونق علی مرحوم کی آواز نے اس مشکل کو آسان کر دیا۔ منشی جی کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے آج بھی یہ بات وثوق کے ساتھ کہنا مشکل ہے کہ منشی جی شوکت کے قلم کا شاہکار تھے یا رونق کی آواز کا اعجاز۔ بہرحال آواز اور مواد کا ایسا حسین امتزاج ریڈیو کو اس سے پہلے کبھی نصیب نہ ہوا تھا۔

شوکت، بچوں کے پروگرام کے بھی روح رواں تھے۔ ملک حبیب احمد بچوں کے ماموں جان، اور شوکت ان کے سامنے نرے بدھو بن کر آتے تھے۔ اس پروگرام میں اپنے لطیفوں اور چٹکلوں کی پھلجھڑیاں چھوڑنے کا انھیں بہترین موقع ملتا رہا۔ لکھنؤ کے بچوں کا یہ پروگرام ان کی ایسی تجربہ گاہ تھی جس میں انھیں اپنی اور دوسروں کی آوازوں کے صوتی اثرات کا علم ہوا۔ اور مزاح کی بے پناہ گنجائشوں کا اعتماد بھی انھیں اسی تجربہ گاہ سے حاصل ہوا۔ شوکت کے مزاح میں سادگی کے ساتھ جس بے ساختگی سے ہم لطف اندوز ہوتے ہیں وہ اسی تجربہ گاہ کی دین ہے۔ اپنے فن میں زندگی بھر وہ بچوں کے دماغ سے سوچتے اور بدھو میاں کا کردار ادا کرتے رہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب وہ بچوں کی بجائے جوانوں کو گدگداتے اور بوڑھوں کو ہنساتے تھے۔ پاکستان میں قاضی جی کی تخلیق میرے اس مفروضہ کی کھلی دلیل ہے۔

ریڈیو کے کردار (Stock Characters) کا اطلاق ان جانی پہچانی آوازوں پر ہوتا ہے جو تسلسل کے ساتھ سنی جاتی ہیں اور اگر سننے والوں کی یہ پسندیدہ آوازیں کسی وجہ سے پروگرام میں شامل نہ رہی ہوں تو سننے والوں کو ناگوارگی کا احساس ہوتا ہے۔ سننے اور سنانے والوں کے درمیان ریڈیو کے یہ کردار ایسا ربط قائم کر لیتے ہیں کہ کمرہ میں رکھا ہوا لکڑی کا ایک بے جان ڈبہ کچھ دیر کے لئے زندہ حقیقت کا مالک بن جاتا ہے اور اس طرح یہ کردار گھروں اور خاندانوں کی مسکراہٹوں اور قہقہوں میں برابر کے شریک رہتے ہیں۔ شوکت کو ریڈیو کردار بننے کے جو مواقع لکھنؤ میں ملے اور ان سے جو تجربات انھوں نے حاصل کئے ان تجربات ہی کی بنیاد پر انھوں نے پاکستان میں قاضی جی کی تخلیق کی۔ اور اس کردار کو کامیاب کر کے انھوں نے خود ریڈیو کردار کی حیثیت کو بہت بلند کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا کے براڈکاسٹنگ سسٹم میں شاید ہی کسی کردار کو وہ مقبولیت حاصل ہوئی ہو جو ریڈیو پاکستان لاہور کے قاضی جی کو اس ملک میں کچھ دنوں کے لئے حاصل ہو گئی تھی لیکن قاضی جی کے اجزائے ترکیبی پر غور کیجئے تو وہی منشی جی کا نقش ثانی ہے جسے لاہور میں بڑے اہتمام سے تیار کیا گیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس دفعہ قلم کے ساتھ آواز بھی شوکت کی تھی اور یہ وہی آواز تھی جس کی صلاحیتوں کا بھرپور تجربہ وہ لکھنؤ میں بچوں کے پروگرام میں کر چکے تھے۔

سنہ ۱۹۴۲ء میں لکھنؤ سے بدل کر میں بمبئی پہنچا۔ حبیب احمد پہلے ہی لاہور جا چکے تھے۔ انصار دہلی اور ملک صاحب پشاور سدھار گئے۔ اور اس طرح لکھنؤ کی یہ کارگزار ٹیم ٹکڑے ٹکڑے کر کے سارے ہندوستان میں بکھیر دی گئی۔ شوکت اب نئے ماحول میں کچھ بد دل بھی ہو گئے تھے۔ منشی جی جیسے کسی دوسرے

کردار کی تخلیق کی طرف وہ مائل ہی نہ تھے اور نہ اب اس کی گنجائش ہی باقی رہی تھی۔ پروگرام کے صاحب اختیار لوگوں میں اب کرشن چندر، اشک، عادل، مہندر اور حفیظ جاوید جیسے فنی قسم کے لوگ لکھنؤ پہنچ گئے تھے۔ ان لوگوں نے شاید اس اسٹیشن کے پروگراموں کو مؤثر تو زیادہ بنایا لیکن اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت میں وہ شوکت کی ذات کو کماحقہ متعین نہیں کر سکے۔

ادھر پچھلی جنگ نے اتحادیوں کے خلاف زور پکڑا تو پبلسٹی کے ساتھ فوجی بھرتی کی ضرورت پر زور دیا جانے لگا۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے ابوالاثر حفیظ جالندھری کی نگرانی میں Song Publicity کا ایک نیا محکمہ شروع کیا جس کی شاخیں پورے ہندوستان میں کھول دی گئیں۔ اس محکمہ کا مقصد فوجی بھرتی کو تیز کرنا تھا۔ لکھنؤ میں یہ جگہ شوکت کو دی گئی۔ اور وہ مقامی Song Publicity کے ناظم مقرر ہو گئے۔

شوکت کی زندگی کے اس نئے موڑ نے ترغیبات میں اضافہ کے ساتھ ان تحریکات کو بھی ابھارا جو ریڈیو کی ملازمت کے زمانے میں ان کے قلب ہی میں مچل مچل کر رہ گئی تھیں۔ ابھی تک وہ چار خود محض تھے اور بنئے بکتے جانے کے قائل۔ ان کی نفیس پسند طبیعت چوک کے گرد چکر لگانے ہنسنے اور بولنے تک محدود تھی لیکن اب وہ گو سنجیدگی کے ساتھ نشاط کے بھی قائل نظر آتے ہیں۔ بزرگوں کا قول ہے کہ دولت کی طرح وجاہت بھی ہر شخص کو راس نہیں آتی۔ یہ وہ آد ہوس ہے جو انسان کے ایمان تک کو متزلزل کر دیتا ہے۔ آج کے اس غیر مذہبی سماج میں اور اس سماج کے اس لامذہب ادب میں ایمان کی بات نہ بھی چھیڑیے تو انفرادی اخلاق و عادات اور اعمال کے تعلق سے بھی اس خطرہ کا امکان قوی ہے کہ مبادا شوکت کی یہ نئی زندگی اُن کے فن پر بھی اثر انداز ہوئی ہو۔ بات وہی غم دوراں کی ہے جسے پھیلا کر کہیے تو دبی دبائی طبعی اور شکم پروری دولت کی نہ مٹنے والی بھوک اور وجاہت و غلبہ کی نہ بجھنے والی پیاس نے فنکار کے فکر و نظر کو گھیرے میں لے لیا اور پیٹ اور جیب کی ذہنیت نے اس کی دروں بینی کو دبا لیا۔ فطرت نے جس فیاضی سے ذہانت و ذکاوت کے ساتھ اظہار کی بے پناہ قوت شوکت کو عطا کی تھی افسوس وہ اوپر نہ اٹھ سکی۔ بعالم خیال میں اس خوش فکر مصنف نے چاہے کچھ بھی لکھا ہو عملی زندگی میں ان کے وہ تجربے جو ایک آرٹسٹ کے ناطے اپنے فن میں سمو کر وہ ہمیں لوٹا گئے ہیں، ادھورے ادھورے، اچٹتے ہوئے، نارسا اور نیم رس محسوس ہوتے ہیں۔

اتنی سی بات کہہ کر میں نے شاید شوکت کے ناخوانوں کو خود اس مضمون پر جھپٹ پڑنے کی دعوت دے رہی ہے۔ لیکن میں یہ بات ایک بار پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ شوکت کا خون پاک و صاف تھا۔ وہ ایک دیندار خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کی زندگی شرافت و ایمانداری اور مذہب و دینداری کی وراثت کا نمونہ بن سکتی تھی۔ لیکن برا ہوا ماحول کا ایک طرف جس نے شوکت کی ذہانت کو علم کی راہبری سے محروم رکھا اور دوسری طرف اسی نئی زندگی کی بے سمجھی بے بوجھی تحریکات میں بکھر کر بکھیر دیا فنکار کو اس کے ماحول میں مطالعہ کرنے کے جس زاویہ سے میں نے شوکت کی زندگی کو دیکھا ہے اس میں زندگی کا تضاد ضرورت سے کچھ زیادہ نمایاں ہے لیکن یہی آج کی عام زندگی کا المیہ بھی ہے۔ یہ شوکت کی زندگی کے لئے کچھ مخصوص نہیں۔ وہ تو ایک مثال ہے جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ زندگی کا عام ڈھانچہ ہی ایسا ہے۔ زندگی کی وسعتوں کے باوجود اور اس کی بے شمار رنگتوں کے باوصف ہمارے فنکار کے خارجی تجربات کا میدان سمٹا ہوا اور تنگ ہے۔ اس کی نظر ٹھٹھری ہوئی اور فکر سست گام ہے۔ ایسے میں پرواز کی کوتاہی کا ذکر ہی کیوں کیجے اور تخیل کی پستیوں کی بات ہی کیوں چھیڑیے۔ اکبر الہ آبادی اور پروفیسر رشید احمد صدیقی جیسے دو ایک فنکاروں کو چھوڑ کر طنز و مزاح میں طائر اکثر زیر دام ہی رہا۔ طائر بام ان میں سے مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ دراصل ہمارا اس صنف لطیف میں فکری گمراہی کی اپنے لئے نہ صرف چھوٹ سمجھتا ہے بلکہ ہر چراگاہ میں منہ مارنے اور ہر وادی میں بھٹکنے کا وہ خود کو مجاز بھی گردانتا ہے۔ زندگی کو کٹ پتلیوں کا تماشا سمجھ کر وہ اکبر کا دربار تو سجا دیتا ہے لیکن ہوا میں کچھ دیر اچھل کود کر کاٹھ کی بے جان گڑیوں کا ڈھیر لگا کر وہ اس دنیا سے چل دیتا ہے۔ ہمارے نقادوں نے اس کے فعل میں اس کے قول کی صداقت کو پھر کبھی پرکھا اور نہ اس کے عمل میں نیت کی جانچ کی اس نے کبھی ضرورت محسوس کی۔ اور اسی لئے اردو ادب میں طنز و مزاح کے اس بے شمار ذخیرہ پر جو ہمیں ورثہ میں ملا عام طور پر بے مقصدی کی چھاپ سی لگی ہوئی ہے اور ہمارے اکثر فنکار اسی لئے بے مقصدی کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے نظر آتے ہیں۔

شوکت سے آخری ملاقات دہلی میں لالہ سری رام کے مشاعرہ میں ہوئی۔ وہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پاکستان سے آئے تھے۔ مشاعرہ گرم تھا اور وہ خود بھی کچھ سرور میں تھے کہ انھوں نے قاضی جی کے پروگرام کی بات چھیڑ دی اور کہنے لگے "بھائی! قاضی جی کے متعلق تیری خاموشی ناقابل معافی جرم ہے۔" میں نے کہا ایک ہندوستانی کے ناطے میری وہی رائے ہے جو ہندوستان میں قاضی جی کے متعلق عام ہے۔ مشہور رہے کہ وہ ہندوستان مخالف اور دل آزار

کردار ہے۔ وہ تڑپ کر بولے۔ مجھ سے ہر ہندوستانی نے یہی کہا ہے اور ایک پاکستانی کی حیثیت سے میرے لئے اس ماننے کی کوئی اہمیت نہیں ہے لیکن ہم اور تم دو الگ الگ ملکوں کے شہری ہوتے ہوئے بھی پیشہ کے اعتبار سے ایک ہیں۔ آخر قاضی جی کی نشری حیثیت بھی تو ہے۔ تم سے میں اپنے اس کردار کی داد چاہتا تھا جسے پنجاب کی سنگلاخ زمین میں جاکر خونِ جگر سے جس کی آبیاری کر کے میں نے پروان چڑھایا ہے۔ شوکت سرور کی اس منزل میں تھے جب بات کی تکرار میں انسان کو لطف مزید آتا ہے اور کیف کے اس عالم میں نشے جب کرم بھی مائل ستم بن جاتا ہے۔ کہنے لگے بھائی! تیری طرف سے کوئی شافی جواب نہ ملنے کا افسوس ہے مشاعرہ گرم تھا۔ داد کا طوفان اٹھ رہا تھا اور بلند سے بلند تر ہو رہا تھا۔ لیکن شوکت اپنی ترنگ میں اصرار کئے جا رہے تھے کہ میں ان کے قاضی جی کے متعلق کوئی ان کی پسندیدہ بات کہہ دوں۔ ٹالنے کی غرض سے میں نے شوکت کی توجہ مشاعرہ کی طرف مبذول کرنی چاہی تو وہ اس کی تاب نہ لا سکے۔ یکایک کھڑے ہو گئے اور کچھ بلند آواز میں کہنے لگے "معلوم ہو گیا تو کوئی جواب دینا ہی نہیں چاہتا لیکن فوراً ہی پھر سنبھل کر وہ اپنی جگہ بیٹھ گئے اور نرم پڑتے ہوئے دھیمی آواز میں کہنے لگے گر میری بات تو سن لے۔ قاضی جی کے کردار میں ہندوستان دشمنی سے زیادہ ہندوستان دوستی ملحوظ ہے۔ شوکت کی سنجیدگی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے لیکن ڈرتے ڈرتے میں نے کہا۔ اس ملحوظ کا جواب نہیں شوکت" قاضی جی کا بھی کہاں جواب ہے۔ شوکت نے اب گفتگو کے تسلسل کو ٹوٹنے نہیں دیا۔ آخر مجھے کہنے نے کاٹا تھا کہ ستر برس کے ایک بڑھے کھوسٹ کو لکھنؤ کے محلہ گولہ گنج سے کھینچتا ہوا میں لاہور لے آیا۔ اگر تم نے پروگرام سنا ہے تو یہ بھی سنا ہوگا کہ جس سماج کے نمائندے قاضی جی ہیں۔ اس کی تہذیب، زبان اور مذہب کو میں نے بڑی اہمیت دی ہے۔ اس کردار میں پاکستان کو میں نے یہ بھی بتایا کہ ہند و پاکستان کی تقسیم جغرافیائی ہے اور تہذیب کے وہ عناصر جن سے پاکستان خود کو ایک قوم کہتا رہا ہے وہ صرف قاضی جی کے پاس ہیں اور کسی کے پاس ان میں سے کچھ نہیں۔ زبان نہیں، کلچر نہ مذہب نہیں ... اور ایک سانس میں جانے کیا کیا کچھ کہہ گئے۔ میں صرف ..... سے ان کی مسلسل اور تند و تیز گفتگو کو ختم کر رہا ہوں۔

میں حیران رہ گیا۔ جس انداز سے شوکت اپنی عظیم تخلیق پر روشنی ڈال رہے تھے وہ سو فیصدی صحیح نہ بھی ہو مگر قاضی جی کے کردار کو سمجھنے کے لئے ان کی یہ توجیہہ ہند و پاکستان کے لئے یکساں قابلِ غور ضرور ہے

میں سوچتا ہوں کہ شوکت اگر قاضی جی کے کردار کو پاکستان کی وقتی سیاسیات میں نہ الجھاتے تو اس کردار کی افادیت خود پاکستان کے لئے زیادہ موثر ثابت ہوتی اور یہ کردار پنڈت رتن ناتھ سرشار کے خوجی سے زیادہ جاندار اردو ادب میں قائم و دائم رہتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

روح الامین ادیب

(ہم عصر حسرت موہانی)

سید مرتضیٰ حسین بلگرامی

اردو زبان اپنی اصل اور نسل سے کس زبان سے رشتہ رکھتی ہے؟ اس پر اب بحث کی ضرورت نہ صراحت کی۔ نیز یہ کہ موجودہ منتظمین جن بنیادوں کو اس سے رشتہ توڑنا چاہتا ہے اس پر نہ ماتم کی ضرورت ہے نہ آہ و فغاں کی۔ بلکہ صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ اردو کی بڑھتی ہوئی اور پھیلتی ہوئی جڑوں کی دیکھ بھال کی جائے، اور اس کی نشو و نما میں جن لوگوں نے حصہ لیا ہے ان کے کارناموں کو باقی رکھا جائے اسی طرح ہم اردو کو زندہ رکھ سکیں گے [illegible] زیادہ موثر طریقہ سے خدمت کر سکیں گے۔ یہ وقت اب محض عملی کام کا ہے۔ ردو قدح کا نہیں۔ اور اردو کا علمی کام کرنے والے اداروں میں جامعہ اردو علی گڑھ کا نام اس وقت سرِفہرست لیا جا سکتا ہے اس ادارے کی بدولت ہند و بیرون ہند میں، اردو کا کام جس تندہی، لگن، ذوق و شوق اور خاموشی سے ہو رہا ہے، اس کی دوسری مثال نہیں مل سکتی۔ تقریباً سات آٹھ ہزار طلبہ و طالبات کا کسی اردو کے امتحان میں شرکت کرنا اور انگریزی و ہندی کے امتحانات میں پاس کرنے کے بعد خود کفیل بننا۔ کوئی کارنامہ نہیں؟ ایسی ہی لگن اردو کے ہر درد مند دل میں پیدا ہونی چاہیے۔

سال گذشتہ جامعہ اردو علی گڑھ کے امتحانات کے سلسلے میں مجھے یوپی کے ایک مشہور قصبہ کوڑا جہاں آباد (ضلع فتح پور) میں قیام کرنا پڑا۔ وہاں کے لوگوں سے مل کر ان کی مہمان نوازی اور خوش اخلاقی دیکھ کر بہت مسرت ہوئی، اور خدا کا شکر ادا کیا کہ ابھی ہماری قصباتی زندگی میں فیشن پرستی اور بے راہ روی کے جراثیم داخل نہیں ہوئے ہیں، جس نے مشرقی آداب لحاظ کو مجروح کر رکھا ہے۔ یہاں بڑے بڑے قلعہ نما مکانات مٹی کا ڈھیر ہو کر رہ گئے ہیں۔ فلک شگاف محلات اب [illegible] گیا۔ دو ایک گھر جو باقی ہیں وہ بھی آثار قدیمہ میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔ کوڑا جہاں آباد کے اردگرد [illegible] الم ہے۔ میرا قیام جس مکان میں تھا اس سے چند گز کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی تین در کی مسجد بنی ہوئی ہے جو [illegible] زمانہ اور اہل خاندان کی عنایت سے محفوظ ہے اور اچھی حالت میں ہے۔ اس پر جو کتبہ نصب ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد ۹۶۸ھ میں سلطان شرقی کی امداد سے پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی۔ اب اسے میاں والی مسجد کہتے ہیں۔ اس مسجد کی اردگرد کی تمام عمارت ملبے کا ڈھیر بن چکی ہے۔ پورا محلہ (سادات) حنفی کا تھا اب دو ایک گھر رہ گئے ہیں۔ اور ان ہی کے دم سے شرافت و نجابت کا نام باقی ہے۔

کوڑا جہاں آباد کے ایک سمت بارہ دری اور امام باڑہ ہے، دوسری سمت بجلی خاں کا قلعہ ہے۔ جس کی بابت مشہور ہے کہ اجرا سنگھ کے بھائی بجئی سنگھ نے مخدوم حضرت سالار قطب الدین کے ہاتھ پر بیعت کی، اور مشرف بہ اسلام ہوا۔ جس کا نام بجئی سنگھ کے بجائے بجلی خان رکھا گیا۔ یہ خاندان گوتمانہ سے تعلق رکھتا تھا۔ حسرت موہانی مرحوم کی ماں، اسی نو مسلم خاندان کی تھیں۔ اگرچہ ان کے والد موہان ضلع اناؤ (کان پور اور لکھنؤ کے درمیان سادات کا مشہور قصبہ) کے سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر سماعت ہے کہ قلعہ والوں سے اور ان کے اہل خاندان کے بڑے عمدہ مراسم تھے، اسی بنا پر یہ رشتہ ہوا تھا، ویسے ممکن ہے زر کثیر بھی ہاتھ آیا ہو۔ حسرت موہانی کے ایک بھائی مبین الحسن صاحب فتح پور ضلع کے ہی ایک قصبہ بندکی میں قیام پذیر ہیں۔ جن کی عمر ۶۰ سال کے لگ بھگ ہے۔ افسوس کہ میں ان کی زیارت نہ کر سکا۔ اگرچہ حسرت موہانی مرحوم سے علی گڑھ اور دہلی میں کئی بار مل چکا ہوں۔ ان کی سادگی، وضعداری اور شرافت و نیک نفسی کے گہرے نقوش باقی ہیں۔ اسی طرح حسرت کی شاعری سے ہر اردو دوست

آگاہ ہے۔ شرافت نفس، تہذیبی اور مشرقی ادب کا جس حد تک پاس ان کی شاعری میں کیا گیا ہے، وہ حسرت کا حصہ ہے۔

حسرت ہی کے ایک دوست میاں روح الامین عرف چھن میاں تھے۔ جن کا تخلص ادیب تھا۔ آپ کے اعزا سے جو معلومات فراہم کر سکا ہوں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حسرت جتنے دن اپنی ماں کے وطن (کرہان) ہوتے، ان کا واسطہ اس خاندان کے افراد سے رہتا اور شب و روز کے بیشتر اوقات یہیں بسر کرتے۔ ان کی صحبت اور علمیت سے قصبہ کے اہل ذوق مستفید ہوتے، شعر و سخن کے جلسے ہوتے، معرکہ آرائیاں ہوتیں، مذاکرے ہوتے، سیر و تفریح ہوتی۔ لیکن حسرت کو سب سے زیادہ شغف روح الامین صاحب سے تھا۔ جو ان کے ہم عصر، ہم مذاق، مسلم یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ اور اس کی روایتی زندگی کے دلدادہ تھے، نیز اپنے قصبے میں اچھی سوجھ بوجھ اور بہتر صلاحیت کے مالک سمجھے جاتے تھے۔ شعر و شاعری کا ذوق بچپن سے تھا، قدرت نے غزل کی ماورائی کیفیات بڑی فیاضی سے عطا کی تھیں۔

میرے پیش نظر موصوف کا جو قلمی نسخہ ہے، اس سے کلام کی خوبی، سادگی، صفائی اور ذہن کی زیرکی کا خاصہ اندازہ ہوتا ہے۔ اس پر لطف یہ کہ وہ کسی کے شاگرد نہ تھے۔ کم از کم ان کے کلام کے قلمی نسخے (جو موصوف کے دست و قلم کا ہے) اور ان کے اہل خاندان کے بیان کے مطابق، اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ کیونکہ انہوں نے ہمیشہ کلام پر جو حک و اصلاح ہے وہ خود شاعر کے دست و قلم کی مرہون ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ادیب اس وقت اپنے کلام کی شاعری پر نظر ثانی صورت کر لیتے تھے، ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صفائی کلام کا خاص خیال رکھتے تھے اور بے ہودہ یا لغو خیالات پر طبع آزمائی نہیں کرتے تھے۔ صوفیانہ مضامین اور پامال خیالات پر توجہ نہیں دی ہے، مگر صوفیانہ اور عشق الٰہی کے مضامین خاصی تعداد میں نظم کیے ہیں۔ ایک دو مثالیں ملاحظہ ہوں:-

میں وہ لذت کش جام مئے وحدت ہوں ادیب
لاکھ ساماں ہے مجھے، بے سر و ساماں ہونا

ایک غزل کا مطلع اور مقطع پڑھیے:-

دل بھی مثال آئینہ صورت نما ہوا
اس کو جو ربط صحبت اہل صفا ہوا

مجھ کو حیات تازہ شہادت ہوئی ادیب
مقطع:- اک آب زندگی مجھے جام فنا ہوا

لیکن ان کا سارا ذہنی شعور غزل اور اس کی رمزیت میں رچا ہوا ہے۔ ایسے ایسے تیکھے اور اچھوتے مضامین پر طبع آزمائی کی ہے کہ حیرت ہوتی ہے، نازکی اور ندرت خیال بھی ہے، پاس لحاظ اور رعب حسن کا دامن کبھی ہاتھوں سے نہیں چھوڑا ہے۔ لطف اور کیف غزل میں اضافہ کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھا ہے مگر غزل کی جان ـــ رمزیت کو مجروح نہیں ہونے دیا ہے۔ اس باب میں انھوں نے حسرت کی ہمنوائی کی ہے۔ اور یہی وصف ان کے کلام کا بہترین حسن ہے۔ حسن کلام اور شوخی و دلربائی کے اکثر جرعے ایسے دل آویز انداز میں یکجا کیے ہیں کہ تعجب ہوتا ہے اور بسا اوقات داغ کی غزلیت کی لطف اور حسرت کی شاعری کی چاشنی کا دھوکہ ہونے لگتا ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو:-

یاد گیسو میں رکھا گیا ہے پریشاں ہونا
آئے دن سر پہ بلائے شب ہجراں ہونا

اور پھر یہ بھی ـــــ

خلش پائے جنوں نے مرے توڑے بازو
لیا آغوش میں اے وادی پُرخار تجھے

توبہ کی ضد نہ چھوٹیں گے کبھی گیسو ان کے

بت خوگر نے کیا ہائے گنہگار مجھے

اس غزل کا مقطع ہے جو قیامت سے کم نہیں :-

کس کشمکش پہ گری آہ یہ تجلی کہ ادیب
سانس لینا بھی نفس میں ہوا دشوار مجھے

شوخ اور والہانہ انداز فکر کی مثال دیکھیے :-

تمہارے رو برو لوٹا تمہارے ہاتھ سے ٹوٹا
زباں کا لوٹ شیشہ کا بننا کی شکست شیشۂ دل کی

ایک شعر اور ہے :-

روپوش ہو کے رہ نہ سکے وہ حجاب میں
ڈالے نگاہ شوق نے رخنے حجاب میں

گریباں کی میرے تجھے دھجیاں
اڑانا نہ باد صبا چاہیے

مندرجہ بالا سطور میں تذکرہ کیا گیا ہے کہ قصبہ کوڑا جہان آباد کی ایک سمت بارہ دری، دو امام باڑہ بھی ہے۔ یہ دونوں عمارتیں شاہان اودھ سے متعلق تھیں اور میاں الماس خواجہ سرا کے انتظام و انصرام میں تھیں۔ میاں الماس جب قصبے میں آئے تو ان کے ہمراہ بنا طوائف بھی آئی مگر اس طائفہ کا دراصل تعلق ایک کائستھ خاندان سے تھا جو بعد میں مسلمان ہو گیا اور حیدر بخش نام پایا۔ اس کی اولادیں فدا حسین وغیرہ ہوئے، لیکن یہ سب ابھی نابالغ ہی تھے کہ حیدر بخش کو فالج کا عارضہ ہو گیا اور اسی حالت میں اس کی وفات ہو گئی۔ اس کی موت کے بعد بھائیوں (جو اپنے مذہب پر قائم تھے) نے دولت پر قبضہ کر لیا اور کل املاک کے مالک بن گئے۔ اور اس طرح حیدر بخش کی اولاد محروم الارث ہو گئی۔ اور ساری جائداد غیر مسلموں کے قبضے میں چلی گئی جس کے مالیہ وارث رئے بہادر ادھبیہ سرن سنگھ ہیں۔ بارہ دری اور اس سے ملحقہ باغات جس کی مالیت اور رقبہ خاصا ہے، اب بھی ان ہی کے قبضے میں ہے۔ مگر آزادی ہند سے کچھ ہی دن قبل امام باڑہ اور امام باغ واگذار ہو چکے ہیں اور شیعہ وقف کے ماتحت ہیں۔ ہر سال محرم الحرام میں باقاعدہ مجالس ہوتی ہیں۔ قصبے کے معتمد حضرات کا کہنا ہے کہ اب سے کچھ پہلے تک امام باڑہ اگرچہ اہل ہنود کے اختیار میں تھا مگر مجالس اور احترام امام باڑہ کا یہ لوگ بے حد خیال رکھتے تھے۔ مجالس میں باقاعدہ پابرہنہ و سر برہنہ حاضر ہوتے۔ نذر نیاز کرتے۔ لنگر تقسیم ہوتا اور غربا و مساکین کو امام باغ کی آمدنی سے مالی اعانت کی جاتی، لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا، حالات بدلتے گئے اور قصبے کے لوگوں نے احترام امام باڑہ کی خاطر نئے انتظام کو ضروری سمجھا اور اس سلسلے میں سعی بلیغ و زر کثیر صرف کر کے واگذاری کے احکامات حاصل کیے۔ اس تفصیل سے قطع نظر یہ بات خاص اہمیت رکھتی ہے کہ قصبہ میں اہل شیعہ سنی کے برابر ہیں۔ لیکن عزاداری اور مجالس امام حسین علیہ السلام باقاعدہ برپا ہوتی ہیں۔ جس میں قریب و جوار کے لوگ شرکت کرتے ہیں۔ امام باڑہ (اس سے ملحقہ مسجد) جس کی حالت بے حد خستہ ہے اور شیعہ وقف بورڈ کی خاص توجہ کی مستحق بھی ہے، کشادہ اور خوبصورت بنا ہوا ہے۔ اس کے فن تعمیر میں اودھ کے مزاج اور حسن کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ نقار خانہ اور بالائی گیلری، لمبا چوڑا صحن اور دیدہ زیب نقش و نگار اب بھی اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ سماعت ہے کہ روح الامین صاحب کی اہل خاندان کی قدر و منزلت کا یہ حال تھا کہ جب تک یہ حضرات مجلس میں شرکت نہ کرتے، اس وقت تک مجلس رکی رہتی اور شروع نہ کی جاتی۔ افسوس کہ حضرت ادیب کی بیاض میں سلام و مراثی وغیرہ کا کلام نہیں ملا۔ ممکن ہے کوئی اور بیاض ہو جس میں ان کا مذہبی کلام محفوظ ہو۔ جناب صدیق حسن صاحب[1] کی زبانی معلوم ہوا کہ موصوف کا بیشتر

---

[1] جناب صدیق حسن صاحب رئیس قصبہ کوڑا جہاں آباد ضلع فتح پور

کلام ان کے دیگر اعزا کے پاس کراچی میں ہے :-

بہرحال یہاں راقم ان کی غزلیات میں سے چند غزلیں بطور نمونہ پیش کر کے رخصت چاہتا ہے :-

غزل ۔ ۱

ہیں وصل میں شوخی سے پابند حیا آنکھیں
اللہ رے ظالم کی مظلوم نما آنکھیں
آفت میں پھنسائیں گی، دیوانہ بنائیں گی
وہ غالیہ ساز زلفیں، وہ ہوش ربا آنکھیں
کیا جانیے کیا کرتا، کیا دیکھتا، کیا کہتا
زاہد کو بھی میری سی دیتا جو خدا آنکھیں
رحم اس کو نہ آیا تھا تو شرم ہی آ جاتی
بیداد کے شکوے پر جھکتی تو ذرا آنکھیں
کس شوق سے آیا ہوں میں محفل جاناں میں
اے رشک عدو دم بھر مجھ کو نہ دکھا آنکھیں
کیوں آنکھ چراتے ہو کیوں منہ کو چھپاتے ہو
دیکھو تو ہیں کب سے مشتاق سنا آنکھیں
تم جان کو لو بیٹھو یا آنکھوں کو رو بیٹھو
روح الامیں تم سے نہ ملائیں گے ذرا آنکھیں
(سات شعر)

غزل ۔ ۲

اپنے جلوے کو نہ اب پردے کے اندر دیکھیے
بجلیاں گرتی ہیں باہر آ کے باہر دیکھیے
آئینہ ہے دیدنی یہ بھی تماشا دیکھیے
دیکھیے حال دل بے تاب مضطر دیکھیے
اف رے خود بینی کہ [illegible] نہ دیکھا آئینہ
جب کہا میں نے کہ لیجے اپنا [illegible] دیکھیے
دیجیے الزام مجھ کو بے حجابی کا مگر
اپنی چشمک، اپنی چتون، اپنے تیور دیکھیے
رہ نہ جائے دل میں شوق خون ناحق ٹھہریے
گر نہ جائے ہاتھ سے غصے میں خنجر دیکھیے
پھر دل گم گشتہ یاد آیا مجھے یاد ش بخیر

پھر خیال آیا کہ اس کی جستجو کر دیکھیے
پھر دلِ ویراں میں اس بت کا خیال آیا ادیب
پھر ہوا آباد یہ اجڑا ہوا گھر دیکھیے　　(سات شعر)

غزل - ۳

کیا کہوں ہمدم دلِ پُر آرزو کی آرزو
آرزو اور اس بتِ بیگانہ خو کی آرزو
رنج و تنہائی سے کچھ باقی نہیں عقل و تمیز
اپنے سائے سے ہے مجھکو گفتگو کی آرزو
۲؎ ایک ہو سکتی ہے دنیا میں بھلا مرگ و حیات ؟
یہ ہماری آرزو ہے، نہ عدو کی آرزو
آپ کے پیماں ہیں یا میرے جگر کی حسرتیں
آپ کا خنجر ہے یا میرے گلو کی آرزو
کون سمجھے اس دلِ بے مدعا کا مدعا
کون پوچھے اس دلِ پر آرزو کی آرزو
مبتلائے عشق کا اللہ رے ذوقِ ابتلا
غم کا غم، حسرت کی حسرت، آرزو کی آرزو　　(ناتمام - ۶ شعر)

غزل - ۴

سراپا عشق ہوں گویا نہیں ہے گو زباں میری
مگر کچھ پاؤں پڑ کر کہہ رہی ہیں بیڑیاں میری
۳؎ پریشاں بوئے گل، حیرت میں نرگس، باغباں خاموش
مگر بلبل نے شاید سیکھ لی طرزِ فغاں میری
۴؎ مرے سوز نہاں کا بعد میں تھا یہ عجب عالم
ہزاروں ہڈیاں بن کر جلی ہیں ہڈیاں میری

۲؎ : غالب کا شعر ہے؛ قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں　موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
کتنی عمدہ تکذیب یا تشریح ہے اور نئے انداز میں۔
۳؎ : غالب کا شعر ہے، بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل　جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
ادیب نے اس مضمون کو نئے معنی میں تلاش کیا ہے :-
۴؎ : بہادر شاہ ظفر کا مشہورِ عالم شعر بھی اس مضمون کا ہے :-
بڑی بڑی گرمی اے سوزِ نہاں جلتی ہے　شمع اس رنگ سے محفل میں کہاں جلتی ہے۔

مری بگڑی ہوئی صورت پہ بگڑے ہیں وہ کچھ ایسے
بیاں سے پہلے ہی سن لی ہے، گویا داستاں میری
گریباں نے کیا مجبور، مجھ کو ضعف نے ایسا
الجھ کر رہ گئیں ہاتھوں میں میرے دھجیاں میری

(ناتمام - ۵ شعر)

غزل - ۵

آہ کرنا دلِ حزیں، نہ کہیں
آگ لگ جائیگی کہیں نہ کہیں
گو زمیں بھی ہے یہی کھٹکا
آسماں ہو، تہِ زمیں نہ کہیں
میرے دل سے نکل کے دنیا میں
چین سے حسرتیں رہیں نہ کہیں
وہ مرے اضطراب کی باتیں
نامہ بر اُن سے سب کہیں نہ کہیں
ہم سمجھتے ہیں تم کو خوب ادیب
چوٹ کھائے ہو کہیں نہ کہیں

(۵ شعر)

غزل - ۶

مری فریاد میں تاثیر تھی یہ جذبِ کامل کی
نگاہِ خیال میں کھنچ کر پھری تصویر قاتل کی
خبر ہم کو نہ دل کی ہے، نہ دل ہے ہم سے کچھ واقف
خدا جانے کہاں ہم ہیں، خدا جانے لگی دل کی
تمہارے رو برو ٹوٹا، تمہارے ہاتھ سے ٹوٹا
زباں کا تو شکایت کی، شکستِ شیشۂ دل کی
چمن میں لالہ و گل، اس لیے رنگیں کفن آئے
کہ چھینٹیں پڑیں گریباں گیر خونِ دل، عنادل کی
ہوا پر لیلیٰ ناقہ سوار آئی، نظر شاید
بلائیں اڑ کے لیتا ہے غبارِ قیس محمل کی
مگر راہِ محبت میں ادیب ناتواں بن کر
جگر سے درد نے اٹھ کر مرے پہلو میں منزل کی

(۶ شعر)

غزل - ۷

زمیں مقتل کی دیتی تھی دہائی، اب سے کچھ پہلے
مرے نالے میں شاید تھی خدائی اب سے کچھ پہلے

مرا رنگ عدو ان کو تو شاید کھینچ لایا ہے
نہ تھی نالے میں گر میرے رسائی اب سے کچھ پہلے

نہ تھا رنگ حنا ظالم، تھے چھینٹے خون ناحق کے
پیام قتل تھا دست حنائی اب سے کچھ پہلے

ادھر گلچیں نے گل توڑا، ادھر بلبل نے دم توڑا
خزاں تیرا برا ہو کیوں نہ آئی اب سے کچھ پہلے

(ناتمام - ۴ شعر)

مسودات کلام میں ایک قطعہ نما غزل ہے، جسے مثنوی کی قسم کہہ سکتے ہیں۔ اس قطعہ میں جو واردات قلبی اور تاثرات بیان کیے گئے ہیں، وہ خالص غزل کی ہیئت ہے۔ لطف یہ کہ مختصر بحر میں دل کی کیفیات، کس مزے سے بیان کی ہیں، دل میں گھر کرنے والی اور موثر زبان استعمال کی ہے۔

غزل - قطعہ نما

۸

ان سے بیداد کی شکایت کی — اور ہاں تو نے کیا قیامت کی
نہ کبھی ہم سے رات فرقت کی — دیکھ لی بات تاب و طاقت کی
چارہ گر بھی ہیں مبتلائے جنوں — واہ تاثیر میری وحشت کی
گر نہ دیکھو مری طرف لیکن — آنکھ چھپتی نہیں محبت کی

ق

کل یہ دل نے کہا کہ اس بت سے — کہیے درد اور رنج والفت کی
کہیے شوق وصال بالتفصیل — کہیے بیداد درد و فرقت کی
کہیے کچھ بیان جوش جنوں — کہیے شرح روز وحشت کی
کہیے کچھ دل کے اضطراب کا حال — کہیے کچھ شدتیں اذیت کی
غیر کی کچھ برائیاں کہیے — کچھ ثنا ان کی شکل وصورت کی
شاید ان سے نکلے کوئی بات — طرز بدلے ذرا طبیعت کی
دل سے جاتا رہے یہ شوق ستم — جی میں آجائے لطف والفت کی
بس اسی وقت بزم میں جا کر — ظاہر اس بت سے سب حقیقت کی
درد فرقت بھی اب بیان کیا — کچھ عیاں وصل کی بھی حسرت کی
کج ادائی کے بھی کیے شکوے — بے وفائی کی بھی شکایت کی

سن کے تقریر میری فرمایا — ہم نے درخواست کی تھی چاہت کی
بے وفا! آج ہم سے ٹھنے تو نہیں — تم نے ہم سے عبث محبت کی
خود سمجھ لو تم ہو، ہم اسیر بلا — اب سزا بھگتو اس حماقت کی
سن کے اس بیوفا سے صاف جواب — ہم نے مہر و وفا پہ لعنت کی

کوئے قاتل سے آ گئے رسوا
بچ گئی جان، خود بدولت کی

(۲۹ شعر)

ابیات

فصل گل آئی مبارک ہو جنوں کو وحشت
مژدہ دل والوں کو سودائے بیاباں ہونا

الٰہی یہ کس کی نظر ہو گئی
مرے دل کی ان کو خبر ہو گئی

سبھی گل زیبِ کف ہیں اک نئے حسن گلستاں میں
رہے اک ہم ہی ارماں بھرے فصل بہاراں میں

کروٹیں شوق نے لیں درد نے پہلو بدلا
واہ رے ضبط کہ تم نے ہی نہ پہلو بدلا

حشر کا دن بھی اسی میں گذرا
طول دیکھو شب تنہائی کا

کونسا جرم کیا ہے، ترے دیوانوں نے
شور زنجیر بھی ظالم ترے زنداں میں نہیں

پوچھیے کیا ہوا ادیب حال چراغ تربت
بے کسی پر مرے افسردہ ہے ٹھنڈا ہو کر

شمیم کرہانی

داستانِ بے ستون و کوہ کن

میر تقی میر

باز آئیں بیانِ عشق سے کیا
اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی
میر نام اک جواں سنا ہوگا
اسی عاشق کے یار ہیں ہم بھی

جس کی باتوں میں جسکے شعروں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے
ایسا رنگیں نوا کہ جس کی غزل
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

تھا وہی آفتاب سا روشن
بزم میں جو چراغ تھا گُل تھا
ہر گلستاں میں ہر بیاباں میں
اُس کی زنجیرِ پا ہی کا غل تھا

تھا تو شاعر وہ گوشہ گیر مگر
اُس نے روئے زمیں تھام لیا
عشق میں کی بسر سلیقے سے
اپنی ناکامیوں سے کام لیا

اس کا ہر شعر تھا کوئی ناوک
اُس کا ہر لفظ کوئی نشتر تھا
سرسری تم نے دیکھا اُس کا کلام
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

اس کا رستہ تھا پیار کا رستہ
اس کی منزل تھی منزلِ محبوب
میر شاعر بھی زور کوئی تھا
دیکھتے ہو نہ بات کا اُسلوب

غزل اک تحفۂ گراں مایہ
بیت اک انتخاب کی سی ہے
اکثر اہلِ کلام کی آواز
اُسی خانہ خراب کی سی ہے

جس کے شعروں کی آب و تاب نہ پوچھ
دھوم ہے جس کی خوش بیانی کی
تشنہ لب مر گیا وہ عاشقِ زار
نہ ملی ایک بوند پانی کی

روش اس کی تو خاص ہے لیکن
واسطہ جس کو راہ عام سے ہے
شعر جس کے ہیں سب "خواص پسند"
پیار سے گفتگو عوام سے ہے

سادہ سادہ سی گفتگو کر کے
غنچے رنگین نہ کھلاتا ہے
میر صنّاع ہے ملوائیں سے
دیکھو باتیں تو کیا بناتا ہے

دیکھتا ہوں تو سادہ سادہ لفظ
سوچتا ہوں تو رنگ رنگ کے جام
شعر کیوں اسکے کھینچتے ہیں دل
ان میں کچھ طرز ہے نہ کچھ ابہام

اس نے ہر شعر میں نظر آئیں
جھلکیاں زیست کے فسانے کی
شعر دل میں اتر تو جاتا ہے
بات لگتی تو ہے ٹھکانے کی

عشق کی بات عقل سے نہ کہو
درد کو درد آشنا سمجھے
میر صاحب کا ہر سخن ہے رمز
بے حقیقت ہے شیخ کیا سمجھے

آج شعر و سخن کی محفل میں
زندگی میر کے کلام سے ہے
سہل ہے میر کا سمجھنا کیا
ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

اس کے اشعار ہی بتاتے ہیں
دل نے الفت میں چوٹ کھائی ہے
مر گیا خفقہ و زادتہ میں سرمست
کیا دوا...نے موت پائی ہے

عمر بیتی سر در سے خالی
زیست گزری نشاط سے محروم
یہی جانا کہ کچھ نہیں جانا
سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

اس کے آنسو تھے اسکو بادۂ ناب
اس کی قسمت میں تھی شراب کہاں
عشق کا گھر تھا میر سے آباد!
ایسے اب خانماں خراب کہاں

تھے حقائق جو عہد میر میں کل!
آج اس دور میں فسانے ہیں
کیا ہیں صحرا نوردیوں کے مزے
وہی جانیں جو خاک چھانے ہیں

زندگانی گزارتا تھا وہ
اپنے خوں گشتہ دل کے ہاتھ میں

بے خودی پر نہ میرؔ کی جاؤ — تم نے دیکھا ہے اور عالم میں

اس کو پروائے التفات نہیں — نہ کرے گر کوئی نگاہ تو کیا
میرؔ کیا ہے، فقیرِ مستغنی — آوے اُس پاس بادشاہ تو کیا

سوزِ غم سے ہوا جو دل روشن — تو وہ سمجھا، کوئی چراغ جلا
اہلِ دنیا سے رہتا تھا بیزار — کس سے ملتا تھا وہ دماغ جلا

تھا تو پاسِ خودی اسے لیکن — دور تھا نشۂ غرور سے وہ
خوش ہیں دیوانگی میرؔ سے سب — کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ

خاکساروں سے جھک کے ملتا تھا — سر گرانوں سے سر گرانی تھی
فقر پر بھی تھا میرؔ کے اک رنگ — کفنی پہنی تو زعفرانی تھی

کیا قلندر تھا، کیا فقیر تھا وہ — تنگ دستی میں شاد رہتا تھا
ایسا دیکھا نہ کوئی رندِ فقیر — فاقہ مستی میں شاد رہتا تھا

ایسا عاشق کہ جس کا قول یہ تھا — عشق ہے گل سے تا بہ زہرہ و ماہ
عشق بنیادِ بندگی کی ہے — عشق ہے لا الٰہ الا اللہ

عیش کا گل، نشاط کا غنچہ — اس نے کب باغِ دہر سے توڑا
سوزِ غم سے مسلسل اس کا دل — جیسے پکتا ہوا کوئی پھوڑا

جو یہ اہلِ وطن سے کہتا رہا — بلبل اس گلستاں کے ہم بھی ہیں
وجہِ بیگانگی نہیں معلوم — تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

دل، سحر سے نڈھال رہتا تھا — رات کٹتی تھی کس خرابی سے

غنچۂ دل مگر کھلاتا تھا! — اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

دے کے دل وہ جو ہوگیا مجبور — اس میں کیا اختیار تھا اُس کا

روتا رہتا تھا ساری ساری رات	ہائے کیا روزگار تھا اس کا

کر گیا اہلِ بزم کو گریاں !	حرف، جو بھی زبان سے نکلا
نامرادی کی رسم تیر سے ہے	طور یہ اس جوان سے نکلا

حسن ہی سے رہا سدا سروکار	عمر بھر اہلِ دل سے پیار کیا
کھینچ کے قشقہ، دیر میں بیٹھا	مذہبِ عشق اختیار کیا

شکوۂ تشنگی کیا نہ کبھی	خونِ دل سے بھرا کیا وہ سبو
بادشاہِ سخن تھا وہ ہرچند	پیرہن میں جگر جگہ تھا رفو

کیسی ہمت تھی کیا توانائی	غم کا سنگِ گراں، اٹھا لایا
سب پہ جس بار نے گرانی کی	اس کو یہ ناتواں، اٹھا لایا

نہیں بھولا ہے ذکرِ مظلومی	قصہ جور یاد ہے ہم کو
نامرادانہ زیست کرتا تھا	میر کا طور یاد ہے ہم کو

ہوش میں وہ نہ آسکا تا زیست	ایک عالم تھا نیم خوابی سا
خونِ دل کی گلابیاں پی کر	عمر بھر وہ رہا شرابی سا

ایسا دیکھا نہ عشق کا مجنوں !	ایسا پایا نہ عشق کا برباد
کوہکن جس کے سنگِ مدفن پر	رکھ کے تیشہ کہے ہے یا اُستاد

کب وہ پاتا نشاط کی منزل	غمِ جاناں نے رہنمائی کی
بے ستوں کوہکن سے کیا اٹھتا	عشق نے زور آزمائی کی

آہ کیسا جنوں نصیب تھا وہ	فصلِ گل صورتِ غبار آئی
رہی پیچاں سی موجِ بادِ صبا	بن کے زنجیر، ہر بہار آئی

ہوگئی انتہا محبت کی !	عشق میں جذب ہوگیا آخر
زندگی بھر اُسے خوشی نہ ملی	روتے روتے جو سو گیا آخر

کوہ کو تھا غبار سا جولاں	ہائے کیا ڈھنگ تھے دوانے کے
ایسا فنکار اور سرگرداں	انقلابات ہیں زمانے کے

مطبوعات موصولہ

میر نمبر۔ دلّی کالج میگزین

نثار احمد فاروقی کی ادارت میں دلّی کالج ایوننگ کلاسز کا میگزین "میر نمبر" کی صورت میں جلوہ گر ہوا ہے۔ نمبر نکالنے کی عام وبا میں کسی رسالے اور پھر وہ بھی کسی کالج کے میگزین سے کوئی کارنامہ ذرا کم ہی متوقع ہوتا ہے۔ لیکن جب میگزین دلّی کالج کا ہو جس نے پہلے بھی کئی اچھے نمبر نکالے ہیں اور اس کا مرتب نثار احمد فاروقی ہو یہ توقع بڑی حد تک جائز ہو جاتی ہے۔ دلی کالج نے اپنی روایت کے عین مطابق یہ نمبر ہر لحاظ سے لائق ستایش نکالا ہے کاغذ، طباعت اور ظاہری رنگ روپ تو معیاری ہیں ہی مواد بھی نثار احمد فاروقی کی ادارت میں شایع ہونے والے رسالے سے وابستہ امیدوں کو پورا کرتا ہے۔

مضمون نگاروں میں قاضی عبد الودود، امتیاز علی عرشی، آل احمد سرور، جعفر علی خاں، منوہر سہائے انور مختار الدین احمد آرزو، کلب علی خاں فائق، مبارز الدین رفعت جیسے مشاہیر شامل ہیں۔ جن کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

مگر دو باتیں میں نے شدّت سے محسوس کیں۔ ان میں ایک زیادہ اہم ہے۔ نثار صاحب نے اعلان کیا تھا کہ اس نمبر میں میر سے متعلق ایک تفصیلی اشاریہ بھی شایع کیا جائے گا۔ انھوں نے یہ وعدہ پورا نہیں کیا۔ یہ کمی اس نمبر کی بہت بڑی کمی ہے۔ بار بار اس سلیقے کے ساتھ میر پر تحریریں جمع نہ ہونگی کیا اچھا ہوتا اگر یہ نمبر اپنی تکمیل کے لیے اشاریہ میر بھی ساتھ لاتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس میں کئی تحریریں نظم اور نثر دونوں میں ایسی بھی ہیں جو پہلے بھی کہیں نہ کہیں شایع ہو چکی ہیں۔ عبد الحق۔ وحید الدین سلیم۔ ڈاکٹر ابو اللیث۔ آل احمد سرور کے مضامین اور مقبول حسین احمد پوری، رضا علی وحشت عزیز لکھنوی کی نظمیں اسی ذیل میں آتی ہے۔ ان میں سے کچھ غیر ضروری بھی ہیں۔ اور اگر مرتب نے ان کی شرکت کو صرف ضخامت کی خاطر نہ گوارا کیا ہے تو بھی یہ اعتراض باقی رہتا ہے کہ اصل ماخذ کا حوالہ کسی جگہ نہیں دیا گیا مرتب کے تحقیقی مزاج کے پیش نظر یہ اور بھی کھٹکتی ہے۔

جن شاعروں نے خراج عقیدت پیش کیا ہے ان میں شمیم کرہانی سب سے زیادہ کامیاب ہیں۔ ادارۂ نگار میر پر اتنی خوب صورت اور بھرپور نظم کے لیے انھیں مبارکباد دیتا ہے۔ یہ نظم نقل کی جا رہی ہے۔

نثار احمد فاروقی کی یہ کاوش تفہیم و تعریف میر میں بے حد اہم اقدام ہے جس کے لیے ان کی حوصلہ افزائی ہونا ہی چاہیے۔ اس نمبر سے چند مضامین انتخاب کیے جائیں گے۔

تعداد صفحات ۴۶۴ ہے۔ ظاہر و باطن دونوں حیثیتوں سے خوش سلیقگی پائی جاتی ہے۔ قیمت درج نہیں۔

نفسیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ اپنے بچوں کا دوسروں کے بچوں کے ساتھ مقابلہ نہیں کرنا چاہیئے۔ اس سے ان کی قدرتی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ بالکل یہی بات میٹرک باٹوں کے سلسلے میں کہی جا سکتی ہے۔

میٹرک باٹوں اور ننھے منوں کی خوبیوں کو پہچانیئے۔ انھیں جوں کا توں اپنایئے۔ ان کا استعمال ان کی موجودہ شکلوں ہی میں کیجیے، جیسے ۱۰ گرام، ۱۰۰ گرام، ۵۰۰ گرام اور ۱ کیلوگرام وغیرہ۔

میٹرک اوزان کا جوڑ توڑ کر کے من سیر کا حساب نہ لگایئے

اس میں آپ کا وقت ضائع ہوگا اور لین دین میں اکثر نقصان رہے گا۔

سہولت اور واجبی لین دین کے لئے

مکمل اکائیوں میں

میٹرک باٹوں

کا استعمال کیجیے

REGD. NO. A - 455
42ND YEAR OF PUBLICATION
NIGAR, URDU MONTHLY, RAMPUR U.P.
SEPTEMBER 1963
REGISTERED WITH THE REGISTRAR OF NEWSPAPERS AT R.N. NO. 2136/57

قیمت { فی پرچہ ۵۷ نئے پیسے
سالانہ دس روپے

رجسٹرڈ نمبر ایل ۴۶۶
جموں کشمیر کی لائبریریوں کے لئے منظور شدہ

نگار

اپریل ۱۹۶۴ء

مدیر اعلیٰ

اکبر علی خاں

معاونین

مظفر حنفی

سلطان اشرف

زر سالانہ
دس روپے

فی پرچہ
۷۵ پیسے

نگار بک ایجنسی رامپور

داہنی طرف کا سرخ صلیبی نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا چندہ اس شمارے کے ساتھ ختم ہو گیا۔

جلد (۴۳) | فہرست مضامین اپریل ۱۹۶۴ء | شمارہ (۴)

دیوان ناسخ کا ایک نادر مخطوطہ۔ امتیاز علیخاں عرشی ۵
سودا کے شہر آشوب۔ ڈاکٹر خلیق انجم ۱۳
پلیگ۔ البیر کامو
ترجمہ و تلخیص محمود رضوی ۲۱
منظومات۔ امتیاز علی عرشی، شہریار، جاوید کمال رامپوری ۳۷
مطبوعات موصولہ بشیر بدر ۳۹

اطلاع نامہ نگار (ضمیمہ)
نگار رامپور کے بارے میں ہند و پاک کے ادیبوں نے کہا ۴
نگار رامپور کے بارے میں ہند و پاک کے مشہور رسالوں نے لکھا۔ ۶

غالب کا الحاقی کلام

اس موضوع پر نادم سیتاپوری ایک کتاب ترتیب دے رہے ہیں

جولائی ۶۴ء کے شمارے میں یہ مکمل کتاب ملاحظہ فرمائیے
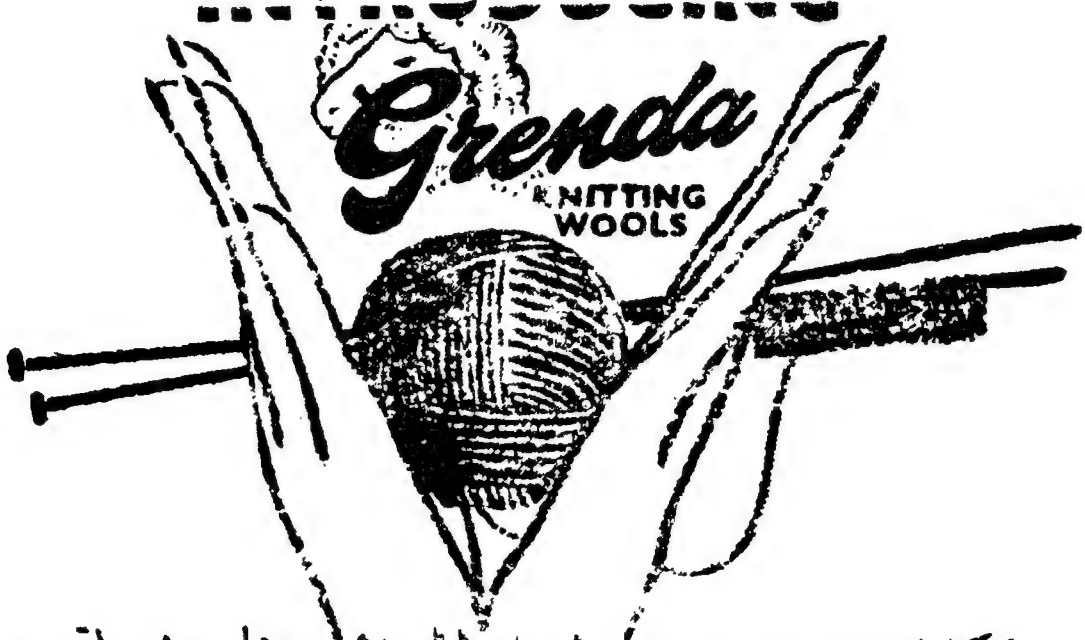
تاریخ نمبر جیسی اہم دستاویزی پیشکش کے بعد

ادارہ ماہنامہ **نگار** رامپور۔ یوپی

دو اور عظیم خاص نمبر پیش کر رہا ہے جنھیں نسلوں نہیں بھلایا جا سکے گا

شاد عارفی نمبر

جو اردو کے اس منفرد تیکھے طنز گو شاعر کے انتخاب کلام خطوط
اور شخصیت و فن پر مضامین کا بھرپور مجموعہ ہوگا۔ اگر آپ بھی شاد عارفی کے خطوط مہیا کر سکیں یا ان کی زندگی
اور فن سے متعلق کچھ لکھنا چاہیں تو جلد از جلد نگار رامپور کو ارسال کیجئے۔

چند لکھنے والے:- • پروفیسر آل احمد سرور • پروفیسر فراق گورکھپوری • پروفیسر احتشام حسین • پروفیسر مجنوں گورکھپوری • احمد ندیم قاسمی • محمد طفیل • مظفر حنفی سر سید • مولانا ماہر القادری • ظ انصاری • خلیل الرحمن اعظمی • ڈاکٹر خلیق انجم • مظفر حنفی • مسعود اشعر • گوپال متل • مخمور سعیدی • کوثر چاندپوری۔ اور بہت سے دوسرے۔

نگار کے مندرجات کا اشاریہ نمبر

مرتبہ:۔ سعدیہ حفیظ و خالدہ عباسی

نگار کا اجرا ۱۹۲۲ء میں ہوا تھا جب سے اب تک تقریباً نصف صدی کے عرصہ میں اس کے صفحات پر الہیات سے جنسیات تک سیکڑوں موضوع زیر بحث آئے ہیں، ملک کے سارے مشاہیر ادب نگار میں لکھتے رہے ہیں۔ اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ ایک تفصیلی اشاریہ ان تمام تحریروں کا مرتب کیا جائے تاکہ اصحاب ذوق کو اپنی مفید مطلب تحریر تک رسائی میں دشواری نہ رہے ہمیں یہ اعلان کرتے ہوئے بیحد مسرت ہے کہ نگار رامپور جلد ہی ایک مخصوص شمارہ اس مقصد کے لئے وقف کر رہا ہے۔ یہ اشاریہ صرف فہرست نہیں ہوگا بلکہ اسمیں مضامین کے مطالب کا خلاصہ بھی شامل ہوگا گویا اس نمبر کی صورت میں نگار کی نصف صدی کی تحریریں مختصراً سمٹ آئیں گی اس طرح یہ کام مفید سے مفید تر ہو گیا ہے۔ تحقیقی کام کرنے والوں اور لائبریریوں کے لیے یہ نمبر بیحد ضروری ہوگا۔

مینیجر ماہنامہ نگار رامپور یوپی

دیوانِ ناسخ کا ایک نادر مخطوطہ

امتیاز علی خاں عرشی

ابھی حال میں رضا لائبریری کے لیے شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی متوفی ۱۲۵۴ھ (۱۸۳۸ء) کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ خریدا گیا ہے۔

کلیات ناسخ (ص ۳۹۸ مطبع مولائی لکھنؤ ۱۲۶۰ھ حسب فرمائش شاہزادہ فرخندہ بخت بہادر) کے خاتمے سے معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ کے تین دیوان ہیں۔ ان کا پہلا دیوان ۱۲۳۲ھ (۱۷-۱۸۱۶ء) میں مرتب ہوا تھا، اور اس کا تاریخی نام "دیوان ناسخ" ہے۔ دوسرا دیوان الہ آباد کی آمد و رفت کی پریشانی کے زمانے میں ترتیب گیا تھا، اس کا تاریخی نام "دفتر پریشاں" ہے۔ جس سے ۱۲۴۷ھ (۳۲-۱۸۳۱ء) نکلتا ہے۔ تیسرا دیوان ۱۲۵۴ھ (۳۹-۱۸۳۸ء) میں انجام کو پہنچا۔ اور اس کا تاریخی نام ناسخ کے شاگرد میر علی اوسط رشک نے "دفتر شعر" تجویز کیا۔

زیر بحث مخطوطے کا ان تینوں دیوانوں سے مقابلہ کرنے پر واضح ہوا کہ یہ نسخہ ناسخ کے دوسرے دیوان کا ہے۔ جیسا کہ آئندہ بیان سے معلوم ہوگا۔ یہ مؤلف کا مسودہ ہے، اس لیے بے حد نایاب تسلیم کیے جانے کا مستحق ہے۔

اس مخطوطے کا ناپ ۲۲×۱۷ سینٹی میٹر ہے۔ ہر صفحے میں ۱۳ سطریں ہیں۔ متن کے ورقوں کی تعداد ۱۶۷، اور شروع میں شامل فہرست اشعار کے اوراق کی تعداد ۸ ہے۔ جس کا مجموعہ ۱۷۵ اوراق ہوتا ہے۔ لیکن اس فہرست سے پتا چلتا ہے کہ اصل متن اوراق کی تعداد ۲۰۸ تھی۔ کیونکہ ورق ۲۰۷ پر جو غزل شروع ہوئی ہے، ورق ۲۰۸ پر اس کا اختتام ہوتا ہے، اور فہرست اشعار میں اس کے بعد کے کسی شعر کا حوالہ نہیں ملتا۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کتاب میں اس سے زائد ورق نہ تھے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ ورق ۲۰۹ بعد پر حرف الف کی کچھ غزلیں ہوں[1]۔

چونکہ فہرست اشعار کا پہلا ورق غائب ہے۔ اس لیے ان کا حوالہ دسترس سے باہر ہے۔

دیوان کا خط صاف اور رواں نستعلیق ہے۔ روشنائی کالی استعمال کی گئی ہے۔ لیکن تخلص شنجرف سے لکھا گیا ہے۔ فہرست اشعار میں عنوان اور اوراق کے ہندسے بھی شنجرفی ہیں۔ کاغذ دیسی بانس کا ہے۔ پوری کتاب میں کرم خوردگی اور آب رسیدگی دونوں کے نشان پائے جاتے ہیں۔ جلد شکستہ اور ورق بے شیرازہ ہو گئے ہیں۔ ورق ۱۳ ب اور ۱۱۰ ب پر ایک ننھی سی مہر ثبت ہے۔ جس میں بخط نستعلیق "مامن شاہ خاں" منقوش ہے۔

ورق ۹ ب سے ۱۶۲ الف تک ردیف وار غزلیں مندرج ہیں۔ یہ ردیفیں ا، ت، د، ذ، ر، ز، ط، ظ، ع، ن، و، ہ اور ی کی ہیں۔ ورق ۱۶۶ الف کی سطر ۱ سے آخر تک ردیفی ترتیب مفقود ہے۔ مثلاً اس صفحے پر یہ غزل مندرج ہے "باغ میں اک بار اگر وہ لالہ رو ہو جائے گا" اور اس کے مقابل یہ غزل ہے: "زاہدا کعبہ دیکھو اتنا ہی اس گمراہ سے" اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نسخے کی جتنی غزلیں ردیف وار ہیں وہ کسی اور بیاض سے نقل ہوئی ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ کہا گیا وہ ترتیب نظم کے مطابق لکھا جاتا رہا۔

شاہ حاتم کے دیوان زادے اور دیوان غالب اردو کے بعد ناسخ کا دیوان دوم تیسری کتاب ہے جس کی اکثر غزلوں کو اس نسخے کی مدد سے تاریخی ترتیب پر مرتب کیا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ ابھی مذکور ہوا دیوان کے سادہ اوراق کی تعداد ۲۰۸ یا اس سے کچھ ہی زائد تھی۔ اس لیے جب سادہ صفحے ختم ہو گئے تو نئی غزلیں حاشیوں پر لکھی جانے لگیں۔ ناسخ کے بارے میں آزاد دہلوی نے آب حیات (ص ۳۵۵ طبع لاہور بار دوازدہم) میں لکھا ہے کہ "دو تین خوشنویس کاتب بھی نوکر تھے" اس لیے متن و حاشیہ دونوں کی کتابت انھیں حضرات کے قلم کی ہوگی۔

---

[1] اس نسخے میں اوراق ۲۴، ۴۰، ۴۹، ۵۴، ۹۳، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۵۸، ۱۶۱، ۱۹۴، ۱۹۸، ۲۰۳، ۲۰۶ کم ہیں۔

اس نسخے کی فہرست دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ناسخ نے اسے مرتب کرنا چاہا تو نقل کرنے والے کی سہولت کے لیے ردیف وار فہرست مرتب کر کے شروع میں لگا دی جس میں ہر غزل کا مصرعِ اول لکھ کر اس کے اوپر شنجرف سے اس صفحے کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ جس پر وہ غزل مندرج ہے۔ چاہیے یہ تھا کہ اس میں ہر ردیف کی غزلوں کو تاریخی ترتیب کے مطابق نقل کرایا جاتا۔ مگر ایسا عمل میں نہیں لایا گیا۔ اور کسی اور مصلحت کی بنا پر جو ہم رنگی یا زنگار نگی ہو سکتی ہے، ترتیب قطعاً غیر تاریخی ہو گئی۔

بہ ظاہر نسخۂ مطبوعہ کی ترتیب غزلیات کو ہمارے مخطوطے کی ترتیب کے مطابق ہونا چاہیے۔ مگر دونوں کا مقابلہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ ناسخ یا ان کے کسی شاگرد نے ان میں کسی قدر رد و بدل کر دیا ہے جس کی وجہ سے مطبوعہ کی ترتیب، تاریخی ترتیب سے دور ہو گئی ہے۔ ہمارے مخطوطے کی رو سے ناسخ کے دوسرے دیوان کی غزلوں کی ردیف وار تاریخی ترتیب کیسی ہوگی۔ اس کو بتلانے کے لیے صرف ردیف الواو کی غزلوں کو بہ طورِ نمونہ پیش کرتا ہوں، ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ پری جمال ہیں نہ جنت میں حورِ عیں دیکھو　　ورق ۷۳ الف
۲۔ تشبیہ دے ہلال ست ابروے یار کو　　"[1]
۳: آسماں کی کیا ہے طاقت جو چھڑائے لکھنؤ
۴: یاد ہیں سب گلعذار لکھنؤ　　ورق ۶۸ الف
۵: ہم صفیر اپنا وطن ہے لکھنؤ　　ورق ۷۲ ب
۶: میرے دم سے تھا بوستاں لکھنؤ　　ورق ۷۳ الف
۷: خطِ شب رنگ بہ گالوں پہ نہیں، درمیاں کرو　　ورق ۸۱ ب
۸: دو شب تار سے تشبیہ ہمارے دل کو　　ورق ۸۴ الف
۹: بزم میں پاتا نہیں جو ساقیِ گلفام کو　　ورق ۸۷ الف
۱۰: مجھ کو عریانی میں کیا ہو پیرہن کی آرزو　　ورق ۹۴ ب
۱۱: بیاں کیا ہو جو ہے جسمِ دل ربا کی بُو　　ورق ۹۶ الف
۱۲: جو اس پری سے شبِ وصل میں رکاوٹ ہو　　ورق ۱۰۱ الف
۱۳: خود بنتے ہو اغیار سے منواتے ہو مجھکو　　ورق [illegible] الف
۱۴: چھڑ گئے جو میرے نالوں کے شرارے رات کو　　ورق ۱۰۰ الف
۱۵: قرابۂ مئے گلرنگ ہے فلک ہم کو　　ورق ۱۰۰ ب
۱۶: چوٹ دل کو جو لگے آہ رسا پیدا ہو　　ورق ۱۱۲ الف
۱۷: ملتے ہو جب نہ تب میرے دل بے تاب کو　　ورق ۱۴۳ الف
۱۸: کس قدر نفرت ہے اس کے توسنِ چالاک کو　　ورق ۱۴۳ ب

مطبوعہ نسخے میں ان کی ترتیب حسبِ ذیل ہے،

۱-۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۱۰، ۹، ۱۱، ۱۳، ۱۲، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷ نے

دوسری ردیفوں میں ان دونوں نسخوں کی ترتیب اور بھی زائد مختلف ہے۔

اس مخطوطے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ نے اپنے دیوان میں کیا رد و بدل کیا ہے۔ کون سے شعر مطبوعہ نسخے میں دانستہ یا نادانستہ شامل نہیں کیے گئے۔ اور کون کون سے شعر یا غزلیں حاشیوں میں بڑھائی گئی ہیں۔ یہاں نمونے کے طور پر صرف چند باتوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

---

[1] یہ غزلیں مخطوطے میں بوجہ نقصانِ اوراق موجود نہیں فہرستِ اشعار سے البتہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ علی الترتیب مخطوطے کے ان اوراق میں مندرج تھیں ۵۰، ۵۱
[2] مخطوطے میں فہرست کے اندر اس غزل کا ورق ۱۰۲ پر ہونا ظاہر کیا گیا ہے مگر یہ کتابت کا سہو ہے غزل ۱۲۳ ب سے شروع ہوتی ہے جس کا موجودہ نمبر ۱۰۷ ب ہے۔

الف اصلاح و ترمیم

۱: ورق ۱۱ ب کا ایک شعر پہلے تھا:

تونے جو پانی پیا ہے اے بتِ شیریں دہن — آبخورے میں مزا ہے کوزۂ قند کا

اس کے دوسرے مصرع میں اصلاح کی ہے - "آبخورے میں ہے عالم"۔ مطبوعہ میں یہی مرقوم مصرع چھپا ہے۔

۲: اسی صفحے پر متن میں ایک شعر ہے۔

تمام عمر بسر ہوگئی یونہی میری — شب فراق گئی روزِ انتظار آیا

اس کے پہلے مصرع پر سنجرفی روشنائی سے لفظ "بدلہ" لکھ کر ترمیم کی: "تمام عمر یونہی ہوگئی بسر اپنی"۔ مطبوعہ میں اصلاح کے مطابق مصرع چھپا ہے۔

۳: ورق ۲۶ الف پر ایک شعر متن میں ہے:

مر کے جاؤں جو خلد میں بالفرض — ہو سفر کا عذاب اے قاصد

"بالفرض" پر نسخے کا "ن" لکھ کر حاشیے میں "بشک" کر دیا ہے۔ جو مطبوعہ میں بھی پایا جاتا ہے۔

۴: ورق ۲۶ ب پر متن میں ہے:

احباب سے انتظار کہنا — ہے تو ہی مرا گواہ قاصد

حاشیے میں انتظار کی جگہ "اضطراب" لکھا ہے اور یہی مطبوعہ میں ہے۔

۵: ورق ۳۴ الف پر ایک شعر ہے:

تشنۂ دیدار ابرو جو سمجھا ہے مجھے — کر رہا ہے قتل قاتل خنجرِ آب سے

متن اور حاشیے میں "ن" لکھ کر قتل کی جگہ "ذبح" بنایا گیا ہے، یہی قرأت مطبوعہ میں بھی ہے۔

۶: ورق ۴۶ ب پر ہے:

موئے کمر نظر نہیں آتا تو کیا کروں — تعریف ورنہ کی ہے ترے بال بال کی

حاشیے میں پہلے مصرع میں نسخہ یوں لکھا ہے۔ "موئے کمر نظر ہی نہ آئے تو کیا کروں" مطبوعہ میں مصرع کی یہی شکل ملتی ہے۔

۷: ورق ۶۵ ب پر ایک شعر ہے:

دیکھیے گا، اے غضب، تاثیر ایامِ بہار — کم نہیں گلشن سے جو محفل میں شانۂ جام ہے

مصرع اول کے لفظ دیکھیے گا پر نسخہ لکھا ہے "دیکھنا" مطبوعہ میں یہی لفظ ملتا ہے۔

۸: ورق ۱۲۲ الف میں مقطع سے پہلے یہ شعر تھا:

کنٹھی ہے گلے میں کافر کے — دیکھیے جب ہے تان ہونٹوں پر

اسے قلمزد کر کے حاشیے میں لفظ "قطعہ" کے تحت یہ شعر اضافہ کیا:

دانتوں پر ہے بہار مستی کی — رنگ لایا ہے پان ہونٹوں پر

اس عمل سے مقطع قطعہ بند ہوگیا ہے۔ مطبوعہ نسخے میں اس شعر کو قلمزد شعر سے پہلے لکھا گیا اور اسے بھی برقرار رکھا گیا ہے۔

۹: ورق ۱۴۱ الف پر ایک شعر متن میں یوں تھا۔

تم چھپر کھٹ میں ہم جنازے پر — سیکھے ہیں خوب ڈھنگ سونے کا

حاشیے میں دوسرے مصرع کے ابتدائی الفاظ یوں بدل دیے ہیں۔ "کیا نکالا ہے الخ"۔ مطبوعہ میں بھی یہی الفاظ ملتے ہیں۔

۱۰: ورق ۱۴۹ پر ایک شعر ہے:

حیران ہوں کیوں ہاتھ ترے بن گئے شعلے		کہتے ہیں کہ تاثیر ہی ہوتی ہے حنا سرد

حاشیے میں دوسرے مصرع کو بہ طور نسخہ یوں لکھا ہے: "کہتے ہیں اطبا کہ ہے تاثیرِ حنا سرد"۔ یہ اصلاح مطبوعہ میں شامل نہیں، اس لیے قابل قدر ہے۔

۱۱: ورق ۱۵۶ الف پر ایک شعر ہے:

آپ اگر اپنی عبادت کرتے ہیں اے خود پرست		سر جھکا منبر مسجد کا نہ کیوں محراب میں

حاشیے میں مصرع ثانی کا نسخہ تجویز کیا ہے: کیوں نہ مسجد کا منارا خم ہوا محراب میں۔

مطبوعہ میں دوسرا مصرع اصلاحی شکل میں ہے۔ نیز اس میں "خود پرست" ہے۔

ب: تشریحاتِ الفاظ

۱: اس مخطوطے کے حاشیے میں کچھ دل چسپ تشریحیں بھی مندرج ہیں۔ چنانچہ ورق ۱۰ب پر ایک شعر ہے:

عہد طفلی میں بھی تھا میں ہی تفکر اپنا		مانگتا تھا کوئی ادتھانہ کبھی باری کا

اس شعر کے محاذ میں حاشیے پر یہ تشریح مندرج ہے:

"ادتھا نام بازیست کہ ہرگاہ طفلے چیزے خورد، و دیگر طفل کہ ادتھا بستہ است بگوید کہ ادتھا بدہ، پس آں را واجب شد کہ ازاں چیز تھوڑی بطریق خود بہ دہد۔ چوں آں طفل کہ چیز بخورد اوّلاً بطریق خود گوید کہ ۔۔۔ ادتھا کھاؤں دا دتھا نہ دوں۔ پس چیز بطریق مذکور نمی دہد تمام بخورد الخ"

دیوان مطبوعہ میں یہ شعر اور تشریح دونوں شامل نہیں، اس لیے دل چسپ بھی ہیں اور اہل لغت کے لیے بھی مفید۔

۲: ورق ۹۵ الف پر ایک شعر ہے:

چھوٹ نکلی ہے سویدا کی جو رنگت اے صنم		صاف آتا ہے نظر بایاں ترا پہلو سیاہ

حاشیے میں لکھا ہے "یعنی پہلوی چپ"۔

۳: ورق ۱۱۰ الف کا پہلا شعر ہے:

جائے دنداں لب سوفار ہوئے اے قاتل		دہن زخم سے ہوگا نہ ترا تبسم پیدا

اس مورد پر "جائے دنداں" کے لیے حاشیے میں لکھا ہے "در حرف ہند سوفار گویند"۔

۴: ورق ۱۱۱ الف پر یہ شعر ہے:

تیرے سر پر جس طرح ہے ابر کا سایہ مدام		میرے سر پر ہو یوں ہی سایہ تری دیوار کا

اس شعر کے لفظ "تیرے" پر سرخ روشنائی سے ایک کا ہندسہ لکھ کر حاشیے میں لکھا ہے: یعنی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ج: اضافۂ اشعار

مخطوطے کے حاشیوں میں جو شعر بڑھائے گئے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

۱: ورق ۱ب کے حاشیے میں یہ شعر بڑھایا ہے:

یہ صفائی یہ لطافت جسم میں ہوتی نہیں		تم نے جو دل میں چھپایا آشکارا ہو گیا

مطبوعہ میں اس کا دوسرا مصرع یوں ہے۔ تم نے جو دل میں لیا وہ آشکارا ہو گیا۔

۲: ورق ۸۲ الف کے حاشیے میں یہ شعر لکھا ہے:

نامۂ جاناں کے پڑھنے سے جو دیکھا خوش مجھے　　نامہ بر بولا کہ ہو پروانگی انعام کی

متن میں جو علامت سقوط لکھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شعر مذکورہ کا اضافہ اس شعر کے پہلے ہونا چاہیئے :

لکھوں سرنامے پہ اپنا نام اگر میں قاصدا　　خط ہی گم ہو ایسی ہے تاثیر میرے نام کی

مطبوعہ نسخے میں ایک تو حاشیے کا شعر شامل نہیں کیا گیا، دوسرے "لکھوں سرنامہ پہ الخ" کا دوسرا مصرع یوں مندرج ہے :

"خط بھی گم ہو ایسی ہے تاثیر میرے نام کی"

۳: ورق ۸۸ ب پر ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے :

اے سحر اب اپنی نورانی دکھا صورت ہمیں　　کیسی کالا منہ دکھائی ہے شب فرقت ہمیں

اس مطلع کے بعد علامت سقوط لکھ کر حاشیے میں یہ تین شعر درج کیے گئے ہیں :

ہجر میں اپنی نظر آئی عجب صورت ہمیں　　آئنے کو دیکھتے ہی ہوگئی حیرت ہمیں

ہجر بن کٹ کر کلیجہ گر پڑے گا منہ کی راہ　　زہر کا ہے گھونٹ[1]، ساقی، بادہ عشرت ہمیں

قد جھکا جاتا ہے اپنا مثل طوق اے فاختہ　　یاد رہتا ہے جو وہ سرو سہی قامت ہمیں

یہ تینوں شعر باوجود اس کے کہ غزل کے اچھے شعروں کی ٹکر کے ہیں، مطبوعہ میں شامل ہونے سے رہ گئے" اس لیے یہ حد قابل قدر ہیں۔

۴: ورق ۹۱ الف کے حاشیے میں یہ شعر درج ہے :

جیتے جی آئے ہمارے ہاتھ ہے امر محال　　کم نہیں مکتوب جاناں نامۂ اعمال سے

مطبوعہ سے یہ شعر بھی خارج ہے ۔

۵: ورق ۹۴ ب کے حاشیے میں ایک شعر یوں لکھا ہے :

گنبد مدفن مرے، شعلوں میں یوں ہے بعد مرگ　　بلبلے پڑتے نظر آتے ہیں جیسے آب پر

مطبوعہ میں بجائے "پڑتے" کے "ترتے" ہے جو بعد کی اصلاح معلوم ہوتی ہے ۔

۶: ورق ۹۵ ب کے حاشیے میں یہ شعر درج ہے :

سبزہ ہے، گل ہیں، کھڑی ہے دو لوں پر کالی گھٹا　　رنگ خط ہے سبز، چہرہ سرخ ہے، گیسو سیاہ

مطبوعہ میں پہلے مصرع کے اندر بجائے "گھڑی" کے "کھڑی" ہے۔ جو بظاہر "گھڑی" معلوم ہوتا ہے ۔

۷: ورق ۱۰۷ الف کے حاشیے میں یہ شعر درج ہے :

گور میں سونے کو ہوتا ہوں جو کہتا ہے کوئی　　آج میرے خواب میں آئے وہ بارے رات کو

مطبوعہ میں یہ شعر بھی نہیں ہے ۔

۸: ورق ۱۱۰ الف کے حاشیے میں یہ شعر ہے :

جب جدائی کے مضامین مجھے سوجھتے ہیں　　حرف سے حرف ہوا ہے دم تحریر جدا

مطبوعہ میں "سوجھے" ہے جو بالفہم ہے یا اصلاح ہے ۔

۹: ورق ..... کے حاشیے میں یہ دو شعر درج ہیں :

جو چھنتے ہیں پیشانی پہ آب افشاں　　یہ صفحہ مطلا ہوا چاہتا ہے

غلط کیا ہے یعقوب کو عشق یوسف　　کنواں بھی تو اندھا ہوا چاہتا ہے

مطبوعہ میں علاوہ ترتیب کے اختلاف کے دوسرا شعر موجود نہیں ۔

---

[1] اصل میں "گونٹ" لکھا ہوا ہے

۱۰: ورق ۱۲۷ الف کے حاشیے میں یہ شعر ملتا ہے:

کیا بہار آئی ہے؟ جو موج ہوا کے بدلے ۔۔۔ تار اڑتے نظر آتے ہیں گریبانوں کے

شعر خوب تھا، مگر کسی وجہ سے شامل دیوان مطبوعہ نہیں کیا گیا۔

۱۱: ورق ۱۲۸ الف، ۱۳۰ب، ۱۳۲الف، ۱۳۸الف، ۱۵۳الف، ۱۵۵ب، ۱۵۸الف، ۱۶۰الف کے حاشیوں میں علی الترتیب یہ شعر مندرج ہیں اور سب کے سب مطبوعہ میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں:-

یاد ہر دم ہے دہن کا کل خم دار مجھے ۔۔۔ کیوں نہ ہو جائے بھلا موج نفس مار مجھے

سوکھا میں غم سے باغ میں آیا نظر جو خار ۔۔۔ بیمار ہوں میں، نرگس بیمار دیکھ کر

تو دیکھ کے خوش ہو تو ابھی لخت جگر سے ۔۔۔ ہر ایک مژہ کو کرے پھولوں کی چھڑی آنکھ

مجھے تو ہول ہے کافر مجھے دھولیدڑی ہے ۔۔۔ غبار دشت جدا ہے، ترا گلال جدا

تو سرخ ہے خوں سے، پر نہ شیریں ۔۔۔ غم سے ہوئی ہائے، کوہکن زرد

فرقت محبوب میں جس شب اچٹ جاتی ہے نیند ۔۔۔ آتے ہیں کیا کیا خیال اپنے دل بیتاب میں

یوں تصور تیرے پلکوں کا دل روشن میں ہے ۔۔۔ جیسے ہوں تار شعاعی مہر عالمتاب میں

کر وں میں ذکر نہ کیوں بار بار مچھلی کا ۔۔۔ یہیں وہ کھیل رہے تھے شکار مچھلی کا

جڑاؤ مچھلی تری یاد آگئی مجھ کو ۔۔۔ کیا شکار اگر نفس دار مچھلی کا

نہر ہو وہ بت نازک جو کرے بادہ کشی ۔۔۔ بوئے انگور سے ہوتا ہے وہ اکثر بیہوش

د: اضافۂ غزلیات

مخطوطے میں حسب ذیل غزلیں حاشیوں میں اضافہ کی گئی ہیں:

۱: کیا گزر اس کے دہان تنگ سے ہو بات کا (ورق ۱۳ الف)

اس کے دوسرے شعر کا دوسرا مصرع مخطوطے میں یوں ہے: "یاد آیا لطف، اے گل مجھ کو تیری بات کا" مطبوعہ میں اسے بدل دیا گیا ہے: "مجھ کو اے گل، لطف تیری بات کا۔"

مخطوطے میں تیسرا شعر ہے:

روتے روتے ہم ذرا تڑپے تھے بالائے زمیں ۔۔۔ کہتے ہیں سب قہر تھا یہ زلزلہ برسات کا

مطبوعہ میں "یا زلزلہ" چھپا ہے؛

مخطوطے کا ایک شعر ہے:

ہڈیاں میری سگ جاناں کو پہنچا دے کوئی ۔۔۔ بعد مردن بھی ہے ظالم بھیجنا سوغات کا

مطبوعہ میں بجائے "ظالم" کے "لازم" ہے۔

مخطوطے میں مقطع اس طرح ہے:

نفی اپنی کو لے اول بعد اثبات حبیب ۔۔۔ ہے عبث یہ شغل ناسخ نفی اور اثبات کا

مطبوعہ میں بجائے "اول" کے "پہلے" ہے۔

۲: ورق ۱۵ الف کے حاشیے میں ایک غزل درج ہے جس کا آغاز اس مصرع سے ہوتا ہے:

"تیرے گیسو میں نے دیکھے جوشش سودا ہو گیا۔" اس غزل کے دوسرے شعر کے دوسرے مصرع کے الفاظ مخطوطے میں یہ

"شاہ جنات ایسا مدیا شاہ دریا ہو گیا"۔

مطبوعہ میں "شاہ جنہ" مندرج ہے

مخطوطے میں ایک شعر ہے

نقش ہیں تسخیر دل کے واسطے نقش قدم — سایہ تیرا اے پری جادو کا پتلا ہو گیا

مطبوعہ میں "تسخیر دل" کی جگہ "تسخیر دان" ہے۔

۳: ورق ۲۴ ب کے حاشیے میں ایک غزل درج ہے، جس کا ایک شعر مخطوطے میں یوں ہے۔

رہ گیا میں مسوس کر دل میں — کب میسر مجھے مساس ہوا

مطبوعہ میں "دل کو" ہے۔

۴: ورق ۵۰ الف کے حاشیے میں جو غزل ملتی ہے، اس کا ایک شعر ہے:

بے شبہ پڑ گیا ہے، دلا، عکس موئے سر — آئینہ جبیں میں یہ چین و شکن نہیں

مطبوعہ میں "پیچ و شکن" چھپا ہے۔

دوسرا شعر ہے:

کیوں ہو گیا ہے روز جدائی مجھے پہاڑ؟ — عاشق تو ہوں ضرور دلے کوہکن نہیں

مطبوعہ میں "دلے" کی جگہ "مگر" ہے

۵: ورق ۷۶ الف کے حاشیے میں ایک غزل درج ہے، اس کا شعر ہے:

طفلی سے ہے یہ شوق شراب آب کی مانند — کمبخت مری پیری میں بھی زنہار نہ چھوٹی

مطبوعہ میں پہلا مصرع یوں ہے "طفلی سے ہی ہے شوق شراب"

اسی غزل کا ایک شعر ہے:

نبضیں بھی مری چھوٹ گئیں منتظری میں — مہندی ترے پاؤں کی مگر یار نہ چھوٹی

یہاں "انتظار" کی جگہ "منتظری" کا استعمال اہل لغت کے لیے دلچسپ ہے۔

۶: ورق ۱۰۴ الف کے حاشیے میں ایک غزل درج ہے، اس کا مطلع ہے:

فرقت ساقی میں کیا مینا و ساغر توڑیے — خشت پائے خم سے اپنا کاسۂ سر توڑیے

مطبوعہ میں "خشت ہائے خم" ہے۔

اس کا ساتواں شعر مخطوطے میں یوں ہے:

انتظار صبح میں مر مر کے کاٹی ہم نے رات — اشتیاق شام میں اب جان دن بھر توڑیے

مطبوعہ میں "ہم نے" کی جگہ "میں نے" ہے۔

مخطوطے میں گیارھواں شعر ہے:

عکس جاناں کا ادب ہے، ورنہ تیر آہ سے — آئینہ کیسا؟ ابھی سد سکندر توڑیے

مطبوعہ میں "کیا ہے" ہے۔

۷: ورق ۱۱۳ الف کے حاشیے میں جو غزل درج ہے اس کا دوسرا شعر ہے:

بے گداز دل نہیں ممکن کہ ہو سیر و سلوک — دیکھ او زاہد! روانی آب آہن میں نہیں

مطبوعہ میں "بہر سلوک" ہے

ایک اور شعر ہے:

کس کو یاں تیرے سوا پہنچا سکے کوئی گزند — کون ہے وہ اے اجل جو تیرے جوشن میں نہیں

مطبوعہ میں پہلا مصرع یوں ہے:

کس کو یاں پہنچا سکے تیرے سوا کوئی گزند

۸: ورق ۱۳۰ الف پر جو غزل ہے اس کا دوسرا مطلع ہے:

کیا ہے پروا جائے، یا عالم رہے — تو ہے جب تک ساتھ تیرے دم رہے

مطبوعہ میں دوسرا مصرع ہے:

تو ہے جب تک ساتھ تیرے ہم رہے

۹: ورق ۱۶۶ الف کے حاشیے میں ایک غزل ہے اس کا مطلع ہے:

کیسے شب وصل آئے مرے شام وسحر ساتھ — گھڑیالیوں نے دونوں بجائے ہیں گجر ساتھ

مطبوعہ میں مطلع اس طرح ہے:

کیسے شب وصل آئے نظر شام وسحر ساتھ — گھڑیالیوں نے دو دو بجائے ہیں گجر ساتھ

ایک اور شعر ہے:

مُنہ آئینے میں اس نے جو دیکھا تو میں بولا — کیا حُسن ہے؟ طالع جو ہوئے شمس و قمر ساتھ

مطبوعہ میں بجائے "میں بولا" کے "وہ بولا" ہے

ایک اور شعر ہے:

وہ سرو جو ہوتا ہے خراماں روشوں پر — سائے کی طرح پھرتے ہیں گلشن میں شجر ساتھ

مطبوعہ میں "گلشن کے شجر" ہے۔

اس نسخہ کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے، تو اور بھی بحث کے گوشے نکلیں گے، جو ناسخ اور کلام ناسخ کے سلسلے میں دلچسپ اور مفید نتائج کے حامل ہوں گے۔

سودا کے شہر آشوب

ڈاکٹر خلیق انجم

شہر آشوب کی تعریف کرنا بہت مشکل ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے کسی عہد میں کوئی پابندی نہیں رہی۔ رباعی، مخمس، مثنوی، اور مسدس وغیرہ میں شہر آشوب ملتے ہیں۔ لیکن مواد کے اعتبار سے ہم شہر آشوب کا تعین کر سکتے ہیں۔ شمالی ہند کے ابتدائی شاعروں نے جو شہر آشوب لکھے ہیں ان میں مختلف طبقات کی اقتصادی بدحالی کا بیان ہے۔ کسی سیاسی حادثے کا ذکر کیا گیا ہے یا ماضی کی خوش حالی، عیش و عشرت، مالی آسودگی اور ذہنی سکون کا ماتم کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ شہر آشوب کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "دراصل کسی نظم کا شہر آشوب کی صنف میں شامل ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ اس میں چند بنیادی اوصاف اور شرائط موجود ہوں۔ اولین شرط اس نظم کی یہ ہے کہ اس میں کسی شہر (یا ملک) کے مختلف طبقوں کا تذکرہ ہو۔ علی الخصوص کاریگروں اور پیشہ وروں کا ذکر۔ دوسری صفت اس نظم کی یہ ہے کہ اس میں اقتصادی اختلال یا کسی حادثے کی وجہ سے سیاسی اور مجلسی پریشانی کا ذکر ہو۔ ابتدائی زمانے کے شہر آشوبوں پر پہلی صفت غالب تھی مگر بعد میں دوسری صفت بھی شہر آشوب کے ساتھ لازم سی ہو گئی۔"(۱)

ڈاکٹر صاحب کی بیان کی ہوئی یہ تعریف جامع نہیں ہے۔ کیونکہ ۱۸۵۷ء کے بعد بہت سے شہر آشوب ایسے لکھے ہیں۔ جن میں سیاسی اور مجلسی پریشانی کی بجائے خود حادثے کا بیان کیا گیا ہے۔ پھر سودا کا قصیدہ تضحیک روزگار اگرچہ ایک گھوڑے کی ہجو ہے لیکن اسے شہر آشوب سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہی حال فولاد خاں کی ہجو کا ہے۔

میرے خیال سے شہر آشوب کی تعریف یہ ہو گی کہ وہ نظم جس میں کسی سیاسی حادثے کی تفصیل بیان کی جائے یا اقتصادی بدحالی کا ذکر کیا جائے۔ یا سیاسی ابتری اور ضبط و نظم کے فقدان کا ماتم کیا جائے یا اس زمانے کا ماتم کیا جائے جب خوشحالی تھی ہر طبقے کی مالی حالت اچھی تھی۔ ہر طرف خوشی و انبساط کے ترانے گونجتے تھے۔ زندگی عیش و عشرت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ملک کے انتظام میں ضبط و نظم تھا۔ شرفا اور کمزوروں پر زیست بھاری نہیں تھی اور ذہن فکر و غم دوراں سے آزاد تھے۔ ابتدائی عہد کے شہر آشوبوں میں اقتصادی بدحالی کا ذکر پیش نظر رکھا گیا ہے۔ لیکن بعد میں یہ قید بھی نہیں رہی۔ بلکہ اسی زمانے میں بھی شہر آشوب ایسے لکھے گئے جو اس قید سے آزاد تھے۔

سودا کے معاصرین میں شاہ حاتم، شاکر ناجی، میر خاں کمترین، میر تقی میر، قیام الدین قائم، رنگین اور لچھمی نراین شفیق وغیرہ نے شہر آشوب کہے۔ سودا کی چار نظمیں شہر آشوب کی تعریف پر پوری اترتی ہیں۔ (۱) قصیدہ شہر آشوب (۲) مخمس شہر آشوب (۳) قصیدہ تضحیک روزگار (۴) مثنوی در ہجو شیدی فولاد خاں کوتوال شاہجہاں آباد۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغل حکومت میں جو زوال آیا تھا۔ جس نے عوام کی زندگی دوبھر کر دیا تھا یہ شہر آشوب ان حالات کی مکمل تصویریں ہیں۔ پہلے شہر آشوب میں سودا نے مختلف پیشہ وروں اور امرا و رؤسا کی اقتصادی بدحالی کی عکاسی کی ہے۔ بقول سودا کوئی پیشہ ایسا نہیں ہے جس میں آمدنی کی صورت ہو۔ سپاہ گری معزز ترین پیشوں میں سے ایک ہے۔ مگر اس عہد میں اس پیشے کا بہت برا حال تھا۔ اگر سپاہی گھوڑا لے کر کسی کا ملازم بھی ہو جائے تو گھوڑے کے کھانے کے لیے کہاں سے لائے

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی ۔۔۔ تنخواہ کا پھر عالم بالا پہ نشاں ہے

گذرے ہے سدا یوں علف و دانہ کی خاطر ۔۔۔ شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیے کے یاں ہے

---

(۱) بحث و نظر ص/ ۲۸ - ۲۹

امرا کی خود مالی حالت خراب ہے۔ وہ تنخواہ دیں تو کیسے؟ لیکن جن ملازمین کے جسم میں جان ہے وہ دھونس دیتے ہیں۔ آقا کی بے عزتی کرتے ہیں اور مختلف حربے استعمال کرکے اپنی تنخواہ وصول کر لیتے ہیں۔ لیکن کمزور بے چاروں کی کوئی نہیں سنتا۔ اگر انسان کسی کی مصاحبت کرے تو اور مصیبت ہے۔ وہ امیر اگر رات بھر جاگے تو مصاحب کو بھی جاگنا پڑتا ہے۔ نیند کے مارے بُرا حال ہے۔ مگر اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتے۔ طبابت کے پیشے میں کچھ اور پریشانیاں ہیں۔ نواب جو چاہتا ہے کھا لیتا ہے۔ پیٹ میں تکلیف ہونے پر طبیب مورد الزام ہوتا ہے۔ اگر نواب کو چھینک آجائے تو اس کی ذمہ داری بھی طبیب ہی پر عائد ہوتی ہے۔ گویا ان امرا کے طبیب علاج کرنے والے نہیں بلکہ موت سے لڑنے والے سپاہی ہیں۔ انسان اگر سوداگری کرنا چاہے تو یہ بھی ممکن نہیں۔ کیونکہ

سوداگری کیجے تو ہے اس میں یہ مشقت
دکن میں بکے وہ جو خرید صفاہاں ہے
ہر صبح یہ خطرہ ہے کہ طے کیجیے منزل
ہر شام یہ دل وسوسۂ سود و زیاں ہے
لے جا جو کسی عمدہ کی سرکار میں دے جنس
یہ درد جو سنیے تو عجب طرز بیاں ہے
قیمت جو چکاتے ہیں سو اس طرح کہ ثالث
سمجھے ہے فروشندہ یہ دزدی کا گماں ہے

غرض بڑی مشکل سے سودا طے ہوتا ہے امیر ایک پروانہ عامل کے نام لکھ کر دے دیتا ہے مگر ان کے خزانے میں پیسے ہی کہاں؟ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چیز واپس ملتی ہے اور نہ پیسہ۔ اگر کھیتی باڑی شروع کی جائے تو ہر وقت بارش نہ ہونے کا ڈر اور قرقی کا خوف کھائے جاتا ہے۔ مختلف پیشوں کی تباہی کے ذکر کے بعد سودا شاعروں کا حال بیان کرتے ہیں

شاعر جو سنے جاتے ہیں مستغنی الاحوال	دیکھے جو کوئی فکر و تردد کو تو یاں ہے
مشتاق ملاقات انھوں کا کس و ناکس	ملنا انھیں ان سے جو فلاں ابن فلاں ہے
گر عید کا مسجد میں پڑھے جا کے دوگانہ	نیت قطعۂ تہنیت خان زماں ہے
تاریخ تولد کی رہے آٹھ پہر فکر	گر دم میں بیگم کے سنے نطفہ خالہ ہے
اسقاط حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا	پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے

شہر آشوب کے آخر میں سودا کہتے ہیں کہ انسان اگر بالفرض ہفت ہزاری بھی ہو جائے تو ذہنی آسودگی اور سکون ممکن نہیں۔ بلکہ دنیا ہی کیا عقبیٰ میں بھی آسودگی نہیں مل سکتی

بالفرض اگر آپ ہوئے ہفت ہزاری
یہ شکل بھی سمجھو تو راحت جاں ہے
ٹک دیکھنا منصور علی خاں جی کا احوال
چھاتی پر کڑک بجلی ہے اور سیر دہا ہے
آرام سے کٹنے کا سنا تو نے کچھ احوال
جمعیت خاطر کوئی صورت ہو کہاں ہے
دنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام

عقبیٰ میں یہ کہتا ہے کوئی اس کا نشاں ہے

سو اس پہ تیقن کسی کے دل کو نہیں ہے

یہ بات بھی گوئندہ ہی کا محض گماں ہے

یاں فکر معیشت ہے تو واں دغدغۂ حشر

آسودگی حرفیست نہ یاں ہے نہ وہاں ہے

دوسرے شہر آشوب میں سودا نے مغل حکومت، اس کے بادشاہ، شہزادے، امرار و رؤسا کی زبوں حالی کا مرثیہ کہا ہے۔ ان کے سیاسی اقتدار کے کھو جانے کا جھوٹی عزت و وقار اور اقتصادی بدحالی کا ماتم کیا ہے۔ سودا زندگی بھر جاگیردار طبقے سے متوسل رہے اس لیے ان کی ہمدردیاں سماج کے اس طبقے کے ساتھ ہیں۔ انھیں اس طبقے کی بربادی کا بہت صدمہ ہے۔ انھوں نے مختلف افراد و اشیار کا مضحکہ اڑایا ہے۔ اور اپنے طنز کے تیز نشتر ایک ایک ناسور پر چلائے ہیں۔ سودا خود کو اس طبقے کا ایک فرد سمجھتے ہیں اس لیے یہ ناسور خود ان کی زندگی کے ناسور ہیں۔

مخمس کے پہلے بند میں سودا بے روزگاری کی شکایت کرتے ہیں اگر انسان گھوڑا خرید بھی لے تو ملازمت کس کی کرے۔ نوکری ڈھیر یوں یا تول تو بکتی نہیں۔ جو بازار جا کر خرید لی جائے۔ پہلے امیر دولت مند نوکر رکھتے تھے اب جاگیر سے ان کی آمد بند ہو چکی ہے۔ مدتوں سے ملک میں سرکشوں کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ پہلے جو ایک شخص بائیس صوبوں کا خاوند تھا، اب وہ کول (علی گڈھ) کا فوجدار بھی نہیں رہا۔ کئی بند میں سودا نے جاگیرداروں کی بدحالی کا نقشہ کھینچا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ طبقہ جو صاحب حل و عقد تھا۔ جس کے دم سے ملک کی سیاست چلتی تھی۔ سیاست سے بیزار ہو گیا اور بقول سودا۔

جو کوئی ملنے کو ان کے گھر آیا

ملے یہ اس سے گر اپنا دماغ خوش پایا

جو ذکر سلطنت اس میں وہ درمیاں لایا

انھوں نے پھر کے دہر سے منہ یہ فرمایا

خدا کے واسطے بھائی کچھ اور باتیں بول

مغل زوال کا اثر فوج پر براہ راست پڑا تھا۔ وہ سپاہی جن کے کارنامے سنہرے لفظوں سے لکھے گئے تھے اب تلوار بھی اٹھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ سودا نے سپاہیوں کی بزدلی کو ذرا مبالغے کے ساتھ پیش کیا ہے۔

پڑے جو کام انہیں تب نکل کے کھائی سے

رکھیں وہ فوج جو منہ تے بھری لڑائی سے

پیادے ہیں سو ڈریں سر منڈانے نائی سے

سوار گر پڑیں سوتے میں چارپائی سے

کرے جو خواب میں گھوڑا کسی کے نیچے الول

مغل خزانہ خالی پڑا تھا۔ تمام صوبے خود مختار ہو چکے تھے۔ خالصہ بہت مختصر تھا۔ اور جو تھا اس سے آمدنی بالکل نہیں تھی۔

نہ صرف خاص میں آمد نہ خالصہ جاری   سپاہی تا منصدی سبھوں کو بے کاری

اب آگے دفتر تن کی میں کیا لکھوں خواری   سوال دستخطی کو پھاڑ کر کے پنساری

کسی کو آتو لہ دے باندھ کر کسی کو کنول

شہزادے قلعہ معلّےٰ میں فاقوں مر رہے تھے لیکن کوئی ان کی چیخ و پکار سننے والا نہ تھا۔ قلعہ کا خزانہ خالی تھا۔ قیمتی اشیاء نادر شاہ اور ابدالی کی نذر ہو چکی تھیں۔ اور مغل شہنشاہ کے پاس اتنا پیسہ نہیں تھا کہ شہزادوں کو صرف ایک وقت بھی کھانا کھلا سکتا۔

مچا رکھی ہے سلاطینوں نے یہ تو بہ دہاڑ
کوئی تو گھر سے نکل آئے ہیں گریباں پھاڑ
کوئی در اپنے پہ آ دے دے مارتا ہے کواڑ
کوئی کہے جو ہم لیے میں چھاتی ہے گی پہاڑ
تو چاہتے ہیں کہ ہمیں سب کو زہر دیجے گھول

دہلی جو عالم میں انتخاب شہر تھا۔ اُجڑا پڑا تھا۔ جہاں کبھی عیش و عشرت کی محفلیں جمتی تھیں اب وہاں گیدڑ کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ جس کی شہر کی حسین و خوبصورت عمارتوں پر جنت کو بھی رشک آتا تھا۔　جہاں ایک ایک گھر چمن اور سبزہ زار تھا آج وہاں گھر گھر گھاس ہے عمارتیں شکستہ پڑی ہیں۔ کہیں کسی مکان کا ستون نظر آتا ہے۔ کہیں مرغول۔ جس شہر کے چراغاں کو دیکھ کر آسمان کے مہ و انجم حسد سے جلے مرتے تھے آج وہاں کی تاریکی میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔

سخن جو شہر کی ویرانی سے کروں آغاز
تو اس کو سن کے کریں ہوش چغد پرواز
نہیں وہ گھر نہ ہو جس میں شغال کی آواز
کوئی جو شام کو مسجد میں جائے بہر نماز
تو واں چراغ نہیں بجز چراغ غول

خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس
کہ جس کے دیکھے سے جاتی رہی تھی بھوک اور پیاس
اور اب جو دیکھو تو دل ہووے زندگی سے اداس
بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس
کہیں ستون پڑا ہے کہیں پڑے مرغول

یہ باغ کھا گئی کس کی نظر نہیں معلوم
نجانے کن نے دکھایا یاں قدم وہ کون تھا شوم
جہاں تھے سرو صنوبر وہاں اُگے ہیں زقوم
مچے ہے زاغ و زغن سے اب اس چمن میں دھوم
گلوں کے ساتھ جہاں بلبلیں کریں تھیں کلول

یہ حالات تھے جن سے تنگ آ کر فن کار اور اہل ہنر نے ترک وطن کیا۔

غرض مآل ہے اس گفتگو سے یہ میرا
کہ بے زری نے جب ایسا گھر آن کر گھیرا
تو کوئی قصد کرے نوکری کا بہتیرا
نہیں یہ فائدہ کچھ تا وہ چھوڑ کر ڈیرا　　کرے نہ عزم سوئے اصفہان و استنبول

گھوڑا دراصل فوجی نشان ہے۔ کیونکہ اس عہد میں فوج و شکست و فتح کا بہت زیادہ دارومدار گھوڑے پر تھا۔ آنوری نے فارسی میں گھوڑے کی ہجو کہی ہے۔ یہ ہجو گھوڑے کی نہیں بلکہ مغل حکومت کے فوجی نظام کی ہے جو افسانوی انداز میں کہی گئی ہے۔ سودا کے ایک دوست تھے جو سو روپے کے ملازم تھے۔ چونکہ ایماندار تھے اس لیے اوپر کی آمدنی نہیں تھی۔ ان کے پاس ایک گھوڑا تھا۔ چونکہ گھوڑے کو دانہ اور گھاس نہیں ملتی تھی سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔

ناطاقتی کا اس کے کہاں تک کروں بیاں
فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کروں شمار
مانند نقش نعل زمیں سے بجز فنا
ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار
اس مرتبہ کو بھوک سے پہونچا ہے اس کا حال
کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گذار
قصاب پوچھتا ہے مجھے کب کرو گے یاد
امیدوار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یوں چمار
ہے پیر اس قدر کہ جو بتلائے اس کا سن
پہلے وہ ریگ بیاباں کرے شمار
لیکن مجھے زروئے تواریخ یاد ہے
شیطاں اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار
ایک دن گیا تھا مانگنے پہ گھوڑا برات میں
دولھا جو بیاہنے کو چلا اس پہ ہو سوار
سبزہ سے تھا سیاہ وسمہ سے ہوا سفید
تھا سرو سا جو قد سو ہوا شاخ باردار
پہنچا غرض عروس کے گھر تک وہ نوجواں
شیخوخیت کے درجے سے کر اس طرف گذار

سودا نے چالیس اشعار میں طرح طرح سے گھوڑے کی حالت بیان کی ہے۔ اور اس کی کمزوری اور لاغری کا مضحکہ اڑایا ہے۔ اس تعریف کے بعد قصہ شروع ہوتا ہے۔ ایک دن نقیب نے سودا سے آکر کہا۔ مرہٹے دہلی تک آ پہنچے اور تم ابھی آرام سے بیٹھے ہو۔ سودا کو بہت شرم آئی انھوں نے فوراً میدان کارزار کی تیاری کی تمام ہتھیار سے لیس ہوئے اور اسی گھوڑے پر جا بیٹھے۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ یہاں اس کے بیان کرنے میں سودا نے کمال دکھایا ہے۔ وہ صرف اپنے زور تخیل سے ایک واقعہ پیدا کرتے ہیں اور بہت ہی ظریفانہ انداز میں اس واقعے کی تفصیلات سناتے ہیں۔ اس ظرافت میں طنز کے نشتر چھپے ہوئے ہیں جو ہمارے ناسوروں پر کام کرتے ہیں۔ سودا نے گھوڑے کے پردے میں اس فوج کا مذاق اڑایا ہے جو دہلی کو حملہ آوروں کے ہاتھوں لٹتے دیکھتی رہی اور کچھ نہ کر سکی نادر شاہ، ابدالی، روہیلے جاٹ اور سکھ دہلی کو لوٹ رہے تھے۔ قتل و غارت گری کر رہے تھے۔ تمام مال و دولت جمع کر کے اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔ مگر مغل فوج بے بس اور لاچار بنی سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتی رہی اور کچھ نہ کر سکی۔ سودا نے اس قصیدہ کا نام تضحیک روزگار رکھا ہے۔

سودا نے جب قصیدہ کہا سن یہ ماجرا   ہے نام اس قصیدہ کا تضحیک روزگار

اب سودا کے میدان جنگ میں جانے کا قصہ سُنیئے:۔

ناچار ہو کے تب تو بندھایا میں اوس پہ زیں
ہتھیار باندھ کر میں ہوا جا کے پھر سوار
جس شکل سے سوار تھا اس دن میں کیا لکھوں
دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار
چابک تھے دونوں ہاتھ میں پکڑے تھا منہ میں باگ
تک تک سے پاشنے تھے مرے پاؤں سے فگار
آگے سے توبڑا اُسے دکھلائے تھا سئیس
پیچھے نقیب بلنکے تھا لاٹھی سے مار مار
اس مضحکہ کو دیکھ ہوئے جمع خاص و عام
اکثر مدبروں میں سے کہتے تھے یوں پکار
پہیے اسے لگا دو کہ تا ہووے یہ رواں
یا بادبان باندھو پون کے دو اختیار
کہتا تھا کوئی مجھ سے ہوا تجھ سے کیا گناہ
کتوال نے گدھے پہ تجھے کیوں کیا سوار

بہرحال خدا خدا کر کے میدان جنگ پہنچے، وہاں جو حال ہوا وہ بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

یہ کہتے میں خدا سے ہوا مستعد جنگ
اتنے میں مرد بھی ہوا مجھ سے آ دو چار
گھوڑا تھا اپنا لاغر و لیت و ضعیف و تنگ
کرتا تھا یوں خفیف مجھے وقت کارزار
جاتا تھا جب ڈپٹ کے میں اپنے حریف کو
دوڑ دو تھا اپنے پاؤں پہ جوں طفل نے سوار
جب دیکھا میں کہ جنگ کی یاں ہے مجھے نہ کل
لے برچھیوں کو ہاتھ میں گھوڑا بغل میں مار
دھر دھمکا وہاں سے پڑتا ہوا شہر کی طرف
القصہ گھر میں آن کے میں نے کیا قرار

اس سلسلے کی چوتھی ہجو شیدی فولاد خاں کوتوال شاہجہاں آباد کی ہے جس میں سودا نے دہلی کی بدانتظامیوں کا مذاق اڑایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان بدانتظامیوں کا ذمہ دار فولاد خاں ہے جو چور اچکوں سے ملا ہوا ہے۔

فولاد خاں[1] اور اس کے دو لڑکے ڈاکہ زنی میں خود حصہ لیتے تھے۔ جس شہر کے کوتوال کا یہ حال ہو تو اس کا خدا ہی حافظ ہے۔ یہ بد انتظامی اور کوتوال کی دیدہ دلیری مغل بادشاہ کی کمزوری اور لاچاری کی وجہ سے تھی۔ سودا نے حسب عادت ان واقعات کو مبالغہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ہجو کی ابتدا میں سودا ان دنوں کو یاد کرتے ہیں۔ جب شہر میں نظم و نسق تھا۔ لیموں کے چور کا بھی ہاتھ کاٹا جاتا تھا۔ جب کوتوال کو رشوت سے کوئی سرکا

[1] حاشیہ صفحہ آئندہ پر

نہ تھا۔ اس سبب شہر میں چوراچکے نہیں ہوتے تھے۔ اور اب تو یہ حال ہے۔

دیکھی جو ہم نے راہ جا ڈری کی
ہے رہزنی تلا ذڑی کی

فولاد خاں جب سے کوتوال ہوا ہے امن و امان مفقود ہو گیا ہے۔

کس طرح شہر کا نہ ہو یہ حال
شیدی فولاد اب جو ہے کوتوال
چور کب اس کا ڈر مانتے ہے
کالا پال اپنا اس کو جانتے ہے
ان سے رشوت لیے بیٹھا ہے
اس کے دل میں یہ چور بیٹھا ہے
بعضوں کا سقد ہوں کے ڈر رہے یہ
پر کہا بھائی گھٹ پور ہے یہ

شہر کے تمام چور فولاد خاں سے ملے ہوئے ہیں اور صبح کو تمام چور اس کا حصہ بھیج دیتے ہیں۔ شہر میں ہر طرف خوف و ہراس ہے۔ لوگوں نے رات کو سونا بند کر دیا ہے۔ محفل عیش و طرب ہو کر میخانہ۔ عبادت گاہ ہو یا بزم ہاؤ ہو ہر جگہ لوگ ہوشیار بیٹھے رہتے ہیں۔

بزم میں شب ہر ایک پیر و جواں
بیٹھے ہیں کر کے رزم کا ساماں

---

(۱)۔ فولاد خاں دہلی کا کوتوال تھا۔ ۴ ربیع الثانی کو فولاد خاں کسی سبب سے گرفتار کیا گیا۔ اور وزیر الممالک (عماد الملک) کے دیوان خانہ میں محبوس ہوا۔ کوتوالی اس کی جگہ سیدی بلال کو ملی۔ اسی ماہ کی ساتویں کو تشدد بسیار کے بعد بند زنداں سے نجات پائی۔ اور پچاس ہزار روپے بطور مال امان مقرر ہوئے لیکن "موکلان وزیر الممالک" کی کشاکش سے نہ چھوٹا تھا کہ تیرھویں شعبان کو راہیٔ عدم ہوا۔ فولاد خاں نے ۱۱۰ سال کی عمر پائی لیکن دیکھنے میں پچاس ساٹھ سال سے زیادہ کا نظر نہ آتا تھا۔ سلک دنداں باہم چناں منظم بود کہ اصلا احتیاج بہ خلال نیفتاد۔ روشنیٔ چشم بدستور خواب و خورش بے فتور و قوت رجولیت برقرار نشستن با مہ جبینان و خواستہ ستوار بود ، ایں خوارق روزگار است (خان مذکور حبش کا رہنے والا تھا اس نے سات بار حج کیا) چندے بامر تجارت اشتغال ورزیدہ پس از آنکہ وارد ہندوستان شدہ۔ در سلک ملازمان ..... محمد شاہ ..... منظم گشتہ پیوستہ بہ خاہ و فراغت اوقات بسری برد۔ مدت سی و چار سال بخدمت کوتوالی رکاب سعادت قیام ورزیدہ۔ نظم و نسق شائستہ پدید آورد۔ تاریخ شاہ عالم گیر ثانی (مصنف نامعلوم۔ قلمی) بحوالہ معاصر حصہ ۲ صفحہ/ ۱۱۶۔

قاضی عبدالودود نے ایک قلمی تاریخ سے فولاد خاں کا حال نقل کیا ہے۔ یہ تاریخ مجہول الاسم ہے۔ "دریں ولا حاجی فولاد خاں بگفت کسے بطور خود زاہد بیگ و صابع بیگ مغلاں را کہ سرخیل ڈاکہ اندازاں بودند قابو دیدہ دستگیر کردہ آوردہ در چبوترہ بہ حبس سخت محبوس نمودہ۔ حکم بادشاہ حاصل نمودہ ، گشت۔ چوں وقت شبے می گذرد در قفلے او بہ روز وزیر الممالک عرض کردند کہ دریں شہر مگر ہمیں دو کس ڈاکہ اندازی می کردند دیگرے نیست...... فولاد خاں خود ڈاکہ ہا می زند۔ و سپرد و پسر آتش آنچہ احوال غارت بدت از ڈاکہ اندازی و زر افشاری و غیرہ دارند در ہمہ عالم ظاہر است ازیں معنی وزیر الممالک مردم خود بکثرت نزد فولاد خاں فرستادہ کہ بیارند۔ سوم ربیع الاول بکہ پاس گذشتہ بذلت تمام پیادہ پا بدستور گنہگاراں کشیدہ بردند۔ اس کا بڑا بیٹا رفیق اللہ خاں بھی گرفتار ہوا۔ مگر چھوٹا اس طرح بھاگا کہ بالکل پتہ نہ چلا کہ کہاں گیا۔ معاصر حصہ ۲ صفحہ/ ۱۱۷

شام سے صبح تک یہی ہے شور
دوڑیو گٹھری لے چلا ہے چور
بے خطر اس سے اب کوئی نہ رہا
اہل میخانہ بھی کھلے ہیں ہوا
نہ عبادت کو جاگتے ہیں شیخ
ذر یہی چور آنہ مار لے میخ

لطف یہ ہے کہ ان چوروں نے خود فولادخاں کا بھی یہی حال کر رکھا ہے۔

خلق جب دیکھ کر کے یہ بیداد
کرتے ہیں کوتوال سے فریاد
بولے ہے وہ کہ میں بھی ہوں ناچار
گرم ہے چوٹٹوں کا اب بازار
کرتے ہیں مجھ سے اب بجا کر ڈھول
میری پگڑی کا میرے سر پہ مول

پلیگ

تصنیف:- البیر کامو

ترجمہ و تلخیص:- سید محمود رضوی

الجیریا کے ساحل پر اوران نام کا ایک چھوٹا سا بندرگاہ ہے۔ اوران کی اس سرزمین پر باغات نہیں ہیں، پھول نہیں ہیں، درخت اور ہریالی نہیں ہے۔ موسم کی تبدیلی کا احساس کسی کو نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ آسمان کی لامحدود وسعتوں میں ہی ختم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بہار کے آنے کا پتہ اس شہر میں صرف ان پھولوں سے چلتا ہے جو آس پاس کے مضافات سے فروخت کرنے کے لیے لائے جاتے ہیں۔ موسم گرما میں آفتاب کی شدید تمازت ہر شے کو جھلس کر رکھ دیتی ہے۔ اور شہر کے در و دیوار تپ کر رہ جاتے ہیں۔ خزاں میں ہر جانب طوفان اور آگ کے بگولے اٹھتے رہتے ہیں۔ مکانوں، دیواروں اور سڑکوں پر بھوری اور باریک دھول کی تہیں کی تہیں جم جاتی ہیں لیکن موسم سرما کے دوران ضرور اس گرمی اور حدت سے کچھ پناہ سی مل جاتی ہے۔

اوران کے لوگ ایک گہری اکتاہٹ کا شکار ہیں۔ اور اس سے فرار پانے کے لیے وہ نئے نئے عیش و نشاط کے سامان کی تلاش میں رہتے ہیں۔ دولت پیدا کرنے کا عام رجحان غالباً اس اکتا جانے یا پھر اس سے نجات حاصل کرنے کا نتیجہ ہے۔ تمام دن کسی نہ کسی طرح وہ زیادہ سے زیادہ دولت مند بننے میں صرف کرتے ہیں۔ اور رات کی تاریکی میں ان کی شدید آرزوئیں کسی غیر معروف اور انجانے رشوری جذبے سے مخمور ہو جاتی ہیں۔ یہاں کے نوجوانوں کی تفریحات بھی دنیا کے دوسرے عام نوجوانوں کی طرح فطری طور پر تیز اور مختصر ہوتی ہیں۔ اور طویل عمر کے لوگوں کے فرصت کے اوقات کلبوں اور دعوتوں میں صرف ہوتے ہیں۔ تاش کے پتوں پر سینکڑوں ہزاروں کی بازی لگانا ان کی زندگی کا سب سے زیادہ ہمت کا کام ہوتا ہے۔ اوران کے لوگ ایک دوسرے سے محبت اور ہمدردی کا جذبہ محض اس وجہ سے رکھتے ہیں کیونکہ ان کے پاس وقت کم ہے اور سوچنے کی فرصت نہیں۔

اسی لیے ۱۹۴۰ء میں اوران پر جو خطرناک اور بھیانک تباہی آئی اس کے بارے میں وہاں کے باشندوں کو تعجب ہی ہوا۔ دراصل ان کی سادی اور یکرنگی سے بسر ہونے والی زندگی میں اس تباہی اور وبا کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی اور یکایک جب وہ حادثہ ظہور پذیر ہوا تو وہ لوگ یقیناً اس کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔

۱۶ اپریل کو صبح کو ڈاکٹر ریو جب اپنے دواخانے سے نکل رہے تھے تو ان کو ایسا محسوس ہوا کہ کوئی ملائم سی چیز ان کے پیر کے نیچے دب گئی ہے۔ ایک مرا ہوا چوہا تھا، جو سیڑھی کے بالکل بیچ میں تھا۔ ڈاکٹر ریو نے اس بات کا کوئی خیال نہیں کیا۔ اور اسے جوتے سے ہٹا کر وہ نیچے اترنے لگے۔ باہر نکلتے وقت جب انھوں نے دربان مائیکل کو دیکھا تو مرے ہوئے چوہے کا دھیان پھر آیا۔ آخر سیڑھی پر اس کے اس طرح پڑے ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔۔۔؟؟ پر اعتماد لہجہ میں مائیکل نے کہا کہ مکان میں چوہوں کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ اور یہ یقیناً آس پاس کے شیطان لڑکوں کی حرکت ہے۔ مائیکل ( ) سے چوہا ہٹا دینے کے لیے کہتے ہوئے ڈاکٹر ریو چلے گئے۔

اسی شام کا واقعہ ہے: ڈاکٹر ریو (Dr. Reo) اپنے مکان کے دروازے پر کھڑے کواڑ کھول رہے تھے، انھوں نے دیکھا کہ سامنے تاریکی میں سے نکل کر ایک بڑا سا چوہا ان کی جانب آ رہا ہے۔ چوہے کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ اور اس کی گہری بھورے رنگ کی کھال بھیگی بھیگی سی لگ رہی تھی۔ یکایک وہ رک گیا جیسے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر وہ تھوڑا سا بڑھا، دوبارہ رکا اور پھر "چیں"

ایک ہلکی آواز کے ساتھ ڈھیر ہو گیا۔ اس کا منہ کھل گیا تھا اور اس میں سے خون کی پتلی دھار بہہ رہی تھی۔ ڈاکٹر ریو متعجب ہو کر ایک لمحہ اس طرف دیکھتے رہے اور پھر اوپر چلے گئے۔

مرے ہوئے چوہے کے منہ سے بہتی خون کی دھار نے اس خیال کو پھر تازہ کر دیا۔ جو آج تمام دن ڈاکٹر کے دل پر بار بنا رہا تھا۔ ریو کمرے میں داخل ہوئے تو مریض بیوی کی مسکراہٹ نے خیر مقدم کیا۔ مسز ریو سال بھر سے بیمار تھیں۔

"آپ جانتے ہیں بہت اچھی رہی میری طبیعت آج دن بھر" وہ بولیں۔ اس کے چہرے پر طویل بیماری کی نشانیاں اپنا سایہ کیے ہوئے تھیں پھر بھی ڈاکٹر نے سوچا کتنی فطری جوانی اور کس قدر تازگی ہے اس چہرے پر۔ شاید مسکراہٹ نے اس لمحہ مرض کے دردناک پن کو مکمل طور پر ہٹا دیا تھا۔

"اب سو جاؤ نرس کل گیارہ بجے آ رہی ہے۔ اور تمہیں دوپہر بارہ بجے کی گاڑی سے جانا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

مسز ریو تندرست ہونے کے لیے اوران سے باہر ایک سینی ٹوریم میں جانے والی تھیں۔

بیوی کی ٹھنڈی پسینے سے تر پیشانی پر ایک نازک سا بوسہ دے کر ریو کمرے سے باہر چلے گئے۔

دوسرے روز صبح جب ڈاکٹر ریو نکل رہے تھے تو مائیکل نے انہیں روک لیا۔ اور کہا "میں نے کہا تھا نا صاحب۔ ان نالائق لڑکوں نے تین مرے ہوئے چوہے ہال میں بھی ڈال دیے تھے۔ شاید انہیں بہت زور سے کچلا گیا ہے وہاں سے پکڑا ہو گا کیونکہ ان کے جسم سے بے تحاشہ خون نکل رہا تھا۔" ریو مائیکل کی بات سن کر چلے گئے لیکن مائیکل کا شبہ ان پر اثر انداز نہیں ہو سکا۔

مائیکل نے دن بھر مکان کی سخت نگرانی کی لیکن بے کار۔ پتہ نہیں کس کی حرکت تھی کہ مرے ہوئے چوہے مکان میں پھر بھی پائے گئے اور چور کا کہیں پتہ نہیں چل سکا۔

"لیکن میں بھی ان بدمعاشوں کو پکڑ کر ہی دم لوں گا۔ آخر بچ کر کہاں جائیں گے۔" مائیکل نے پھر اسی خود اعتمادی کے ساتھ ڈاکٹر کے سامنے دعوےٰ کیا۔

ڈاکٹر ریو مریضوں کو دیکھنے کے لیے ان کے گھر جا رہے تھے۔ کار ہلکی رفتار سے چل رہی تھی ریو نے دیکھا سڑک کے کنارے پڑے کرکٹ کے ڈھیر کے پاس مرے ہوئے چوہے پڑے ہیں۔ نہ جانے کن شدید بدمعاش لڑکوں کی کرتوت تھے۔ ایک ہی گلی میں ڈاکٹر نے بارہ چوہے گنے۔

ریو کا پہلا مریض ۔۔۔ کا ایک پرانا مریض تھا ایک بوڑھا اسپینی۔ اتنی طویل بیماری کے باوجود چہرے پر ایک مردانہ سختی تھی۔ اس کے پاس ہی دو برتن رکھے ہوئے تھے۔ جن میں سوکھی مٹر تھی۔ جب ڈاکٹر ریو کمرے میں داخل ہوئے تو مریض پلنگ پر بیٹھا ہوا تھا اور گردن دہرا موڑ کر ہانپ رہا تھا اور اکھڑی ہوئی سانس کو درست کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مریض کی بیوی پیالہ میں پانی لے آئی۔ ڈاکٹر ریو انجکشن تیار کرنے لگے دفعتاً مریض بولا "دیکھا ڈاکٹر دیکھا۔ کتنے زور شور سے نکل رہے ہیں۔ وہ۔۔۔"

"ان کا مطلب چوہوں سے ہے۔ پڑوس کے ایک شخص کو اپنی دہلیز پر تین چوہے مرے ہوئے ملے" بیوی نے بات صاف کرتے ہوئے کہا۔

ہاہاہا۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ بوڑھے مریض کے چہرے پر عجیب سی دہشت ناک چمک تھی۔ کوڑے کے ڈھیر میں درجنوں مل سکتے ہیں۔ یہ ان کی بھوک ہے جو کم بختوں کو کھینچ کھینچ کر باہر لا رہی ہے۔

مریضوں کو دیکھنے کے بعد ریو جب گھر واپس ہوئے تو انہوں نے مائیکل سے پہلا سوال چوہوں کے بارے میں کیا۔

"جی نہیں اب کوئی چوہا نہیں ہے۔ میں سخت نگرانی کر رہا ہوں۔ یہ بدمعاش چھوکرے سمجھ گئے ہیں کہ میں نے ان کی حرکت پکڑ لی ہے۔ اب وہ دوبارہ ایسا کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔"

پھر مائیکل نے ان کے نام کا ایک تار ان کو دیا۔ تار میں لکھا تھا کہ ریو کی والدہ اگلے ہفتہ آ رہی ہیں۔ بیوی کی عدم موجودگی میں وہ بیٹے کی

نگہداشت کریں گی۔

مسز ریو سفر کے لیے بالکل تیار تھیں۔ نرس بھی آ چکی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ یکایک ریو کو ایسا محسوس ہوا کہ ان کو اپنی بیوی کی دیکھ بھال اور زیادہ اچھی طرح کرنا چاہیے تھی۔ تیمارداری میں کچھ کمی رہ گئی۔ ذرا سے توقف کے بعد ڈاکٹر نے کہا: "لیکن تم جب لوٹ کر آ ؤ گی تو سب کچھ پہلے سے زیادہ اچھا ہو جائے گا۔ ہم تم پھر سے نئی اور پرسکون خوشی کی زندگی بسر کر سکیں گے۔" ان کی آواز سے آرزو، حسرت، فکر، تقاضہ سب ہی کچھ تو نمایاں تھا۔

مسز ریو خوشی سے کھل اٹھیں "ہاں .... ہاں .... بالکل نئی اور اچھی۔"

اسٹیشن سے گاڑی روانہ ہوتے وقت بیوی کی آنسوؤں سے جھلملاتی آنکھوں میں ایک ایسی پر نور چمک اور مسکراہٹ تھی جو گاڑی چلے جانے کے بعد ریو کے ذہن سے نہ ہٹ سکی۔ کبھی کبھی آنکھوں کی زبان بھی کس قدر قابل فہم ہوتی ہے۔

ریو جب واپس جانے کے لیے مڑے تو انھوں نے سامنے سے پولیس مجسٹریٹ موسیو اوتھون کو آتے دیکھا "ہلو، کیسے اسٹیشن کیسے آنا ہوا؟" ریو نے سوال کیا۔

"مادام اوتھون واپس آ رہی ہیں انہیں لینے آیا ہوں .... یہ چوہوں کا معاملہ۔" موسیو اوتھون نے کہا۔

اتنے ہی میں کسی انجن نے سیٹی دی "چوہے ...... کوئی ایسی خاص بات تو نہیں ......" اسی وقت ریلوے کا ایک نوکر مرے ہوئے چوہوں کی ایک ٹوکری اٹھائے ان کے قریب سے نکل کر گیا۔ مادام اوتھون کی گاڑی آ گئی تھی۔ ریو ان سے رخصت لیکر چلدیئے۔

اسی روز سہ پہر کو ایک فرانسیسی نوجوان ان سے ملنے دواخانہ میں آیا۔ اس کا نام ریمنڈ رابرٹ ( ) تھا۔ کپڑوں سے وہ ایک لا ابالی نوجوان معلوم ہو رہا تھا۔ اور اس کے اطوار کچھ اس قسم کے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر حالت میں اپنی حفاظت کر سکتا ہے۔ وہ پیرس کے ایک اخبار کا نمائندہ تھا اور اسی بات سے اس کے پیرو... اخبار کی کوئی تحریک کہ وہ اس شہر کے عرب لوگوں کی زندگی اور خاص طور سے ان کی صحت کے حدود پر ایک مضمون لکھے۔

ڈاکٹر ریو نے اسے بتایا کہ لوگوں کی صحت عام طور سے اچھی نہیں ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ سوال بھی کیا کہ کیا وہ اخباری نمائندہ ہونے کے ناطے اپنے مضمون میں اس بارے میں سچائی پر سے مکمل پردہ اٹھا سکے گا؟

رابرٹ نے جواب دیا "کافی حد تک۔ میرا مطلب ہے ....

تو ہم لوگوں کو پھر اس بارے میں گفتگو نہ کرنا چاہیے۔" ریو نے کہا۔

ایک لمحے کے لیے رابرٹ نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا پھر وہ بولا "میں آپ کی بات سمجھ گیا۔ چلتے ہوئے کہا: "میں نے آپ کا وقت خراب کیا۔"

ڈاکٹر ریو کے راستے پن کے باوجود بھی جدا ہوتے وقت رابرٹ کے دل میں ان کے لیے ایک احترام سا تھا۔

پانچ بجے کے قریب ریو پھر اپنے شہر میں رہنے والے مریضوں کو دیکھنے باہر نکلے۔ انہوں نے دیکھا کہ جین تارو ( ) سیڑھیوں پر کھڑا فلسفیانہ انداز میں سگریٹ پی رہا ہے۔ اور ایک زینے ہوئے چوہے کی آخری تڑپ کو بڑے غور سے دیکھ رہا ہے۔ تارو نے ڈاکٹر کی جانب دیکھ کر کہا "ہے نا تعجب کی بات۔ اتنے سارے چوہے بلوں سے نکل نکل کر باہر مر رہے ہیں۔"

"ہاں عجیب گھبراہٹ سی ہوتی ہے" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

ریو نیچے اترے تو مائیکل کو دیکھا وہ دیوار کا سہارا لیے کھڑا تھا۔ اور بہت تھکا ماندہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کا سرخ صحت مند چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

"ہاں میں جانتا ہوں۔" مائیکل نے کہا۔ جب ریو نے اسے اور بھی مرے ہوئے چوہوں کے بارے میں بتایا "ان کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ اور یہی بات دوسرے مکانوں میں بھی ہے۔" مائیکل کو ان نامعلوم لڑکوں کے سامنے ہار مان لینا ہی پڑی تھی۔ اس احساس شکست سے

مائیکل کی طبیعت کافی خراب تھی۔ حالانکہ اس وقت اس نے یہ بات نہیں مانی۔

دوسرے روز جب ریو کی والدہ آئیں تو مرے ہوئے چوہوں کی تعداد اور بڑھ گئی تھی۔ بالائی منزل سے نیچے تک چوہے ہی چوہے تھے اور آس پاس کے مکانوں اور سڑکوں پر بھی یہی حال تھا۔ مائیکل کی حالت اس روز اور بھی زیادہ خراب تھی۔

لیکن ان چوہوں کی وجہ سے اس خوشی میں کوئی فرق نہیں آسکتا جو مجھے تمہارے پاس آنے پر حاصل ہوئی ہے۔ ریو کی ماں ریو سے کہہ رہی تھیں۔

ریو نے میونسپلٹی کے محکمہ حفظان صحت کے چیرمین کو فون کیا۔ اور پوچھا کہ وہ چوہوں کے اس قدر زیادہ تعداد میں مرنے کے سلسلے میں کیا کر رہے ہیں۔؟ چیرمین بھی اس بات سے کافی فکرمند تھا۔ اس نے کہا کہ اگر حالت اور زیادہ خراب ہوئی تو وہ لوگ سخت سے سخت کارروائی کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔

اور شہر میں مرتے ہوئے چوہوں کا خوفناک سیلاب سا آگیا۔ دس سے بیس اور بیس سے سو اور سو سے ہزاروں تک بات جلد ہی پہنچ گئی۔ ایک طرف میونسپلٹی کی گاڑیاں مرے چوہے لاد کر جلانے کے لیے لے جاتیں اور دوسری جانب پھر اسی تعداد میں مرے ہوئے چوہوں کے ڈھیر لگ جاتے۔ چوتھے روز تک چوہوں کے گروہ کے گروہ باہر نکل کر ادھر ادھر مرنے لگے۔

رات کی انتہائی تاریکی میں مکانوں اور گلیوں میں سڑکوں اور راستوں پر مرتے ہوئے چوہوں کی ہلکی چیخیں گونج جاتیں۔ اور پھر ایک پرہول سناٹا چھا جاتا۔ اور ان کے منہ سے نکلا ہوا خون گندے لال پھولوں کی طرح ادھر ادھر پھیلا پڑا رہتا۔ ہر جگہ ان بھیانک ننھی ننھی لاشوں کے ڈھیر لگنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس سرزمین پر خوشحالی اور تہذیب کے ایوان کھڑے تھے اس کی کوکھ میں ازل سے سڑا ہوا مواد اب پھوٹ پھوٹ کر باہر نکل رہا ہے۔ اور اس کی روک تھام انسان کے بس کی بات نہیں۔

۲۸ اپریل کو رینڈک جرنل ایجنسی نے اعلان کیا کہ دن بھر میں آٹھ ہزار مرے ہوئے چوہے اکٹھے کیے گئے۔ لیکن دوسرے روز سے ہی اچانک چوہوں کا مرنا تیزی سے کم ہوتا شروع ہوگیا۔ اور پریشان حال شہریوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ جس روز چوہوں کے مرنے میں کمی ہوئی اسی روز ریو کو معلوم ہوا کہ مائیکل کی طبیعت کافی خراب ہوگئی ہے۔ اس کی گردن، بغل اور کمر میں درد تھا۔ اور گردن کے نیچے ایک بڑی سی گلٹی نکل آئی تھی۔ ریو دوسرے مریضوں کو دیکھنے کے لیے باہر نکل رہے تھے۔ انہوں نے مائیکل سے کہا۔

یہ ایک دل ہلا دینے والی کہانی ہے۔ جب فرانسیسی الجیریا میں اوران نام کے شہر پر دفعتاً پلیگ کی خوفناک بیماری آئی۔ دولت اور عیاشی میں ڈوبے ہوئے باشندوں کا شیرازہ اس تباہی سے منتشر ہونے لگا۔ سارا شہر درد، تکلیف، آنسوؤں اور آہوں سے بھر گیا۔ اور اس حقیقت سے ان کی روح کرب کے عالم میں تڑپنے لگی۔ آرزوئیں دفن ہوگئیں۔ لیکن ...... مجرم کوٹارڈ جیل خانے کے خوف سے یہی چاہتا رہا کہ پلیگ کبھی ختم نہ ہو۔ اور اس کے برخلاف جین تارو جو موت کے خلاف زندگی بھر جہاد کرتا رہا اور آخرکار پلیگ کے مصیبت زدہ لوگوں کی خدمت کرتا ہوا شہید ہوگیا۔ ذہن اور انسان انسانیت ڈاکٹر ریو ہے۔ جس نے پلیگ سے جنگ کی۔ اس میں وہ مفتوح ہوا لیکن پھر بھی ڈٹا رہا۔ اور ایک دن عقیدہ کے بل پر فتح حاصل کر ہی لی۔ اور اس پلیگ سے صرف اوران کے باشندوں کو ہی نہیں بلکہ ساری انسانیت کو ایک عبرت ناک سبق ملا۔

"تم فوراً گھر جاؤ اور تھرمامیٹر سے بخار دیکھتے رہو۔ میں واپس آتے وقت تمہیں دیکھوں گا۔"

ریو ہسپتال میں کام کر رہے تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میونسپلٹی کا ایک کلرک جوزف گرینڈ ( ) بات کر رہا تھا۔ ڈاکٹر اس کا علاج ایک بار پہلے کر چکے تھے۔

اس بار ایک اور شخص کے لیے آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔ میرے پڑوسی کو ایک حادثہ پیش آگیا ہے۔ اگر آپ آسکیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ جوزف نے کہا۔

"میں فوراً ہی آرہا ہوں"۔ ریو نے جواب دیا۔ انھوں نے سوچا مائیکل کو لوٹ کر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ایک تنگ بدبودار مکان کی سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے۔ گرینڈ نے آگے بڑھ کر ان کا خیر مقدم کیا۔ وہ پچاس سال کا منحنی لمبا فرد کا ایک آدمی تھا۔

پتہ چلا کہ گرینڈ کے پڑوسی کوٹارڈ (   ) نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ جو ناکام ہوگئی۔ ریو اور گرینڈ جب کمرے میں داخل ہوئے تو کوٹارڈ کی طبیعت اتنی زیادہ خراب نہیں تھی۔ صرف اس کے چہرے پر کسی اندرونی کرب کے آثار تھے۔ اور شاید اسی وجہ سے اس نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ لیکن اب وہ زندہ تھا۔ اس پر اب رنج تو نہیں تھا، ایک چڑھ سی ضرور تھی۔

کوٹارڈ کو انجکشن دے کر اور گرینڈ سے اس کی نگہداشت کرنے کے لیے کہہ کر ریو چلے گئے۔

گرینڈ نے بڑے جوش سے کہا ہاں..... ہاں ضرور آخر ہمارے پڑوسیوں کی خدمت کرنا ہی تو ہمارا فرض ہے"۔ اس وقت ریو نے اس کے سنتے ہوئے چہرے پر ایک عجیب قسم کی چمک دیکھی۔

لوٹتے وقت ریو مائیکل کو دیکھنے کے لیے رکے۔ مائیکل درد سے تڑپ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سوج گئیں تھیں اور پیاس بہت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ مائیکل کی بیوی کو ضروری ہدایات بتا کر چلے گئے۔

اپنے ایک ساتھی ڈاکٹر سے انھوں نے ٹیلیفون پر پوچھا کہ اس طرح کے بخار کا کوئی کیس ان کے پاس کبھی آیا یا نہیں۔ ڈاکٹر نے جواب دیا "نہیں" پھر جلد ہی جیسے اسے کچھ یاد آگیا اور وہ دوبارہ بولا "ہاں ... ہاں دو کیس میرے پاس آئے ہیں۔

رات میں مائیکل کی طبیعت اور بھی خراب ہوگئی۔ ڈاکٹر ریو مائیکل کو دیکھنے پھر آئے۔ اور یہ بھی کہہ گئے کہ جب ضرورت ہو فوراً فون کر کے ان کو بلا لیا جائے۔

دوسرے روز مطلع غبار آلود سا تھا۔ اور ہلکی ہلکی گرم ہوا چل رہی تھی۔ ریو کے دماغ پر سے بھی بار کم ہوگیا تھا۔ اور ناامیدی و یاس کے چھائے بادل چھٹنے لگے تھے۔ بوڑھے مائیکل کا بخار بھی کم ہوگیا تھا۔ اور وہ مسکرا رہا تھا۔

مائیکل کی بیوی کے سوال کرنے پر ڈاکٹر نے کہا ابھی یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

دوپہر کو مائیکل کا بخار دفعتاً پھر تیز ہوگیا۔ اسے قے بھی ہونے لگی اور پھر سرسامی کیفیت طاری ہوگئی۔ گردن کی گلٹی کا درد بھی اور شدت اختیار کر گیا۔ اور آخرکار مائیکل کو اسپتال پہونچانا پڑا۔ ایمبولینس میں پڑا۔ راستہ بھر وہ بے ہوشی کے عالم میں یہی بڑبڑا تا رہا "یہ چوہے ...... کمبخت چوہے ......" اس کا چہرہ بدرنگ ہوگیا تھا۔ ہونٹوں کا سارا خون جیسے کسی نے نچوڑ لیا ہو۔ سانس بھی رک رک کر آرہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی وزنی بوجھ کے نیچے دب کر اس کا دم نکلا جا رہا ہو۔ مائیکل کی بیوی کا روتے روتے برا حال تھا۔ ...!

کیا کوئی امید نہیں ماسٹر صاحب.....؟ اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے پوچھا۔

ریو نے کچھ انداز سے سر ہلایا کہ اس کا دل دہل کر رہ گیا۔ مائیکل مر چکا تھا۔

اور اس طرح مائیکل کی موت کے ساتھ ایک باب ختم ہوا۔ خوفناک اندازوں کا باب۔ اور دوسرے باب کا آغاز ہوا جس میں وہ اندازے اور گمان ٹھوس اور تلخ حقیقت کی شکل میں سامنے آنے لگتے ہیں۔ اور پھر آہستہ آہستہ مرنے والوں کی تعداد بڑھنے لگی شروع میں کسی نے کوئی خاص خیال نہیں کیا۔ اور جب خیال ہوا بھی تو کافی دنوں تک سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ مرض کیا ہے.....؟ ریو کو اس بات کا خیال تھا کہ معاملہ پیچیدہ (سنجیدہ) ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے دوسرے ڈاکٹروں کی رائے بھی اس بارے میں معلوم کرنا چاہی لیکن کوئی بھی یقین کے ساتھ کچھ نہ کہہ سکا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی نادیدہ ہولناک سایہ چاروں طرف سے سمٹ کر پورے شہر کو اپنے خطرناک پنجوں میں دبوچنے کے لیے آگے بڑھتا چلا آرہا ہے۔ اس گھبراہٹ کی وجہ سے اور اس کے خلاف متحد ہونے کے لیے شہر کے باشندوں میں ایک جوش سا جاگنے لگا۔

ریو کی فکر برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ زیادہ تر مریضوں میں وہی نشانیاں پائی گئیں جو مائیکل میں تھیں۔ ریو نے دواؤں کی ایک دوکان پر یہ معلوم کرنے کے لیے فون کیا کہ اس طرح کی بیماری کا علاج کرنے کے لیے "سیرم" ان کے پاس کتنی تعداد میں ہے۔ جواب ملا کہ اس کی کمی ہے۔

اب صرف ایک ہی چارہ تھا۔ ریو نے گلٹیوں کو چاقو سے کاٹنا شروع کر دیا۔ ان میں سے خون اور مواد نکلنے لگا۔ مریض اپنے اعضا کو درد کی شدت سے دور تک پھیلاتے۔ خون اور مواد بہتا رہتا، زیادہ تر مریض اس نکراند اور گندگی سے مر بھی جاتے۔

حکام شہر بھی فکر مند ہونے لگے۔ ڈاکٹروں کی میٹنگ بلائی گئی کافی بحث ہوئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے سب کے ہونٹوں پر ایک ہی لفظ ہو لیکن جیسے منہ سے باہر نکالنے پر سب ہی خوف زدہ ہیں۔

ڈاکٹر ریو اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے، سڑکوں پر زندگی کا وہی رقص لا متناہی نظارہ۔ کھڑکی میں کھڑے کھڑے ریو کو پلیگ کے تمام تاریخی واقعات یاد آنے لگے۔ جن کے بارے میں انہوں نے پڑھا تھا۔ لندن کی طاعون کی تباہی، پیرس کے پلیگ کی وبا۔ اور قسطنطنیہ کا پلیگ۔ جن میں مکمل آبادیاں کی آبادیاں ختم ہو چکی تھیں۔ کتنی وسیع تھی وہ تباہی!! کیا ایسا ہی یہاں پر بھی ہوگا۔۔۔؟! وہ لرز گئے۔

اس وقت صرف سچائی کو قبول کرنے کی صورت میں ہی تباہی کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر یہی سوچ رہے تھے کہ گرینڈ کمرے میں آیا۔ وہ دفتر سے یہیں آرہا تھا۔ اس نے آتے ہی بتایا کہ پچھلے اڑتالیس گھنٹوں میں گیارہ آدمی مر چکے ہیں۔

ریو نے ایک لمحہ اس کی طرف دیکھا اور پھر بولے کیا ہی اچھا ہوتا اگر ہم اس بیماری کے بارے میں ایک متفقہ فیصلہ کرکے اسے اس کی صحیح شکل میں مان لیتے۔ اب تک کی یہ چشم پوشی، دور حصیل اچھی نہیں۔ میں تجربہ گاہ جا رہا ہوں، چلو گے میرے ساتھ۔؟

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں بھی یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ کسی بھی شئے کو اس کے صحیح نام سے پکارا جائے۔۔۔۔ لیکن آپ کے خیال میں یہ بیماری ہے کیا۔۔۔۔؟" گرینڈ نے سوال کیا۔

"یہ تو میں نہیں بتاؤں گا۔۔۔۔۔۔۔ اور پھر معلوم کر کے تم کو فائدہ بھی کیا ہوگا۔" ڈاکٹر نے کہا۔

گرینڈ مسکرا دیا اور بولا "تو پھر دیکھیے نا۔۔۔۔۔ سچ بات کہہ دینا اتنا آسان بھی تو نہیں۔"

سیڑھیوں سے نیچے اترتے ہوئے گرینڈ نے کہا وہ تجربہ گاہ نہیں جا سکے گا۔ کیونکہ اسے گھر پر کافی کام ہے۔ اور جو ہمیشہ ہی رہتا ہے۔ اور بغیر بتائے کہ وہ کام کیا ہے۔ وہ وہاں سے چلا گیا۔

دوسرے روز ڈاکٹر ریو نے میونسپلٹی کے چیرمین پر زور ڈال کر ڈاکٹروں کی ایک اور میٹنگ کروائی۔ تقریباً سب ہی ڈاکٹروں کی رائے یہ تھی کہ اس قدر نا امیدی اور پریشانی کی کوئی ضرورت نہیں، سب کچھ جلد ہی آپ ہی آپ ٹھیک ہو جائے گا۔ اور جلد بازی میں کوئی بھی قدم اٹھانا مناسب نہیں رہے گا۔ لیکن ڈاکٹر ریو اس بات پر زور دے رہے تھے کہ معاملہ کی پیچیدگی پر غور کرکے اور بیماری کی ایک خاص شکل کا نام رکھ کے بچاؤ کے بہتر سے بہتر ذرائع اور سخت سے سخت کارروائی پر ڈٹا جائے۔ ورنہ تقریباً نصف سے بھی زیادہ آبادی کا ناس [illegible] ان میں کوئی بات طے نہ ہو سکی۔

لیکن سچائی سے منہ موڑ کر سچائی کی حقیقت پر پردہ تو نہیں ڈالا جا سکتا۔ چند ہی روز میں مرنے والوں کی تعداد میں اور اضافہ ہو گیا۔ کسی بڑی تباہی کا زہر تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا۔

ریو نے پھر چیرمین کو فون کیا۔ اب تک ان کے ہاتھ پاؤں بھی پھول چلے تھے۔ لیکن اپنی ذات پر کوئی آنچ نہ آنے کی وجہ سے انھوں نے کہا کہ وہ مرکزی حکومت کو تمام باتوں سے آگاہ کرنے کے لیے اس کی ہدایت کا انتظار کریں گے۔ اس بات چیت کے کچھ ہی گھنٹوں بعد چیرمین نے ریو کو اپنے دفتر بلا کر ایک تار پڑھنے کو دیا۔ جو مرکزی حکومت کی جانب سے تھا۔ تار میں تھا۔

"پلیگ کا اعلان کر دو اور شہر کے دروازے بند کر دو۔"

شہر کے خاص دروازے بند کر دیے گئے۔ بیرونی دنیا سے رابطہ ٹوٹ گیا۔ کسی کا باہر جانا یا شہر کی حدود میں داخل ہونا منع قرار دیا گیا۔ شہر کے لوگوں پر اس کا عجیب اثر پڑا۔ وہ اس بات کے لیے بالکل تیار نہ تھے پھر بھی وہ یہی سوچتے رہے کہ یہ بات عارضی ہے۔ ابھی جو لوگوں سے ملنے کو منع کر دیا گیا ہے۔ ان سے وہ جلد ہی پھر مل سکیں گے۔ لیکن اچانک ہی بغیر کسی اطلاع کے جب ایک غیر متعین عرصہ کے لیے

انہیں اپنے پرانے شناساؤں سے، تمام دنیا سے علیحدہ کر دیا گیا۔ تو وہ بوکھلا اٹھے ملاقات کا کوئی راستہ نہیں تھا
جب اس بات کو کافی دن گذر گئے تو لوگوں نے چیرمین کے دفتر کے آگے بھیڑ لگا کر اس بات پر اصرار شروع کر دیا کہ یہاں سے ہر ایک کی
بات کو ذاتی طور پر اہم سمجھ کر انہیں شہر سے باہر جانے کی اجازت دی جائے۔ آخر ان کی بیوی یا محبوبہ، شوہر یا محبوب، والدین یا اولاد ان سے
دور تھے۔ اور یہ ان کے جذبات کی توہین تھی۔ موت تھی۔ اگر اس طرح انہیں یہاں بند کر کے رکھا جائے۔ لیکن سچائی کے سامنے ہمیشہ جذبات
نے ہتھیار ڈالے ہیں۔ اور یہاں بھی اس سے کوئی مختلف بات نہیں ہوئی۔ چیرمین کے حکم کے سامنے ان کی تمام کوششیں رائگاں گئیں۔

آغاز پلیگ کے دنوں میں زندگی کی عام رفتار بالکل مدھم پڑ گئی تھی۔ ایک شدید بے بسی نے لوگوں کو جکڑ لیا تھا کیونکہ یہ بات یقین سے
نہیں کہی جا سکتی تھی کہ تباہی کب تک جاری رہے گی۔ اس لیے پیٹرول وغیرہ پر کنٹرول کر دیا گیا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ دوسری اشیاء پر بھی۔ سڑکیں
سنسان نظر آتی تھیں۔ موٹروں کا تانتا اور آدمیوں کا رش ختم ہو گیا تھا۔ اور صرف ٹراموں کی گھڑگھڑاہٹ یا مریضوں اور لاشوں کو لے جانے والی
ایمبولینس گاڑیوں کی آواز ہی سنی جا سکتی تھی۔

جلد ہی چیرمین نے کنٹرول اور سخت کر دیا۔ شہر پناہ کے دروازوں پر پہرہ اور بڑھا دیا گیا کیونکہ یہ خبر ملی تھی کہ کچھ لوگوں نے نکل بھاگنے کی
کوشش کی تھی۔ آخر کار موت کی ہولناک تباہی کے سائے میں اور ناامیدی و یاس کے احساسات کو سینے میں دبائے۔ لوگ ایک ایک لمحہ کو
ایک ایک صدی مان کر جینے کی امنگ میں مست ہو گئے۔ سینما ہالوں میں لوگوں کی تعداد بڑھنے لگی، ہوٹلوں اور کیفوں میں لوگ زیادہ دیر تک اور
دلچسپی سے ساتھ بیٹھنے لگے۔ شراب نوشی بھی بڑھنے لگی اور اکثر یہ دیکھا جانے لگا کہ رات کے دو دو بجے اور تین تین بجے شراب کے نشے
میں دھت لوگ ہوٹلوں سے لڑکھڑاتے ہوئے نکل کر سنسان اور ویران سڑکوں پر زور زور سے بے ہنگم نعرے لگا رہے ہیں۔ دوکاندار مال
سجا بجا کر رکھ رہے تھے تاکہ وہ اس کو گراں سے گراں قیمت پر فروخت کر سکیں۔

اوران رفتہ رفتہ ایک وسیع گورستان بنتا جا رہا تھا۔ چوبیس گھنٹے ایمبولینس ادھر سے ادھر بھاگتی دکھائی دیتیں۔ یا تو مریضوں کو ان کے گھر
سے اسپتال لیجانے کے لیے یا پھر .... لاتعداد مردوں کو قبرستان میں دفن کرنے کے لیے۔ ڈاکٹر ریو دن رات مشغول تھے۔ صبح سے
شام تک مریض ان کے پاس لائے جاتے اور وہ ان کا علاج کرنے کی ناکام کوشش کرتے اور اس کے بعد ...... مردوں کو ٹھکانے کے لیے بھیجدیا جاتا۔
ریو کے ساتھ ہی ساتھ کچھ اور لوگ بھی مشغول ہوتے جا رہے تھے، ان میں سے جوزف گرینڈ بھی ایک تھا۔ مریضوں اور مرنے والوں کے
اعداد و شمار جمع کرنے میں اس کا زیادہ سے زیادہ وقت لگنے لگا۔ صرف کوٹارڈ ہی ایک ایسا شخص تھا جو تباہی میں اضافے کے ساتھ ساتھ اور
زیادہ خوش رہنے لگا تھا۔ اور پینے بھی لگا تھا۔

ان دنوں کوٹارڈ اتنا خوش معلوم ہوتا تھا جتنا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ دوسری جانب بوڑھے کا پہلے ہی سے تھکا ماندہ جسم تکان سے
اور اتنا زیادہ چور ہو جاتا کہ اسے وہ اپنا شام والا مزدوری کا کام کرنے میں بھی دقت ہوتی۔ لیکن اس کے پاس کبھی الفاظ نہیں رہتے تھے۔
اپنی بات ظاہر کرنے کے لیے اور اس سے وہ اب بھی خاموش تھا۔ اور اس وقت بھی اس پر خاموشی ہی طاری رہی تھی۔ جب اس کی بیوی
برسوں تک باہمی زندگی گذارنے کے بعد اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ کیونکہ گرینڈ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ محبت کا انجام شادی ہونے کے بعد
اس بندھن کو برقرار رکھنے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔

یہ امنگ اور یہ جوش ابھی رابرٹ میں باقی تھا۔ اور پلیگ کے سبب اس شہر میں قید ہو جانے پر وہ اور بھی بڑھ گیا تھا۔ اس سے سیکڑوں
میل پیرس میں اس کی محبوبہ اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ اور رابرٹ کا اس سے ملنے جانا نہایت ضروری تھا۔ لیکن ضمیر کی آواز پر وہ چونک پڑا۔
کیا اخباری نمائندہ ہونے کے ناطے اس شہر میں رہ کر حالات کا جائزہ لے کر اس کے لیے ضروری نہیں ہے ..... ؟؟ رہیں۔ نمائندگی زندگی کی دوسرے
درجے کی ذمہ داری اور اس کی پہلی ذمہ داری اپنی محبوبہ کے لیے ہے۔ دل نے ضمیر کو للکارا۔ اور آخر دل جیت گیا۔ رابرٹ نے تمام حکام سے یہ بار
کہی کہ اسے شہر چھوڑ کر جانے کی اجازت دے دی جائے۔ لیکن کسی نے اسے ٹال دیا۔ اور کسی نے سختی سے منع کر دیا۔ آخرکار وہ ڈاکٹر ریو کے پاس

آیا کہ وہ اسے یہ سرٹیفکیٹ دے دیں کہ وہ بالکل اچھا ہے۔

"لیکن میں تمہیں نہ سرٹیفکیٹ دے سکتا ہوں اور نہ دوں گا!" ریو نے سرد مہری سے جواب دیا۔

"مگر کیوں؟ میرا اپنی محبوبہ سے ملنا نہایت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اس شہر سے، یہاں کے لوگوں اور ان کی مصیبتوں سے میرا کیا تعلق؟ میں بیرونی باشندہ ہوں........"

اس وقت کوئی باہر سے آیا ہوا نہیں ہے۔ پلیگ نے ہر شخص کو ایک ہی رشتہ میں باندھ دیا ہے اور تم چاہتے ہوئے بھی اس سے اپنے آپ کو علیحدہ نہیں کر سکتے۔ ریو نے رابرٹ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

رابرٹ کو غصہ آگیا۔ وہ بولا آپ کے دل میں جذبات مردہ ہو چکے ہیں۔ اور صرف جذبات ہی ایک ایسی سچائی ہے جس سے آپ کوسوں دور ہیں۔

بناوٹی اور مصنوعی اصولوں نے ... آپ کو اندھا کر دیا ہے۔"

رابرٹ کو یہ بات کب معلوم ... تھی ریو کی بیوی جسے وہ بیحد چاہتے

ہیں میلوں ان سے دور ہے ... لیکن پھر بھی وہ ذاتی غرض کے لیے

عام ذمہ داری کی قربانی نہیں دے ... سکتے تھے۔

مسیح ریو کے منہ سے اچانک ... ہی نکلا۔"

جی ہاں۔ اور مجھے یہاں سے ... جانے میں کوئی نہیں روک سکتا!"

اس نے ایک عزم سے جواب دیا۔ ... خدا تمہاری آرزو پوری کرے۔

ریو نے کہا۔ رابرٹ چلا گیا۔ اور ریو ... اسپتال میں داخل ہوئے۔

آنے والے دن اپنے ساتھ ... تباہی پر خوفناک سود بڑھاتے گئے

بچاؤ کی ساری تراکیب کے باوجود ... دبا پھیلتی ہی جا رہی تھی۔ ریو گرینڈ

ڈاکٹر کیسٹل کی بنائی ہوئی نئی دوا "سیرم" پہلی بار پلیگ کے خلاف آزمائی گئی۔ لیکن وہ زندگی میں چند لمحوں کے ساتھ اضافہ کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکی۔

پلیگ کا نام شہر کے ہر گلی کوچوں میں پھیلا ہوا تھا۔ اور جب اس کا سایہ ہٹا تو تارو بھی اس کے ساتھ ہی چلا گیا۔ اب ریو کے لیے یہ دنیا بالکل سنسان تھی۔ اس طرح طاعون کی اس خوفناک تباہی کا خاتمہ تو ہوا، لیکن ریو........ اس کے لیے اب اس زندگی اور دنیا میں کیا رہ گیا تھا........؟؟؟

اور ان سب لوگوں کو دم لینے کی بھی فرصت نہ تھی جو پلیگ کے خلاف جنگ آزما تھے۔ ایک ہفتہ کے اندر پانچ سو سے زیادہ اموات کا اوسط تھا۔ اور سب سے خوفناک بات یہ تھی کہ جس شہر میں اس کے باشندوں کے رہنے کے لیے کافی جگہ تھی اسی میں اس شہر کے مردوں کے لیے جگہ کی کمی ہوتی جا رہی تھی۔ شروع شروع میں لوگ نہایت مناسب تابوت ایک ساتھ ہی دفنائے جانے لگے۔ اور پھر سارے قبرستان بھرنے لگے۔ چار پانچ پانچ تابوت ایک ساتھ ہی دفنائے جانے لگے۔ اور آخر ایک وقت ایسا آیا کہ پادری کی آخری رسوم ادا کرنے کی ذمہ داری کو بھی ختم کر دینا پڑا۔ اور پھر حالت یہ ہو گئی کہ سرکاری حکم کے بموجب مرنے والوں کے رشتہ داروں کے وہاں آنے پر پابندی لگ گئی۔ منتشر لاشیں درجنوں کی تعداد میں رات کی تاریکی اور گمنامی میں دفن کی جانے لگیں۔ اور انسان اپنی بے بسی کا تماشہ دیکھتا رہا۔ انسانی دماغ چیخنے لگا۔ اور دل شکستہ ہو گیا۔

ڈاکٹر ان المناک دنوں میں تین شفاخانوں کا کام سنبھال رہے تھے۔ ایک صبح سے دوسری صبح تک ایمبولینس گاڑیاں تانتا توڑے بغیر مریضوں کو درجنوں کی تعداد میں لاتی رہتیں۔ اور پھر تمام علاج و ترامیک کے باوجود اسی طرح لاشوں کو بھر کر اس جگہ لے جاتیں جہاں اب دفنانے کی جگہ بھی باقی نہیں بچی تھی اور لاشوں کی ایک بڑی تعداد ایک ساتھ ہی جلا دی جاتی۔ ریو اس غیر معمولی تکان اور اس شدید شکست کا کوئی احساس یہ تھا سیکڑوں لوگوں کے ایک ساتھ مرنے پر اس بات کو محسوس کرنے کے لیے فرصت ہی نہیں تھی۔ صرف اس روز جب شام کو ان کی والدہ نے ان کی بیوی کا تار ان کو دیا تو تار پکڑے ہوئے ڈاکٹر ریو کے ہاتھوں میں رعشہ کی کیفیت طاری تھی۔ ماں نے جب اس متعلق معلوم کرنا چاہا تو ریو نے ٹہلتے ہوئے کہا۔ "یہ کوئی خاص بات نہیں، آہستہ آہستہ عادت پڑ جائے گی تو سب اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"جو زندہ ہے اسے موت کی عادت پڑنے میں وقت تو درکار ہوگا ہی۔"

ریو کو رابرٹ کی وہ بحث یاد آگئی۔ رابرٹ نے تکلیف اور درد، رنج و غم، الم اور موت کی توہین کر کے خوشی اور ہمدردی پریم اور زندگی کی

خواہش کی تھی۔ اور یہ انتخاب صحت مندانہ رجحانات رکھنے والے کسی بھی شخص کے لیے فطری تھا۔

جب ہر طرف مصائب و آلام اور رنج و غم کے بھیانک سائے ہوں تو مذہب لوگوں کے لیے ایک بار پھر زندہ ہو جاتا ہے۔ تکلیف اور تباہی کے گھٹے ہوئے ماحول سے بچنے کے لیے انہیں مذہب کی خوشگوار اور حیات پرور دھوپ چاہیئے۔ گہری تاریکی میں اطمینان بخش روشنی پھیلانے کے لیے مذہب کے چراغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اوران پر آئی ہوئی اس خوفناک تباہی کو دور کرنے کے لیے بھی دعائیں ہونے لگیں۔ پادری پینی لونے سب لوگوں کو جمع کر کے وعظ کہنا شروع کیا۔

"میرے بھائیو! یہ مصیبت جو تمہارے اوپر آئی ہے، ایک طرح تم اس کے حق دار بھی تھے۔ خدا تعالیٰ کی مرضی اور احکام کے خلاف جو کام ہوئے ہیں اس کی سزا ملنا ضروری ہے۔ توبہ کے آنسوؤں سے ہی گناہ کے دھبے مٹائے جا سکتے ہیں۔ اور توبہ کرنے کی جرأت اور صلاحیت آج تم میں نہیں۔ اسی لیے قدرت تم کو یہ سزا دینے کے لیے مجبور ہو گئی۔ گناہ نا انصافی اور ظلم کا مکمل دیا جانا ضروری ہو گیا۔ رسی اس سے زیادہ اور دراز نہیں کی جا سکتی۔ یہ مصیبت اور تباہی جو آج تمہارے اوپر آئی ہے وہ صرف عذاب خداوندی ہی نہیں بلکہ گناہ اور نا انصافی کو ختم کرنے کے لیے ایک تباہ کن ہتھیار بھی ہے۔ جو جھوٹا ہے، گنہگار ہے، مکار ہے وہ اس تباہی کی آگ سے نہیں بچ سکتا۔ وہ اس میں جل جائے گا تاکہ سچائی اور پاکیزگی زندہ رہ سکے اور نکھر سکے ...."

فادر پینی لو کی بات کچھ لوگوں کی سمجھ میں تو آئی اور کچھ لوگوں نے اس کا کوئی خاص خیال نہیں۔ پولیس مجسٹریٹ کو بیمار لوگوں کو فادر پینی لو کی باتیں مکمل سچائی پر مبنی معلوم ہوئیں۔ ڈاکٹر ریو نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

لیکن رابرٹ اپنے خیالات کے بارے میں مکمل طور پر یقین کیے ہوئے تھا۔ بار بار وہ اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتا۔ "میرا فیصلہ اٹل ہے" اور جیسے جیسے وہ یہ بات دہراتا جاتا اس کا اضطراب بڑھتا جاتا۔ اور اس اضطراب کا نتیجہ ایک کمزور ارادہ اور منہ دلی اختیار کرتا جاتا۔ تاریکی میں بار بار اس کی محبوبہ کا رنگین اور چمکدار ہیولا ابھرتا اور وہ اس کو اپنی باہوں میں بھر لینے کے لیے بے چین ہو جاتا۔ مجھے اپنی زندگی سے دور بیمار پر قید رکھنے کا اختیار کسی کو نہیں۔ یہ ظلم ہے، سراسر نا انصافی ہے۔ رابرٹ کی روح میں فریاد کا زہر گھلنے لگا۔ لیکن شاید اسے معلوم نہیں تھا کہ کسی بھی چیز کے آخری لمحوں میں سچائی کی ٹھوس حقیقت کو ماننا ہی پڑتا ہے۔ اس کے سامنے کسی بھی جذبہ کی قدر نہیں۔ سچائی بہر حال سچائی ہے۔ خواہ وہ انصاف کے بارے میں ہو یا نا انصافی کے لیے۔ محبت کے لیے ہو یا نفرت کے لیے، موت سے متعلق ہو یا زندگی سے۔ ان دنوں راتوں میں رابرٹ کی محبوبہ اس کے خوابوں میں محو خرام نظر آتی۔ لیکن جب آنکھ کھلتی تو بے لیمپ کا اس کا دل گھٹ کر رہ جاتا۔ اور دل کی گھٹن، خدا کی پناہ ...... !!! دن میں سنسان سڑکوں کے چکر لگاتا ہوا اسٹیشن تک جاتا جہاں اب کوئی بھی گاڑی نہیں آتی تھی اور نہ جاتی تھی۔

آفتاب کی تپش، وحدت اور اس وبا کی ہیبت ناک تباہی نے شہر کی ساری سڑکیں جلا کر خاک کر دی تھیں۔ ساری خوشیوں کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اتنے دن گزر جانے کے بعد اب شہر کے لوگ بھی اپنی اس تباہ و برباد اور خوفناک حالت کے عادی ہو چکے تھے۔ اسلیے اب ان کے دلوں میں خوف کی جگہ پلیگ کے شکست خوردہ لوگوں جیسی اداسی آ گئی تھی۔ تارو نے اپنی ڈائری میں لکھا "شہر کے باشندے اب پلیگ کے عادی ہو چکے ہیں۔ کوئی شخص بھی ہنستا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ جب تک کہ اس نے حلق سے سوالی نہ لی ہو اور زیادہ تر لوگوں کے لیے تو یہ سارے مصائب و تکالیف اور حتیٰ کہ موت تک بھی معمولی باتیں بن چکی ہیں۔

پلیگ کا آغاز ہوئے تین ماہ سے زائد عرصہ گزر چکا تھا۔ ڈاکٹر ریو کے گھر اس دن تارو ان سے ملنے کے لیے آتے والا تھا۔ گھر میں ریو اور ان کی والدہ کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ ضعیف ماں کی پوری توجہ اس مصیبت اور تباہی کے دوران ڈاکٹر ریو پر مرکوز ہو گئی تھی۔ ان کی زندگی کا آرزوؤں اور تمناؤں کا غرض کہ ہر چیز کا انحصار ڈاکٹر ریو پر تھا۔ اور دنیا کی کوئی بھی شے ان کو اس طرف سے نہ ہٹا سکتی تھی۔ ڈاکٹر ریو اپنی ماں کے ساتھ اطمینان بخش سنجیدہ اور شفقت آمیز چہرے کی جانب دیکھ رہے تھے۔ اور اس سے انہیں بہت سکون حاصل ہو رہا تھا۔ اچانک ماں

نے سوال کیا "کوئی اطلاع آئی بہو کے پاس سے ؟

ہاں ابھی حال ہی میں جو تار آیا تھا اس کے مطابق وہ اب پہلے سے بہت اچھی ہیں۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں یہ اس لیے لکھا گیا ہے کہ میں فکر مند نہ ہوں۔

اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی اور فوراً ہی لمبا چوڑا تارو کمرے میں داخل ہوا۔ تارو یہ تجویز لے کر آیا تھا کہ پلیگ بہت پھیل چکا ہے۔ اور کام نبٹانے کے لیے رضاکاروں کی بھرتی کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

مجھے اس بات سے سخت نفرت ہے کہ لوگوں کو بے بسی کی حالت میں موت کے حوالے کر دیا..... اور اسی لیے میں یہ رضاکاروں کی پارٹی بنانا چاہتا ہوں۔ تارو نے کہا۔"

ریو نے تارو کے پُرعزم اور تقریباً جذبات سے عاری چہرے کو ایک لمحہ کے لیے دیکھا۔ اور پھر بولے "آپ نے یہ سوچ لیا ہے کہ ایسا کرنے میں ذاتی طور سے آپ کو کتنا خطرہ ہے ؟

لیکن تارو کو سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کبھی بچپن میں اس نے اپنی والد کی کچہری میں ایک ایسے شخص کو دیکھا تھا جسے سزائے موت دی جا رہی تھی۔ ننھے تارو کو یہ تو نہیں معلوم تھا کہ آیا اس مجرم نے واقعی یہ جرم کیا ہے یا نہیں۔ اس کے ذہن پر تو صرف اس مجرم کا سہا ہوا اور خوف زدہ چہرہ ہمیشہ کے لیے ثبت ہو گیا۔ اور اس نے اسی وقت سے یہ طے کر لیا تھا کہ جرم خواہ کچھ بھی ہو کسی شخص کو سزائے موت دینا ناانصافی ہے۔ چاہے منصف انسان ہو یا خدا۔ اور اس کی ساری زندگی اس ناانصافی کے خلاف جدوجہد میں ہی صرف ہوئی تھی لیکن آج تک اسے یہ اطمینان نہیں ہوا کہ علاج حقیقی معنوں میں ہو رہا ہے یا نہیں۔ کیونکہ ہر قدم پر ناانصافی انصاف کے بھیس میں تھی۔ اور مختلف اصولوں کے نام پر انسان کو موت کے حوالے کیا جا رہا ہے۔ یہ کیسا اندھیرا ہے۔ یہ اندھیرا حیوانی رہتی ہے۔ ضمیر کی شمعیں بجھ گئیں۔ دل کے چراغ ٹھنڈے ہو گئے۔ کوئی شعلہ طور سے ہی رہبری کرے۔ اسی لیے فادر پینی لو کے کہنے کے مطابق اوران کے لوگوں پر جو یہ عذاب خداوندی نازل ہوا تھا اس کے خلاف بھی تارو جدوجہد کر رہا تھا۔ اور پلیگ سے لڑائی لڑنے اور اس پر فتح مندی حاصل کرنے کے لیے وہ سب کچھ کر گذرنے کو تیار تھے۔

اس دنیا نے مجھے صرف ایک ہی بات سکھائی ہے۔" تارو نے کہا "اور وہ یہ کہ ہمیں اس کا خاتمہ کرنے کے لیے باہمی طور پر کام کرنا ہے۔ ہم سب کے اندر پلیگ کا وجود موجود ہے۔ ہم سب مریض ہیں۔ اور ساری دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جو اس بیماری سے الگ ہو اس لیے متحد ہو کر اس کا مقابلہ کرنا ہمارا پہلا فرض ہے۔ ڈاکٹر ریو اور تارو نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کر اس بات کا وعدہ کیا۔ اور رضاکاروں کا گروہ بنانے کی بات پکی ہو گئی۔

رضاکاروں کی پارٹی میں اور لوگوں کے ساتھ ہی ساتھ بوڑھے گرینڈ بھی شامل ہو گیا۔ گرینڈ کی اپنی کوئی سماجی پوزیشن نہیں تھی۔ وہ ادھیڑ عمر کا تھکا ماندہ شخص مائی کی تلخ دستبرد میں بازوؤں کو سینے میں چھپائے اس بات جیبت کے سمندر میں خوش نصیبی کا ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا۔ وہ اپنے اکلوتے کمرے میں بیٹھا نہ جانے کب سے اس ناول کی پہلی ہی سطر بار بار لکھ رہا تھا۔ جس میں اس کے اندرونی کرب کو ایک خاموش زبان مل گئی تھی۔

تارو رابرٹ سے بھی اس پارٹی میں شامل ہونے کے لیے اصرار کر رہا تھا لیکن رابرٹ نے جواب دیا کہ اس شہر کے مصائب سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ اور اس کے علاوہ وہ یہاں سے جانے والا بھی ہے۔ ریو نے جب رابرٹ کے جانے کی بات سنی تو انہوں نے رابرٹ کو نیک خواہشات کا تحفہ دیا۔ رابرٹ کو اس بات پر بہت تعجب ہوا۔ اس نے کہا "آپ جانتے ہیں کہ میرا یہاں سے جانا یا نہ جانا کی کوشش کرنا غیر قانونی ہے پھر بھی آپ روکنے یا رکوانے کی کوشش نہیں کرتے۔ بلکہ نیک خواہشات کا اظہار ہی کرتے ہو۔

ڈاکٹر ریو زیر لب مسکراتے ہوئے بولے "تم نے خوشی کا انتخاب کیا ہے اور ایک انسان ہونے کے ناطے یہ تمہارا حق بھی ہے اس لیے یہ کسی بھی طرح غیر قانونی نہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا ہے۔

رابرٹ کے ذہن میں ریو کی بات جگہ لگاتی رہی لیکن پھر بھی کسی قیمت پر اوران سے باہر نکل کر اپنی محبوبہ سے قریب ترین ہو جانے کی خواہش

میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ اور ان ہی کوششوں میں وہ مصروف بھی رہا۔ اس نے حکام کو پھر درخواستیں دیں۔ لیکن پھر پہلے ہی کی طرح ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ایک روز اس کی ملاقات کوٹارڈ سے ہو گئی۔ اس نے رابرٹ سے کہا وہ نکلنے کا راستہ بتا سکتا ہے اس کے لیے یہ بات کہہ دینا ممکن بھی تھا کیونکہ کوٹارڈ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں پلیگ سے فائدہ ہی ہوا تھا۔ اس کے ایک ایسے جرم پر پردہ پڑا تھا کہ پولیس اسے کسی وقت بھی وہ راز معلوم ہو جانے پر گرفتار کر سکتی تھی۔ کوٹارڈ پلیگ سے زیادہ گرفتاری سے خوف زدہ تھا لیکن حکام شہر کو پلیگ کی وجہ سے کوٹارڈ اور اس کے جرم کا ذرا بھی احساس نہ رہ گیا تھا۔ اس لیے اس کی آزادی برقرار تھی۔ دوسرے اس وقت شہر میں عام استعمال کی اشیا کی کمی پڑ گئی تھی اور کوٹارڈ اس گروہ سے تعلق رکھتا تھا جو مال چوری چھپے شہر میں برآمد کیا کرتا (لایا کرتا تھا) اس میں اسے خاصا مالی منافع بھی ہو رہا تھا۔ اور اس کے اندر خوف کی جگہ ایک نئی خود اعتمادی نے لے لی تھی۔

اس وجہ سے جب کوٹارڈ نے رابرٹ کو اشارتاً سمجھایا کہ اس کے چھپ کر اوران سے باہر جانے کا انتظام ہو سکتا ہے تو اس کو بہت تعجب ہوا اور اس نے پوچھا کیا سچ مچ یہ ممکن ہے؟ تمہیں پورا یقین ہے۔؟؟

"بالکل ...... اور ایک دوست ہونے کے ناطے میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔ آخر جذبات کی بھی کوئی قیمت ہوتی ہے۔ چلو، میرے ساتھ"

اور رابرٹ نے محسوس کیا کہ اس دوزخ میں اس کی بات سمجھنے والا کم از کم ایک آدمی تو ہے۔ وہ کوٹارڈ کے ساتھ ہو لیا۔ وقت دوپہر کا تھا اور سورج کی تمازت بہت تیز تھی۔ سڑکیں تقریباً خالی تھیں جیسا پلیگ کے دنوں ایک عام قاعدہ سا بن گیا تھا۔ کافی دور چلنے کے بعد کوٹارڈ اور رابرٹ ایک ریسٹوران میں داخل ہوئے۔ یہ جگہ بندرگاہ سے کافی قریب تھی۔ ریسٹوران کی تقریباً سب ہی میزیں خالی تھیں اندر کی گرم خاموشی میں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ گندک کے رنگ کے پنجرے میں ایک مریل سا طوطا تھا جو ان دونوں کے اندر داخل ہوتے ہی زور زور سے چلانے لگا۔ ریسٹوران کا مالک چیخ رہا تھا۔ آواز سن کر اٹھا۔ وہ کوٹارڈ سے واقف تھا وہ قریب آیا تو کوٹارڈ نے پوچھا "ہے؟"

"کہہ نہیں سکتا" ریسٹوران مالک کا مختصر جواب تھا۔

"ہوں ...... میں اپنے ان دوست کو ملانا چاہتا تھا۔"

"تو یہ بھی دھندے کے آدمی ہیں!!"

"ہاں!"

"اچھا شام کو آئیے گا۔"

شام کو رابرٹ اور کوٹارڈ پھر آئے اس وقت یہ لوگ ریسٹوران میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے رابرٹ کی جانب غور سے دیکھا۔ اتنے میں ہی ایک گٹھا مضبوط سا آدمی کرسی سے اٹھ کر کوٹارڈ سے مخاطب ہوا۔ "ہوا! چلو بار کی طرف چلا جائے۔"

تینوں کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر اسی شخص نے جس کا نام گرسیو تھا کہا "چلو پھر باہر چلا جائے۔ تینوں باہر آ گئے۔ یہاں آکر کوٹارڈ نے گرسیو کو رابرٹ کی مشکل سے آگاہ کیا۔ اور پھر یہ طے پایا کہ دس ہزار میں رابرٹ کا کام ہو جائے گا اور وہ یہ جاننے کے وقت دیا جا سکتا ہے۔ گرسیو نے رابرٹ کی ملاقات ایک اور شخص گونزالز سے کرائی۔ گونزالز نے رابرٹ کو دو ہسپانوی نوجوانوں سے ملایا۔ یہ دونوں بھائی بھائی تھے اور شہر کے ایک دروازے پر پہرہ دار تھے۔ انہوں نے رابرٹ کو بتایا کہ ان کے پہرے کی باری ایک ہفتے بعد آئے گی اور وہ انہیں اس سے ایک روز پہلے پرانے اسکول کے پاس ملے۔ رابرٹ نہایت خوشی کے ساتھ ان سے رخصت ہوا۔

ان سب باتوں میں تین چار روز لگ گئے۔ جب رابرٹ نے گونزالز سے کہا: یہ دیر ہو رہی ہے تو گونزالز نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا "کاموں میں دیر تو لگتی ہی ہے۔

رابرٹ نے کام کو منع نہ کیا جانے کی وجہ سے جلدی سے کہا "ہاں ہاں! یہ تو ضرور لگتی ہوگی!"

جب رابرٹ واپس لوٹ رہا تھا تو اس نے دیکھا تارد اور ڈاکٹر ریکا رمیں آرہے ہیں۔ وہ خود خوشی سے اتنا مست تھا کہ اسے کسی سواری کا خیال بھی نہ آیا۔ اور وہ پیدل ہی چل پڑا تھا۔ تارد نے کار روک لی اور اس سے کار میں بیٹھنے کو کہا۔ راستے میں تارد نے اس سے پھر کہا کہ وہ رضاکاروں کے اس گروہ میں شامل کیوں نہیں ہو جاتا؟

رابرٹ نے پورے اعتماد کے ساتھ جواب دیا کہ ایک ہفتہ کے اندر وہ یہاں سے چلا جائے گا۔ اور اس کا پارٹی میں شامل ہونا ناممکن ہے۔ وہ اپنی اس نئی خوشی میں ان لوگوں سے جلد ہی رخصت ہو کر چلا گیا۔

ہوٹل پہنچ کر اس نے اس خوشی کو پورے طور سے منانے کے لیے مے نوشی کی اور محبوبہ سے ملنے کی مسرت اور شراب کے نشے میں مست وہ اپنے کمرے میں پہنچا۔ کافی دیر تک اسے نیند نہیں آئی۔ وہ اپنی محبوبہ سے تصور میں ہی ملتا رہا اور دل ہی دل میں روٹھی محبوبہ کو منانے کی ترکیبیں سوچتا رہا۔ جب وہ اس سے اتنے دن دور رہنے کی شکایت کرے گی تو اسے باہنوں میں کس کر اتنا پیار کروں گا اتنا پیار کروں گا تاکہ وہ بوسوں کی شدت اور گرمی میں اپنی شکایت بھول جائے گی .....

لیکن یکایک اس کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ اپنی محبوبہ کا چہرہ بھول گیا ہے جیسے اچانک کسی آدمی کی آنکھیں پھوڑ دی جائیں اور اس کے لیے دنیا کی ہر چیز پر اندھیرا چھا جائے۔ اس نے چہرے کو یاد کرنے کی لاکھ کوشش کی لیکن سب بے سود

وبا کی تباہی سے وہ سارا شہر چلا اٹھا..... اور رابرٹ نے دیکھا کہ اس وارڈ کے اندر ایک دم گھونٹ دینے والا دھندلکا ہے۔ مریض چارپائیوں پر پڑے چیخ رہے ہیں۔ تمام جگہ دوزخ کی طرح ہو رہی ہے۔ اور ان کے درمیان صرف ڈاکٹر نرسیں کمر باندھے دیکھ بھال اور علاج کرتے پھر رہے ہیں بسسکتی اور دم توڑتی زندگی کو بچانے کی کوشش میں مصروف ہیں..... ایسے وقت....

ہر بار کوشش کرنے پر اس کے تخیل میں ایک دھندلا دھندلا سا سایہ ہی ابھرتا رہا اور اس کے ساتھ اس کی جھنجھلاہٹ بھی بڑھتی چلی گئی حتیٰ کہ اس بے بسی اور جھنجھلاہٹ کے عالم میں تمام رات بے خوابی میں گذر گئی۔

آخر وہ دن بھی آپہنچا جب اسے ان دونوں بھائیوں سے پرانے اسکول کے پاس ملنا تھا۔ بڑی آرزو اور مسرت کے ساتھ وہ وہاں پہنچا۔ لیکن طے شدہ وقت سے کافی دیر بعد ان دونوں میں سے کوئی بھی وہاں نہیں آیا۔ جھنجھلایا ہوا اور رفکر مند رابرٹ وہاں سے واپس لوٹ آیا۔ اب تک کی ساری کوششیں رائیگاں ہوگئیں۔ اسے دوبارہ وہ کام پھر اسی ترتیب سے انجام دینا ہوگا۔ بڑی کوششوں کے بعد دوبارہ ان بھائیوں سے ملاقات ہو پائی۔ اور پھر ایک خاص روز طے پایا۔ ایک ہفتہ بعد۔

اس دوران انتظار رابرٹ کی شراب نوشی بڑھتی گئی وہ اپنی محبوبہ کے چہرے کو لاشعور میں تلاش کرنے کی بہت کوشش کرتا لیکن اس کے تصور میں اور اس کی نگاہوں کے سامنے بھی رنج و تکلیف چیخ و پکار جنازے اور موت کے نظارے ناچتے رہتے۔ انہیں الجھنوں میں اس کی ملاقات تارد یا ڈاکٹر ریکا سے ہو جاتی تو رابرٹ بڑی خود اعتمادی سے کہتا "ایسے کاموں میں دیر لگتی ہی ہے ۔ بس ایک ہفتے کے اندر اندر میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اور یہ کہتے کہتے اس کے لہجے میں ایک کھوکھلا سا آجاتا گویا وہ ان کو نہیں اپنے آپ کو یقین دلانے اور سمجھانے کی کوشش کر رہا ہو۔

طے شدہ وقت پھر آگیا لیکن معلوم ہوا کہ فرار ہونے کے لیے وہ رات خطرناک ہے۔ اس لیے ایک ہفتہ بعد پھر کوشش کی جائے گی۔ اور وہ ہفتہ بھی اسی طرح کی الجھن میں بسر ہوا۔ اور دن گذرنے کے ساتھ ہی ساتھ رابرٹ کی شراب نوشی بڑھتی گئی۔ آخر وہ دن بھی آہی گیا۔ وہ ایک روز قبل ہی ان دونوں نوجوانوں کے مکان میں جا کر ٹھہر گیا۔ جیسے جیسے اس کے جانے کا وقت قریب آتا جا رہا تھا ویسے ویسے ہی اس کی بے بسی اپنی محبوبہ کا چہرہ یاد کرنے کے لیے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ شام کو ان دونوں میں سے ایک نے آکر بتایا کہ رات کے گیارہ بجے مناسب وقت ہوگا۔

"تو اب میں جا ہی رہا ہوں۔" اس نے نہایت مسرت کے عالم میں یہ بات سوچنا شروع کی۔ لیکن اس خیال سے اسے کسی خوشی کے جذبہ کا احساس نہ ہو سکا۔ کتنی بڑی انسانی بے بسی ہے اگر ہم خوشی کے حالات میں خوش ہونا چاہیں لیکن نہ ہو سکیں۔ پھر رابرٹ نے دوبارہ یہ بات نہیں سوچی۔ اس نے طے کیا کہ اس وقت جا کر اسے تارو اور ڈاکٹر ریو سے الوداع کہنی چاہیے۔

رابرٹ اسپتال میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ تارو کام میں بے طرح مشغول ہے۔ نئے آنے والے مریضوں کے کارڈ بن رہے تھے اور اسی تیزی سے ان پر ان کی موت کا وقت اور تاریخ ڈالی جا رہی تھی۔ انسانی زندگی...... صرف چند کارڈ..... اور بس!

"دیکھ رہے ہو میرا کام تو حساب کتاب رکھنے والے منشی جیسا ہو رہا ہے۔ ارے ہاں! کہو تمہارے جانے کا کیا ہوا؟" تارو نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"آج رات کو جا رہا ہوں" رابرٹ کو یہ جواب دیتے وقت ایسا محسوس ہوا جیسے یہ بات اس نے نہیں کسی دوسرے نے کہی ہو۔ جانے سے قبل تم سے اور ڈاکٹر ریو سے ملنے آیا تھا...... کہاں ہیں ڈاکٹر؟

"اندر ... آپریشن روم میں۔ ان کا باہر آنا ناممکن ہے۔ لوگ اتنی بڑی تعداد میں اور اتنی تیزی سے آ رہے ہیں کہ بیچارے ڈاکٹر کو دم لینے کی فرصت نہیں ہے۔" تارو نے کہا۔

"لیکن تارو میرا ان سے ملنا ضروری ہے۔" رابرٹ کی آواز سے بے قراری جھلک رہی تھی۔

"اندر جانا اول تو خطرناک ہے اور پھر منظر اتنا ہولناک ہے اتنا بھیانک ہے کہ شاید تم برداشت نہ کر سکو گے۔" تارو نے اسے بتایا۔

لیکن رابرٹ کا شدید اصرار تھا اس لیے وہ اسے اندر لے گیا۔ دونوں منہ پر کپڑا باندھ کر وارڈ کے اندر داخل ہوئے۔

رابرٹ نے دیکھا وارڈ کے اندر دم گھونٹ دینے والا دھواں لگا ہے۔ ایک بدبودار بھاپ سی ہے۔ چارپائیوں پر پڑے مریض چلا رہے ہیں۔ درد سے چیخ رہے ہیں۔ پورا کمرہ دوزخ کا نمونہ معلوم ہو رہا ہے۔ اور ان سب کے درمیان صرف ڈاکٹر ریو منہ پر کپڑا لگائے علاج اور دیکھ بھال کرتے ہوئے ادھر ادھر گھوم رہے ہیں۔ سسکتی دم توڑتی زندگی کو بچانے میں مصروف ہیں۔ تباہی و بربادی کے اس ماحول میں تعمیر کی ایک کوشش۔ کافی دیر بعد ڈاکٹر ریو، تارو اور رابرٹ کی طرف متوجہ ہو سکے۔

"تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا رابرٹ" ریو نے کہا۔ منہ پر بندھے کپڑے کی اوپر جھانکتی آنکھوں میں تکان کا احساس تھا۔

"میں...... میں یہ کہنے آیا ہوں کہ بیماروں کی نگہبانی اور تیمارداری کے مشن گروہ میں بھی شامل ہونا چاہتا ہوں" رابرٹ ایک دم ہی یہ بات کہہ گیا۔

ریو اور تارو تعجب کے دونوں تکتے رہے۔ ریو نے ایک توقف کے بعد کہا "یہ بات کچھ ایسی ہے کہ مجھ کو کوئی مناسب نہیں ہوتا رابرٹ! تمہارا اپنی محبوبہ سے ملنا ہی ٹھیک ہے۔ کسی خاص طریقے تمام مصائب اور درد تکلیف میں پرکشش ورانہ معلومات ہوتے ہیں۔ لیکن خوشی کی آرزو کرنے میں کوئی شرم کی بات نہیں۔

لیکن جس خوشی اور مسرت میں صرف خود غرضی شامل ہو وہ شرم کی بات ضرور ہے رابرٹ نے کہا۔ آج اس کی آواز میں ایک نیا عزم تھا۔ لہجہ میں ایک نیا یقین تھا جو صرف درد کی تلخی سے ہی ابھرتا ہے۔ اور اس کے بعد کوئی بھی بحث کچھ بھی مزید کہنا غیر ضروری تھا۔

رابرٹ تارو کی پارٹی میں شامل ہو کر کام کرنے لگا۔

پلیگ کی تباہی برابر بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ریو، تارو، گرینڈ اور رابرٹ کی مصروفیات کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ مرنے والوں کی تعداد میں زیادہ سے زیادہ ہی رہا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ پلیگ نے اور بھی تباہ کن اور پیچیدہ شکل اختیار کر لی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بھی انسانی کوشش اس عذاب خداوندی کے مقابلے میں کامیاب نہ ہو سکے گی۔ لیکن انسان کے اندر کیسا ایسا گہرا یقین ہے جانے کونسی ایسی طاقت ہے جس کے بل بوتہ پر وہ اس آفت سے لگاتار جدوجہد کر رہا تھا۔ ناکامی کے تھپیڑے اس کے تمام تر کس بل توڑ کر رکھ دیتے تھے لیکن اس کی کوشش میں کوئی کمی نہ تھی۔ اور

ـب کے خلاف جنگ کرنیوالوں میں ضرور قبولی ایسی سچائی، کوئی ایسی قوت اعتماد ہی تھی کہ قدرتی کام میں کوئی خاص مصلحت کے اصولوں پر یقین کرنے والے فادر پینی لو بھی ان ہی لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنے لگے۔ حالانکہ ان کا خیال غالباً اب بھی یہی تھا کہ پلیگ خدا کا عذاب ہے جس کے ذریعہ گناہگاروں کا، ناانصافی اور ظلم کرنے والوں کا ستیاناس کر رہا ہے۔

اسی عرصہ میں ڈاکٹر کیسٹل کی پلیگ کے خلاف بنائی گئی نئی دوا "سیرم" پہلی بار آزمائی گئی اور جس پر تجربہ کیا گیا وہ تھا پولیس مجسٹریٹ موسیو اوتھون کا چھوٹا سا لڑکا جس کو یکایک پلیگ نے آدبوچا تھا۔ بچے کو فوراً ہی شفاخانے بھیج دیا گیا۔ اور موسیو اوتھون اور مادام اوتھون کو اس کیمپ میں، جو شہر سے باہر ان لوگوں کو علیحدہ رکھنے کے لیے بنایا گیا تھا جن کے خاندان میں کسی کو پلیگ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر ریو نے موسیو اوتھون کو تسلی دلایا تھا کہ وہ بچے کا ہر ممکن خیال رکھیں گے۔ بچے کے شفاخانے جاتے وقت انہوں نے شاید پہلی بار اپنے اندرونی جذبات کو باہر آنے کی اجازت دی۔ میرے بچے کی جان بچانے کی کوشش کرنا ریو۔

اور ریو نے ہر امکانی کوشش کی لیکن پلیگ کے خطرناک اور ہیبت ناک حملے کے سامنے کچھ کام نہ آیا اور پہلی مرتبہ ریو کو اپنی ساری کوششوں کی ناکامی کا سخت تلخ احساس ہوا۔ بچے کی حالت تیزی سے خراب ہوتی جا رہی تھی اور یہ بات ریو کے لیے بالکل ظاہر تھی کہ اب اس کے بچنے کی بالکل امید نہیں ہے۔ اس حالت میں انہوں نے اس پر ڈاکٹر کیسٹل کی نئی سیرم کا استعمال کرنا طے کیا۔ یہ ایک اہم فیصلہ تھا۔ کیونکہ سیرم کی کامیابی یا ناکامی پر ہی بہت سے شہریوں کی امید یا ناامیدی کا انحصار تھا۔ بچے کو انجکشن دیا گیا۔ ریو، تارو، گرینڈ، کاسٹیل اور فادر پینی لو سب انتظار میں بیٹھے کہ شاید اس نئے علاج کا بچے پر اچھا اثر پڑے اور وہ ٹھیک ہو جائے۔

دن اور رات ..... رات اور دن حیات و موت کے درمیان سخت کشمکش جاری رہی۔ چھ آدمی بیٹھے ہوئے اس ننھے بچے کی حالت دیکھتے رہے اور .... صرف دیکھتے ہی رہے ..... لیکن انسان کو اپنی عاجزی کا احساس شاید ہی کبھی ہوتا ہو ..... مگر سب کچھ بے کار رہا۔ زہر ناک دل پر پھیلتا گیا تھا۔ دوا ناکام ہو رہی تھی۔ تارو سے بچے کی یہ تکلیف دیکھی نہ گئی۔ اور اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ ریو کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا دل مسل کر رکھ دیا ہو۔ فادر پینی لو نے دعا کی "خدایا اس بچے کی جان بچا لے۔" نامعلوم طبیعت گرینڈ کی خاموشی اور شدید ہو گئی۔ ڈاکٹر کیسٹل کو بچے کی تکلیف کا احساس نامرادی کے اندھیرے میں ڈھکیل رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنی بنائی ہوئی سیرم کا اثر بھی دیکھ رہے تھے ڈاکٹر ریو کا نظریہ یہی تھا جو ڈاکٹر کا ہونا چاہیے لیکن ساتھ ہی شدید ناکامی اور غصہ کا تلخ اور گہرا احساس بھی تھا۔ بچے کی ناقابل برداشت تکلیف دیکھ کر ان کی روح کرب سے بے چین ہوئی جاتی تھی۔

بچے کا موت کا آخری وقت تک جم کر مقابلہ کیا۔ لیکن آخر کار شکست کھا ہی گیا۔ اس کا دبلا پتلا جسم آخری تکلیف کے ساتھ بے چین ہو کر بے دم ہو گیا۔ ڈاکٹر ریو نے نہایت غصے کے عالم میں فادر پینی لو سے چلا کر کہا "آپ کہتے تھے کہ پلیگ عذاب خداوندی گناہگاروں اور ظالموں کو سزا دینے کے لیے۔ لیکن اس بچے کے متعلق کیا ارشاد ہے۔ یہ بچہ بے گناہ تھا۔ بالکل معصوم۔"

فادر پینی لو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن اس واقعے کے بعد سے ان کے زندگی بھر کے پختہ عقائد میں دراڑ سی پڑ گئی۔ حالانکہ ان کا دل اس بات کا مخالف تھا لیکن دماغ کے سکون میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ ذہن کی پرسکون سطح متلاطم ہو چکی تھی اس وجہ سے ان کا برتاؤ بھی کچھ عجیب سا ہو گیا۔ کچھ روز بعد وہ بھی بیمار پڑے لیکن انہیں اپنے اس فیصلے سے کہ وہ اپنے آپ کو کسی ڈاکٹر سے رجوع نہیں کریں گے، ایک اطمینان سا ہوا۔ پرسکون طریقے سے آخری وقت کی جسمانی تکلیف برداشت کرنے کے بعد فادر پینی لو کا بھی انتقال ہو گیا۔ وہ اپنے عقیدے پر شہید ہو گئے۔ لیکن شاید اس شہادت سے بھی ان کا اپنا سوال حل ہوا تھا۔ اور آخری وقت ان کو اپنے پختہ عقائد کا سہارا ملا یا نہیں یہ بھی ٹھیک سے نہیں کہا جا سکتا۔

فادر پینی لو کا انتقال موسم سرما کے آغاز میں ہوا تھا۔ جاڑے کا موسم آنے پر لوگوں کو یہ امید تھی کہ پلیگ ختم ہو جائے گا لیکن اس امید

کے پورے ہونے کا اب بھی کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ مرنے والوں کی تعداد اب تک بہت بڑھ چکی تھی۔ اور لوگ اب بھی برابر پلیگ کا شکار ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر کسٹیل کی سیرم استعمال میں لائی جا رہی تھی۔ کیونکہ اوتھون کے لڑکے کی بیماری میں یہ ثابت ہو گیا تھا کہ اس دوا کی وجہ سے مریض موت سے دیر تک جدوجہد کر سکتا ہے۔ لیکن کسی کی جان بچانے میں یہ دوا بھی ناکام ثابت ہوئی تھی۔

مسلسل ناکامی اور شکست کے سبب ریو کو شدید تھکان کا احساس ہونے لگا تھا۔ کبھی کبھی بیوی کی حالت کے بارے میں تار آتا جس میں ہمیشہ یہی ایک جملہ لکھا ہوتا "اب طبیعت پہلے سے اچھی ہے" لیکن ریو کو معلوم تھا کہ یہ جملے محض اس کو تسلی دینے کے لیے لکھا گیا ہے۔ لیکن کام اب بھی اتنا زیادہ تھا کہ ریو کو اپنے نجی معاملات میں مصروف ہونے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ تارو بہت تھک چکا تھا۔ ذہنی اور جسمانی اور دونوں اعتبار سے لیکن صرف اس کے علاوہ کہ اس کی ڈائری میں اس کا رسم الخط برا ہو گیا۔ اس تھکان کا اظہار اور کچھ (کہیں) نہیں تھا۔

لیکن گرینڈ کا برتاؤ ایک دم بہت عجیب سا ہو گیا۔ کئی روز تک وہ نہ گھر پر ٹھیک طریقے سے رہا اور نہ دفتر میں گیا۔ تمام تمام دن وہ شہر کی سنسان سڑکوں پر گھومتا پھرتا۔ اکیلا اور بالکل اکیلا...... ایک دن ریو اور تارو فکر مندی کے عالم میں اسے ڈھونڈنے نکلے۔ کافی دیر بعد گرینڈ کا مکان سے دور، لڑکھڑاتا اور لاغر سا دکھائی دیا۔ لیکن ڈاکٹر ریو کے آتے ہی وہ ایک جانب کو بھاگ نکلا۔ اس واقعہ کے دوروز بعد معلوم ہوا کہ گرینڈ بیمار پڑ گیا ہے۔ ریو اور تارو نے علاج اور تیمارداری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ لیکن گرینڈ کا تھکا ماندہ کمزور جسم موت سے کتنی دیر جدوجہد کر سکتا تھا...... اس کی حالت بگڑتی ہی گئی۔ ڈاکٹر ریو نے آخری کوشش ڈاکٹر کسٹیل کی سیرم استعمال کرنے ہی کی۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ شکست اور ناکامی کے علاوہ قسمت میں کچھ اور نہیں ہے۔ ادھر گرینڈ کی حالت کافی خراب ہوئی۔ خاتمہ قریب دکھائی دینے لگا۔ کمرے میں موت کے خوف سے خاموشی طاری ہو گئی۔ گرینڈ نے نحیف آواز میں کہا۔ اس الماری سے میرا ناول نکال دیجیے۔ ریو نے ویسا ہی کیا۔ تقریباً پچاس صفحات ہوں گے جن میں صرف ایک ہی جملے کو بار بار اچھا سے اچھا بنا کر لکھا گیا تھا، کیونکہ گرینڈ کو یقین تھا کہ ناول مکمل کرنے کے بعد وہ ادب کی دنیا میں تہلکہ مچا دے گا۔ اس جملے کے علاوہ ایک جملہ اور لکھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ جملہ ابھی پچھلے چند دنوں میں ہی لکھا گیا ہے۔ "میری پیاری جین مجھے تمہاری یاد بہت آتی ہے۔"

گرینڈ نے کہا کہ سب کاغذوں کو کمرے میں جلتی آگ میں ڈال دیا جائے۔ ریو کچھ جھجکا لیکن گرینڈ نے بڑی بے قراری سے اصرار کیا۔ اور ریو نے گرینڈ کی خواہش پوری کر دی۔ گرینڈ دیوار کی جانب منہ کر کے لیٹ گیا۔ کاغذوں کے جلنے سے کمرے میں اچانک ایک وحشت ناک تیز روشنی لال پھیل گئی۔

تارو کو مریض کی نگہداشت کرنے کے لیے چھوڑ کر ریو اپنے گھر چلے گئے۔ رات بھر وہ یہی سوچتے رہے کہ موت کی طاقت کے سامنے زندگی کتنی بے معنی ہے۔ صبح جب وہ گرینڈ کے مکان پر پہنچے تو دیکھا اس کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی جیسے کسی نے جادو کے اثر سے بیماری ختم کر دی ہو۔ اور اس کے کچھ ہی عرصہ بعد گرینڈ رفتہ رفتہ بالکل ٹھیک ہو گیا۔ اسی دوران ریو کی ایک اور مریض — ایک چھوٹی سی بچی بھی اچانک ٹھیک ہو گئی۔ صحت مند ہونے کے یہ منظر اس بات کی نشان دہی کرتے تھے کہ جس طرح یہ وبا ہی دفعتاً آئی تھی اسی طرح ختم بھی ہو جائے گی۔ موت کے خوف ناک سائے تیزی سے شہر کے اوپر سے ہٹنے لگے اور مرنے والوں کی تعداد نہیں کے برابر رہ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ وبا اب ختم ہونے ہی والی ہے۔ لیکن اس بات سے لوگوں کو وہ خوشی نہیں ہوئی جو اس موقع پر فطری طور پر ہونا چاہیے تھی۔ وہ اب تک بہت کچھ سیکھ چکے تھے۔ خوشی کے عارضی پن اور موت کی طاقت کا اندازہ اب لوگوں کو ہو چکا تھا۔ اس لیے ابھی وہ اپنی خوشی، تسکین اور جوش پر پابندی لگائے ہوئے تھے۔

لوگوں کو اس بات پر بھی بڑی حیرانی ہو رہی تھی کہ سڑکوں پر اب پھر مرے چوہے دکھائی دینے لگے تھے۔ وبا اور تنہائی کے ایسے عرصے میں کہیں پر ایک بھی چوہے کا نام و نشان تک نہیں ملتا تھا۔

لیکن پلیگ نے جاتے جاتے ایک آخری حملہ اور کیا۔ اس کا شکار ہی تھا...... تارو.... یکایک اس کی طبیعت خراب ہوئی، ڈاکٹر ریو اور ان کی ماں نے بڑی تندہی سے تارو کی دیکھ بھال کی اور تیمارداری کی، لیکن حالت خراب ہی ہوتی چلی گئی۔ تارو نے بڑی مردانگی اور جرأت کے ساتھ موت کا سامنا کیا۔ لیکن نہ اس کی جرأت و ہمت، نہ ریو کی دوستی، دوا اور علاج اس کی زندگی بچا سکے۔

تارو مر گیا۔

تارو کو اپنے اس خاتمہ سے کبھی سکون نصیب ہوا یا نہیں یہ تو ڈاکٹر ریو نہیں کہہ سکتے تھے لیکن وہ یہ بات ضرور جانتے تھے کہ اب ریو کے لیے کوئی اطمینان اور سکون ممکن نہیں تھا۔ اسی طرح جیسے جنگ کے بعد کا امن اس ماں کے لیے بے معنی ہو جاتا ہے جس کا بیٹا جنگ میں کام آ چکا ہو۔ یا اس شخص کی طرح جس نے ابھی ابھی اپنے کسی نہایت عزیز دوست کو دفن کیا ہو۔ زندگی میں اب کون سی رنگینی اور مسرت باقی رہ گئی تھی۔ کیا رہ گیا تھا یادوں کے علاوہ...... پلیگ کی تباہی اور اس کی یاد، کسی کے قریب ترین ہو جانا اور اس کی گذشتہ یاد، غم حاصل ہوتے ہی اس کا ختم ہو جانا، اور اس کے ختم ہو جانے کی یادیں۔ اس سے زیادہ اور.... کچھ نہیں ....!! زندگی عذاب یاد ماضی کے علاوہ اور کچھ بھی ہے ....؟؟؟

انہیں خیالات سے ریو کو وہ طاقت ملی، جس کے بل بوتہ پر شاید وہ اپنی بیوی کی موت کے صدمے کو بھی برداشت کر گئے۔ جس کی خبر انہیں تارو کی موت کے کچھ ہی دیر بعد ملی تھی۔

اور اس طرح پلیگ کی ترسناک تباہی کا خاتمہ ہوا۔ فروری کی ایک چمکدار صبح کو شہر کے پھاٹک دوبارہ کھولے جانے کا جشن بڑے جوش و خروش سے منایا گیا۔ توپیں اور آتشبازیاں چھوڑی گئیں۔ شراب کی ندیاں بہا دی گئیں۔ رنگ برنگی جھنڈیاں لگائی گئیں۔ سنسان اسٹیشن پر دوبارہ رونقیں آئیں۔ بندرگاہوں پر پھر سے جہازوں کی آمد شروع ہوئی۔ زندگی کے پر مسرت رقص کا پھر سے نئے جوش و ولولے سے آغاز کیا گیا۔ جیسے حیات نے موت کو آخر کار شکست دے دی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے زندگی ایک مستقل شئے ہے اور موت وقتی اور عارضی۔

پرانے دوست، رشتہ دار، عزیز، دل گرفتہ محبوب مجسم عشوہ و انداز محبوبائیں شدید فراق کے بعد پھر سے ملے اور جوش سے پاگل ہو کر اس بات کو ثابت کرنے میں مصروف ہو گئے کہ زندگی نے موت پر فتح حاصل کر لی ہے۔

لیکن جب رامبرٹ نے فرانس سے آئی ہوئی اپنی محبوبہ کو بانہوں میں لیا تو اسے ایک دم ایسا محسوس ہوا جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔ اور اس احساس کے بعد کوئی بھی بات کوئی بھی تعلق کارآمد نہیں رہ جاتا۔ اور اسی احساس کو مکمل طور پر مٹانے کے لیے نئے سرے سے سعی کرنا ہوگی جس کے لیے وقت درکار ہے۔

اپنی کھڑکی میں کھڑے ڈاکٹر ریو اس جوش و خروش کو، اس جشن کو دیکھ کر سوچنے لگے کہ اس طرح کی خوشی اور مسرت جو وہ اس وقت دیکھ رہے ہیں، ہمیشہ تباہی کے زیر سایہ ہی (ماتحت ہی) رہتی ہے اور رہے گی۔ پلیگ کا حد درجہ تباہ کن جراثیم کبھی مرتا نہیں ہے۔ اور نہ ہمیشہ کے لیے غائب ہی ہوتا ہے۔ یہ برسوں گزارہ سکتا ہے، زندگی کی مختلف اشیاء میں دبکا ہوا۔ اور نوع انسانی کو پھر سے سبق سکھانے کے لیے، اسے دوبارہ سچائی کی راہ دکھانے کے لیے، وہ کسی ہولناک شکل میں پھر ابھر سکتا ہے۔ اور اپنی پیروی کرنے والوں کو اپنے نمائندوں کو ایک مسرت سے بھرپور جگہ پر بھیج سکتا ہے۔ تاکہ سزا کے بعد وہ سچائی کو جان سکیں، پہچان سکیں۔

امتیاز علی عرشی

تیرے دیوانے بھی کیا کام بیاں کرتے رہے
اپنے ویرانے کو ہمدوشِ جہاں کرتے رہے

خوئے تسلیم و رضا آج بہت کام آئی
اس جفا جو کے ہر الزام پہ ہاں کرتے رہے

جسقدر بڑھتے رہے راہِ وفا میں ہم لوگ
ثبت ہر گام پہ اک اپنا نشاں کرتے رہے

جس کو ہم راز سمجھتے رہے نادانی ہے
اپنے چہرے سے اسے خود ہی عیاں کرتے رہے

جانتے تھے کہ نہیں عقل کو کچھ ہوش مگر
عمر بھر راہنما اپنا گماں کرتے رہے

تشنگی دل نے گرائے جو گہر آنکھوں سے
جیب و دامن میں ہم ان سب کو نہاں کرتے رہے

لاکھ احباب نے روکا ہمیں عرشی لیکن
جادۂ عشق کو ہم کاہکشاں کرتے رہے

شہریار

لاکھ خورشید سرِ بام اگر ہیں تو رہیں
ہم کوئی موم نہیں ہیں کہ پگھل جائیں گے

ہر گلی کوچے میں رسوا ہوئے جن کی خاطر
کیا خبر تھی کہ وہی لوگ بدل جائیں گے

ان کے پیچھے نہ چلو ان کی تمنا نہ کرو
سائے پھر سائے ہیں کچھ دیر میں ڈھل جائیں گے

قافلے نیندوں کے آئے ہیں انہیں ٹھہراؤ
ورنہ یہ دور بہت دور نکل جائیں گے

جاوید کمال رامپوری

مطربِ خوش نوا کی یاد آئی
نغمۂ جانفزا کی یاد آئی

پھر وہ وقتِ وصال یاد آیا
پھر اسی دلربا کی یاد آئی

پھر اسی بزم کا خیال آیا
پھر دلِ نارسا کی یاد آئی

پھر اسی رہگزر کے ہو بیٹھے
پھر اسی نقشِ پا کی یاد آئی

پھر کوئی زخمِ دل مہک اٹھے
پھر کسی بے وفا کی یاد آئی

آج اک حادثہ ہوا یعنی
دل کو اک آشنا کی یاد آئی

بشیر بدر

"تیورِ جفاکار" کو پہچان نہ پایا
دل حسن کے ایثار کو پہچان نہ پایا

آئینے نے آئینے میں سو بال نکالے
فن کار بھی فن کار کو پہچان نہ پایا

ہاں غور سے پھر دیکھ خداوندِ محبت
تو اپنے گنہگار کو پہچان نہ پایا

میں اپنی تمناؤں کا وہ خالقِ معصوم
جو اپنے ہی شہکار کو پہچان نہ پایا

سمجھا کہ خدا نے بھی کوئی شعر کہا ہے
واللہ میں سرکار کو پہچان نہ پایا

محرابِ حرم جیسی مجھے چاہیے سزا دے
میں ابروئے خمدار کو پہچان نہ پایا

مطبوعات موصولہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

سیارہ لاہور چند ماہ سے نعیم صدیقی نے ایک ماہنامہ کا اجرا کیا ہے۔ جس کا نام سیارہ ہے۔ سیارہ صالح ادبی اقدار کا نمائندہ ہے۔ اس رسالے نے اپنے مندرجات سے اور ترتیب و تہذیب میں حسن کی بنیادوں پر خاصی مقبولیت حاصل کرلی ہے۔ یہ رسالہ عام دلچسپی کا بڑا متنوع مواد پیش کررہا ہے اور پوری باقاعدگی کے ساتھ۔ پڑھنے والوں میں جو پذیرائی اس رسالے کی ہوئی ہے اس سے حوصلہ پاکر اس کے منتظمین نے ڈائجسٹ ایڈیشن بھی نکالنا شروع کیا ہے۔ سیارہ ڈائجسٹ میں کاغذ کا معیار اور بلند کرنے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اندرونی صفحات کو مصور بھی ہونا چاہیئے۔ اگرچہ اب بھی کہیں کہیں تصاویر دی گئی ہیں۔ مگر ان کے خطوط میں کوئی کشش نہیں اور اور یہ اس وقت تک نہیں ہوگا جب تک کسی اچھے آرٹسٹ مثلاً ریمزی بازیدی کی خدمات حاصل نہ کی جائیں گی۔
دونوں ایڈیشنوں کا مجموعی سالانہ چندہ اٹھارہ روپئے ہے جو اس کی خوبیوں کے پیش نظر قابل قبول ہے۔ خریداری کیلئے اس پتہ پر لکھیے منیجر سیارہ اچھرہ لاہور

اردو کے کلاسیکی شعرا:- مرتبہ ایم حبیب خاں۔ میر سے اقبال تک اردو کے اساتذہ شعرا پر تنقیدی مضامین کا ایک انتخاب ہے۔ جس کے پہلے اور دوسرے حصے شائع ہو چکے ہیں۔ اس انتخاب سے کلاسیکی شعرا کو سمجھنے میں بہت مدد ملے گی۔ یہ مضامین مختلف مشہور و معروف نقادوں نے لکھے ہیں۔ اور پہلے مختلف رسائل و کتب میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ادیب ماہر اور ادیب کامل قسم کے طلبا کو پیش نظر رکھ کر مرتب کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے کہ ان کی درسی ضروریات کو بہت کچھ پورا کرتی ہے۔ نئی نسل کے ذوق کی تعمیر کے لیے کلاسیکی ادب کا زیادہ سے زیادہ تعارف بنیادی کام ہے۔ ایم حبیب خاں نے یہ سلسلہ مرتب کرکے ایک مفید قدم اٹھایا ہے۔ کتاب کی قیمت سوا تین روپے اور ملنے کا پتہ انوار بک ڈپو شمشاد بلڈنگ علی گڑھ۔

دیوان حافظ مترجم و محشیٰ نئی صدی میں ہندوستان جس تیزی سے فارسی سے بیگانہ ہوا ہے وہ حیرت انگیز تو نہیں لیکن افسوسناک ضرور ہے۔ فارسی زبان و ادب کے توسط سے ماضی میں ہندوستان نے زندگی کو سنوارنے اور نکھارنے کا بہت کچھ سلیقہ پایا ہے۔ اخلاق و سیاست کے بارے میں جو زندگی کے دو اہم پہلو ہیں فارسی کے ادیب اور شعرا جن اسرار و رموز سے آشنا کرتے ہیں وہ آلام و مصائب اور پریشانی افکار میں ہمیشہ تسکین اور طمانیت کے پیغام لائے ہیں۔
ان افکار و خیالات کے مبلغین کے کلام و پیام کو زیادہ سے زیادہ سلیقہ مندی کے ساتھ پیش کرنا زندگی سنوارنے کے مترادف ہوگا۔
خوشی کی بات ہے کہ جناب مولانا حاجی سید سجاد حسین صاحب نے جو مدرسہ فتحپوری دہلی کے صدر مدرس ہیں اور فارسی و عربی ادب کا بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ اپنی توجہ فارسی کے عظیم ادب کے اردو تراجم مع اصل فارسی پیش کرنا شروع کیے ہیں۔ گلستاں اور بوستان سعدی کے بعد انہوں نے حال ہی میں دیوان حافظ شائع کیا ہے۔ ترجمہ سادہ سلیس اور پرکشش ہے۔ کتاب کی جلد بہت خوبصورت ہے۔ لیکن اچھے کاغذ اور اچھی طباعت کے باوجود حواشی اور بین السطور ترجمہ بالکل اسی ڈھنگ سے کتابت کرایا گیا ہے۔ جو پرانی فارسی کتابوں کا جانا پہچانا طریقہ ہے۔ ہم فاضل مترجم سے درخواست کرتے ہیں کہ آئندہ ایڈیشن میں جو یقیناً جلد شائع ہوگا اس کے حسن کتابت کی طرف خصوصی توجہ صرف کی جائے۔ یہ کتاب غیر مجلد ۸ روپے میں اور مجلد ۱۰ روپے میں سب رنگ کتاب گھر گلی قاسم جان دہلی سے مل سکتی ہے۔

ورسٹڈ ویونگ اور ہوزری یارن

کی

ضروریات کی تکمیل کے لئے یاد رکھئے

حرف آخر

کپور سپن

KAPURSPUN

ہی ہے

تیار کردہ۔ کپور سپننگ ملز۔ ڈاک خانہ

رآن اینڈ سلک ملز۔ امرت سر

جی ہاں آگ میں پھول بھی کھل سکتے ہیں

خدا نہ کرے لیکن اگر آپ کے جسم کا کوئی حصہ جل جائے یا چوٹ آجائے، یا خراش پڑجائے تو جلن اور سوزش کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ جیسے آگ ہو اس موقع پر فوری **جلمار** کا استعمال کیجیے۔

جو آپ کی اس آگ میں پھول کھلا دے گی۔

FOR

BURNS
SCALDS &
ABRASIONS

USE

JALMAR

a CIPLA product

بنانیوالے:۔

سپلا لیبارٹریز۔ بمبئی ۱

ضروری اعلان:

پاکستانی خریدار اپنا سالانہ چندہ اس پتے پر بھیج دیں رسالہ جاری کر دیا جائے گا

نمائندہ نگار ۶۱۷ این سمن آباد لاہور

Extract of a letter from Librarian Patna University Library addressed to the Nigar Monthly Rampur

..........May we impress upon you that the journal is of much use to all Urdu readers of our library and its absence causes great dissatisfaction to them.

.........Send a bill in duplicate for payment of future subscription to the journal which is shortly to fall due.

Dated 12th Dec. 1963

Sd/ R.P. Misra
Librarian

لائبریریوں، دارالمطالعوں اور ریڈنگ روموں کے منتظمین سے

اردو زبان میں ایسی ڈائرکٹری کی کمی برابر محسوس کی جاتی رہی ہے جس میں اردو کی کتابیں اور رسالے خریدنے والے اداروں کے مکمل پتے درج ہوں اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہم نے لائبریریوں، دارالمطالعوں اور ریڈنگ روموں کی ڈائرکٹری شایع کرنے کا فیصلہ کیا ہے اگر آپ کا تعلق کسی ایسی تنظیم سے ہے تو اپنی لائبریری دارالمطالعہ ریڈنگ روم سے متعلق مندرجہ ذیل معلومات فراہم کیجیے۔

(۱) نام لائبریری/ دار المطالعہ/ ریڈنگ روم (بہتر ہو اگر آپ یہاں پتے کی مہر لگا دیں) (۲) کب سے قائم ہے، (۳) جو اخبار اور رسالے خریدے جاتے ہیں ان کے نام (۴) جو اخبار اور رسالے اعزازی آتے ہیں ان کے نام (۵) حکومت یا میونسپلٹی سے کوئی امداد ملتی ہے؟ کتنی؟ (۶) پتہ (۷) دستخط منتظم

پتے کی جگہ انگریزی کی مہر لگائی جائے تاکہ غلطی کا امکان نہ رہے امید ہے کہ زیادہ سے زیادہ لائبریریاں اور دارالمطالعے توجہ دینگے اسکول اور کالج بھی اپنے بارے میں لکھ سکتے ہیں

ہمارا پتہ یہ ہے

کتاب کار پبلیکیشنز، پھلواڑ، رامپور۔ یوپی

بخدمت جناب ——————————

——————————

مکرمی محترمی

امید ہے کہ آپ مجھے اس وقت اور توجہ کے لیے معاف فرمائیں گے جو میں آپ سے اس خط کے ذریعے حاصل کر رہا ہوں اگرچہ یہ زحمت آپ کو ایک ادبی مقصد کے لیے دی جا رہی ہے۔

ہم عرصہ سے ایک ادبی رسالہ نگار کے نام سے شائع کرتے ہیں جو ۱۹۲۲ء میں جاری ہوا تھا اب یہ اپنی زندگی کے ۴۲ویں سال میں ہے اور ہمیں یہ کہتے فخر ہے کہ یہ اردو کا قدیم ترین ادبی رسالہ ہے جو آج تک نہ صرف یہ کہ زندہ ہے بلکہ اس کے تسلسل اشاعت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ ہندوستانی صحافت میں اس کا یہ تسلسل خود ایک تاریخی چیز ہے۔

نگار ہمارے ملک میں علمی اور ادبی خدمات انجام دیتا رہا ہے اور اس کے آزاد دریے نیز بیباک نقطہ نظر نے ہمیشہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ اردو کے نقاد اور دوسرے ادب دوست اس رسالے کو ایک بلند مقام دیتے ہیں۔ نگار کی اپنی ایک مخصوص آواز لہجہ اور آہنگ ہے۔ اس کے اپنے نظریات ہیں جن کی صحت مندی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ نگار میں مختلف موضوعات پر مضامین شائع ہوتے ہیں۔ مذہب، نفسیات، تاریخ، معاشیات، معاشرت، ادب اور تنقید وغیرہ کچھ مخصوص شعبے ہیں جن پر نگار توجہ دیتا ہے لیکن ان سب کی بنیادی حیثیت ادبی ہوتی ہے آپ کو ان سب میں ادبی زبان کی نزاکت جاری و ساری ملے گی

یقیناً یہ بات آپ کی دلچسپی کا باعث ہوگی کہ نگار کے پڑھنے والوں میں ڈاکٹر ذاکر حسین وائس پریزیڈنٹ انڈیا۔ ڈاکٹر تارا چند مشہور مورخ۔ پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق۔ مشہور شاعر اور نقاد مولانا امتیاز علی عرشی ماہر ہندوستانیات اور عربی فارسی کے ایک بڑے عالم جیسے حضرات شامل ہیں۔

یہ رسالہ ہندوستان کے بہت سے تعلیمی ادارے خریدتے ہیں جن میں اسکول کالج اور یونیورسٹیاں سبھی شامل ہیں۔ حال ہی میں پٹنہ یونیورسٹی کے لائبریرین نے اپنے ایک خط مورخہ ۱۲ دسمبر ۶۳ء میں لکھا ہے۔

"آپ کا ماہنامہ (نگار) ہماری لائبریری کے اردو پڑھنے والوں کے لیے بے حد کارآمد رسالہ ہے اور اس کی غیر حاضری ان پڑھنے والوں کی پریشانی کا باعث بن جاتی ہے۔"

رسالے کا آئندہ چندے کا بل ڈوپلیکیٹ میں بھیج دیجیے جو جلد ہی واجب الادا ہونے والا ہے ادائگی کر دی جائیگی"

یہ ایک عام رائے ہے اس رسالے کے بارے میں کہ اس کے سنجیدہ مضامین بے حد مفید اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان خوبیوں کے پیش نظر آپ بھی اپنے لیے اس رسالے کی خریداری کو پسند فرمائیں گے

آپ کی منظوری اور سہولت کی خاطر میں یہاں سنہ ...... کے لیے سالانہ چندے کا بل اور منی آرڈر فارم شامل کر رہا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ آپ جلد از جلد اپنا چندہ مرحمت فرما کر نگار کے خریداروں میں اپنے آپ کو شامل کر لیں گے۔

نگار کی خریداری کا مقصد صرف یہی نہیں کہ آپ نے اپنی لائبریری کو ایک اہم رسالے کا خریدار بنایا بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ آپ نے ہندوستان میں اعلیٰ ادب کی ترقی میں حصہ لیکر اپنی مادر وطن کی ثقافت کو بھی پھلنے پھولنے میں بھی مدد دی۔

میں آپ کی توجہ کے لیے ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں —————— آپ کا مخلص سرکولیشن منیجر

نگار رامپور کے بارے میں ہندو پاک کے ادیبوں نے کہا :

علامہ نیاز فتح پوری (بانی نگار) میرے لیے اس سے زیادہ مسرت اور کیا ہو سکتی ہے کہ نگار کسی نہ کسی صورت سے جاری رہے۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (الہ آباد) مضامین اچھے ترتیب بھی قابل تعریف، خدا مبارک کرے اور رسالے کو مزید ترقی عطا فرمائے۔

قاضی عبدالودود (پٹنہ) اکبر علی خاں نے نگار کا معیار بلند کر دیا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی (بارہ بنکی) نگار ہندوستان پہلی بار دیکھنے میں آیا۔ یہ فروری نمبر آپ کا بھیجا ہوا ہے۔ میں سمجھے ہوئے تھا کہ نگار پاکستان کا مثنیٰ ہوگا لیکن یہ تو بالکل لیکن تو چیزے دیگر ہی نکلا۔ اس سے قبل کا کوئی نمبر میری نظر سے نہیں گذرا۔

مولانا غلام رسول مہر (لاہور) رسالہ نگار میں نے اسی روز اول سے آخر تک دیکھ لیا تھا۔ اس کا کوئی بھی پہلو ایسا نظر نہ آیا جو زیادہ سے زیادہ قابل قدر نہ تھا حسن صورت، حسن طباعت، حسن مضامین، حسن ترتیب سب ایک دوسرے پر فائق۔
یقیناً آپ سے ایسے ہی علمی کارنامے کی توقع تھی۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو اور برابر شایان تر علمی کارناموں کی توفیق سے مشرف رکھے۔ غالب سے متعلق نئی چیزیں نکالنے کی گنجائش بہت کم رہ گئی ہے لیکن یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے فروری کے خاص نمبر میں تمام مضامین نئے شائع کیے۔ اور ہر مضمون مفید معلومات پر مشتمل تھا۔

ڈاکٹر سید عابد حسین (دہلی) میں نے نگار کو بڑی دلچسپی سے پڑھا اس کے مضامین عام طور پر اور آپ کی تحریر خاص طور پر جو غالبیہ کے نام سے مسلسل شائع ہو رہی ہے بہت پسند آئی۔ خدا سے دعا ہے کہ یہ نوخیز نگار بوڑھے نگار سے زیادہ معقول اور مقبول ثابت ہو۔

پروفیسر ڈاکٹر عندلیب شادانی (ڈھاکہ) نگار کی پرانی آن بان قائم رکھنے میں تمہاری سعی مشکور ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور (علی گڑھ) کل نگار نظر نواز ہوا۔ یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ ایک طرف آپ نے نگار کی روایات کا لحاظ رکھا ہے اور دوسری طرف اس میں کئی خوشگوار اضافے کیے ہیں۔ مستقبل کے لیے پروگرام بھی شاندار ہے۔ یوں تو اور مضامین بھی قابل قدر ہیں لیکن غالبیہ کا عنوان مجھے بہت پسند آیا۔ یہ بہت مفید سلسلہ شروع ہوا ہے اور اس سے آئندہ کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی۔

ڈاکٹر عبدالعلیم (علی گڑھ) غالبیہ کا سلسلہ اچھا ہے۔ یوں تو میرا خیال ہے کہ اگر ہم لوگ ایک عرصے کے لیے غالب کو اپنی قبر میں آرام کرنے دیں تو غالباً جانبین کے لیے بہتر ہوگا لیکن مجھے یقین ہے کہ میری رائے کوئی ماننے کا نہیں اور جیسا کہ صفحہ ۲۵ کے اشتہار میں کہا گیا ہے غالب سے چھیڑ چلتی رہے گی۔

پروفیسر سید احتشام حسین (الہ آباد یونیورسٹی) نگار جنوری نظر نواز ہوا۔ آپ نے جس حد تک اس کی روایتوں کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے وہ لائق تحسین ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نئے دور میں نگار اس سے زیادہ علمی اور ادبی خدمات انجام دے گا۔ جو پہلے دے چکا ہے کیوں کہ اس وقت علم و ادب دونوں نئی منزلوں اور نئے افق کی جستجو میں ہیں۔
اس نمبر میں یوں تو سبھی مضامین قابل مطالعہ ہیں لیکن غالبیہ کے سلسلے میں آپ نے دو جز شامل کیے ہیں وہ خاصے کی چیز ہیں۔ میں بھی اس کی جو خدمت کر سکوں گا کروں گا۔

مالک رام (بر سلز، بیلجیم) نگار کا جنوری کا شمارہ ملا تھا، شکریہ، ماشاءاللہ خوب نکلا ہے خدا کرے یہ خوب سے خوب تر ہوتا جائے۔ آپ نے غالبیہ کا جو سلسلہ شروع کیا ہے بہت خوب چیز ہے اگرچہ بہتر ہوتا اگر آپ اسے مکمل غالب نمبر میں ایک ہی مرتبہ شایع کر دیتے اس سے ایک تو کتاب ایک اشاعت میں پوری ہو جاتی دوسرے لوگوں کو انتظار کی زحمت بھی نہ اٹھانا پڑتی۔

پروفیسر حمید احمد خاں (لاہور) میں نے نگار کے غالب نواز اوراق کو دلچسپی سے پڑھا اور آپ کے حسن ترتیب اور ذوق سلیم کی داد دی۔ ہندوستان میں تحقیق غالب کے لیے ابھی بے حساب مواد موجود ہے امید ہے آپ کی توجہ سے بتدریج اس سرمایہ کا انکشاف ہوتا رہے گا۔

پروفیسر محمود الٰہی (گورکھپور یونیورسٹی صدر شعبہ اردو) نگار ملا۔ اب کی مینم بر بیدار لیست یا رب یا جناب آپ نے یقیناً معیار بلند کیا ہے ... میں خود بھی نگار کا چندہ جلد ہی بھجواؤں گا امید ہے کہ آپ برا نہ مانیں گے اگر ہم لوگ بھی خریدار نہ بنیں گے تو کون بنے گا....

پروفیسر نجیب اشرف ندوی (بمبئی) نئے سال کا نیا تحفہ دلکش و حسین نگار کی شکل میں جلوہ نما ہوا۔ اسے وقت تو خوش کر دیتا ما خوش کر دی　　اللہ تعالیٰ آپ کو ہر میدان میں اکیسر ہی رکھے۔

مختار الدین احمد آرزو (علی گڑھ) نگار ملا۔ شکریہ، پاکستانی ایڈیشن بھی آج دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصل ہے اور وہ نقل۔ معلوم ہوتا ہے آپ نگار کے دفتر سے وہی کاغذ اٹھا لائے اور وہی کاتب، طباعت اور کتابت بہت اچھی ہے۔ اس کی داد اس لیے دے رہا ہوں کہ اچھی طباعت کی رامپور میں امید نہ تھی۔

میکش اکبرآبادی (آگرہ) خوشی کی بات ہے کہ آپ نے نگار کا معیار قائم رکھا۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ غالبیہ کے اضافے سے اس کی اہمیت اور افادیت بڑھ گئی۔ تاباں کی غزل بہت ہی بہتر ہے۔ ابھی میں جستہ جستہ ہی مطالعہ کر سکا ہوں مگر اپنے ذہن میں ایک قسم کی حرکت محسوس کر رہا ہوں اس لیے امید ہے کہ انشاءاللہ کبھی کوئی خدمت ضرور کر سکوں گا۔

غلام ربانی تاباں (دہلی) آپ نے بہت محنت سے ایڈیٹ کیا ہے۔ واقعی بہت پسند آیا۔

محمود ایاز (مدیر سوغات بنگلور) نیاز فتح پوری نے نگار کو ایک مخصوص کردار اور مزاج کا حامل بنایا تھا اور خوشی کی بات ہے کہ آپ اس کردار مزاج کو برقرار رکھنے کی سعی کر رہے ہیں۔

عطا محمد شعلہ (بنارس) آپ کا تحفہ ملا۔ جسے پاکر طبیعت میں نہایت درجہ فرحت و انبساط کا احساس ہوا یہ نگار کی نشاۃ ثانیہ ہے اور .... یہ تحقیقی حیثیت کے لحاظ سے بہت آگے ہے۔.... خدا آپ کو ہمت و استقامت عطا فرمائے۔ اور آپ اسی شان سے اس کو چلاتے رہیں تو اردو ادب کے لیے یہ ایک نیک فال ہوگی۔

صہبا لکھنوی (مدیر افکار کراچی) آپ نے نگار کی دیرینہ روایت کو نہ صرف برقرار رکھا ہے بلکہ مضامین اور کتابت و طباعت میں تنوع پیدا کر کے اس روایت کو آگے بھی　　بڑھایا ہے۔ دلی مبارک باد۔

ظفر قریشی (مدیر ماہ نو کراچی) غالبیہ والی تجویز اور اس کی ابتدا بہت اچھی ہے۔ آپ لوگ یہ کام خوب کر سکتے ہیں۔ غالب کو اپنی عمر میں اتنے اور ایسے قدرداں نہیں ملے جتنے اب ملے ہیں اور رامپور والوں نے تو ہمیشہ اس کی ہر طرح عزت افزائی کی اور سرپرستی بھی

مرتضیٰ حسین فاضل (لاہور) نگار ملا .... اتنا دلکش کہ کرشمہ دامن دل کھینچنے لگا۔ جو صفحہ الٹا وہ عنوان نظر فریب و ذوق افزا سے آراستہ تھا۔ خدا اس نگار بسیار شیوہ کو آپ کے ہاتھوں تابندہ و پایندہ رکھے۔

محمد عتیق صدیقی (علی گڑھ) (یہ) دیکھ کر جی خوش ہوا کہ آپ نے نگار کی سابقہ روایات کو کامیابی کے ساتھ برتا ہے شکل و صورت کتابت اور مواد نگار کے ماضی کا آئینہ دار ہے خدا آپ کو مزید توفیق عطا فرمائے۔ اور آپ اس کو بہتر سے بہتر بنا سکیں۔

نگار رامپور کے بارے میں ہندوپاک کے مشہور رسالوں نے لکھا:

منادی (دہلی) مارچ ۶۳ء — **تبصرہ نگار خواجہ حسن ثانی نظامی**

ماہنامہ نگار رام پور

تعریف ہمیشہ پرانی شراب اور نئے جام کی ہوتی آئی ہے اور اس معاملے میں رندان بادہ خوار اور مشاہدہ حق کی گفتگو کرنے والے ایک زبان رہے ہیں لیکن نئے زمانے کا ایک اعجاز یہ ہے کہ آج سب کو پرانے جام اور نئی شراب کی تعریف کرنی پڑ رہی ہے۔ عام خیال یہ تھا کہ نیاز صاحب فتح پوری کی ضعیفی اور بے وقت ہجر کیساتھ ان کا نگار بھی ختم ہو جائے گا۔ یا کم از کم اس میں کوئی کشش باقی نہیں رہے گی۔ لیکن اکبر علی خاں صاحب پرانے نگار کو نئے رنگ میں اس طرح لے کر آئے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے اور بیساختہ داد دینی پڑتی ہے۔

نگار کی پرانی وضع قطع کو اکبر علی خاں صاحب نے اس طرح برقرار رکھا ہے جس طرح محکمہ آثار قدیمہ پرانی عمارتوں کی مرمت کراتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھتا ہے کہ مرمت کا پیوند نیا معلوم نہ ہو۔ چنانچہ سرورق اور عنوان وغیرہ سب گویا پرانے نگار کا فوٹو ہیں۔ بس صرف فرق اتنا ہے کہ مضامین نئے ہیں۔ اور قدیم معیار اور افادیت کے ساتھ ساتھ ہر جگہ ایک نئی روح نظر آتی ہے اور ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ انشاء اللہ، جدید اور جاندار ادارت کیساتھ اردو ادب کو اس نگار چہل سالہ کی صحبت خوب راس آئے گی۔

نگار کی سابقہ روایات کے مطابق اکبر علی خاں صاحب عظیم الشان خاص نمبر بھی شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اور اس کے لیے انھوں نے مندرجہ ذیل عنوان تجویز کیے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نمبر۔ رشید احمد صدیقی نمبر۔ خواجہ حسن نظامی نمبر۔ اختر شیرانی نمبر۔ خود نوشت سوانح نمبر۔ مطبوعہ مکاتیب نمبر اور غالب نمبر

غالب اکبر علی خاں صاحب کا محبوب موضوع ہے۔ اور جنوری ۶۳ء سے اب تک ان کی ادارت میں جتنے شمارے تیار ہوئے ہیں ان سب میں غالب کے تذکرے کو نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے یہ تجویز بھی رکھی ہے کہ غالب کے متعلق جو لکھا جائے وہ ہندو پاکستان کے صرف دو یا تین پرچوں میں شائع ہو تا کہ ریسرچ کرنے والوں کو جگہ جگہ خاک نہ چھاننی پڑے۔ مصنفین کے لیے تو یہ تجویز واقعی بہت دلکش اور بہت کار آمد ہے لیکن اس سے غالب بس ان دو تین پرچوں کے حلقۂ اشاعت تک محدود ہو کر رہ جائے گا اور یہ غالب پر بھی ظلم ہوگا اور غالب کے قدردانوں اور پرستاروں پر بھی۔ اس سے بہتر صورت تو یہ رہے گی کہ نگار غالبیات کی ڈائجسٹ کی طور پر بھی استعمال کیا جائے اور ہندو پاکستان کے پرچوں میں غالب پر جو بھی چھپے نگار میں نقل ہو جائے تاکہ ریسرچ کرنے والے آسانی کے ساتھ اور ایک ہی جگہ سے سیراب ہو سکیں۔ اس کے علاوہ اب تک غالب پر جو متفرق مضامین مختلف پرچوں میں شائع ہوئے ہیں (خاص نمبروں کو چھوڑ کر) ان سے بھی نگار کا ایک خاص نمبر مرتب کر کے ریسرچ کرنے والوں کی بڑی خدمت کی جا سکتی ہے۔

بہرحال نیا نگار نام نہاد جدت پسندی کے چھچھورے پن اور قدامت پرستی کی مردنی سے پاک ہے۔ صرف اردو کے لیے ہی نہیں نئے زمانے اور نئے رجحانات کے واسطے بھی نیک فال اور روشن مثال کی حیثیت رکھتا ہے کہ قدیم و جدید اور جام و سندال کے اس توازن ہی میں انسانیت کی فلاح ہے۔

ضخامت ۷۵ صفحات۔ اخباری کاغذ۔ کتابت اور چھپائی عمدہ۔ سالانہ قیمت دس روپے فی پرچہ ۷۵ نئے پیسے

ملنے کا پتہ:۔ ہندوستان میں نگار بکبرگی ۔ رام پور ۔ یوپی۔ پاکستان میں نمائندہ نگار ۹۱/۲ ب سمن آباد لاہور۔

ج

تہذیب الاخلاق لاہور مارچ ۶۳ء تبصرہ نگار سید ہاشمی فرید آبادی

نگار رامپور

ماہنامہ نگار کے نقش طراز ہندوستان سے دامن کشاں پاکستان چلے آئے اور یہ مجلہ رنگین اسی آب و تاب کے ساتھ افق کراچی سے جلوہ پیرا ہوا جس طرح سالہا سال مطلع لکھنؤ پر ضیا پاشی کرتا رہا تھا مگر اس سے کچھ پہلے اسی نام اور اسی ٹھاٹ باٹ سے رام پور کا نگار میدان میں نکل آیا۔ جس کی زمام ادارت اکبر علی خاں صاحب (خلف حضرت امتیاز علی عرشی صاحب رامپوری) کے ہاتھ میں ہے۔ ان کے رسالے پر جلد ۴۲ شمارہ اول جنوری ۶۳ء ثبت ہے اس اعتبار سے نگار قدیم اب رام پور کی چھاپ مانا جائے گا۔ زیر بحث شمارہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر عبدالعلیم، پروفیسر ہارون خاں شیروانی کے علمانہ قسم کے مضامین کے علاوہ ایک فاضلانہ مقالہ عبدالسلام خاں صاحب کا فلسفہ الوہیت پر شامل ہے۔ بہرہ نظم کا صفحہ واحد ناظرین نگار کے لیے کافی نہ ہو تو اس کی تلافی زیر تالیف کتاب غالبیۃ کی قسط اول (۶ صفحے) کر دیتی ہے۔ جس میں گذشتہ صدی کے تذکروں سے غالب کے حالات چن کر سجائے ہیں۔ حضرت عرشی نے غالبیات پر قیمتی علیے اہل شوق کو دیے ہیں۔ بالکل مناسب اور بجا ہوگا کہ ان کی تزئین و تکمیل مزید کا کام عرشی صاحب کے خلف الرشید انجام دیں۔ بعض تذکرے جن سے اقتباس لیے گئے ہیں زیادہ معروف نہیں۔ بہتر ہو کہ ان کا سال تالیف و طباعت یا کتابت مولفین کے نام و مقام بھی مختصر طور پر حاشیے میں ٹانک دیا جائے۔

کتابی دنیا کراچی مارچ ۶۳ء تبصرہ نگار ضیاالدین احمد برنی

نگار رام پور

جنوری ۶۳ء سے مولانا نیاز فتح پوری والے "نگار" کا انتظام اکبر علی خاں کے ہاتھ میں آ گیا۔ ان کی زیر ادارت دو نمبر نکل چکے ہیں۔ زیر تبصرہ شمارہ نمبر ۲ (فروری) ہے۔ یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ اکبر علی خاں رسالہ کو دلکش بنانے کے لیے پوری کوشش کر رہے ہیں۔ اس شمارہ میں مالک رام کا مضمون پڑھنے کے قابل ہے۔ اگرچہ اس میں کوئی نیا انکشاف نہیں کیا گیا ہے، غالب کے اسباب پر اور طرح روشنی نہیں ڈالی گئی۔ غالب (غالب کے ایک گمنام شاگرد) کے حالات اور شاعری کے نمونے نادم سیتاپوری نے ایک مضمون میں پیش کیے ہیں۔ "غالب اینڈ گو" ایک مزاحیہ خاکہ ہے۔ جیسے میں عرصہ ہوا سن چکا ہوں۔ بہرحال خاکہ خوب ہے۔

آجکل کراچی اپریل ۶۳ء تبصرہ نگار ایم الیاس

ماہنامہ نگار رامپور یوپی۔ ایڈیٹر اکبر علی خاں۔ قیمت ۷۵ نئے پیسے فی پرچہ۔

نگار ہندوستان کا ایک قدیم پرچہ ہے جو تقریباً تیس سال گذارنے کے بعد اس مرتبہ رام پور سے نئی آب و تاب کے ساتھ افق صحافت پر طلوع ہوا ہے۔ مجلے کے ایڈیٹر اکبر علی خاں صاحب بلاشبہ ترتیب مضامین کے فن پر گہری نظر رکھتے ہیں جس کا اظہار زیر نظر مجلے اور ان کی گراں مایہ تصنیف غالبیہ سے ہوتا ہے جس کی ایک قسط اسی شمارہ میں شریک اشاعت ہے۔

اس وقت ہمارا مشورہ مدیر نگار کی خدمت میں یہ ہے کہ نگار کو صرف ادب کے لیے وقف کر دیں۔ اور مذہب کے خشک و پیچیدہ مباحث سے احتراز کریں۔ ورنہ ممکن ہے کسی مسئلے پر وہ تلخی پیدا ہو جائے جو نیاز فتح پوری اور قارئین کے درمیان ہو گئی تھی۔ یہ نگار کی حیات نو ہے اس لیے احتیاط سے قدم اٹھانا چاہیے۔

زیر نظر شمارہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں۔ ڈاکٹر عبدالعلیم، پروفیسر ہارون خاں شیروانی اور رضانی خاں کے مضامین کافی اہم ہیں۔

زندگی (رام پور) اپریل ۶۳ء تبصرہ نگار عروج قادری

نگار

اڈیٹر:۔ اکبر علی خاں۔ قیمت سالانہ عہ۔ فی پرچہ ۷۵ نئے پیسے۔ مقام اشاعت:۔ دفتر نگار گھیر سنی رامپور۔ یوپی

دینی اور ادبی دونوں ہی نقطہ نظر سے یہ خوشی کی بات ہے کہ نیاز فتح پوری کا نگار اب ایسے ہاتھوں میں منتقل ہو گیا ہے جنہیں

دین و مذہب کا چہرہ بگاڑنے سے نہیں، علم و ادب کی زلفیں سنوارنے سے دلچسپی ہے۔ جہاں تک صورت کا تعلق ہے اکبر علی خاں صاحب نے اس کی سابقہ روایات کو اسی طرح برقرار رکھا ہے کہ ٹائٹل دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں سمجھ سکتا کہ یہ لکھنؤ کا نگار نہیں ہے۔ وہی سائز۔ ہیئت۔ ٹائٹل اور کتابت کا انداز وہی سب کچھ ہے۔ اس کے اب تک دو شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ دوسرا شمارہ تو ایک چھوٹا سا غالب نمبر ہی ہے۔ پہلے شمارہ میں متعدد موضوعات پر مضامین ہیں۔ ان مضامین میں تبصرہ نگار کے نزدیک مختلف حیثیتوں سے مولانا عبد السلام صاحب کا مقالہ بہت قیمتی ہے۔ بڑی قابلیت اور اونچی سطح سے لکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وجود اور صفات پر چند صفحات میں گویا ایک پوری کتاب کا مواد سمیٹ لیا گیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی مضمون کے ہر لفظ اور ہر نقطے سے اتفاق ضروری نہیں۔ بحیثیت مجموعی ادبی مضامین ہے۔ اور اس کو سمجھنے کے لیے بھی اچھی خاصی استعداد کی ضرورت ہے۔ غالبیہ کا سلسلہ بھی غالب سے عشق رکھنے والوں کے لیے مفید ہے۔ پہلے نمبر کے ملاحظات میں جن عنوانات پر خاص نمبر شائع کرنے کا پروگرام شائع کیا گیا ہے۔ وہ ادب کی آتش شوق میں اشتعال پیدا کرتا ہے۔ اس ماہنامے کا چندہ دس روپے سالانہ غالباً اسی پروگرام کی وجہ سے مقرر کیا گیا ہے۔ پاکستان سے اب جو نگار نکل رہا ہے اس پر بھی کہیں نظر پڑی تھی۔ تبصرہ نگار کے نزدیک بحیثیت مجموعی نگار ہند، نگار پاکستان سے بہتر ہے۔

ماہ نو کراچی - مئی ۶۳ء — تبصرہ نگار ظفر قریشی

نگار رامپور

نگار کا سفر حیات بھی خاصا طویل رہا ہے اور یہ اردو کے ادبی رسائل میں شاید سب سے طویل العمر مجلہ ہے۔ بھوپال میں جنم لینے کے بعد یہ لکھنؤ آ گیا۔ شباب سے رشیب تک کئی منزلیں یہاں طے کیں مگر یکایک اس کی ایک کرن کراچی کے مطلع سے بھی نمودار ہونے لگی اور لکھنؤ سے بھی جلوہ دکھاتی رہی مگر آثار یہی تھے کہ اب تک جو ثابت تھا سیارہ ہوا چاہتا ہے۔ اور اب تو نگار سن، نگار پاکستان کی مستقل شکل اختیار ہی کر چکا ہے۔ فطرت میں چونکہ خلا محال ہے اس سبب یہ کیسے ممکن تھا کہ ہند میں محفل ادب سے یہ نگار آتشیں رخ یوں اچانک پردہ کر جائے اسی لیے رامپور والوں نے اس طائر کے پر باندھ کر اپنے شہر سے بھی تاؤ دینے شروع کر دیئے ہیں۔

اس وقت اس کے تین شمارے موصول ہو چکے ہیں۔ اور یہ دیکھ کر طمانیت ہوتی ہے کہ گو اس طائر خوش پرواز کی شاخ آشیاں بدل چکی ہے۔ مگر طرز نوا گری میں کوئی خاص فرق نہیں آیا ہے۔

ہمیں معاصر کی اس رائے سے بھی اتفاق ہے کہ غالب پر لکھنے والے حضرات اپنی قلمی کاوشوں کو ادھر ادھر چھپوانے کے بجائے صرف تین مجلوں سے مختص کر لیں یعنی ہندوستان میں نگار (رام پور) اور آجکل (دہلی) اور پاکستان میں ماہ نو (کراچی) ہمیں شک نہیں کہ اس طرح غالب پر جو کام برصغیر میں ہو رہا ہے وہ پراگندگی، گمنامی اور گمشدگی کے سانحے سے بچ جائے گا۔ اس سلسلے میں لکھنے والوں کا ایک معین فورم بننے سے تحریریں بھی محفوظ ہو جائیں گی۔ اور قارئین بھی غالب پر لکھنے کے لیے ٹامک ٹوئیے مارتے نہیں پھریں گے جہاں تک ادارہ ماہ نو کا تعلق ہے اس نے اس روایت کو جو دہ آزادی کے قبل "آجکل" میں قائم کر چکا تھا، پاکستان میں بھی برابر قائم رکھا ہے۔ اور ان پندرہ سولہ سال میں غالب پر اتنا کچھ تحریری، تصویری مواد شائع کر دیا ہے جو بجائے خود غالبیات پر ایک اہم کام متصور ہو گا۔

نگار رام پور میں غالبیہ کے تحت جو دستاویزی مندرجات مرتب کیے جا رہے ہیں ایک اچھی تجویز ہے اور اس پر عمل بھی خوش ذوقی کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔

امید ہے کہ ان فرد فرد غالب پاروں کو اوراق گل کی طرح منتشر نہیں ہونے دیا جائے گا بلکہ کتابی صورت میں لا کر انھیں ایک دستنو کی شکل دیدی جائیگی۔

آجکل دہلی - جون ۶۳ء — تبصرہ نگار عرش ملسیانی

ماہ نامہ نگار (رام پور)

سالانہ دس روپے۔ فی پرچہ ۵ روپئے پیسے۔ ملنے کا پتہ۔ نگار بک ایجنسی۔ رامپور۔ یوپی۔

نیاز فتح پوری صاحب کی ہجرت پاکستان کے بعد اب یہ مشہور رسالہ اکبر علی خاں کی ادارت میں رام پور سے شائع ہو رہا ہے۔ موصوف نے اس کی ادبی روایات کو قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کی ظاہری صورت کو زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ غالبیہ کا سلسلہ انتخاب مدیر کی ذہانت و کد و کاوش کا نتیجہ ہے اس میں انھوں نے غالب سے متعلق ایسی سب تحریریں جمع کر دی ہیں جو انیسویں صدی کے

مائر سے ہی آتی ہیں۔ اس صدی ایسے بہت سے لوگ تھے جنہوں نے غالب کو دیکھا تھا یا اس [illegible] سے فائدہ اٹھایا تھا" ضرورت ہے کہ اہل ذوق اسے پروان چڑھانے میں پورا پورا حصہ لیں۔

ادیب مئی جون ۶۳ء　　　تبصرہ نگار ابن فرید

نگار جلد ۴۲ شمارہ ۱۰ جنوری ۶۳ء

نیاز فتح پوری کے ترک وطن کی وجہ سے نگار کا بھی انتقال مکانی ہو گیا ہے۔ اب یہ رام پور یوپی سے اکبر علی خاں کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ صوری اعتبار سے مدیر محترم نے روایت کو برقرار رکھا ہے۔ چنانچہ نگار کا وہی انداز کتابت ہے، وہی مسودوں کی ادنیٰ ترتیب میں وہی قدامت برقرار رکھی گئی ہے۔ جسے نیاز فتح پوری نے دانستہ برقرار رکھا تھا۔ البتہ یہ ارتقاء ضرور ہوا ہے کہ نیاز صاحب کے زمانے میں ادھر چند سالوں سے اس کے عام مضامین کا معیار کافی پست ہو گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ محض چھوٹوں کی دلجمعی کے لیے ان کے مضامین شائع کر دیا کرتے تھے ان پر نظر ثانی یا اصلاح کی زحمت نہ کرتے تھے۔ اکبر علی خاں روز اول سے اس معاملے میں محتاط ہیں۔ چنانچہ پہلے شمارہ ہی میں غیر معمولی ترقی محسوس ہوتی ہے۔ اس شمارہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عبدالعلیم، پروفیسر ہارون خاں شیروانی، محمد عبدالسلام خاں، غلام ربانی تاباں اور کیفی اعظمی وغیرہ شریک ہیں۔
امید ہے کہ اس بزرگ سنی کے نرغے سے نکل کر اب یہ پرچہ صوری اعتبار سے بھی ترقی کرنا پسند کرے گا۔
ایک شمارہ کی قیمت ۵۰ نئے پیسے اور سالانہ قیمت دس روپے ہے۔ پتہ۔ منیجر نگار بلاک ۱۰ بی رامپور یوپی۔

ماہنامہ جامعہ دہلی جولائی ۶۳ء　　　تبصرہ نگار عبداللطیف اعظمی

نگار رامپور　اڈیٹر۔ اکبر علی خاں

اردو صحافت میں نگار لکھنؤ کو ایک خاص مقام حاصل ہے اور اس کامیابی میں تمام تر جناب نیاز فتح پوری کی ہمہ گیر شہرت کو دخل ہے۔ پچھلے سال بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر نیاز صاحب پاکستان چلے گئے اس وقت سے ان کا نگار بھی پاکستان سے شائع ہوتا ہے۔ جنوری ۶۳ء سے جناب اکبر علی خاں صاحب نے رام پور سے نگار نکالا ہے۔ اور اعلان کیا ہے کہ "نگار لکھنؤ سے رام پور آگیا ہے" چنانچہ جلدوں کا شمار نیاز کے نگار ہی سے کیا گیا ہے۔ مگر ظاہر ہے نگار کی جو خصوصیات نیاز صاحب کی ذات طبع کی رہین منت تھیں۔ وہ محض جلدوں کے تسلسل سے پیدا نہیں ہو سکتیں۔ لیکن اب تک جتنے پرچے شائع ہوئے ہیں ان کی بنا پر یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ رام پور کا نگار بھی اردو ادب میں ایک مخصوص جگہ بنائے گا۔ پہلے شمارہ کے ملاحظات میں لکھا گیا ہے کہ نگار نے بڑے بڑے کے سالنامے نکالے ہیں۔ اب بھی اس نے ایک پروگرام بنایا ہے جس کے تحت بڑی اہم شخصیتوں اور موضوعات پر خاص نمبر ترتیب دیے جائیں گے۔ چنانچہ ایک ڈاکٹر ذاکر حسین نمبر کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ نگار کی گذشتہ روایات سے قطع نظر ہم اس تجویز اور فیصلے کا مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور امید کرتے ہیں کہ رام پور کا نگار اپنا ایک الگ معیار قائم کرے گا۔

ماہنامہ فاران کراچی جولائی ۶۳ء　　　تبصرہ نگار ماہر القادری

ماہنامہ نگار رامپور　ایڈیٹر۔ اکبر علی خاں۔ قیمت فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے سالانہ دس روپے
ملنے کا پتہ:۔ نگار رامپور (انڈیا) — پاکستان میں چندہ بھیجنے کا پتہ:۔ نمائندہ نگار ۲۱۷/پی سمن آباد لاہور

جناب نیاز فتح پوری کے پاکستان چلے آنے کے بعد نگار لامحالہ ہندوستان میں بند ہو جانا چاہیے تھا مگر جناب اکبر علی خاں صاحب نے اسکو بند نہیں ہونے دیا۔ لکھنؤ کی بجائے رام پور اس کا مرکز اور مطلع قرار پایا۔ نگار اسی سج دھج اور آن بان سے شائع ہو رہا ہے۔ خاص طور سے [illegible] عنوان سے غالب پر جو علمی نوادر اس پرچہ میں آتے ہیں [illegible] نگار کو انفرادیت اور ممتاز خصوصیت کا حامل بنا دیا ہے۔ نگار رامپور کا ادبی معیار شروع ہی سے بلند ہے اور روز بروز بلند ہو رہا ہے [illegible] اکبر علی خاں بڑے سلیقے کے ساتھ اس مجلہ کو مرتب فرماتے ہیں۔ توقع ہے کہ قدیم "نگار" کا حلقہ جدید نگار کو قبول کیا ہو گا۔

سہ ماہی صحیفہ لاہور جولائی ۶۳ء　　　تبصرہ نگار سید عابد علی عابد

نگار (رامپور) جو اکبر علی خاں کی زیر ادارت شائع ہوتا ہے۔ اچھا علمی رسالہ ہے۔ خدا کرے پروان چڑھے اور پھلے پھولے۔

REGD. NO. A—466 42ND YEAR OF PUBLICATION

NIGAR, URDU MONTHLY, RAMPUR U.P. OCTOBER 1963

REGISTERED WITH THE REGISTRAR OF NEWSPAPERS AT R.N. NO. 2136/57